معیاری تخلیقات کی ایک اہم دستاویز ۔۔۔ ۸۴-۱۹۸۵ء

کالی داس گپتا رضا نمبر

سہ ماہی

تناظر

نئی دہلی

جلد ۷ — ۱۳

جون ۱۹۸۴ء تا دسمبر ۱۹۸۵ء

قیمت (۱۰۰) ایک سو روپے

مدیر ناشر و طابع

بلراج ورما

خوشنویس : محمد صلاح الدین قاسمی

سرورق : گیتا ورما

طباعت : (فوٹو آفسیٹ) نعمانی پریس، دہلی

زیر اہتمام : مکتی ورما

Registered with the Registrar of News papers in India

TANAZUR تناظر

Urdu Quarterly Journal devoted to literature, culture and the Arts

R. NO. **40608/83**
EST. **1977**

24-D,
Mayur Vihar Pocket III
Delhi-110091

ناشر

تناظر پبلی کیشنز ـــــ ۲۴ ڈی، پاکٹ ۳، میور وہار

دہلی ۱۱۰۰۹۱

تناظر ــــ ترقی پذیر ادب کی دستاویز

●●

ہماری پالیسی اور اغراض و مقاصد

"میں نہیں چاہتا کہ میرا گھر ایسا فصیل بند قلعہ ہو جس کی کھڑکیاں ہر طرف سے مقفل کردی گئی ہوں۔ میرے گھر کی آغوش ہر ملک و قوم کے تہذیبی دھاروں کے لیے تاقیامت وا ہے۔ مگر میں یہ بھی نہیں چاہوں گا کہ کسی ایک دھارے کے تند و تیز بہاؤ سے میرے اپنے پاؤں ہی اکھڑ جائیں۔"

گاندھی جی کا یہ قول ہمارا رہبر ہے۔ ہم کسی بھی مخصوص طریق زندگی یا آئیڈیالوجی کے حق میں نہیں، مگر اس مسلک کے پرستار ضرور ہیں جو زندگی کو صحت، استقلال اور حسن کی تحریک دیتا ہے۔

ہندوستانی ثقافت و تہذیب کا تحفظ اور ارتقا، قومی اور بین الاقوامی یک جہتی کی پاسداری، صالح عالمی اقدار کی دریافت و بازیافت، جمہوریت، سیکولرازم اور انسان دوستی کا فروغ، ادب اور تنقید کی صحیح سمت اور رفتار کا تعین، نئی نسل کی ذہنی و حسی تہذیب و تشکیل اور فن کی بنیادی اقدار کی تلاش اور از سر نو ترویج و اشاعت ـــــ یہی ہمارے اغراض و مقاصد ہیں۔

تناظر کوئی تجارتی ادارہ نہیں، ایک ترقی پذیر تحریک ہے
تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی تجربات کا دارالعمل
جس کا مقصد ایسے ترقی پذیر تعمیری ادب کی بنیادیں تیار کرنا
ہے جو ہندوستانی ہوتے ہوئے بھی بین الاقوامی
قدروں کا احاطہ کریں۔

بلراج ورما

●●

کالی داس گپتا رضا

اردو زبان اور تہذیب کا

عظیم مجاہد، جس کی شخصیت

تخلیق، تنقید اور تحقیق کا بے مثل

سنگم ہے

اور

جو پورے بیس سال مشرقی افریقہ اور

پچھلے پندرہ سال سے وطن عزیز میں ایک

گوشہ نشین فقیر کی طرح چپ چاپ

شمع اردو کو زندہ اور تابندہ رکھے ہوئے ہے۔

★★★★★★★

آدمی کا کام اس کے نام اور مرتبے سے ہمیشہ

بلند ہوتا ہے۔ ادارۂ تناظر اردو کے اس سآونت

کے کام کے جائزے کے طور پر یہ

خصوصی شمارہ پیش

کرتا ہے۔

بلراج ورما

کالی داس گپتا رضا ــــ مطبوعات

۱۔ شعلۂ خاموش ۲۔ شورشِ پنہاں ۳۔ شاخِ گل ۴۔ اجالے
۵۔ دی سائیلینٹ فلیم ۶۔ مکتوباتِ جوش ملسیانی بنام رضا ۷۔ منشوراتِ
جوش ملسیانی ۸۔ دعائے صباح ۹۔ ہندوستانی مشرقی افریقہ میں
۱۰۔ متعلقاتِ غالب ۱۱۔ چکبست اور باقیاتِ چکبست ۱۲۔ شعورِ غم
۱۳۔ سہو و سراغ ۱۴۔ انتخاب آتش و غالب از چکبست ۱۵۔ شعاعِ جاوید
۱۶۔ کلیاتِ چکبست ۱۷۔ غالبیات چند عنوانات ۱۸۔ مقالاتِ چکبست

اور

۱۹۔ کالی داس گپتا رضا تحقیق و تالیف اور شعر کی روشنی میں از ظفر ادیب

زیر طبع

۱۔ شب نشین (شعری مجموعہ)

اور

کالی داس گپتا رضا ــــ حیات اور کارنامے از راہی قریشی
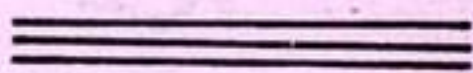
تناظر پبلی کیشنز کے علاوہ آپ یہ کتابیں

مندرجہ ذیل اداروں سے بھی حاصل کر سکتے ہیں

(۱) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی، علی گڑھ، بمبئی
(۲) انجمن ترقی اردو، اردو گھر، راؤز ایونیو۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲
(۳) موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲
(۴) وِمل پبلی کیشنز۔ ۳۰۵ چرچ گیٹ چیمبرز۔ نیو میرین لائنز۔ بمبئی ۴۰۰۰۲۰

منظرنامہ

پہلی نظر

از ص ۱۱ تا ۴۱

دوسرا منظر

از ص ۴۲ تا ۲۴۵

تیسرا منظر

از صہ ۲۴۶ تا ۲۹۰

چار مصرعے، چوبیس اوزان

(رُباعی)

چوتھا منظر

از صہ ۲۹۱ تا صہ ۳۲۴

ادب کی آبرو یا نیم وحشی صنف

(غزل)

پانچواں منظر

از صہ ۳۲۵ تا صہ ۴۲۹

متفرق اصناف شاعری

(پانچ اوّلین مقالے)

شاعری کے بارے میں کچھ اور

چھٹا منظر

ساتواں منظر

آٹھواں منظر

از ص ۵۹۹ تا ص ۶۵۲

(تلاشِ حق)

حرفے چند

کالی داس گپتا رضا

(رضا کی تحریریں) نگارشاتِ رضا

اردو تحقیق کا ایک منفرد اور معتبر نام

قابلِ رشک محقق
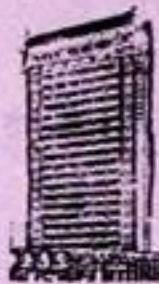
نواں منظر

از ص ۶۵۳ تا ص ۶۹۸

(رضا کی چند بیانیہ نثریں)

بیان ملکیت اور دیگر تفصیلات سہ ماہی تناظر (اردو) - دہلی

(مطابق فارم نمبر ۴ - قاعدہ نمبر ۸)

مقام اشاعت: دھلی وقفۂ اشاعت: سہ ماھی

ایڈیٹر، پرنٹر پبلشر اور مالک :- بلراج ورما

قومیت :- ھندوستانی

پتہ

۴۲ ڈی - پاکٹ ۳ - میور وہار - دھلی ۱۱۰۰۹۱

میں بلراج ورما اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم ویقین کے مطابق درست ہیں

۳۱ر اکتوبر سنہ ۱۹۸۵ء

دستخط

بلراج ورما

لبِ شکستہ

کالی داس گپتا رضا نمبر کے بارے میں تناظر کے پچھلے چند شماروں میں ہمارے اعلانات پڑھ کر ہمارے ایک 'معروف' ہم عصر نے مشورہ دیا تھا کہ ہم یہ ارادہ ترک کر دیں بلکہ تناظر (جس کا اپنا ایک مخصوص مزاج اور معیار بن گیا ہے) کا کوئی بھی خاص نمبر کبھی نہ شائع کریں، کیوں کہ ہمارے عام نمبر بھی اکثر رسائل کے خاص نمبروں پر بھاری ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں خاص نمبروں کی اشاعت عام نمبروں کے مقابلے میں نہ صرف زیادہ وقت لیتی ہے بلکہ مالی اعتبار سے بھی خاصی تکلیف دہ ہے۔ خط کے اختتام پر ہمارے اس کرم فرما کا مشورہ تھا کہ اگر منافع یا نام کمانا ہی ہمارا مقصد ہے تو امیتابھ بچن جیسے کسی بڑے سیاسی رہنما یا بھگوان رجنیش جیسے کسی بین الاقوامی مذہبی پیشوا پر نمبر نکالیں تاکہ دنیا، دین اور عاقبت سبھی میں سہولت ہو۔

ایک اور صاحب نے لکھا "رضا صاحب کو آپ کے نمبر کی ضرورت نہیں کیوں کہ یہ کام ملک کے دوسرے رسائل خاصی باقاعدگی سے کر رہے ہیں۔ رضا ادیب ہیں اور ادبی طور پر ابھی خالی نہیں ہوئے یعنی بدستور لکھے جا رہے ہیں اور بدستور لکھتے جانے کا دم بھی رکھتے ہیں۔ اس قسم کی سرگرم شخصیات پر مضامین وغیرہ تو ضرور لکھیے کیوں کہ یہ ان کا حق اور آپ کا فرض ہے مگر گرنتھوں ایسے ضخیم نمبروں کا نہ سوچیے۔"

ہمارا جواب تھا کہ ادب سیاست اور مذہب سے اور ادیب سیاسی رہنماؤں اور عصری ناخداؤں سے بڑا ہے۔ رہا سوال رضا نمبر ہی کیوں تو اس کا جواب یہ نمبر خود ہے۔

ادیب تہذیب، فن اور زندگی کا امین ہوتا ہے۔ ملک اور قوم کا ضمیر ہوتا ہے۔ اس نے ہر رنگ کے ہر دور میں زندگی کو سجایا سنوارا اور نکھارا ہے۔ تاریخ کے ہر موڑ، عصر کے ہر مرحلے

میں نئی حیات، نئے رجحان، نئے اخلاق اور نئی روحانیت کی رہنمائی کی ہے۔ جب اور جہاں کہیں اس نے سماج کے کسی فرقہ یا حکومت کے کسی انتظامیہ کے ہاتھوں زندگی کی بے قدری ہوتی دیکھی ہے، پوری شد و مد سے اس کی مذمت کی ہے، ادب میں احتجاج کا بے خوف نعرہ بلند کیا ہے۔

ہماری غلامی کے شرمناک دور میں جب بڑے بڑے سیاسی اور سماجی رہنماؤں کے قدم اکثر ڈگمگا جایا کرتے تھے، ہمارے ادیب غیر ملکی سامراج کے خلاف برابر جد و جہد کرتے رہے اور وطن عزیز کی بے خانماں جنتا کے تحفظ اور اس کے ہر جائز حق کے لیے لڑتے رہے۔ بھوک، افلاس اور ان سب اسباب و عوامل سے برسرِ پیکار رہے، جن کے نتیجے میں غریبی اور لاچاری سرعام وجود میں آتی ہے۔ وہ اپنی تمام تر قوت سے اس سیاسی اور اقتصادی ڈھانچے کو للکارتے رہے جس نے ملک کے ذرائع پیداوار کو روز حشر تک قومی ملکیت نہ بننے دینے کا عزم کر رکھا تھا۔ ہندوستان میں وہ نہرو کا قلم بنے، جنوبی افریقہ میں جیمو کینیا ٹا کا۔

خدا کا شکر ہے کہ وہ صورت حال کم از کم اپنے اس پرانے رنگ ڈھنگ میں آج باقی نہیں۔ ہماری یہ خوش قسمتی ہمارے فنکاروں اور ادیبوں کی دین ہے۔ آج ہم آزاد ہیں۔ کینیا بلکہ سارا افریقہ اور ایشیا آزاد ہے۔

ہم ایک جمہوریت ہیں، دنیا کی سب سے اہم نہ سہی، تاہم دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ضرور ہیں۔ جمہوریت انسانی بہبود کا سب سے عظیم اور ناقابل تسخیر سرچشمہ ہوتی ہے۔ جمہوریت میں ہر شہری آزاد ہوتا ہے۔ ہر ماں چاہے وہ محلوں کی رانی ہو یا پٹریوں پر سونے والی غریب مزدور عورت۔ اپنے بچے کے لیے یہ خواب دیکھنے کی حقدار ہے کہ وہ بڑا ہو کر ملک کا پہلا شہری بنے گا۔ جمہوریت کا قیام، استحکام اور فروغ اور ہر شہری کے ہر مناسب اور واجب خواب کو اس کا مقدر بنانا حکومت وقت سے زیادہ ادیب کا فرض ہے۔ ادیب قوم کا آرٹسٹ، مفتی اور معلم ہوتا ہے۔ ادیب کے فرائض حکومتوں اور حکمرانوں کے فرائض سے بڑے ہوتے ہیں۔ زندگی کے الجھے ہوئے رشتوں کو حکومتیں یا حکمراں نہیں ادیب اور فنکار سلجھاتے ہیں، وہی زندگیوں میں رنگ بھرتے ہیں وہی خواب بناتے بنتے اور بانٹتے ہیں۔ وہی انسانی سوچ و وچار کے چشموں کو رواں رکھتے ہیں۔

ادیب مسکراہٹیں بانٹتا ہے۔ رنج و غم بھی بانٹتا ہے۔ وہ درد کے رشتوں کا بانی اور مصور ہے۔

زندگی میں درد بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا سرور و انبساط۔ درد نہ ہو تو قوم کے گیت مر جاتے ہیں۔ گیت مر جائیں تو قوم بے حس ہو جاتی ہے۔ ادیب کی عظمت کی کہانی لمبی ہے۔ یہ ویدوں اور اپنشدوں سے بھی پہلے شروع ہوئی۔ ہر یگ اس مالا میں ہزاروں لاکھوں ہیرے موتی پروتا آیا ہے اور یہ مالا ہر یگ کے ہر دور میں پہلے سے زیادہ شاندار ہوئی ہے۔ اسی کڑی کے ایک موتی کا تذکرہ میں آپ سے کرنے جا رہا ہوں۔ میں نے اس موتی کو تب دیکھا جب درجنوں نکتہ رس اپنی اپنی کسوٹیوں پر جانچ پرکھ کر اس کے خالص ہونے کے بارے میں اپنی تشفی کر چکے تھے۔ میں کوئی جوہری نہیں ہوں مگر اتنا جان گیا ہوں کہ یہ موتی سچا ہے۔ مصنوعی نہیں۔ اور اس کی نشو و نما تہذیب اور وقت نے کی ہے۔ یہ کسی مصلحت کے کیمیائی نسخوں سے نہیں ہوئی۔

میں جانتا ہوں کہ یہ موتی ہمارے دور کا سب سے بڑا قیمتی موتی نہیں۔ مگر اس نے اپنے آپ کو ایک سچے موتی کے طور پر منوا لیا ہے اور وقت کے جوہری نے بھی اسے انسانی تہذیب کی اس مالا میں پرو دیا ہے جو صدیوں پرانی ہے اور کل کے آدمی کے لیے دیو مالا ہوگی۔

ہر دور کا آدمی دو کرداروں میں بٹا ملتا ہے:۔ ۱۔ اچھا آدمی ۔ ۲۔ برا آدمی۔ اچھے آدمی کے ذہن نے اچھائی کے تحفظ کے لیے خدا کی اختراع کی ۔ برے آدمی نے شیطان کی۔

یہ دنیا اچھے اور برے یعنی خدا اور شیطان میں بنٹی ہے۔ کبھی خدا کے بندے یعنی فرشتے اور انسان تو کبھی شیطان کے رکھشش اس پر حاوی رہتے ہیں۔ ہر آدمی میں خدا اور شیطان ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔

اچھے خیر و فلاح، نیکی، سچائی، ایمان داری، تعمیر حسن و حیات اور امن و مسرت کے داعی ہوتے ہیں اور برے شر و فساد، بدی اور بدکاری، بدصورتی، بگاڑ اور ریاکاری، دکھ، عصبیت، ظلم اور جھوٹ کے موجد اور تقسیم کار۔

یہ ایک پرانی کہانی ہے۔ تمدنِ انسانی کی ترتیب و ترکیب کی ایک مستقل اور شاید کبھی نہ بدلنے والی تصویر۔ اس کی خارجی ساخت، رنگ و روپ اور کونے و زاویے تو بدلتے رہتے ہیں مگر وہ ادھارشِلا جس پر آدمی کی تہذیب اور اس کے کلچر کی یہ عمارت کھڑی ہے، کبھی نہیں بدلتی۔ دیوتا اور شیطان کا یہ کھیل یگوں سے اسی طرح چلا آیا ہے۔ یہ دنیا آدمی کے امتحان اور اعمال کو جانچنے کے لیے خدا ہی کی طرف سے ترتیب دیا ہوا میدانِ عمل ہے۔ اپنے بندوں کو پرکھنے کا اس سے بڑا آلہ خدائے پاک نے ظاہر ہے کہ ابھی تک غالباً جان بوجھ کر ایجاد نہیں کیا۔ جنت سے رسوا ہو کر

نکالے جانے کے بعد سے آج تک آدمی اپنی یہ داستان سناتا آیا ہے۔ زبان وقلم سے فیضیاب ہونے کے بعد اس نے یہ داستان لکھنی شروع کی اور لکھتا چلا گیا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا یہ داستان لمبی ہوتی چلی گئی۔ اس کہانی کا نہ کبھی کوئی واحد آغاز تھا نہ کبھی انت ہی ہوگا۔ یہ انت ہے۔ کبھی کوئی آدمی اتنا بڑا نہیں تھا نہ غالباً کبھی ہوگا جو اس داستان کی پوری تفصیل کا خلاصہ لکھنے کا حق ادا کر سکے۔ جب بھی کوئی لیکھک یہ کہانی لکھنے یا دہرانے بیٹھتا ہے تو اس کا مقصد اسے حسب استعداد آگے بڑھانے یا دوسروں کی کہی ہوئی کسی بات کو اپنے طور پر، اپنے انفرادی انداز میں کہنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے فلاں موضوع پر آخری بات کہہ دی ہے اور اس طرح اپنے انسان یعنی اشرف المخلوقات ہونے کا حق ادا کر دیا۔

لاکھوں کروڑوں موضوعات میں پھیلی آدمی کی کہانی کا حرف آخر خدا کی ذات ہے جو آدمی کے محدود ذہن میں نہیں سما سکتی۔ باوجودیکہ خدا کا تصور بھی اس کے اپنے ہی ذہن کی اختراع ہے۔ ہر مصنف جو اپنے یا اپنے سے پہلے والے کسی عہد کے ادراک اور ترسیل کی اہلیت رکھتا ہے، لائق تحسین ہے۔ ظاہر ہے یہ ادراک ایک جیسا نہیں ہوتا اور نہ ترسیل ایک جیسی ہوتی ہے۔ دل کے کسی ولولہ یا زندگی کے کسی ایک المیہ کا تذکرہ بھی اظہار کا جیتا اور حصہ ہے، بشرطیکہ اس میں حق کا چمتکار اور حسن و سچائی کا جوہر ہو۔ یہی نہیں وہ قاری کو غفلت کی نیند سے جھنجھوڑ کر جگا دینے والی شکتی بھی رکھتا ہو۔

میں تخلیق کو اول درجہ اور تحقیق و تنقید کو دوئم درجہ کا ادب مانتا ہوں (گو کہ ہماری مرکزی ساہتیہ اکادمی اس سے متفق نہیں) تخلیق میں افسانہ و شاعری دونوں شامل ہیں۔

میں البتہ یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اپنے اعلیٰ معیار کی بنا پر تنقید اور تحقیق بھی اول درجہ کا لٹریچر قرار دی جا سکتی ہیں اور نظم اور افسانہ تیسرے درجے کا ادب بھی نہیں بن پاتے۔ لکھنا میرے نزدیک خود ایک ایسا وصف ہے جس پر ہم سب بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں اور اپنی اپنی بساط کے مطابق ہر بڑے اور اہم کام کو اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کر سکتے ہیں اور اس طرح دین و دنیا کی سعادت حاصل کر سکتے ہیں۔

ادیب، شاعر، موسیقار اور مصور خدا کی طرف سے کھینچی ہوئی سیرتیں ہوتے ہیں۔ وہ معاشرے کی گھڑی ہوئی مورتیں نہیں ہوتے۔ مجھے ماحول کی بے پناہ طاقت و اثر سے انکار

نہیں۔ مگر یہ ایک سچائی ہے کہ سچی شہرت اور عزت کے حقدار اول الذکر قسم کے علماء، شعراء اور ادباء ہوتے ہیں۔ دوسری مختلف اقسام کے حضرات بھی کبھی کبھار خاصی شہرت اور دولت حاصل کر لیتے ہیں۔ مگر اس قسم کی سستے وسیلوں سے حاصل کی گئی شہرت اور ناجائز و مشتبہ دولت دیرپا نہیں ہوتی۔ نہ اس سے انسانوں کے ایمان و اعمال بنتے سنورتے ہیں۔ میں ایک ایسے شاعر کو جانتا ہوں جو دوسری غزل تب تک نہیں گھڑتے جب تک کہ پہلی سے پانچ دس ہزار روپے نہ کما لیں۔ یہ حضرت ایک معلم ہیں اور اردو پڑھانے کی خاصی معقول تنخواہ پاتے ہیں۔ ممکن ہے طلباء سے ان کی مڈبھیڑ مشاعروں میں اکثر ہوتی ہو، مگر کلاس روم میں کم کم ہی ہوتی ہے یہ اردو زبان ہی کا دم ہے جو ایسے اشرف انسانوں کے درمیان زندہ و تابندہ ہے۔

سچا شاعر اور ادیب حق کا بندہ ہوتا ہے۔ حق ہی کو اپنی حد مان کر چلتا ہے۔ حق و انصاف کی خاطر قید و بند کی سختیاں جھیلتا ہے اور معاش کی تنگی بھی۔ اس کی راہ کے یہ پتھر وہ کڑی آزمائشیں ہیں، جن سے اس کی زندگی میں مقصد کا نکھار اور تحریر میں تاثیر اور سوز و گداز پیدا ہوتے ہیں۔ ادب اور انشا اسلوب نگارش، انداز فکر، حسن و محبت کی بصیرت اور ذوقِ سخن نکھرتے ہیں۔ فن کی راہیں۔ بڑی احتیاط اور دیدہ وری مانگتی ہیں، کیوں کہ فن الہام ہے، خدا کا روپ ہے، اور خدا تک پہنچنا ظاہر ہے، ریاضت چاہتا ہے۔

میں نے تناظر کے اس ایک موضوعی شمارے کے لیے کالی داس گپتا رضاؔ کو کیوں چنا؟ محض اس لیے نہیں کہ وہ ایک بڑا شاعر، انشاپرداز، ناقد اور عظیم محقق ہے۔ میرے وطن نے، اردو نے، بڑے بہت بڑے شاعر اور محقق پیدا کئے ہیں۔ اردو ادب کے عصری منظر نامے میں بھی وہ سرفہرست شاعر یا محقق نہیں ہے۔ میری تحریک رضاؔ کی ذات ہے۔ میری اس سے دوستی ہے۔ میں نے اس شخص کے اندر جھانک کر اس کا وراٹ سروپ دیکھ لیا ہے اور پوری طرح سے اطمینان کر لیا ہے وہ ایک اچھا بہت اچھا اور بے حد اچھا انسان ہے۔ میں نے اس انسان کو دیکھا۔ دل کی ترازو میں تولا اور جب میری تیسری آنکھ نے بھی گواہی دے دی کہ وہ واقعی بے حساب اچھا ہے تو میں نے طے کیا کہ ایسے شخص کو تناظر کے صفحات میں محفوظ کرنا اور پھر دنیا کو بھی دکھانا چاہیئے۔ اچھے آدمی اتنے کم ہیں کہ دنیا کا اچھائی سے ایمان اٹھتا جا رہا ہے۔ وہ کسی انڈسٹری کا کیپٹن ہوتا تو میں اس کی انڈسٹری اور اس کے کاروبار کا ذکر کرتا۔ وہ ایک فنکار ہے۔ لہٰذا اس کی شخصیت کے ساتھ ساتھ دنیا کو اس کے فن سے بھی اپنے طور پر روشناس کرانا ضروری ہے، حالانکہ سارا برصغیر آج اس کے نام اور کام سے

واقف ہے۔

میں نے جس طرح اس کا کام دیکھا ہے، اس کی شاعری اور نثری تخلیقات پڑھی ہیں اور اس کی ریسرچ کے نکتے اور زاویے سمجھے ہیں، ان سے میرے ایمان کو تقویت ملتی ہے کہ میں نے اس عظمت کا اندازہ بہت پہلے کر لیا تھا اور صحیح کیا تھا۔

کالی داس گپتا رضاؔ ایک اچھا انسان، ایک اچھا محقق اور میری پسندیدہ زبان کا بڑا رسیا اور عالم ہے۔ اس زبان کا درس میں نے کسی مدرسے میں نہیں، گھر کے ماحول سے بھی نہیں، بلکہ خود اپنی ریاضت سے حاصل کیا ہے ـــــ اور کون سا وسیلہ چاہیئے ـــــ میرے پاس میرا تناظر ہے، جس کے اوراق پر میرا حق اتنا ہی ہے، جتنا اس زبان کے مستقبل کا ہے۔

میں جانتا ہوں کہ یہ نمبر نکال کر میں رضاؔ کا نہیں اپنا اور تناظر کا وقار بڑھا رہا ہوں۔ رضاؔ کو ایک دنیا جانتی ہے۔ اس کے توسط سے کچھ اچھے لوگوں سے میری ملاقات بھی ہو جائے گی۔ اچھے لوگ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔

مجھے یقین ہے میری اس کاوش سے رضاؔ کے بارے میں اردو ادب کے قارئین کی جانکاری میں اضافہ ہوگا، جو ظاہر ہے اپنی جگہ اچھی بات ہوگی۔ رضاؔ عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں۔ انھیں جینے کا سلیقہ آتا ہے۔ لہٰذا خاصی لمبی عمر جئیں گے۔ جس لگن اور جانفشانی سے وہ اردو ادب کی خدمت میں سرگرداں ہیں، وہ انھیں یقیناً وہ مقام دلوا کر رہے گی جو ان کا حق ہے۔ وہ خدا کو مانتے ہیں، اور آدمی کے تصور کی حدوں کو پہچانتے ہیں۔ فنکار کے حقوق اور فرائض سے بھی پوری طرح واقف ہیں۔

اس نمبر سے اس دل کش، محبوب اور بے حد مربوط و متوازن شخصیت کی سیرت اور بصیرت کے اصلی خد و خال میرے قارئین کے سامنے آ گئے اور لوگوں نے ایک حد تک ہی سہی جان لیا کہ وہ کیا ہیں تو میں سمجھ لوں گا کہ مجھے میری محنت کا ثمرہ مل گیا۔

مجھے یقین ہے کہ میں نے یہ ایک اچھا اور نیک قدم اٹھایا ہے اور رضاؔ کے نام اور کام کے تذکرے جو اس شمارے کی زینت ہیں خاصی دیر تک ہماری عصری یادوں کا حصہ بنے رہیں گے اور اس طرح اس نمبر کو قبولِ عام حاصل ہوگا۔

میرے ساتھ کہیئے:۔ آمین!

ہماری پہلی ملاقات اور اس کا ردِ عمل

جون کی تپتی ہوئی دلی جب برداشت سے باہر ہو جاتی ہے تو ہم لوگ اکثر کسی نہ کسی پہاڑ کا سہارا لیتے ہیں مگر ۱۹۶۹ء کی تپش کچھ ایسی تھی کہ ہم نے طے کیا کہ جون کا وہ مہینہ کسی ساحلی علاقے میں گزاریں اور بمبئی چلے آئے۔ بمبئی ہماری پسندیدہ نگری ہے۔ جوانی کے اولین دور کا پورا ایک سال ہم نے فلموں میں داخل ہونے کے ناکام چکر میں یہاں کے گلی کوچوں میں بحیثیت آوارہ گرد گزارا تھا۔ اس زمانے کی یادگار ہماری چند کہانیاں ہیں جن میں کچھ ایک کو قبولِ عام بھی حاصل ہوا۔ "کابوس۔ مقدس کتاب۔ بمبئی۔ دھند میں لپٹی اک یاد۔ پائی پو کونڈریاکس اور۔ بڑا ہے درد کا رشتہ"، بمبئی ہی سے متعلق ہیں۔ ہماری کتنی ہی اچھی اور بری یادیں "ویشالی کے اس آنگن سے" وابستہ ہیں۔ انھیں دھندلی یادوں کی بنا پر یہ شہر ہمارے لیے جتنا اہم ہے ہماری بیگم صاحبہ کے لیے اتنا ہی غیر اہم۔ وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنی حماقت میں کتنے ہی ایک دم سچے (اور کچھ کم سچے بھی) رومانی تعلقات ان پر افشا کر رکھے ہیں۔

ہم لوگ اپنے میزبان کے پرتکلف دسترخوان پر بیٹھے قورمہ اور پراٹھے چکھ رہے تھے، کہ یکایک صاحب خانہ کے ملازم نے اطلاع دی کہ ہمارا ٹیلی فون آیا ہے۔ بمبئی میں ہمارا یہ پہلا ہی دن تھا اور یہ ٹیلی فون۔

ریسیور پکڑا تو پتا چلا کہ کال ہمارے ایک پرانے ملاقاتی کی طرف سے تھی جسے ہم نے دلی چھوڑنے سے چند روز قبل اپنی بمبئی یاترا کے بارے میں اطلاع کر دی تھی۔

"میں اِدھر تمہارے پڑوس یعنی رضا صاحب کے دولت کدہ سے بول رہا ہوں!"

"کون رضا؟"

"ارے تم رضا صاحب کو نہیں جانتے؟"

"رضا؟ کہو بھائی۔ علی رضا۔ وہ تو میرے پرانے کرم فرما ہیں۔"

ارے وہ فلموں یعنی مدر انڈیا والے رضا صاحب نہیں۔ یہ رضا صاحب ہیں۔ کالی داس گپتا رضا۔

"افریقہ والے؟"

"ہاں بھئی وہی افریقہ والے۔ شعلۂ خاموش، شورشِ پنہاں اور شاخِ گل والے!"

"میں انھیں ان کے نام اور کام سے تو جانتا ہوں مگر ذاتی ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ علاوہ ازیں سن رکھا ہے کہ وہ بڑے وہ ہیں!"

"مطلب؟"

"بڑے وہ سے میرا مطلب بڑے پیسے والے ہے۔ تم تو جانتے ہو میں کروڑپتیوں سے ذرا دور ہی رہتا ہوں۔"

"ارے کہاں کے پیسے والے اور کروڑپتی۔ بیچارے ایک گوشہ نشیں فقیر ہیں۔ تم آؤ اور ان سے ملو۔ دل خوش نہ ہو جائے تو کہنا۔ حیدر آباد ہاؤس سے نیچے اتر کر نے ہبی این سی روڈ پر آجاؤ۔ بل کے پاس جل درشن نام کی ایک بڑی عمارت ہے۔ اسی میں چوتھے مالے پر ان کا فلیٹ ہے ۳ ام اے بس چلے آؤ اور دیکھو خدا کی قدرت۔ دو اچھے آدمیوں کو ملا دوں گا تو آج کا دن سپھل ہو جائے گا ——"

ہم تو ظاہر ہے کہ کوئی ایسے اچھے نہیں مگر اچھوں سے ملنے کی اپنی چاہ ہمیشہ بنی رہتی ہے —— رضا کو ایک نظر دیکھ کر ہی ہم نے بھانپ لیا کہ یہ مالدار بنیا نہ صرف ایک کامیاب تاجر ہے بطور آدمی بھی خاصے کی چیز ہے۔ وہ ایک اچھا شاعر ہے یہ تو ہم جانتے ہی تھے —— سمندر کے کنارے تین کمروں کا فلیٹ۔ سمندر اور تین کمرے۔ مدھو مودن کا ایک کامیاب افسانہ یاد آگیا اس فلیٹ کی بالکنی میں بیٹھ کر اک ٹک سمندر کی طرف دیکھتے جاؤ تو خوابوں کا ایک جہاں آباد ہو جاتا ہے۔ بس جاگتے میں خواب دیکھنے کا سلیقہ آنا چاہیئے۔ سامنے آسمان کی حدوں تک پھیلا اے بی این سی اور نیچے سڑک پر بمبیا زندگی کی ریل پیل۔

رضا چند منٹوں کے لیے دوسرے کمرے میں گئے تو ہمارے دوست نے کہا اردو ادب کا یہ صاحب ثروت فقیر جب جب خواب دیکھتا ہے تو اکیلا نہیں ہوتا ان ہزاروں لاکھوں بے حیثیت لوگوں کو بھی اپنے ساتھ رکھتا ہے جو سمندر کے کنارے تین کشادہ کمروں والے فلیٹوں میں نہیں رہتے، بس سوچا ہی کرتے ہیں اس قسم کے گھروں اور ان میں رہنے والے خوش نصیب لوگوں کے بارے میں۔

گھنٹے بھر کی گفتگو میں ہی ہمیں علم ہو گیا کہ یہاں ہماری دال نہیں گلنے کی، کیوں کہ اس شخص نے ہر وہ چیز پڑھ رکھی تھی جس کے متعلق اس کی جانکاری میں اضافے کا ہم سوچ سکتے تھے۔ اپنے محدود علم کو اور بھی محدود دیتی اپنے اس نئے ملاقاتی کے لامحدود علم سے ہر لحاظ سے کمتر پا کر ہم

نے ادب کا چکر چھوڑ کر ادیبوں کی باتیں شروع کر دیں اور جلد ہی جان گئے کہ کم از کم اس کوچے میں ہمارا گزران سے زیادہ رہا ہے۔ انھیں افریقہ سے لوٹے سات آٹھ سال ہو چلے تھے مگر ملک کے علماء شعرا اور ادبا سے ان کے ذاتی تعلقات نفی کے برابر تھے باوجودیکہ وہ اکثر حضرات سے ادبی طور پر متعارف تھے۔ اب ہماری سمجھ میں آیا کہ ہمارے دوست نے انھیں گوشہ نشین فقیر کیوں کہا تھا۔

دوران گفتگو ہم نے محسوس کیا کہ وہ اپنے آپ کو فراموش کر کے اپنے سامع اور مخاطب سے کچھ اس طرح ہم کلام رہتے ہیں کہ وہ بے چارہ سمجھنے لگتا ہے کہ جو بات وہ کہہ رہے ہیں وہ، وہ نہیں وہ خود کہہ رہا ہے یا کہنا چاہتا ہے۔ اپنے آپ سے علاحدہ ہو کر دوسرے شخص کی کھال میں اس طرح جا گھسنے کا یہ انوکھا انداز جسے وہ یقیناً جان بوجھ کر منتخب کرتے ہیں سننے والے کو حیرت میں ڈال دیتا ہے اور اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ جو بات اسے کہنی تھی یا برسوں سے اس کے ذہن کے کسی گوشے میں بھی بیٹھی تھی اس شخص نے کیسے اڑالی۔ یوں تو ہر شخص جن امور پر گفتگو کرنا چاہتا ہے انھیں پورے شعور سے خود ہی چنتا ہے مگر ایسی پیچیدہ اور حیرت میں ڈال دینے والی جادوگری ہر کسی کا مقدر نہیں ہوتی۔

کروڑ پتی ہوتے ہوئے بھی وہ کوئی ایسا سربلند یا مغرور آدمی نہیں۔ سر جھکا کر تحمل بلکہ انکسار سے بات کرنے والا آدمی ہے۔ اس کی وجہ اس کے گھر کی فضا یعنی اس کے بیوی بچے ہیں۔ خاندانی شرافت کی ایسی من موہنی تصویریں جن کو پا کر آدمی زندگی سے پورے طور پر مطمئن ہو جاتا ہے اور اسے بیجا غرور سے پرہیز کرنا اپنے آپ آجاتا ہے۔ ساوتری (ان کی اہلیہ محترمہ) سمجھتی ہیں کہ ان کے شوہر کی شاعری ان کی شخصیت کی طرح ہی عظیم ہے اور چونکہ وہ جانتی ہیں کہ وہ اس شخص کی زندگی کا پہلا اور غالباً آخری رومان ہیں لہٰذا یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ ان کی شاعری کا خاصا بڑا حصہ ان ہی کے دم سے ہے۔

رضا کا ذہن ایک archeologist کا ذہن ہے جو قدیم کو اتنا ہی مانتا ہے جتنا حال اور مستقبل کو لہٰذا انھیں اطمینان ہے کہ وقت timer اُن کی کشش کو اس شخص کی نگاہ میں کبھی ماند نہ پڑنے دے گا، ایسا یقین لے کر جینا کتنا پُر لطف اور اطمینان بخش ہوتا ہوگا۔

پینے کا دور ختم ہوا تو ہمارے دوست نے ہمیں محترمہ قرۃ العین حیدر صاحبہ کے گھر لے جانے کا لالچ دیا۔ ہم مس حیدر کے پرستار ہیں۔ اس صدی کے چوتھے اور پانچویں دہوں

میں جوادو دھم کبھی ہماری پیاری عصمت آپا نے مچایا تھا اور ان کی افسانہ نگاری نے مرد کہانی کاروں کے افکار پر جس قسم کی برف باری کر رکھی تھی کچھ ویسا ہی ہنگامہ آج کل جیلنی مچائے ہوئے ہیں اور آج ہر جانب سے اعتراف ہو رہا ہے کہ جہاں تک اردو افسانے کا تعلق ہے (اور ادب سے ہمارا تعلق تھوڑا بہت اور جتنا ہے محض افسانے ہی کے توسط سے ہے) یہ یگ قرۃ العین حیدر کا یگ ہے۔ ہمارا من ڈگمگایا ضرور مگر ہم نے اپنے دوست سے معذرت چاہی اور وہیں ڈٹے رہے۔ دراصل ہم رضا بھائی کے پیار اور اخلاق سے کچھ ایسے متاثر ہوئے تھے کہ ہمیں اتنی جلدی یہ ملاقات ختم کر دینا کسی صورت گوارا نہ تھا۔

ہماری یہ ملاقات تین چار گھنٹے ہی رہی مگر اتنی گھنٹیاں بجا گئی دل و دماغ میں کہ جب ہم اپنے میزبان کے گھر لوٹے تو پورے بیس گھنٹے انھیں تین چار گھنٹوں کا ذکر کرتے رہے۔ رضا صاحب سادِتری (بیگم رضا) اور ان کی اولاد (ریٹا اور رومل) کی باتیں۔ نوکروں کے ہوتے ہوئے سادِتری کے خود اپنے ہاتھوں ناشتہ بنانے اور پروسنے کے سلیقہ کی باتیں۔ ریٹا اور اس کے والد کے موسیقی سے لگاؤ کی باتیں۔ گھر کے صاف اور سادہ رکھ رکھاؤ کی باتیں۔ یہ ہماری باتوں ہی کا جادو تھا کہ ہماری بیگم جو ہمارے اکثر ملاقاتیوں اور خاص طور پر ادبی ملاقاتیوں سے اکثر خوف زدہ رہتی ہیں دوسرے روز خود ہی رضا صاحب کے گھر جانے کو تیار ہو گئیں۔

ہمارا ایمان ہے کہ عورتیں پہلی ملاقات میں ایک دوسرے سے کبھی متاثر نہیں ہوتیں وہ دوسری کے شوہر کو ایک دم شریف، معقول بلکہ وجیہہ بھی مان لیتی ہیں مگر شوہر کے کسی دوست کی بیوی کو بہت کم پسند کر پاتی ہیں ——— وہ بھی کوئی عورت ہے۔ کہاں وہ اور کہاں اُس کا آدمی۔ کیسا بانکا تیکھا اور ذہین ——— اور کہاں وہ پھوہڑ ——— ہم اس لفظ کے معنی آج تک سمجھ نہیں پائے ——— ہمارا تجربہ رہا ہے کہ جب دو عورتیں جم کر ایک دوسری کو ایک دو بار ڈانٹ پھٹکار لیتیں ہیں تو محض خفت مٹانے کے لیے آپس میں بہنیں بن جاتی ہیں ——— یہ غالباً پہلا موقع تھا جب ہماری بیگم کو ہمارے کسی دوسرے ملاقاتی کی بیگم پہلی ملاقات میں پسند آ گئی۔

سادِتری واقعی سادِتری ہیں۔ ہماری دیومالا کی شہزادی کی طرح۔ وہ اپنے شوہر کو دنیا کا سب سے اہم اور دانا آدمی سمجھتی ہیں۔ وہ اردو نہیں جانتیں مگر انھیں یقین ہے کہ جس زبان نے اُن کے اتنے دانا شوہر کو اس قدر متاثر کر رکھا ہے یقیناً بڑی شے ہوگی۔

انھیں تو غالباً اس کا بھی یقین ہے کہ ان کے شوہر جیسا اُردو زبان و ادب کا دوسرا کوئی عالم اِس وقت ہندوستان بھر میں نہیں ہے۔ اُن کا یہ بھی خیال ہے کہ اُن کے شوہر کے مجسمے یا کم از کم تصاویر ہی ہر اُس ادارے کی زینت ہو جانی چاہیئے تھیں جن کا اُردو سے دُور کا بھی کوئی تعلق ہے۔ وہ پہلی خاتون ہیں جو شوہر کے شوق کو اپنی سوتن مانتے ہوئے بھی اس کا احترام کرتی ہیں۔

کالی داس واقعی بڑے خوش نصیب شوہر ہیں۔ کسی بھی شوہر کا، اپنی بیوی کے لیے اچھائی یا برائی کا بیرومیٹر ہو سکنا باعث فخر ہے۔ ہمیں یہ فخر کبھی نصیب نہیں ہوا۔ ہمیں یقین ہے کہ ہماری بیگم ہمیں خاصا کند ذہن آدمی سمجھتی ہیں اور اکثر اعلانیہ بھی فرما چکی ہیں کہ ہمارے پاس وہ نگاہ ہی نہیں جو ایک نظر دیکھ کر یہ پہچان لے کہ فلاں شخص کیسا ہے۔ رضا کے بارے میں اُن کی رائے ہے کہ وہ شکل و صورت، چال ڈھال، رہن سہن بلکہ بات چیت سے بھی شاعر وغیرہ نہیں لگتے۔ "اپنے گھر سے ایسا لگاؤ اور اپنے بیوی بچوں سے ایسا پیار شاعروں کے مقدر میں کہاں ہوتا ہے۔ شاعری کا اظہار قلندری میں ہوتا ہے، جیسے شاد بھائی (نریش کمار شادؔ) تھے ــــــ صاف ستھری باہوش اور ایکدم کلاک کی طرح ایک طے شدہ رفتار اور توازن سے چلنے والی زندگی میں نہیں ــــــ کالی داس جو ایک کامیاب تاجر ہے۔ صاحب جائیداد ہے۔ سُلجھی زندگی جیتا ہے ایک بڑا عالم تو ہو سکتا ہے شاعر نہیں ہو سکتا۔ کم از کم دیکھنے میں نہیں ــــ"

اُن کی بات سے مجھے آسکر وائلڈ کے امریکی سفر کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ اُن کے امریکی ٹور کے منتظمین نے اُن کی شہرت کے مدِنظر انھیں ایک بڑے ہی نازک قسم کا aesthete سمجھ رکھا تھا مگر جب انھیں دیکھا تو قدرے جھنجھلائے۔ Aesthete! my foot The man is an athelete

جسمانی ساخت کے اعتبار سے کالی داس صاحب بھی پہلوان زیادہ اور شاعر کم لگتے ہیں۔ یعنی athelete زیادہ اور aesthete کم۔ مگر اس کشادہ، قد و قامت اور مضبوط ہاڈ ماس کی سانولی سلونی کھال میں جو شخصیت محفوظ ہے وہ شاعرانہ نا سہی ایک شاعر کے تخیل کی چیز ضرور ہے۔

مجھے تو ساوتری کی خوش نصیبی پر رشک آتا ہے، ہوئی نا وہی بات کہ ہر عورت کو دوسری عورت کے شوہر میں وہ ساری خوبیاں نظر آتی ہیں جو وہ ایک شوہر کے لیے ضروری سمجھتی ہیں اور جوان کے اپنے

شوہر ہمیں اکثر نہیں ہوتیں۔

بعد میں درجنوں ملاقاتیں ہوئیں اور آہستہ آہستہ ہم دوست بن گئے۔ پنجاب کے ضلع ہوشیار پور اور ضلع جالندھر کے ایک حصے کے لوگ ہوشیار کم اور بدھو زیادہ ہوتے یا مانے جاتے ہیں۔ یہ پنجاب کا نسبتاً پچھڑا ہوا علاقہ ہے جسے پرتاپ سنگھ کیروں نے ایک بار ٹرائیبل قرار دینے کا سوچا تھا ــــ فی زمانہ چونکہ ہر سیدھا سادا اور شریف النفس آدمی اکثر احمق یعنی معصوم یا بدھو سمجھا جاتا ہے لہٰذا یہ قدرِ مشترک یعنی بدھوپن اپنے علاقہ کی حدود سے باہر ملنے والے ہوشیار پوریوں کو غالباً اپنی ذات کے تحفظ کے پیشِ نظر ہی ایک دوسرے کے قریب لے آتی ہے۔ اپنی زبان کا جادو اجنبی آسمانوں کے نیچے جو لطف دیتا ہے اس سے وہی لوگ مانوس ہوتے ہیں جو اس قسم کے تجربوں سے گزرے ہوں۔ کالی داس اور میں نہ صرف اسی علاقے کے رہنے والے ہیں ہماری اخلاقی تربیت کا پس منظر بھی آریہ سماجی اسکولوں کی تعلیم ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ آج بھی پکے آریہ سماجی ہیں اور میں گورو کا سکھ ہوں۔ میں بلراج سنگھ سے بلراج ورما کیسے بنا، کیوں بنا، یہ میرے پتن کی داستان ہے۔ جس کے انکشاف کی جگہ یہ نہیں۔

رضا ایک بار کوئی ہفتہ دس دن دلی میں رہے اس دوران ہم تقریباً ہر روز ملتے رہے۔ کبھی پنڈارا روڈ میرے فلیٹ پر تو کبھی نظام الدین میں ان کے سسرال والوں کے یہاں۔ جہاں وہ ان دنوں اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ ٹھہرے ہوئے تھے ــــ ہماری بیٹی امرتا جسے ہم اپنی فیملی کا سب سے ذہین فرد سمجھتے ہیں، رضا انکل کو بے حد سلجھا ہوا آدمی سمجھتی ہے۔ اس کے چند جملے جو مجھے اکثر یاد آتے ہیں۔ رضا بھائی کی گوناگوں شخصیت کا معقول ناپ تول ہیں۔

"رضا انکل جب ساہتیہ یا جیون کے کسی اور انگ رنگ کا ذکر کرتے ہیں تو لگتا ہے کہ کوئی بہت بڑا Historian بول رہا ہے۔ انھیں ساہتیہ کی بجائے اِتہاس پر کام کرنا چاہیئے تھا۔ ایسا ہوتا تو ہماری تاریخ کی بہت سی سِلوٹیں صاف ہو جاتیں اور پرانی اور مشکوک واردات کے بارے میں ہمارے intellectuals کے بہت سے شکوک بھی دور ہو جاتے۔"

میرے بتلانے پر کہ وہ اردو ساہتیہ کے ایک جانے مانے اتہاس کار ہیں اس کی تشفی نہیں ہوئی ــــ "ڈیڈی یہ بہت سمِٹ دائرہ ہے۔ اردو ساہتیہ کی عمر ہی کتنی ہے۔ میں خود اتہاس کی اسٹوڈنٹ ہوں اور جانتی ہوں کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔"

ظاہر ہے کہ رضا صاحب نے ہمارے پریوار کے افراد کو بہت متاثر کیا ہے۔
جن دنوں ہم شعاعِ جاوید کی ترتیب اور اشاعت کے چکر میں مصروف تھے ہمارے گھر والے اکثر ہمارا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ "ایسا لگتا ہے دو ہوں (رباعیات) کی یہ کتاب رضا انکل نے نہیں ڈیڈی نے خود لکھی ہے۔"

پھر ایک دن غالباً جون ۱۹۸۳ء میں ہم نے طے کیا کہ ہم رضا نمبر نکالیں گے۔ رضا پہلے تو چپ رہے مگر جب تناظر کے چوتھے شمارے (جو ستمبر ۱۹۸۳ء میں ریلیز ہوا) اس کا باقاعدہ اعلان کر دیا گیا تو رضا ایک دم سیریس ہو گئے۔

"ارے بھائی صاحب (ہم چونکہ ان سے عمر میں چند ایک سال بڑے ہیں لہٰذا وہ ہم سے اکثر اسی طرح مخاطب ہوتے ہیں) ابھی تو ماشاء اللہ میں جوان ہوں۔ صحت مند ہوں اور معقول قسم کی شاعری اور معتبر قسم کا تحقیقی کام بھی کر رہا ہوں ابھی تو مجھے بہت آگے جانا ہے، ابھی سے میرا مجسمہ بنانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"یہ کام میں آپ کے لئے نہیں تناظر کے لئے کر رہا ہوں۔ اردو کے اس قاری کے لئے کر رہا ہوں جو اس کے زبان و ادب کے ماضی، حال اور مستقبل سے جڑا ہوا ہے اور پورے ایمان سے اس کے سیکولر کردار کی بنا پر اسے ہمارے کمپازٹ کلچر کا سب سے اہم سمبل سمجھتا ہے۔ آپ ایک ہندو ادیب ہیں اور میں ایک ہندو مدیر ہوں۔ اردو کے سیکولر کلچر کا دعویٰ ہم آپ جیسوں ہی کے دم سے تو ہے۔ یہی آپ کا موٹی ویشن رہا ہے اور یہی میرا موٹی ویشن ہے۔"

"آپ کی ضد ہے تو نکالئے۔ ہمیں کتابیں جمع کرنے اور بانٹنے کا شوق ہے رضا نمبر کے بیس تیس نسخے ہم بھی خرید لیں گے مگر ہم وارن کئے دیتے ہیں کہ یہ سراسر گھاٹے کا سودا ہے ویسے ہم آپ کو کچھ کچھ سمجھ گئے ہیں اور بھابھی صاحبہ سے متفق ہیں کہ آپ میں نفع کا سودا کرنے کی اہلیت سرے سے ہے ہی نہیں۔"

"کتابیں خرید لینے سے ہی نہ چلے گا آپ کو وہ درجنوں مضامین بھی میرے حوالے کر دینے ہوں گے جو اردو کے دانشور احباب گاہے گاہے آپ کے بارے میں لکھتے رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ چھپے ہوئے کام کو دوبارہ چھپانا کوئی بڑی بات نہیں مگر جہاں بری باتوں کو دہرانا بے ہودگی ہے اچھی باتوں کو دہرانا برا نہیں۔ اس کے علاوہ آپ اپنا غیر مطبوعہ کلام

بھی میرے حوالے کر دیں۔ رہی میرے نفع نقصان کی بات تو وہ آپ بھول جائیے۔ تناظر میرا شوق ہے میری بیوی اسے میری سنک کہتی ہیں۔ سات سال پہلے جب میں نے اس جریدے کا اجرا کیا تھا۔ تب میرے ساتھ اور لوگ بھی تھے مگر ان کو نفع نقصان کی بات سمجھ آتی تھی لہذا ایک ایک کر کے وہ سب میرا ساتھ چھوڑ گئے۔ اس کام سے مجھے ذہنی سکون تو ملتا ہی ہے زندہ رہنے کی تحریک بھی ملتی ہے۔"

رضا مسکرائے۔"میں نے مجتبیٰ حسین کا مقالہ "بلراج ورما نے تناظر نکالا" پڑھا ہے۔ اور جان گیا ہوں کہ آپ اپنے ہر منصوبے میں احباب کو ساتھ تو رکھتے ہیں اور ان سے صلاح ومشورے بھی کرتے ہیں مگر کرتے وہی ہیں جو آپ کے من میں ہوتا ہے۔ پھر بھی مشورہ دوں گا کہ رضا نمبر کا خیال چھوڑ دو۔ اپنی افسانہ نگاری کا گزٹ چھاپو جیسے آپ کے ہم نام بلراج منیرا چھاپا کرتے ہیں یا افسانہ نمبر چھاپو جو آپ کی فیلڈ ہے۔

مگر —"

میں نے رضا نمبر کا خیال نہیں چھوڑا۔ میں کوئی کام ادھورا نہیں چھوڑتا۔ تاخیر ضرور ہوئی ہے اور میں سال بھر بیمار بھی رہا ہوں مگر میں نے قدم پیچھے نہیں ہٹائے۔ کالی داس رضا نمبر آپ کے سامنے ہے۔ اب یہ میرا نہیں، رضا کا بھی نہیں آپ سب کا ہے۔ اس کے ساتھ آپ جو بھی سلوک کریں گے، مجھے منظور ہو گا —— ایک بار پھر کہئے آمین۔

ہمارا یگ

ہمارا یگ ویشیہ یعنی بنئے کا یگ ہے۔ بنیا یعنی تاجر آج زندگی کے ہر شعبہ کا حاکمِ مطلق ہے۔ اِس یگ کے فنکار، شاعر، فلسفی، مغنی اور سائنس داں۔ دانشور اور اخبار نویس۔ معاشیات سیاسیات اور اقتصادیات کے ماہرین سب کے سب ویشیہ بھگوان کے اپاسک ہیں۔ اپاسک ہونا ایک بات ہے بھگوان کی اولاد ہونا دوسری۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ کالی داس نے اپنے نام کے ساتھ اپنی ولدیت بھی جوڑ رکھی ہے یعنی محض کالی داس نہ رہ کر وہ کالی داس گپتا کہلاتے ہیں تاکہ سب کو معلوم ہو کہ وہ یگ پرش ویشیہ منی کبیر کی چہیتی اولاد ہیں۔ اس حقیقت کو مشتہر کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی مگر اسے چھپانا بھی کوئی ایسا سودمند سودا نہ تھا جبکہ آج ساری دنیا پر آشکار ہے کہ کبیر کے بیٹے بیٹیاں ہی آج کے شہزادے شہزادیاں۔ گوئل، متل اور گپتا ہمارے راج کمار ہیں اور کالی داس صاحب

کا گو نر ویسے متبل ہے)۔

کالی داس کا نام سن کر ذہن میں جو مہکتا مہکتا تصور ابھرتا ہے جس قسم کی سُریلی راگنیاں سنائی دیتی ہیں اور جن نغموں کی دھیمی دھیمی سرسراہٹیں دِلوں کو گدگداتی اور گرماتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی کیفیتیں لفظ گپتا کے اُچارن سے پیدا نہیں ہوتیں۔ کالی داس ایک مقدس نام ہے ایک کلچر ہے۔ انسان کے تخلیقی اڑان کی ایک ایسی سیما ہے جس کا افق پھیلتا ہی جا رہا ہے ایک نغمہ ہے جو گونجتا ہے تو گونجتا ہی چلا جاتا ہے۔ لفظ گپتا کی فصیل کتنی بڑی اور بلند ہو نغمے کی اِس گونج کو روک نہیں سکتی۔ کالی داس گپتاؤں کے سنہری یگ کی سب سے اہم یادگار ہیں۔ ہو سکتا ہے کالی داس جی کے والد محترم جو بڑے ہی باشعور اور پڑھے لکھے بزرگ تھے، بھی اپنے نام کے آگے گپتا لگاتے ہوں مگر کالی داس گپتا کی تصدیق کے بغیر بھی میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ انھوں نے اپنے بیٹے کے نام کا چناؤ گپتا یگ کے کالی داس ہی کو ذہن میں رکھ کر کیا ہو گا۔ ناموں کے آگے ذاتوں کو جوڑنا کوئی اچھا رواج نہیں ہے مگر ہمارے دور کی خاصی بڑی اکثریت اِس کی شکار ہے۔

شیکسپیر نام کو اہمیت نہ دیتے تھے اگرچہ اُن کے کرداروں کے نام خاصے بامعنی ہیں۔ کالی داس تو ظاہر ہے کہ ایک بڑا ہی قابلِ احترام نام ہے۔ ہم نے نامناسب قسم کے ناموں والے حضرات بھی دیکھے ہیں جن پر ہماری سنسکرتی نازاں ہے۔ یگ پرش نانک دیو کے والد کا نام کالو رام تھا۔ خود ہمارے دادا جان بھی اِسی نام سے جانے جاتے تھے۔ اب آپ ہی غور کیجیے بھورام بھی فی زمانہ کوئی نام ہے مگر اس نام کا شخص ایک ایسا شاعر تھا جس پر پانچ دریاؤں کی دھرتی جسے ہم پنجاب کہتے تھے اور جہاں وید بھگوان نے جنم لیا تھا، کتنی ہی صدیوں تک ناز کرتی رہے گی۔ ابوالفصاحت حضرت جوش ملسیانی یہی بھورام جی تھے۔ کالی داس گپتا کو رضا یعنی شاعر بنانے والے اُن کے اُستادِ محترم۔ شاعری رضا کے خون میں تھی۔ اُن کی نس نس میں بہہ رہی تھی مگر اس عظیم اُستاد کے آشیرباد کے بغیر وہ اتنے مشاق شاعر شاید نہ بن پاتے۔

رضا کے کلام کے عروضی پہلو۔ اس کی زبان و بیان کی پاکیزگی اور لطافت۔ معنویت اور بلندیٔ فکر اور دیگر فنکارانہ خصوصیات کے بارے میں ڈاکٹر گیان چند صاحب اور دوسرے معاصرین نے اِس شمارے میں جو لکھا ہے وہ قابلِ غور ہے۔ میں ناقد نہیں ہوں لہٰذا رضا کے

کلام کے کسی مخصوص پہلو کو زیرِ بحث لانا میرا مقصد نہیں نہ میں اِس کا اہل ہی ہوں۔ یہ سب اِس اداریہ کے دائرہ تحریر سے باہر ہی رہے گا۔ مجھے تو بس مسرت اور انبساط کے اُن لمحات کا قرض ادا کرنا ہے جو رضاؔ کی دوستی اور اُن کی تخلیقات کے مطالعہ سے مجھے نصیب ہوتے۔ یہ جذباتی تقاضا ہے۔

رضاؔ اُردو ادب کی اُن چند ممتاز ہستیوں میں سے ہیں جن کی اُونچی اہمیت مسلّم ہے اور رہے گی اُن کی شاعری کا آغاز اُن کے طالب علمی کے زمانے ہی میں ہو گیا تھا۔ اگرچہ وہ اونچی تعلیم کے فارمل حصول کے لئے کسی یونیورسٹی میں نہیں گئے مگر اُن کے ادبی مُطالعہ کی گہرائی یونیورسٹی کے کسی معلم یا ادب کے بڑے سے بڑے شناسا سے کم نہیں مانی جاسکتی۔

رضاؔ اپنے استاد حضرت جوشؔ کا بڑا احترام کرتے ہیں اور اُن کے بے پناہ علم سے بھی بعد متاثر ہیں مگر یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ ان کی ادبی تربیت اور سلیقے شاعرانہ مزاج کا ناظر کوئی ایک واحد شخص ہے متاثر تو وہ غالبؔ چکبستؔ اور اقبالؔ سے بھی ہیں اور فراقؔ سے بھی مگر ان کے ذوقِ سلیم کی تربیت اور منجھے اور پختہ ادبی شعور کی تحریک وہ عظیم لائبریری ہی ہے جو انھوں نے خود اپنی محنتوں سے جٹائی ہے۔ بیس بائیس ہزار یا شاید اس سے بھی زیادہ ادبی شہپاروں کا یہ ذاتی کتب خانہ جو انھیں اپنی ذات سے بھی عزیز ہے ان کا مدرسہ مندر اور کعبہ ہے۔ اس کتب خانے میں ایک گوشہ نشین فقیر کی طرح ہر روز گھنٹوں بیٹھ کر ہی انھوں نے اردو زبان اور اس کے عظیم ادب کی روح کو کھوجا، جانا اور پایا ہے۔ عبادت کا یہ سلسلہ دن کے چوبیس گھنٹوں میں آٹھ گھنٹے تو جاری رہتا ہی ہے۔ یہ ایک دو دن کی بات نہیں، سالوں سے چلا آرہا معمول ہے جو ان کے شب و روز کی مستقل عادت بن چکا ہے۔ یہیں سے انھوں اردو ادبیات کی دنیا کو اس کی بے پناہ وسعت و ہمہ گیری سے روشناس کرا کر اس کا دھیان ان امکانات کی طرف موڑا ہے جن کی دریافت ابھی ضروری ہے۔

اسی کتب خانہ سے انھوں نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے نظریات اور رویوں کا وہ درس پایا ہے جس کے بغیر آدمی کے ادبی اور سماجی رشتوں کی وہ صورت اور اہمیت سامنے نہیں نہیں آتی جس سے واقفیت کے بغیر اس جہالت کا ازالہ ممکن نہیں جو آج بیسویں صدی کے اس سائنسی دور میں بھی اکثر انسانوں کے دماغوں پر قابض ہے۔ وہ کسی مخصوص جماعت، گروہ، تحریک یا آئیڈیالوجی سے وابستہ نہیں مگر ہر اس آئیڈیا اور صداقت کے حامی اور پرستار ہیں جو

انسانی ترقی و بہبود کا متمنی ہے۔ ادب میں کھرے کھوٹے کی پہچان صرف وقت کرتا ہے اور وقت اسی کا ساتھ دیتا ہے جو اس کا ہم سفر ہو اس کے ساتھ چلے اسی سمت میں اور اسی رفتار سے چلے جس کا وقت خود عادی ہے۔ وقت ایک انتھک اور تیز گام گھوڑا ہے جو ہمیشہ مسافت اور نئی نئی راہوں اور منزلوں کی کھوج میں رہتا ہے۔ رضا ہمیشہ وقت کے ساتھ چلے ہیں۔ وقت کے تقاضوں کو سمجھ کر چلے ہیں اور وقت نے بھی اپنے اس ہمراہی کو پہچان لیا ہے جو شخص آغاز سفر سے ہی اچھے اور برے۔ غلط اور درست کھوٹے اور کھرے۔ سچے اور جھوٹے میں تمیز کا شعور لے کر چلا ہو اسے اپنے تحفظ اور ارتقا کے لئے گروہوں اور تحریکوں کی بیساکھیوں کی ضرورت نہیں ہوتی ضرورت ہوتی ہے تو منزل کی جان کاری کی اور ان راہوں اور وسیلوں کی جن کی رہبری میں وہاں پہنچا جا سکتا ہے۔ رضا جانتے ہیں کہ انھیں کہاں پہنچنا ہے اور کن کن مراحل اور پرپیچ پگ ڈنڈیوں سے گذرنا ہے۔

ظاہر ہے کہ اکیلے اور قافلے کے ساتھ اس کی حفاظت میں چلنے میں فرق ہوتا ہی ہے قافلہ ایک منظم قبیلہ ہوتا ہے جس کے افراد ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور بوقت ضرورت ایک دوسرے کے کام آتے ہیں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں اور دوسرے قبیلوں کے افراد کے مقابلے میں اپنوں کو ابھارتے اور اونچا اٹھاتے ہیں۔ اکیلے آدمی کو اس کے برعکس اپنی شخصیت اور اپنے کام کی مناسب شناخت کرانے کے لئے خود یعنی اکیلے ہی ساری جدوجہد کرنی پڑتی ہے جو ظاہر ہے کہ خاصا جوکھوں کا کام ہے۔

جو لوگ رضا کی طرح اکیلے چل سکنے کا دم رکھتے ہوں انھیں اپنے جوہر کی داد خود ان کے اپنے دل و دماغ سے ہی ملتی رہتی ہے وہ دعوتیں بھجوا کر بلائے گئے جانے پہچانے سامعین کی تالیوں کے نہیں دل کی اس دھن کے متلاشی ہوتے ہیں جو صرف انھیں کو سنائی دیتی ہے۔ "اپنے ہی من مسرور و شادماں۔ حق کی رضا میں رضا مند۔ اپنی ذات میں مکمل و متوازن لوگ۔" ایسے لوگ کم ضرور ہوتے ہیں مگر اکیلے نہیں ہوتے۔ ایسے لوگ ہر قوم و ملت، ہر ملک اور زمین، ہر آباد اور کم آباد خطوں میں ہوتے ہیں۔ یہ لوگ خدائے پاک کے چہیتے اور وقت کے چنے ہوئے ہوتے ہیں۔ انھیں کی معرفت قدرت حق اور حقیقت کا درس خدا کے دوسرے بندوں میں بانٹتی ہے ان لوگوں کو زندگی کی متنوع صورتوں کا شعور ہوتا ہے۔ یہ گیت کے سر تال پہچانتے ہیں حسن اور سچائی کی کھوج میں عمروں سرگرداں رہتے ہیں اور جہاں کہیں ان عناصر کی جھلک دیکھ پاتے ہیں

احترام سے رک جاتے ہیں اور اپنی عقیدت کے پھول چڑھا کر ہی آگے بڑھتے ہیں۔ حسن ہمیشہ سے پردہ نشین رہا ہے۔ ننگی اور بے حیا آنکھوں نے کبھی اس کا دیدار نہیں کیا یہ آتما کی گہری نگاہوں ہی سے دیکھا جا سکتا ہے کیونکہ صرف آتما ہی کا تیج مستقل ہوتا ہے اور وہی قدرت کے بھید سمجھ سکتی ہے۔

نیک شفیق اور فرشتہ سیرت لوگ۔ یہ مسکراتے گنگناتے اور خوشیاں بکھیرتے لوگ اختیار و اقتدار کی ہوس سے بے نیاز یہ لوگ جو زندگی کی بے ترتیب گڈمڈ الجھی اور بیمار کیفیات سے یکسر مانوس ہوتے ہیں اور آدمی کے درد کو پہچانتے ہیں۔ انھیں کے صدقے زندگیوں میں رنگ نغمے اور خوشبوئیں پھیلتی ہیں۔ انسانی برادری کے یہ مغنی، مصور اور باغباں جنھیں ہم شاعر ادیب فنکار وغیرہ کے ناموں اور القابوں وغیرہ سے جانتے ہیں تہذیب کے والدین ہوتے ہیں۔ وہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیا دار نہیں بنتے۔ دنیا میں سمٹ یا کھو جانے کی بجائے وہ دنیا اور اس کے درد و رنج و غم کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں۔ اس طرح وہ دنیا کا رنگ لینے کی بجائے خود اسے اپنے رنگ میں رنگ دیتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ دنیا کو اپنے اندر سمیٹ کر ہی وہ اسے اپنا رنگ اور کردار دے سکتے ہیں اس طرح دنیا ان کے اندر سمٹ کر خود بخود خوبصورت ہو جاتی ہے۔ جو لوگ دنیا میں گھل مل جاتے ہیں اور اپنے آپ کو دنیا کی ضرورتوں کے مطابق ڈھال لیتے ہیں دنیا ہی کا انش بن جاتے ہیں۔ مگر وہ لوگ جو دنیا کو اپنے رنگ میں ڈھالنے کی اہلیت رکھتے ہیں دنیا کی اصلی طاقت اور سج سجاوٹ ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ایسے ہی لوگوں نے ہر دور میں تہذیب کے ارتقا میں کندھا دیا ہے اور انھیں کے صدقے آدمی کا کلچر ہر یگ میں قدم دو قدم آگے بڑھا ہے۔

کالی داس گپتا رضا ایسے ہی پیارے پیارے لوگوں میں سے ایک ہیں۔ وہ تقریباً چالیس برسوں سے لکھ رہے ہیں مگر ابھی تک ان کے کل چھ شعری مجموعے ہی منظر عام پر آئے ہیں۔ بہ اعتبار تاریخی ترتیب ان کے نام یہ ہیں۔

۱۔ شعلۂ خاموش (۱۹۶۸ء)، ۲۔ شورش پنہاں (۱۹۷۰ء)، ۳۔ شاخ گل (۱۹۷۴ء)، ۴۔ اجالے (۱۹۷۵ء)، ۵۔ شعور غم (۱۹۸۱ء)، اور ۶۔ شعاع جاوید (۱۹۸۱ء)

شعلۂ خاموش کی چند نظموں کے تراجم رضا کی انگریزی نظموں کی کتاب The silent flame جو ۱۹۷۵ء میں چھپی تھی، میں شامل ہیں۔ اس مجموعہ کی نظمیں اس امر کی گواہ ہیں کہ اگر وہ چاہتے

تو ادبی طور پر انگریزی میں بھی منتقل ہو سکتے تھے مگر ایسا ہوا نہیں جو ظاہر ہے کہ اچھا ہی ہے اس سے انگریزی ادب میں کوئی غیر معمولی اضافہ نہ ہوتا مگر اردو ادب ایک بڑے فن کار کی خدمات سے محروم اور تشنہ رہ جاتا۔

ان کے دو شعری مجموعے جن میں ان کا مارچ ۱۹۸۴ء تک کا وہ کلام شامل ہے جو ان کے پچھلے چھ مجموعوں میں شامل نہیں ہے اس وقت پریس میں ہیں۔ ان میں وہ کلام بھی شامل ہے جس پر ڈاکٹر گیان چند (کالی داس گپتا رضا کی تحریریں) جناب اسلم انصاری (شب نشیں سحر شناس) مرحوم ظفر ادیب (رضا کے جہاں غزل کے بدلتے لہجے) اور جواں فکر شاعر عبداللہ کمال (رضا صاحب کی غزلیہ شاعری۔ نئی صداقتوں کے تناظر میں) نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔

چالیس سال اور سات مجموعوں پر مشتمل رضا کی شاعری کو ڈھنگ سے سمجھنے پرکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہر مجموعہ کلام کو الگ کر کے مضمون کا موضوع بنایا جائے۔ یا پھر اس سارے کلام پر بھرپور عالمانہ نظر ڈالی جائے اور پوری ایمانداری اور ریاضت سے اس کی ادبی اہمیت اور افادیت کا جائزہ لیا جائے۔ اس قسم کا تجزیہ ظاہر ہے کہ گہری ریسرچ کا کام ہے اور اس قسم کا کام اس اداریہ یا کسی ایک مضمون میں سمو دینا ممکن نہیں اگرچہ اس نمبر کی مشمولات میں اس قسم کی کوشش خاصی کامیابی سے کی گئی ہے اور حال ہی میں اردو کے ایک ذہین پروفیسر نے پی ایچ ڈی کے تھیسس کے طور پر رضا کی نگارشات پر تنقید و تحقیق کا یہ اہم کام اپنے ذمہ لے کر رضا کی ادبی اور علمی شناخت اور اردو ادب کے عصری منظر نامے میں ان کے مقام کو متعین کرنے کا بار گراں مکمل کیا ہے۔

ترقی پسند تحریک

رضا کی ذہنی تربیت کا اولین پس منظر اس صدی کے چوتھے دہے کا ادب ہے کیونکہ انھوں نے اسی دور میں لکھنا شروع کیا تھا۔ یہ ترقی پسند تحریک کا دور تھا جس نے اس دہے کی ادبی پود سے اٹھنے والے تقریباً ہر قابل ذکر ادیب کو فکری اور کہیں کہیں عملی طور پر بھی متاثر کیا تھا۔ رضا تسلیم کریں یا نہ کریں زندگی اور فن سے متعلق ان کے نظریات کی تشکیل پر اس دور کا خاصا اثر رہا ہے اور غالباً بدستور رہے گا کیونکہ وہ حال اور اس سے آگے دیکھنے کے ہی عادی نہیں مڑ مڑ کر پیچھے جھانکتے رہنے کے بھی عادی ہیں۔

خیال اور احساس جو تخلیق کا بیج ہیں ماحول سے پیدا ہوتے۔ ماحول سے ہمارا مطلب آس

پاس کی زندگی کے علاوہ فطرت کے وہ مظاہر بھی ہیں جو آدمی اور اس کے معاشرے کی ذہنی تنظیم پر اثرانداز ہوتے رہتے ہیں۔ خیال یا تخیل الہام نہیں یہ خلا سے نہیں اپجتے فنکار کے مادی گرد و پیش سے پیدا ہوتے ہیں۔ دن کی روشنی کی طرح جو سورج سے طلوع ہو کر اسی میں غروب ہو جاتی ہے خیال بھی جس ماحول سے پیدا ہوتا ہے بالآخر اسی میں سما جاتا ہے۔ خیال کو جمال کے جاموں سے سجا کر دوسروں پر آشکارا کرنے کا جذبہ ایک ایسا جذباتی تقاضا ہے جس کو پورا کئے بغیر فنکار کے کردار کی نہ شناخت ممکن ہے نہ تکمیل۔ موضوع اور ہیئت کی شکل و ساخت تخلیق کار کے مغز اور ذہنی فضا کی آئینہ دار ہے جس سے پہلے وہ خود متاثر ہوتا ہے اور پھر اس تاثر کو اپنی آگہی اپنے اسلوب اور اپنی زبان کا لباس پہنا کر دوسروں کو دکھانا بلکہ ان میں بانٹنا چاہتا ہے۔ ایک ماں کی طرح جو اپنی اولاد کو دوسروں کو دکھانے اور ان کے تعریفی جملوں میں اپنی تخلیق کاری کی داد پاتی ہے۔ یہ ایک روحانی عمل ہے جو فنکار کے ذہنی افق پر مستقل طور پر قابض رہتا ہے۔

خیال اور احساس اگر فن کی روح ہیں تو ہیئت ان کا بدن یعنی دونوں ایک دوسرے کے لئے ضروری ہیں۔ جسم کے بغیر روح اپنے وجود کو تسلیم نہیں کرا سکتی باوجودیکہ ہندو ایمان کے مطابق بدن فانی ہے اور آتما امر ہے۔

خیال اور احساس مل کر پہلے فنکار کے شعور، لاشعور اور تحت الشعور کی تہوں سے موضوع کی تلاش کرتے ہیں اور پھر اس کو انھیں کے مشورہ سے ‎‎ ‎ کرنے کا منصوبہ بناتے ہیں۔ اس قسم کا تانا بانا بنے اور جوڑے بغیر وہ نہ ہی قاری کو مسرت سے ہمکنار کرا سکتے ہیں نہ اس سے اپنی اہمیت تسلیم کرا سکتے ہیں۔ ماحول کی تبدیلی خیال اور اظہار دونوں پر اثر انداز ہوتی ہے اس کا اثر موضوع اور فارم پر بھی پڑتا ہے۔ اپنے سماجی سیاسی اور معاشی تناظر کو جذب کئے بغیر فنکار کے لئے اپنی معاشرت کے بنیادی رشتوں کا نہ ہی تعین ممکن ہے نہ شناخت۔

رضا نے اپنی جوانی کے بہترین دور کے پورے بیس سال کینیا (افریقہ) میں گذارے۔ وہ ہندوستان سے اس صدی کے چوتھے دہے کے سنسکار اپنے ساتھ لے کر گئے تھے اور افریقہ میں بھی ان کا ادبی مطالعہ برقرار رہا اور برصغیر کے کتب و رسائل کے ساتھ انھوں نے مقامی اور مغربی ادبیات کا مطالعہ بھی جاری رکھا تھا لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں کہ ترقی پسند تحریک اثرات جو اس زمانے میں ساری دنیا کے دانشوروں کی ایک بڑی اکثریت نے قبول کر لئے تھے ان پر اثر انداز نہ ہوتے۔ وہ افریقہ کی غلامی کا غالباً آخری عہد تھا۔ ان کی مشہور نظم جو انھوں نے افریقی ہیرو اور

کینیا کے پہلے صدر جومو کینیاٹا کی برطانوی جیل سے (طویل مدت کے بعد) رہائی کے بارے میں لکھی تھی، تحریک کے ان مثبت اثرات کی غماز ہے جو رضا کی شخصیت اور شاعری پر آج بھی حکمراں ہیں۔

افریقہ رضا کا وطن نہ سہی مگر افریقی معاشرے کے فرد تو ایک لمبے عرصے تک وہ تھے ہی۔ اس نئے اور بدلے بدلے ماحول کو انھوں نے اپنی پوری قوت مشاہدہ اور پورے جلال سے نظم کیا ہے مگر ہندوستان کے قدیم کلچر پر بھی اپنا اعتقاد اور اعتماد برقرار رکھا۔ آدمی کو اس کے بنیادی سنسکار ماں کے دودھ کے ساتھ ملتے ہیں لہذا انھیں فراموش کر سکنا آسان نہیں ہوتا۔ رضا کا گھرانا پرانے کلچر اور مذہبی اعتقادات کے نور سے منور تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تحریک سے متاثر بیشتر اچھے فنکاروں کی طرح رضا نے بھی اپنے تخلیقی اظہار کے لئے تحریک کے مقرر کئے ہوئے ڈھانچے تو استعمال نہیں کئے مگر اس کے مثبت اثرات مثلاً انسان دوستی، آزادی اور امنِ عالم وغیرہ کو نہ صرف قبول ہی کیا بلکہ اپنا مستقل شعار بنا لیا۔ وہ جانتے تھے کہ جس طرح جسم کی مہمان ہوتے ہوئے بھی روح جسم سے بلند و بالاتر ہے اسی طرح موضوع بھی اظہار سے اونچی شے ہے۔ اس زمانے کے جو ادیب فارم کی تازگی کے پیچھے بے محابا بھاگے تھے ان کا واحد مقصد اپنے موضوع کی فرسودگی کو چھپانا تھا نتیجتاً ان کا ادب ادب نہ رہ کر کھوکھلی نعرے بازی اور بے معنویت کا شکار ہو گیا۔ کیفی اعظمی جیسے سمجھدار اور سلجھے ہوئے شاعر کی وہ تحریریں جو انھوں نے تحریک کے مقدس باپ (سٹالن) کی شان میں لکھی تھیں آج کہیں دکھائی نہیں دیتیں۔ نعرہ نعرہ ہے اور ادب ادب ہے۔ انقلاب زندہ باد، کا نعرہ ہماری جنگ آزادی کے دور کا ایک بڑا ہی پر اثر نعرہ تھا مگر جس آواز نے ہمیں غفلت کی نیند سے جھنجھوڑ کر جگایا وہ ہمارے اس زمانے کا ادب ہی تھا۔ وہ سبرامنیم بھارتی، ٹیگور، قاضی نذرالاسلام، اقبال اور چکبست کا ترانا تھا یا بنکم بابو اور پریم چند کا غفلتوں کی نیند سے جھنجھوڑ کر جگا دینے والا ادب جس میں تعمیر کی روح بھی تھی اور حسن کا جوہر بھی

کیفی اعظمی کا مقدس باپ نہیں آیا۔ کیسے آتا بیچارہ۔ اسے تو اس کے اپنے ہی وطن نے تاریخ کی سنگلاخ زمین میں دفن کر دیا تھا۔

گیتا رضا نے شاعری کی ہے نعرہ بازی کبھی نہیں کی۔ کبھی جوش میں نعرے لگائے بھی تو وہ خالص شاعرانہ نعرے تھے۔ چالیس سال کی ادبی ریاضت اور کل سات شعری مجموعے ظاہر ہے کہ فی زمانہ یہ کوئی ایسا بڑا ادبی ذخیرہ نہیں مگر یہ اچھا بہت اچھا ادب ہے۔

رضا کے دانشورانہ شعور اور شاعری کی اولین تربیت جو پہلے گھر اور پھر اسکول اور وقت کی فضا

میں ہوئی تھی اس صدی کے چوتھے دہے اور پانچویں دہے کے پہلے چند سالوں تک بدستور جاری رہی۔ ۱۹۵۶ء میں تربیت کا دوران کی شادی کے ساتھ ہی ختم ہو گیا اور وہ ہر لحاظ سے ایک پختہ اور مشاق شاعر قرار دیے جانے لگے۔ وہ افریقہ ہی میں تھے جب ان کا پہلا شعری مجموعہ 'شعلہ خاموش' ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا

عورت بیوی ہو یا محبوبہ فنکار کی زندگی میں اس کا اثر و رسوخ جو جسمانی دنیاوی اور روحانی تینوں دھاروں میں بہہ کر آتا ہے فنکار کو اکثر کسی ایک سمت میں بہا کر لے جاتا ہے۔ اس سمت کا رخ دھارے کی وہ رو ہوتی ہے جس کا رسوخ دوسرے دھاروں سے زیادہ ہوتا ہے۔ اکثر شاعروں نے بیوی کو وبال جان کہا ہے کیونکہ شاعر کی زندگی میں داخل ہوتے ہی وہ اس کے اعصاب پر کچھ اس طرح قابض بلکہ سوار ہو جاتی ہے کہ شاعر کو اسی کے روپ میں وہ وارٹ سروپ دکھائی دینے لگتا ہے جس نے ارجن کو عقل و خرد اور دنیاوی رشتوں کے سارے بھید اور رموز آن کی آن میں سمجھا دیے تھے۔

رضا پر بھی غالباً اسی قسم کا اثر ہوا عورت کے اولین لمس اور اس کے بعد کے شب و روز کی رفاقت کا اور انھیں اس عورت کی ذات میں زندگی اور ندرت کے مظاہر کی وہ یونیورسٹی دکھائی دینے لگی جسے پا کر آدمی دنیا میں اپنے مقام سے پوری طرح مطمئن ہو جاتا ہے۔ سوچ کی سلوٹیں دور ہو جاتی ہیں اور جینے میں لطف آنے لگتا ہے۔ سب کے ساتھ شاید ایسا نہ ہوتا ہو مگر جس شریف النفس آدمی کا پہلا (اور غالباً آخری بھی) رومانی encounter اس کی اپنی بیوی ہوتی ہے وہ اس کی ذات کے نور سے شادی کے بعد کچھ اسی طرح چندھیا جاتا ہے کہ اسے اسی کی ذات میں کائنات کے درشن ہونے لگتے ہیں۔ اب اس بیوی پر منحصر ہے کہ وہ اس کی پاسبان و خضر بن کر اسے اپنی چنی ہوئی راہوں پر چلائے یا خود اس میں مدغم ہو کر اس کی طاقت میں اضافہ کرے اور اس کی سوچ کے چشموں کو پیار و وفا کی آنچ سے ابال کر چاروں طرف پھیلا دے تا کہ گھر آنگن سے باہر کی دنیا بھی فیضیاب ہو سکے۔

شادی کے بعد رضا کی شاعری اور سوچ میں نکھار ہی آیا ہے وہ الجھنیں اور الجھاؤ نہیں آئے جو اکثر شاعروں کو گمراہ کر کے ان راہوں میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں جن میں کچھ بھی ایسا نہیں ہوتا جسے حسین کہا جا سکے اور جس سے جینے کی تحریک مل سکے۔

دولت، خاندانی غرور ادبی وقار اور بیوی۔ رضا کو ان میں سے کسی نے بھی گمراہ نہیں کیا

بلکہ سب نے ان کی رہبری ہی کی ہے۔ وہ ایک کٹر آریہ سماجی خاندان کے چشم و چراغ ہیں مگر ان کا مذہب ہندو دھرم تک ہی سمت نہیں بلکہ پوری انسانیت ان کا مذہب ہے۔ گاندھی جی نے ہندو دھرم کو دنیا کے تمام دھرموں اور مذہبی عقیدوں کی پارلیمنٹ قرار دیا ہے۔ رضا اسی پارلیمنٹ کے ایک اہم رکن ہیں۔ کسی ایک دھرم میں پیدا ہو جاتا محض ایک حادثہ ہے مگر کسی ایک مخصوص دھرم کو اپنا کر مکمل یعنی کٹر طور پر اسی کا ہو جانا ایک قطعی دوسری بات ہے۔ یہ وہی فرق ہے جو دوستوں اور رشتہ داروں میں ہوتا ہے رشتہ دار وراثت میں پائی ہوئی آدمی کی وہ مجبوریاں ہیں جن سے چھٹکارا کسی طرح ممکن نہیں مگر دوستی میں چناؤ کا عنصر بڑی اہم چیز ہے۔ مذہب اور دھرم میں جو فرق ہے رضا اسے سمجھتے ہیں لہٰذا وہ دھرماتما زیادہ اور مذہبی کم ہیں۔ ویسے بھی ایک عام آدمی کے مذہبی تصورات اور ایک اہم فنکار کے مذہبی تصور میں فرق ہوتا ہے۔ یہ فرق سماج میں اس کے رتبہ، اس کے طرزِ زندگی یعنی رہن سہن یا کھانے پینے کے سلیقوں سے ہی ظاہر نہیں ہوتا، اس کے ان سنسکاروں میں واضح ہوتا ہے جو اسے خالق سے خاص قسم کے تحفوں کے طور پر ملتے ہیں اور اس کے تخلیقی کلام کی آدھار شلا بنتے ہیں لہٰذا کہا جاتا ہے کہ شاعر کے ایمان اور مذہب کی پہچان اس کا کلام ہے۔ رضا بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ روٹی روزی کے سلسلہ میں وہ کسی بھی نظام یا ادارے سے وابستہ ہو سکتے ہیں مگر اپنی ذات کی شناخت کے لئے وہ جس جزو کو زیادہ اہمیت دیں گے وہ ان کی شاعری یعنی تخلیقی زندگی ہی ہوگی ان کے مذہبی عقائد بھی اسی میں اپنی نشو و نما پائیں گے۔ انسانی تہذیب اور کلچر اور تمام مذاہب کا احترام ہی رضا کا دھرم ہے جو انھیں بین الاقوامی اسٹیج پر ایک یونیورسل مین کے طور پر project کرتا ہے ان کی شاعری خالص ہندوستانی ہوتے ہوئے بھی ان تمام بین الاقوامی قدروں کا احاطہ کرتی ہے جو عصری حالات میں ہمارے تحفظ کے لئے اہم بلکہ ضروری ہیں۔

مشمولات

کالی داس گپتا رضا کی شخصیت یا ان کے فکر و فن پر اس نمبر کے سارے مشمولات اپنی جگہ اہم اور قابلِ غور ہیں۔ ان کی شاعری کی جن فنی تہذیبی فکری اور حیات آفریں خصوصیات کا

تفصیلی ذکر آپ کو ان مشمولات میں جا بجا پڑھنے کو ملے گا ہم اپنی یعنی سیدھی زبان میں مختصراً کچھ اس طرح بیان کر سکتے ہیں :

رضا کے یہاں بلاغت، ندرت، سنجیدگی لطافت اور جدت کی فراوانی ہے اس لئے نئی، انوکھی اور بلیغ تشبیہوں، کنایوں اور استعاروں کی تلاش اور اختراع میں انھیں دقت نہیں ہوتی۔ ہنرمندانہ تمثیل نگاری ان کا خاص وصف ہے۔ شعرائے اردو آجکل اس جانب مناسب توجہ نہیں دیتے اگرچہ جانتا مانتا ہر کوئی ہے کہ یہ عناصر اچھی شاعری کی جان اور روح ہوتے ہیں۔ رضا کے ہاں یہ خاصی نزاکت، گہرائی اور تابناکی سے زندہ اور اجاگر ہیں بیجا محاورہ بندی سے انھوں نے اکثر پرہیز کیا ہے مگر جب اور جہاں کہیں انھوں نے جانے بوجھے محاورات کا استعمال کیا ہے زبان و بیان کی لطافت کو دوبالا کر دیا ہے اور شعر کے سر تال اور نغمگی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ان کے استعارے اور کنائے وضاحت یا فرحت کے محتاج کبھی نہیں ہوتے۔ ان کے یہاں ابہام شیرینی اور تاثر کا باعث تو ہوا ہے، ادراک کی راہ میں حائل نہیں ہوا ہے۔

اردو کے شعرا کو جو واہ واہ اور شہرت، شوخ نگاری اور بے ساختگی کی وجہ سے ملی ہے وہ ان کے کلام کے کسی دوسرے عنصر سے شاید نہیں ملی۔ صدہا اشعار محض اسی ایک وصف کے سہارے زبان زدعام ہیں رضا کی خوش طبعی مشہور نہ سہی مگر جب کبھی وہ سنجیدگی کا لبادہ اتار کر کھلے بندوں مہکے چہکے ہیں ان کی شاعری لذت سے مہک اٹھی ہے۔

رضا ایک پہلو دار شخصیت ہیں۔ ان کے بہت سے اشعار اپنی بے پناہ سادگی اور سنجیدگی کے باوجود کتنی ہی معنوی پرتوں میں بٹے ملتے ہیں۔ پہلی نظر میں ایک نظر آتا ہے دوسری میں دوسرا اور تیسری یعنی نسبتاً گہری نظر میں قطعی الگ مفہوم کے مظہر ہو جاتے ہیں۔ یہ غور طلب شاعری ہے۔ اس کا لطف وہی اہل ذوق و نظر لے سکتے ہیں جن میں سٹیٹمینٹ سے آگے بڑھنے کی صلاحیت ہو یعنی جو ظاہری حسن و نفاست اور لفظی معنوں پر ہی قناعت کے عادی نہ ہوں۔

رضا کی شاعری کھلی فضاؤں کی طرح آزاد ہوتے ہوئے بھی بیشتر فن کے بنیادی دائروں سے باہر نہیں جاتی۔ مگر انھوں نے اپنی شاعری کو مصنوعی حد بندیوں کا شکار بھی نہیں ہونے دیا ہر قسم کی قید و بند سے ماورا رکھا ہے ان کے اختراعی ذہن نے مضامین اسلوب

اور زبان و بیان کے تخلیقی استعمال کے نکتہ نظر سے جس قسم کی نیچرل سادگی وسعت اور لطافت کو منظم کیا ہے وہ کسی معمولی شاعر کے بس کی بات نہ تھی۔ تمام غیر ضروری لکشمن ریکھاؤں کو توڑ کر اپنے تخلیقی کھیل کے میدان کو کچھ ایسے ڈھنگ سے وسیع و عریض کر لیا ہے کہ اس میں ان کے تخیل کی نزاکتیں اور لطافتیں بڑے آزادانہ طور پر کھلواڑ کر سکتی ہیں اس کھلی اور آزاد فضا میں معنیٰ آفرینی اور تہذیبی تکلفات کا ایک جہاں آباد ہو گیا ہے۔ یہ رنگ جوان کا نجی رنگ ہے لفظی تصنع اور فضول اور بیکار قسم کی مبالغہ بیانی اور فرسودہ روایتوں سے میلوں پرے ہے۔

رضا شاعری میں جملوں کی پینترے بازی اور قافیوں کی بھرمار کے قطعی قائل نہیں جملہ اپنے آپ قافیہ دار ہو جائے تو ہو جائے۔ جان بوجھ کر اور کوشش سے وہ اس قسم کی شعبدہ بازی سے ہمیشہ پرہیز کرتے ہیں۔ یہ انداز مشق اور مہارت سے حاصل ہوتا ہے نہ کہ تقلید سے۔ یہ انداز فن کار کے تخیل کی قوت اور اس کی اپنی ذات کا حصہ ہو، بات جب ہی بنتی ہے۔

رضا صاحب ثروت ہوتے ہوئے بھی ایک درویش اور فقیر کی طرح زندگی جیتے ہیں وہ آدمی کے دکھ درد کو سمجھتے اور پہچانتے ہیں۔ ان کے پہلو میں ایک حساس اور دردمند دل ہے۔ ایک ایسا دل جو اپنی فطرت اور جبلت کے اثر سے قیمتی قالینوں پر لیٹے لیٹے بھی کوئی نہ کوئی غم، کسی نہ کسی نوعیت کا کوئی نہ کوئی درد تلاش کر ہی لیتا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی، انقلابِ زمانہ، مصائبِ زندگی، ماتم پرسی، افسردگی اور رنج والم کے مضامین کے اظہار کے لئے جو بیانیہ وہ اختیار کرتے ہیں وہ ہر قسم کی بناوٹ اور توصیف سے مبرا ہوتا ہے۔ واقعیت کی صحیح تصویر کشی ان کے طرز تحریر کا ایک ایسا خاص اور منفرد وصف ہے جس پر وہ جتنا بھی ناز کریں بیجا نہ ہو گا۔ گردشِ ایام نے ہر کسی کو کبھی نہ کبھی ستایا ہے۔ اس کا حصہ رضا کو بھی خاصی مقدار میں ملا ہے۔ نہ ملتا تو وہ خود بڑھ کر اسے دبوچ لیتے۔ دوسروں کا غم اپنا لینا ان کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ وسیع مشرب، فراخ ذہن اور دردمند دل والا یہ شخص غریبوں اور حاجت مندوں کے دکھوں کو اپنے دکھ سمجھتا ہے اور ان کی واجب ضرورت کو پورا کرنا اپنا اخلاقی فرض۔

رضا ہندو ہیں۔ مذہب اور خدا کے تصور کے پورے طور پر قائل ہیں مگر اپنے مذہبی

عقیدوں پر پابند رہتے ہوئے بھی انھوں نے اپنے دنیاوی تعلقات میں مذہب کو کبھی مخل نہیں ہونے دیا۔ خلوص اور خدا کے بندوں سے پیار کو وہ ہر مذہب اور ہر عقیدے پر ترجیح دیتے ہیں اور ہمیشہ اس مسلک پر قائم رہتے ہیں کہ انسانیت کا درس خدائی سے بھی بڑا ہے۔ رضا کا حلقہ احباب بہت مختصر ہے مگر اس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی سب ہی نقطہ نظر کے لوگ شامل ہیں۔ ترقی اور جدت پسند بھی اور کلاسکی روایات کے علمبردار بھی انھوں نے اپنے ذہن کی کھڑکیوں کو ہر طرف سے کھلا اور کشادہ رکھا ہے تاکہ ہر قسم کے خیالات اور افکار کی ہوائیں آزادانہ طور پر اپنا آنا جانا جاری رکھیں۔ ملت اسلامیہ حسینؓ کی یاد میں چودہ سو برس سے چھاتیاں پیٹ پیٹ کر غم کے مظاہرے کر رہی ہے مگر اس دوران میں اس نے کسی دوسرے حسینؓ کو جنم نہیں دیا کیونکہ حسینؓ کی کہانی ماتم ہی کی نہیں احترام کی حقدار ہے۔ یہ شہادت جو حق اور سچائی کے تحفظ کی خاطر ظہور پذیر ہوئی تھی انسان کے لئے ایک ایسا پیغام ہے جس سے ہم آج بھی بے خبر ہیں۔ اسلامی ملت بھی بے خبر ہے۔ اس کے برعکس اس ہندو شناسا نے حسینؓ کے پیغام کو سمجھا اپنایا اور اپنے کردار میں سمویا ہے۔ انھوں نے حسینؓ کی شہادت پر بڑا ہی دردناک اور پر اثر مرثیہ لکھا ہے۔ اجالے اور شعور غم ایسی شعری تخلیقات پر انسانی برادری اور دنیائے اسلام کو بجا طور پر ناز کرنا چاہئے ہمارے عصری منظر نامے میں اس میدان میں رضا کسی مسلمان تخلیق کار سے پیچھے نہیں ان معرکہ خیز تصانیف کے پس منظر میں جو مقدس جذبہ ہے وہ قابل صد رشک ہے۔

مقام مسرت ہے کہ برصغیر کے مشاہیر ادب، اہل ذوق اور ادب نواز طبقوں نے رضا کے شاعرانہ فن کو خاصی قدر کی نظر سے دیکھا ہے اور ان کی تصانیف پر اعلیٰ سے اعلیٰ تبصرے تحریر فرمائے ہیں۔ مگر جہاں ان کا اتنا احترام ہوا حاسدوں کی بے جا نکتہ چینی اور اعتراضات بھی کم نہیں۔ رضا کو اس قسم کا بے بنیاد اور حاسدانہ سلوک ناگوار تو گذرا ہوگا مگر اس سلسلہ میں تلخی کا اظہار انھوں نے کبھی نہیں کیا۔ رضا کو آسکر وائلڈ کے ان جملوں کی صداقت کا علم ہے کہ only the dull and colourless have no enemies

اور کہ Genius is always resented

کسی تحریک یا منظم ادبی گروہ تو ایک طرف انھوں نے اپنی شاعری کو بارسوخ ادبی مجلسوں میں بھی ایک لمبے عرصے تک نہیں چھپوایا۔ شعر کو کتاب میں منتقل کر کے

محفوظ تو کیا جاسکتا ہے۔ ادب کے گلی کوچوں تک نہیں پہنچایا جاسکتا۔ کتابوں اور تبصروں کے سہارے وہ شہرت نہیں ملتی جو رسائل کے ذریعہ ملتی ہے کیونکہ اس طرح رسائل کے منتظمین بھی اپنے ادبی مضامین کے طرف دار ہو جاتے ہیں۔ کم از کم وہ جن میں دم خم ہوتا ہے اور جو سمجھتے ہیں کہ وہ کوئی چیز ناپے تولے بغیر نہیں چھاپتے۔ اگر کوئی نا اہل ان کے جریدوں میں چھپی تحریروں پر ناواجب قسم کی تنقید کرتا تو ان کا اخلاقی فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس کا منہ توڑ جواب دیں۔ رضا اپنی تحقیق میں تو قاضی عبدالودود اور مالک رام جیسے مدیرین تک پہنچے ہیں مگر اپنی شعری تخلیقات کو بارسوخ حلقوں تک نہیں پہنچا سکے، یہ کھوج کا عہد نہیں۔ آج کس کے پاس وقت ہے کہ وہ خود دریافت کرے کہ اسے کیا پڑھنا ہے آج تو بتانا ہی پڑتا ہے کہ فلاں چیز خوبصورت ہے اور اسے اِس یا اُس نظر سے دیکھنا چاہئے۔ اس دور میں اپنے آپ کو منوانا یا اپنی شناخت کرانا تو درکنار اپنے نام کی پہچان کے لئے بھی ادب کے ان قافلہ سالاروں کی خوشنودی کی ضرورت ہوتی ہے جو ادبی اور تعلیمی اداروں کے نگہبان ہیں۔

آدمی کے قد کی پہچان چھوٹے بڑے دوسرے قد والوں کے مقابل کھڑے ہونے سے ہی ہوتی ہے۔ گھر بیٹھ کر اپنے آپ کو شیشے میں دیکھتے رہنے سے خود اپنی پہچان تو ممکن ہے مگر باہر کھلے میں نکلے بغیر دوسروں کی نظروں میں آنے یا کھٹکنے کی بات نہیں بنتی۔ رضا مشاعروں کے شاعر بننا نہیں چاہتے۔ انھیں شعر کہنا تو آتا ہے مگر اسٹیج پر میراثیوں کی طرح لہک چہک کر سنانا انھیں پسند نہیں باوجودیکہ انھوں نے موسیقی کی تعلیم خاصی باقاعدگی سے لے رکھی ہے اور شعر کے ساتھ ساتھ گلے سے بھی سُر تال کا چمتکار دکھانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ وہ نیروبی کے شعری ہنگاموں میں برابر شامل رہے اور سوز و گداز سے پڑھنے والے شعرا کے مقابلے میں بھی خاصے مقبول رہے۔ رضا نے اردو شعر و ادب کی قندیل ہندوستان سے ہزاروں میل دور مشرقی افریقہ کے غیر مانوس، اجنبی بلکہ غیر موافق ماحول میں جس تابناکی سے فروزاں رکھی وہ کوئی معمولی کارنامہ نہ تھا۔ انھوں نے ثابت کر دیا تھا کہ غیر ملکی آسمانوں کے نیچے اپنی زبان کی خصوصیات اور اس کا حسن اور بھی دوبالا ہو جاتے ہیں۔ ان کے افریقی دور کا کلام سادہ، صاف ستھرا پاکیزہ بے عیب ہے اور ہر لحاظ سے پختہ اور جامع ہے۔ ان کے وطن لوٹ آنے کے بعد کی شاعری بھی اس دور کی شاعری کی طرح ہی نغموں اور خوشبوؤں سے لدی

بھری ہے اور اس میں اپنے آپ وہ نئے اور زندہ رجحان بھی آگئے جو آج کی شاعری کی پہچان ہیں۔ اس میں کتنی اور کیسی کیسی روشنیاں، کیسے کیسے صحت مند نظریے۔ دلوں کو لبھانے اور گدگدانے والی امیدیں اور غفلتوں سے جھنجھوڑ کر جگا دینے والے نقاروں کی بے ساختہ گونجیں موج در موج بہ چلی آتی ہیں۔ رضا نے عشق کیا ہے۔ پرجوش سرگرم مجنونانہ عشق دھیما شرمیلا اور زیر لب عشق بھی۔ وطن سے، آدمیت سے، اپنے فن سے، اردو زبان وادب سے اور اپنی پیاری رفیقۂ حیات اور فرشتوں ایسے اپنے دو بچوں سے۔ انھوں نے اردو شاعری کی ہر صنفِ سخن اور اس کے تقاضوں کو پہچانا ہے رنگ و بو سے لبریز مہکتے مہکاتے اور گنگناتے اس دور کے ان کے اشعار ایک ایسی ریاضت اور ہنرمندی کے آئینہ دار ہیں جن پر کوئی بھی شاعر ناز کرسکتا ہے۔

رضا نمبر کو ہم نے دو حصوں میں بانٹ دیا ہے پہلا حصہ ان کے تخلیقی یعنی شعری کارناموں سے متعلق ہے اور دوسرا ان کی تحقیقی سرگرمیوں سے۔

ہندوستان لوٹنے کے بعد رضا نے نجانے کس مصلحت کی بنا پر اپنے ادبی رتھ کو تحقیق کے میدانِ کارزار میں لا کھڑا کیا اور اپنی پہلی اور اصلی محبوبہ یعنی شاعری کو تقریباً یا ایک حد تک فراموش کر دیا۔ یہ اچھا ہوا یا برا یہ تو ظاہر ہے وقت ہی بتائے گا مگر یہ واقعی ایک حقیقت ہے کہ اس میدان میں اترنے کے بعد انھوں نے جتنی دوڑیں جیتی ہیں ان پر کوئی بھی رتھ بان ناز کرسکتا ہے۔ پچھلے دس پندرہ سالوں سے وہ کتابیں پڑھنے جمع کرنے اور جانچنے پرکھنے میں مشغول ہیں اور اس طویل عرصہ کے ہر دن کے جاگتے اوقات کا تقریباً نصف اسی نئے شوق کی نذر کر رہے ہیں۔ حسرت ہوتی ہے کہ یہ وہی شخص ہے جسے کسی زمانے میں نثر لکھتے ہو کوفت ہوتی تھی اور شاعری ماں کے دودھ، درخت کے پتوں اور ہوا کی آزاد سرسراہٹوں کی طرح اپنے آپ دل و دماغ سے پھوٹی پڑتی تھی؟

تحقیق

ان کے تحقیقی کارناموں کا ذکر اس نمبر کے بیشتر مشمولات میں خاصی تفصیل سے آگیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اب ہم جو کہیں گے وہ ایک حد تک انھیں تاثرات کو دہرانا ہوگا۔

عرصہ ہوا محمد حسین آزاد (مرحوم) نے آبِ حیات کے دیباچہ میں تحریر فرمایا تھا۔

میرے دوستو! زندگی کے معنی کھانا پینا، چلنا پھرنا، سو رہنا یا منہ سے بولے جانا نہیں۔ زندگی کے معنی یہ ہیں کہ صفاتِ خاص کے ساتھ نام کو شہرتِ عام ہو اور اسے بقائے دوام ملے۔ اب انصاف کرو کہ کیا یہ تھوڑے افسوس کا موقع ہے کہ ہمارے بزرگ خوبیاں بہم پہنچائیں۔ انھیں بقائے دوام کے سامان ہاتھ آئیں اور اس پر نام کی زندگی سے محروم رہیں۔ بزرگ بھی وہ بزرگ کہ جن کی کوششوں سے ہماری ملکی اور کتابی زبان کا لفظ اور حرف حرف گراں بار احسان ہو ان کے عالموں کا اس گمنامی کے ساتھ صفحۂ ہستی سے مٹنا بڑے حیف کی بات ہے۔ جس مرنے پر ان کے اہل وعیال روئے وہ مرنا نہ تھا۔ مرنا حقیقت میں ان باتوں کا مٹنا ہے جس سے ان کے کمال مرجائیں گے، اور یہ مرنا حقیقت میں سخت غم ناک حادثہ ہے۔

جیسا کہ میں نے تناظر کے کسی شمارے میں لکھا تھا غالبیات کے اندھیرے گوشوں یا عروضی اور فن شعر کی الجھا دینے والی تاریکیوں اور اردو کے پرانے نامور مگر نسبتاً گمنام ادبا اور شعرا کو حلقۂ شام دسحر سے نکال کر بقا بخشنے کی جو سعی پچھلے پندرہ سالوں میں کالی داس گپتا نے کی ہے وہ ہمارے ادب کی عصری تصویر کا ایک جگمگاتا باب ہے۔ انھوں نے مرحوم آزاد کے کام کو جس لگن محنت اور کاوش سے آگے بڑھایا ہے اس کا احترام ہم اردو والوں پر یکساں لازم ہے۔

یہ شمارہ برصغیر کے ادبی تعاون کی ایک تاریخی دستاویز ہے۔ رضا کے فکر وفن کے کتنے ہی پہلوؤں کو لے کر ہمارے معاونین نے جس طرح بلا جھجک و رعایت بحث کی ہے اس سے تناظر کے قارئین پر اس فنکار کا ہر وہ پہلو، اگرچہ پوری طرح نہیں مگر کافی حد تک سامنے آگیا ہے۔

ہم پر آشکار ہے کہ اردو زبان وادب کے لیے رضا کی بے لوث اور قلندرانہ خدمات کا بھگتان کسی ایک نمبر سے خواہ وہ کتنا ہی ضخیم کیوں نہ ہو، ممکن نہیں۔ کچھ نہ کچھ کمی تو ظاہر ہے کہ ہر صورت رہے گی ہی

ہم کہہ سکتے ہیں کہ تناظر کا یہ خصوصی شمارہ کالی داس گپتا رضا کے فکر وفن اور ان کی گوناگوں

شخصیت کا ایک ایسا مجسمہ پیش کرتا ہے جسے کسی عظیم بت گر نے اپنے ماڈل کی اناٹمی کی پوری جانکاری اور کھوج کے علاوہ اس کی آتما میں جھانک کر اور اس کے پیکر کے جزئیات کو سمجھ کر تراشا ہو۔

ٹی، ایس، ایلیٹ (T.S. Eliot) فرماتے ہیں:

From time to time, it is desirable that some critic shall appear to review the past of our literature and set the poems and poets in a new order

یہ کام اردو کے ہر معتبر محقق اور مجلّے پر فرض ہے۔

اپنی آپ بیتی میں رضا صاحب فرماتے ہیں۔

"ہم میں اجتماعی کام کرنے کی صلاحیت بہت کم ہے اس لیے میرا خیال ہے کہ آنیوالے پچاس برسوں تک بھی اردو کی عظمت انفرادی طور پر کئے ہوئے کام ہی کے سہارے باقی رہیگی اجتماعی کام کے سہارے نہیں"

آزاد اور ایلیٹ کا اشارہ ماضی پرستی کی طرف نہیں ہے بلکہ ایک اجالی مانی حقیقت کی طرف ہے ـــــ اردو کے سیمینار اور ورکشاپیں ان لوگوں کے لیے تو کار آمد ہیں جن میں تقریر سے جادو جگانے کا جوہر ہوتا ہے یا مشاعروں کے مداریوں اور میراثیوں کی طرح کہک کہک کر سامعین کو مرعوب کرنے کا ہنر جانتے ہیں، مگر وقت گواہ ہے کہ ان جمگھٹوں سے وقتی طور پر کچھ ادیبوں کا بھلا تو اکثر ہوا ہے مگر ادب کی زلف کبھی نہیں سنوری۔ تقریر کا اثر چند گھنٹے رہتا ہے۔ تحریر میں صدیوں تک زندہ رہنے کی صلاحیت ہے۔

بلراج ورما

عرش ملسیانی

کالی داس گپتا رضاؔ

اصل میں نام کالی داس ان کا
اور مشہور ہیں رضاؔ گپتا
دل سے شاعر، قلم سے ساہوکار
یہ زمانہ عجب ہے ندرت بار
میرے والد کے نامور شاگرد
خطِ توثیق ان کے گرداگرد
گل بداماں و خاک پائے جوشؔ
عاشقِ اردو و فدائے جوشؔ
حق پہ قربان، صدق کے طالب
رُوحِ چکبستؔ، راحتِ غالبؔ
رنگِ تحقیق، آبِ تیغِ تیز
شعر گوئی میں شاعرِ گلریز
عرشؔ کی ہے دعا تہہِ دل سے
اے رضاؔ، تو گہر اگلتا رہے
سب نگاہوں میں ہو تری توقیر
اے بشر دوست! اے ادیبِ شہیر

(از کلیاتِ عرش ملسیانی ص ۶۴۲
مرتبہ مالک رام)

ساوتری گپتا
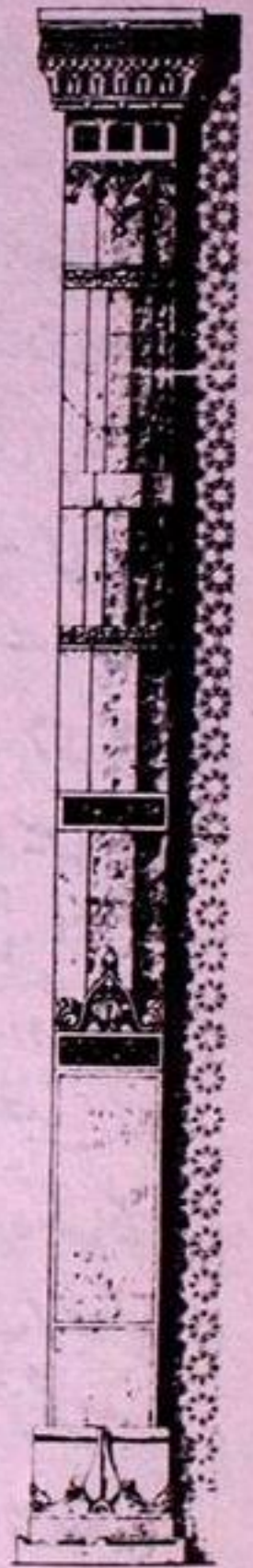
میرے پتی

میں نے شادی سے پہلے گپتا جی کو نہیں دیکھا تھا۔ ہماری شادی وہی پرانے ریتی رواج سے ہوئی تھی۔ جیسے آج سے پچیس تیس سال پہلے ہوا کرتی تھی۔ شادی ہمارے ماتا پتا نے طے کی۔ مجھے صرف گپتا جی کا فوٹو دکھایا گیا تھا۔ جیسے ایک ہندو لڑکی اپنے بڑوں کی پسند کو اپنی پسند سمجھتی ہے، ویسا ہی ہوا۔ میرے من میں امنگ بہت تھی گپتا جی کو دیکھنے کی۔ آخر وہ دن ۱۴ اگست ۱۹۵۶ء کو آ ہی گیا۔ شادی دھوم دھام سے ہوئی اور ۱۵ اگست کی دوپہر میری ڈولی اروشا سے نیروبی روانہ ہوئی۔ گپتا جی ایک بڑی کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ کچھ وقفے کے بعد گپتا جی نے کچھ کہا مجھے ان کی آواز جو میں نے پہلے کبھی نہ سنی تھی بہت پسند آئی کیا مردانہ آواز تھی، سن کر بہت خوش ہوئی۔ باتیں بہت ہوئیں، مگر میں کچھ کم بول رہی تھی، لمبے گھونگھٹ میں کیا بولتی۔ ایک دو گھنٹے بعد راستہ میں ایک چھوٹی سی دکان دکھائی دی۔ شام کا وقت تھا۔ بتیاں جل گئی تھیں۔ گپتا جی کار سے باہر اترے۔ میں نے چپکے سے ان کو دیکھا۔ نوجوان اور بھرا ہوا چہرہ، لمبا قد، سڈول بدن۔ دیکھتے ہی میں نے اپنے ماں باپ کی پسند کی داد دی اور اپنے آپ کو بھاگیہ شالی سمجھا۔ ایسے ہی تھوڑی باتیں کرتے ہم رات کے ۹ بجے نیروبی پہونچے گھر میں زور شور سے سواگت ہوا۔ جب میں نے گپتا جی کو قریب سے دیکھا تو اپنے سے ہر لحاظ سے بڑا آدمی پایا۔ ان کے بول چال کا ڈھنگ تمام نوجوانوں سے الگ تھا۔ جیسے ہمیشہ آہستہ بولنا، کسی کے سامنے مجھے غصے سے نہ بولنا۔ اگر میری وجہ سے غصہ ہو بھی تو آرام سے بیٹھ کر سب طے کر لینا۔ میں نے ان کے سامنے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ ان کے سامنے جھوٹ

بولنا بہت مشکل ہے۔ میں نے ان کو بہت اچھا آدمی پایا ہے۔ ان کی خصوصیات ہیں:
بھائی چارگی سے لوگوں سے پیش آنا۔ اپنے سے بڑوں کی عزت کرنا، اپنے گھر والوں اور پڑوسیوں
سے گہرا تعلق رکھنا۔ لڑائی جھگڑا تو ان سے کوسوں دور رہتا ہے۔

۱۶/اگست کو ان کے دوستوں میں سے ایک جو شاعر تھے، ملنے آئے۔ ان کا نام تھا آغا
(چند سال بعد ہی کینسر سے ان کا انتقال ہوگیا)۔ گپتا جی کو اپنے دوستوں سے بہت لگاؤ
رہتا ہے۔ (آغا صاحب کے انتقال سے ان کے دل پر گہری چوٹ پہنچی تھی)۔ ہاں تو اس
دن معلوم ہوا کہ گپتا جی شاعر بلکہ استاد شاعر ہیں۔ میری شادی پر سہرے تو بہت سے
پڑھے گئے تھے مگر چوں کہ وہ ان کے دوستوں اور شاگردوں نے پڑھے تھے، انھوں نے ظاہر
ہے کہ خود تو کچھ پڑھا نہ ہوگا۔ لہذا معلوم نہ ہو سکا تھا کہ یہ خود بھی شاعر ہیں۔ خیر گھنٹوں باتیں
ہوئیں۔ آغا صاحب انھیں بہت پسند کرتے تھے اِن کو بھی اور اِن کی شاعری کو بھی۔ پھر
کئی جگہ دعوتیں اور محفلیں ہوئیں۔ گویا میں ایک دوسری ہی دنیا میں آگئی۔

تھوڑے دنوں بعد ہم ممباسہ چلے گئے جو نیروبی سے تقریباً تین سو میل دور سمندر کے
کنارے خاصی مشہور بندرگاہ ہے۔ وہاں ہم دو سال رہے۔ ہمارے اکلوتے بیٹے ومل کا
جنم اسی دوران (۱۶/اگست، ۱۹۵۷ء) میرے میکے اروشا میں ہوا۔ ممباسہ جا کر معلوم ہوا کہ گپتا
جی ایک اچھے سنگیت کار بھی ہیں اور ستار بجانے میں تو ماہر ہیں۔ گھر میں بہت سے ساز
بھی رکھے ہوئے تھے۔ روز محفلیں ہوتی رہتیں۔ لوگ دور دور سے ان کو سننے آتے تھے۔
وہاں کا سب سے اچھا طبلچی ان کے ساتھ سنگت کرتا تھا۔ ستار سے ہمارے گھر کا ہال گونج
اٹھتا۔ لوگوں کی واہ واہ سے چار چاند لگ جاتے۔ پروگرام کے بیچ بیچ تھوڑے تھوڑے وقفہ
بعد چائے ناشتہ ہونا ضروری ہوتا۔ چاہے کتنے لوگ ہوں۔ انھوں نے شاستریہ سنگیت
ودھی پوروک چودہ پندرہ سال سیکھا تھا۔ اس لیے کوئی بھی بڑا آرٹسٹ جو انڈیا سے وہاں
جاتا ہمارے یہاں ضرور آتا۔

گپتا جی کو پہلے ہی سے کھلانے پلانے کا بہت شوق تھا۔ ان کو اس میں خوب مزا آتا
ہے۔ آج بھی اگر کوئی گھر میں آجائے تو اسے کچھ کھلائیں پلائیں گے ضرور۔ پلانے میں شراب
البتہ شامل نہیں۔ اس معمولی خاطر تواضع میں وہ بالکل امیر غریب کا فرق نہیں رکھتے۔
طبیعت میں فقیری کی حد تک سادگی ہے۔ دکھاوے سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ بلکہ دکھاوے

کی زندگی سے ازحد نفرت کرتے ہیں۔ پروپگینڈہ ان کی طبیعت سے میل نہیں کھاتا۔ گھر میں سادہ رہنا، سادہ کھانا، غریبوں کے بھلے کا سوچنا ان کی فطرت ہے۔ اگر کوئی ان کو برا بھلا بھی کہہ جائے تو اس کا بدلہ نہیں لیتے۔ نقصان تو دشمن کو بھی نہیں پہونچاتے۔ ہمیشہ یہی کہہ کر چپ ہو جاتے ہیں کہ ایک دن اسے خود ہی احساس ہو جائے گا۔ لوگ مدد کے لیے آتے ہیں تو ان کی مدد ضرور کی جاتی ہے۔ چاہے مالی ہو چاہے مانسک۔ گپتا جی نے کبھی یہ نہیں چاہا کہ مدد کا کوئی بدلہ لیا جائے۔ غریبوں کو اگر کبھی قرض دیا ہے تو سود نہیں لیا۔ کسی غریب کو یہ احساس بھی نہیں ہونے دیتے کہ وہ غریب ہے۔ زیادہ سے زیادہ اسے اوپر اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ غریبوں پر رحم کرنا تو جیسے ان کی زندگی کا مقصد ہے گھر کا کام چاہے لیٹ (LATE) ہو جائے مگر پہلے اسی کام کو کریں گے جس کے لیے کہہ رکھا ہے۔ گپتا جی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ وعدہ اور ٹائم کے بہت پکّے ہیں۔ جو بات ایک بار کہہ دی، کہہ دی۔ اگر کسی کا کوئی کام نہیں ہو سکتا تو پہلے ہی کہہ دیتے ہیں۔ اسے پیچھے پیچھے نہیں دوڑاتے۔ انھیں ٹال مٹول سے سخت نفرت ہے۔ جن لوگوں کو واسطہ پڑا ہے، انہوں نے محسوس کیا ہوگا کہ ان کے کہنے اور کرنے میں کبھی کوئی فرق نہیں ہوتا۔ میں اس لیے نہیں کہتی کہ یہ میرے شوہر ہیں بلکہ یہ سچی بات ہے، جس کا بار بار دہرانا بے سود ہے۔ کیوں کہ آج کل ایسے لوگ بہت کم ملتے ہیں۔ یہ کئی بار کہا کرتے ہیں اگر زندگی اچھی ہے اور پرایکا کی زندگی ہے تو ایسے آدمی کی موت سہانی ہی ہوگی۔ لیکن اگر زندگی بھیانک بھی رہی ہو تو بھی کام ایسے کرنے چاہئیں کہ کم سے کم موت ضرور سہانی بن جائے اس پھول کی طرح جو مہک بکھیرتا ہے اور مرجھانے کی فکر نہیں کرتا۔

ہمارے یہاں نیروبی میں ایک بہت پرانا افریقی نوکر رہتا تھا۔ اس کا نام کیوگو تھا، جو میرو قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ سب اسے میرو کہہ کر ہی پکارا کرتے تھے۔ وہ شادی سے پہلے کی ان کی زندگی کی باتیں سنایا کرتا تھا۔ وہ ان سے بہت پیار کرتا تھا۔ اس کی باتوں سے مجھے یقین ہو گیا کہ گپتا جی جو آج بہت پیسے والے ہیں، اس وقت بھی جب ان کا بھرپور جوانی کا زمانہ تھا، دل کے، کام کے اور چال چلن کے اتنے ہی اچھے تھے جتنے کہ آج ہیں۔ یہ بات میں بھی مانتی ہوں کہ ہر کوئی ان سے خوش نہیں رہ سکتا۔ کم سے کم دو قسم کے لوگ ان سے خوش نہیں ہوتے ایک تو وہ جو ان سے جھوٹ کہلوانا چاہتے ہیں دوسرے وہ جن کی

ضرورت یہ پوری نہیں کرسکتے۔ مگر میں نے کبھی کسی کو انھیں چور، اسمگلر، بے ایمان دھوکے باز، جھوٹا یا لالچی کہتے ہوئے نہیں سنا۔ میرا خیال ہے چال چلن کا اس سے بڑا سرٹیفکیٹ (CERTIEICATE) اور کیا ہو سکتا ہے۔

نیروبی میں ہمارے گھر میں ہر مہینے ایک بہت صاف ستھری مشاعرے کی محفل ہوا کرتی تھی۔ دو مرتبہ مرحوم ماہر القادری صاحب نے بھی اس میں حصہ لیا تھا۔ گنے چنے پچاس ساٹھ شاعر اور سننے والے ہوتے تھے۔ ماہر صاحب نے وہاں ان کی اور ان محفلوں کی بہت تعریف کی تھی۔ ہمارا نوکر میروان محفلوں کو بہت شوق سے سنا کرتا اگرچہ اس کی سمجھ میں یہ زبان نہ آتی تھی۔ محفل کے دوسرے دن صبح سویرے میرے پاس آتا اور کہتا بوآنا کاڑی دبوآنا، یعنی جناب اور کالی داس کو کاڑی) سے اچھا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ اس کا پوئم بول رہا ہوتا۔ پھر وہ سب شاعروں کی باری باری نقل اتارتا اور بہت خوش ہوتا۔ اس وقت اس کے سننے والے میں اور میرے دونوں بچے وِمل اور ریتا ہوتے۔ وِمل اور ریتا مشاعرے کے لیے رات رات بھر جاگتے رہتے تھے اور انٹرول میں کھلانے پلانے میں میرا ہاتھ بٹاتے تھے۔ بہت اچھے تھے وہ دن۔

گپتا جی نے مجھ سے اور میرے بچوں سے بھی زیادہ انڈیا اور اردو سے پیار کیا ہے۔ کہا کرتے تھے کہ جی چاہتا ہے کہ انڈیا جاکر اردو کی بہت سی خدمت کروں۔ میں کہتی کہ کیا یہاں کم خدمت کی ہے۔ جنگل میں منگل کر دیا ہے۔ اتنے لوگوں کو اردو سکھائی۔ اتنے شاعر بنا دیئے۔ مشاعروں کی دھوم دھام گجراتیوں تک میں پھیل گئی ہے۔ مگر یہ نہ مانتے۔ آخر جنوری ۷۰ء میں انڈیا آہی گئے۔ یہاں آکر پہلے تو بہت جھنجھلائے۔ پھر بزنس اور اردو میں مست ہوگئے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ بزنس میں کم اور اردو میں زیادہ۔ ان کی اردو خدمت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے مگر جب میں سنتی ہوں کہ لوگ انھیں جن سنگھی اور آریہ سماجی کہتے ہیں تو بڑا دکھ ہوتا ہے۔ جن سنگھی ہونا تو راج نیتک بات ہوئی مگر کسی ہندو کا آریہ سماجی ہونا کہاں کا پاپ ہے۔ اگر گپتا جی آریہ سماجی ہیں تو میں ایسے آریہ سماجی پر لاکھوں نا آریہ سماجیوں کو قربان کرسکتی ہوں۔ ایک بات جو میں کہے بغیر نہیں رہ سکتی وہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو کی جو خدمت کی ہے وہ کم لوگوں نے کی ہوگی۔ مگر کیا انھوں نے اردو کی روٹی کھائی؟ کیا انھوں نے اردو کی انجمن کا پردھان یا ممبر بننا چاہا؟ اگر یہ مجھے اجازت دیں تو

میں بتاؤں کہ اردو کے کن کن دعوے داروں نے ان سے کون کون سی مدد اور کب کب لی۔ چوں کہ یہ سب کچھ میرے سامنے گھر میں ہوتا ہے اس لیے مجھ سے اچھا کوئی دوسرا اس کا رازداں نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی کہوں گی کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہو سکتیں، انھیں جو اچھے آدمی ملے اور ان کی تعداد بھی خاصی ہے۔ یہ تو نہیں مانتے مگر میں دل سے تسلیم کرتی ہوں کہ اگر وہ اپنی شہرت کا ذرا بھی خیال کرتے تو اردو دنیا میں انگلیوں پر گنے جانے والوں میں شمار کیے جاتے۔ ہاں اتنا میں ضرور کہتی ہوں کہ اگر انھوں نے اپنی شہرت خود نہیں چاہی تو لوگوں نے انھیں پرکھنے میں دیر کیوں کی۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک بیوی کے جذباتی الفاظ ہیں، چلو ایسا ہی سہی، آخر کچھ قربانی میری بھی تو ہے۔ جب ہم انڈیا میں نئے نئے آئے تو کچھ لوگ ہمیں جاننے لگے۔ کچھ لوگوں نے مشورہ دیا کہ جھوٹے انعام حاصل کر لینے چاہییں۔ مگر ایک درویش صفت انسان، سچائی پر ساری زندگی چلنے والا آدمی، اتنا بڑا فریب کرنے پر کیسے تیار ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس عزم صادق کا نتیجہ یہ نکلا کہ دن بہ دن ان کا نام پھیلنے لگا اور بفضل خدا ان کی بہت سی کتابوں پر انعام بھی ملا۔ مگر کیا کتابوں کے یہ انعام ان کے کام کی برابری کر سکتے ہیں۔؟ گپتا جی محنت اور کام پر یقین رکھتے ہیں۔ ہمارا گھر ان ہی کے اصول وضوابط پر چلتا ہے۔

میرے لیے ان کے ساتھ نباہ کرنے میں سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ یہ اکثر اوقات اپنے کتب خانے میں منہمک رہتے ہیں۔ کبھی کبھی کسی مسئلے میں اتنے مستغرق ہو جاتے ہیں کہ کئی کئی دن ان سے بات کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ اسی انتظار میں رہتی ہوں کہ ان کا مضمون ختم ہو تو کچھ بات کروں۔ کبھی کبھی تو غصے میں کہہ بیٹھتی ہوں کہ غالب تو مر گیا مگر ہمارے لیے مصیبت کھڑی کر گیا سچ تو یہ ہے کہ اگر شوہر شاعر یا محقق ہو تو بیوی بھی محقق ہو۔

کچھ لوگ ایسا نہیں مانتے شاید یہ بھی ٹھیک ہے۔ پھر بھی اتنی زندہ دلی میں نے کم لوگوں میں دیکھی ہے۔ پہلے نوکروں کے کھانے سے متعلق معلوم کریں گے دا اپنے اور ان کے کھانے میں فرق نہیں رکھیں گے، گھر میں صفائی، اور ترتیب رکھنا ان کی خاص عادت ہے۔ اس میں کوتاہی ہو تو ان کا غصہ ہو جانا لازمی ہے۔ میں، بچے اور نوکر ان کی عادت کو جان گئے ہیں۔ اس لیے غصہ کی نوبت نہیں آتی۔ ہم گھر میں پنجابی بولتے ہیں۔ انھیں

اردو، ہندی، انگریزی تو ایک طرف پنجابی میں بھی زبان کی غلطی بہت ناگوار گزرتی ہے فوراً درستی کی طرف دھیان دلاتے ہیں اور اپنی غلطی بھی فوراً مان لیتے ہیں اور اس کی تصحیح کر لیتے ہیں۔ ہمارے گھر میں اردو، ہندی، انگریزی تینوں زبانوں کے ڈھیر سارے رسالوں کے علاوہ روزانہ اخبار بھی آتے ہیں۔ سب سے پہلے صبح کو یہی انھیں پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ ایک اور بات سنیئے۔ وقت کے پابند ہونے کے باعث اگر کوئی کام وقت پر نہ ہو یا کوئی وعدہ کر کے وقت پر نہ آئے تو انھیں صرف غصہ ہی نہیں آتا بلکہ آئندہ کے لیے کوشش رہتی ہے کہ ایسے لوگوں سے کم ملا جائے۔ ویسے عام حالات میں بہت نارمل رہتے ہیں۔

آئیے اب واپس ممباسہ چلیں۔ ہم ممباسہ سے نیروبی کو ۱۹۵۸ء میں لوٹ آئے یہاں آکر انھوں نے اپنی نئی زندگی شروع کی۔ نیروبی کا ماحول ممباسہ سے اس لیے جدا تھا کہ وہاں رات رات بھر سنگیت کی محفلیں نہیں ہوتی تھیں۔ یہاں نیروبی میں سنگیت کی جگہ شاعری نے لے لی اور مشاعروں کی دھوم دھام شروع ہوئی۔ دو سال پہلے جن شاعروں کو یہ جہاں چھوڑ گئے تھے وہ وہیں تھے۔ دو چار بار ممباسہ سے نیروبی خاص طور پر بلوائے ضرور گئے تھے۔ مگر ممباسہ شہر کا ماحول شاعری سے کوسوں دور تھا ان کو پیسوں کی تو کوئی فکر نہ تھی۔ امیر گھرانے سے تعلق رکھتے تھے مگر اپنی سادگی سے مجبور تھے۔ اور اپنی کمائی کی روٹی کھانا ہی پسند کرتے تھے۔ افریقہ میں انھوں نے خوب محنت کی۔ کسی کے ہاتھوں کی طرف نہیں دیکھا۔ طبیعت کے بے حد محنتی اور ایمان دار ہیں اس لیے بہت پیسہ کمایا ہے۔ ہر روز صبح سات بجے کام پر شروع شروع میں پیدل جاتے تھے اور کھانے پینے کی زیادہ فکر نہ کرتے تھے۔ ویسے یوں تو حال اب بھی یہی ہے۔ فرق صرف یہ آیا ہے کہ پہلے پیسہ کمانے پر زیادہ محنت کرتے تھے اور تحقیق و تالیف پر کم وقت خرچ کرتے تھے اب تحقیق میں بہت زیادہ وقت گزارتے ہیں اور کام میں بہت کم۔

اس وقت جب کہ میں پونا کے فلیٹ میں بیٹھی ہوں اور یہ بے تکا، بالکل اناڑی سا مضمون لکھ رہی ہوں، گیتا جی اپنے بستر پر لیٹے ہوئے بڑی دل چسپی اور گہرائی سے ایک موٹی سی کتاب پڑھ رہے ہیں۔

میں نے پوچھا

"یہ کیا پڑھا جا رہا ہے ؟"

مجھے چھیڑنے کے لیے بولے۔ "غالب کی فارسی کوتیا کا سنگرہ (کلیاتِ غالب فارسی)"

میں نے کہا "آج لوگ اردو بھی نہیں پڑھ پاتے اور آپ فارسی پڑھ رہے ہیں؟"

بولے "ہم اگلے وقتوں کے لوگ ہیں"

(ہندی سے)

ڈاکٹر گیان چند

سرمایہ دارِ ادب

کالی داس گپتا رضا نہ صرف بہت بڑے سرمایہ دار ہیں بلکہ اسی مرتبے کے سرمایہ دار تحقیق بھی ہیں ان کی شخصیت کے سب سے ممتاز یہی دو گوشے ہیں کہ وہ بہت بڑے سیٹھ ہیں اور قدیم اُردو ادب اور قدیم علوم میں گہری نظر رکھتے ہیں۔ انہیں سیٹھ کہا جائے تو لجاتے ہیں لیکن وہ شرمایا کریں جب بمبئی میں رہتے ہیں جہاں چائے کی دکان کا مالک بھی سیٹھ کہلاتا ہے، جب انہیں ثروت دنیوی سے بڑا ابھرا ملا ہے، جب ذات کے ویش ہیں، جو ساہوکارے کا کام کرتے ہیں تو انہیں سیٹھ کہلانا ہی پڑے گا۔

میں انہیں تقریباً دس سال سے جانتا ہوں۔ اس دوران میں ان سے پانچ لمبی ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ ایک بار بمبئی میں، دو بار الٰہ آباد میں، ایک بار پونا میں اور آخری بار حیدر آباد میں فروری ۱۹۸۴ء میں۔ ہر بار یہ ملاقات کئی کئی دن کے عرصے کو محیط رہی۔ اس طرح ظاہراً گو ان سے زندگی میں محض پانچ بار ملا ہوں لیکن ایسا لگتا ہے جیسے ایک دوسرے کو جگ جگ سے جانتے ہیں اور خلوص کے رشتے نے ایک دوسرے کو قریب کر رکھا ہے۔ حضرت جامی نے کہا ہے کہ عشق گفتار سے بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ پاکستان کے کئی ادیب میرے گہرے دوست ہیں لیکن میں نے انہیں کبھی دیکھا ہی نہیں۔ کالی داس گپتا رضا صاحب سے بھی میں اس وقت قریب ہو چکا تھا جب انہیں دیکھا نہ تھا۔ وہ ۱۹۷۰ء ہی میں افریقہ کے ریگ زار سے ہندوستان واپس آئے۔ کالے افریقہ نے اردو کو دو ادیب دیے ہیں، جوگیندر پال اور کالی داس گپتا۔ ۷۰ء سے پہلے انہیں جاننے کا سوال ہی نہیں تھا۔

ان سے غائبانہ ملاقات بڑے عجیب طریقے سے ہوئی۔ میں نے مالک رام کے رسالہ تحریر ۱۹۶۷ء شمارہ ۳، ۴ میں رباعی کے اوزان پر ایک مضمون لکھا تھا۔ ۱۹۷۰ء میں ہندوستان واپس آنے پر انھوں نے یہ مضمون دیکھا ہوگا۔ رسالہ کتاب لکھنؤ کے کسی شمارے میں انھوں نے اس پر ایک معترضانہ تبصرہ لکھا۔ مضمون کا لہجہ قدرے درشت تھا۔ اس وقت میں نے ان کا نام نہیں سنا تھا۔ داس گپتا

بنگالیوں کے نام کے آخر میں ہوتا ہے۔ پھر یہ کالی کے داس تھے۔ قوی گمان ہوا کہ کوئی بنگالی ہوں گے۔ لیکن ساتھ ہی مسلمانوں کے نام جیسا تخلص رضا مضمون سے اندازہ ہوا کہ یہ صاحب عروض سے کماحقہٗ واقف ہیں لیکن ان کا نقطۂ نظر کلاسکی ہے اور انہیں کتابی عروض میں کسی قسم کی ترمیم واصلاح کی تاب نہیں۔ میں نے ان کے مضمون کا کوئی جواب نہیں دیا چپکا ہو کر بیٹھ رہا۔ سوچا کہ جب کبھی مضمون کو مجموعے میں شائع کروں گا جب اس میں کچھ ترمیم کر لوں گا۔

برسوں بعد کالی داس صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ ڈاکٹر صفدر آہ ان کے جوابی مضمون کا مسودہ لے گئے تھے تاکہ کسی رسالے کو بھیج دیں۔ آں مرحوم مجھ سے پرخاش رکھتے تھے۔ انھوں نے جی بھر کر مضمون میں تحریف کی، لہجہ سخت بنایا، درشت کلامی کی اور مضمون رسالہ کو بھیج دیا۔ گویا کالی داس صاحب کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلائی۔

میں شتر کینہ نہیں ہوں۔ یہ تو بہرحال ایک علمی اختلاف تھا۔ یاد نہیں آرہا کہ کب اور کس طرح کالی داس صاحب سے مراسلت شروع ہو گئی۔ میں اکتوبر ۱۹۷۶ء میں جموں یونیورسٹی کو تیاگ کر پریاگ الٰہ آباد چلا آیا تھا۔ کالی داس گپتا کہتے ہیں کہ مراسلت جموں ہی شروع ہو گئی تھی۔ میں پرانی رنجش کو بالکل محو کیے ہوئے تھا۔ وہ شکر رنجی خلوص کی گرم جوشی میں بدل گئی۔ مراسلت کا سلسلہ جاری ہوا اور یہ مراسلت علمی وادبی انداز ہی کی ہوتی تھی۔ ۱۹۷۷ء میں انھوں نے خواہش کی کہ میں ان کی زیر طبع کتاب متعلقاتِ غالب پر پیش لفظ لکھ دوں۔ میں نے تامّل کیا اور دوسرے موزوں تر نام سجھائے لیکن وہ نہ مانے۔ ان کے اصرار کے سامنے مجھے حامی بھرنی پڑی۔ میں نے مسودہ منگا لیا۔ اس وقت تک میں یہ نہ جانتا تھا کہ ملک کے کس حصّے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی کیا عمر ہے۔ اور بمبئی کیا دھندا کرتے ہیں۔ ان کی کتابوں کی مدد سے میں ان کے بارے میں جو کچھ معلوم کر سکا وہ مختصر تعارف میں لکھ دیا۔ اس وقت ان کی کتاب مکتوباتِ جوش ملسیانی بنام رضا میرے سامنے نہ تھی۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ عاریتاً لے گئے تھے۔ یہ کتاب سامنے ہوتی تو میں بہت کچھ جان سکتا تھا۔ چند ماہ بعد اکتوبر ۱۹۷۷ء میں بمبئی میں ان سے ملنا ہوا تو مزید معلومات کی روشنی میں اس تعارف میں ترمیم کر کے نومبر ۱۹۷۷ء کی تاریخ ڈال دی۔

اب تو انہیں اردو کا بچہ بچہ جانتا ہے، ان کے حالات سے واقف ہے پھر بھی میں دو ایک باتیں لکھے دیتا ہوں۔ وہ ۱۹۲۵ء میں ضلع جالندھر کے ایک گاؤں مکند پور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں وہ افریقہ گئے جہاں ۲۱ سال قیام کیا۔ اگست ۱۹۵۶ء میں انھوں نے ایک پنجابی لڑکی سے شادی

کر لی۔ یہ صاحبہ افریقہ ہی میں پیدا ہوئی تھیں۔ ہندوستان کبھی نہ دیکھا تھا۔ دونوں نے محض ایک بیٹے اور ایک بیٹی پر اکتفا کی۔ ۱۹۶۳ء میں یہ پورا خاندان مختصر عرصے کے لیے ہندوستان کی سیاحت پر آیا۔ تبھی بیوی بچوں نے پہلی بار ہندوستان دیکھا۔ ۱۹۷۰ء میں یہ مستقلاً ہندوستان آگئے اور بمبئی میں بس گئے۔ یہاں ان کے دو ذریعۂ معاش ہیں۔ پہلا کام روپیہ ادھار دینے کا ہے۔ یعنی وہ فائی نین شیئر یا بینکر ہیں۔ دوسرے ساہوکار دوسروں سے کم شرح پر روپیہ ادھار لیتے ہیں اور اہلِ حاجت کو زیادہ شرحِ سود پر ادھار دیتے ہیں۔ لیکن کالی داس نرالی وضع کے سرمایہ کار ہیں۔ وہ ادھار لیتے نہیں دیتے ہی ہیں۔ انہیں ادھار لینے کی ضرورت نہیں کیونکہ انہیں زرِ نقد سے غیر معمولی بہرہ ملا ہے۔ ان کا دوسرا کام شہری جائداد کی تجارت کا ہے۔ وہ رہائشی مکان اور فلیٹ خریدتے ہیں اور کچھ عرصے کے بعد انہیں منافع سے فروخت کر دیتے ہیں۔ بعض سودے میں انہیں دو چار لاکھ کا گھاٹا ہو جاتا ہے۔ تو دوسرے میں پانسات لاکھ کا فائدہ۔ متعلقاتِ غالب پر میرے تعارف کو دیکھنے کے بعد مالک رام صاحب نے رضا صاحب سے کہا تھا کہ "اپنے تموّل اور کتب خانے کے اشتہار کی کیا ضرورت تھی؟" لیکن کالی داس نے مجھ سے کب کہا تھا کہ میں ان چیزوں کا ڈھنڈورا پیٹوں۔ انہیں تو یک گونہ الجھن ہی ہوئی ہو گی لیکن میرا قلم ان کے ہاتھ میں کب تھا؟ مجھ سے کون اپنی تعریف لکھا سکتا ہے؟ ان کا تموّل ان کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ہے۔ اس کی طرف سے کیونکر صرفِ نظر کیا جا سکتا ہے۔ اُردو کے اہلِ قلم میں مالی حیثیت سے کوئی بھی ان کے لگ بھگ نہیں پہنچتا۔ میں بمبئی گیا تو ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی نے کہا کہ گپتا صاحب کروڑپتی ہیں۔ میں نے دل میں سوچا کہ مبالغہ ہے اور واقعی یہ مبالغہ تھا کیونکہ گپتا صاحب اس منصب کے آس پاس ہیں، واقعی اس پر ہاتھ نہیں پہنچا سکے۔

اکتوبر ۷۷ء میں میں اپنی اہلیہ کے ساتھ بمبئی گیا، اپنی بھتیجی کے یہاں قیام کیا۔ کالی داس صاحب سے فون پر بات کی یعنی انہیں دیکھنے سے پہلے ان کی آواز سنی۔ انھوں نے ہمیں بمبئی گھمانے کے لیے کسی ڈرائیور کے ہاتھ اپنی کار بھیج دی۔ کالی داس صاحب مذہبی عقیدے کے لحاظ سے آریہ سماجی رہے ہیں لیکن الٰہ آباد کے ایک مہاتما 'سچا بابا' سے بھی عقیدت رکھتے ہیں۔ اب تو پچھلے سال ستمبر ۸۳ء میں سچا بابا کا انتقال ہو گیا۔ سچا بابا کے ایک خلیفہ مہاتما رشی کیش میں رہتے ہیں۔ گپتا صاحب الٰہ آباد جاتے تو ہزاروں کا سامان خورد و نوش وغیرہ آشرم کو ہدیہ دے دیتے تھے۔ رشی کیش کے مہاتما کے آشرم کی تعمیر میں انھوں نے بہت بڑی مدد کی۔ ہاں تو یہ ڈرائیور جو مشرقی یو۔پی کا رہنے والا تھا، گپتا صاحب

کا ملازم نہ تھا بلکہ یہ بھی سچے بابا کا عقیدت مند تھا۔ گپتا صاحب نے بغیر کسی ضمانت کے اسے بہت بڑی رقم قرض دی اور اس سے بالکل سود نہیں لیا جو برسوں کی مدت میں ہزاروں تک پہنچ جاتا۔

ڈرائیور کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ میں گپتا صاحب سے آج تک نہیں ملا۔ اس نے ان کی انسان دوستی، نیکی اور سخاوت کی اتنی تعریف کی کہ یہ معلوم ہوا کہ زندگی میں آج پہلی بار انسان سے ملنا ہوگا۔ بمبئی کے ایک حصّے کی سیاحت (دوسرے کی موٹر اور پٹرول ہو تو مفت کی سیر میں بہت مزا آتا ہے) کے بعد کالی داس صاحب کے یہاں جانا ہوا اور ان سے پہلی ملاقات ہوئی۔ ڈرائیور نے ان کی سخاوت وسیر چشمی کے علاوہ ان کی سادگیِ مزاج کی بھی تعریف کی تھی۔ اسے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اتنے بڑے اثاثے اور اتنی بڑی آمد کے باوصف ان کا رہن سہن بالائی متوسط طبقے جیسا ہے۔ اگر سرمایہ داروں جیسا ہوتا تو میں ان کے پاس نہ پھٹکتا۔ مجھے ان سے کوئی جلبِ زر تو کرنا نہ تھا۔ ان کے مزاج کی سمائی کی داد دینی پڑتی ہے کہ اتنے مال وزر کے باوجود وہ نمود امارت نہیں کرتے۔ انہیں پیسے کا نشہ نہیں۔

نمود کیا وہ تو اس کے دوسرے سرے پر معتکف ہیں۔ ان کے پاس صرف ایک امبیسڈر کار تھی جس پر کوئی ڈرائیور نہ تھا۔ وہ خود ہی اسے ہانکتے تھے۔ ۷۷ء میں یہ کار زیادہ براق نہیں تھی بلکہ نیچے کے اطراف کی چادر کسی قدر خمیدہ یا شکستہ سی تھی۔ حیرت ہوئی کہ یہ کیسے رئیس ابن رئیس ہیں جو اس پھٹیچر دیسی کار پر قناعت کیے ہوئے ہیں۔ ان جیسے سرمایہ دار کے پاس دو تین موٹریں ہونی چاہئیں تھیں جن میں ایک دو جہاز نما بدیسی دلبر ہوتیں۔ میں نے جھجکتے ہوئے کہا کہ اس موٹر کو نکال کر دوسری خرید لیجیے۔ انھوں نے سادگی سے کہا، "بمبئی کی ہوا میں سمندر کے پانی کا کھار ہے جو موٹر کی باہری چادر کو کھا جاتا ہے، میں اس کا جسم بدلوا لوں گا۔"

میرا دل بیٹھ گیا کہ یہ کیسے سیٹھ ہیں جو کار کی پیوند کاری پر اکتفا کریں گے۔ قالب بدلنے کے بعد ایک اور مسئلہ کھڑا ہو سکتا ہے۔ ایک فلسفی کے جوتے کا تلا پھٹ گیا اس نے پورا تلا نیا لگوا لیا۔ کچھ عرصے کے بعد اوپری حصّہ بوسیدہ ہو کر خندۂ دنداں نما کرنے لگا۔ اس نے اوپر کا حصہ بھی بدلوا لیا۔ اب وہ فلسفی اسی مسئلے پر مراقبہ کرنے لگا کہ یہ میرا پرانا جوتا ہے یا نیا۔ کالی داس صاحب کو بھی کہیں انہیں مراحل و مسائل سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ فسانۂ عجائب کے مطالعے کی وجہ سے میں انسان اور بندر کے تبدیلِ قالب سے واقف تھا لیکن موٹر کے تبدیلِ قالب کی کبھی نہ سنی تھی۔ میں نے دریافت کیا کہ اس کا کیا نسخہ ہے۔ انھوں نے بتایا کہ قالب کے گدے نکلوا کر رنگ کرا لیتے ہیں۔ میں نے

من میں سوچا کہ یہ تو کھودا پہاڑ نکلا چوہا والی بات ہوئی یہ کھڑاگ' یہ لیپا پوتی تو ہم بھی کراتے رہتے ہیں اسے قالب کی اصلاح کہنا چاہیئے نہ کہ قالب کی تبدیلی۔ جون ۸۰ء میں پونا میں انھوں نے اطلاع دی کہ اب موٹر کی حالت پہلے سے بہتر ہے۔ میں نے عرض کیا کہ معمولی آدمی بھی چند سال میں کار بدل لیتے ہیں۔ آپ کیوں نہیں بدلتے۔ کہنے لگے "معمولی آدمی ہی اپنی نمود کرتے ہیں۔ میں بہت مرسڈیز وغیرہ رکھ چکا ہوں۔ اب جی بھر گیا ہے لیکن آپ کا اصرار ہے تو بدل لوں گا۔ معلوم نہیں اب ۸۴ء میں کیا حال ہے وہی بڑھیا ساتھ لگی ہے کہ اسے بدل لیا۔ اب انھوں نے ڈرائیور رکھ لیا ہے۔ بمبئی کی بھیڑ بھاڑ میں کہاں تک خود کو تھکاتے۔

ان کے گھر میں نوکروں کی ریل پیل نہیں۔ شاید صرف ایک کُل وقتی ملازم یا ملازمہ ہے۔ حد یہ ہے کہ کچھ سال پہلے تک کھانا ان کی اہلیہ محترمہ پکاتی تھیں۔ اب غالباً کوئی ملازم یا ملازمہ اس بوجھ کو اپنے ذمے لیے ہے۔ مجھے دولتِ دنیا سے بہرہ ملا ہوتا تو میں گھر میں غسل خانے تک بھی پیدل چل کر نہ جاتا۔ وہ چاکر اٹھا کر یا بدستِ دگرے دست بہ دستِ دگرے کے انداز میں لے جایا کرتے۔ لیکن ع

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر، کا اصول ہے۔ انھیں دیکھ کر بالکل یہی معلوم ہوا جیسے میری سطح سے کچھ اوپر کا کوئی خوش حال گھرانا ہو۔ پھر کیا وہ جزورس ہیں؟ نہیں ایسی بات نہیں۔ وہ صرف سادگی پسند ہیں۔ میں ظ۔ انصاری کو پوسٹ کارڈ لکھتا ہوں تو وہ جز بز ہوتے ہیں۔ طنز کرتے ہیں اور اسے شاید میرے بنیے پن پر محمول کرتے ہیں۔ کالی داس بھی کئی بار پوسٹ کارڈ لکھتے ہیں۔ وہ بھی میرے ہم قوم ہیں۔ لیکن یہ بخل کے سبب نہیں کیونکہ متعدد موقعوں پر ان کی شاہ خرچی اس کا بطلان کرتی ہے۔ وہ دوسرے شہروں میں جاتے ہیں تو کبھی کسی کے گھر مہمان نہیں ہوتے، کئی سو روپے روز کے ہوٹلوں میں قیام کرتے ہیں مثلاً آج سے پانچ سال پہلے الٰہ آباد سے پٹنہ گئے تو وہاں تقریباً چار سو روپے روزانہ کرایے کے ہوٹل میں قیام کیا اور بے دریغ کئی دن تک ٹھہرے۔

مجھے ان کی سخاوت اور دریا دلی کی متعدد مثالیں معلوم ہیں۔ ان کے کردار کو صحیح روشنی میں پیش کرنے کے لیے قارئین کو ان کی جھلک دکھانی ضروری ہے۔ ان کا افشا انھیں سخت ناپسند ہوگا اور مضمون کی اشاعت کے بعد وہ مجھ سے آزردہ بھی ہوں گے۔ میں کوئی ان کی اجازت اور اطلاع سے تو لکھ نہیں رہا ہوں اس لیے تصویر کے سبھی خدوخال پیش کروں گا۔

الٰہ آباد اور رشی کیش کے آشرموں پر جس طرح وہ ہزاروں روپے انڈیلا کیے اس کا پیچھے ذکر کیا جا چکا ہے۔ اردو کے ایک نئے اہلِ قلم کو کئی سال تک سات آٹھ سو روپے ماہانہ دے کر اسے کسی قابل

کر دیا۔ ایک مسلمان بیوہ کو کئی سال سے چار پانسو روپے ماہانہ دے رہے ہیں۔ معلوم نہیں کتنوں کو حج کے مصارف دے چکے۔ افریقہ اور ہندوستان میں متعدد لڑکیوں کی شادی کے اخراجات ادا کر دیئے اور ان میں کئی مسلمان لڑکیاں بھی ہیں۔ ایک نوجوان کو بغیر کسی شناخت اور وسیلے کے مکان خرید دیا اور کاروبار سے لگا دیا۔ ایک بے روزگار انجینئر کو ٹی وی کی دکان کھلوا دی۔ اور اپنی کاروباری صلاحیت اور تجربے سے اس طرح اسے ایک فلیٹ کا مالک کرا دیا کہ آخر کار اس سے سب روپیہ واپس مل گیا یعنی اس پر ان کا روپیہ خرچ بھی نہ ہوا اور وہ صاحبِ جائداد بھی ہو گیا۔ ایک رسالے کے خاص نمبر پر تقریباً چالیس ہزار روپیہ لگا دیا جب کہ رسالے میں یہ کہیں ظاہر نہیں کیا گیا کہ اس کے مالیے کی کفایت گپتا صاحب نے کی ہے۔ آخر کار انھوں نے اس کے تمام شمارے بیچ کر اپنا روپیہ نکال لیا۔

ان کی کاروباری سوجھ بوجھ انہیں اردو کتب کی اشاعت میں مدد دیتی ہے۔ آج کل کسی ناشر سے کتاب شائع کرائیے تو وہ رائلٹی نہیں دیتا۔ خود شائع کیجیے تو کتابیں فروخت نہیں ہوتیں۔ گپتا صاحب نے اپنی تمام کتابیں خود شائع کیں اور سب کو بیچ کر ان کی لاگت نکال لی۔ کہتے ہیں کوئی ۲۲ ہزار جلدیں چھاپی ہوں گی۔ تین چار ہزار تحفۃً گئیں۔ بقیہ ۱۸ ہزار فروخت کر لیں۔ ہم میں سے کون ایسا کر سکتا ہے؟

اردو کے ادیب نیز یونیورسٹیوں کے اساتذہ ان سے مالی امداد کی درخواست کرتے رہتے ہیں اور وہ بشرطِ استحقاق ان کی مقصد براری کرتے ہیں۔ جموں یونیورسٹی کے ڈاکٹر شیام لال کالڑا عابد پیشاوری کو اپنا تحقیقی مقالہ چھپوانے کا مسئلہ درپیش ہے۔ ان کے ممتحنین ڈاکٹر محمود الٰہی اور ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ انھوں نے اب تک جتنے تحقیقی مقالے دیکھے ہیں ان میں یہ بہترین تھا۔ میں نے گپتا صاحب سے کہا کہ کالڑا کے مقالے کی اشاعت التوا میں پڑی ہے کیونکہ دس ہزار کا صرفہ ہے اور ان صاحب کا حال ہے ع چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں؟ موصوف نے کہا کہ میں چھپوا دیتا ہوں بشرطیکہ طباعت کی ذمہ داری وہ خود لیں۔ میں نے کالڑا صاحب کو لکھا۔ وہ ایک ٹیڑھے، بلکہ بہا ٹیڑھے آدمی ہیں۔ وہ کیوں کسی کا احسان لینے کو تیار ہوتے۔

کالی داس صاحب کی دریا دلی کا سیلاب کتابوں کی خریداری میں ظاہر ہوتا ہے۔ مسعود حسن رضوی صاحب کے بعد ذاتی کتب خانوں میں ان کا کتب خانہ سب سے زیادہ بیش بہا ہے۔ غالب کی زندگی کے تمام نسخوں کے علاوہ ان کے پاس غالب کی بعض تحریریں بھی ہیں۔ چنانچہ غالب کے دو غیر مطبوعہ

فارسی قطعات انھوں نے اپنی کتاب متعلقاتِ غالب میں شائع کیے۔ ۱۹۶۹ء میں بمبئی کے کسی نادر فروش نے غالبیات کے ایک غیر معمولی ذخیرے کی فروخت کا اعلان کیا تھا۔ قیمت تقریباً تیس ہزار روپے تھی۔ یہ گنج بادآورد رضا صاحب کا مقسوم ہو گیا کیونکہ کسی دوسرے کو اس کی استطاعت کہاں ہو سکتی تھی۔ اب کیفیت یہ ہے کہ دنیا میں غالبیات کا جو ذخیرہ ان کے پاس ہے اور کہیں نہ ہو گا۔ پندرہ سو کے قریب کتابیں اور رسالوں کے غالب نمبر تو ہوں گے ہی۔ غالب کے زندگی کے تمام نسخوں کے علاوہ ان کے پاس غالب کی بعض دستی تحریریں بھی ہیں۔ تین سال قبل تک ان کے ذخیرے میں دیوانِ غالب کا پہلا ایڈیشن نہ تھا گو اس کی فوٹو کاپی تھی۔ اتفاق سے الٰہ آباد میں اس کی تین جلدیں تھیں۔ ایک صاحب سے میں نے کئی سو روپے میں انہیں ایک کاپی دلادی۔ بعد میں وہ مجھے لکھا کیے کہ بقیہ دونوں جلدیں بھی منہ مانگے داموں میں خرید لیجیے لیکن میں ایک حد سے آگے روپیہ پھنکوانے کے لیے آمادہ نہ ہوا۔ ایک صاحب کے کتب خانے سے انھوں نے محض چند سو کتابیں ۲۵ ہزار روپیوں میں خرید لیں۔ مولا دے اور بندہ لے۔ مثل مشہور ہے کہ بنیا مکان بنانے اور اولاد کی شادی کرنے میں دیوانہ ہو جاتا ہے یعنی اپنی روایتی کنجوسی کو بھول کر بے دریغ روپیہ خرچ کرتا ہے۔ کالی داس گپتا نے (جو میری طرح بنیے ہیں) دیوانگی میں تیسری رشتق کا اضافہ کر دیا ہے کہ نادر کتابیں خریدتے وقت وہ دیوانہ ہو جاتے ہیں۔ اور سو روپے کی چیز ہزار روپے میں خرید لیتے ہیں۔ لیکن اس جنون کو شوق فضول نہیں کہہ سکتے۔

افسردہ مرثیہ گو کے مخطوطات کی دو جلدیں جن میں کچھ کلام مصنف کے قلم سے بھی ہے۔ شاید تیرہ سو روپیوں میں خریدی ہیں۔ ہر قسم کے موضوع کی نادر کتابیں، قلمی نیز مطبوعہ ان کے پاس بکثرت ہیں۔ قدیم اردو ادب کے کسی بھی پہلو پر تحقیق کیجیے، ان کے کتب خانے سے استفادہ کیے بغیر بات نہ بنے گی۔ ان کے کتب خانے میں رسائل کے ذخیرے کے علاوہ بارہ ہزار کے قریب کتابیں ہیں۔ قدیم ڈراموں کا بہت اچھا ذخیرہ ہے۔ بمبئی میں مکانیت کی بڑی قلت ہے جو کتب خانے کے پھیلاؤ میں مانع آتی ہے اس لیے وہ نادر کتابوں پر زیادہ توجہ کرتے ہیں۔ کتابیں میرے پاس بھی کئی ہزار ہیں لیکن ان میں سے اکثر و بیشتر مال غنیمت ہیں۔ انہیں قیمتاً نہیں خریدا۔ افراد اور اداروں سے ہدیتہً ملی ہیں یا یوپی اردو اکیڈمی کی انعامی کمیٹی کی رکنیت کا صدقہ ہیں۔ اس لیے ان سب کو پڑھنے کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ ہاں بہ وقت ضرورت ان سے استفادہ کر لیا جاتا ہے رضا صاحب کے یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ان کے کتب خانے میں جتنی کتابیں ہیں

انھوں نے وہ سب پڑھی ہیں اور طالب علم کی طرح ان کے نوٹس لیئے ہیں۔ وہ تحقیقی یادداشتوں
کی فائل مرتب کر لیتے ہیں۔ ان کے پاس ایک جز وقتی حیدرآبادی منشی ہے۔ جو ان کی یادداشتوں
اور مسودوں کو صاف کرتا ہے۔ چنانچہ ان کی یادداشتوں کی کم از کم ڈیڑھ سو فائلیں ہیں۔ ایک
بار میں نے اقبال کے ایک پہلو پر کچھ لکھنے کی سوچی۔ انھوں نے اپنی اقبال کی فائل میرے پاس
بھیج دی۔ اس میں متعدد کتابوں سے (جن میں بیشتر پاکستانی مطبوعات تھیں) یادداشتیں لکھی
ہوئی تھیں اور صاف ستھرے کشادہ طریقے سے، جو ظاہر ہے، منشی جی کا کیا ہوا مبیّضہ ہوگا۔

ان کا مطالعہ اردو ادب تک محدود نہیں۔ انھوں نے سنسکرت کے ادبی اور مذہبی ادب
کو تفصیل سے پڑھا ہے۔ کالی داس کو تو الف سے یے تک مطالعہ کر چکے ہیں۔ اہل اردو میں ایسی
علمی لگن کم ملتی ہے۔

ادب کے علاوہ ان کا ایک اور مطالعہ خصوصی آخری دور کی تاریخ ہند کا ہے۔ وہ
مراٹھا تاریخ پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ جنوبی ہند کی وجے نگر سلطنت کے بارے میں ایک کتاب
لکھنا چاہتے ہیں لیکن اردو میں اس کی مانگ کہاں۔

وہ شاعروں اور فلم والوں سے دور رہنا چاہتے ہیں کیوں کہ یہ لوگ جانتے ہیں کہ ان
کے پاس ڈھیر سا زر خالص ہے اس لیے وہ ذیل کے شعر کا ورد کرتے ہوئے ان کی طرف بڑھتے ہیں

اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی   گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی

کئی عمائدینِ فلم نے انہیں مدعو کیا لیکن یہ ان کے یہاں نہیں گئے۔ جو چھوٹے موٹے شاعران
کے دفتر میں ان سے ملنے کے لیے آتے ہیں یہ انہیں باہر سے باہر ہی کچھ روپیہ دے کر رخصت
کر دیتے ہیں۔

بمبئی کی مجلسی زندگی؟ ارے توبہ! آدمی کے پاس روپے کی بہتات ہو تو کھانے پینے میں
کتنا لگ سکتا ہے۔ باغ و بہار کے پہلے درویش کو اس کے مصاحبوں نے مشورہ دیا تھا۔
"اس جوانی کے عالم میں کیفنکی کی شراب یا گلِ گلاب کھنچوایئے، نازنین معشوقوں کو بلوا کر ان کے
ساتھ پیجیئے اور عیش کیجیے۔"

آدمی کے پاس زیادہ روپیہ ہو تو ہر پھر کر مندرجہ بالا شغل ہی یہ آ رہتا ہے اور حالی کے
مصرع کو حرزِ جان بنا لیتا ہے ع ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں۔ لیکن اس برگشتۂ تحقیق
کے پاس ان مشاغل کے لیے نہ وقت ہے نہ دماغ۔ جس ذہن میں علم کی کھٹک لگی رہتی ہے وہاں

ہوس کاری کے لیے گنجائش کہاں ۔ افسوس کہ میری طرح انھوں نے شراب نہیں چکھی۔ وہ یک گونہ گوشہ نشینی اختیار نہ کرلیں۔ تو لکھنا پڑھنا کیوں کر ممکن ہو۔ وہ اپنے کاروباری دفتر میں صرف تین گھنٹے کے لیے جاتے ہیں اور لکھنے پڑھنے میں تقریباً دس گھنٹے روزانہ لگاتے ہیں۔ اردو کے اساتذہ بھی اردو کے مطالعہ کو اتنا وقت نہیں دیتے۔

رضا صاحب کو بچپن میں پامسٹری (ہاتھ دیکھنا) کا شوق تھا لیکن اسے انھوں نے ترک کردیا۔ دوسرا شوق شطرنج کھیلنے کا تھا۔ ان کے استاد جوش ملیانی شطرنج کے اچھے کھلاڑی تھے۔ رضا صاحب پہلی بار ان سے کھیلے تو انہیں مات دے دی۔ افریقہ جاکر انھوں نے اس شغل کو بھی تیاگ دیا کیوں کہ یہ کھیل جس قدر فراغت اور انہماک چاہتا ہے وہ کام دھندے والا آدمی کہاں سے لاسکتا ہے۔ ان کا تیسرا شغل موسیقی کا ہے لکھتے ہیں۔

"اس وقت میں نے تین رستے اختیار کیے۔ ایک زمین کی دیکھ بھال کا، اسپورٹس (فٹبال ہاکی وغیرہ) اور تیسرا شاستریہ سنگیت۔ ایک بڑا کمرہ سنگیت کے لیے وقف ہوگیا۔ بعد دوپہر دو ڈھائی بجے سے شام کے پانچ چھ بجے تک وہ سنگیت فضاؤں میں بکھرتا کہ تان سین کی روح بیدار ہو جاتی۔ رفتہ رفتہ علاقے کے اچھے اچھے کلاکار اس محفل میں شریک ہونے لگے۔ بعض محفلوں کے چرچے تو دنوں بلکہ مہینوں زبان پر رہتے۔"[۱]

گو انھوں نے گایا بھی ہے لیکن ان کا زیادہ رجحان سازوں پر تھا۔ انھوں نے طبلے اور ستار کی باقاعدہ تربیت لی۔ کلاسکی موسیقی کے اسرار ورموز کا انہیں اتنا اچھا گیان ہے کہ موسیقی کے بہت سے پروگراموں کے لیے دھنیں بناتے ہیں۔ میری یونیورسٹی میں ایک ذہین ریسرچ اسکالر کا تعلق ایک موسیقارانہ گھرانے سے ہے۔ اسے اردو زبان وادب میں ہندوستانی موسیقی کا موضوع دیا کہ اس پر کام کرنے کے اہل کم حضرات ہوتے ہیں۔ فروری ۱۹۸۰ء میں کالی داس حیدرآباد آئے اس نے ان سے ایک طویل انٹرویو لیا۔ اس کو تو یہ ایک ہادی کامل مل گئے۔

ایک اور فن جس میں وہ ماہر ہیں ہومیو پیتھی ہے۔ ان کے کتب خانے میں ہومیو پیتھی کی تقریباً ڈھائی سو کتابیں ہیں۔ سفر میں ہومیو پیتھی کی دواؤں کی صندوقچی ساتھ رکھتے ہیں۔ کئی غیر معمولی کامیابیاں حاصل کر چکے ہیں۔ اپنے خاموش سرطان خون کے علاج میں بھی ان سے استفادہ

۱۔ حسینا۔ مشمولہ سہو و سراغ ص ۲۳۸

کر رہا ہوں۔ اب تو ان کا یہ حال ہے کہ روز صبح کو گھنٹے دو گھنٹے اپنے گھر پر مطب کرتے ہیں مریض آتے ہیں دوا لے جاتے ہیں۔ ان کی یہ منت ہے کہ وہ کسی سے علاج یا دوا کا پیسہ نہیں لیں گے۔

ایک بینک کے بہت بڑے افسر تھے۔ پیٹ کے یا آنتوں کے پھوڑوں سے سخت عاجز تھے۔ ایلوپیتھی سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ تجویز ہوئی کہ نو دس انچ آنت کاٹ کر کوئی نیا ٹکڑا جوڑ دیا جائے۔ وہ صاحب دکھی ہو گئے۔ کسی اہل اردو نے مشورہ دیا کہ کالی داس صاحب سے رجوع کرو۔ ان کے علاج سے انہیں کافی تشفی ہوئی۔ وہ ان کے احسان کا بار کچھ ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ ایک بار بینک کے لیے رہائشی فلیٹوں کی خرید کی ضرورت ہوئی۔ کالی داس جی کا یہ پیشہ ہی ہے۔ اس نے ان سے بہت کہا کہ فلیٹ ان کے توسط سے لے لیے جائیں۔ انہیں کئی لاکھ روپے بچ جاتے۔ کالی داس صاحب نے کہا۔ "اس کے بعد مجھ سے آپ کا علاج نہ ہو سکے گا۔" وہ اپنے دل میں قسم کھائے ہوئے ہیں کہ ہومیوپیتھی سے بالواسطہ بھی کوئی مالی فائدہ نہ اٹھائیں گے۔ اللہ اللہ ایسے آدمی بھی ہوتے ہیں۔ جو لاکھوں روپیوں کو یوں ٹھکرا سکتے ہیں۔

ان کی آخری لت شاعری کی ہے جو شتم پشتم ابھی تک باقی ہے۔ ۱۹۴۰ء میں پندرہ سال کی عمر میں وہ شعر کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہوئے۔ ابتداءً انھوں نے جوش ملسیانی کے ایک شاگرد لالہ جگن ناتھ کمال کرتاری سے مشورہ سخن کیا۔ رضا صاحب انہیں "کامل استاد، ماہرِ فن اور بے بدل شاعر و ادیب" قرار دیتے ہیں اور ماتم کرتے ہیں۔

"افسوس کمال ایسا صاحبِ کمال گمنامی ہی میں بسر کر کے راہیِ ملکِ عدم ہوا[۲]۔"

ہو سکتا ہے کمال صاحب استاد اور ماہرِ فن رہے ہوں لیکن ان کے شاعرِ بے بدل ہونے میں شبہ ہے۔ زمانہ بہترین منصف ہے۔ اگر مضامین کے اعتبار سے ان کا کلام اپنے عصر کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ اس حد تک گم نام رہتے۔ انھوں نے ۱۹۴۳ء میں رضا صاحب کو مشورہ دیا "صحت زبان کے لیے نوح ناروی، قبلہ جوش ملسیانی، دل شاہجہاں پوری جلیل مانک پوری کا کلام دیکھیے[۳]"

جاہلیت عرب کی شاعری میں لفظ اور اندازِ بیان ہی پر زور دیا جاتا تھا معنی کی کوئی اہمیت

۱۔ حسنیا مشمولہ سہو دسراغ ص ۲۳۸

۲۔ مضمون استادی قبلہ جوش ملسیانی مرحوم مشمولہ مکتوبات جوش ملسیانی بنام رضا ص ۱۰
۳۔ میرے استاد محترم مشمولہ سہو دسراغ ص ۲۲۲

نہ تھی۔ قدیم اردو تنقید بھی طرزِ ادا، اور جدتِ ادا سے آگے نہ سوچ سکتی تھی۔ کمال صاحب نے مندرجہ بالا اساتذہ کے کلام کو زبان سیکھنے کے لیے پڑھنے کا مشورہ دیا ہے لیکن انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ ان کا کلام دیکھنے سے زبان ہی نہیں، مضامین بھی اپنا اثر چھوڑیں گے۔ ان حضرات کے کلام کا مطالعہ ذوقِ شعری کی ریڑھ مارنے کا مجرب ترین نسخہ ہے۔ ۱۹۲۳ء میں ترقی پسند شاعری اپنے شباب پر تھی اس عہد میں نوح ناروی اور دل شاہجہاں پوری کے کلام کی سیر انیسویں صدی جیسی شاعری کرا سکتی تھی۔

۱۹۴۶ء میں رضا صاحب نے جوش ملسیانی سے مراسلت کے ذریعہ مشورۂ سخن کا آغاز کیا۔ ۱۹۴۸ء میں بالمشافہ ملاقات ہوئی۔ ۱۹۵۲ء کے قریب جوش صاحب کی خرابی صحت کو دیکھتے ہوئے رضا صاحب نے درخواست کی کہ انہیں اپنے کسی فارغ الاصلاح شاگرد سے وابستہ کر دیں۔ از خود رضا صاحب نے مولانا اطہر ہاپوڑی کو بھی ایک غزل بھیجی۔ انھوں نے اصلاح دے کر معذرت کی کہ میری عمر ۸۴ سال کی ہے اب میں اصلاح کے قابل نہیں رہا۔[۱] جوش صاحب نے رضا صاحب کو نسیم نور محلی کے سپرد کر دیا۔ رشی بٹیالوی انہیں نسیم نور محلی کے شاگرد ہیں۔ ۱۹۵۴ء میں رضا صاحب نے ان سے مشورہ کیا لیکن ان کی اصلاحوں سے مطمئن نہیں ہوئے پھر جوش صاحب ہی سے مشورہ کرنے لگے۔ انھوں نے غالباً ۱۹۶۴ء میں انہیں فارغ اصلاح کر دیا۔ اس کے بعد جب کبھی کوئی شعبہ ہوتا تبھی استاد سے رجوع کرتے۔ مکتوباتِ جوش ملسیانی سے پتا چلتا ہے کہ کم از کم ۱۹۶۹ء تک رضا صاحب نے جوش صاحب سے مشورہ کیا ہے۔

رضا صاحب اپنے تخلص کو رائے مکسور سے لکھتے ہیں۔ جوش ملسیانی نے انہیں ۱۹۵۰ء میں افریقہ خط لکھا تو پتے پر Rilla لکھا تھا۔ رضا صاحب کو یہ کھٹکا اور انھوں نے بدملا استفسار کیا کہ میرا تخلص رضا بکسرِ اوّل ہونا چاہیے یا بالفتحِ اوّل؟ جوش صاحب نے جواب دیا۔ انگریزی مجھے نہیں آتی۔ پہلے خط پر سرنامہ جس شخص سے لکھوایا تھا اسی نے رضا کو Raza نادرسے لکھ دیا ہوگا۔ آر کے بعد آئی ہی درست ہے۔[۲]

حیدرآباد میں رضوی کو فتحِ اوّل سے رَضوی بولتے ہیں۔ عبدالقادر سروری بھی اسی طرح بولتے تھے۔ ایک عرصہ ہوا کہ میں نے مسعود حسن رضوی صاحب سے زبانی گفتگو میں پوچھا حیدرآباد

---

[۱] مکتوباتِ جوش ملسیانی ص ۱۲۳ [۲] منشوراتِ جوش ملسیانی ص ۱۰ تا ۱۳۔

والے کہتے ہیں رَضا سے رَضوی درست ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟" مسعود حسن صاحب نے فرمایا "رضا کب زبر سے ہے۔ رِضوی (بکسر را) ہی صحیح تلفظ ہے۔"

یہ ہوئی لغت کی بات لیکن اردو کا اصول ہے کہ دوسری زبان سے مستعار لفظ کا اردو میں جو تلفظ رائج ہے وہی صحیح ہے خواہ وہ ازروئے اصل غلط ہو۔ مجھے اصرار ہے کہ اُردو میں رضا فتح اول سے اور رِضوی کسرِ اوّل سے بولا جاتا ہے۔ مغربی یوپی میں ایک عوامی کہاوت ہے "مزا تو لے گیا محمد رضا" نہ معلوم یہ محمد رضا تجمل حسین خاں کے ہمزاد تھے یا کوئی اور۔ شاہ ایران تو نہ ہوں گے۔ غالباً نواب رام پور محمد رضا علی خاں رہے ہوں گے۔ اس کہاوت میں رضا پر رائے مفتوح قابلِ توجہ ہے۔ اُردو میں رِضا بہ اصنوعی اور مولویانہ تلفظ معلوم ہوتا ہے۔ بس تو اسے زبر کے ساتھ ہی مرجح قرار دوں گا۔

جوش صاحب نے ایک مضمون[1] "املا کی خاص غلطیاں" میں ہدایت کی ہے کہ جن مرکب الفاظ کے دونوں اجزا اسم یا بامعنی ہوں انہیں منقطع لکھا جائے۔ ترقی اُردو بورڈ کے املانامے[2] کا بھی یہی فتویٰ ہے۔ پھر معلوم نہیں کیوں رضا صاحب اپنے نام کو کالیداس اور اپنی بلڈنگ کو چلدرشن لکھتے ہیں۔ کالی داس بجل درشن پڑھنے میں کتنا سبک معلوم ہوتا ہے۔ میرے استفسار پر کالی داس صاحب نے بتایا کہ ملا کر لکھنے کی عادت ہو گئی ہے۔ قلم خود بخود ملا کر لکھ دیتا ہے۔

بس شاعری سے بہک کر زبان کی تحقیق تک جا پہنچا۔ آمدم برسرِ مطلب۔

اُردو میں رضا صاحب کی ادبی شخصیت کے دو خاص پہلو ہیں شاعر کا اور محقق کا۔ انھوں نے قیامِ افریقہ کے دوران شعر گوئی پر خصوصی توجہ کی۔ وہاں ان کی وسیع المشربی اور مذہبی ہم آہنگی کا یہ مظاہرہ بار بار ہوا کہ اسلامی تقریبوں میں پابندی سے شرکت کرتے اور حسبِ موقع کلام پیش کرتے۔ ان کی اسلامی نظموں کی تعداد بہت تھی۔ افریقہ سے ہندوستان واپس آتے ہوئے بہت کچھ ضائع ہو گیا۔ جو کچھ بچا تھا اسے 'اجالے' نام کے ایک مختصر مجموعے میں شائع کر دیا۔ ایک اور صاحب اعجاز سیمابی نے واقعۂ شہادت اور امامت سے متعلق نظموں کو شعورِ غم کے نام سے مدوّن کر دیا۔ اب تک ان کی اردو نظموں کے چھ اور انگریزی نظموں کا ایک مجموعہ شائع

---

[2] املانامہ مرتبہ۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ص ۷۲ تا ۷۴

ہو چکا ہے۔ شاذ اب بھی کچھ کہہ لیتے ہیں۔

لیکن اب انھوں نے اپنی صحیح حیثیت دریافت کرلی ہے۔ جو اُردو محقق کی ہے۔ تحقیق میں وہ قاضی عبدالودود کے پیرو بلکہ جانشین ہیں۔ قاضی صاحب مرحوم انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ اس جذباتی رشتے کی وجہ یہ ہے کہ وہ بھی تحقیق میں قاضی صاحب کے حزم واحتیاط کو مدنظر رکھتے ہیں۔ رضا صاحب کے تحقیقی فیصلوں میں کہیں انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں ہوتی کیونکہ ان کے ہر دعوے کو معتبر اسناد کی پشت پناہی ہوتی ہے۔ اس زمانے میں وہ معترضوں کے جواب میں قدما اور اساتذہ کے کلام سے جس طرح اسناد پیش کرتے ہیں اس سے قدیم اساتذۂ فن بالخصوص چکبست کی یاد آجاتی ہے۔ سند پیش کرنے کے لیے بڑے وسیع مطالعے اور حافظے کی ضرورت ہے۔

قاضی عبدالودود کے علاوہ وہ کلیم الدین احمد سے بھی نزدیک رہے۔ ان کے سر پر بزرگ محقق جناب مالک رام کا دستِ شفقت بھی ہے لیکن انھوں نے اپنے فرطِ کرم سے ان پر الطاف کی غلط بارش کردی یعنی انہیں انجمن ترقی اردو مہاراشٹر کا صدر نامزد کر دیا۔ ممکن ہے کالی داس انجمن کے لیے مفید ثابت ہوں۔ لیکن یہ عہدہ ان کے تصنیفی کاموں میں مخل ثابت ہوگا۔ اس کے لیے اور بہت سے آرزومند مل جائیں گے۔ کالی داس صاحب کی تحقیق وتصنیف کا شباب ہے۔ انہیں اردو تحریک کا کام دوسرے مجاہدوں کے سپرد کر دینا چاہیئے۔ ان کے کسی کرم فرمانے انجمن کی مجلسِ عام کے لیے بھی ان کا نام تجویز کر دیا تھا۔ گپتا صاحب نے اپنے انکسار سے کام لے کر کسی کو خط نہیں لکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں ووٹوں کی ضروری تعداد سے ایک ووٹ کم ملا۔ اُن دنوں راقم الحروف امریکہ میں تھا۔ میں نے ان کے لیے (اور دوسرے کئی حضرات کے لیے) اپنا ووٹ کا لفافہ بغیر رجسٹری کے بھیجا تھا اور اس پر مہر نہیں لگائی تھی۔ اس بنا پر میرا لفافہ مسترد کردیا گیا۔ اگر میرا ووٹ شامل ہوتا تو کالی داس صاحب کسی دوسرے امیدوار کے برابر آجاتے اور فیصلہ قرعے سے ہوتا۔ وہ ان چیزوں سے اتنے بے نیاز ہیں کہ انہیں اس سب کا بالکل علم نہ تھا۔ فروری ۱۹۸۴ء میں حیدرآباد آئے، میں نے بتایا تو حیران ہوئے کہ انہیں اتنے ووٹ کس نے دے دیے تھے۔ تلافی کے طور پر صدر انجمن نے انہیں مجلسِ عام کا رکن نامزد کر دیا ہے۔

دو حضرات نے چند سال کے عرصے میں اردو دنیا میں بہت بلند مقام حاصل کر لیا ہے ایسا

مقام جسے پانے کے لیے دوسروں کو برسوں پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ رسالہ شب خون کے اجرا سے پہلے شمس الرحمٰن فاروقی کا نام کون جانتا تھا۔ اس رسالے کے ساتھ وہ ہندوستان میں جدیدیت کے ابوالآبا گئے۔ ان کے علم وفضل اور ان کی تنقیدی بصیرت نے انہیں اردو کے چوٹی کے نقادوں میں جگہ دلائی ہے۔ کالی داس گپتا بھی اسی طرح چند برس میں اردو کے چوٹی کے محققوں میں شمار کیے جانے لگے۔ یہ مقام کسی ہاتھ کی صفائی، کسی ٹوٹکے منتر یا تعلقاتِ عامہ کے سبب میسر نہیں آتا، یہ گاڑھی محنت اور گاڑھے علم ہی سے مل سکتا ہے۔ کالی داس صاحب کو اردو میں اپنی جگہ بنانے کے لیے چار علاوہ ذہنی پرخاشوں کا سامنا کرنا پڑا۔

سب سے پہلی یہ کہ وہ غیر مسلم ہیں۔ ادھر اردو دانوں کے ایک تنگ طبقے میں یہ ہوا چل پڑی ہے کہ پریم چند جیسے کوہ قامت ادیب ہی کو نہیں ہم عصر مسلم اہل قلم کو بھی ایک ایک کرکے ہدف تنقیص بنایا جاتا ہے۔ ان میں آنند نرائن ملا، رام لال، کمار پاشی جیسے تخلیق کار ہوں یا مالک رام، گوپی چند نارنگ، تارا چرن رستوگی، حکم چند نیّر اور راقم الحروف جیسے محقق یا نقاد۔ وشوا ناتھ طاؤس جو مجاہدینِ اردو میں پیش پیش رہنے کے لیے مضطرب رہتے ہیں انہیں تک نہیں بخشا گیا۔ بس جانتا ہوں کہ یہ صرف معدودے چند افراد کرتے ہیں جب کہ مسلم اہلِ اردو کی بہت بڑی اکثریت غیر مسلموں کی نوازتی ہے لیکن عرض کرنا یہ ہے کہ ایسے میں ایک نو وارد غیر مسلم محقق کو، بالخصوص وہ جسے کسی درس گاہ کی پشت پناہی حاصل نہیں، اپنا جائز مقام تسلیم کرانا قدرے دقت طلب ہوتا ہے۔

رضا صاحب کے لیے دوسری دقت یہ ہے کہ وہ پنجابی نژاد ہیں۔ دلی اور یوپی والے اردو کو اپنی جاگیر تسلیم کرتے ہیں۔ باہر والوں کی زبان کو کبھی مان کر نہیں دیتے۔ ان کا غرور اقبال، فیض، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی وغیرہ نے توڑا۔ اگر مستند زبان ہی سب کچھ ہے تو اردو کے بہترین شعرا، ذوق، داغ، ناسخ، شوق لکھنوی، رشک، سحر وغیرہ ہوں گے۔ بہترین نثر نگار اشرف صبوحی، ملا واحدی، آغا حیدر حسن دہلوی رہ جائیں گے۔ آپ اقبال، فیض، کرشن چندر راجندر سنگھ بیدی اوپندر ناتھ اشک، مالک رام وغیرہ کو چھوڑ کر محض جامع مسجد دلی یا لکھنؤ کے چوک میں بیٹھ کر زبان کی تلاش کرتے رہیے۔ جامع مسجد میں کرخنداری اور چوک لکھنؤ میں اودھی آمیز اردو سننے کو ملے گی۔ اب اردو دلی و لکھنؤ کی گلیوں سے کہیں زیادہ وسیع ہو گئی ہے۔ لاہور اور کراچی میں اردو کا جو کام ہو رہا ہے وہ دلی اور لکھنؤ میں کہاں۔

اس لیے اپنے ذہنی محفوظات کو ترک کر کے پنجابیوں کو قبول کرنا پڑے گا۔

رضا صاحب کی تیسری پریشانی یہ ہے کہ وہ کسی درس گاہ سے وابستہ نہیں۔ یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے مقام پر ان کے عہدے کی مہر لگی ہوئی ہے ان کے ساتھ حامیوں کا ایک گروہ ہوتا ہے، یونیورسٹیوں کے باہر کے نقاد یا محقق کو اپنا مقام منوانے کے لیے جد و جہد کرنی پڑتی ہے۔

رضا صاحب کو آخری مزاحمت جس کا سامنا کرنا پڑتا ہے یہ ہے کہ وہ رئیس ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ زردار کے پاس علم کی دولت کہاں ہو سکتی ہے۔ وہ کرائے پر دوسروں سے لکھاتا ہو گا۔ حاجت مندوں کو روپیہ دے کر اپنی تعریفیں رقم کراتا ہے لیکن رضا صاحب کا میدان تحقیق ہے۔ شعر و افسانہ یا تنقیدی مضامین تو دوسروں سے لکھائے جا سکتے ہیں لیکن مجھے ایسے تحقیقی مزدور دکھائی نہیں دیتے جو پیسہ لے کر دوسروں کے لیے تحقیقی گوہر پیش کر دیں۔ گپتا صاحب کا مقام دوسروں کے تعریفی مضامین سے نہیں بنا بلکہ ان کی اپنی تحریروں سے، غالب و چکبست پر ان کے کاموں سے، جن حضرات کو ان کی تحقیقی صلاحیتوں سے انکار ہے وہ ان کی تحقیق پر اعتراض کر کے دیکھ لیں اور مسکت جواب پا لیں، ان کے ساتھ بیٹھ کر گھنٹہ دو گھنٹہ ان کی تحقیقی تحریروں پر بحث کر لیں۔ اس کے بعد انہیں لب کشائی کی ضرورت نہ رہے گی۔

اُردو تحقیق میں رضا صاحب کا مقام مسلّم ہو چکا ہے۔ ان پر گلبرگہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر راہی قریشی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی ہے۔ میری رائے میں انہیں زندہ مصنفین پر کام کرنا چاہیے. جن کا تصنیفی کام تقریباً مکمل ہو چکا ہے اور جن سے توقع نہیں کہ اب وہ مزید قابل قدر کام کریں گے۔ گپتا صاحب کو ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ عرض صرف یہ کرنا ہے کہ گپتا صاحب نے کوشش کر کے اپنے اوپر پی ایچ ڈی نہیں کرائی، اسے خود لکھ کر نہیں دیا۔ انھوں نے صرف اپنی کتابیں راہی قریشی کو دیں۔ بقیہ سب کام خود قریشی صاحب کا تھا۔

گپتا صاحب پر ظفر ادیب نے کتاب لکھی، شاعر نے گوشہ نکالا اور اب تناظر ایک گوشہ یا شمارہ نکال رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ان میں سے کسی کے لیے انھوں نے تحریک نہیں کی۔ چار سال پہلے رسالہ فن و شخصیت ان کا خاص شمارہ نکالنا چاہتا تھا۔ لیکن گپتا صاحب پر انکساری دیانتداری، خود فراموشی اور خدا جانے کا ہے کا ایسا دورہ پڑا کہ انھوں نے اس شمارے

کا اجرا روک دیا۔ اردو دنیا میں ان کا جو مقام ہے وہ ان پر لکھی کتابوں اور رسالوں کے خاص شماروں کے سبب نہیں بلکہ سہو و سراغ متعلقاتِ غالب، غالبیات چند عنوانات، باقیات چکبست، مقالاتِ چکبست اور کلیات چکبست وغیرہ کے طفیل ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ادبی عظمت شعبدے بازی اور تعلقات عامہ یا روپئے سے نہیں خریدی جا سکتی۔ ان کے بل پر چند دن کے لیے غل غپاڑہ کرایا جا سکتا ہے۔ شہرت عام اور بقائے دوام بھاری بھرکم علمی کاموں ہی سے مل سکتی ہیں وہ اسی راہ پر گامزن ہیں۔

وارث علوی
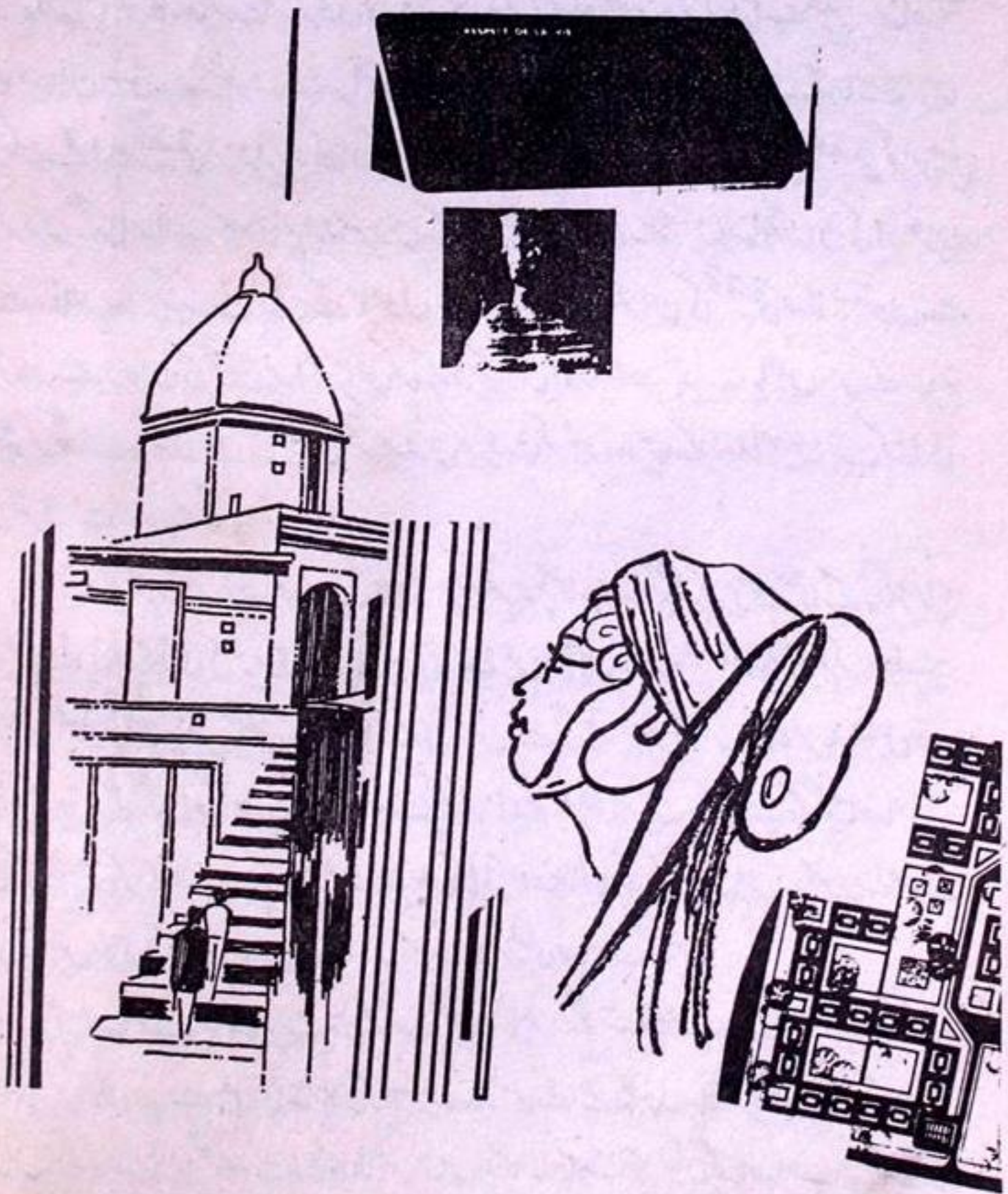
کالی داس صاحب

ہمارے ذہنی سفر کے دوران جن ادیبوں سے ہم ملتے ہیں ان کی یادیں ہمارے ادبی حافظہ کا گراں مایہ سرمایہ ثابت ہوتی ہیں. کالی داس گپتا رضا ایسی ہی شخصیتوں میں سے ایک ہیں. ان سے میری پہلی ملاقات احمد آباد میں ہی ہوئی. ویسے میں بمبئی اکثر آتا جاتا رہتا ہوں لیکن اُن کے درشن کو جل درشن نہ جا سکا جہاں وہ رہتے ہیں. ایک بار تو عجیب اتفاق ہوا. احمد آباد کی ملاقاتوں کے بعد میرا بمبئی جانا ہوا. بمبئی میں مَیں ہمیشہ باقر مہدی کے یہاں ٹھہرتا ہوں. میرا دستور ہے کہ صبح کاذب کے وقت اٹھ جاتا ہوں اور ٹیکسی لے کر بمبئی کے خوشنما علاقوں کی طرف چل پڑتا ہوں. وہاں ٹیکسی چھوڑ کر گھنٹہ دو گھنٹہ گشت کرتا ہوں. ایک بار الٹرا مونٹ روڈ نکل گیا. خوب گھوما. پھر ایک فلک شگاف عمارت دیکھی. بے حد خوبصورت اور پر شکوہ. ظاہر ہے نہایت ہی متمول لوگ اس میں رہتے ہوں گے. اس کے بائیں باغ کی فصیل سے پورے بمبئی کا نظارہ نظر آتا تھا. بہت دیر تک کہرے میں ملفوف شہر کا نظارہ کرتا رہا جو کافی بدصورت تھا. اکثر آف بیٹ فلموں میں بھی بمبئی کی عمارتوں پر پھیلتی ہوئی صبح کی روشنی کی تصویر کشی طائرانہ نگاہ کے زاویہ سے دیکھی تھی اور شہر ان میں بھی بدصورت نظر آیا تھا. اس وقت قصور تصویر کشی کا معلوم ہوتا تھا. اب تو بدصورتی کہرے کا دامن پھاڑ کر آنکھوں سے ٹکرا رہی تھی. ایسا لگتا ہے کہ صبح شہر کے لیے بنی ہی نہیں. وہ تو وادیوں کہساروں اور ننھے منے دیہاتوں پر اپنا حسن بے نقاب کرتی ہے. اسی لیے شاید شہر بھی صبح ہونے سے پہلے ہی دن کے ہنگامے شروع کر دیتا ہے تاکہ سورج کے رتھ پر سوار اونشا کاروں، ٹرکوں بسوں اور ٹرینوں کے قافلوں میں نظر ہی نہ آئے. جس جگہ میں کھڑا تھا وہاں سے بھی صبح اپنا دامن سمیٹتی اور شہر اپنے ہاتھ پاؤں پھیلاتا دکھائی دیتا تھا. میری پشت پر وسیع و عریض اور بلند و بالا عمارت "جل درشن" تھی جو انسانی فنِ تعمیر کا معجزہ تھا. وہاں سے پھر گشت لگاتا اپنے جائے قیام پر پہنچ گیا. راستہ میں سوچتا تھا کالی داس گپتا اسی نواح میں رہتے ہیں. اگر پتہ یاد ہوتا یا پاس ہوتا

تو صبح کا ناشتہ اُن کے ساتھ کرتا۔ احمد آباد لوٹ کر جب انہیں خط لکھا اور ڈائری میں پتہ دیکھا تو سر پیٹ لیا۔ اسی جل درشن کا ایک فلیٹ جس کے احاطہ میں کھڑا میں بمبئی درشن کے مزے لوٹتا رہا تھا۔

ویسے بھی مجھے لوگوں سے ملاقاتوں کا اب بہت چاؤ نہیں رہا۔ انہی سے ملتا ہوں جن کا بوریت میں مرتبہ مجھ سے کم ہے۔ جن علوم میں مجھے دستگاہ نہیں ان کے ماہرین سے ملنے میں مجھے خوشی ہوتی ہے، انہیں ایک سعادت مند سامع ملتا ہے اور وہ بحرِ علم میں غواصوں کے مزے لوٹتے ہیں۔ چوں کہ خود اُن کی ذات ہی علم کا دریا ہوتی ہے اس لیے ذات میں ڈوبنے سے جو خود فراموشی پیدا ہوتی ہے وہی گفتگو کو خود کلامی کا رنگ دیتی ہے۔ مجھے عالمانہ خود کلامی پسند ہے کیوں کہ وہ خود اپنی اندرونی طاقت کے سہارے چلی رہتی ہے۔ سامع کو اسے ایڑ لگانے یا کندھا دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اسی لیے وہ اس کشمکش سے بچ جاتا ہے کہ کاسۂ ذہن میں علم کے منتشر چھوٹے اور کھوٹے سکوں میں سے کون سا سکہ کھنکھنائے کہ بات کا سلسلہ چلتا رہے ان علماء کی صحبت میں علم و ادب کے ان گمنام گوشوں کی سیر ہو جاتی ہے جہاں ہم چھٹ بھیوں کا داخلہ ممنوع ہے۔

لیکن جب رضا صاحب سے ملاقات ہوئی اس وقت سر سے اکتسابِ علم کا یہ سودا بھی نکل چکا تھا۔ اہل علم کی خود کلامیوں کی امواج تند و تند پر بے دست و پا بہنا ممکن نہیں رہا تھا۔ جو کچھ عالمانہ سنا بری تھی وہ بھی دم توڑ چکی تھی اسی لیے جب احمد آباد میں رضا صاحب نے مجھے یاد کیا تو ہم ان کے ہوٹل کی طرف اس انداز سے نہیں چلے کہ اپنے سایہ سے سرو قدم آگے تھا بلکہ دل میں یہ تردد لیے روانہ ہوئے کہ میں ہوں ہنسوڑ اور تو ہے مقطع۔ میرا تیرا میل کیسے ہوگا۔

کا لیداس نہایت تپاک سے ملے۔ آدمی نہایت وجیہہ ہیں اُن کی شخصیت میں سب سے زیادہ موہ لینے والی چیز ان کی آواز ہے۔ میں آوازوں کا عاشق ہوں۔ سردار جعفری کو سننے میں وہی لطف آتا ہے جو ایک دلنشین سمفنی کو سننے میں آتا ہے۔ شاعروں کی آوازوں سے لوگوں نے شاعروں کی شخصیت ہی کا نہیں بلکہ ان کی شاعری کی صفتوں تک کا سراغ لگایا ہے۔ رضا صاحب کی آواز میں ایک صاف گو آدمی کی کاٹ بھی تھی اور خلیق آدمی کی مدھرتا بھی۔ ان کی بات چیت میں شائستگی بھی تھی اور نفاست بھی لیکن اتنی فطری کہ رنگِ تکلف کا نام و نشان نہیں تھا۔ میں گیا تو یہ ارادہ کر کے کہ پانچ پندرہ منٹ میں رسمیہ بات چیت کے بعد رخصت ہو جاؤں گا۔ میرا خیال ہے ہماری

پہلی نشست چار گھنٹے تک چلی۔ شام کو جب ملے تو رات کے بارہ بج گئے، اور رضا صاحب تین روز احمد آباد رہے، ہر روز یہی عالم تھا۔

بس یوں سمجھئے کہ ہمارے درمیان دوستی کلک ہو گئی در اصل رضا صاحب سے گفتگو ممکن ہے اور یہ بات بہت کم لوگوں کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔ میں نے بہت خوش کلام لوگوں کو دیکھا ہے لیکن وہ ہم کلام نہیں ہوتے۔ یا خود کلامی کیا کرتے ہیں یا لکچر پلاتے ہیں، آپ کو بھی بولنے کا موقع دیتے ہیں اور آپ کی بات غور سے سنتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن فی الحقیقت آپ کی بات کے بعد وہ جو بات کہنا چاہتے ہیں اس کے سوچ میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ جس دل نشینی سے رضا صاحب اپنی بات کہتے ہیں اس سے کہیں زیادہ اشتیاق سے وہ دوسروں کی باتوں کو گوش نشین کرتے ہیں۔ ہمارے مزاج، خیالات، ذوق سخن اور شخصیتوں میں فرق ہونے کے باوجود ہم باتوں کے مزے لیتے رہے تو اس کا سبب یہی تھا کہ یہاں ایک دوسرے کو مرعوب و متاثر کرنے کی کوئی کوشش نہیں تھی۔ ادب کے موضوع پر بے تکلف گفتگو کا لطف کچھ اور ہوتا ہے۔

در اصل رضا صاحب بہت سی خوبیوں کے مالک ہیں۔ اُن کا ذکر ہمیشہ اُن کی دولت کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن وہ صحیح معنی میں درویش صفت آدمی ہیں۔ میں نے انہیں اُن کے اپنے مکان میں دیکھا نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ وہاں بھی وہ اسی سادگی سے رہتے ہوں گے جیسا کہ میں نے احمد آباد میں پایا۔ یہ سادگی اختیاری نہیں ہے بلکہ اس کلچر کا عطیہ ہے۔ جس میں ان کی پرورش ہوئی۔ اس کلچر کی تشکیل میں جہاں اعلیٰ ترین ہند وروایات کا بڑا حصہ ہے۔ وہیں اُردو زبان کی ثقافت نے بھی گہری رنگ آمیزی کی ہے۔ اردو زبان سے رضا صاحب کی محبت مشہور ہے لیکن مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ خود اردو زبان اور اس کی ثقافت نے رضا صاحب کا قالب اختیار کر لیا ہے۔ وہ لوگ جو ایک زبان کے تہذیبی مزاج کے بنائے ہوئے ہیں۔ ان کی صحبت میں مجھے روحانی سرشاری کا تجربہ ہوتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ خود میری ذات ان عناصر سے محروم ہے۔ در اصل تہذیبی اور تمدنی سطح پر میں اتنے داخلی اور خارجی گھر سنوں اور چھینا جھپٹیوں سے گذرا ہوں کہ اب یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ میں نے کیا کھویا اور کیا پایا ہے کئی کھٹی ٹوٹی ہوئی ذات تہذیبی اثاثۃ البیت کا کباڑ خانہ نظر آتی ہے۔ رضا صاحب کی شخصیت ایک صاف ستھرے سگھڑ گھر کا نقشہ پیش کرتی ہے، جس میں جانی پہچانی چیزیں قرینہ سے مناسب جگہوں پر رکھی ہوئی ہیں۔ اس گھر کی اپنی ایک فضا ہے، پرسکون، خاموش اور سادگی کا وقار لیے ہوئے۔ یہ نو دولتیوں کا ڈرائنگ

روم نہیں جس کی چکا چوند کرتی ہوئی نمائش اور چیختی ہوئی سجاوٹ اعصاب میں انتشار پیدا کرتی ہے۔
رضا صاحب ایک بھرے ہوئے آدمی ہیں۔ وہ محقق تو ہے لیکن ان کے اندر کا نقاد بار بار ابھر کر سامنے آنا چاہتا ہے۔ اس سے بھی کہیں زیادہ تحقیق اور تنقید دونوں کے حصاروں کو توڑ کر ان کے اندر کا شاعر اپنی تخلیقی شخصیت کا اثبات کرنا چاہتا ہے۔ ہر ڈسپلن کے اپنے تقاضے ہیں اور آدمی کو اس کی قیمت چکانی پڑتی ہے۔ تنقید تو تخلیق کا ساتھ دیتی ہے لیکن تحقیق نہیں دے پاتی۔ بہت کم محقق اچھے شاعر اور نقاد ہوتے ہیں۔ اپنے وقت کی شاعری اور تنقید سے غیر اطمینانی کے پیچھے رضا صاحب کی خود اپنی ذات سے غیر اطمینانی کا عنصر رہا ہوا ہے۔ وہ خود کو طفل تسلیاں دیتے ہیں کہ فلاں قسم کی شاعری اور فلاں قسم کی تنقید میں لکھا گیا ہے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ کھیل کھیلنے کے جو دن تھے وہ انھوں نے محققانہ کاموں میں گذار دیے۔ یہی نہیں بلکہ اساتذہ کی صحبت نے بھی انہیں خاصا خراب کیا۔ زبان و بیان کی صحت کا انہیں اتنا خیال رہا کہ شاعری کے لیے جو دو چار روگ اپنی ذات کو لگانے پڑتے ہیں، ان سے وہ دور رہے۔ پھر وہ کافی عرصے تک افریقہ میں مقیم رہے۔ یہ ذہنی جلاوطنی تخلیقی ذہن کے لیے ہمیشہ مہلک ثابت ہوتی ہے۔ اب تو ہر زبان میں ایسے فنکاروں کی تعداد بڑھ رہی ہے جو اپنی لسانی کمیونٹی اور اس کی جاریاتی کشمکشوں سے دور انگلینڈ، امریکہ اور کنیڈا میں بستیاں بسائے ہوئے ہیں۔ انہیں خبر بھی نہیں ہوپاتی اور ان کا تخلیقی سوتا خشک ہونے لگتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ فنکار کے تخلیقی سرچشمہ میں بھی پانی اسی برف پوش پہاڑ سے قطرہ قطرہ ٹپکتا ہے جو عبارت ہے اس کے معاشرے سے۔ طوفان، آندھیاں، انجماد اور پگھلاؤ کے تجربات کو مسلسل اپنے حواس میں جذب کرتے رہنا فنکار کا مقدر ہے۔ ان سے دور رہ کر ان کے متعلق جاننا موسم کے سماچار پڑھنے کے مصداق ہے۔ میں ذاتی طور پر بے شمار اردو اور گجراتی کے ایسے لکھنے والوں سے واقف ہوں جو ترک وطن کر کے چلے گئے اور ان کی تخلیقی صلاحیتیں بھی آہستہ آہستہ معدوم ہو گئیں۔ بہت سوں نے تو جدید ترین مغربی اسالیب اور رجحانات اپنائے لیکن چونکہ ان میں اپنی زبان کی زمین کی بوباس نہیں تھی، اس لیے ان کی چیزیں کاغذی پھول بن کر رہ گئیں۔ احساس ہر آن بدلتا ہے اور چیزوں کو جس طرح ہم نے کل دیکھا تھا آج نہیں دیکھ پاتے۔ ایک لمحہ ہوتا ہے جب احساس کے اس اڑتے ہوئے رنگ کو شاعر لفظوں میں قید کر لیتا ہے اور اسے وہ استعارہ اور امیج مل جاتا ہے جس کے بغیر شاعری اپنا جادو نہیں جگاتی۔ نہ جانے ایسے کتنے لمحات ہمارے فنکاروں نے پردیس کی سرزمینوں میں کھو دیے۔

رضا صاحب افریقہ سے واپس ہندوستان آئے تو یہاں کی فضائیں بدل چکی تھیں رضا صاحب کو خود اعتراف ہے کہ اقبال کا اثراب نئے ذہنوں پر اتنا نہیں رہا جتنا پہلے تھا لیکن نیا ذہن تو اقبال سے لے کر فیض اور سردار جعفری کے اثرات سے بھی باہر نکل چکا تھا۔ رنگ پکڑتے ہوئے پھل کی مانند یہ تبدیلی اتنی بتدریج تھی کہ رنگِ سخن کے بدلتے ہوئے shades کی شناخت کے لیے نظر کا ارتکاب ناگزیر تھا۔ رضا صاحب جب ہندوستان واپس آئے تو انھوں نے پکا پکایا پھل دیکھا اور انہیں نہ تو اس کا مزا پسند آیا نہ رنگ۔ زبان کے مزے کی مانند ذوقِ سخن بھی ایک cultivated چیز ہے۔ نئی شاعری فوراً چٹخارہ نہیں دیتی۔ قاری کو بھی احساس کی ان منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے جس سے شاعر گذرتا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ دونوں تجربات کے اس بھنور میں گھرے ہوئے ہوں جو گردشِ زمانہ کا پیدا کردہ ہے۔ ظاہر ہے ہندوستان آکر انہیں اپنی گھڑی یہاں کے وقت کے مطابق ٹھیک کرنی پڑی ہوگی۔ احساس کی سوئی اتنی آسانی سے نہیں گھومتی۔

رضا صاحب اپنی شاعری کا ذکر جب بھی کرتے ہیں تو نہایت انکسار کے ساتھ لیکن خود اعتمادی سے کرتے ہیں۔ ان کے انکسار کو دیکھتے ہوئے ان کے اعتماد کو مجروح کرنا اچھا نہیں لگتا۔ لیکن لفاظی تنقید کے جال بچھا کر انہیں اور ان کے قارئین کو سبز باغ دکھانے کا کرتب بھی مجھے نہیں آتا۔ ان کی شاعری کو پڑھتے ہوئے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جس وادی کو انہیں چھلنی پاؤں، لخت لخت سینہ اور زخمی ہاتھوں سے طے کرنا چاہیے تھا اسے وہ عصائے سخن کی مدد سے پار کر گئے۔ یہ طریقہ اساتذۂ روزگار کا ہے۔ لوگ سخن گوئی یوں ہی کیا کرتے تھے۔ زبان و بیان و عروض پر ان کی قدرت بے مثال ہے۔ وہ ایک خوش گو اور خوش فکر شاعر ہیں۔ لیکن شاعری آج کل وہی چلتی ہے جو پریشان فکر اور پریشان حال ہو، جو زخموں پر نمک چھڑکے کہ پر تشدد دور میں مرہم فریب ہے اور لذت تشدد کا ردعمل بھی اور جواب بھی ہے۔ رضا صاحب سنگیت کے ماہر اور شاعری کی موسیقیت اور غنائیت کے قائل بھی ہیں۔ لیکن زمانہ مخالف غنائیت ہے۔ وہ شاعری کے نئے آہنگ کی تلاش میں ہے جو نثر کے آہنگ سے بہت فاصلے پر نہ ہو کیوں کہ جو کچھ بدصورت ہے، کریہہ ہے، غلیظ ہے، کرب ناک ہے، سے بادیئر اور بیدی کی طرح ایک نئے غنائی فارم میں بدل دینا آج کے شعر و ادب کا مقصود ہے ہمارے یہاں یہ کام بڑے پیمانہ پر نہیں ہوا۔ لیکن جدیدیت کی رفتار اسی سمت ہے۔ شاعری اب بطور شاعری کے لطف نہیں دیتی۔ اسی وقت مزا دیتی ہے جب اس میں وقت کے

لگاتے ہوئے زخموں کی تازہ کاری اور کچا پن ہو ۔ اب تو شاعری تاثیر اور تاثر سے بھی اجتناب کرتی ہے۔ شعر کی ہیئت اس قدر کفایت شعارانہ بن گئی ہے کہ نغمہ ریز الفاظ تو کیا، حروف کی اصوات کا استعمال بھی سنبھل کر کرتی ہے کہ آہنگ میں غیر ضروری کھنک پیدا نہ ہو۔ اسی فضا میں ہر شاعر کو اپنا رنگ سخن پیدا کرنا ہے۔ رضا صاحب اس فضا سے دور رہے۔ جب اس میں داخل ہوئے تو ان کا کلاسکی مزاج اس سے ہم آہنگ نہیں ہو پایا۔ نثری نظم کا تو کیا سوال رضا صاحب نظم آزاد تک کے قائل نہیں ہوتے اسی لیے وہ شاعری تو کر لیتے ہیں اور بڑی زوردار شاعری کرتے ہیں لیکن ماورائے سخن جو بات ہے اسے نہیں پاسکتے" اور آج کے زمانہ میں ماورائے سخن وہی بات ہے جو سخن کو لخت لخت کرتی ہے اور رضا صاحب کو یہ سودا منظور نہیں۔ رضا صاحب بہت بھرے ہوئے سلیم الطبع صحیح الدماغ، راسخ المزاج، خوش خلق اور صاف باطن آدمی ہیں۔ ایسے شخص کی دوستی فی نفسہ ایک بیش بہا تجربہ ہے۔ لیکن ایسے شخص کی شاعری کو گراں مایہ تجربہ بننے کے لیے ان اوصافِ حمیدہ کے علاوہ کچھ اور چیزوں کی ضرورت ہے۔ مکدر فضا میں دل و دماغ کو آئینہ رکھنا بڑا کارنامہ ہے۔ لیکن زمانہ پُر خلل ہو تو آئینہ کو سالم بچائے جانا شخصیت کے لیے اچھا ہے، شاعری کے لیے برا۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ رضا صاحب کی شاعری بری ہے۔ خراب شعر کہنا ان کے لیے ممکن ہی نہیں رہا کہ فن شعر گوئی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس پر انہیں عالمانہ عبور حاصل نہ ہو۔ زبان کی نزاکتوں اور بیان کی لطافتوں کی جو آگہی انہیں ہے فی زمانہ وہ کم ہی لوگوں میں نظر آتی ہے۔ پھر رضا صاحب بھی ایک باشعور اور حساس آدمی ہیں۔ درد و غم انھوں نے بھی جمع تو کیے ہیں لیکن میر کی طرح ابھی انہیں دیوان تیار کرنا باقی ہے۔ سوال پھر شاعر کی دیوانگی اور عالم کی فرزانگی کا پیدا ہوتا ہے، اور یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا تشفی بخش جواب نہیں ملتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ زخموں کی نمائش شاعرانہ رویہ کا کوئی قابلِ تعریف پہلو نہیں لیکن رضا صاحب کی پردہ داریٔ زخمِ جگر کی وضع اس انتہا کو پہنچی ہوئی ہے کہ دل تقاضا کرتا ہے سینہ شق ہونے کا تاکہ لذتِ فراغ نصیب ہو۔ رضا صاحب کی فرزانگی ان کی دیوانگی کو شاعری میں بھی چاک دامنی کے مزے لوٹنے نہیں دیتی۔ صحبت تو ہمیں فرزانوں کی پسند آتی ہے لیکن شاعری دیوانوں کی۔ تاہم رضا صاحب ان چند لوگوں میں سے ہیں جن سے گھنٹوں بے جام و سبو لطفِ سخن اٹھایا جاسکتا ہے۔

آغا رشید مرزا

بنامِ رضاؔ

۲۳ مئی ۱۹۸۴ء۔ کلکتہ آنے کے بعد اتنے عرصہ تک آپ کو خط نہیں لکھ سکا۔ معلوم نہیں میرے متعلق آپ کیا خیال فرماتے ہوں گے۔ لیکن کسی کی یاد کا دل میں قائم رہنا اور اسے صفحۂ قرطاس پر اتارنا دو علیحدہ چیزیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تین ماہ کلکتہ سے غیر حاضری کی بنا پر یہاں آنے کے بعد بڑی مصروفیت رہی اور آپ کو خط لکھنے کے لیے فرصت اور یکسوئی دونوں کی ضرورت تھی۔ یوں رواروی میں آپ کو کچھ لکھنا میں نے روا نہ سمجھا ؎

لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

آپ کی یاد آتی رہی ذکرِ خیر بھی ہوتا رہا۔ آپ کے علم و حلم کا، بلندیٔ ذوق و شوق کا، سخن فہمی، سخن گوئی کا، غالب شناسی، چکبست نوازی کا اور خاموشی کے ساتھ تحقیقی، علمی، ادبی سرگرمی کا، پھر سب سے بڑھ کر آپ کی مہمان نوازی کا، گرم گرم چائے کا، خصوصاً بھابی صاحبہ کی بنوائی ہوئی گرما گرم پکوڑیوں کا اور لذیذ شیرینی کا جس کی لذت زبان پر اور آپ کی گرمیٔ خلوص کا نقش ہمارے دلوں پر باقی ہے اور سدا رہے گا۔

آپ کی دلچسپ باتیں، ادبی نکتے، لطیفے۔ وہ ایک حلوائی کا نعتیہ شعر کیا تھا یاد نہیں رہا دو شعر اور بھی تھے غالباً ماہِ صیام کے خیال سے ایک ماہ کی ایک ساتھ پلانے کی فرمائش ساقی سے تھی۔ غالب کی تہہ داری کے متعلق بڑی اچھی توجیہ آپ نے کی تھی۔ پھر آپ کا کلام آپ کی زبانی دوہری ضیافت کا لطف اٹھایا۔ اتنا وقت کہاں گذرا معلوم ہی نہیں ہوا۔ آپ کا دوپہر کا کھانا بے وقت ہوا۔ بھابی صاحبہ کو بڑی بھوک لگ آئی تھی معلوم نہیں دل میں کیا کہتی ہوں گی۔ لیکن اپنا دل تو یہ کہہ رہا تھا ؎

مجھے پینے دے، پینے دے کہ تیرے جامِ لعلیں میں
ابھی کچھ اور ہے، کچھ اور ہے، کچھ اور ہے ساقی (مجاز)

اور اب اس صحبتِ رفتہ کو یاد کر کے یوں کہتا ہے (عُمر کی جگہ "وقت" کے تصرف کے ساتھ)

ذرا "وقتِ" رفتہ کو آواز دینا

آپ کی عنایت کردہ کتابوں میں سے "شعلۂ خاموش" سفر میں ہمراہ رہی اور ہمدمِ سفر ثابت ہوئی۔ اس کی بہت سی نظمیں، غزلیں، اشعار شعلۂ جوالہ ہیں اور جو شعلۂ خاموش ہیں ان میں بھی چنگاریاں دبی ہوئی ہیں، حسن و عشق کی، مجاز و حقیقت کی، جہد و عمل کی۔ باقی کتابیں کلکتہ پہنچنے کے بعد دیکھتا رہا ان پر کچھ لکھنے کا حق تو ادا نہیں کر سکتا لیکن اظہارِ خیال کیے بغیر رہ بھی نہیں سکتا۔ بے ساختہ داد نکلتی ہے خدا "زورِ قلم" "زورِ الہام" اور زیادہ کرے۔

آپ کے کلام میں وسعتِ بیاں، فکر و خیال کی ہمہ گیری اور آزادی کے باوجود شاعری کے اصولوں اور اس کی روایتوں کی پوری پابندی ہے جو اس دور کے شاعروں کی اس شکایت کی تردید کرتی ہے کہ پابند شاعری خصوصاً غزل کی تنگ دامنی آج کی وسعتِ فکر و خیال کی متحمل نہیں ہو سکتی

دوسری چیز جو مجھے آپ کے کلام میں پسند آئی اور آج اردو کی بقا کے لیے اس کی ضرورت بھی ہے۔ وہ ہے زبان و بیان کی شیرینی اور سادگی، محاورہ بندی اور بے ساختگی۔ شعلۂ خاموش بھی شاعری کے ان محاسن سے مزین ہے۔ میری پسند کے اشعار میں سے چند اشعار جو اس حسن کا نمونہ ہیں یہ ہیں۔

ان کے دل کا غبار دھونا تھا — آج مجھ کو بہت سا رونا تھا

واہ کیا کہنے ہیں شعر کے، میرؔ کا سا رنگ ہے۔ مشاعرہ میں پڑھا ہوگا تو اسے لوٹ لیا ہوگا۔ میرؔ نے بھی رونے اور دھونے کو اپنے رنگ میں باندھا ہے۔

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح — تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا

میرؔ نے آنسوؤں سے اپنا منہ دھویا، آپ نے کسی کے دل کا غبار دھویا۔ بہت خوب مضمون باندھا آپ نے۔

دل میں اب کوئی نہیں ناممکن — نہ سہی آپ خدا تو ہوگا
اگر بندگی میں عقیدت نہ ہوگی — وہ ہنگامہ ہوگا طریقت نہ ہوگی
کبھی حرم سے ہم آئے کبھی حرم کو چلے — گذاری عمرِ رضا ہم نے آنے جانے میں

لفظ "تھام لے" کا استعمال اقبال کے ہاں خوب ہوا ہے۔

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے — مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

نالہ ہے بلبل شوریدہ ترا خام ابھی — اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

لیکن "تھام آیا" کا استعمال آپ ہی کا حصہ ہے اور بہت خوب ہے۔

مجھے اے دوست اب کچھ ڈر نہیں لگتا حوادث سے — میں اپنے غم شرابِ ناب کے ہاتھوں میں تھام آیا

پھر "تھام آیا" کے ساتھ آپ کے الفاظ "ہاتھوں میں" اور بھی حسن پیدا کر دیتے ہیں۔

غالباً آپ پہلے شاعر ہیں کہ آپ نے بیچارے شیخ کی حمایت کی ہے ورنہ عموماً کسی شاعر نے ان حضرت کو نہیں بخشا۔

رضاؔ اک شیخ پر الزام کیا — شراب تند اوروں نے بھی پی ہے

"بیوی سے شکوہ" بھی خوب ہے۔ آپ نے کچھ اس انداز سے شکوہ کیا ہے کہ مجموعی طور پر بیویاں مایکے جانے کا خیال ہی ترک کر دیں۔ عشق و محبت کے معاملے میں بعض اوقات شاعر بہت خود غرض ہو جاتا ہے نادانستہ طور پر وہ صرف اپنا ہی درد دیکھتا ہے حسن کی مجبوری نہیں دیکھتا۔ ایک مصرع کسی کا یاد رہ گیا ؎ حسن مجبور ہے مختار نہیں

لیکن "جواب شکوہ" بھی ہوا یا نہیں۔ غالباً اقبال کے شکوہ کی طرح آپ کے شکوہ پر کچھ دے نہیں ہوئی۔

اس مجموعہ کے عنوانات کچھ "بانگِ درا" کے طرز پر اپنی ایک کشش رکھتے ہیں۔ اگرچہ فکر و خیال کا رنگ آپ کا اپنا علیحدہ ہے۔ "محنت کشوں سے خطاب"، "لکشمی بائی"، "اے عقلِ سلیم"، "دیپ مالا کے چار چاند"، "صحرا"، "شہیدوں کے مزار کی ایک صبح"، "گرونانک"، "ایک ناکام محبت سے شاعر کی گفتگو" اور اقبال کے اشعار پر نظمیں آپ کی قادر الکلامی کی ضمانت ہیں اور حسن کلام پر دلالت کرتی ہیں۔

شعاعِ جاوید کی رباعیاں، دلربا اور دلپذیر ہیں، دلدوز اور بصیرت افروز بھی ہیں۔ ان میں کائنات کا دل بھی دھڑکتا ہے اور انسان کا اپنا دل بھی۔ وہ زندگی کی حقیقتوں سے قریب اور صحیح تجزیہ کی آئنہ دار ہیں۔

نالہ کبھی ہوتا نہیں درمانِ درد — شیون سے بھی کچھ بڑھتی نہیں شانِ درد
یہ بادِ سحر نہیں چلے اور تھم جائے — تھمتے تھمتے تھمے گا طوفانِ درد

گوپی چند صاحب نارنگ نے آپ کی رباعیوں کا بہت اچھا جائزہ پیش کیا ہے۔ یہ

بات انھوں نے خدالگتی اور دل کو لگتی خوب کہی ہے کہ تحقیق و تخلیق کا اجتماع ضدین استثنا کی صورت میں آپ کے ہاں ہے۔ ایک اور بات میں کہنا چاہتا ہوں کہ اچھی شاعری کے ساتھ نثر نگاری کا ملکہ بھی بطور عطیہ خاص آپ کو ملا ہے۔ پھر موسیقی اور وہ بھی علم موسیقی میں دسترس گویا اجتماع تخلیق و تحقیق کے ساتھ اجتماعِ ذوقِ فنونِ لطیفہ بھی حسن خداداد ہے۔

آپ کی ایک رباعی بہت خوب ہے اور اس کا پہلا شعر بہت ہی خوب ہے۔

دانشور، صاحب نظر فلسفہ داں
اک بھی تو نہیں واقفِ آغازِ جہاں
واقف ہے تو بس خدا، نہیں وہ بھی نہیں
دنیا پہلے بنی، خدا بعد ازاں

اس رباعی کے دوسرے شعر میں دنیا یا خدا کے اول و آخر ہونے میں جس اشتباہ کا اظہار ہوتا ہے اس کا جواب بہت پہلے، آپ جن کے پرستار ہیں، انھوں نے اس شعر کے پہلے ہی مصرع میں دیدیا ہے

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ میں ہوتا تو کیا ہوتا

بس اول و آخر ہی وہ ہے۔ اللہ بس باقی ہوس۔

گوپی چند صاحب آپ کی رباعی کی تشریح میں کہتے ہیں "اور آخر میں دنیا کو اول اور خدا کو بعد میں دکھایا ہے یعنی دنیا کا وجود ہے تو خالق کے وجود کا اقرار بھی ہے ورنہ نہیں ہے۔" میں سمجھتا ہوں کہ خالق کے وجود کا اقرار دنیا کے وجود پر قائم نہیں ہے۔ اس کے وجود کا اقرار دنیا کے وجود سے پہلے ہی ہے۔ اس کے کرّوبیاں اس کی ثنا میں دنیا کے وجود میں آنے سے پہلے ہی مصروف ہیں۔ اور پھر وہ تو بے نیاز ہے کسی کے اقرار و انکار کا محتاج نہیں۔ خیر ان باتوں کا سلسلہ لامتناہی ہے اپنی اپنی فکر اور اپنا اپنا خیال الگ الگ ہوتا ہے۔ آپ کی رباعی بہر حال اچھی ہے۔ میرے خیال میں اس کے پہلے شعر سے آپ کی وارداتِ قلبی اور دوسرے شعر سے وارداتِ عقلی کا اظہار ہوتا ہے۔ کبھی کبھی عقل اس طرح سوچنے پر بھی مجبور ہو جاتی ہے اور یہ ایک قدرتی امر ہے۔ اگرچہ محدود، لامحدود کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔ آپ ہی نے کہا ہے۔

جھوٹ ہے یہ کہ تجھ کو جان گئے   سب ترے در کی خاک چھان گئے
ہاں اگر کچھ جانا تو عشق نے ہی جانا ہے

سکونِ دل کو رضا عشق کی پناہ میں ڈھونڈھ　　　یہیں قرار کے سامان پائے جاتے ہیں

شاخ گل۔ اپنے اندر ایک گلستاں لیے ہوئے ہے۔ اس گلستاں میں نہ صرف اپنی سرزمین کے خوبصورت پھول فتح و شکست، ترک دنیا کیوں، بھگوان بدھ کا تیاگ، امرت منتھن یادِ کربلا، نظموں کی شکل میں کھلائے گیے ہیں بلکہ دوسری سرزمین کے ادبی گلستان سے بھی قلمیں لے کر لگائی گئی ہیں۔ "قدیم مصریوں کا ادب" کے عنوان سے اخلاقِ طاہوطپ، شوقِ وصال اور اخلاقِ ایمن اموپ، اخلاق و محبت کی خوشبو بکھیرتی ہیں۔ یہ نظمیں اردو والوں سے قدیم مصری ادب کا تعارف کراتی ہیں اور مذہبی کتابوں سے اخذ شدہ دلچسپ کہانیاں بھی سنواتی ہیں جن سے شاعر کی عقیدت کا مظاہرہ اور قاری کی عقیدت میں اضافہ ہوتا ہے۔ "وحشی جی اٹھا" اور دوسری طنزیہ نظمیں میر کی پسندیدہ چھوٹی بحریں ہیں اور تاثر کا بحر بیکراں رکھتی ہیں۔ "شاخ گل" میں غزلیں اور رباعیاں بھی ہیں جن میں پھولوں کی مہک بھی ہے اور بادل کی گرج اور بجلی کی چمک بھی ہے۔ مجھے جو اشعار پسند آئے ان میں سے چند یہ ہیں۔

جسنے اک عہد کے ذہنوں کو جلادی ہو گی　　　میرے آوارہ خیالات کی بجلی ہو گی

لے اڑی جو ترے ہاتھوں کی حنا پچھلے پہر　　　میرے الجھے ہوئے افکار کی آندھی ہو گی

پھر زمانہ مجھے غلط سمجھا　　　جھوٹ پھر بڑھ گیا صداقت سے

کامل انسان کی عظمت کو نہ پہنچا کوئی　　　نہ معلّم، نہ مبلغ، نہ سخنور، نہ ادیب

آپ کا یہ آخری شعر اس تخیل فکر اور جستجو کو پیش کرتا ہے جس کی ضرورت فلاسفہ اور صوفی شعرا مختلف ادوار میں محسوس کرتے آئے ہیں اور اسے مختلف رنگ میں پیش کرتے چلے آئے ہیں مشہور فلسفی دیو جانس کلبی انسان کی تلاش میں چراغ ہاتھ میں لیے گھومتا تھا اسے مولانا روم نے یوں نظم کیا ہے

دی شیخ با چراغ ہمیں گشت گرد شہر　　　کز دام دو دملول انسانم آرزوست

از ہمرہاں سست عناصر دلم گرفت　　　شیر خدا و رستم دستانم آرزوست

خواجہ حافظ بھی انسان اور کامل تر دنیا کی تلاش کرتے ہیں۔

آدم خاکی دریں عالم نمی آید بدست　　　عالمے دیگر بباید ساخت از نو آدمے

اور اقبال سب سے آگے بلکہ حد سے آگے نکل جاتے ہیں۔

خدا ہم در تلاشِ آدم است

اجالے۔ بڑا خوبصورت عنوان ہے آپ کی نعتیہ نظموں، رباعیوں، قطعوں کا یہ مجموعہ روحانی

کیف و سرور سے بھرپور ہے۔ وہ صرف دلوں میں ہی اجالا نہیں کرتا روح کو بھی نورِ حقیقت سے منور کرتا ہے۔ آپ کے اس کلام میں بلا کی روانی، آمد اور ترنم ہے۔ جذبات کی فراوانی بھی غضب کی ہے۔ اس سے آپ کی والہانہ عقیدت مندی کا اظہار ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے جو کچھ کہا ہے وہ صدقِ دلی سے کہا ہے، جذبہ دل سے سرشار ہو کر کہا ہے، جذبِ دل میں ڈوب کر کہا ہے۔ اسی لیے ہر شعر ایک مقناطیسی کشش اور سحر آفریں اثر رکھتا ہے۔ ان الہامی کیفیات کی شاعری سے کوئی قاری کوئی سامع متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں اپنی پسند لکھوں تو شروع سے آخر تک پورا مجموعہ کلام دہرانا ہوگا۔ ولادت رسول، قبل از ولادت اور یوم ولادت دونوں نظموں میں مصورانہ انداز اور الفاظ میں منہ بولتی تصویر آپ نے پیش کی ہے۔ تصویر کا پہلا رخ۔

زمیں پہ روشنی نہیں فلک پہ روشنی نہیں
سبب ضرور اس کا ہے کسی کو آگہی نہیں
محبتیں کہیں نہیں عداوتوں کا زور ہے
اذیتوں کا زور ہے، ضلالتوں کا زور ہے
تصورِ حیات پل گیا الم کی گود میں
ابد کی نیند سو چلا بشر عدم کی گود میں
ادب کی خامکاریاں بشر کی خامکاریاں
غرض شمار کیا کریں بشر کی خامکاریاں
زمانہ ہو گیا اسی ڈگر پہ کائنات ہے
اندھیری رات ہے یہاں وہاں اندھیری رات ہے

تصویر کا دوسرا رخ۔

مگر یہ آج کیا ہوا کہ ظلمتیں ہی چھٹ گئیں
بساطِ غم الٹ گئی، مصیبتیں پلٹ گئیں
مگر یہ آج کیا ہوا بشر بنے کھڑے ہیں سب
جہالتوں کے دور کے خدا اکھڑ گیے ہیں سب
یہ سب کو ایک جان سا بنا لیا گیا ہے کیوں
یہ سب کو ایک تار میں پرو دیا گیا ہے کیوں
شگفتہ ہے کلی کلی حسین پھول پھول ہے
یہ روزِ بے مثال ہے ولادتِ رسول ہے

اس رباعی میں کس ادب واحترام اور عقیدت کے ساتھ دعا مانگی گئی ہے اور کیا مانگی گئی ہے۔

افکار و خیالات کی کثرت دینا
بے لاگ کہوں بات وہ طاقت دینا
اک غیر کے تفویض ہے نعتِ احمد
یارب اسے توفیق و فضیلت دینا

اور دینے والے نے ہر فضیلت اور نعمت سے آپ کو نوازا۔ لیکن آپ غیر کہاں ہوئے۔ اس کی نگاہ میں تو سب ایک ہیں۔ اور یوں بھی آپ تو اپنوں سے بھی آگے نکل گئے اور یہ سبقت کیوں نہ ہو۔ کہ

شعر کہتا ہے وہ شہرت کا طلبگار نہیں
درم و دام کا دولت کا طلبگار نہیں
اے نبی تیری شفاعت تیری رحمت کے سوا
تیرا شاعر کسی نعمت کا طلبگار نہیں

پھر ایسے انسان کے لیے اپنے آپ کو غیر کہنا اپنے پرائے سب ہی پر ظلم ہوگا جو یہ کہتا ہو۔

بے کار کی باتوں نے ابھارا ہم کو
عیسےٰ بھی محمد بھی ہے پیارا ہم کو
تقسیم مذاہب سے نہیں کچھ بگڑا
انسان کی تقسیم نے مارا ہم کو

حصہ باب شہادت اور "شورِ غم" میں شہادت کا بیان اور حق و صداقت کے لیے مرمٹنے والوں کا ذکر جس پرجوش انداز میں کیا ہے وہ ایک ایسا بادۂ سرجوش ہے جو دلوں کو گرماتا احساس کو بڑھاتا اور شعور کو بیدار کرتا ہے۔ آپ کی یہ عقیدت آپ کے نام اور کام کو اس داستان کے ساتھ زندہ جاوید رکھے گی۔ ہر دور ہر زمانے میں آپ کے اس پیغام کی ضرورت ہوگی۔

پھر بنانا ہے ہمیں رسم شہادت کے نقوش — پھر ہمیں جذبۂ ایثار دکھانا ہے یہاں
دل کی قوت کے لیے نام شہیداں لے کر — پھر ہمیں قصر ستمگار گرانا ہے یہاں
پھر ہمیں پیاس کے ماروں کا فسانہ کہہ کر — ایک ہنستی ہوئی دنیا کو رلانا ہے یہاں

حقیقت یہ ہے کہ عمل اور ایمان و ایقان کی بنیاد عشق حقیقی پر ہے اور اس دور کا رونا یہ ہے کہ آج صرف عقل کا ہی دور دورہ ہے جو صرف مادیت پرستی سکھاتی ہے۔ دونوں میں جس توازن کی ضرورت اس وقت ہمیں ہے وہ نہیں ہے۔

"باب شہادت" میں آپ کی ایک رباعی کسی حد تک سورہ الشعرا کی آخری تین آیتوں کی تفسیر پیش کرتی ہے جو شاعری کے بارے میں ہیں۔

شاعری کیا ہے خیالوں کی فراوانی ہے
بیقراری ہے نحوست ہے گراں جانی ہے

ہاں مگر آلِ محمد کے لیے وقف ہو جب
سحر و اعجاز ہے برکت ہے درافشانی ہے

دعاے صبح کی اشاعت سے بڑا کام ہوا جس کا ایک ہی نسخہ آپ کے پاس پڑا تھا اور آپ نے ایک نسخے سے ہزار نسخے بنوا کر عوام تک پہنچا دیے۔ ہر عظیم فنکار کے ابتدائی کام میں کچھ ایسی کمی ضرور ہوتی ہے جسے وہ عروج پر پہنچ کر نظر انداز کر دیتا ہے جیسا کہ غالب نے کیا لہ مورخین ادب کے لیے اس کی بھی اہمیت ہوتی ہے۔ اس لیے دعائے صبح کی اشاعت کی ضرورت اور اہمیت ہمہ وقت تھی۔ پھر جب صاحب دعاے صبح کی اہمیت ہے تو پھر اس کی دعا اور اس کے ترجمہ کی اہمیت کیوں نہ ہوگی۔

آپ نے اپنے مقدمہ میں اس ترجمہ کی تاریخ اور مختلف ادوار میں اس کی اشاعات پر روشنی ڈالی ہے اور اس کی فارسی زبان کے سقم پر تبصرہ کر کے اسے غالب کے عہد جوانی کی کوشش ثابت کیا ہے گویا غالب کو ایک اعتراض سے بچا لیا ہے۔

SILENT FLAME کا یہ عنوان شعلہ خاموش کا بہت اچھا ترجمہ ہے اسی طرح اس کی نظموں کا انگریزی ترجمہ بھی ترجمہ معلوم نہیں ہوتا۔ نظمیں انگریزی میں طبع زاد معلوم ہوتی ہیں یہی ترجمہ کی خوبی ہے کہ وہ اصل معلوم ہو۔ میں آپ کی ان ترجمہ شدہ انگریزی نظموں کو کسی مغربی شاعر کے کلام سے مماثلت یا مناسبت دینا نہیں چاہوں گا (اگرچہ دی جا سکتی ہے) کیونکہ میرے خیال میں اس سے شاعر کا اپنا رنگ پھیکا پڑتا ہے اس ملاوٹ سے اس کی انفرادیت مجروح ہوتی ہے پھر مغربی طرز فکر اور ہماری طرز فکر میں بھی تفاوت ہے۔ ہم ادب میں یا زندگی کے کسی شعبہ میں بھی صرف وہی چیزیں لے سکتے ہیں جو ہماری سرزمین، تہذیب و تمدن کے لیے سازگار ہوں، ہماری روایات پر اثر انداز نہ ہوں۔ یوں اندھی تقلید اور نقالی کی بات اور ہے۔ کئی اصناف سخن جو مغرب کی پیداوار تھیں وہاں بطور فیشن رائج ہو کر ختم بھی ہو گئیں لیکن یہاں ابھی تک ان کا ڈھول پیٹا جا رہا ہے۔ اس نقالی سے اردو زبان اور ادب کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اس کا اندازہ ان نقالوں کو نہیں ہے۔ اس سے ہماری شاعری کا حسن ختم ہو رہا ہے اور وہ عوام سے دور ہو رہی ہے۔ مغرب کے بہت سے شعرا ہماری شاعری پر رشک کرتے ہیں۔ بی بی سی لندن کے ایک اردو پروگرام میں ایک انگریز شاعر کے متعلق سنا جو یہ کہتا ہے کہ اے کاش ہماری شاعری بھی اردو شاعری کی طرح ہوتی اور اسے اسی طرح پڑھا جا سکتا۔ نظم و نثر دونوں میں ہی نئے نئے تجربوں کے نام پر ان

نیم حکیموں کے ہاتھوں اردو شعروادب اور زبان کی جان پر بن رہی ہے۔ یوں کہنا چاہیئے کہ یہ لوگ بنا رہے ہیں لیکن جسے خدا رکھے اور اسے کون چکھے۔ اس کے سر پر صوفیائے کرام کا ہاتھ ہے اور عوام کے دلوں کا ساتھ ہے بہر حال آپ اس غلط روش پر کچھ لکھیں تو اردو زبان و ادب کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔

"شاعر" نے آپ پر بہت اچھا شمارہ نکالا ہے۔ اس نمبر میں مضامین سب اچھے ہیں۔ لیکن آپ کی تمام تصانیف اور مجموعہ ہائے کلام پر بھرپور کام نہیں ہوسکا۔ گنجائش بھی تو اوراق میں اتنی نہیں۔ سب لکھنے والوں نے اختصار سے کام لیا ہے۔

گیان چند صاحب نے اگرچہ ذرا تفصیل دی ہے پھر بھی ع "حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔" اس میں شک نہیں کہ انھوں نے اپنے جائزوں میں حق گوئی اور حق شناسی سے کام لیا ہے لیکن بعض جگہ حق ناشناسی بھی کی ہے جن کا جواب میں نے اپنے خط میں دیدیا ہے۔ ایک اعتراض کہ انھوں نے اچھے کاغذ کے استعمال کو "اسرافِ بیجا" لکھا ہے (اسراف کے تو معنی خود ہی فضول خرچی کے ہیں اس کے ساتھ "بیجا" کا استعمال بیجا معلوم ہوتا ہے۔ یا پھر "صرف بیجا" لکھا جاتا تو مناسب ہوتا) دوسرے مشرقی افریقہ کے متعلق آپ کی تصنیف پر یہ اعتراض ہے کہ اس میں وہاں کے قبائلی اور وہاں کے جانوروں وغیرہ کا ذکر نہیں ہے۔ تیسرے دعاے صبح کی اشاعت پر اعتراض ہے۔ بہر حال یہ اپنا اپنا خیال ہے انھوں نے اپنے خیال کے مطابق مناسب سمجھ کر اعتراضات کیے ہیں جو میرے خیال میں غیر مناسب ہیں۔ جہاں جہاں ان باتوں کا ذکر آیا ہے میں نے اپنے خیال کا اظہار کردیا ہے۔

بڑی حیرت یہ ہے کہ آپ کی نعت اور مراثی کے مجموعوں کا ذکر تو ہوا لیکن کسی نے آپ کی نعتیہ شاعری اور مرثیہ گوئی کی اہمیت واضح نہیں کی اور نہ ان کے محاسن کو اجاگر کیا جس طرح کہ کرنا چاہئے تھا آپ کی نعت اور مراثی میں جو ایک نیا رنگ اور ڈھنگ ہے اسے دکھانا چاہئے تھا۔

اس شاعری میں جو اعتقادات ہیں' اخوت و محبت ہے' مذہبی رواداری ہے' دوسرے مذاہب کے لیے احترام ہے' عالمی انسانی برادری اور محبت کا جو اسلامی نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے اور اس کے پیش کرنے میں یک جہتی کا جو جذبہ کار فرما ہے اسے نمایاں کرنے کی ضرورت تھی۔ یہ بھی ایک دوا ہے ایک نسخہ ہے نفرت اور تعصب کے اس مرض اور وبا کے لیے جو ہمارے ملک میں پھیلا ہوا ہے۔

ہاں آپ کے کردار اور شخصیت کے متعلق خوب لکھا گیا ہے اور اس پر اچھی روشنی ڈالی گئی ہے

"میرے خاوند" پر آگے ذرا تفصیل سے لکھوں گا۔

آپ کی شاعری میں بقول اقبال "اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی" ہے۔ اقبال نے دعا مانگی تھی "خدایا مرا نور بصیرت عام کر دے" ایمان وایقان کی روشنی اور اس کے استحکام کے لیے یہ عمل کارگر تھا اور مادیت پرستی کے پھیلتے ہوئے مرض کی روک تھام کے لیے یہ نسخہ تیر بہدف تھا۔ آج ضرورت ہے کہ آپ یہ دعا مانگیں "خدایا مرا جذبۂ دل عام کر دے" کہ یہی فرقہ واریت کے زہر کے لیے تریاق اور قومی یک جہتی کے لیے اکسیر ہے۔

میں آپ کی شاعری سے بہت متاثر ہوا اور لطف اندوز بھی ہوا۔ آپ کے اشعار دوسروں کو بھی سنائے اجالے اور شعور غم کا کلام بھی اپنے ہندو مسلم سکھ احباب سب کو سناتا ہوں تاکہ بقول حفیظ

دوستوں کو بھی ملے درد کی دولت یا رب
میرا اپنا ہی بھلا ہو مجھے منظور نہیں

انتخاب آتش وغالب از چکبست۔ چکبست پر آپ کی محنت نے اس کے کام اور نام کو زندہ جاوید کر دیا ہے اس سے پیشتر کسی نے اس فراموش شدہ شاعر کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ آپنے اس کی خدمات کے منتشر اوراق کو یکجا کر کے اس کا جائز مقام اسے دلا دیا۔

انتخاب کے متعلق یہ اعتراض کہ وہ اچھا نہیں ہے رسالہ کی بھرتی کے لیے کیا گیا ہے یا انتخاب کرنے والے کے اپنے معیار کے مطابق نہیں درست نہیں معلوم ہوتا۔ انتخاب کا معاملہ کچھ ایسا ہے کہ پسند اپنی اپنی خیال اپنا اپنا اور ذوق بھی اپنا اپنا کار فرما ہوتا ہے۔ انتخاب کرنے والا اسی لحاظ اور معیار سے انتخاب کرتا ہے اور پرکھنے والا اپنے ذوق اور پسند کے لحاظ سے پرکھتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ پرکھنے والے اور انتخاب کرنے والے کا ذوق اور پسند ہم آہنگ ہو جائے۔ البتہ ایک عام قاری اس جھنجھٹ اور الجھن میں نہیں پڑتا وہ شعر کو شعر کی خوبی کے لحاظ سے دیکھتا ہے اور لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے چکبست کے یہ دونوں انتخاب اس کے ذوق منتخب کی نشان دہی کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ سے

یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

دیباچہ میں چکبست نے اس انتخاب کی جو غرض وغایت بیان کی ہے اس کی آج اور بھی زیادہ

ضرورت ہے کہ "قدیم مذاق کی یاد تازہ رہے اور سچی شاعری کی تصویریں غفلت و ناواقفیت کے پردہ میں چھپ نہ جائیں۔"

اس انتخاب میں آپ کے "عرضِ حال" میں مٹ کے آخر میں کتابت کی ایک غلطی ہوتی ہے۔ آئندہ اشاعت میں اسے درست فرمالیں۔ اس میں لکھا ہے ۔ "مجھے یقین ہے کہ ایک برگزیدہ شاعر کا کہا ہوا و نہایت برگزیدہ شاعروں کے کلام کا انتخاب اہل ذوق کو اپنی طرف متوجہ کرے گا۔" یہاں کہا ہوا کی جگہ کیا ہوا ہونا چاہئے۔ محاوروں کی بات کچھ ایسی ہے کہ لکھنے میں یا بولنے میں ان کے استعمال میں اکثر سہو ہو جاتا ہے کیونکہ یہ اکثر یادداشت سے محو ہو جاتے ہیں۔ آج کل لکھنے پڑھنے اور بولنے میں بھی ان کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے۔ ادب عالیہ کے شوقین اور بلند ذوق رکھنے والے اس کی اہمیت سمجھتے ہیں اور زبان کے حسن کو دوبالا کرنے کے لیے ان کا استعمال کرتے ہیں۔ آپ کے ہاں یہ حسن بدرجہ اتم موجود ہے۔

کلیاتِ چکبست۔ آپ نے حرفِ اول میں چکبست کی شاعری اور ان کی زندگی کے مختلف گوشوں کو جس طرح نمایاں کیا اور جو کچھ کہا ہے وہ بجائے خود حرفِ آخر ہے۔ تقلید غالب و آتش پر آپ نے بڑی جستجو سے لکھا ہے اور تینوں شعرا کے اشعار کی مثالیں دے کر چکبست کی انفرادیت کو ثابت کیا ہے۔ اسی طرح چکبست کی زبان و بیان کے معترضین کا نہایت مدلل جواب اساتذہ کے اشعار سے اپنی تشریح کے ساتھ خوب دیا ہے۔ چکبست کی غزلوں کا گوشوارہ بھی آپ نے خوب تیار کیا ہے۔

آپ کا حرفِ آخر بھی حرفِ حق ہے خصوصاً "گفتنی" کہ "بڑے چھوٹے شاعروں میں امتیاز کرنے کا کوئی آلہ میرے پاس نہیں ہے کیونکہ بڑے شاعروں کے ہاں معمولی شاعری کے انبار موجود ہیں اور چھوٹے شاعروں کی خاکستر میں عظیم شاعر کی چنگاریاں مل جاتی ہیں۔"

تعجب ہے کہ کچھ لوگ چکبست پر آپ کے کام کے پیچھے مذہبی جذبہ کارفرما بتاتے ہیں۔ وہ لوگ غالب پر آپ کے کام کے پیچھے کون سا جذبہ کارفرما بتاتے ہیں۔ اور آپ کے نعتیہ کلام، مرثیہ، نوحہ، منقبت کے پیچھے کون سا جذبہ کارفرما بتاتے ہیں۔ فرقہ واریت کا الزام اکثر عظیم فنکاروں پر لگایا جاتا ہے اقبال پر بھی یہ الزام عائد کیا گیا کیونکہ ہمارے ہاں ہر چیز کو مذہب کی عینک سے دیکھا جاتا ہے۔ یہاں تو رنگوں کا بھی مذہب ہوتا ہے۔ سبز رنگ مسلمان ہوتا ہے اور زعفرانی رنگ ہندو ہوتا ہے۔

جسے ہے فکر مرہم کی اسے قاتل سمجھتے ہیں الٰہی خیر ہو یہ زخم اچھا ہو نہیں سکتا

(چکبست)

حصہ نظم میں بڑی اچھی نظمیں ہیں۔ پیران نکوکار، تنبیہہ، آب انگور، قوم کی حالت اور کئی نظمیں ایسی ہیں جن میں دیا ہوا پیغام آج بھی اس وقت سے کچھ زیادہ ہی اہمیت رکھتا ہے۔ ان نظموں سے چکبست کے سیاسی شعور کی اہمیت، وطن پرستی، انسان دوستی اور آزادی کی لگن کا اندازہ ہوتا ہے

غزلوں کے حصے میں آپ نے ہر غزل کے ساتھ اس کی تاریخ اور تھوڑا سا پس منظر بھی دیدیا ہے آپ کی یہ جدت بہت خوب اور کار آمد ہے جو لطف کو دوگونہ کرتی ہے۔ غزلیں تعداد میں مختصر لیکن کمال سخنوری میں فزوں تر ہیں۔ ان کا کلام ہی قدما اور ان کے ہمعصر شعرا میں ان کے صف اول کا شاعر ہونے کی ضمانت ہے۔

مقالات چکبست ۔ آپ نے اپنے اس تحقیقی کام کو مختلف عنوانات کے تحت بڑے سلیقے سے سلسلہ وار ترتیب دیا ہے۔ چکبست کے نثری اثاثہ پر ایک نظر، چکبست بحیثیت محقق، چکبست اور طنز و مزاح، تبصرہ تنقید وغیرہ، اس طرح ان کی نثر نگاری کے سب پہلو قاری کے سامنے آجاتے ہیں۔ آتش کے خطوط بنام شرر کے تحت چکبست کے شرر سے ادبی معرکے دلچسپ ہیں۔ رفتار قوم کے عنوان سے چکبست کی تحریریں اس دور کے سیاسی حالات اور تحریک آزادی کی دلچسپ خبروں سے باخبر کرتی ہیں۔ وہ سیاسی خبروں کو ادبی عنوانات کے ساتھ شائع کرتے تھے۔ مثلاً جام و سبو نئے ہیں نیا کارخانہ ہے کاغذی صلح، دردوست سحہ دارم و بینا در آستیں، وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے، وغیرہ۔

حسرت آزاد، حسرت کے عقائد اور بیگم حسرت پر چکبست کا اظہار خیال بہت دلچسپ ہے حسرت اور بیگم حسرت کی قربانیوں کا ذکر وہ بڑے دلنشیں انداز میں کرتے ہیں جو آج کل نوجوانوں کے لیے بھی سبق فراہم کرتا ہے۔

"ہم نہایت ادب سے بیگم حسرت کی خدمت میں اس موقع پر مبارکباد عرض کرتے ہیں اور قوم کے نوجوانوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس دیوی کے قدموں کے نیچے بیٹھ کر استقلال اور ایثار نفس کا سبق حاصل کریں"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ چکبست کے دل میں فرقہ واریت اور مذہبی تعصب سے بلند ہو کر قوم کے سچے خدمتگذاروں کی کتنی عزت تھی اور نوجوانوں کی اصلاح و بہبودگی کے لیے کتنا جذبہ تھا۔

غالبیات چند عنوانات ۔ آپ کے یہ چیدہ چیدہ تحقیقی مضامین مجھے بہت پسند آئے غالب کا ملازم خاص کلّو داروغہ آپ کی ادبی مساوات پسندی کا ثبوت ہے۔ جہاں آپ نے غالب جیسے عظیم شاعر پر تحقیقی کام کیا وہاں کلو جیسے معمولی ملازم کو بھی اہمیت دی۔ اقبال کا ملازم مولا بخش اردو ادب میں زندہ جاوید ہوا تو آپ نے کلو کے نام کو بھی ادب میں جاوداں کر دیا کلو کا ذکر تو بہت سے محققین نے کیا ہے لیکن اسے بطور تحقیق موضوع خاص آپ نے بنایا ہے۔

غوث علی شاہ قلندر پانی پتی بہت خوب ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب اپنی رندی کے باوجود کتنے خوش عقیدہ تھے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ صوفی اور متقی بھی ان کے پرستاروں میں تھے۔ سید جمیل الدین بغدادی کا ذکر بھی اسی زمرہ میں آیا ہے۔ بڑی مسرت ہوئی کہ آپ کی دوستی ایسے خدا دوست انسان سے رہی۔ کیوں نہ ہو ولی را ولی می شناسد۔ خدا دوست انسان کا دوست بھی خدا دوست ہی ہوتا ہے۔ ان کے لیے آپ کی دعائیہ سلامت روی و باز آئی' آدھی قبول ہوئی۔ چلیے کوئی درجۂ ولایت آپ کو مل گیا۔ "بیاض جمیل" بھی خوب رہی یہ سلسلہ جاری رہے تا کہ بقول آپ کے "شہر شہر غالب غالب" ہوتی رہے اور بقول جمیل الدین بغدادی مرحوم (بہر دور، بہر طور) غالب سب پر غالب رہے۔

"مکتوبات شوکت" کے کیا کہنے ہیں۔ پر شکوہ الفاظ' مقفّیٰ مسجع زبان' محاورہ بندی کے حسن سے مزین ایک زمانے کے بعد زبان کا یہ چٹخارہ میسر آیا جا بجا بر محل اشعار نے لطف دوبالا کیا۔ اس دور کی معاشرت اور تہذیب میں طوائف کو بھی ایک اہمیت حاصل تھی وہ اپنی ذہانت اور علمی قابلیت میں بھی کم نہ ہوتی تھیں۔ ان خطوط سے اس زمانہ کی ایک جھلک سامنے آجاتی ہے۔

"بیاضِ رفعت" آپ نے ادبی نوادرات کی جھلکیاں بھی اپنے علمی ادبی خزانہ سے نکال کر دکھا دی ہیں اور اس میں سے بھی انتخاب کر کے خاصہ کی چیزیں قاری کے سامنے رکھدی ہیں۔ اس تذکرے میں دوسرے تذکرے بزرگوں کے' اہل فن کے اور ان کی تصانیف کے ملتے ہیں۔ ملا عبدالمومن دہلوی معروف بہ ملا دو پیازہ کا ذکر' اس دور کی خبریں' حضرت نظام الدین اولیا کی رباعی پھر حواشی میں دی ہوئی تشریحات تاریخی حیثیت سے کار آمد ہیں۔ مولانا فضل حق خیر آبادی کا تاریخی قصیدہ خود ان کی زندگی کے تاریخی واقعات اور انگریزوں کے مظالم کے پس منظر میں بہت پر درد اور موثر ہے۔

مولانا کی جنگ آزادی سے بے تعلقی کے جواز میں مالک رام صاحب کا جائزہ اگر درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر مولانا کی اسیری اور سزا کے کیا وجوہ۔ اس سوال کے پیش منظر آپ کی ذاتی رائے

قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنی جان بچانے اور رہائی حاصل کرنے کی خاطر یہ رویہ اختیار کیا ہوگا۔

"درفش کاویانی" سے لے کر "اردوئے معلےٰ" تک آپ نے غالب کے متعلق جو درِ بے بہا جمع کیے ہیں وہ مستقبل کے محققین کے لیے مشعل راہ ثابت ہوں گے۔

ہندوستانی مشرقی افریقہ میں (جلد اول)۔ افریقہ کی جغرافیائی تاریخ اور اس تاریخ سے متعلق مختلف انگریزی کتابوں کی تاریخ، وہاں بسنے والے ہندستانیوں کی تاریخ اور وہاں کی تاریخی ہستیوں کی تاریخ سے آراستہ یہ مختلف تواریخ کا مجموعہ نہایت دلچسپ ہے۔ خصوصاً چانن سنگھ کی سوانح حیات بہت دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ البتہ جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں افریقہ کے قبائل، وہاں کے جنگل اور جنگلی جانوروں کا ذکر ہونا چاہئے تھا وہ نہیں ہے۔ یہ اعتراض درست معلوم نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ آج کل تو انسان خود ہی جنگلی جانوروں کی طرح ایک دوسرے کو پھاڑے کھا رہا ہے مارے ڈال رہا ہے تو ایسی حالت میں عظیم انسانوں کا ذکر ہی زیادہ موزوں اور مناسب معلوم ہوتا ہے۔

آپ کی عنایت کردہ کتابوں سے بہت متاثر اور محظوظ ہوا۔ خوب علم کے دریا بہائے ہیں، غور و فکر اور تحقیق کے گوہر آبدار نکال کر لائے ہیں۔ آپ کی محنت اور لگن کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

مغربی طرز پر آپ کی کتابوں کا خوبصورت گٹ اپ مجھے بہت پسند آیا جو کتابیں حسنِ باطن سے مزین ہیں وہ حسنِ ظاہر سے بھی آراستہ ہونی چاہئیں کم از کم ایسی بلند معیار کتابوں کی اشاعت اعلیٰ کاغذ کتابت و طباعت کے ساتھ عام معیار سے علیحدہ ہی ہونی چاہئے۔ ڈاکٹر گیان چند صاحب کا "شاعر" میں عمدہ کاغذ کے استعمال پر اسراف کا اعتراض بے جا معلوم ہوتا ہے بس اسے صرفِ بجا سمجھتا ہوں۔

"شاعر" کا خاص نمبر جو آپ کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ اس کے بھی سب مضامین پڑھے۔ مجھے اور گھر میں سب کو "میرے خاوند" سب سے زیادہ پسند آیا۔ معلوم ہوا کہ بھابی صاحبہ بھی کسی سے کم نہیں اور کیوں نہ ہوں آخر بیگم کس کی ہیں۔ لیکن چھپی رستم نکلیں ہم کو بتایا بھی نہیں کہ ہندی میں لکھتی ہیں اور خوب لکھتی ہیں۔ اگر اردو میں لکھتیں تو آپ کے لیے توشہ مات رکھی ہوئی تھی انھوں نے ایک بڑے مزے کی بات کہی ہے "غالب تو مر گیا ہمارے لیے مصیبت کھڑی کر گیا"۔ وہ بیچارہ زندگی میں خود

اپنے لیے مصیبت رہا اور مرنے کے بعد دوسروں کے لیے مصیبت ہو گیا لیکن اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لیے نسخہ بھی انھوں نے ہی تجویز کر دیا ہے کہ اگر شوہر شاعر یا محقق ہو تو بیوی کو بھی محقق یا شاعرہ ہی ہونا چاہئے۔ اس لیے اب کیوں نہ وہ بھی محقق ہو جائیں اور کالی داس گپتا رضا پر تحقیق شروع کر دیں اگرچہ ان کا یہ مضمون بھی تحقیق سے کچھ کم نہیں بس اس میں اضافہ شروع کر دیں ظاہر ہے اس کام کو ان سے بہتر کون کر سکتا ہے۔ تو یہ 'عوض معاوضہ گلہ نہ دارد' دونوں برابر ہو جائیں گے یا پھر یوں ہو گا کہ "خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو" بہر حال مسئلہ حل ہو جائے گا۔ کسی کو کسی سے شکوہ نہ ہو گا۔

ایک اور بات جو محسوس کرتا ہوں کہہ دوں۔ موجودہ نئی نسل میں آپ جیسی ہستیاں اگر عنقا نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔ اس دور میں جبکہ خود اردو والے ہی بہت سے ادیب اور شاعر الٹی چھری سے اردو کو ذبح کرنے پر تلے ہوئے ہیں آپ خاموشی کے ساتھ گوشہ نشینی میں اس کے لیے مسیحا کا کام کر رہے ہیں۔ آپ کی خدمات کو دیکھتے ہوئے آپ کو وہ صلہ اور مقام نہیں ملا جو ملنا چاہئے تھا۔ یہ پروپگنڈے کا زمانہ ہے اس لیے "حق بحقدار نمی رسد"۔ خیر آپ اس سے بالاتر ہیں۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔

ایک اہل علم ہونے کی حیثیت سے آپ کے لیے یہ کہا جا سکتا ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا (اقبال)

اور بحیثیت انسان کہا جا سکتا ہے ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
جب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں (میر)

ڈاکٹر آدم شیخ

دو چار ملاقاتوں میں......

دوبدو پہلی ملاقات سے قبل ہی میں نے محقق اور شاعر رضا صاحب کی ایک خیالی تصویر ان کی تحریر کی لکیروں اور ان کی شاعری کے رنگ و نور سے، ان کی تحقیق، دقت پسندی کے کینوس پر بنانے کی کوشش کی تھی۔

ایک فنکار سے ملاقات اور شناسائی، ایک عام آدمی کے ملنے سے کہیں مختلف ہوتی ہے۔ ایک عام آدمی کی طرح ایک فنکار اپنی گفتگو اور عمل سے پوری طرح گرفت میں نہیں آتا۔ اس کے سمجھنے کے لیے اس کے شعور و لاشعور میں اترنا پڑتا ہے اور اس کی تحریروں کے سینے چاک کر کے عرفان و آگہی حاصل کرنی پڑتی ہے۔ کسی فنکار کو پڑھنے والا اگر اس عمل بازیابی سے بے بہرہ ہو تو اس کے لیے تخلیق کار کی شناخت کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ خاکسار نے بھی پتہ نہیں کس جذبے کے تحت رضا صاحب کی نظم و نثر کو توجہ سے دیکھنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ رضا صاحب کی خیالی تصویر میں مختلف قسم کے رنگوں نے نمایاں ہونا شروع کیا لیکن یہ رنگ آمیزی، تصویر کو واضح نہیں کر پا رہی تھی کہ اچانک بمبئی کے ایک ماہنامہ "صبح امید" میں ان کی تصویر پہلی مرتبہ نظر آئی۔

رضا صاحب کی تصویر کیا نظر آئی، تصور اور حقیقت میں کشمکش شروع ہوئی، یہ ایک ایسا موڑ تھا جہاں تخیل حقیقت سے سمجھوتہ نہیں کر پا رہا تھا۔ "صبح امید" میں رضا صاحب کی تصویر ایک زاویے سے کھینچی ہوئی لگتی تھی جس میں انھوں نے بلا کی سنجیدگی اوڑھ لی تھی اور لباس کا رکھ رکھاؤ بھی عمومی تھا۔ ان کے لباس پر ایک معمولی سی شکن بھی نہیں تھی۔ جب کسی تصویر میں سلیقے، سنجیدگی اور باقاعدگی سے کام لیا جاتا ہے تو اصل صورت و شکل مسخ

ہوجاتی ہے اور صرف پرچھائیں باقی رہ جاتی ہے۔ تصویر دیکھ کر میں نے یہ سوچنا شروع کیا
کہ ایک عام آدمی کی باقاعدگی اور ہموار سلیقے سے تصویر کھنچوانے والا یہ انسان اپنے اندر تحقیقی
جستجو کی وہ تڑپ، فن کی وہ خوب صورت بے ترتیبی اور شاعری کا وہ دانشمندانہ جنوں جو
تخلیق کو الہامی سطح پر لے جاتا ہے، کس طرح فراہم کرتا ہے، ظاہر و باطن کا یہ تضاد اس
فنکار کی ذات میں قدم بہ قدم کس طرح نباہ کرتا ہے۔ اور تقریباً بیس سال بعد "سہو کراباغ"
میں ان کی تصویر دیکھ کر مجھے ایک طرح کی تسکین کا احساس ہوا کیوں کہ اُس تصویر میں
ان کی آنکھوں میں ایک محقق کی عقابی جستجو، ان کے چہرے پر ایک شاعر کا
کرب اور ان کے بالوں میں تجربے کی سفیدی جھلک رہی تھی۔ اس تصویر میں لاابالی
انداز پایا گیا تھا جو اس حقیقت کا غماز تھا کہ اب قلم کار، روح اور کائنات کی گہرائیوں
میں ڈوب کر خیالات و احساسات کی ترجمانی اور درد و کرب کی عکاسی کا شعور حاصل
کر چکا ہے۔

ابتدا میں رضا صاحب کے نثر و شعر کو نظر انداز کر دیا گیا تھا، ان کے بارے میں یہ
اطلاعیں ملی تھیں کہ وہ ایک بے حد مالدار تاجر ہیں اور افریقہ کے کسی شہر میں مقیم ہیں
میں نے نہ جانے کیوں ان کو ان مال دار قلم کاروں میں سے ایک شمار کیا جو
اپنی دولت کے سہارے نثار اور شاعر بننے کی کوشش کرتے ہیں اور ادب کو تفریح اور
شہرت کا ذریعہ بناتے ہیں۔ میرے علم میں دو ایک ایسے واقعات پہلے ہی تھے۔ بمبئی
کے ایک رئیس شاعر سے میں اچھی طرح واقف تھا، جن کے بے شمار گھوڑے، ریس
میں دوڑا کرتے تھے۔ موصوف کے اشعار ملک کے بیشتر رسالوں میں نظر آتے تھے اور
خاصے ہوتے تھے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ بے زبان جانوروں کو دوڑا کر دولت کمانے والا
یہ خود ساختہ شاعر، ایک بے کس، غریب، ضرورت مند اور محتاج زبان داں شاعر کے فکر
و فن کو خرید کر کس طرح ادبی شہرت کما رہا ہے۔۔۔ اور اس روز تو مجھے اپنی آنکھوں پر
یقین ہی نہیں آیا جب عمارات کے ایک ٹھیکیدار شخص کا ایک تحقیقی مضمون کسی
رسالے میں دیکھا۔ یہ صاحب دراصل سرے سے اردو ہی نہیں جانتے تھے لیکن انھوں
نے غالب کی شاعری کا محققانہ جائزہ لیا تھا میں نے شدت سے اس تکلیف دہ حقیقت
کو محسوس کیا کہ تخلیقی ادب کی ساری توانائی، صلاحیت اور انقلابی روح، افلاس اور

ضرورت کے وقتی شکنجے میں کس طرح جکڑ جاتی ہے۔ ایک بے بس فنکار کے خون سے تونگر افراد کے اجاڑ اور بے رنگ خاکوں میں کس طرح گل کاری کی جاتی ہے۔

غرض یہ کہ رضا صاحب کو اسی زمرے میں شامل کرکے میں بھی انھیں اور ان کی تخلیقات کو نظر انداز کرتا جارہا تھا کہ یکبارگی ان کے ایک تحقیقی مضمون نے میرے تعصبات کو بکھرا کر رکھ دیا۔ مضمون مجھے یاد نہیں کون سا تھا لیکن اس سے اس بات کا واضح اندازہ ہوا کہ اس طرح کی تحقیق خریدی نہیں جا سکتی، اور یہ کہ تحقیق کا یہ زاویۂ نظر، اردو کے کسی خریدار ادب محقق کا نہیں ہے۔ اور پھر ان کی نثری اور شعری تخلیقات کو میں توجہ سے دیکھنے لگا۔ شاید اسی موقع کے لیے کہا جاتا ہے کہ جادو وہ جو سر پہ چڑھ کر بولے۔

اسی اثناء میں رضا صاحب بمبئی میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہو گئے۔ میرے دل نے بارہا یہ چاہا کہ ان سے قریب ہو کر ان کے اندر جھانکنے کی کوشش کروں اور یہ معلوم کروں کہ بظاہر کاروباری ذہنیت رکھنے والا یہ بینکر، اپنی تخلیقات میں خلوص، لطافت اور حقیقت کی رنگ آمیزی کے لیے خونِ جگر کا استعمال کس طرح کرتا ہے۔ ان سے ملاقات کی آرزو نے بارہا سر اٹھایا لیکن راہ میں خودداری، تساہل اور مصروفیت کی اتنی دیواریں حائل تھیں کہ ان سے ملنے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اور میری یہ خواہش لاشعور کے دھندلکوں میں گم ہو کر رہ گئی۔

وہ جو کہتے ہیں کہ 'حیلے روزی، بہانے موت'، تو اس میں یہ بھی شامل کر لیا جائے کہ حیلے قربت، بہانے ملاقات۔ ہوا یوں کہ بمبئی یونیورسٹی کے اردو بورڈ کے لیے، چند ایسے افراد کی شمولیت کا مسئلہ سامنے آیا جو ادب کے معاملے میں ایک متوازن اور بالغ نظر رکھتے ہوں۔ بورڈ کے ایک ممبر کی حیثیت سے میری نظر انتخاب، بغیر پس و پیش، رضا صاحب پر پڑی جو خوش قسمتی سے اپنی خواہش کے برخلاف اردو بورڈ کے ممبر ہو گئے۔ کہتے ہیں قربت، دو افراد میں لگاؤ اور محبت پیدا کرتی ہے لیکن رضا صاحب سے دو چار ملاقاتوں کے بعد میں نے یہ محسوس کیا کہ قربت دو انسانوں کے تاثرات اور تصورات کو صحیح راہ پر ڈال دیتی ہے۔ ان سے ملنے کے بعد کتنے واہمے چھٹ گئے، کتنے تعصبات گم ہو گئے اور کتنے نئے زاویے ابھر آئے۔

رضا صاحب سے دو چار ملاقاتوں کے بعد ہی یہ روشن ہو گیا کہ اگر آج کسی فنکار کی

ذات غلط فہمیوں کا شکار، افواہوں کا مرکز اور پڑھے لکھے طبقے کی لاعلمی اور بے اعتدالی کا نشانہ ہے تو وہ رضا صاحب کی ذات ہے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اردو والوں کی نظر میں وہ محض اس لیے قابل اعتنا، اور مورد احترام ہیں کہ وہ ایک ہندو ہوتے ہوئے، ایک " ہندو دشمن " زبان اردو میں تحقیقی و تخلیقی کام کر رہے ہیں گویا رضا صاحب سے اردو والوں کی محبت، ان کی " دشمن نوازی " کا صلہ تھی۔ بعض سادہ لوح دوستوں نے انھیں برصغیر میں اردو کا آخری ہندو اسکالر گردانا ہے جو اردو کی دامے، درمے، سخنے، خدمت کر رہا ہے۔ رضا صاحب کی شخصیت اور فن سے شدید سے شدید محبت بھی اس غلط بیانی کا جواز پیدا نہیں کر سکتی۔ ان سے قریب ہو کر مجھے تو یہ محسوس ہوا کہ یہ حضرت " آخری ہندو اسکالر " تو کیا ہوں گے، سرے سے ہندو ہی کہاں ہیں۔ کسی اہل قلم کو عقائد کے شیشے میں مہر بند کرنا، بے معنی سی بات ہے۔ وہ اول و آخر انسان ہوتا ہے اور انسان ہی اس کی منزل ہوتا ہے جملہ اصناف سخن کے علاوہ والہانہ انداز میں نعت و منقبت کہنے والے اس فنکار کو محض ہندو کہہ کر روشناس کرانے والے نادان دوست، نادانستہ طور پر رضا صاحب کے قدوقامت کو چھوٹا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

رضا صاحب بینکر ہیں، روپیوں کا لین دین کرتے ہیں یہ ان کا بزنس ہے۔ بہت سے دوستوں کا خیال ہے کہ ان کی ادبی سرگرمیاں اور تحقیقی خون آشامیاں، چاندی کے پہیوں پر رواں دواں ہیں۔ مجھے بارہا حیران ہونا پڑا، جب میں نے کئی دوستوں، ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کو اکثر رضا صاحب سے صرف اس لیے ملتے دیکھا کہ ان کی تجوریوں میں بقول ان مداحوں کے (غلط یا صحیح) کرنسی نوٹوں کے انبار ہیں۔ ان اردو دوستوں کی ستم ظریفی کا بھی کوئی جواب نہیں، بڑا افسوس ہوتا ہے جب رضا صاحب کے " مداحوں " کو اس حقیقت سے بے خبر پاتا ہوں کہ ان کے " ممدوح " کی تجوریوں میں کرنسی نوٹ ہی نہیں بلکہ ان کی تحویل میں ہزاروں نادر، کمیاب اور نایاب کتب اور مخطوطات بھی ہیں، جن کا کوئی مول نہیں اور پھر یہ کہ اس ادبی خزانے میں، کرنسی نوٹوں سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے اضافہ ہو رہا ہے۔ پتہ نہیں علم و آگہی کی دنیا میں اہل نظر اور صاحب بصیرت افراد کا کال کیوں پڑتا جا رہا ہے۔ رضا صاحب کے مداحوں

کوان کی اختر شماریوں، زہرہ گداز کاوشوں اور کربناک سحر خیزیوں کا کچھ تو احساس ہونا چاہیئے۔ اردو والوں کی یہ بے بصری، احتساب کی یہ بے خبری اور خطِ امتیاز کی یہ کجی کہاں تک جائز اور مناسب ہے؟

رضا صاحب کہتے تھے کہ دولت اور داد و دہش کی جو شہرت حاتم کو اپنا سارا اثاثہ لٹا کر اور فرہاد کو زندگی بھر تیشہ زنی کر کے نہیں مل سکی وہ مجھے بیٹھے بٹھائے حاصل ہو گئی۔ مجھے ان سے اتفاق ہے کہ ان کی داد و دہش کے متعلق لوگوں کی اکثر باتیں اندازے ہیں۔ کیوں کہ وہ اپنے دست کرم کا علم اپنے بائیں ہاتھ کو بھی نہیں ہونے دیتے ہاں اس غلط فہمی نے رضا صاحب کو کچھ موقع بے موقع "فائدے" بھی پہنچائے ہیں۔ ایک تو ان کے حلقے میں نئے نئے موقع پرست ملاقاتیوں کا خواہی نخواہی اضافہ ہو رہا ہے اور دوسری جانب ہر ملنے والا ایک خاص ذہن کے ساتھ ان سے فدویانہ انداز میں ملتا ہے۔ اور ان کی تحریروں کی ایسی ایسی تعبیریں کرتا ہے کہ کبھی کبھی خود رضا صاحب ششدر رہ جاتے ہیں۔

دو چار ملاقاتوں میں میں نے تو یہ رائے قائم کی ہے کہ بیوپار کے معاملے میں رضا صاحب بے حد محتاط ہیں کیوں کہ بینکنگ کا بزنس ہی ایسا ہے اور ایک دور اندیش اور سمجھ دار آدمی کے لیے غالباً یہی طرزِ عمل مناسب ہے اگر وہ فراخ دلی سے ہر کس و ناکس کی مٹھیاں گرم کرنے لگیں تو وہی ہاتھ کسی روز، ذراسی رنجش اور ناکامی کے بعد، ان کی شخصیت، فن اور افکار کے تاج محل پر بے تحاشا پتھراؤ کرنا شروع کر دیں گے۔

حق تو یہ ہے کہ ان کی کاروباری صلاحیتوں نے ان کی تخلیقات میں ایک نفاست اور سلیقہ پیدا کر دیا ہے۔ وہ اپنے روپیوں کی طرح اپنے خیالات کو بھی مناسب انداز میں استعمال کرتے ہیں اور الفاظ کے خزانے کو کم سے کم خرچ کرتے ہیں۔ لوگ عام طور پر دولت اور حماقت میں چولی دامن کا ساتھ سمجھتے ہیں لیکن میں نے رضا صاحب کو اس طرح سوچنے والے "عقل مندوں" کی حماقت پر مسکراتے دیکھا ہے۔ ان کے شعر کی داد دے کر دام وصول کرنا اور ان کی تحقیق کی تعریف کر کے درم وصول کرنا، جوئے شیر نکالنے سے بھی مشکل تر کام ہے۔ ان کی شخصیت، مزاج اور اصولوں کے کہسار بر

کسی خوشامدی فرہاد کا تیشہ کارگر نہیں ہوتا۔

پیشے اور مشغلے کا کسی شخص کے خیالات واحساسات اور طرزِ عمل پر کس قدر اثر پڑتا ہے، اس کا اندازہ مجھے رضا صاحب سے گفتگو کے دوران ہوا۔ تحقیق و تنقید پر رضا صاحب سے تبادلۂ خیال کرتے ہوئے، میرے تصور میں ایک ایسے بزرگ کی شکل بار بار ابھر آتی ہے جو کبھی محکمۂ پولیس میں سراغ رسانی کیا کرتے تھے۔ یہ بزرگ اپنی گفتگو، عمل اور برتاؤ میں، ہمیشہ بدگمان اور محتاط لگتے تھے۔ ہر شخص کو ایسی نظروں سے ٹٹولتے اور اس طرح گفتگو کرتے گویا وہ کوئی اشتہاری مجرم ہو، اور تو اور ان کی شریکِ حیات کو بھی یہ شکایت تھی کہ ایسے موقعوں پر جب کہ شوہر نامدار کو ان کی جانب محبت پاش نظروں سے دیکھنا چاہیئے تھا، وہ ایک سراغ رساں کے تیور سے دیکھتے تھے۔ بالکل اسی طرح رضا صاحب کی تحقیقی کاوشوں نے انھیں سراغ رسانی کی راہ پر ڈال دیا ہے۔ افکار و آرار کا تحقیقی تجزیہ کرتے کرتے اور ادبی دفینوں کی تلاش وجستجو میں صحرا نوردی کرتے کرتے، ان کے اندازِ فکر نے بے یقینی اور تشکک کو اپنا شیوہ بنالیا ہے۔ الفاظ ومعانی اور شعور و لاشعور کی گتھیاں سلجھاتے سلجھاتے وہ تلاش و تجسس کے خوگر ہو گئے ہیں۔ ان کی جستجو کے قدم تحقیق کی کانٹوں بھری پگڈنڈیوں پر چلنے کے عادی ہو چکے ہیں، ان کی آبلہ پائی پُرخار راہوں کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے، تحقیق کے لیے مشکل سے مشکل موضوعات انھیں پسند ہیں۔ وہ تن آسان محققوں کی بھیڑ میں گم ہونا نہیں چاہتے، اپنی انفرادیت کے بقا کے لیے پرخطر راہوں پر یکہ وتنہا چلنا چاہتے ہیں، کہیں وہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی کو شاعر کی حیثیت سے تلاش کرتے ہیں اور کہیں مرثیہ گوئی اور نعت گوئی کے میدان کے غیر مسلم سالکوں کا پتہ چلاتے ہیں۔ کبھی غالب جیسے شاعر کی نفسیاتی تہوں کو کھولتے ہیں، اور کبھی چکبست کی نظم گوئی کو ایک نئے رُخ سے پیش کرتے ہیں۔ ان تمام مرحلوں سے وہ بارہا گذر چکے ہیں اور گذرتے رہتے ہیں۔ اس معروضیت نے جہاں ان کی تحریروں کو واضح، نتیجہ خیز اور فکر انگیز بنایا، وہیں ان میں ایک خوب صورت وضع داری بھی پیدا کردی ہے۔ وہ کسی بات یا زاویے کو بغیر دلیل و حجت تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ حتیٰ کہ مسلمہ فیصلوں کے لیے بھی دلائل طلب کرتے ہیں۔ بعض اوقات سوچتا ہوں کہ اگر میں ان سے یہ کہوں کہ "رضا صاحب! آپ بقیدِ حیات ہیں اور مجھ سے گفتگو کر رہے

ہیں" تو وہ مجھ سے خود اپنے زندہ ہونے کا ثبوت مانگ بیٹھیں گے۔ لیکن ان کی اس حسین خامی میں درپردہ بڑی خوبیاں پوشیدہ ہیں۔ ان کی بے یقینی اور تشکک نے ان کی تحریروں اور تجزیات کو تیقن آمیز لب ولہجہ دیا ہے جو تحقیق کے لیے ایک نیک فال ہے اور جس کا اعتراف قاضی عبدالودود جیسے سنگ یار اور بے مثال محقق نے بھی کیا ہے۔

سرمایہ کی دنیا میں وہی بینکر کامیاب ہوتا ہے جسے یہ گر معلوم ہوتا ہے کہ بھرپور معاوضے کے لیے کہاں اور کتنا روپیہ لگانا چاہیۓ اور تحقیقی کائنات میں وہی قلم کار سرخ رو ہوتا ہے جو یہ جانتا ہو کہ وسیع مطالعے کے نتائج کو کس طرح استعمال کرنا چاہیۓ۔ تاکہ حقیقت کی وضاحت اور فیصلے کی قدر ہو۔ رضا صاحب اس لحاظ سے ایک کامیاب بینکر بھی ہیں اور ایک نامور محقق بھی۔ لفاظی، تکرار، مبالغہ اور ابہام سے وہ کوسوں دور ہیں۔ ان کی کاوشیں، کم از کم تحقیق کے روشن مستقبل سے مایوس نہیں ہونے دیتیں۔

اس کائنات میں مختلف چیزوں کی شناخت، تضاد کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔ تکثیر نے وحدت کو نمایاں کیا، رات کی وجہ سے دن کو پہچانا گیا، راحت کا احساس تکالیف سے ہوا اور زندگی کی قدر موت کے سایوں میں ہوئی۔ اس فلسفۂ تضاد نے تحقیقی تخلیقات کو بھی جنم دیا۔ علم وادب کی دنیا میں جب بے راہ روی داخل ہوتی ہے، اصول اور ضابطے ادبی روح کو بے جان اور منجمد کر دیتے ہیں، معاشرہ منتشر ہو جاتا ہے اور افراد سائے بن کر رہ جاتے ہیں، ادب کے نام پر غیر معیاری، پست اور بے کار چیزوں کا اضافہ ہونے لگتا ہے اور فن کی شکل پہچانی نہیں جاتی تو ادب کے اسی نقطۂ انجماد سے انقلاب کروٹ لیتا ہے، روایت شکن اور انقلاب پسند فنکار منظر عام پر آ کر ادب کو فکر وفن کی نئی دنیا سے روشناس کراتے ہیں۔ ادب میں عمدہ اور ادنیٰ کے درمیان امتیاز کیا جانے لگتا ہے بھلے برے کی پہچان ہوتی ہے اور زیادہ تر یہ ذمہ داری ایک محقق کے سر ہی آتی ہے محقق کسی شاعر کی طرح اپنی ذات میں گم ہو کر خود کلامی نہیں کرتا اور نہ وہ کسی افسانہ نگار، انشائیہ نویس، ناول نگار یا نقاد کی طرح اپنی تخلیقات کا تانا بانا اپنی ہی ذات کے اردگرد بنتا ہے۔ تحقیق ایک جان لیوا فن ہے، یہاں نہ تو بے راہ روی کی گنجائش ہے

نہ ترمیم واضافے کی، تحقیق کی منزل تو تلوار کی دھار پر چل کر حاصل ہوتی ہے۔ اس دنیا میں ایک ایک لفظ پرکھا جاتا ہے اور ایک ایک خیال تولا جاتا ہے۔ کسی معاشرے میں ہزاروں شاعر اور نقاد مل جاتے ہیں لیکن محقق خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ تحقیق ایک ایسی غواصی ہے جس میں سمندروں کی تہہ سے موتی لانے پڑتے ہیں۔ محقق حال کے جھروکوں سے ماضی میں جھانکتا ہے۔ اور وجود سے عدم کی طرف لپکتا ہے۔ بوسیدہ کتابوں، دھندلی روایتوں، معدوم معاشروں اور مدفون شخصیتوں میں خود کو گم کر کے حقائق کی جستجو کرتا ہے اردو ادب کا موجودہ دور اس لحاظ سے تہی دامن اور فرومایہ ہے کہ آج کوئی محقق بڑی مشکل سے نظر آتا ہے۔ تحقیقی سفر کے آخری مرحلے پر قاضی عبدالودود، مالک رام اب بھی خراماں نظر آتے ہیں، پروفیسر محمود شیرانی، مولوی عبدالحق، امتیاز علی خاں عرشی اور مسعود حسین رضوی ادیب گم ہو چکے ہیں۔

تحقیق کی اسی دقت طلب اور پرُ خطر راہ پر رضا صاحب چلے جا رہے ہیں، یکہ و تنہا، بے نیاز و بے پروا اپنی دھن میں مگن اور اپنے ارادوں میں اٹل، وہ ایسے مشکل اور جستجو طلب مضامین کو چھیڑتے ہیں جن سے دوسرے دور ہی رہنا پسند کرتے ہیں۔ مردہ کتابوں اور فراموش کردہ تخلیقات میں زندگی کی لہر دوڑانا، رضا صاحب کا محبوب مشغلہ ہے۔ جس ملک میں اردو کے تعلق سے مایوسی اور محرومی اپنی انتہا کو پہونچی ہوئی ہو، جہاں عصری ادب بھی اپنوں اور غیروں کے تغافل کا شکار ہو وہاں فن تحقیق کی آبرو کا نگہبان ہونا، رضا صاحب جیسے مجاہد ہی کا حصہ اور حوصلہ ہے۔

کائنات کی ہر شے تقسیم ہوتی ہے، کُل سے اجزا پیدا ہوتے ہیں، اور اجزا، کل کو وجود میں لاتے ہیں۔ عمل ثنویت (DUALISM) کی یہ معجز نمائی رضا صاحب کی شخصیت اور فکر و فن میں بھی جاری و ساری ہے۔ ایک رضا، کئی خانوں میں بٹ جاتا ہے، کہیں وہ شاعر اور کہیں نقاد، کہیں سفر نامے لکھتا ہے اور کبھی خاکے ترتیب دیتا ہے، کبھی خطوط کو سلیقے سے سجاتا ہے اور کبھی کسی شاعر کے دیوان کو مرتب کرتا ہے، گویا ایک ہی ذات شاعر بھی ہے اور نثار بھی، مسافر بھی ہے اور راہ بھی، مرتب بھی ہے اور محقق بھی، اور ان تمام پہلوؤں کا ارتکاز رضا صاحب ہی کی بھرپور شخصیت میں ہوتا ہے

ایک اور حیرت انگیز امر رضا صاحب کے بارے میں یہ ہے کہ وہ ایک عالم سے دوسرے

عالم میں بڑی سرعت اور آسانی کے ساتھ تحلیل ہو جاتے ہیں، ان کا قلم شعریت کی گل براماں پگڈنڈی پر جس تیزی سے سفر کرتا ہے اسی رفتار سے تحقیق کے او بڑ کھابڑ راستوں پر بھی چلتا ہے، رضا صاحب نے اپنے قلم کی جادوگری بڑی عرق افشانی اور دیدہ ریزی کے بعد حاصل کی ہے۔

رضا صاحب فن شعر سے گہری واقفیت رکھنے والے مشاق، فطری اور فکری شاعر ضرور ہیں مگر بنیادی طور پر وہ ایک محقق ہیں اور ان کی ایک نظر ہے۔ یہی نظر ادب میں جواہرات کو سنگریزوں سے الگ کرتی ہے اور یہی نظر ان کے دوستوں اور ملاقاتیوں میں اچھوں اور بروں کو پہچانتی ہے۔ بنکنگ اور تحقیق نے انھیں مردم شناس بنا دیا ہے، وہ نہ اپنا کاروبار ڈوبنے دیتے ہیں اور نہ اپنے علم و فضل کا بھرم ٹوٹنے دیتے ہیں۔ پہلی ہی ملاقات میں وہ کسی شخص کے خیالات اور کردار کا محاسبہ کر لیتے ہیں اور پھر اس سے اسی انداز میں ملتے جلتے ہیں جو لوگ ان کو غائبانے میں ایک ناسمجھ دولت مند سمجھتے ہیں، انھیں کیا معلوم کہ وہ ایک ایسے شخص کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہیں جو ایک زبردست ذہانت اور دور بین بصارت کا مالک ہے اور نبض شناسی کا اچوک ملکہ رکھتا ہے

رضا صاحب کے دوستوں اور شناساؤں کا حلقہ مجھے بے حد تنگ نظر آیا، اس کی ایک وجہ ان کا معیاری شعور انتخاب ہے، وہ ہر کس و ناکس سے گھلنے ملنے کے قائل نہیں دوستوں کے معاملے میں رضا صاحب کمیت سے زیادہ کیفیت کو مدنظر رکھتے ہیں۔ میں رضا صاحب کے کاروباری دوستوں کے بارے میں مطلق کچھ نہیں جانتا لیکن ان کے علمی وادبی حلقے میں جو بھی چہرے ہیں، اپنی دنیا میں یکتا ہیں، دوران گفتگو، میں نے ان کی زبان سے چند ہی نام بار بار سنے۔ جیسے قاضی عبدالودود، ڈاکٹر گیان چند، مالک رام، کلیم الدین احمد وغیرہ۔ بصورت دیگر مجھے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی کو اپنی نجی اور ادبی زندگی میں داخل ہونے ہی نہیں دیتے۔ رضا صاحب کے اس طرز عمل کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ بیشتر ملنے والے اپنی آنکھوں میں کسی نہ کسی مقصد، طلب اور مفاد کی جھلک لے کر ان سے ملتے ہیں، رضا صاحب کو ایسے مہذب کاسہ برداروں سے سخت نفرت ہے۔ دوسرے یہ کہ انھیں اس بات کا مطلق کوئی شوق نہیں کہ ادبی گداگروں کے ترسے ہوئے لبوں کو سیراب کر کے "محسن اردو" کہلائیں اور نہ وہ گرسنہ قلم کاروں کے لیے لذت کام و دہن کا سامان فراہم

کر کے "رہبرِ ادب" بننا چاہتے ہیں۔ رضا صاحب مزاج کے اتنے اکھڑ اور کھرے ہیں کہ خوشامد سے بجائے خوش ہونے کے برہم ہو جاتے ہیں، اور میں تو یہ سوچتا ہوں کہ ان کی فطرت اور مزاج میں یہ پہلو نہ ہوتا تو آج وہ بھی عام فنکاروں کے ہجوم میں اپنی انفرادیت کھو بیٹھتے اور ان کا فن اس قدر نہیں نکھرتا۔ ایک سچے فنکار کی طرح وہ اپنی علمی، ادبی اور تحقیقی کاوشوں کے بجا اعتراف اور ہمت افزائی کے خواہاں ضرور ہیں لیکن نامناسب تعریفی جملے انھیں ناپسند ہیں۔ ان کی شہرت اور مقبولیت خریدی ہوئی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے رضا صاحب کو صدہا راتیں آنکھوں میں کاٹنی پڑی ہیں اور بے شمار دن صَرفِ جنوں ہوئے ہیں۔

اردو والوں سے کم آمیزی کو خود رضا صاحب اپنے احساس کمتری سے تعبیر کرتے ہیں لیکن دراصل یہ فنکار کی وہ اَنا اور خواہش ہے جو ان کو خود ان کی نظر میں بلند قامت اور قد آور بناتی ہے۔ اسی کج کلاہی نے انھیں بدنام بھی کیا اور نیک نام بھی، اسی باعث وہ غلط فہمیوں، غلط بیانیوں اور نکتہ چینیوں کا نشانہ بنے اور افواہوں کا مرکز بھی،

اس موقع پر میں ایک عالی دماغ پروفیسر کے "افکارِ عالیہ" کو بھول نہیں سکتا جو اکثر یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اردو کی تحقیقی اور تخلیقی دنیا میں رضا صاحب کو خواہ مخواہ کیوں اہمیت دی جا رہی ہے۔ ان کی شاعری میں کیا وزن ہے اور ان کی تحریروں میں کون سی خوبی ہے۔ رضا صاحب کے ان نکتہ چینیوں کا حال یہ ہے کہ وہ تنقید و تحقیق کی ابجد سے تو واقف ہیں نہیں لیکن چاند پر تھوکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تصویر کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ رضا صاحب کی علمی گہرائی اور فنی وسعت نے انھیں قدرے خود پسند بنا دیا ہے۔ ان کی یہ خود پسندی ایک مناسب دائرے میں ہے اور اسی سے ان کی تحریروں کا، لہجہ پُر اعتماد ہے اور ان کے تحقیقی نتائج فکر انگیز ہیں۔

فنکار کی یہ خود پسندی جب حدود سے تجاوز کر جاتی ہے تو اس کی شخصیت مسخ ہو جاتی ہے اور اس کا فن مجروح۔

خدا کرے رضا صاحب کی یہ خود نگری، معتدل رہے ورنہ اردو ایک ممتاز محقق سے محروم ہو جائے گی۔

اس تاثراتی خاکے میں رضا صاحب کے کاروبار اور طرزِ عمل پر کچھ اتنے اشارے ہوئے

ہیں کہ کوئی پڑھنے والا اس غلط فہمی کا شکار ہو سکتا ہے کہ رضا صاحب ایک ایسے صاحبِ ثروت انسان ہیں جو انتہائی خود پرست، بخیل، تاجر مزاج اور مردم بیزار ہے لیکن یہ تجزیہ صحیح نہیں ہوگا۔ میں پہلے بھی اپنے اس تاثر کا اظہار کر چکا ہوں کہ رضا صاحب دولت اور محنت کو برمحل اور مناسب انداز میں استعمال کرنے کے فن سے بخوبی واقف ہیں

رضا صاحب سے ان ہی دو چار ملاقاتوں میں مجھ پر اس حقیقت کا بھی انکشاف ہوا کہ ان کی اعانت اور دستگیری نے کئی غریب بیٹوں کے سر سہرے بندھوائے ہیں اور کئی مجبور نوجوانوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا ہے۔

رضا صاحب کی دولت میں کوئی تونگر حصہ دار ہے یا نہیں، یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ کئی بیوائیں، یتیم، محتاج اور بے کس ان کی دولت کے مستقل حصہ دار ہیں۔ رضا صاحب نام و نمود اور نمائش سے بہت دور بھاگتے ہیں اس لیے ان کے اٹھے ہوئے داہنے ہاتھ کو ان کا بایاں ہاتھ بھی نہیں جانتا۔ وہ اس معاملے میں ایک سچے مسلمان ہیں اور غریبوں اور مزدوروں کے ان نام نہاد ہمدردوں سے بدرجہا بہتر ہیں جو غریبی اور عدم مساوات کا رونا رو کر اپنی تجوریاں بھرتے ہیں، ہوائی جہازوں میں سفر کرتے ہیں اور ہزاروں روپیوں کی بدیسی شراب میں غرق رہتے ہیں اور پھر بھی غریبوں کی "سرداری" کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ریاکاری اور مکاری، رضا صاحب کے کردار میں نظر ہی نہیں آتی۔ ان کے ملازم ان کی اولاد سے بھی زیادہ محبت اور سرپرستی پاتے ہیں۔ رضا صاحب کی قربت میں مجھ پر یہ بھی منکشف ہوا کہ وہ خاکساروں سے تو خاکساری برتتے ہیں لیکن سربلندوں سے اکثر ٹکرا جاتے ہیں۔ جو ان کی جانب ایک قدم بڑھتا ہے، یہ اس کے وجود میں سما جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پیدائشی پنجابی ہیں اس لیے ان کے دل میں رواداری، محبت، ہمدردی، خلوص اور انسانیت کے پانچ دریا ہر وقت موجزن رہتے ہیں البتہ وقت پڑنے پر یہ شاخِ گل، شمشیرِ بُرّاں میں بدل جاتی ہے، اور کبھی کبھی نسیمِ سحر کی نرمی رکھنے والی ان کی شخصیت، سخت چٹان بھی بن جاتی ہے۔ خوشامدانہ اور بزدلانہ سمجھوتہ بازی ان کی شریعت میں مطلق جائز نہیں خواہ وہ دوستی میں ہو، یا معاملاتِ علم و ادب میں۔ ان کے اس طرزِ عمل نے ان کے کئی نکتہ چیں اور حاسد پیدا کیے ہیں جو اکثر رضا صاحب کے خاکے میں سیاہ رنگ بھرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان تمام اذیت ناک اور تکلیف دہ مرحلوں سے وہ ہمیشہ سرخرو گزر جاتے

ہیں۔

رضا صاحب کی شخصیت اور فن کا ایک نوکیلا پہلو، میرے لیے اکثر تحیر کا باعث بنتا ہے اور وہ ہے ان کی شاعری۔ ”شعلۂ خاموش“، شاخ گل“ شورش پنہاں“ اجالے“ شعورِ غم“ اور شعاع جاوید کا یہ خالق نہ جانے کس طرح اپنی شخصیت، فن اور رجحانات کو بانٹ پاتا ہے۔ ایک بگڑا شاعر مرثیہ گو تو بن سکتا ہے لیکن ایک محقق، ہزاروں بگاڑ کے بعد بھی ایک خوش گو شاعر بنا رہے اور سکہ بند غزلیں اگلتا رہے، یہ بات ذرا مشکل ہی سے حلق سے اترتی ہے۔ تحقیق روایت پرستی پر آگے بڑھتی ہے اور غزل روایت شکنی چاہتی ہے، تنقید ہر ہر بات کا جواز طلب کرتی ہے اور غزل منطق اور فلسفے کو جھٹلاتی ہے۔ غزل ایک بت پرستی کا عمل ہے، آزادہ روی اس کی فطرت اور عشق اس کی بنیاد ہے۔ تحقیق سلیقہ اور تنظیم چاہتی ہے اور تنقید تحلیل و تجزیہ اور ترتیب طلب کرتی ہے۔ پتہ نہیں رضا صاحب فکر و فن کے ان تمام مطالبوں کو بیک وقت کس طرح مطمئن کر پاتے ہیں اور کس طرح ”درکفے جام شریعت درکفے سندان عشق“ کی جیتی جاگتی تصویر بن جاتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ عشق کا ملکہ قدرت نے انسان کے خمیر میں ہی شامل کر دیا تھا، اسی لیے کائنات کے آدمِ اول سے لے کر آج تک کوئی اس کی گرفت سے نہیں بچا۔ اسی خیال سے میں نے رضا صاحب کی زندگی کے گرد و پیش میں کچھ ٹٹولنے کی کوشش کی کہ ایک انسان اور پھر شاعر ہونے کے ناطے ان کے افق زندگی پر کوئی ستارہ نظر آجائے، کہیں ان کا بھی دل اٹکا ہوا نظر آئے لیکن دور دور تک اس خوش گو شاعر کی دنیا میں کوئی موہنی صورت اب تک تو مجھے نظر نہیں آئی، ممکن ہے پس پردہ کوئی نور جہاں ہو یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کا شعورِ عشق، کسی حقیقی یا خیالی محبوب سے بے نیاز ہو چکا ہو، اگر یہ صحیح ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ عشق و حسن کے معاملے میں اس بلندی پر پہونچ چکے ہیں جہاں عشق کو ضرورتِ حسن نہیں رہتی اور جہاں عشق خود ہی حسن بن کر اپنی پرستش کرنے لگتا ہے

ایک مرتبہ ان کے گھر جانے کا اتفاق بھی ہوا اس مختصر سے وقفہ میں مجھے رضا صاحب کی ان کے خاندان سے محبت کا اندازہ بھی ہوا، وہ گھر والوں سے دوستانہ ماحول میں ملتے ہیں۔ ان کا بیٹا ان کا ساتھی لگتا ہے اور ان کی بیگم؟ اب میں کیا

کہوں! تعجب نہیں اگر یہی محترمہ ان کے تغزل کا مرکز ہو۔ محبوب کو شریک حیات کی شکل میں دیکھنا جتنا مشکل کام ہے، اتنا ہی بیوی کو محبوب کا روپ دینا ہے یہ سب میری قیاس آرائیاں ہیں، حقیقت خدا ہی بہتر جانے

رضا صاحب انسان ہیں، انسان فانی ہوتا ہے لیکن انھوں نے بڑی عقلمندی سے اپنی بقائے دوام کا سامان کر رکھا ہے۔ ان کی تحقیق و تخلیق مدتوں باقی رہے گی، لوگ ان سے استفادہ کرتے رہیں گے، تلاش و جستجو کے نئے نئے چراغ جلاتے رہیں گے اور رضا صاحب زندہ رہیں گے۔ اردو کے نیم مردہ قالب میں زندگی کی روح پھونک کر انھوں نے خود آبِ حیات نوش کر لیا ہے، اردو سے رضا صاحب کی محبت کا یہ صلہ کتنا خوب صورت، دیر پا اور زندگی نواز ہے۔

ڈاکٹر محمد انصار اللہ

رضاؔ کے بارے میں

معاصرین کے بارے میں کچھ لکھنا یوں بھی مشکل ہوتا ہے اور جب دوستی، محبت اور اخلاص کا رشتہ درمیان میں آجائے تو یہ کام اور بھی زیادہ مشکل ہو جاتا ہے لیکن جس سے یگانگت اور اتحاد ہوتا ہے آدمی اسی سے توقعات بھی وابستہ کرتا ہے۔ نہیں بلکہ ایمان کی بات یہ ہے کہ صرف وہی ہوتے ہیں جو واقعات کی حقیقت کو جانتے اور معاملات کی نوعیت کو پہچانتے ہیں اس لیے یہ انہیں کا حق ہوتا ہے کہ وہ لکھیں اور پوری دیانت اور خلوص کے ساتھ لکھیں۔ دنیا میں عمدہ باتوں اور مثبت حقیقتوں کے اعلان سے بہتر کوئی کام نہیں ہو سکتا اس لیے موقع ملے اور سچ بات کہنے سے رہ جائے تو اس سے بڑی چوک نہیں ہو سکتی۔

جناب کالی داس گپتا رضاؔ سے میری مراسلت کا آغاز ۱۹۷۸ء کے اوائل میں ہوا تھا لیکن اب یہ یاد نہیں آتا کہ یہ سلسلہ کس طرف سے اور کس تقریب سے شروع ہوا تھا۔ اتنا ضرور یاد ہے کہ اسی زمانے میں رضا صاحب کو چکبست سے متعلق بعض مضامین کی ضرورت تھی جو ان کی ایما کے مطابق نقل کروا کر میں نے بھیجے تھے۔ یہ نہیں معلوم کہ ان نقلوں سے رضا صاحب کس حد تک مطمئن یا نامطمئن تھے لیکن یہ معلوم ہے کہ ناقل کی خواہش کے مطابق ان کا حقِ محنت رضا صاحب نے بلا تامل اور پورا بھیج دیا تھا۔ بعض تجربوں کی روشنی میں آج کے زمانے میں یہ بات بھی ایسی نہیں ہے جسے غیر معمولی نہ کہا جائے۔

سلسلۂ مراسلت کے آغاز کے بعد رضا صاحب نے اپنی تمام تصانیف میرے پاس بھیج دی تھیں تاکہ تعارف صحیح طور پر ہو سکے۔ اس وقت سے آج تک یہ معمول رکھا ہے کہ جب بھی کوئی کتاب چھپتی ہے مجھے ضرور عنایت کرتے ہیں۔ ایک بار کوئی کتاب موصول ہوئی تھی جو نہایت خوبصورت چھپی تھی (ویسے رضا صاحب کی کوئی ایک کتاب بھی ایسی نہیں چھپی ہے جسے دیکھ کر رشک نہ آئے) اسے دیکھ کر میرے قلم سے غیر ارادی طور پر نکل گیا کہ "کاش میری بھی کوئی

کتاب ایسی چھپتی۔" جواباً انھوں نے مجھے لکھا کہ:

"تین چار سو صفحوں کی کوئی کتاب آپ چھپوالیں، مصارف میرے ذمہ ہوں گے۔"

میرے جیسے شخص کے لیے جسے اپنے "بزرگوں" سے برعکس تجربات بار بار ہو چکے تھے اس سے زیادہ عجیب کوئی بات نہیں ہو سکتی تھی۔ اس تحریر سے دل ان کا آج تک نہایت ممنون ہے۔ شیخ محمد ابراہیم ذوق نے خوب کہا ہے ؎

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے ان کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے

یہ محبت ہی وہ ہے جس کی وجہ سے دل رضا صاحب کی عزت کرتا ہے اور اسی عزت کے جذبے سے یہ سطور لکھی جا رہی ہیں۔

یہ بہت دلچسپ اتفاق ہے کہ اکثر علمی معاملوں میں میرے اور رضا صاحب کے خیالوں میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ فرق بس یہ ہے کہ ان کے یہاں کبھی کبھی شدت کا اظہار بھی ہوتا ہے جب کہ میں ایسے موقعوں پر بھی احتیاطاً دوسری صورت کے لیے کسی قدر گنجائش چھوڑ دینے کو بہتر سمجھتا ہوں۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ رضا صاحب راسخ العقیدہ شخص ہیں اور دوسرے سے بھی چاہتے ہیں کہ وہ اپنے عقاید پر مضبوطی سے قائم رہے۔ میری ترقی کی خبر سن کر انھوں نے لکھا کہ:

"اب آپ پر شکرانہ کی نماز فرض ہو گئی۔"

میرا نہایت مخلص اور بہی خواہ مسلمان دوست بھی یہی کہہ سکتا تھا۔

یگانگت ہی کے سلسلے کی ایک بات یہ ہے کہ جناب کالی داس نے اپنی علمی زندگی کی ابتدا شعرگوئی سے کی ہے اور اس کے فواید بھی انھیں کماحقہ حاصل ہیں۔ ان کا تعارف کراتے ہوئے پروفیسر گیان چند نے لکھا ہے کہ:

"آپ نے ابتدا میں کمال کرتارپوری سے مشورۂ سخن کیا جو جوش ملسیانی کے صف اول کے شاگردوں میں تھے۔ بعد میں آپ نے خود جوش ملسیانی کے آگے زانوے تلمذ تہ کیا۔ انھیں کی تربیت کا فیض ہے کہ رضا صاحب کے کلام میں ایک استادانہ پختگی اور زبان و فن پر عبور ملتا ہے۔ انھیں کے طفیل آپ عروض کے غوامض پر بھی نظر رکھتے ہیں۔" (متعلقات غالب ص)

کالیداس رضا صاحب کا پہلا مجموعۂ کلام "شعلۂ خاموش" کے نام سے ۱۹۶۸ء میں چھپا تھا۔ سات برس بعد اس کی بعض نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کر کے انھوں نے The Silent Flame کے نام سے شائع کیا۔ "شعاع جاوید" سے قطع نظر جوان کی رباعیوں

کا مجموعہ ہے اور بلراج ورملانے مرتب کیا ہے شعلۂ خاموش کے بعد سے رضا صاحب اپنے کلام کے پانچ چھ مجموعے شائع کر چکے ہیں ان میں آخری مجموعہ "اجالے" ہے جو اکتوبر ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا تھا اور انہیں کے بقول۔

"اجالے میرے اسلامی رنگ کے اشعار کا چھوٹا سا مجموعہ ہے جس میں چند نعتیں سلام، رباعیاں اور قطعے ہیں۔"

ان مختصر اور ضخیم مجموعوں سے بدیہی طور پر یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ رضا صاحب ایک نہایت پر گو اور قادر الکلام شاعر تھے اور ہر سال ایک شعری مجموعہ مرتب کر ڈالنے کی قدرت رکھتے تھے لیکن اب وہ غالباً شاعری کو بالکل چھوڑ کر ہمہ تن نثر لکھنے کی طرف متوجہ ہیں۔ رضا صاحب کے کلام کے مجموعوں کے ناموں میں عموماً کوئی ایسا لفظ ہوتا ہے جس سے روشنی کے جاری یا عام ہونے کا تصور ابھرتا ہے اس سے ان کی فکر کے انداز کی طرف ایک حد تک رہنمائی ہوتی ہے۔ فکر کے اسی میلان نے انہیں نثر کے اس میدان میں لا ڈالا جس میں داد و ستائش اور شہرت و ناموری کے لیے کم سے کم گنجائش ہے البتہ ہر ہر قدم پر اختلافوں اعتراضوں سے سابقہ ہوتا ہے۔ میرے لیے یقین کے ساتھ یہ کہنا ممکن نہیں کہ کالیداس صاحب نے تحقیق کے خارزار میں پہلی بار کب اور کیوں قدم رکھا تھا لیکن جو اطلاعات مجھے حاصل ہو سکی ہیں ان کی روشنی میں بس اتنا کہا جا سکتا ہے کہ:

"۱۹۷۲ء کے بعد سے ان کے یہاں زبان و بیان میں اپنا مستقل لہجہ نمایاں ہے۔"

بظاہر اُس وقت تک تحقیقی مضامین لکھتے ہوئے انہیں دو تین برس سے زیادہ نہ ہوتے ہوں گے۔

خیال یہ ہے کہ جناب کالیداس نے جب اہل لکھنؤ کی تحقیقات کا مطالعہ کیا تو انہیں بار بار یہ احساس ہوا کہ بعض لوگ اپنے موضوع کی وکالت ہی کو تحقیق سمجھتے ہیں حالانکہ یہ سامنے کی بات ہے کہ محقق وکیل نہیں ہوتا، ہاں وکالت سے تحقیق میں مدد لی جا سکتی ہے۔ محقق کا منصب منصف یا جج سے بھی مختلف ہوتا ہے۔ وہ چار و ناچار، نامکمل اور ناقص، محدود اور متعین شواہد اور قرائن کی بنا پر فیصلہ صادر کر دینے کے لیے مجبور نہیں ہوتا۔ محقق خبروں حقیقتوں کو جمع کرتا رہتا ہے، بالواسطہ شہادتوں پر بھی نظر رکھتا ہے اور بہت احتیاط کے ساتھ اپنی بات نہایت انکسار اور اعتماد کے ساتھ کہتا ہے۔ وہ خود کو ہمہ دان نہیں سمجھتا لیکن وہ ہیچمدان بھی نہیں ہوتا۔ جتنا اور جو کچھ

جانتا اور معلوم کر پاتا ہے اسے بے کم و کاست پیش کر دیتا ہے۔ اسے بس اپنی بات کہنی مطلوب ہوتی ہے، طرزِ بیان کی شگفتگی اور لطافتوں کے چکر میں وہ نہ خود پڑتا ہے اور نہ دوسروں کو ان چکروں میں ڈال کر ان کا وقت ضائع کرنا چاہتا ہے۔ زندگی بہت مختصر ہے۔ آج میں کل کا بھروسہ نہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ پل کا بھروسہ نہیں۔ اس مہلت کو غنیمت جان کر اگر ہم ایک بات بھی جو کہنے کے قابل تھی کہہ دینے میں کامیاب ہو جائیں تو اس سے بڑھ کر اور اس سے بہتر کر اور کیا بات ہو سکتی ہے۔

جناب کالیداس نے جب پہلے پہل میاں دلگیر کی بحث اٹھائی اور یہ کہا کہ میاں دلگیر ہندو پیدا ہوئے تھے۔ ہندو ہی رہ کر مرے تو پہلی نظر میں لوگوں کو خیال ہوا کہ شاید مذہبی پاسداری سے وہ ایسا کہہ رہے ہیں۔ جواب دینے والوں نے دلگیر کے مذہب سے اپنے دین اور ایمان کو وابستہ کر لیا حالانکہ دلگیر اگر مسلمان مرے تو اس کے فواید انہیں حاصل ہوں گے اور اگر وہ مسلمان نہیں ہوئے تھے تو اس سے ہمارا ایمان متاثر نہیں ہوتا اور ہماری عاقبت پہ اس کا ذرہ بھر بھی اثر نہیں پڑتا۔ ہر شخص اپنی قبر میں سوتا ہے اور اپنے اعمال و عقاید کا خود جوابدہ ہو گا۔ ہاں ہماری ذمہ داری بس اتنی ہے کہ سچ بات جتنی بھی ہمیں معلوم ہے اپنے قول اور اپنے عمل سے دوسروں تک پہنچا دیں۔ اس سے زیادہ کے ہم مکلف ہیں۔

ماہنامہ صبح امید بمبئی کے فروری مارچ[1] ۱۹۷۴ء کے شمارے میں اپنے مضمون کے ساتھ جناب کالیداس نے جو تمہید[2] لکھی ہے افسوسناک ہے۔ دعوے کچھ بھی ہوں، عمل ہمارے بڑوں کا

---

۱ : یہ مضمون ۱۹۷۲ء کے اواخر میں لکھا گیا تھا مگر چھپنے کی نوبت ۱۹۷۴ء میں آئی۔

۲ : وہ تمہید یہ ہے۔

"انصاف کا تقاضا یہ ہی تھا کہ یہ مضمون ماہنامہ نیا دور لکھنؤ ہی میں چھپتا کیونکہ یہ بحث پہلے پہل اسی جریدے میں چھڑی تھی اور میرے مضمون کے جواب میں دو مضمون یکے بعد دیگرے اسی میں شائع ہوئے تھے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ میں نے ذیل کا مضمون مئی ۱۹۷۳ء کو مدیر "نیا دور" کی خدمت میں بھیجا تھا جسے طباعت کے لیے منتخب نہیں کیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ میرے متعدد رجسٹرڈ خطوط کو بھی مدیر "نیا دور" نے اس قابل نہ سمجھا کہ ان کا جواب دیا جائے۔ میری نظر میں مدیر "نیا دور" کا یہ رویہ خواہ وہ کیسے بھی حالات کے زیر اثر روا رکھا گیا ہو قابل افسوس ہے۔ اب آٹھ نو ماہ کے بعد یہ مضمون میری درخواست پر مجھے واپس بھیج دیا گیا ہے جسے ادارہ صبح امید شائع کر رہا ہے۔ کاغذ کی گرانی کے اس دور میں مدیر صبح امید کے اس حسنِ سلوک کے لیے میں از حد ممنون ہوں" ——— رضا

یہی ہے کہ دوسرے شخص کو بات نہ کہنے دو۔ معلوم نہیں کہ زبان بندی کر دینے سے ان کو کس قسم کے فوائد کے حصول کی توقع ہوتی ہے؟ کیا اس طرح اس کی غلط بات صحیح ہو جاتی ہے، یا اس سے خود ان حضرات کے علمی وقار میں کوئی بڑا اضافہ ہو جاتا ہے؟ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اول تو آج کسی بھی شخص کی زبان کو بند کر دینا بہت آسان نہیں ہے، وقتی طور پر ممکن ہے کوئی شخص اس باب میں کامیاب ہو کر اپنے دل کو خوش کر لیتا ہو لیکن بالآخر شرمندگی کے سوا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ بہترین طریقہ یہی ہے کہ علمی معاملات کو علمی انداز سے ہی پیش کیا جائے اور اپنے مناصب یا اثرات سے دوسرے کو خاموش کر کے اپنے آپ کو خود فریبی میں مبتلا نہیں کرنا چاہیئے۔ جناب کالیداس کی مذکورہ تمہید میں جن حقائق کا ذکر کیا گیا ہے ان کے نتیجہ میں جناب کالیداس کے لہجہ اور انداز بیان میں تلخی اور شدت آگئی ہے۔ اس کا اثر یہ ہے کہ ان کے مضمون میں مناظرہ کی صورت پیدا ہو گئی ہے جس میں جوش و خروش تو بہت ہے لیکن کام کی باتیں زیادہ نہیں کہی گئی ہیں۔

میاں دگیر سے متعلق بحثوں میں دونوں طرف سے حقائق پر کم از کم نظر رکھی گئی ہے اور کوشش یہ رہی ہے کہ کسی طرح سے فریق مخالفت کو جاہل یا جعلساز ثابت کر دیا جائے۔ اس قسم کی بحثوں سے کوئی علمی مقصد پورا نہیں ہو سکتا چنانچہ یہی ہوا۔ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب نے امبیکا پرشاد اور کھنولال تایب سے منسوب بعض بیان شائع کیے لیکن یہ خیال نہ کیا کہ جس شخص کے اخلاف ہندو ہوں اور وہ خود یا اس کے اخلاف میں سے کوئی اسلام سے منحرف ہو کر ہندو نہیں ہوا تو یہ بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ شخص ہندو رہا اور ہندو ہی مرا۔ اسی طرح جناب کالیداس نے بھی غالباً انتہائی جوش میں اس پہلو پر بالکل نظر نہیں کی اور ان دونوں شخصوں سے منسوب بیانوں کی تغلیط و تردید پر سارا زور لگا دیا۔ یہ صحیح ہے کہ کالیداس صاحب کی اس محنت کے نتیجے میں زندوں سے اپنے مفید مطلب بیان حاصل کر لینے کے طریقے کی حوصلہ شکنی ہوئی اور یہ بڑا فائدہ محض ضمنی طور پر ہو گیا لیکن کالیداس صاحب کی صلاحیت اور ان کی محنت کا صرف بھی مصرف نہیں ہے۔ بیان معتبر وہ ہوتا ہے جو ذاتی علم پر مبنی ہو (مسعود حسن رضوی ادیب کے پیش کردہ) امبیکا پرشاد اور کھنولال کے بیانات کچھ بھی ہوں دگیر کے بارے میں لائق اعتنا نہیں تھے۔

اسی بحث میں جناب کالیداس نے "منظومات دگیر مولفہ ڈاکٹر اکبر حیدری" کا بھی ذکر کیا ہے۔

جناب کالیداس کو اس کتاب کا مخطوطہ جو محمود آباد کے کتب خانے میں بتایا جاتا ہے کسی طرح دستیاب نہیں ہو سکا۔ انھوں نے اپنے مضمون میں یہ پیش کش کی ہے کہ اگر اس مخطوطے کو بمبئی یونیورسٹی لائبریری

یا کسی دوسری بمبئی کی لائبریری کو ماہرین کی جانچ کے لیے بھیج دیا جائے تو "ماہرین کے مصارف اور مخطوطے کے بہ حفاظت آنے جانے کے تمام مصارف میں برداشت کروں گا"۔

یہ پیش کش یقیناً بہت قابلِ قدر ہے اور کم لوگ ہیں جو محض علمی مسائل کی تحقیق کے لیے اس طرح مصارف برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن محض اس بنا پر مخطوطے کو جعلی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جناب کالیداس نے یہ دعوا بھی کیا ہے کہ:

"جس جعلساز نے مجموعۂ منظومات کو دیوان کہہ کر راجا صاحب محمود آباد کے یہاں پہنچایا وہ قطعاً جاہل آدمی ہوگا۔" مجھے اس کا تو اعتراف ہے کہ جو شخص مجموعۂ منظومات کو دیوان کہتا ہے وہ غلطی کرتا ہے لیکن محض اتنی بات سے اس کا "قطعاً جاہل" ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ غزلیات کے علاوہ مخمسات اور قصاید کے دیوان بھی ہوتے رہے ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص غزل کی ہیئت میں بہت سے قطعے کہہ کر ان کو ردیف وار جمع کر کے اسے دیوان کہے تو اس پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ دیوان کے لیے یہ بالکل ضروری نہیں اس میں مکمل غزلیں ہی ہوں۔ دو دو چار چار شعر بلکہ مفردات بھی دیوان میں شامل ہوتے ہیں۔ شعرا نے اپنے دواوین میں مثنویاں، حکایتیں (منظوم) وغیرہ بھی شامل کی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جعلسازی کے لیے بڑی سوجھ بوجھ کی ضرورت پڑتی ہے۔ معمولی فہم و فراست کا آدمی جعلسازی نہیں کر سکتا۔ جعلساز کو "قطعاً جاہل" کہنا بجائے خود بہت صحیح بات نہیں معلوم ہوتی۔ افسوس ہے کہ تا حال "منظومات دلگیر مؤلفہ ڈاکٹر اکبر حیدری" راقم کی نظر سے نہیں گذری ہے البتہ اس کے محض چند اقتباس دیکھے ہیں اور اتفاق یہ ہے کہ وہ چند اقتباس وہی ہیں جو دلگیر کے حالات سے متعلق ہیں۔ دوسرے ماخذ سے دلگیر کے جو حالات سامنے آتے ہیں ان سے ان اقتباسوں کے بیانات مختلف ہیں، اور خلاف واقعہ معلوم ہوتے ہیں۔ اگر کالیداس صاحب محنت کر کے اس کتاب کا تفصیلی جائزہ لے لیتے تو اس کتاب کا جعلی ہونا اس طرح سامنے آجاتا کہ پھر قیل و قال کی گنجائش نہ رہ جاتی۔ اس کا فائدہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ آئندہ کوئی شخص کسی جعلی مخطوطے کو دھوم دھام سے پیش کرنے کی جرأت نہ کرتا۔ یہ جناب کالیداس کا ایک علمی کارنامہ ہوتا۔ بہ حالت موجودہ بھی اتنا تو ہوا کہ ایسے قلمی نسخوں پر جو "پوشیدہ ذخیرے" کی حیثیت رکھتے ہیں کوئی شخص بے تامل اعتماد نہیں کرے گا۔ یہ فائدہ بھی کم نہیں ہے۔

جناب کالیداس نے دلگیر کے بارے میں میرے خیالوں سے واقف ہونے کے بعد

فرمایا ہے کہ:

"اتفاق ہے کہ آپ نے دلگیر سے متعلق میرے کئی اہم مضمون نہیں پڑھے مثلاً دلگیر کا دیوان (دو مضمون) تلامذۂ دلگیر وغیرہ۔ مجھے افسوس ہے کہ سردست یہ مضمون مجھے مل نہیں سکتے۔ اگر مل گئے تو بھیجوں گا"

میں جناب کالیدا اس کا احسانمند ہوں کہ وہ اس طرح مجھے اپنی مصروفیتوں اور بعض وقت الجھنوں کے باوجود بھی نوازتے رہتے ہیں اور مجھے یہ اعتراف لازم ہے کہ مذکورہ مضامین میں نے نہیں دیکھے میرے نزدیک دلگیر کے بارے میں ان سوالوں کو بہت زیادہ اہمیت دینا صحیح نہیں کہ:

۱۔ دلگیر کا اسلامی نام کیا تھا ؟

۲۔ وہ کس ہاتھ پر مسلمان ہوئے ؟

۳۔ ان کے جنازے کی نماز کس نے پڑھائی تھی ؟

۴۔ ان کی قبر کہاں ہے ؟

یہ کسے نہیں معلوم کہ لکھنؤ میں "شیعہ گری" میں "غلوے تمام" کا ذکر تذکروں وغیرہ میں مذکور ہے۔ کتنے ہی لوگ اپنے آبائی مذہب کو چھوڑ کر مسلمان (شیعہ) ہو گیے۔ ان میں بیشتر کے بارے میں مذکورہ چاروں سوالوں کے جواب دستیاب نہیں۔ دلگیر کے استاد ناسخ کا نام عبداللہ بھی تھا لیکن یہ نام کب بدلا ؟ وہ کس کے ہاتھ پر شیعہ ہوئے تھے ؟ ان کے جنازے کی نماز کس نے پڑھائی تھی کون جانتا ہے۔ ناسخ یقینی طور پر دلگیر کے مقابلے میں زیادہ حیثیت کے مالک تھے۔ وہ جس وقت مرے ان کے سو سے زاید شاگرد تھے اور ان میں بیشتر نہایت عقیدتمند اور نمایاں شخصیت کے مالک تھے۔ بیچارے دلگیر تو مفلسی میں مرے تھے۔ ان کے شاگردوں میں شاید کوئی ہو جس نے ناسخ کے شاگردوں کی طرح اپنے استاد کا چرچا کیا ہو۔ میاں دلگیر کے اعزا میں مہاراجہ میوارام تھے۔ میوارام کو اپنے زمانے میں جو اعزاز و اقتدار حاصل تھا اس کا اندازہ اس سے کیا جانا چاہیئے کہ دلگیر جیسے لوگ ان کی دعاگوئی کرتے ہیں۔ وہ مع اپنی بیگم کے مسلمان ہو گئے تھے اور عزاداری پر "گنجہائے شایگاں" صرف کرتے تھے لیکن کسے معلوم کہ وہ کب شیعہ ہوئے تھے، کس کے ہاتھ پر ہوئے تھے اور کس نے ان کے جنازے کی نماز پڑھائی تھی وغیرہ۔ یہ خیال کرنے کی بات ہے کہ اس صاحب توقیر شخص کے شیعہ ہونے پر خوشی

بھی منائی گئی ہوگی اور اس کے مرنے سے بہتوں کو رنج بھی ہوا ہوگا۔ میاں دلگیر اگر شیعہ ہوتے تھے تو اپنے لیے ہوئے تھے، مر گئے تو کسی کی روزی بند نہیں ہوئی۔ جو تفصیلات مہاراجہ میوارام کے بارے میں محفوظ نہ رہیں وہ میاں دلگیر کے بارے میں کون محفوظ کرتا؟ مہاراجہ میوارام کا اسلامی نام منبر کے کہے ہوئے قطعہ تاریخ کے عنوان میں مذکور ہے اور اس کو صحیح ماننے کے سوا چارہ نہیں میاں دلگیر کا بھی اسلامی نام اگر ایک تذکرے کے حاشیہ نویس کے سوا کسی نے نہیں لکھا۔ تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ میاں دلگیر کو یہ تو اتر تمام تذکرہ نویس (میاں دلگیر کی زندگی میں بھی) مسلمان لکھتے رہے۔ کسی ایک شخص نے بھی ان کی زندگی میں یا ان کے مرنے کے بعد اس کی تردید نہیں کی۔ میاں دلگیر کا خود دعوا ہے کہ انھوں نے حدیثوں کے مطابق مرثیے لکھے ہیں۔ یعنی انھوں نے کتبِ حدیث کا مطالعہ کیا تھا لکھنؤ کے شاہی کے زمانے میں حدیث کی وہ کتابیں غیر مسلم تو کجا غیر شیعہ کے ہاتھ لگنی بھی آسان نہیں تھیں۔ شیعہ دینیات کے ایک استاد سے جو میرے شاگرد بھی رہ چکے ہیں میں نے اس باب میں استفسار کیا۔ انھوں نے سنکر بڑے اعتماد سے کہا کہ ہرگز کوئی سوال نہیں کہ ایسا شخص غیر شیعہ ہو۔ دلگیر مرثیہ گو تھے۔ کوئی غیر مسلم "منبر رسولؐ" پر نہیں بیٹھ سکتا۔ ہاں ازراہِ عقیدت اگر وہ مرثیہ کہتا ہے تو منبر کے برابر کھڑے ہو کر یا دوسری کرسی پر بیٹھ کر مرثیہ پڑھ سکتا ہے۔ اگر میاں دلگیر نے کسی ایک مجلس میں بھی اس طور پر مرثیہ پڑھا ہوتا تو یہ ایسی بات نہیں تھی جس کا چرچا نہ ہو گیا ہوتا اور تمام تذکرہ نویس اس بات کو نظر انداز کر جاتے۔ تذکرہ نویسوں میں موافق اور مخالف سب رہے ہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ اتنی اہم غلط بات پر خوشگی اور باطن جیسے لوگ شیفتہ کے اور نساخ جیسا شخص محسن کا ہمنوا ہو جاتا۔ ان بدیہی حقائق کے برخلاف اگر کوئی ایک صریحی روایت ایسی نہیں ملتی جس میں دلگیر کا آبائی مذہب پر مرنے کے وقت تک قائم ہونا مذکور ہو تو تمام تذکرہ نویسوں کو متہم کرنا بڑی بے انصافی کی بات ہے۔ آج کے معاملات پر قیاس کرنا درست نہیں۔ شاہی کے زمانے میں میر علی اوسط رشک جیسا شخص کسی غیر مسلم کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ جنت کو سدھارا اور جمیع شہدا کی پابوسی سے مشرف ہوا۔ میرے خیال میں مناسب بات یہ ہے کہ جناب کالیدا اس محنت کر کے میاں دلگیر کے حالات بہ حدامکان تفصیل و تحقیق سے معلوم کریں، ان کو زمانی ترتیب کے ساتھ مرتب کریں اور پھر میاں دلگیر کے کارناموں کا بغور جائزہ لیں۔ اس سے ایک بڑا علمی مقصد پورا ہوگا اور بخوبی ممکن ہے کہ ان کے

مسلمان ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں بھی قطعی حقائق سامنے آجائیں۔ محض مسلمان ہونا نہ ہونا ایک جز ہے اور اس جزو کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے کل کا جائزہ لینا زیادہ مناسب ہے عقیدے کا اثر آدمی کے تمام معاملوں پر مرتب ہوتا ہے اسے زندگی کے دوسرے واقعات سے الگ کر کے دیکھنا بہتر نہیں ہے۔ یوں بھی اس شخص کے ذاتی عقاید کا علم ہمارے لیے صرف اسی لیے ضروری سا ہے کہ اس کے اثرات اس کے کلام میں مرتب ہوئے ہوں گے، ادب کے طالب علموں کے لیے اصل اہمیت اس کے ذاتی معاملات کی نہیں ہے بلکہ نتائج فکر اور نتائج طبع کی ہے اور تحقیق میں ہمیں اپنے مقصود اصلی کو بہر حال نظر میں رکھنا چاہیئے۔

جناب کالی داس رضا کی دوسری بحث فارسی کی اس نعت سے متعلق ہے جس کا پہلا مصرع یہ ہے ع۔

مرحبا سید مکی مدنی العربی

اس باب میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اس کا مصنف محمد جان قدسی ہے۔ بحث یہ ہے کہ یہ محمد جان قدسی کون تھا؟ جناب کالی داس کا اصرار ہے کہ یہ شاہجہاں بادشاہ کے دربار سے وابستہ محمد جان قدسی مشہدی تھا۔ ڈاکٹر سمیع الدین احمد استاذ شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا کہنا ہے کہ یہ قدسی مشہدی کے سوا کوئی اور قدسی ہے۔ اس بحث میں دونوں طرف سے کئی مضامین شائع ہوئے لیکن بات جہاں تھی وہیں ہے۔ دو باتیں مسلم ہیں یعنی:

۱۔ یعنی محمد جان نامی ایک شاعر جس کا تخلص قدسی تھا دربار شاہجہانی سے وابستہ تھا اور فارسی کا شاعر تھا۔

۲۔ ایک نعت جس کا پہلا مصرع وہ ہے کسی محمد جان قدسی نے لکھی ہے جو فارسی میں ہے۔

ثابت یہ کرنا ہے کہ نعت کا مصنف شاہجہانی شاعر ہے۔ اس کے لیے جو باتیں معلوم کی جانی ہیں یہ ہیں:

۱۔ کیا شاہجہانی قدسی نے نعتیں لکھی تھیں؟ کیا اس کی نعتیں ہندوستان میں اس کے بعد کے زمانے میں مقبول و مروج ہوئیں؟ کیا اس کی کسی ایسی نعت پر بھی جو اس کے مستند کلام میں شامل ہو غالب اور ناسخ کے عہد کے شاعروں نے تضمین کی؟

۲۔ کیا مذکورہ نعت (جس کا پہلا مصرع نقل ہوا) قدسی کے مستند کلام میں شامل ہے؟ کیا

کسی ایسے شخص نے جو شاہجہانی قدسی سے براہ راست واقف ہو یا اس کا قریب العہد ہو، براہ راست یا بالواسطہ طور پر اس نعت کا ذکر کیا ہو؟ کیا کسی قابل اعتماد مآخذ سے اس نعت کا عہد شاہجہانی میں تصنیف کیا جانا ثابت ہو سکتا ہے؟

اگر مذکورہ سوالوں کا جواب اثبات میں نہیں ملتا تو غالب اور ناسخ کے عہد کے کسی شاعر کے یہ کہہ دینے سے کہ یہ نعت قدسی شاہجہانی کی ہے اسے اس کی تصنیف (بغیر تامل کے) نہیں مانا جا سکتا کیونکہ امکان اس بات کا رہتا ہے کہ اس بیان کرنے والے کو خود کوئی دھوکا ہو گیا ہو۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ تحقیق و تلاش کے بعد یہ بات ثابت کر دی جائے کہ ایسا کوئی شاعر جس کا نام محمد جان اور تخلص قدسی ہو عہد شاہجہانی سے عہد اکبر شاہ ثانی تک ہوا ہی نہیں، اس صورت میں بھی اس نعت کا قدسی شاہجہانی کا ہونا مسلم ہو جائے گا لیکن یہ بات غالباً نہیں کہی جا سکتی اس لیے ہرگز کوئی ذریعہ اس بات کا بجز مذکورہ بالا اطلاعات کے فراہم کرنے کے نہیں ہے کہ اس شبہ کو کہ یہ نعت شاید کسی دوسرے قدسی کی ہو دور کیا جا سکے۔ زیادہ نہیں تو اتنا ہی ثابت کر دیا جائے کہ یہ نعت بارہویں صدی ہجری میں موجود تھی۔ اس سے بھی اتنا تو ہو ہی جائے گا کہ تیرہویں صدی میں محمد جان قدسی نامی تمام شاعر اس بحث میں سے خارج ہو جائیں گے۔

اس نہج پر ایک واقعہ کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ میں استاذ جنت مقام قاضی عبدالودود صاحب کی خدمت میں جب پہلی مرتبہ حاضر ہوا تو دوران گفتگو عرض کیا کہ آزاد کا یہ قول صحیح معلوم ہوتا ہے کہ شاہ نصیر کے صاحبزادے شاہ وجیہہ الدین منیر ذوق کے شعر اپنے نام سے پڑھ دیتے تھے۔ استاذ محترم نے وجہ معلوم کی تو میں نے عرض کیا کہ مصحفی نے لکھا ہے کہ منیر دہلی سے بھاگ کر آیا ہے اور پھر انھوں نے منیر کے نام سے صرف یہ مطلع نقل کیا ہے ؎

رخصت اے زنداں جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے   مژدہ خار دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

اور یہ مطلع ذوق کا ہے۔ استاذ محترم نے نہایت ناراض ہو کر سوال کیا کہ مصحفی نے یہ کہاں لکھا کہ یہ مطلع انہیں خود منیر ہی نے سنایا ہے؟ اگرچہ اس وقت مجھے ملال ہوا تھا لیکن اب خیال ہوتا ہے کہ قرائن کی حیثیت قرائن سے زیادہ نہیں ہے اور محض قرائن کافی نہیں ہوتے۔ اس دنیا میں کتنے ہی واقعات ایسے رونما ہوتے رہے ہیں جن کے بظاہر قرائن موافق نہیں ہوتے۔ ایک دفعہ تحقیق کی بات ہو رہی تھی۔ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی نے مجھ سے فرمایا کہ حضرت آپ کی تحقیق بھی

خوب چیز ہے۔ کہنے لگے کہ اگر کوئی آپ سے کہے کہ مسعود حسن رضوی داڑھی رکھتے تھے تو آپ کیا کہیں گے ؟ میں نے کہا کہ اس کی بات نہ مانوں گا۔ کہنے لگے کہ وہ سچ کہتا ہے۔ میں جوانی میں داڑھی رکھتا تھا - پھر سوال کیا کہ اگر کوئی آپ سے کہے کہ دو دوستوں نے ایک ادارہ سے وابستہ رہ کر ایک زمانے میں دو مختلف موضوعات پہ کتابیں لکھیں اور دونوں نے ایک ہی نام رکھا تو آپ کیا کہیں گے ؟ میں نے تعجب کا اظہار کیا۔ فرمایا کہ آرایش محفل دیکھی ہوگی ۔ ایک داستان ہے اور دوسری ملک کے مختلف مقامات و معاملات سے متعلق معلومات پر مشتمل ہے۔ پھر پوچھا کہ کیا آپ اس بات کا یقین کریں گے کہ دو دوستوں نے ایک ادارہ میں رہ کر ایک ہی وقت میں ایک ہی کتاب کے الگ الگ ترجمے کیے ہوں اور دونوں نے اپنے ترجمے کا ایک ہی نام مقرر کیا ہو ؟ اس کے جواب میں انھوں نے گلشن ہند کا ذکر کیا۔ پھر سوال کیا کہ کیا آپ یہ سوچ سکتے ہیں کہ ایک شخص دو مختلف زبانوں میں دو مختلف موضوعات سے متعلق الگ الگ کتابیں لکھے، دونوں کو خود ہی چھپوائے اور دونوں کا نام ایک ہی ہو۔ مجھے اس پہ نہایت تعجب ہوا۔ موصوف نے واجد علی شاہ کی دو کتابیں دکھائیں دونوں کا نام ایک ہی تھا۔ ایک عروض سے متعلق تھی اور دوسری قواعد کے متعلق تھی۔ ایک ولیعہدی کے زمانے کی تھی اور دوسری بادشاہت کے زمانے کی۔ یہ انسان عجیب ترین مخلوق ہے۔ ابھی ہنستا ہے ابھی روتا ہے۔ اس کے معاملات بھی اتنے ہی عجیب ہیں۔ ابھی فرشتہ ہے اور ابھی شیطان ہے ع

شیخ صنعاں سا مسلماں رند بد مشرب بنے

انسان مشین نہیں ہے کہ ہمیشہ ایک ہی ڈگر پر چلتا رہے۔ پھر مشین بھی کبھی کبھی بگڑ جاتی ہے اور چلنا بند کر دیتی ہے۔ کبھی خراب ہو کر الٹی بھی چلنے لگتی ہے۔ محقق کے لیے لازم ہے کہ وہ انسان کو انسان ہی سمجھے اور یہ خیال رکھے کہ حقیقت کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ ہمارا کام تو صرف یہ ہے کہ خلوص، دیانت اور لگن کے ساتھ حقیقت کی جستجو کرتے رہیں۔ انسان میں اگر حقیقت کو پالینے کا جذبہ اور واقعی تڑپ ہے تو پھر اور کیا چاہیئے۔ یہی بہت ہے بلکہ کل ہے۔ کم لوگ ہیں جن کے یہاں یہ تڑپ موجود ہو۔ کالیداس صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ ان کے یہاں یہ تڑپ اس حد تک ہے کہ وہ اس مقصد کے لیے اپنی دولت بھی صرف کرتے رہتے ہیں اور اپنی عمر عزیز کو بھی صرف کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ابھی چند روز پیشتر کی بات ہے کہ پروفیسر گیان چند کے خط سے یہ معلوم ہوا کہ کالیداس صاحب نے افسردہ کے مرثیے تیرہ سو روپے میں خریدے ہیں۔

مجھے معلوم ہے کہ چند مرثیوں کے لیے اتنی قیمت بہت کم یونیورسٹیاں دینے کے لیے تیار ہو سکیں گی ایک فرد اپنی جیب سے یہ قیمت ادا کرے، یہ بات یقینی طور سے نادرات سے ہے کم سے کم اردو دنیا سے تو میں واقف ہوں کہ جہاں بہت بڑے لوگ محض چند روپیوں کی کتاب بھی نہیں خریدتے۔

نثر میں مضامین لکھنے کے علاوہ جناب کالیداس نے یکے بعد دیگرے کئی کتابیں شائع کی ہیں۔ ان کی پہلی کتاب ان کے استاد کے خطوں کا مجموعہ ہے۔

مولانا محمد حسین آزادؔ نے اپنے استاد شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کے دیوان میں لکھا ہے کہ:

"تحریر حالات میں بعض باتوں کے لکھنے کو لوگ فضول خیال کریں گے مگر کیا کروں، جی یہی چاہتا ہے کہ کوئی حرف اس گراں بہا داستان کا نہ چھوڑوں۔ یہ شاید اس سبب سے ہو کہ اپنے پیارے اور پیار کرنے والے بزرگ کی ہر بات پیاری ہوتی ہے لیکن نہیں۔ اس شعر کے پتلے کا ایک رونگٹا بھی بیکار نہ تھا۔ ایک صنعت کاری کی کل ہے سے کون سے پرزے کو کہہ سکتے ہو کہ نکال دو، یہ کام کا نہیں۔ اور کون سی حرکت اس کی ہے جس سے کچھ حکمت انگیز فائدہ نہیں پہنچتا۔ اسی واسطے میں لکھوں گا اور سب کچھ لکھوں گا جو بات سلسلۂ حالات میں مسلسل ہو سکے گی ایک حرف نہ چھوڑوں گا۔"

آزادؔ کی یہ بات نہایت صحیح ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ بیشتر بہت چھوٹی باتیں بہت بڑے نتائج کا سبب بنتی ہیں لیکن ایسی "چھوٹی باتوں" کا انتخاب نہایت ضروری ہے۔ انسان کی زندگی کی داستان کو اگر من وعن قلمبند کیا جائے اور ایک حرف کو بھی نہ چھوڑیں تو وہ اتنی طویل ہو گی جتنی اس شخص کی عمر تھی۔ ظاہر ہے اتنی طویل داستان میں نہ کوئی کشش ہو گی اور نہ افادیت۔ داستان اسی صورت میں مفید اور دلچسپ ہو سکتی ہے جب اس میں سے غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے صرف نتیجہ خیز واقعات اور معاملات کو ذکر میں لایا جائے۔ جناب کالی داس گپتا رضاؔ کے استاد جناب جوشؔ ملسیانی کی علمی اور شعری خدمات متنوع ہیں اور یقینی طور سے وہ اس قابل بھی ہیں کہ ان کا مطالعہ دلچسپی کے ساتھ کیا جائے۔ جوشؔ صاحب نے نئی نسل کے کئی باصلاحیت شخصوں کو تربیت بھی دی ہے چنانچہ ان کی داستان حیات میں بہت سے ایسے گوشے نکل سکتے ہیں جن کی افادیت عام ہو۔ ذاتی طور پر جناب کالی داس کو ان کے ساتھ جو عقیدت ہو سکتی تھی ظاہر ہے۔ انھوں نے جب نثر میں کتاب مرتب کرنے کا خیال کیا تو سب سے پہلے استاد کی عنایتوں اور شفقتوں کا خیال آیا۔ اس سے لائق شاگرد کی نیکی طبع کا اندازہ کیا جانا چاہیے۔

جناب کالی داس نے اپنے استاد کے خطوں کو فراہم کر کے انہیں ایک مجموعہ کی شکل دی۔ ان پر مختصر حواشی تحریر کیے۔ جوش صاحب کے صاحبزادے جناب عرش ملسیانی سے ان کے حالات لکھوائے اور خود بھی ان کے بعض واقعات تحریر کیے۔ اس طرح "مکتوبات جوش ملسیانی بنام رضا" کے نام سے ایک نہایت مفید کتاب تیار کر کے ۱۹۷۶ء میں شائع کی۔ جناب کالی داس کی یہ پہلی کتاب ان کی صلاحیتوں اور سلیقہ کی بخوبی غمازی کرتی ہے۔

دوسرے سال یعنی ۱۹۷۷ء کے اختتام تک کالی داس کی دوسری کتاب "ہندوستانی مشرقی افریقہ میں" کا پہلا حصہ چھپ کر شائع ہوا۔ اس میں ان ہندوستانی بزرگوں کے حالات اور کارناموں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے اس ملک کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ دوسرے حصے میں وہ ان علاقوں میں اردو کی ترویج کی داستان لکھنا چاہتے تھے۔ راقم کو وہ حصہ موصول نہیں ہوا ہے اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ وہ شائع ہوا یا نہیں۔ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب کالی داس ان لوگوں میں سے ہیں جن کو اپنے ملک، اپنی قوم، اپنی معیشت اور معاشرت اور اپنی تہذیب و زبان ہر چیز سے واقعی محبت ہوتی ہے ان کا حال بعینہٖ وہی معلوم ہوتا ہے کہ ع

سمجھو وہیں ہمیں بھی، دل ہو جہاں ہمارا

وہ جہاں بھی رہے اپنے وطن، اپنی قوم اور اپنی زبان کا درد لیے رہے اور جہاں بھی موقع ملا اس کے اظہار سے نہیں چوکے۔

شروع شروع میں معمول کے مطابق جناب کالیداس نے بھی غالب سے بہت دلچسپی لی۔ ۱۹۷۸ء میں انھوں نے اس سے متعلق دو قابل قدر کتابیں شائع کیں یعنی:

متعلقات غالب اور دعائے صباح از غالب

پہلی کتاب ان کے ایسے مضامین پر مشتمل ہے جو براہ راست یا بالواسطہ طور سے مرزا غالب سے متعلق ہیں۔ ان کے بارے میں پروفیسر گیان چند کا کہنا ہے کہ:

"یہ مضامین عام دلچسپی کے نہیں۔ یہ کلام غالب کے رسیاؤں کے ڈھب کے بھی نہیں۔ یہ صرف محققین غالب کے درخور التفات ہو سکتے ہیں۔ ان مضامین میں رضا صاحب نے بہت سی غلط فہمیوں کا پردہ چاک کیا ہے۔ بہت سے حقائق کو پہلی بار افشا کیا ہے"۔

ان میں پہلے دو مضامین قدسی کی نعت سے متعلق ہیں جن کی طرف ہم شروع میں اشارہ کر چکے ہیں۔ ان کے بعد دو مضمون "دعائے صباح" کے اس فارسی ترجمے سے متعلق ہیں جو غالب نے کیا

تھا۔ یہ ترجمہ کتابی صورت میں کئی بار چھپ چکا تھا لیکن اس کے پہلے ایڈیشن کا بقول جناب کالی داس:

"آج تک صرف ایک ہی نسخہ معلوم ہے اور خوش قسمتی سے یہ میرے ہی غالب کلکشن میں شامل ہے۔" (دعائے صباح ص۵)

اس کی اہمیت کے خیال سے انھوں نے اس کو من وعن نقل کروا کر ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔ خود کہتے ہیں:

اس کتاب میں جو دعائے صباح مع ترجمہ نثر و نیز ترجمۂ منظوم از مرزا اسد اللہ خاں غالب، شامل ہے وہ من وعن اسی اشاعت اول (مطبوعہ نولکشور) کے متن اور حواشی کی نقل ہے۔ میری خواہش تھی کہ بجائے نقل اشاعت اول (مطبوعہ نولکشور) کا مکمل عکس شائع کرتا مگر رسالے کی خستہ حالت کے پیش نظر یہ ممکن نہ ہو سکا" (ایضاً ص۶)

نادر مطبوعات اور مخطوطات کو شائع کرنے کا کام مولوی عبد الحق مرحوم نے جس انہماک سے کیا تھا اس کی مثال ملنی مشکل ہے چنانچہ آج ادبیات قدیم سے متعلق جو بھی کام ہو رہا ہے اس میں براہِ راست اور بالواسطہ ان بزرگ کا فیض ضرور شامل ہے۔ وہی کام "دعائے صباح" کو شائع کر کے جناب کالیداس نے کیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ انھوں نے اس مختصر رسالے کی کتابت بہت اہتمام کے ساتھ "اصل کے مطابق" کروائی ہے جس کے نتیجہ میں یہ رسالہ نہایت دیدہ زیب ہو گیا ہے۔

غالب سے متعلق جناب کالی داس کی تیسری کتاب غالبیات چند عنوانات ہے جو جنوری ۱۹۸۲ء میں چھپی تھی۔ کتابت طباعت، کاغذ، سرورق ہر اعتبار سے یہ کتاب بھی کالی داس صاحب کی دوسری کتابوں کی طرح دیدہ زیب اور لائق تحسین ہے۔

اس کتاب کا پہلا عنوان "غالب کا ملازم خاص۔ کلو داروغہ" میرے خیال میں بالکل اچھوتا ہے۔ چونکہ اس موضوع سے متعلق کالی داس صاحب نے پہلی بار سوچ سمجھ کر قلم اٹھایا ہے، غالباً ان کی کوشش یہ رہی ہے کہ کلو داروغہ کے بارے میں جو کچھ بھی دستیاب ہے اسے یک جا کر کے مرتب کر دیں۔ انھوں نے اپنے اس مضمون میں نادرات غالب سے بھی استفادہ کیا ہے۔ میں اس محنت کے لیے جناب کالیداس کی تعریف کرتا ہوں جو انھوں نے اس مضمون پر کی ہے اور امید کرتا ہوں کہ آئندہ جناب کالی داس اس بارے میں مزید تلاش و جستجو کے بعد کلو داروغہ سے متعلق کچھ اور نتیجہ خیز حقائق پیش کرنے میں ضرور کامیاب ہوں گے۔

کتاب میں غالب سے متعلق بعض دوسرے افراد مثلاً غوث علی شاہ وغیرہ کے بارے میں بھی الگ الگ مضامین شامل ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ کام بہت دقیع ہے۔ ضرورت ہے کہ غالب کے سبھی معاصرین کے بارے میں الگ الگ معلومات یکجا کی جائیں۔ ذوق اور مومن جیسے اہم لوگوں کے بھی صرف ان واقعات کو علاحدہ سے ترتیب دیا جائے جو غالبیات کی تفہیم میں معاون ہو سکتے ہیں۔ جناب کالی داس نے اس کتاب میں چند مضامین لکھ کر اس مفید کام کی ابتدا کی ہے اس سلسلے کو جاری رہنا چاہیے۔

اس کتاب کا آخری عنوان "مطالعات و مشاہدات" ہے۔ اس عنوان کے تحت جناب کالی داس نے غالب سے متعلق پچاس کتابوں کے بعض اندراجات کے بارے میں اپنی یادداشتوں کو جمع کر دیا ہے۔ یہ یادداشتیں بھی غالبیات سے متعلق آئندہ کام کرنے والوں کے لیے مفید ثابت ہوں گی۔

بطور مجموعی یہ کتاب غالبیات سے دلچسپی رکھنے والوں کو دعوت فکر دیتی ہے اور کئی ایسے عنوانات پیش کرتی ہے جن پر مبسوط کام کی ابھی ضرورت ہے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب بہت زیادہ قابل توجہ ہے۔

مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ جناب کالی داس "فیشن" کے اسیر نہیں ہوئے ہیں۔ انھوں نے بہت جلد اپنی طبیعت کے مطابق ایک الگ موضوع کا انتخاب کر لیا اور :

"منصوبہ بنایا کہ چکبست پر کچھ ایسا کام کیا جائے جو اس بلند و بالا شخصیت کے ہر پہلو پر حاوی ہو۔"

اب تک جناب کالی داس اپنے اس منصوبہ کے مطابق درج ذیل کتابیں شائع کر چکے ہیں۔

نام کتاب	ماہ و سال اشاعت
چکبست اور باقیات چکبست	مارچ ۱۹۷۹ء
انتخاب آتش و غالب از برج نرائن چکبست	مارچ ۱۹۸۰
کلیات چکبست	جنوری ۱۹۸۱
مقالات چکبست	جنوری ۱۹۸۳

چونکہ انھوں نے "تاحد امکان کام مکمل کرنے کا منصوبہ" بنایا ہے اس لیے توقع کی جانی چاہیے کہ

عنقریب چکبست سے متعلق جناب کالی داس چند کتابیں اور بھی شائع کریں گے۔" چکبست اور باقیات چکبست" کے پیش لفظ میں انھوں نے یہ ذکر بھی کیا تھا کہ:

"چکبست کے کلام نظم ونثر کی ٹوہ ہنوز جاری ہے۔ جیسے ہی معتدبہ مقدار میں مواد اکٹھا ہو جائے گا۔ باقیات چکبست حصہ دوم" کے نام سے عام مطالعہ کے لیے پیش کر دیا جائے گا۔"

جو کتابیں اب تک منظر عام پر آچکی ہیں ان سے چکبست کے متنوع علمی کارناموں کا تعارف بھی ہوا ہے اور خود مرتب کی محنت، مشقت، تلاش اور جستجو اور اس کے فکر وخیال کی وسعت اور گہرائی کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ جناب کالی داس کی یہ خواہش بہت مبارک ہے کہ:

"کام زیادہ سے زیادہ صحت کے ساتھ انجام پائے۔"

جب تک بنیادی متون پوری صحت کے ساتھ یکجا نہ ہو جائیں چکبست کی علمی حیثیتوں کا بھی کما حقہ، تعین نہیں کیا جا سکتا۔ میری دلی خواہش اور دعا ہے کہ جناب کالی داس اپنے اس عمدہ مقصد میں بخوبی کامیاب ہوں اور اپنے منصوبہ کے مطابق تمام کتابیں جلد تر شائع کر سکیں۔

مجھے جناب کالی داس پر حیرت ہوتی ہے کہ تحقیقی کاموں کے کرنے کا سلیقہ انھوں نے کس طرح سیکھا۔ دوران مطالعہ جو بھی قابل لحاظ باتیں ان کے سامنے آتی ہیں وہ ان کو الگ الگ فائلوں میں محفوظ کرتے جاتے ہیں۔ ۱۹۷۷ء میں پروفیسر گیان چند نے لکھا تھا کہ:

"آپ نے تحقیقی یادداشتوں کی تقریباً ڈیڑھ سو فائلیں تیار کر رکھی ہیں۔"

میں اسے صابر دت کا کارنامہ سمجھتا ہوں کہ انھوں نے مذکورہ فائلوں کی علمی اہمیت سے خاص وعام کو روشناس کرایا۔ ان کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ وہ رضا صاحب کے کتبخانے سے "ڈھیر ساری فائلیں" اٹھا لائے۔ ان میں جو متفرق مضامین تھے ان کو بہ اعتبار موضوع جمع کر کے ایک نہایت مفید کتاب "سہو وسراغ" کے نام سے تیار کر کے ۱۹۸۰ میں چھاپ دی۔ اب خیال ہوتا ہے کہ اگر صابر دت کو موقع مل جائے اور وہ باقی فائلیں بھی نکال لانے میں کامیاب ہو جائیں تو شاید ایسی ایک دو کتابیں اور بھی تیار ہو سکیں۔

جناب کالی داس کی دلچسپیاں محض قدما تک محدود نہیں ہیں بلکہ وہ معاصرین سے بھی محبت اور مروت کے معاملات رکھتے ہیں اور ان کے کارناموں کی بھی قدر کرتے ہیں۔" فن اور شخصیت" کے "آپ بیتی نمبر" کی نگرانی جناب کالی داس نے خود کی تھی اور یہ تمبر صوری اور

معنوی ہر قسم کی خوبیوں سے مزین ہو کر ۱۹۸۰ء میں شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ میں اسے دور حاضر کے اہل قلم کا جن میں شعرا، افسانہ نگار، ناقدین اور محققین سبھی شامل ہیں ایک مستند مرقع بلکہ تذکرہ سمجھتا ہوں۔

یہ بڑی طمانیت بخش حقیقت ہے کہ جناب کالی داس کے تحقیقی کارناموں کا عام طور سے اعتراف کیا جانے لگا ہے۔ جناب ظفر ادیب کو غالباً اس باب میں اولیت حاصل ہے کہ انھوں نے ایک مربوط اور مبسوط کتاب "کالی داس گپتا رضا۔ تحقیق و تالیف اور شعر کی روشنی میں" مرتب کر کے جنوری ۱۹۸۲ء میں شائع کر دی تھی۔ ماہنامہ شاعر بمبئی کے ایڈیٹر افتخار امام صاحب بھی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اپنے رسالے میں رضا صاحب کی علمی خدمات کے اعتراف کے طور پر "گوشہ" شائع کیا ہے۔ سنا ہے کہ اور بھی بعض رسالوں نے خاص نمبر نکالے ہیں۔ ان سب کو دیکھ کر بے ساختہ میر علی اوسط رشک کا شعر زبان پر آ جاتا ہے۔

نہیں موقوف اولاد کماں و خلق و دولت پر
بڑی تقدیر ہے دنیا میں جس کو نام ملتا ہے

اردو میں باقاعدہ تحقیق کی عمر ابھی کچھ زیادہ نہیں ہے۔ اس پر زیادہ مصیبت یہ ہے کہ ہمارے محققین بہت تیزی سے اٹھتے چلے جا رہے ہیں۔ حافظ محمود خاں شیرانی گیے، مولانا امتیاز علی خاں عرشی سدھارے اور اب جناب قاضی عبدالودود صاحب بھی رخصت ہو گئے ہیں نسل یقینی طور سے بے صلاحیت نہیں ہے اور اس سے توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں لیکن عام طور سے یونیورسٹیوں میں جو ہو رہا ہے اس کی وجہ سے ہرگز توقع نہیں کہ با استعداد نوجوانوں کو ابھرنے اور اپنی لیاقتوں کو روبکار لانے کے مواقع بآسانی مل سکیں۔ اب جو بزرگ ہیں ان میں بار بار پروفیسر گیان چند کی طرف نگاہ اٹھتی ہے کہ آج اردو دنیا میں اسم با مسمیٰ انہیں کی ذات ہے۔ ظاہر ہے کہ پروفیسر گیان چند صاحب جناب کالی داس کے لیے جو فرما دیں وہی سند ہے۔ کم از کم میرا جیسا شخص تو اس سے اختلاف کی جرأت نہیں کر سکتا خصوصاً اس لیے کہ میں خود ہی جناب کالی داس کی محنت و کاوش، مطالعہ اور غور و فکر کا نہایت معترف ہوں گیان چند فرماتے ہیں:

تحقیق میں وہ (گپتا رضا صاحب) قاضی عبدالودود کے پیرو بلکہ جانشین ہیں۔ قاضی صاحب مرحوم انہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ اس

جذباتی رشتے کی وجہ یہ ہے کہ وہ بھی تحقیق میں قاضی صاحب کے حزم و احتیاط کو مدِّنظر رکھتے ہیں۔ رضا صاحب کے فیصلوں میں کہیں انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ کیوں کہ ان کے ہر دعوے کو معتبر اسناد کی پشت پناہی ہوتی ہے۔ اس زمانے میں وہ معترضوں کے جواب میں قدما اور اساتذہ کے کلام سے جس طرح اسناد پیش کرتے ہیں اس سے قدیم اساتذۂ فن کی یاد آجاتی ہے۔"

ڈاکٹر علیم اللہ حالی

رضا کے فنی شاہکار نامے

اُردو غزل میں غالب نے اپنی نکتہ سنجی، معنی آفرینی اور افکار و خیالات کی وجہ سے جو شہرت و مقبولیت حاصل کرلی ہے وہ ایک مسلمہ حقیقت ہے لیکن اس برصغیر میں ذوق و داغ کی روایتوں نے جس طرح جڑ پکڑی ہے اور ان کے شاگردان در شاگردان کا جو جال سا بچھ گیا ہے وہ غالب کو نصیب نہ ہو سکا، اس کی کیا وجہ ہے؟ یہ بڑی تحقیق اور بہت اہم لسانی و فنی نکتوں کی طرف لے جانے والا مسئلہ ہے اس تفصیل سے قطع نظر میں اس حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ اُردو شاعری پر افکار و خیالات سے زیادہ زبان۔ بیان کے نت نئے تجربوں کی حکمرانی رہی ہے۔ الفاظ و تراکیب، محاورات اور تشبیہات کے نادر استعمال اور تجربوں سے اُردو کے شاعروں نے شعری روایت قائم کی ہے۔ انھوں نے شاعری میں الفاظ اور اس کے محل استعمال کی بالادستی کو قبول کرلیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک حرف اور لفظ کے ردّ و بدل سے نئے موضوعات پیدا کرلیے گئے ہیں۔ اس روایت کا اثر ہماری شاعری کی تمام اصناف پر پڑا ہے۔ خاص طور پر غزل لفظیات سے احساسات تک پہنچنے کا ایک وسیلہ بن گئی۔ الفاظ کے خوب صورت استعمال سے نئی احساسی کیفیتیں پیش ہونے لگیں، نتیجہ یہ ہوا کہ حسن و قبح کا سارا معیار استعمالِ الفاظ سے متعین ہوگیا۔ شاعری کی پستی و عظمت کا تعلق براہ راست لفظیات سے ہوگیا اور اس میں شک نہیں کہ اس میدان میں شعرائے کرام نے ایسی جست لگائی ہے کہ اس نے انھیں نئی منزلوں سے ہمکنار کردیا۔ ہماری شاعری کا عام، مقبول

عوام اور دُور دُور تک پھیلا ہوا مزاج انھیں بنیادوں پر قائم ہوا۔ چنانچہ اُردو شاعری میں داغ، ذوق کی روایت پھیلتی ہی چلی گئی۔ کالی داس گپتا رضا کا تعلق بھی اسی روایتی سرچشمہ سے ہے۔ لیکن جس طرح ہر اچھا شاعر روایتی محور پر چلنے کے باوجود اپنی منفرد تخلیقی تابانی رکھتا ہے اسی طرح رضا بھی روایت سے منسلک ہوتے کے باوجود انفرادی نقوش کے حامل ہیں، ان کے یہاں زبان وبیان کی طرف بھی توجہ ہے اور فکر وخیال کے نئے نئے گوشوں پر بھی نظر ہے۔ وہ براہ راست ہندوستان کے مشہور شاعر جوش ملسیانی سے قربت اور تلمذ رکھتے ہیں، جوش ملسیانی سے انھوں نے پورے طور پر اکتساب فن کیا ہے۔ جوش نے جو خطوط انھیں لکھے ہیں ان کا ایک مجموعہ "مکتوباتِ جوش ملسیانی بنام رضا" شائع ہوچکا ہے۔ ان مکتوبات کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت جوش نے جناب رضا کی شعری تربیت میں ہمیشہ دلچسپی دکھائی ہے۔ انھوں نے عروض والفاظ کی عام باتوں سے ہٹ کر فن وادب کے اہم نکتوں کی طرف رضا کی توجہ دلائی۔ یہ رہنمائی درسائی رضا نے بخوشی قبول کی ہے۔ ایک اچھے اور بیدار مغز صاحبِ علم کو جس طرح اپنے شاگرد کی ذہنی تربیت کرنی چاہیے جوش نے اسی طرح رضا کو درسِ سخن دیا ہے۔ اپنے مختصر اور طویل خطوط میں اپنی نجی باتوں سے زیادہ جوش نے علمی ادبی اور لسانی مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ۳ مارچ ۱۹۴۹ء کے خط میں انھوں نے رضا کی ایک غزل کے قافیوں میں ایطا کے عیب کو ظاہر کیا ہے اور انھیں یہ بتایا ہے کہ قافیے یا تو کرتیں مرتیں ہوں یا ہتیں، رہیں، بہیں وغیرہ۔

۶ جولائی ۱۹۵۱ء کے خط میں یہ بتایا گیا ہے کہ حد اور خم بہ تشدید دال و میم بھی درست ہیں۔ لفظ کلمہ کے سلسلے میں انھوں نے ۲۴ جولائی ۱۹۵۱ء کے خط میں یہ بتایا ہے کہ اردو کے شاعروں نے کلمہ کو بہ سکون لام کلمۂ بھی استعمال کیا ہے۔ ایک خط میں مت کو بالاتفاق متروک قرار دیا ہے اور شعر میں اس کے استعمال کو ممنوع بتایا ہے۔ ۲۷ جنوری ۱۹۶۹ء کے خط میں انھوں نے میری پلکوں سے نم اٹھے، پر اعتراض کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ نم اٹھنا درست نہیں، نم پیدا ہونا درست ہے۔ "سیم وزر سے تولے گئے" کی بجائے "سیم وزر میں

تولے گئے" کو درست بتایا ہے ـــــــ غرض ان سارے خطوط میں جوشؔ نے ہر حیثیت سے رضاؔ کی تربیتِ سخن کی ہے۔ انھوں نے مختلف مشاعروں کا ذکر کیا ہے۔ کچھ اہم کتابوں سے جو فنِ شاعری سے تعلق رکھتی ہیں رضاؔ کو متعارف کرایا ہے۔ جگہ جگہ حضرت نوحؔ ناروی کا ذکر کیا ہے جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ خود جوشؔ ملسیانی کے شعری مزاج کی تشکیل میں نوحؔ ناروی کے رنگِ سخن کو بڑا دخل ہے۔ ان تمام نکات و مسائل کے ساتھ ساتھ جوشؔ نے صحیح تربیت کے لیے کئی خطوط میں رضاؔ کو اپنے اشعار لکھ بھیجے ہیں، اس طرح ان مکتوبات کے پیش نظر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ رضاؔ نے جوشؔ ملسیانی کی تربیت کو خاصا طویل عرصہ حاصل کیا ہے، ظاہر ہے کہ جب ایسا باکمال استاد کسی ہنرمند اور سعادت مند شاگرد کی تربیت میں اتنی دلچسپی لے رہا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ ستارۂ فن آگے بڑھ کر ہمسرِ شمس و قمر نہ بن جائے۔

نگاہِ ناز جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

اتنی بات طے ہے کہ جب تک کسی شخص میں شاعری کا اصل ملکہ نہ ہو اس وقت تک بڑے سے بڑے استاد کی تربیت بھی کارگر نہیں ہو سکتی۔ رضاؔ کی شاعری میں زبان و بیان کی جو خوبی نظر آتی ہے وہ تو بلاشبہ ان کے استاد کی توجہ کا نتیجہ ہے لیکن جو چیز بلاشرکتِ غیرے رضاؔ کی ہے وہ ان کی بے پناہ تخلیقیت اور طباعی ہے۔ رضاؔ نے آگے چل کر جو کچھ اپنے شعری مجموعوں میں پیش کیا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے یہاں شعرگوئی کا ملکہ فطری طور پر موجود تھا۔ استاد کی نگاہوں نے ان کی شخصیت کا یہ جوہر محسوس کر لیا اور انھیں ہر طرح کامیاب فنکار بنانے کی کوشش کی۔

کالی داس گپتا رضاؔ کے مطالعہ کی وسعت نے انھیں شاعری کے علاوہ تحقیق و تنقید کے میدان کی بھی سیر کرائی ہے اور سچ یہ ہے کہ ان کے مطالعہ نے ان کی شاعری میں بھی ایک امتیازی خصوصیت پیدا کر دی ہے۔ ان کی کتاب "متعلقاتِ غالبؔ" ان کی تنقیدی اور تحقیقی صلاحیت کی زندہ و تابندہ مثال ہے۔

اس کتاب میں شامل اپنے مضمون "غزل قدسی اور تضمین غالب" میں انھوں نے ایک بڑی غلط فہمی کو دور کر دیا ہے جو سید وزیر الحسن کے ایک مضمون سے پھیل رہی تھی۔ وزیر الحسن نے اپنے ایک مضمون میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ سے پہلے دہلی میں ایک نعتیہ مشاعرہ منعقد ہوا تھا جس میں اس وقت کے اکابر شعرا نے شرکت کی تھی اور قدسی کی مشہور زمانہ نعتیہ غزل کے مطلع پر تضمین کہی تھیں۔ اس غزل کا مطلع یوں ہے ؎

مرحبا سید مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

وزیر الحسن صاحب کا دعویٰ ہے کہ غالب نے اس نعتیہ مشاعرہ میں شرکت کی ہے اور تمام غزلوں کا گلدستہ قاضی محمد عمر نے شائع کیا ہے۔ اسی سلسلہ میں انھوں نے غالب کی خودداری کا ایک پہلو یہ بھی دریافت کیا ہے کہ انھوں نے تضمین نگاری سے احتراز کیا ہے اور یہ صرف نعت گوئی میں شرکت کا شرف تھا، جس نے غالب سے قدسی کی غزل پر تضمین لکھوا دی۔ جناب رضا نے تحقیق سے کام لے کر ان دعاوی کو بے بنیاد بتایا ہے اور اس سلسلہ میں انھوں نے جو ثبوت فراہم کیے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وزیر الحسن صاحب نے کس طرح مفروضوں سے کام نکالنا چاہا تھا۔ رضا صاحب نے یہ ثابت کیا ہے کہ غزل قدسی کے مرتب قاضی محمد عمر نہیں تھے بلکہ محمد حسین خاں تحسین تھے۔ انھوں نے یہ بھی تحقیق کی ہے کہ اس سلسلہ میں کبھی کوئی مشاعرہ منعقد نہیں ہوا بلکہ تحسین نے خط و کتابت کے ذریعے قدسی کے شعر پر فرمائشی تضمینیں لکھوائیں اور اس طرح یہ گلدستہ تیار ہو گیا۔ محمد حسین خاں تحسین، صاحب ذوق آدمی تھے دہلی میں مطبع مصطفائی کے مالک تھے، یہ کام یعنی ترتیب غزل قدسی، انھوں نے حصول ثواب کے لیے کیا تھا۔ چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں کہ "بعد چھوڑ جانے اس دار فانی کے واسطے بقائے نام اور وسیلہ نیکی سرانجام کا ہو۔" وزیر الحسن صاحب نے تحسین کی خواہش بقائے نام کو خاک میں ملا دیا اور سارا کریڈٹ قاضی محمد عمر کو دیدیا۔ انھیں اس ثبوت کو پائے تحقیق تک پہنچانے کے لیے رضا صاحب نے حدیث قدسی کے مختلف ایڈیشنوں کا مطالعہ کیا ہے۔ جن اخبارات میں یہ تضمینیں

شائع ہوئی تھیں ان کا حوالہ پیش کیا ہے اور اپنی بات کو حتمی طور پر ثابت کر دیا ہے
بر سبیل تذکرہ جناب رضا نے وزیر الحسن صاحب کے اس قول کو بھی چیلنج کیا ہے
کہ غالب نے صرف نعت گوئی کے لیے تضمین لکھی ہے ورنہ عام طور پر اسے وہ اپنی
انفرادیت کے منافی سمجھتے تھے کہ دوسروں کے مصرع یا شعر پر اپنے کلام کی بنیاد رکھیں
رضا صاحب نے اپنے وسیع مطالعہ کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا ہے کہ غالب کے یہاں
ایسی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ انھوں نے بادشاہ ظفر کی غزل شمشیر آدھی رہ گئی، دلگیر آدھی
رہ گئی، پر تضمین لکھی ہے، اس کا آخری بند یوں ہے ؂

تم جو فرماتے ہو "دیکھ اے غالب آشفتہ سر
ہم نہ تجھ کو منع کرتے تھے گیا کیوں اس کے گھر"
جان کی پاؤں اماں باتیں یہ سب سچ ہیں مگر
دل نے کی ساری خرابی لے گیا مجھ کو ظفر
وداں کے جانے میں مری توقیر آدھی رہ گئی

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل اشعار اس بات کا کھلا ثبوت ہیں کہ غالب نے
تضمین سے بطور خاص کوئی اجتناب نہیں کیا ہے بلکہ دوسرے شاعروں کی طرح
کبھی کبھی اس طرف بھی متوجہ ہو گئے ہیں ؂

آہنگ اسد میں نہیں جز نغمہ بیدل
"عالم ہمہ افسانہ ما دارد و ما ہیچ"

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

مجھے جنوں نہیں غالب ولے بقول حضور
فراق یار میں تسکین ہو تو کیوں کر ہو

"متعلقاتِ غالب" تفہیم غالب کے لیے ایک اہم مواد ہے، غالب کو سمجھنے کے لیے ان افراد واصحاب کے بارے میں تفصیلی واقفیت ضروری ہے جو کسی رشتہ داری کے تعلق یا شاگردی کی وجہ سے غالب سے قریب رہے ہیں اور غالب کے رقعات اور قطعات میں موضوع بنتے رہے ہیں۔ جناب رضا نے غالب شناسی کے سلسلہ میں متعلقاتِ غالب میں کئی اہم باتیں بیان کی ہیں۔ غزل قدسی کے بعد دعائے صباح کا وہ منظوم ترجمہ زیرِ بحث ہے جو غالب نے فارسی میں کیا ہے۔ رضا کی دور رس نگاہوں نے اس میں غالب کے تسامح کو تلاش کر لیا ہے۔ اس کے بعد رضا نے غالب کے بھانجے مرزا عباس بیگ اور عباس بیگ کے چچا مرزا افضل بیگ کے سلسلہ میں تفصیلی حالات اکٹھا کیے ہیں۔ ان تفصیلات کو یکجا کرنا اور تاریخ کے مٹتے ہوئے ابواب کو مرتب کرنا بڑی دقت نظری کا کام تھا۔ رضا نے غالب کے مکتوبات اور قطعات سے ان دونوں کے حالات مرتب کیے ہیں۔ اس کے علاوہ ان تفصیلات کے حصول میں "کارنامہ سروری" سے بھی کام لیا گیا ہے۔ غالب کے جو خطوط سیاح کے نام سے مکتوب ہیں اور جن میں میر غلام بابا خان کا تذکرہ بھی ہے ہمارے مطالعہ کے لیے ایک نیا میدان مہیا کرتے ہیں۔ رضا نے محمد حبیب اللہ ذکا کے غیر مطبوعہ اردو دیوان کا مطالعہ پیش کر کے غالب سے ان کے تعلق نیز ان کے فارسی کلام پر غالب کے اصلاحوں کی بہت سی معلومات فراہم کی ہیں۔ اس طرح رضا نے ایک محقق اور ناقد ہونے کا حق بھی پورے طور پر ادا کر دیا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح جناب رضا نے ان حقائق کو مکمل طور پر دریافت کر لیا جہاں تک دوسرے محققین کی نظر نہیں پہنچ سکی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رضا بنیادی طور پر دقت پسند، مہم جو اور ممتاز و منفرد مزاج کے حامل ہیں۔ تحقیق میں ان کا انداز کچھ ایسا ہے کہ پڑھنے والا کہیں سے اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا۔ وہ غیر مصدق باتیں کبھی نہیں لکھتے۔ اہم نکتوں کو ماخذ کا حوالہ دے کر ہر لحاظ سے مکمل بنا دیتے ہیں، اس کے علاوہ جس موضوع پر وہ لکھ رہے ہوں اس سے متعلق بہت سے دلچسپ حقائق کو پیش کر کے اپنی تحریر میں دلکشی پیدا کر دیتے ہیں۔ مثلاً عباس بیگ اور مرزا افضل بیگ پر جو مقالے لکھے گئے ہیں ان میں اس بنگالن، ماہ لقا کی تفصیل بھی بیان کرتے

ہیں جسے مرزا عباس بیگ کے چچا مرزا افضل بیگ بیاہ کر لائے تھے اور جسے چچا کے انتقال کے بعد عباس بیگ بھگا کر پنجاب کی طرف لے گئے تھے اور جس کی وجہ سے خاندان میں زبردست انتشار پیدا ہو گیا تھا۔ جناب رضا کی تحقیق ژرف نگاری کا یہ عالم ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے امر کی تلاش و تشریح ضروری سمجھتے ہیں۔ مثلاً جب قدر بلگرامی نے مرزا عباس کی اولاد کو غالب کے نواسی نواسے بتایا تو غالب نے اپنے خط مورخہ ۲۲ فروری ۱۸۶۳ء میں اس کی پُر زور اور دلچسپ انداز میں تردید کی۔ قدر بلگرامی کو اس خط میں حقیقت حال سے مطلع کرتے ہوئے غالب لکھتے ہیں کہ

"ایک بہن اور اس کی مجموع اولاد وہاں میرا تو وہ خانہ باغ ہے۔"

اب جناب رضا کو یہ تحقیق کرنی تھی کہ غالب نے بہن کی مجموع اولاد کی بات کیوں کی ہے اور ایک کامیاب محقق کی طرح رضا صحیح صورت حال تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

متذکرہ بالا تفصیلات سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ جناب رضا کا ذہن مرتب اور مربوط ہے۔ وہ مفکرانہ اور علمی انداز میں حقائق تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں، اس پس منظر میں ان کی شاعری کے کچھ خاص نقوش نمایاں ہوتے ہیں۔ وہ اردو کے عام شاعروں کی طرح عشقیہ موضوعات پر زور نہیں دیتے غزل کی روایتی خصوصیات میں افکار و خیالات کی پائیداری کے مقابلہ میں احساسات و جذبات کی نزاکت و لطافت کی اہمیت زیادہ ہے اس لیے عام طور پر اردو غزل میں انفعالیت مجہولیت اور احساسی شدت کا احساس ہوتا ہے۔ غزل میں ہمیں ایک ایسی فضا ملتی ہے جہاں کارزار ہستی سے فرار حاصل کر کے گوشۂ عافیت میں پڑے رہنے کا شائبہ ہوتا ہے۔ غزل کا ماحول ہمیں تن آسانی، عیش کوشی اور لذت یابی کی طرف لے جاتا ہے اور کالی داس گپتا رضا اس کے برخلاف بیداری عمل فکر اور تنظیم و ترتیب کے قائل ہیں، اس لیے ان کے ذہن و مزاج کی صحیح کشاد غزل کی بجائے نظموں میں نظر آتی ہے، پیش نظر ان کے ایک مجموعۂ "شاخ گل" میں غزلیں بھی ہیں اور غزل کے عام لب و لہجہ کے اعتبار سے ایسے کامیاب اشعار بھی ہیں۔ مثلاً ؎

افسوس دل تک آنے کی راہیں نہ کھل سکیں
کوئی فقط خیال تک آکر پلٹ گیا

اُگیں گے پھول خیالوں کے ریگزاروں سے
خزاں کے گھر سے جلوسِ بہار نکلے گا

یہ اسیرانِ بلا اپنے ہی قیدی نکلے
کوئی پہرہ تو نہیں تھا درِ زنداں کے قریب

عمر بھر دل بجھا بجھا سا رہا
آپ کی ایک پل کی نفرت سے

میں وہ صدا ہوں جو حالِ دردں سنائے بغیر
اثر کی کھوج میں در در کی ٹھوکریں کھائے

ہم کو لے آئی تھی پھولوں کی مہک گلشن میں
چاک ہو جائیں گے داماں یہ خبر کس کو تھی

جلوۂ عام کے دھوکے میں چلے آئے تھے
بند ہوگا درِ جاناں یہ خبر کس کو تھی

لیکن سچ یہ ہے کہ رضا کا اصل جوہر نظموں میں کھلتا ہے جہاں وہ بسط و تفصیل کے ساتھ اپنے تجربات کو پیش کر سکتے ہیں، رضا نے فنِ شاعری کو کہیں بھی صرف تفنن طبع کے لیے نہیں اپنایا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ فنونِ لطیفہ اور خاص طور پر شعر و ادب کسی ملک اور کسی عہد کی تہذیب و ثقافت کے امین ہوتے ہیں۔ صرف لمحہ دو لمحہ کی جھوٹی خوشی شاعری اور زندگی کا مقصد نہیں بن سکتی، لاشعوری طور پر

رضاؔ اس بات کو محسوس کرتے ہیں شعر و سخن پر انفرادی اور نجی کیفیات و احساسات سے زیادہ زندگی کی اجتماعی اور انسانی قدروں کا حق ہے۔ انھوں نے غزل میں بھی اور خصوصاً اپنی نظموں میں یہ فنی مجاہدہ کیا ہے کہ تخلیقی منزلوں میں اپنے ذاتی تاثرات سے ہٹ کر موضوع سخن کو بھرپور طور پر پیش کیا جائے۔ اس طرح فنکار کا اپنے فن پارہ سے اپنے آپ کو باہر رکھنا ایک زبردست روایت شکنی ہے پتہ نہیں خود جناب رضاؔ کو اپنی اس خصوصیت کا اندازہ ہے یا نہیں لیکن جب آپ ان کی نظمیں فتح و شکست، ترک دنیا کیوں، امرت منتھن اور جھدنا کام وغیرہ کا مطالعہ کریں گے تو اس دعویٰ کی صداقت کھل کر سامنے آجائے گی۔

جناب رضاؔ اپنی شاعری میں ماضی کی قدیم ترین لہروں سے فکر و احساس کا تموج پیدا کرتے ہیں۔ قدیم مصریوں کی تہذیب ہو یا ہندوستان کی قدیم ترین Mythology رضاؔ کے یہاں خاص طور پر شعری تحرک کا باعث بن جاتی ہیں۔ انھوں نے مصریوں کی ہزاروں سال قبل مسیح کی تہذیب کو اس لیے موضوع سخن بنایا ہے کہ غیر مصدقہ تاریخی قرائن انسان کی ابتدائی تہذیب و ثقافت کی کھوج لگاتے ہوئے برصغیر افریقہ کی طرف لے جاتے ہیں، قدیم تمدن سے یہ گہری دلچسپی رضاؔ کا خاص موضوع ہے۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعہ گم گشتہ دنیاؤں کو تاریخ کے پھیلے ہوئے صفحات سے نکال کر ہمارے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بھگوان بودھ کا تیاگ اور ترک دنیا کیوں؟ جیسی نظموں میں وہ قدیم واقعات سے مثبت اور ٹھوس نتائج اخذ کرنا چاہتے ہیں۔ اپنی نظم فتح و شکست میں انھوں نے رگ وید کے منڈل ۱؎ سوکت ۳۲؎ کے متن کا ترجمہ کیا ہے لیکن ہم اسے محض ترجمہ نہیں کہیں گے۔ انھوں نے رگ وید کے اس موضوع اور اس فکر کو منتقل کیا ہے۔ اردو کا جامہ پہناتے ہوئے انھوں نے اس کے تمثیلی اور تشبیہی پہلو پر خاص طور پر نظر ڈالی ہے اور ان پرانی تحریروں میں چھپے ہوئے SYMBOLS کی طرف غیر محسوس طور پر اشارہ کر دیا ہے۔ اگر رضاؔ ان SYMBOLS کو اپنی سوجھ بوجھ کے لحاظ سے کوئی مفہوم عطا کر دیتے اور قطعی ترجمانی کی کوشش کرتے تو شاید ان علائم کا حسن محدود ہو جاتا

کہا جو کچھ تو تیرا حسن ہو گیا محدود

اس لیے رضا نے بے جا طور پر ترجمانی سے پرہیز کیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے امرت منتھن کی کتھا کو پیش کرتے ہوئے اپنے آپ کو قرار واقعی قصہ تک محدود رکھا ہے، انھوں نے ان موضوعات میں تمثیلی قوت پیدا کر دی ہے۔ امرت منتھن کی رعایت سے ان کے الفاظ اس نظم میں غیر معمولی طور پر متحرک پُر جوش، فعال اور باعمل نظر آتے ہیں۔ رضا کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ وہ لفظوں سے حرکت و عمل کی توانائی کا خوبصورت SUGGESTION پیش کرتے ہیں، متذکرہ بالا تمام نظموں میں یہ خصوصیت دیکھی جا سکتی ہے۔ رضا کے بیان میں اتنی قدرت ہے کہ وہ محض لفظوں سے ایک طوفان پیدا ہونے کا احساس دلا دیتے ہیں۔

کالی داس گپتا رضا کے اندازِ سخن کو سمجھنے کے لیے ان کی نظم ترک دنیا کیوں؟ کو پڑھنا اور سمجھنا ضروری ہے۔ وٹھوبا نے دنیا کے حرص و آز اور ہنگامہ و فساد سے بیزار ہو کر ترکِ دنیا کر لیا تھا۔ اس کا بیٹا سنت گیانیشور اسے جنگل سے واپس لانے کی کوشش کرتا ہے، یہ پوری نظم وٹھوبا اور گیانیشور کے مکالمہ پر مبنی ہے، اس نظم کا بڑا حسن یہ ہے کہ دونوں کردار زندگی کے نظریہ کو پیش کرتے ہیں۔ دو متضاد فلسفے آپس میں ٹکراتے ہیں، ایک ہی موضوع کو دو مختلف باشعور ذہن کس انداز میں سمجھتے ہیں اور کس طرح اس کی تعبیر کرتے ہیں ___ یہ نظم اس دلچسپ اور خیال افروز صورتِ حال کو پیش کرتی ہے۔ خیالات کا یہ مجادلہ بغیر کسی ردعمل کے شروع ہوتا ہے۔ وٹھوبا اپنی جگہ مطمئن ہے کہ ؎

قلب کی تسکین و راحت کے لیے
بن ہی موزوں ہے عبادت کے لیے
شہر میں افکار کا ہے ازدحام
دولت و دنیا سے لوگوں کو ہے کام

لیکن گیانیشور حقیقت کو دوسری طرح سے دیکھتا ہے۔ وہ ان مادی ہنگاموں سے گریز کی بجائے ان پر قابض ہو جانے کو زیادہ بہتر سمجھتا ہے۔ آگے چل کر یہ بحث مادی دنیا اور معرفت کی دوئی اور یکتائی کی بحث میں منتقل ہو جاتی ہے، انجام کار گیانیشور وٹھوبا کو واپس لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور یوں یہ فلسفہ ابھر کر سامنے

آتا ہے کہ ہمیں دنیا میں آنے کے بعد مادی وسائل سے گزر کر ہی عرفان کی منزل حاصل کرنی ہے۔ گیانیشور باہمہ بے ہمہ کی وکالت کرتا ہے اور دنیا میں عرفان کے حصول کا ایک نیا طریقہ بتاتا ہے۔ رضا کا کمال فن دیکھئے کہ وہ ڈھوبا اور گیانیشور کی بحث کو بڑی تدریج کے ساتھ آگے بڑھاتے ہیں۔ شروع میں ہلکی پھلکی باتیں ہوتی ہیں۔ رفتہ رفتہ طرفین فلسفہ کی گہرائیوں میں اترتے جاتے ہیں، ایک اور حسن کا پہلو اس نظم میں یہ ہے کہ چونکہ گیانیشور کی بحث میں جیت ہوتی ہے اس لیے فطری طور پر رضا نے اس کے ذریعہ پیش کی گئی حقیقتوں کو زیادہ بسط کے ساتھ اور زیادہ اثر انگیز اور باوقار لب و لہجہ میں بیان کیا ہے۔ غرض رضا نے ایسے عمیق اور فلسفیانہ موضوعات کی پیش کش میں بھی بیان کے حسن اور بلاغت کا خیال رکھا ہے۔ ان طویل فلسفیانہ نظموں سے ہٹ کر رضا نے مختصر نظمیں بھی لکھی ہیں، ایسی نظموں میں تاثرات کی شدت کا مظاہرہ ہے۔ رضا ایک باشعور فنکار کی طرح ہر طرح کے موضوعات کو پیش کرنے کی قدرت رکھتے ہیں انھوں نے کبھی کسی عصری یا نظریاتی موج میں بہہ کر موضوعات یا اسلوب و انداز کے سلسلہ میں ترک و انتخاب سے کام نہیں لیا، دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ رضا کی شاعری فطری حسن کی حامل ہے اسلئے اسے کسی خارجی اہتمام کی کبھی ضرورت ہی نہیں رہی۔ رضا کی شاعری کو صرف ان کے شعری مجموعوں کی روشنی میں نہیں پڑھنا چاہیے بلکہ ان کی پوری شخصیت کے پس منظر میں سمجھنا چاہیے ـــــ ایسی شخصیت جس میں علم بھی ہے حلم بھی ہے، تدبر بھی ہے اور تاثیر بھی ہے، مطالعہ بھی ہے اور مشاہدہ بھی، تخیل بھی ہے اور فلسفہ بھی، تاریخ بھی ہے اور اخلاق بھی ـــــ غرض شخصیت کے ان پہلوؤں کو سامنے رکھ کر ہی ہم رضا کی شاعری سے صحیح لطف اور افادیت حاصل کر سکتے ہیں۔

رام لال نابھوی

گپتا رضا
ایک شناخت

ہوا یوں کہ ہم ایک تحقیقی مقالہ بہ عنوان "چھنو لال دلگیر" پڑھ رہے تھے۔ اس میں مصنف کالی داس گپتا رضا اپنے نقطۂ نظر کو دلائل و براہین سے پیش کر رہے تھے۔ یہ معاملہ علماء میں زیر بحث تھا۔ ہمیں شرارت جو سوجھی تو ایک ہاتھ سے قلم اٹھایا۔ دوسرے ہاتھ سے تذکرہ آثار الشعرار ہنود نکالا اور ایک خط داغ دیا۔ جواب ملنا تھا۔ ملا اور کرارا ملا۔ بس ایک جھٹکا تھا۔ کچھ یوں لکھا تھا۔ "میاں جو آپ نے پڑھا ہے وہ میں نے بھی پڑھا ہے۔ جس کتاب کا حوالہ آپ نے دیا ہے وہ میرے پاس موجود ہے۔ لیکن جو میں نے پڑھا ہے وہ شاید آپ نے نہیں پڑھا فلاں کتاب کا فلاں ورق اور اس پر لکھی فلاں تحریر پڑھو۔" جواب میں قدرے تلخی تھی۔ لیکن تھا پُر لطف۔ یہ تھی رضا صاحب سے ہماری پہلی ملاقات اور یہی ملاقات دوسری ملاقات کا باعث بنی اور پھر لامتناہی ملاقاتیں۔ ایک سلسلہ چلا آرہا ہے۔

رضا صاحب چنڈی گڑھ تشریف لائے۔ ایک قد آور اور مضبوط جسم ہمارے سامنے تھا۔ نظر سے نظر ملی۔ ہماری نظر ٹھہر ہی نہ سکی۔ پُر رعب چہرہ۔ آنکھوں میں ذہانت کی چمک۔ موتیوں سے دانت۔ آواز میں لچک اور شوخی۔ پھر بھی جو کچھ، ایک آنکھ دیکھنے میں نظر آیا، اور اس کا جو اثر ہوا ہمارے نازک دل پر ہوا اس کا ذکر کرنے سے پہلے بتا دینا ضروری ہے کہ ایک اور جھٹکا ملا اور اس میں کرنٹ زیادہ تھا۔ یعنی ہمارا ہاتھ ان کے ہاتھ میں کیا پہنچا کہ انھوں نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ اپنی طاقت کا مظاہرہ کر ڈالا۔ یہ تھی دوسری ملاقات۔

ابھی چائے کا انتظار ہو رہا تھا۔ "یہاں کوئی لائبریری ہے۔ بہت بڑی۔ جس میں مخطوطات۔ قلمی نسخے۔ پرانی بیاضیں۔ کوئی قلندر۔ کوئی دیوانہ، کوئی زخمی۔ کوئی زار۔ کوئی جرار۔ کوئی رند۔ کوئی اسیر۔ کوئی ادیب غرض کہ کوئی اسی طبقہ کا مل سکے گا؟" یہ رضا صاحب کا پہلا سوال تھا۔ ہم گھر سے بیوی بچوں کو بے کم مزدوری کاموں سے ناطہ توڑ کر رضا صاحب سے ملنے گئے تھے کہ بمبئی کی سیر گھر بیٹھے کریں گے اور وہاں سے کچھ نہ کچھ لے کر ہی لوٹیں گے۔ لیکن یہاں تو لینے کے دینے پڑ گئے۔ میں نے کہا۔ "پہلے چائے پی لو۔" جواب ملا کہ "چائے اگر، بادمیں پی لیں گے۔" بیوی بچوں کو چھوڑا۔ مزدوری کاموں سے منھ موڑا اور سیدھے مخطوطات کی دنیا میں داخل ہو گئے۔ کھانے کا وقت آگیا۔ ہم نے جھنجھوڑا۔ مسکرا کر کہنے لگے۔ "میاں ایک ہی جھٹکے میں ایسے دس مخطوطات مل گئے۔ جن کی برسوں سے تلاش تھی۔" اتنا کہا۔ پھر غرق۔ ہماری تسلی اس حد تک ہو گئی کہ رضا صاحب جھٹکے دینے میں جہاں ماہر ہیں وہاں جھٹکے خود بھی خوب کھاتے ہیں۔ کھانا تو کیا شام کی چائے بھی غائب۔ لائبریری کا وقت ہو گیا۔ نکلے بلکہ یوں کہئے نکالے گئے۔ ہاتھ میں کاغذوں کا پلندہ۔ چہرے پر سرور اور نور۔ دل میں خوشی کے فوارے پھوٹ رہے تھے۔ وہ کچھ پاکر آرہے تھے اور ہم کچھ کھو کر جا رہے تھے۔ باہر نکلتے ہی فرمایا۔ "میں تمہیں یادداشتیں دے جاؤں گا۔ ان کی فوٹو سٹیٹ کاپیاں بھجوا دینا۔" وہ دنیا کا علم سمیٹ رہے تھے۔ ہم نے بھی فیصلہ کر لیا کہ اس سمٹے سمٹائے علم کے واحد وارث بنیں گے۔ تو لیجئے حضرات آج کا موضوعِ سخن کالی داس گپتا رضا ہیں۔ اے اہلِ نظر!

"اِک نظر تم میرا محبوبِ نظر تو دیکھو"

رضا صاحب بہ یک وقت محقق ہیں۔ مورخ ہیں۔ نقاد ہیں۔ مبصر ہیں۔ ادیب ہیں۔ شاعر ہیں۔ مصنف ہیں۔ سراغ رساں ہیں۔ عقابی نظر رکھتے ہیں۔ ہنس کی طرح دودھ سے پانی الگ کر دیتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ اعلیٰ تربیت یافتہ ہیں۔ سونے کا چمچہ منھ میں لے کر پیدا ہوئے ہیں۔ سونے کے پلنگ پر سوتے ہیں۔ اردو میں لکھتے ہیں فارسی میں لکھتے ہیں۔ انگریزی میں لکھتے ہیں۔ دوسروں کو لکھنا سکھاتے ہیں۔ شاید ہاتھ میں قلم بھی لے کر پیدا ہوئے ہیں۔ مصنفوں کو تصنیف کرتے ہیں۔

ان سے ٹکراتے ہیں۔ جھکتے نہیں۔ بہت بڑے تاجر ہیں۔ کروڑوں کا سودا کرتے ہیں وہ بہ یک وقت علم اکٹھا کرتے ہیں۔ روپیہ اکٹھا کرتے ہیں۔ علم سے علم پیدا کرتے ہیں۔ روپیہ سے روپیہ پیدا کرتے ہیں۔ روپے سے علم پیدا کرتے ہیں۔ نایاب چیزیں۔ نایاب قلمی نسخے۔ پرانی کتابیں۔ بیاضیں۔ خریدتے ہیں۔ انھیں ڈھونڈنے کے لیے اور پھر حاصل کرنے کے لیے ہر طریقہ اور ہر حربہ استعمال کرتے ہیں۔ اور جب کوئی مخطوطہ ہاتھ لگا تو یوں محسوس کرتے ہیں کہ زندگی کو زندگی ملی۔ قارون کا خزانہ ملا۔ اسے سنوارتے ہیں۔ ترتیب دیتے ہیں۔ الماری میں سجاتے ہیں۔ دل میں جگہ دیتے ہیں۔ ہم نے تو مدبرین کو اور بڑے بڑے تاجروں کو یہی کہتے سُنا ہے کہ رضا صاحب کے پاس دو خزانے ہیں۔ ایک دماغ میں۔ ایک بینک میں۔ اللہ جب دینے پر آتا ہے۔ دیتا ہے۔ کسی کو پوچھ کر تھوڑے ہی دیتا ہے۔ خوبی اور کمال تو یہ ہے کہ رضا صاحب نے اللہ میاں کو بھی گانٹھ رکھا ہے۔ ان سے بھی ان کی گاڑھی چھنتی ہے۔ گھر جیسے ہی تعلقات ہیں۔

آیئے ذرا انھیں کام کرتے دیکھیں۔ دن کا آدھا وقت تو وہ ادبی کام کرتے ہیں۔ باقی نصف وقت وہ سوداگری کرتے ہیں۔ دونوں سے برابر سلوک ہے دونوں اپنی اپنی جگہ خوش ہیں۔ ادبی کام میں ان کی یہ کوشش رہتی ہے کہ ایسا کوئی معرکہ کریں۔ کوئی ایسی نئی بات نکالیں جس کا کسی کو پتہ نہ ہو۔ جسے پتہ ہو وہ اس دنیا میں نہ ہو۔ اب ایسا کوئی مخطوطہ ان کے ہاتھ لگ جائے تو ان کے وارے نیارے۔ پہلے اسے چھانتے ہیں۔ پھر پھٹکتے ہیں۔ پھر وزن کرتے ہیں۔ اس کا ناپ کرتے ہیں۔ اس کا قد۔ اس کی سیاہی۔ اس کی عمر کی جانچ کرتے ہیں۔ کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ ابھی اس کی اناٹمی کہاں ختم ہوئی۔ اپنے ایسوں سے ملتے ہیں رائیں ہوتی ہیں۔ مشورے ہوتے ہیں بحثیں ہوتی ہیں۔ الٹ پلٹ کر پھر دیکھتے ہیں۔ چھوٹی خوردبین سے دیکھتے ہیں۔ بڑی خوردبین سے دیکھتے ہیں۔ جب مال کھرا اور بکاؤ یا یوں کہیے تہلکہ مچانے والا نظر آتا ہے تو جوہری کی طرح اس میں اپنا جوہر ملاتے ہیں۔ ادھر دھماکہ ہُوا ادھر ہنگامہ۔ ان کی بات کو کون جھٹلائے۔ کسی نے ہمت کی تو الجھ پڑے۔ ٹکرا گئے۔ نہ رکے نہ جھکے۔ ان کا یہ کاروبار خوش اسلوبی

چل رہا ہے۔ وہ خوش ہیں کہ ان کی محنت اور ان کے فن کی قدر ہوتی ہے۔ قارئین خوش ہیں کہ گھر بیٹھے بٹھائے موتیوں کی مالا مل گئی۔ تحسین آفرین تو ایسے محققین کو مل ہی جایا کرتی ہے۔ اسے حاصل کرنے کے لیے انہیں کہیں جانا نہیں پڑتا۔ میں نے تو مدبرین اور بڑے بڑے تاجروں کو یہ کہتے سُنا ہے کہ شہرت اور دولت ان کے پیچھے بھاگتی ہے اور انھیں پتہ ہی نہیں لگتا کہ کتنی مل چکی ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔ رضا صاحب کی صحت عمدہ ہے چہرے پر بشاشت ہے۔ کنول کی طرح کھلے رہتے ہیں۔ ہر شخص سے ہنس کر بات کرتے ہیں۔ اب ان سے کوئی پوچھے۔ خیر یہ تو بعد میں پوچھ لیں گے۔ ابھی ذرا ٹھہریئے، ہمیں ایک بات یاد آگئی رضا صاحب کو موسیقی سے گہری مناسبت ہے۔ ساز کی واقفیت ہے اور آواز کی پہچان ہے۔ راگوں سے انس ہے۔ مخطوطات کی طرح سازندوں کو۔ مغنّیوں کو موسیقاروں کو۔ آرٹسٹوں کو بھی ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ تھوڑا اور رک جائیں تو یہ انکشاف بھی کردوں کہ محفلوں میں نہیں جاتے۔ مشاعروں میں نہیں پہنچتے۔ ایوانوں کے چکر نہیں لگاتے۔ وزیروں کو نہیں جانتے۔ اپنا ڈنکا بجوانے کے ہنر سے ناواقف۔ گروہ بندوں اور پارٹی بازوں سے بے نیاز۔ ادب کے نام پر لوٹنے والوں سے لاتعلق۔ اپنی دنیا۔ اپنا کاروبار۔ ایک اور ایک بیوی۔ دو پیارے بچے۔ اللہ کا یہاں بھی کرم ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ یعنی ہم دو ہمارے دو۔ ہر سکھ۔ ہر موج۔ عام بات ہے۔ کہ لکشمی اور سرسوتی دونوں ایک جگہ قیام نہیں کرتیں۔ ایک تشریف لائی دوسری تشریف لے گئی۔ لیکن یہاں دونوں مقیم ہیں۔ دونوں خوش ہیں۔ رضا صاحب نے ہمیں یہ بات کبھی نہیں بتائی لیکن رضا صاحب کی سراغ رسانی کرتے کرتے یہ سراغ بھی چل گیا۔

ہم نے کئی بار سوچا کہ رضا صاحب اپنی جوانی اور تازگی میں افریقہ کے جنگلوں میں رہے۔ وہاں ادب اور ادیب کہاں۔ ساز و مینا کہاں۔ شعر و شاعر کہاں۔ ساز اور آواز کہاں۔ حسن و عشق کہاں۔ سمندر اور تلاطم کہاں۔ مخطوطات کے نسخے کہاں۔ لیکن جب یہ بھی سراغ رسانی کی تو معلوم ہوا کہ وہاں مشاعرے کرتے تھے۔ ماہر القادری مرحوم وہاں پہنچے تو گھیر لائے۔ شاعر پیدا کر لیے۔ اپنے

استاد قبلہ جوش ملیانی سے اصلاح لیتے رہے۔ ان کے خطوط اور ان میں چھپی رنگینوں سے لطف اندوز ہوتے رہے اور دوسروں کو کراتے رہے۔ کتابیں لکھتے رہے۔ چھپواتے رہے۔ کتابیں مارکیٹ میں ہوتی تھیں اور مصنف ہندوستان سے غائب ہوتا تھا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ایسی پراسرار شخصیت کی کھوج نکالنے کے لیے بین اقوامی شہرت کے سراغ رساں درکار ہیں۔ مگر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ادھر سراغ رساں پہنچے۔ اُدھر رضا صاحب نے ان پر قبضہ کیا اور ان کا علم چھین کر ہی انھیں جانے دیا۔

سنا ہے رضا کا فلیٹ ایک دانش کدہ ہے۔ وہاں ہر عمر کا۔ ہر سائز کا۔ ہر قسم کا۔ ہر زبان کا نسخہ ملتا ہے۔ کتاب ملتی ہے۔ نقل کیجیے۔ پوچھیے۔ رضا صاحب استاد ہیں۔ اور استادوں کے استاد ہیں۔ ہم نے یہ بھی سُنا ہے کہ رضا صاحب کا فلیٹ حیرت کدہ ہے۔ یہ تو ان سے پوچھیے جنھوں نے اسے دیکھا ہے۔ ہمیں تو رضا صاحب کتابیں دے کر ہی ٹرخاتے رہے ہیں۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔

عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ جنھیں مضمون لکھوانا ہوتا ہے وہ حاضر ہوتے ہیں۔ یا بلاتے ہیں۔ مہمان بناتے ہیں۔ انٹرویو دیتے ہیں۔ یہ ہمارے کیسے محبوب ہیں بمبئی میں تشریف فرما ہیں۔ ہم خط لکھتے ہیں۔ تو نخرے سے جواب دیتے ہیں۔ دور سے بات کرتے ہیں بلکہ بات ہی نہیں کرتے۔ یہی تو ایک ادا ہے جو ہمیں مار گئی ہے تو لیجیے حضرات

"ذکر اس پری وش کا اور پھر بیان اپنا"

رضا صاحب کے معاملات میں ہاتھ ڈال دیا۔ اب ان پر ہاتھ اٹھانے اور قلم چلانے کا سوال درپیش ہے۔ ہاتھ اٹھانے کے ہم حق میں اس لیے نہیں کہ ہم ان کی طاقت کا نمونہ دیکھ چکے ہیں۔ قلم چلانے سے پہلے ہم نے جو کام کیے پہلے وہ سنیے۔ ان کی مکمل مطبوعات میز پر رکھیں۔ تمام رسائل نکالے جن میں ان کے مضامین چھپ چکے ہیں۔ قلم چلانے سے پہلے ان کے ادبی معرکے ان کی تحقیقات۔ ان کے تنقیدی مضامین اور ان کے تبصرے نکالے۔ پھر انھیں

ڈھونڈا جنھوں نے ان پر تبصرے کیے۔ ان کے کام کو پرکھا۔ انھیں بھی لا جمع کیا۔ پھر لائبریریوں سے ماہر غالبیات۔ ماہر آتشیات۔ ماہر چکبستیات نکال لائے۔ جتنے شعرا اور ادبا پر رضا صاحب نے لکھا ان کا کام۔ ان کا کلام اور ان پر لوگوں اور نقادوں کی رائیں اکٹھی کریں۔ ہر قسم کی لغت تو ہمارے پاس پہلے ہی تھی۔ تازہ ترین اکٹھی کریں۔ جب میز بھر گئی تو ایک بڑے سائز کی میز پر ان کے تقسیم نامے عمل میں آئے۔ اس کام سے فارغ ہو کر ہم نے رضا صاحب کے کام اور کلام کے حصے بخرے کیے۔ ملا یہ کہ " ہر فن کے ہیں استاد انھیں کیا نہیں آتا"

شعر و شاعری
سوانحی خاکے
تنقیدی تناظر
تحقیقی مقالے
تواریخی مسئلے
مباحثے

اس مختصر مضمون میں رضا صاحب کی تخلیقات کے ان سبھی حصوں کا تجزیہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ چنانچہ ان کے کاموں میں سے ان کے محققانہ کام پر ہی نظر ثانی کی جا رہی ہے۔ ان کی تین ایسی کتابیں "دعائے صباح" "متعلقاتِ غالب" اور "سہو و سراغ" ہیں، جو اس وقت ہمارے سامنے ہیں۔ پہلی دو کتب کا تعلق غالب سے ہے اور تیسری کتاب میں رضا صاحب کئی ادبا کو قعر گمنامی سے نکال کر لائے ہیں۔ ان کی یہ کاوشیں پورے عروج پر ہیں۔

تحقیق کا کام جان جوکھوں کا ہے۔ ایک غوطہ خور کا سا جو سمندر کی عمیق گہرائی میں دُرِ مقصود حاصل کرنے کے لیے جان پر کھیل کر پہنچتا ہے۔ آخر اسے صدف ہائے گوناگوں میں سے صرف گوہر یک دانہ کی تلاش ہی تو ہوتی ہے۔ تحقیق ایک ایسا لامتناہی سمندر ہے جس کی تہوں سے کوئی فیصلہ کن نتیجہ اخذ کرنا نہایت مشکل ہے۔ تحقیقی مسائل کے نشیب و فراز میں الجھنا۔ تحقیقی وسائل کے انحطاط اور مسائل کا بھرپور جائزہ لینا۔ خارزاروں سے دامن بچاتے نکلنا۔ اشیا کے باطنی آہنگ

میں نقطۂ نظر کی تلاش کرنا۔ موضوعاتی کشمکش کے ہر پہلو کا احاطہ کرنا اور بھول بھلیوں سے نکل کر مشاہدہ کو تجزیہ کی منزل تک لے جانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ منطقی استدلال۔ علمی تفحص۔ تحقیقی ریاضت۔ تاریخی حقیقت۔ تنقیدی وزن و وقار تو جان لیوا ہیں ہی۔ شاعری۔ عروض۔ ترکیبات۔ صرف و نحو۔ تاریخ گوئی۔ فارسی اور عربی زبان اور اس عہد کی روایات، لسانیات۔ ادبیات و شخصیات سے کماحقہٗ واقفیت لازمی ہے۔ خود اعتمادی۔ وسیع النظری۔ خودداری۔ اصول پسندی۔ غیر تعصبی۔ صداقت اور حق گوئی کے علاوہ بے خوفی اور بے باکی کے بغیر یہ کام صحیح طور پر پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔ اردو زبان میں نقادوں اور مبصروں کا کیا کہنا۔ کہیں کوئی بات گرفت میں آئی اور انہیں اپنا نام پیدا کرنے کا وسیلہ ہاتھ لگا۔ ایک چھوٹی سی غلطی کیے کرائے پر پانی پھیر سکتی ہے۔ رضا صاحب کا عقیدہ ہے:

"خود اپنے ہی سوزِ باطنی سے نکال اک شمع غیر فانی"

تو حضرات چلیے منزل کی طرف اور لیجیے اپنے ہاتھ میں "دعاے صباح" جو سال ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی۔

"دعاے صباح" حضرت علی سے منسوب مجموعہ موسومہ "صحیفۂ علویہ" کی ایک مشہور و مقبول دعا ہے۔ جسے شیعی حضرات عموماً صبح کے وقت بعد نماز پڑھتے ہیں۔ اصل ماخذ میں لکھا ہے کہ نافلہ کے بعد پڑھی جائے۔ دعا عربی میں ہے اور قرآنی اسلوب بیان کے مطابق ہے۔ بہت حد تک قرآنی آیات استعمال ہوئی ہیں۔ دعا کا پیرایہ وہی ہے جو اسلامی دعاؤں کا ہوتا ہے۔

"دعاے صباح" کی فارسی شرحیں اور ترجمے صدیوں سے ہوتے آئے ہیں۔ زیرِ مطالعہ اور زیرِ بحث ایک ایسا فارسی منظوم ترجمہ ہے جو مرزا غالب نے کیا اور ان کی زندگی ہی میں ان کے بھانجے مرزا عباس بیگ کے ایما پر نول کشور پریس سے طبع ہوا۔ اس مطبوعہ نسخہ پر تاریخ طباعت درج نہیں لیکن رضا لائبریری کے ایک قلمی نسخے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نسخہ غالب کی زندگی ہی میں شائع ہو گیا تھا۔ اس مطبوعہ نسخہ کا تعارف سب سے پہلے فضل اللہ فاروقی نے "نوائے ادب" بمبئی اپریل ۱۹۵۰ء میں لکھ کر کرایا۔ اس کی اشاعت آٹھ بار ہوئی۔ اس مطبوعہ نسخہ کو مِن وعن

رضا صاحب نے مبسوط محققانہ مقدمہ کے بعد شائع کیا ہے۔ رضا صاحب کا کہنا ہے۔

(i) اس مثنوی کے معانی کو واضح کرنے کے لیے غالب نے اپنی طرف سے بھی بہت سے اشعار بڑھائے ہیں جن کی تعداد تینتیس ہے۔

(ii) مثنوی کے کل اشعار ایک سو اکتیس ہیں۔ ایک سو چوبیس "دعاے صباح" کے اور سات دعاے حضرت امام زین العابدین کے جو "دعاے صباح" پڑھنے کے بعد سجدہ میں پڑھے جاتے ہیں۔

(iii) غالب شیعہ تھے۔

(iv) کتابت کی غلطیاں اور فنی اسقام سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ یہ غالب کا شروع کا کلام ہوگا۔ لکھا اور بھلا دیا۔ کیوں کہ اس کا ذکر نہیں کیا۔ نہ فارسی کلام میں شائع کیا۔ کہیں سے پرانا نسخہ مرزا عباس بیگ کے ہاتھ لگا اور انھوں نے اسے اپنے ایما پر مطبع نول کشور پریس لکھنؤ سے ازراہِ عقیدت چھپوا دیا۔

مطبوعہ نسخہ میں پہلے عربی متن ہے۔ پھر فارسی ترجمۂ نثر اور اس کے نیچے غالب کا منظوم ترجمۂ فارسی ہے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ نثر میں ترجمہ کس نے کیا ہے۔ اور کیا وہ عربی متن کے عین مطابق ہے۔ ایک صاحب نظر سرسوتی سرن کیف صاحب کا خیال ہے کہ مرزا غالب وفات سے چند سال قبل اپنے ہر طرح کے کلام کو منظر عام پر لانے کے متمنی تھے اور جن خطوط کی اشاعت سے انھوں نے پہلے انکار کر دیا تھا انھیں بعد میں زور دے کر شائع کرایا۔ لہٰذا اگر یہ مثنوی عہدِ جوانی کی تصنیف تھی تو بھی غالب اس کی اصلاح کر سکتے تھے۔ کیف صاحب کا خیال ہے کہ غالب نے یہ منظوم ترجمہ شیعیت میں اپنے پختہ اعتقاد کے ثبوت کے طور پر اس وقت کیا ہوگا جب وہ علَم کے قضیہ میں شیعہ فرقہ میں اٹھنے والے طوفان کے نرغے میں پھنس گئے تھے۔ انھوں نے خلفشار میں یہ منظوم ترجمہ کیا ہوگا اور اس لیے اس میں اغلاط رہ گئیں۔ کیف صاحب کے خیال میں غالب عروض و قافیہ و بیان و معنی کے ماہر نہیں تھے۔ معاملہ تو ایسا تھا کہ دانشوران اس پر کھل کر بحث کرتے بہر حال رضا صاحب نے ایک نقطہ نکالا ہے۔ اور شاید وقت کے ساتھ اس کی مزید تحقیق ہو گی۔ یا ہو رہی ہو گی۔

"متعلقاتِ غالب"، سال ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی۔ اس محققانہ کاوش کا پہلا مضمون غزل قدسی اور تضمینِ غالب ہے۔ سید وزیر الحسن نے ایک مضمون بہ عنوان "دلی کے ایک اہم نعتیہ مشاعرے کی تضمین" لکھا۔ جس میں انھوں نے بتایا تھا کہ دربار شاہ جہاں کے ملک الشعراء قدسی کی مشہور زمانہ نعتیہ غزل پر دلی میں ۱۸۵۷ء کے غدر سے کچھ ہی مدت پہلے ایک نعتیہ مشاعرہ میں اس وقت کے مشاہیر شعرا نے اس نعتیہ غزل پر تضمینیں پڑھی تھیں۔ اور ان تضمینوں کو قاضی محمد عمر ساکن دہلی نے ایک گلدستہ کی شکل دے کر "حدیثِ قدسی" کے نام سے مرتب کیا تھا۔ اور یہ کہ غالب کبھی تضمین نہیں کرتے تھے۔ اور یہ اصول انھوں نے صرف نعت گوئی کے لیے توڑا تھا۔ مضمون تو ربع صدی پہلے کا تھا۔ مگر پڑ گیا ہاتھ رضا صاحب کے۔ بال کی کھال، ادھیڑنے کے لیے اپنے ہی محکمۂ غالبیات میں داخل ہوئے۔ اور فیصلہ سنا دیا کہ اس مفروضہ نعتیہ مشاعرے کا کبھی انعقاد ہی نہیں ہوا۔ قاضی محمد عمر صاحب "حدیثِ قدسی" کے اولین مرتب نہیں۔ محمد حسین خاں تحسین جو اس عہد میں مطبع مصطفائی دہلی کے مالک اور مہتمم تھے نے ایک کتاب بہ عنوان "چمنِ مدحِ نبی" ترتیب دی تھی۔ جس میں انھوں نے اس وقت کے نامی گرامی شعرا سے خود اور بذریعہ خط و کتابت قدسی کی اس نعتیہ غزل پر تضمین کرائی۔ اور ۱۸۵۴ء میں یہ کتاب مجموعہ خمسہ ہائے غزل قدسی یا چمن مدح نبی کے نام سے پہلی بار شایع کی اور یہ کہ غالب کے ہاں تضمین ممنوع نہیں تھی۔ جس کا ثبوت بھی دیا گیا ہے۔ رضا صاحب کا مزید کہنا ہے کہ خمسہائے غزل قدسی یا چمن مدحِ نبی ۱۲۶۹ھ میں مرتب ہوئی۔ اور ۱۲۷۱ھ میں شایع ہوئی۔ "حدیث قدسی" کی ترتیب کا خیال قاضی محمد عمر صاحب کو ۱۲۷۲ھ میں آیا جو ۱۲۷۹ھ میں مکمل ہوا۔ جسے معمولی حذف اور اضافے کے ساتھ اپنی تالیف کہہ کر حدیثِ قدسی کے نام سے شایع کرایا۔ تحسین کا جن کے نسخے کی چوری کی گئی۔ ذکر تک آنے نہیں دیا گیا۔ رضا صاحب رقم طراز ہیں کہ حاجی سید شمشیر علی بھی اسی طرح قاضی محمد عمر صاحب کے ہی مقلد و ہم مسلک نکلے۔ انھوں نے کچھ خمسے قاضی محمد عمر کے یہاں سے نقل کیے، کچھ بذریعہ خط و کتابت اور ذاتی طور پر حاصل کیے اور باقی کی ایک بڑی تعداد ہفتہ وار جریدۂ روزگار مدراس سے لے کر بغیر کسی حوالے کے درجِ کتاب کر دی۔ اور صحیفۂ قدسی حصہ دوم

حدیث قدسی" اپنی تالیف بنا ڈالی۔

رضا صاحب نے "معارف" دسمبر ۱۹۷۶ء میں چھپے ڈاکٹر سمیع الدین احمد صاحب کے مضمون کا ذکر کیا ہے جو قاضی محمد عمر اور حاجی شمشیر علی کی دونوں مطبوعات پر مبنی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ یہ نامکمل واقفیت کی بنا پر لکھا گیا ہے۔

آگے چل کر مرزا عباس بیگ مرحوم (خواہر زادہ غالب) مرزا افضل بیگ مرحوم (غالب کے بہنوئی مرزا اکبر بیگ کے چھوٹے بھائی) کی زندگی کے حالات کی چھان بین کی گئی ہے۔ غالب کے مطبوعہ قطعات تاریخ۔ غالب کے دو غیر مطبوعہ قطعات تاریخ اور گلدستہ سخن اور میاں داد خاں سیاح کے بارے میں تاریخی نشاندہی کی ہے آخر میں ذکا شاگرد غالب اور اس کا غیر مطبوعہ دیوان اردو۔ اس کی مختصر حالاتِ زندگی تذکرہ عروس الاذکار۔ دیوانِ ذکا اردو۔ دیوان ذکا میں چند تاریخی قطعات اور انتخاب دیوان ذکا (اردو غزلیات) درج ہے۔ اشاریہ اور کتابیات کے ساتھ اس کتاب کو ختم کیا گیا ہے۔

رضا صاحب کی تحقیق سے متعلق تیسری کتاب "سہو و سراغ" ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جس میں رضا صاحب کچھ ادبا کو قعرِ گمنامی سے نکال کر لائے ہیں۔ اور ان کا نظریہ شاہین کا ہے۔ اس کتاب کی بات کرنے سے پہلے میں رضا صاحب سے چاہوں گا کہ اگر وہ کبھی ادھر کا رُخ کریں تو انھیں اور ایسے ادبا کا پتہ لگے گا جن کا ذکر نہ کبھی ہوا اور نہ ہو گا اور جن کا کام تذکروں کی زینت بننے کے قابل ہے۔

اس کتاب میں آتش لکھنوی، اسیر لکھنوی۔ گو زبخش لکھنوی۔ امانت لکھنوی۔ بحر لکھنوی۔ جرار فیض آبادی۔ رائے سرب سکھ دیوانہ لکھنوی۔ رند لکھنوی۔ رشک لکھنوی۔ مینڈو لال زار لکھنوی۔ شاد لکھنوی۔ ناسخ لکھنوی۔ وزیر لکھنوی کے زندگی کے حالات ان کا کام اور ان کا کلام مختصراً درج ہے۔ مرزا جان جاناں مظہر اور رائے کیول رام کی زندگی کے حالات پر ایک مختصر مضمون، منشی گوبند رام۔ آفتاب رائے رسوا دہلوی منشی بنسی دھر ہمت لکھنوی۔ منشی کنج بہاری لال شفق۔ راجہ رتن سنگھ زخمی اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے حالات زندگی اور کام پر مضامین ہیں۔ مولانا فضل حق خیر آبادی کا

تاریخی قصیدہ ہندو مرثیہ گو۔ ہندو شعرا کی نعتیں۔ داغ اور اودھ پنچ۔ مثنوی مولوی معنوی۔ چند مشہور شعرا اور ان کے خالق۔ چکبست اور طنز و مزاح۔ دبیر کے تذکروں کے بعد غالبیات سے ہوتے ہوئے بھی چند مضامین ہیں۔ ان میں ماہر القادری کے متعلق مضمون تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔

ہم نے شروع میں لکھا تھا کہ رضا صاحب کی نظر عقابی ہے اور اب تو ہم اس نتیجے پر بھی پہنچ گئے کہ ان کی یادداشت بھی غضب کی ہے۔ انھیں "ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ" مرتبہ ڈاکٹر سید عبداللہ ازبر ہے۔ کسی ایسے ادیب کا پتہ لگا جس نے فارسی میں کوئی مستند چیز لکھی ہو اور جس کا ذکر ڈاکٹر سید عبداللہ نے کیا ہو اور وہ اس ادیب کو اور اس کے تمام کام اور کلام کو ہی اٹھا لائے اور چل پڑے اور جب تک چین نہ لیا جب تک اس ادیب کو مستند اور موقر ادبا کی فہرست میں جگہ نہ دلائی۔ یہی تو ان کا کارنامہ ہے کہ قعر گمنامی میں پڑے ان ادیبوں کی وہ کھوج میں لگے رہتے ہیں اور پھر ڈٹ کر محنت کرتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ یہی تحقیق ہے۔ ورنہ بقول اکبر:

خدا کے واسطے اکبر کوئی ذکر اور ہی چھیڑو
سنی باتوں کا کیا سننا، کہی باتوں کا کیا کہنا

حسن عباس فطرت

کمار رضا

ایک مدت تک ملکوں ملکوں، شہروں شہروں کی آوارہ گردی اور دریوزہ گری کے بعد جب خیر سے بدھو گھر کو آئے تو یہاں کے علمی رسالوں میں ایک نیا اور بڑا سا نام دیکھا اور وہ تھا کالی داس گپتا رضا۔ اس سے قبل میں اس طرح کے لوگوں میں مہتاب پسروی، شانتی رنجن بھٹا چاریہ، اور دوارکا داس شعلہ کے نام سے واقف تھا۔ مگر یہ نام کہیں نہیں دیکھا تھا۔ جب کہ مضامین نہایت درجہ علمی اور تحقیقی ہوتے۔ جسے رشید احمد صدیقی "گورکنی" کہا کرتے تھے اگرچہ وہ مرحوم کی حسینِ حیات ہی ترقی کر کے "کوہ کنی" تک جا پہنچا تھا۔ ایک ایسا نام جس کی ابتداد انتہا کچھ معلوم نہ ہو ہر آدمی کو الجھن میں ڈال دیتا ہے۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ اگر یہ حضرت نئے نئے قلم بکف ہو کر میدان میں آئے ہیں تو چشم باروشن و دلِ ماشاد۔ بسم اللہ بفرمائید، لیکن مضامین کی نوعیت پکار پکار کے کہہ رہی تھی کہ یہ تو کوئی "پراگندہ طبع لوگ" میں کا ہے۔ نئے نئے لوگ یا تو شعر و شاعری سے ابتدا کرتے ہیں یا پھر کسی جدید شاعر کی قصیدہ خوانی سے نثر نگاری کا آغاز۔

جب ہم اس عقدۂ لسانی کو حل کرنے سے معذور رہے تو اپنی انسائکلوپیڈیا کی طرف رجوع ہوئے۔ پروفیسر مجاہد حسین حسینی صاحب کا کمال یہ ہے کہ ان کو بھلے ہی کوئی نہ جانتا ہو موصوف سب کو جانتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ جناب یہ رضا صاحب پہلے نیروبی میں ہوتے تھے۔ شاعری فرماتے تھے۔ میں نے فرمایا کہ ٹھیک ہے تو کیا وہ چلے آئے؟۔ ہاں ہاں کئی برس ہو گئے۔ بڑے 'دقاق' ہیں، علم

العروض اور شعر گوئی کی فنی باریکیوں کو بغیر چشمے کے دیکھ لیتے ہیں۔ میرے منھ کا مزہ پھیکا ہونے لگا۔ عروضی سمرقندی کے علاوہ میرا سامنا جتنے عروضیوں سے ہوا وہ زیادہ تر پرانے کیمیاگروں کی طرح جنونی ثابت ہوئے ہیں۔ خدا ان کی زد سے ہم ایسے آشفتہ سروں کو محفوظ رکھے۔ اجی ہاں ٹھیک ہے، خیر اور کچھ تعریف و توصیف ممکن ہے ان کی آپ سے؟ بس خدا کے لئے آپ ان کا رشتہ آرزو لکھنوی سے نہ ملا دیجئے گا؛ آرزو لکھنوی، پروفیسر ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی کا محبوب موضوع ہے اور پی۔ ایچ۔ ڈی لینے کے بعد بھی آرزو کی جان بخشی نہیں ہوئی ہے۔ نہیں بھائی وہ تو داغ اسکول کے ہیں اور جوش ملسیانی کے شاگرد ہیں ــــ لا الہ الا اللہ، ایک تو کریلا پھر نیم چڑھا۔ یہ کیسے گلے اترے گا۔ خیر جی بمبئی میں بہت سے شاعر، عالم اور محقق بستے ہیں ان سے ملاقات نہیں کر سکا تو ان کو بھی سہہ لوں گا۔" ایک بات تو کہنے سے رہ گئی کہ ان کے پاس ایک سے ایک نادر کتابیں موجود ہیں اور بہت عمدہ ذخیرہ کتب۔" تب تو میرے دل نے کہا کہ ان سے ملاقات ہونی ہی چاہیے مگر یہ بات بھی بہتوں کے بارے میں میرا دل کہہ چکا ہے اور دل کی دِل ہی میں رہ گئی ہے۔ وہی حال کالی داس گپتا رضا صاحب کا بھی ہوا۔'

رضا صاحب شاعر ہیں اچھے شاعر، ہر رنگ میں کہنے والے، ان کے چار دیوان شائع ہو چکے ہیں۔ نظمیں، غزلیں، رباعیاں، قطعات، منقبت، منظوم ترجمے، سیاسی، سماجی شاعری، کوئی خانہ خالی نہیں چھوڑا ہے لیکن ان کی شاعری نہ زیادہ اخبار و رسائل میں نظر آتی ہے نہ مشاعروں میں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ شاعری انھوں نے سوزِ ناتمام کے ہاتھوں مجبور ہو کر اختیار کی اور اس راہ میں وہ اپنی ساری جسمانی و ذہنی قوت کو صرف کرنے پر بھی شہرتِ دوام حاصل کرنا نہیں چاہتے۔ بہرحال یہ تو اندازہ ہو گیا کہ کالی داس گپتا رضا نہ تو ایسے جوان ہیں جن کی مسیں بھیگ رہی ہوں نہ کوئی بڈھے ٹھڈے گور میں پاؤں لٹکائے ہزاروں یادوں کی تختی سینہ پر جمائے اور ماضی کی گھگھنی منہ میں ڈالے ہوئے بزرگ ہیں۔ اور 'ہم کل شئی مرہون یادقا تھا' کے قائل،

جب کبھی منظورِ خدا ہو گا بل لیں گے۔

تحقیق کا مادہ رضا کی فطرت میں ابتدا سے موجود تھا وہ اپنے اُستاد کو الفاظ کے استعمال و اعراب میں اکثر مین میخ نکال کر ستایا کرتے تھے۔ شعر کی اصلاح لینے پر اکتفا نہ کرتے بلکہ معانی و بیان کے بہت سے رموز ضمنی طور پر دریافت کر لیتے۔ یہی ذوقِ جستجو ان کو تحقیق کی خانقاہ میں لے آیا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ رضا صاحب نے جب افریقہ سے واپس آکر پھر ہندوستان بسایا تو اس وقت اردو تحقیق کی ہانڈی میں اُبال آیا ہوا تھا اور بہت سے "بڑوں" کے کئے کرائے پر پانی پھیرنے کا چلن عام تھا۔ پاکستان سے چل کر یہ وبا ہندوستان میں بھی آگئی اور اس کی زد میں ہمارے بہت سے عمر و ضعیف محققین آ گئے۔ تحقیق اب انفرادی شوق نہیں رہ گیا بلکہ ایک ذمہ دارانہ علمی کام قرار پایا۔ گیان چند جین، ابو محمد سحر، نثار احمد فاروقی، تنویر احمد علوی، عابد رضا بیدار ایسے نہ جانے کتنے جنونی پیدا ہو گئے جو تحقیق کی شناوری میں نئے نئے کرتب دکھا رہے تھے غرض کہ دریا بھی جوش میں تھا اور پیراکوں کے حوصلے بھی اونچے تھے چنانچہ رضا بھی اس میدان میں بسم اللہ کہہ کر پھاند پڑے اور لگے نئی نئی کھینے سنانے معارف، نیا دور، آجکل، تحریر، شاعر، صبحِ امید کے ذریعے۔

یہ تو ہمیں معلوم ہی تھا کہ رضا صاحب نیروبی میں برسہا برس رہ چکے ہیں۔ مالی حالت اچھی ہو گی کیوں کہ ان ہی کی طرح میرے دو چار اور بھی دوست ہیں جو ہندوستان آچکے ہیں، مگر آگے کچھ خبر نہ تھی کہ موصوف فی الحال یہاں کیا کر رہے ہیں۔ اتفاق سے ایک دن ہمارے شاعر دوست اعجاز سیمابی سے سرِ راہ ملاقات ہو گئی۔ اعجاز سیمابی کی میں اس لئے قدر کرتا ہوں کہ وہ محض شاعر نہیں بلکہ علمی مذاق اور تنقیدی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ باتوں بات میں رضا صاحب کا ذکر آگیا۔ میں نے کہا بھئی یہ کون شخص ہے جو رہتے رہتے ایک نہ ایک توپ داغ دیا کرتا ہے؟ وہ تو جیسے موقع اور بہانہ کے منتظر تھے انھوں نے بالتفصیل رضا کے مالہ و ما علیہ سے آگاہ کرنا شروع کر دیا۔ جیسے جیسے ان کی تقریر آگے بڑھتی میں حیرت زدہ ہوتا جاتا۔ مثلاً یہ کہ وہ صرف دو گھنٹہ اپنے معاشی کاروبار کو دیتے ہیں اور

باقی وقت علمی کاموں پر صرف کرتے ہیں۔ بنکنگ کا کاروبار کرتے ہیں لیکن روپیہ پیسہ کو حقیر سمجھتے ہیں۔ شاعر ہو کر واہ والے سے گھبراتے ہیں۔ انگریزی کی اعلیٰ لیاقت رکھنے کے باوجود عروض کے رسیا اور ماہر ہیں۔ تحقیق پسند ہوتے ہوئے اردو کے تمام اخبارات و رسائل کا بغور مطالعہ کرتے ہیں اور ہم ایسے ادب کے چیڑ قناتیوں کی تحریریں بھی پڑھتے ہیں۔ اتنی اور اس سے زیادہ باتیں معلوم کرکے کون ہوگا جس کے اندر اشتیاقِ ملاقات کا جذبہ نہ ابھرے مجھے بھی یہ شوق بجرایا، میں نے کہا۔ اعجاز صاحب ان سے ملاقات ہونا چاہیئے۔ اعجاز صاحب نے جو جواب دیا اس نے مجھے متحیر کردیا۔ بولے کہ وہ بھی "انقلاب" (بمبئی) میں آپ کے تبصروں کی اکثر تعریف کیا کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ تو پھر ہو جائے کسی دن۔ پھر بات آئی گئی ہو گئی۔

اس کے بعد "مکتبۂ جامعہ" میں ان کی کتاب "مکتوباتِ جوشؔ بنام رضاؔ" آئی۔ میں نے دیکھتے ہی اس پر جھپٹا مارا اور لے کر گھر چلا آیا۔ کتاب کھولی پڑھنا ہی شروع کیا تو پڑھتا ہی چلا گیا۔ اگرچہ خطوط کا یہ مجموعہ نامکمل ہے مگر اس سے بہت سی پر لطف معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اور جوشؔ و رضاؔ دونوں کی افتادِ طبع، ذہنی سطح محتاط و بے عیب سیرت، وضع داری و بے ریا محبت کا عینی مشاہدہ حاصل ہو جاتا ہے۔ انھیں خطوط سے پتہ چلا کہ رضاؔ پندرہ سال کی عمر میں اردو شاعری کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو گئے تھے اور چھ برس تک کمالؔ کرتارپوری شاگرد جوشؔ ملسیانی سے شاعری کے رموز و فنی نکات حاصل کرتے رہے پھر ان ہی کی سفارش پر جوشؔ ملسیانی نے رضاؔ کو براہ راست اپنا شاگرد بنا لیا۔ شباب و شعر کا یہ البیلا اُبھار ہند کی سرزمین کو نہیں بھایا اور جلد ہی ان کو رختِ سفر باندھ کر ہزاروں میل دور افریقہ کا جنگل بسانا پڑا۔ ایسے میں عام صلاحیت کے افراد فکرِ معاش کے علاوہ سب کچھ بھول بھال جاتے ہیں مگر رضاؔ نے مادی و معاشی فکر کے ساتھ ساتھ فکرِ سخن بھی جاری رکھی اور مطالعہ بھی نہ چھوڑا۔ فنِ شعر پہ بذریعہ خط و کتابت صیقل ہوتا رہا اور علمی سرمایہ کتب خانوں میں بیٹھ کر بڑھاتے رہے۔ رضاؔ کا گھرانہ تھا تو تاجر پیشہ مگر پنجاب کا، جہاں اردو فارسی کی تعلیم لازمی بھی سمجھی جاتی

بھی اور لائق فخر بھی۔ رضا پنجاب یونیورسٹی میں فارسی کا اعلیٰ ترین امتحان "منشی فاضل" دے چکے تھے اور اس تعلیم کو انھوں نے ضایع نہیں ہونے دیا بلکہ فارسی دانی کو بڑھاتے رہے۔ حتیٰ کہ کینیا میں علمی وادبی ملقے کا نقطۂ پرکار بن گئے۔

ان مکتوبات سے ہمیں دو فائدے حاصل ہوئے۔ اس میں جہاں رضا نے اپنا کلام استاد کو بہ نظر اصلاح پیش کیا ہے وہیں پر ہر خط میں استاد سے تازہ کلام کی فرمائش بھی کی ہے اور ان کے شفیق استاد نے اکثر شاگردِ رشید کی خواہش کو پورا بھی کیا ہے۔ بہت سے مقامات ایسے ملے جہاں رضا کی ژرف نگاہی تحقیقی بصیرت، کشادہ دلی اور شخصیت سے مرعوب نہ ہونے کی صفت ابھری ہوئی ہے بہر حال اس کتاب کے مطالعہ کے بعد رضا میرے لئے اجنبی نہیں رہے اور میں ان سے ملاقات کا بہانہ ڈھونڈنے لگا۔ پھر ایسا ہوا کہ میں نے مشرقی افریقہ کے ممالک پر تاثراتی سفرنامے کا آغاز کر دیا۔ کئی مضامین لکھے اور شائع ہو کر مقبول ہوئے لیکن کینیا پر مجھے مفصل لکھنا تھا۔ میں نے سوچا کہ بغیر ان سے ملے ہوئے مضمون کی تکمیل مشکل ہے چنانچہ وقت لے کر ان کے آفس پہونچا۔ دل و دماغ میں مختلف خیالات تھے۔ تصویر سے وہ کچھ تنگ ظرف قسم کے جان پڑتے تھے مگر پہلی ملاقات میں جس گرم جوشی اور حسنِ اخلاق کا مظاہرہ ان کی طرف سے ہوا اس نے مجھے شرمندہ کر دیا۔ بہت دیر تک افریقہ، نیروبی، ممباسہ کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر وہاں کی علمی وادبی صحبتوں اور اشغال کا ذکر چلا اس طرح کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے گہرا تعلق اور انس محسوس کر رہے تھے۔ پھر یہاں کی باتیں ہوئیں رضا صاحب نے میری تعریف شروع کر دی تو میں نے بات بدلنے کے لئے کہا۔ کہ آپ بھی اپنی کوئی تازہ کتاب تبصرہ کے لئے دیں تو بہت اچھا ہو۔ چنانچہ انھوں نے از راہ مہربانی نئی کتابوں کے ساتھ اپنے مدح و نعت و منقبت کا مجموعہ "اجالے" بھی مرحمت فرمایا۔ میں نے شکریہ کے ساتھ رخصت لی اور گھر آکر اپنی ملاقات کے تاثرات کو ذہن میں بٹورنے لگا۔

ہمارا خیال تھا کہ وہ دبلے پتلے مخنی قسم کے منشی صفت انسان ہوں گے جو بات

کرتے وقت گرانباری محسوس کرتے ہیں اور کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں۔ درمیانی عمر کے آدمی ہیں لہذا ٹھہر ٹھہر کے، سمجھا سمجھا کے بات کریں گے۔ اور جب سامنا ہوا تو ان میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی۔ نہ شاعرانہ اوصاف نہ محقق کی ازخود رفتگی۔ کھنک دار آواز، فوجی انداز، تڑ تڑ تڑ تڑ گفتگو، ٹیپ ٹاپ، صاف گوئی، باتوں میں مزاح وٹھیکی، تن، بدن، پیرہن، رہن سہن ہر چیز نوک و پلک سے درست۔ ایسا تو کوئی سیٹھ دیکھا نہ شاعر و ادیب۔ وہ وقت ضایع نہیں کرتے۔ پان سگریٹ کو منھ نہیں لگاتے۔ صورت سے رعب ٹپکتا ہے مگر اسی وقت تک جب تک وہ خاموش رہتے ہیں۔ حفظانِ صحت کے اصول پر پوری طرح عامل ہیں چنانچہ دس پندرہ سال پہلے کی تصویر دیکھو تو وہ آج ہی کی لگتی ہے۔

پہلی ملاقات میں انھوں نے جب میرے ذاتی حالات وطرز معاش پر گفتگو چھیڑ دی تو تھوڑی دیر کے لئے مجھے الجھن و وحشت نے آگھیرا اور کچھ صاف بات نہ کرسکا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ہر صاحب علم ملاقاتی سے یہی سوال کرتے ہیں مگر رسماً اور تکلفاً نہیں بلکہ اس مسئلے کو حل کرنے میں ہر ممکن سعی کرتے ہیں اور مدتوں سے یہ ان کی ہابی بن چکی ہے۔ ہاں اگر رضا صاحب بخیل ہیں تو اپنا کلام سنانے میں۔ اب میری ان کی کئی ملاقاتیں ہو چکی ہیں اور ساری کی ساری ادبی و علمی۔ مگر انھوں نے بھولے سے بھی اپنا کلام درمیان میں نہیں آنے دیا۔ اگرچہ وہ اس کا حق رکھتے ہیں۔ رضا صاحب کا انداز زندگی آثر لکھنوی سے کچھ ملتا جلتا ہے جب وہ شاعری کرتے تھے تو شاعری میں اپنے کو منوالیا اور اس کے بعد تنقید و تحقیق کے میدان میں اترے تو وہاں بھی اپنی حیثیت تسلیم کرالی۔ یہاں پر رضا و اثر کا تقابل نہیں منظور ہے صرف مثال دی گئی ہے۔

تحقیق کے میدان میں رضا کا طریقۂ کار ایک انفرادیت کا حامل ہے وہ کاتا اور لے دوڑی کو سخت معیوب ہی نہیں سمجھتے بلکہ حوالے کے طور پر اصل ماخذ کی تلاش ضروری خیال کرتے ہیں۔ مقدار کے لحاظ سے ان کا کام بہت ہے ہی مگر اعتبار و سند کے لحاظ سے بوجھل سے بوجھل کام پر بھاری ہے۔ عام روش سے

ہٹ کر وہ ایسے موضوع کو چنتے ہیں جس سے یا تو بے اعتنائی برتی گئی ہے یا یہ طے کر لیا گیا ہے کہ اب اس موضوع پر آگے کچھ کہنے یا لکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔ مواد کی فراہمی کے لئے انھوں نے اپنا سارا پس ماندہ سرمایہ صرف کر کے بے شمار مخطوطات اور نوادرات کا کتب خانہ بنایا ہے جسے دیکھ کر حیرت بھی ہوتی ہے اور منھ میں پانی بھی آجاتا ہے۔ غالب کے تعلق سے تو ان کا کتب خانہ دنیا بھر میں انوکھا ہے۔ جہاں پر غالب کی زندگی میں شایع شدہ دواوین کے پانچوں ایڈیشن یکجا موجود ہیں۔ موضوع کا تعین کر لینے کے بعد اور مواد کی فراہمی کے بعد وہ اس کی چھان بین بڑی احتیاط اور مستعدی سے کرتے ہیں۔ پھر اپنی تحقیقی یادداشتوں کی فائل بناتے ہیں۔ وہ اب تک اس طرح دو سو سے زائد فائلیں بنا چکے ہیں۔ ان کا انکشاف و تحقیق زیادہ تر ذاتی کتب خانے اور اس کے مخطوطات پر منحصر ہے۔ جہاں کسی غیر کی رسائی بھی نہیں ہو سکتی۔

"متعلقاتِ غالب" میں تمام کے تمام مضامین ایسے ہیں جو غالبیات میں بیش بہا اضافہ ہیں۔ جن میں غالب کے دو فارسی قطعے بھی ہیں جو قطعی رضا صاحب کی دریافت ہے۔ اگرچہ یہ کتاب "غالب صدی" کے کئی برس بعد مرتب کی گئی ہے اور اس سلسلے میں جتنی نئی باتیں دریافت کی جا سکتی تھیں وہ ختم ہو چکی تھیں اور ایک ماہر غالبیات نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ غالب کے تعلق سے ہر شے منظر عام پر آچکی ہے لیکن کالی داس گپتا رضا نے اپنی تحقیق سے یہ بتایا کہ ابھی بہت کچھ باقی ہے۔ امید ہے کہ اگر دیگر اشغال وافکار نے ان کو مہلت دی تو جلد ہی کچھ اور نایاب چیزیں اہلِ نظر کے سامنے آئیں گی۔

رضا کو ہم صاحبِ طرز نثر نگار نہیں کہتے مگر ان کو اس کا ملکہ حاصل ہے کہ موضوع کے مناسب اسلوبِ بیان اختیار کریں۔ ان کی کتاب "ہندوستانی مشرقی افریقہ میں" سراسر ایک تاریخی و تمدنی جائزہ ہے۔ مگر اس کا طرز بیان بہت سادہ و ولولہ انگیز ہے جب کہ ان کے تحقیقی مضامین کی زبان علمی اور پُر اعتماد ہوتی ہے۔ لیکن جہاں تک سند و ذمہ داری کا تعلق ہے وہ ہر جگہ بات کو تول کے، ٹھونک بجا کے کہنے کے عادی ہیں جن کا رد عموماً ممکن نہیں۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ رضا صاحب کے چار شعری مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔
وہ بہت اچھے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری ان کی شخصیت کا آئینہ ہے۔ وہ صرف ہجر و
وصال، حسن و جمال اور غم دوراں و غم جاناں پر محیط نہیں بلکہ ایک وسیع کینوس
رکھتی ہے۔ جس میں شاعر کی داخلی زندگی اور خارجی زندگی کے بے رحم اثرات کا
عکس نمایاں ہے۔ رضا کا پہلا مجموعۂ کلام "شعلۂ خاموش" ہے۔ یہ کون سا "شعلۂ خاموش" ہے؟
کوئی ایک شعلہ نہیں۔ جس نے رضا کے جذبات کو مشتعل کر دیا ہو، بلکہ یہ اس بھٹی سے
عبارت ہے جو ایک دردمند انسان کے اندر سلگتی رہتی ہے اور اسی کی گرمی و
آنچ سے پگھل پگھل کر انسانیت کے شریفانہ جذبات سنور سنور کر کے ظہور پاتے رہتے
ہیں۔ اس مجموعے میں شاعر نے خود کو کھول کر رکھ دیا ہے۔ شاعر جو زمان و مکان،
نسل و ذات کی زنجیروں سے آزاد ہوتا ہے۔ اپنے اور بیگانے میں تفریق نہیں
رکھتا۔ اس کے دردمند دل میں اپنے درد کے علاوہ ہر درد کی ٹیسیں اٹھتی رہتی
ہیں۔ وہ خوب صورتی و سچائی کا متلاشی ہے اور اس کا نغمہ خواں ہے، چاہے وہ
خوب صورتی ایک مصلح قوم میں ہو یا آزادی کے متوالوں میں۔ وہ تڑپتا ہے ہر حادثے
پر چاہے وہ آسام کا زلزلہ ہو یا معرکہ کربلا۔ ہم نے رضا جیسے شاعر کم دیکھے ہیں جو اپنے
ملک کی لکشمی بائی سے بھی اتنی عقیدت رکھتے ہوں جتنی کینیا کے جوموکنیاٹا سے۔ رضا
اگر ایک طرف ہندوستان کی کالی گھٹا کی تعریف کرتے ہیں تو ساتھ ہی افریقہ
کے جھیل نیواشا پر بھی خوب صورت نظم کہتے ہیں۔ ان کے مجموعہ ہائے کلام فلسفہ،
اخلاق، عبرت، حب الوطنی، منظر نگاری، غزلیات، قطعات کا مرقع ہار ہیں۔ داغ
اسکول سے تعلق رکھنے کے باوجود ان کا کلام صلابت، عمق اور پھیلاؤ رکھتا ہے
تنوع و رنگارنگی بھی۔ ایک بات خاص یہ ہے کہ ان کی شخصیت و شاعری میں بڑی
حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ جس کسی نے رضا کو نہیں دیکھا ہے۔ ان کے کلام کا
مطالعہ کر کے جب ان سے ملے گا تو اسے ذرا بھی اجنبیت محسوس نہیں ہو گی۔
ان کی صاف گوئی، خودداری، مشغت پسند زندگی۔ ہر قسم کے استحصال سے نفرت
دردمندی و مزاج کی ملائمت، پاکیزگی نفس، حق پسندی، انصاف طلبی کے علاوہ
ان کی عہد بہ عہد زندگی کا مرقع بھی ان کے اشعار میں موجود ہے۔ انھوں نے

جب جب جیسا محسوس کیا اپنے جذبات و محسوسات کو شعر کے سادہ و آسان پیکر میں ڈھال دیا۔

جن لوگوں کو معاش کی فکر میں اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر پردیس جانا پڑتا ہے ان کو اجنبی دیس میں پہونچ کر بڑی بڑی آزمائشوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ ایک طرف قدم قدم پر دیارِ غیر کے کانٹے تن بدن میں چبھ کر سوزش پیدا کرتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف اپنے وطن کی صبح و شام، ندی، نالے، احباب و اعزا کی یاد کی زنجیر اپنی جانب کھینچتی ہے۔ اس کشمکش سے دوچار ہونا ہی دلِ زندہ کا ثبوت ہے۔ ورنہ اگر کوئی بے حس ہے تو اس کا شمار ہی انسانوں میں نہیں۔ رضا ایک حساس و شریف دل رکھتے ہیں اس لئے ان پر اس بلا کا نزول زیادہ ہوتا ہے اور اس سے متاثر ہو کر وہ یہ شعر کہتے ہیں جو ان کی قلبی کیفیت کا آئینہ تو ہے ہی، ساتھ ہی ان کو عام انسانوں سے بھی ممتاز کرتا ہے۔

یوں مضطرب ہیں رہ کے ہم اپنے وطن سے دور
جیسے تڑپ رہے ہوں عنادل چمن سے دور

یہی تڑپ اور اضطراب جو رضا کو اپنے وطن سے دوری کے باعث تھا اور کسی پہلو چین نہ لینے دیتا تھا، پردیس میں ان کی نئی زندگی اور ترقی کا ضامن بھی ہوا۔ اور اسی نے اس کے پیروں کو اجنبی دیس میں ٹکا دیا۔ کیوں کہ وطن سے محبت کا جذبہ انسانی جذبات میں شریف ترین جذبہ ہے۔ اور جس کے اندر یہ محبت جتنی زیادہ ہوتی ہے۔ مصائب و آلام راہ اس کے لئے سایہ اور دیوار بن جاتے ہیں۔ اسی جذبہ سے عزمِ محکم، استقلال و ثباتِ قدم کی کونپلیں پھوٹتی ہیں جو نگاہ و دل کو بصیرت و پختگی عطا کرتی ہیں۔ اور زبان پر یہ حرف جاری ہوتا ہے۔

غربت میں رہ کے اور بڑھے گی وطن کی قدر
اچھا ہوا رضا جو وطن سے نکل گیا

یہاں رضا نے عام زاویۂ نظر سے انحراف کر کے ایک اونچی بات کہی ہے یہاں ؎ قطرہ جو گہر بنا عدن سے نکلا" والا جذبہ نہیں ہے۔ رضا کے لئے مسافرت کی زندگی کا سب سے بڑا ثمرہ یہ ہے کہ دور رہ کر وطن کی محبت جو زندگانی

کا عزیز وبیش بہا سرمایہ ہے۔ اس میں زیادتی ہو گئی۔

اس موضوع پر رضاؔ نے مختلف انداز میں اپنے حالات وکوائف، جذبات وواردات قلبی کو ظاہر کیا ہے۔ پردیس کی سختی اور معولی ناکامی پر انسان کا جی اچٹ جاتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ آن کی آن میں وطن پہونچ جائے۔ اور اس کرب ومصیبت کی زندگی کا خاتمہ ہو۔ رضاؔ پر شاید یہ کیفیت بار بار گذری اور کئی سخت مرحلے سامنے آئے۔ لیکن رضاؔ نے قدم پیچھے نہیں ہٹائے اور بالآخر اس کے قدم کامیابی نے ایسا چومے کہ صرف مالی نہیں سماجی مرتبہ بھی کافی بلند ہو گیا۔ اس سلسلے میں 'کلمن جارو' کو علامت بنا کر رضاؔ نے ایک شعر میں اپنی کہانی سمو دی ہے۔

گھر پلٹ جاتا بہت پہلے ہی میں کھا کے شکست
کام آئی مرے خودداری کلمنجارو

"کلمنجارو کی خودداری" کو وہی سمجھ سکتا ہے جو مشرقی افریقہ کے جغرافیہ سے واقف ہے ورنہ یہ کہ وہ ایک پہاڑ ہے۔ برف سے ڈھکی ہوئی چوٹی والے پہاڑ ہر براعظم میں ہیں مگر خودداری کا مفہوم کیا ہے؟ خودداری کی تشریح یہ ہے کہ خط استوا اور منطقہ حارہ میں واقع ہونے کے باوجود یہ پہاڑ اپنی کج کلاہی کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ رضاؔ کے اس شعر کے بعد صاحبانِ فہم کو ان کی جدوجہد، ناکامیابی و مایوسی اور بڑی بڑی دشواریوں کو حل کر کے راہ بنانے کی لمبی داستان سننے کی ضرورت نہیں ہے اور وہ اس بلیغ ترین شعر سے سب کچھ سمجھ سکتے ہیں کہ شعر کی خوبی رمز وایما ہے، برہنہ گوئی نہیں۔

رضاؔ کے مرغوب طبع موضوعات حب وطن کے بعد افلاس زدہ لوگ تاریخی شخصیتیں، بورژوا طبقہ کی گندی ذہنیت، اردو زبان، مذہب میں رواداری ہے۔ اس کے سوا رضاؔ نے فلسفہ موت وحیات کو بھی موضوع سخن بنایا ہے۔ یہ ایسا موضوع ہے جس پر آج تک سیکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور جتنے منھ اتنی باتیں ہیں۔ رضاؔ ان اقوال وآرا کا مطالعہ کرنے کے بعد کسی نظریہ پر نہیں ٹھہرتے بلکہ نظریات کا اتنا سارا اختلاف ان کی تشکیک کو قوی کر دیتا ہے اور

وہ کہتا ہے۔ ع

نہ پوچھو آدمی کی ابتدا اور انتہا کیا ہے
یہاں دانا بھی چکر میں ہے دیوانہ تو دیوانہ

شاعر کا یہی منصب ہے جو عدالتی کارروائی یا محاکمے سے پرے ہوتا ہے۔
جب ہم رضاؔ کی شخصیت و شاعری میں چند انوکھی باتیں دیکھتے ہیں تو ہمیں ان کے پس منظر میں جانا ضروری ہو جاتا ہے اور اس منبع کی تلاش ہوتی ہے جس نے انھیں ہر اچھی اور سچی شے کا مداح بنا دیا ہے اور ہر بدی وجھوٹ سے نفرت۔
ہم نے افریقہ میں بسنے والے بھارتیوں کی غالب اکثریت کو دیکھا تو یہی پایا کہ ان کا دل ہندوستان میں ہے۔ قدم اس دھرتی پر اور رقم لندن میں۔ ایسے بہت کم تھے جن کو اس تاریک براعظم کے صبح و شام، ماضی و مستقبل سے کوئی خاص لگاؤ ہو لیکن رضاؔ کا حال یہ ہے کہ وہ کینیا ٹاڈے پر، آزادیِ کینیا پر نظمیں بھی کہتے ہیں اور وہاں کے محبانِ وطن کے دکھ درد کا مرثیہ نظم کرتے ہیں —
"بے گناہ طلبہ پر لاٹھی چارج" ان کے دل کو آب آب کر دیتا ہے اسی طرح جیسے "آسام کا بھونچال" دور دیس میں بیٹھ کر انھوں نے آنسو بہائے۔ کافی تلاش و جستجو کے بعد معلوم ہوا کہ اس دلِ دردمند وحق پرستی کا اصل سوتا رضاؔ کی وہ روحانیت اور خدا پرستی ہے جو بچپن سے ان کی گھٹی میں شامل ہو گئی ہے اور تمام اعضا و جوارح، اعصاب و اوسان میں اندر اندر اس کی کرشمہ کاری ہے۔
کرم، گیان اور بھگتی پر رضاؔ کا عقیدہ بہت پختہ ہے اسی وجہ سے ان کے اندر بے خوفی، باغلی، انصاف پسندی کے ساتھ انسانیت کے وہ اعلیٰ اصول موجود ملتے ہیں جو صرف مذہب اور روحانیت کی دین ہیں۔ رضاؔ نے اپنی شاعری کو صرف دنیا اور اہل دنیا کی خدمت تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ اسے گرونانک، پیغمبر اسلام، امام حسین و حضرت علی کی تعریف و توصیف پر بھی صرف کیا ہے۔ وہ اسی آئینہ کو اپنی شخصیت کے بناؤ سنگار کے لئے مناسب خیال کرتا ہے۔

ایک بند ملاحظہ ہو۔ ع

شبیرؔ ہیں جو فرض کی عظمت سے ہیں پُر نور
عباسؔ دِلاور ہیں کہ جرأت میں، ہیں مشہور
ہیں اہلِ حرم جن کے ہیں دل یاس سے معمور
کچھ اور بہادر ہیں جو مرنے پہ ہیں مجبور
یا عابدِ بیمار ہیں دریا کے کنارے

ہم نے رضاؔ کا ایک مجموعۂ کلام "اجالے" دیکھا جو نبی وآل نبیؐ کے فضائل و مصائب پر مشتمل ہے، تو بے حد رشک آیا کیوں کہ ایسا پُر اثر، رقت خیز، عبرت ونصیحت آمیز کلام جس میں ان کے مدارج ومراتب کا پورا لحاظ رکھ کر فضائل ومحائل کو آشکار کیا گیا ہو، ہر مسلم کے بس کی بات نہیں چہ جائیکہ ایک غیر مسلم۔ لیکن ایک بات کا پتہ چلا کہ اس طرح کے اشعار کہنے کے لئے انھوں نے مراثی اور قصائد کے تمام قدیم اثاثے کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کے قصائد روایتی انداز کے تشبیب وگریز والے بھی ہیں اور براہِ راست اور بے مقدمہ اصل مقصد کی طرف رجوع ہو جانے والے بھی۔

رضاؔ کے نعتیہ و ثنائی کلام کو دیکھو اور ان کی دیگر نظمیں "بھگوان بُدھ کا تیاگ" یا "ترکِ دنیا" پڑھو تو ڈاکٹر صفدر آہؔ کے یہ جذبات پتھر کی لکیر لگتے ہیں۔

"رضاؔ ذہناً ایک سیکولر ادیب ہیں لیکن ان کا "سیکولرازم" لامذہبیت نہیں "ہمہ مذہبیت" ہے۔ ایسے انسانوں میں ایک بڑی، خوش گوار اور پُر کشش محبت ہوتی ہے، اور یہی بات رضاؔ میں بھی ہے۔ وہ ہندوستان کے ہر مذہب سے محبت کرتے ہیں۔ کیوں کہ ان کی محبوب ہندوستانی تہذیب میں انھیں مذاہب کی رُوح اور رُوح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وطن سے دور رہ کر بھی انھوں نے ہندوستان کے مذہبی خیالات سے پُر خلوص رابطہ باقی رکھا۔"

رضاؔ کہنے کو غزل کے شاعر ہیں لیکن ان کے فن اور قدرتِ کلام کا بہتر اظہار نظموں میں ہوتا ہے۔ چاہے وہ طبع زاد ہوں یا ترجمہ۔ نظموں میں وہ

رمز و ایما، استعارات و علائم سے اس خوب صورتی سے کام لیتے ہیں کہ ایک خاص فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ جسے نئی امیجری بھی کہا جا سکتا ہے۔ ذات کے کرب اور شخصیت کے ادھورے پن کا تیز احساس نئی نظموں کا طرہ امتیاز ہے جہاں زندگی ایک الاؤ ہے، ایک چتا ہے اور شاعر کی شخصیت اس آگ میں پڑی ہوئی چیخ چیخ کر شور مچاتی ہے۔ رضا کی ایک نظم "زندگی کے صحرا میں" پڑھ کر مجھے محسوس ہوا کہ رضا کسی شعری تحریک سے نہ بے خبر رہتے ہیں نہ کان بند کر کے بیٹھتے ہیں۔ مجھے تو یہ نظم پڑھ کر بے اختیار ابنِ انشار کی نظم "اپنے سائے سے" یاد آ گئی۔ چوں کہ یہ نظم مختصر ہے اس لئے اسے نقل کرتا ہوں تاکہ مجھ پر خلا میں باتیں کرنے کا الزام نہ لگ سکے۔

زندگی کے صحرا میں

آج پھر اکیلا ہی
زندگی کے صحرا میں
پھول چن رہا ہوں

دستِ بے نوائی سے
خام آرزوؤں کا
جال بُن رہا ہوں میں

بزم سے الگ پڑ کر
اپنی بے قراری کے
گیت سن رہا ہوں میں

کون ہے مرا ساتھی
کون ہے مری منزل
محض ایک رستا ہے

گھر نہ کوئی بستی ہے
صرف آرزوؤں کا
ایک شہر بستا ہے

ہندوستانی مشرقی افریقہ میں (جلد اوّل)

پہلی صدی مسیحی تک ہندو افریقہ کے تجارتی تعلقات بہت ہی مضبوط ہو چکے تھے سلسلہ صدیوں پہلے سے چلا آرہا تھا۔ مارکو پولو اور واسکوڈی گاما جب افریقہ کے ساحلوں پر ٹھہرے تو ہر جگہ ہندوستانی تاجر اور ان کے جہاز دکھائی دیئے۔

"انیسویں صدی میں سلطان زنجبار نے پورے ایسٹ افریقہ کے کسٹم کا مختار ایک ہندی تاجر کو بنا دیا۔ جس کا نام تھا جے رام شیوجی یہ شخص سلطان کے خانگی معاملات میں بھی دخیل تھا۔"

"کینیا کی لمبی ایمرجنسی اور ماؤ ماؤ کی تحریک میں ہندوستانیوں نے کھلے بندوں افریقیوں کا ساتھ دیا اور انگریزوں کے عتاب کا نشانہ بنے۔"

یہ اور ایسی ہی بہت سی حیرت و انبساط انگیز معلومات سے بھری ہوئی کتاب "ہندوستانی مشرقی افریقہ میں" میرے سامنے ہے۔ آج سے تین سال قبل جب میں مشرقی افریقہ کے ممالک پر اردو بلٹز میں مضامین لکھ رہا تھا تو مجھے گمان بھی نہ تھا کہ کوئی شخص بمبئی میں ایسا بھی موجود ہوگا جو وہاں برسوں رہ چکا ہے۔ (رہتے سہتے تو لاکھوں ہیں) پھر وہ لاکھوں میں اکیلا شاعر و محقق ہوگا اور صاحبِ نظر و بصر بھی، جب میں نے کالی داس گپتا رضا کی یہ کتاب دیکھی تو یہ عقدہ کھلا کہ اکیلا میں ہی نہیں اردو کا کوئی اور بھی صاحب قلم ہے جو اس موضوع سے گہری دلچسپی رکھتا ہے۔ اور مجھ سے کوسوں آگے ہے۔

جب مشرقی افریقہ نے آزادی پائی تو عوام نے ایشیائیوں کو اپنا بدخواہ اور سامراجیوں کا ایجنٹ جان کر بری نظر سے دیکھنا شروع کیا' ایسا ہوتا آیا ہے کوئی نئی بات نہیں' حالانکہ ہندوستانیوں ہی کے دم سے ان کی تحریکِ آزادی پنپ سکی۔ مصنف نے کتاب میں زیادہ تر اسی نکتہ پر زور دیا ہے اور تصنیف کا محرک بھی یہی غلط جذبہ ہوا ہوگا غالباً۔

کتاب بہت معلوماتی ہے۔ اندازِ بیان سادہ مگر شگفتہ ہے۔ تسلسل و روانی کے باعث دلچسپی کم نہیں ہوتی۔ اس کتاب کا دیباچہ مالک رام صاحب نے لکھا ہے۔ شروع میں تنزانیہ، کینیا، یوگنڈہ کے بارے میں جغرافیائی معلومات دی گئی ہیں۔ پھر عام ہند اور افریقہ کے تعلقات کا سرسری جائزہ ہے۔ اور آخر میں ان چند ہندوستانیوں

مطلب کو کئی اشعار میں بیان کیا ہے۔

۴۔ سہوِ کاتب بہت ہے۔ (وہ تو برحق ہے)

۵۔ فنی اسقام کا پیراگراف آخری ہے اور اس میں رضا نے بڑی مہارت کے ساتھ عروض کی خامیوں کو اجاگر کیا ہے۔ یہ حصہ مقدمہ کا حاصل ہے اور نشاط انگیز بھی۔ لیکن ان عیوب سے یہ نتیجہ نکال ڈالنا کہ یہ مرزا کی نوجوانی کی تصنیف ہے، ہم کو تو نہیں جنچا۔ طبع زاد کلام و ترجمہ کی پابندی میں ایک جیسی صورت حال تو نہیں رہ سکتی۔ پھر میں نے دیکھا کہ فارسی نثر والے حضرت۔ خدا ان کو بخشے اکثر غلط ترجمہ بھی کرتے چلے گئے ہیں۔ مگر غالب نے اشعار میں معانی کو ابھارا اور سنوارا ہے۔ آخری عمر میں آدمی یا تو یہ استغفار کرتا ہے یا عقد ثانی وثالث۔ غالب دوسرا کار ثواب تو نہیں کر سکے یہ محقق ہے۔ لہٰذا طبعاً یہی مان لیں تو کیا ہرج ہے کہ قویٰ کا اضمحلال ان کو خدا کی یاد کبھی کبھی دلا دیتا تھا اور اسی کا نتیجہ تھا 'دعائے صباح' کا یہ ترجمہ۔ اس طرح کا کام انیسؔ نے بھی کیا ہے ان کی آخر عمر کی دو مناجاتیں تو آج بھی ہمارے گھروں میں پڑھی جاتی ہیں۔

اگر یہ تصنیف نوجوانی کی ہوتی تو شاعر اسے چھپانے میں کبھی دم نہ لیتا۔ اپنے کلام میں شامل نہ کرنا اس لئے بھی ہو سکتا ہے کہ یہ پایانِ عمر میں کہا گیا جس کے قبل مجموعۂ کلام شایع ہو چکا تھا۔ دیگر یہ کہ خالص مذہبی کلام میں اتنی نوک و پلک بھی نہیں دیکھی جاتی پھر اسے ادبی کلام میں شامل بھی کم ہی لوگ کرتے ہیں۔

مرتب نے ابتدا میں 'دعائے صباح' کا جو تعارف کرایا ہے اس تعلق سے اتنا لکھنا ضروری ہے کہ دعا ضرور عربی میں ہے مگر قرآنی اسلوب؛ صرف آلِ عمران کی ایک لمبی آیت کے سوا اس میں قرآن کی کوئی آیت نہیں ہے۔ دعا کا اسلوب اس عہد کے عام ادبی اسلوب سے میل کھاتا ہے۔ جہاں سجع پر خصوصی دھیان دیا جاتا ہے۔ اسی لئے تو حضرت علیؓ کا کلام ہونے میں شک ہوا ہے۔ مگر ساتھ ہی اس میں توحید و صفاتِ الٰہیہ اور رموزِ فطرت کا ایسا باریک بیان ہے جسے علیؑ کے سوا نہ کسی نے بیان کیا نہ کر سکتا ہے۔ اس لئے 'دعائے صباح' پر کلام علی ہونے کا گمان قوی ہو جاتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

غالب کی علیؑ بھگتی شہرۂ آفاق ہو چکی ہے۔ وہ تو خود کو اس باب میں غالی کہلانا زیادہ پسند کرتے ہیں ان کے اردو فارسی اشعار خطوط و نثر سب میں ان کی بصیرت بکھری اور بٹی ہوئی ملتی ہے لہذا دعائے صباح کو ترجمہ کے لئے چننا موصوف نے اپنے تئیں موجب برکت وسعادت گنا ہو گا۔ یہ دعا دیگر دعاؤں سے مختصر ہے۔ شاید اس لئے اسے ترجیح دی ہو۔ اس عہد میں اس کا چرچا بہت رہا ہو گا۔ اب تو اتنا نہیں جتنا مشلول کا ہے۔ مثنوی کی پانچویں بحر رمل مقصور میں غالب نے اس دعا کو فارسی نظم میں ڈھالا اور ۱۲۴ اشعر دوں میں کام بن گیا۔ مدتوں بعد ان کے تازہ شیعہ ایک عزیز عباس بیگ نے نولکشور صاحب سے فرمائش کر کے اسے چھپوایا۔ پہلا ایڈیشن غالب کی حیات میں شایع ہو چکا تھا لیکن خبر نہیں کہ مرزا صاحب نے اسے دیکھا بھی کہ نہیں اور اگر دیکھا تو کچھ گل افشاں بھی ہوئے یا مسکرا کے رہ گئے۔ یہی اولین نسخہ بوسیدہ و پارہ پارہ قطع منازل کرتا ہوا کالی داس گپتا رضا کے سامنے آیا۔ آپ نے اس پر ایک ہزار روپے (آج کے کئی ہزار) کی آرتی آتار کے اپنے کتب خانے میں جگہ دی۔ پھر ہو بہو نقل بڑی صفائی درستی سے کرائی۔ اسے اچھے کاغذ پر چھپوایا۔ جلد بندھوائی دیدہ زیب گرد پوش لگا کے اپنے پُر مغز مقدمہ کے ساتھ بازار علم وادب کے حوالے کر دیا جو یقیناً غالب وحضرت علیؑ دونوں سے عقیدت کا ثمرہ ہے۔ پچیس صفحات کی کتاب پر رضا صاحب نے بیس صفحے کا بیش قیمت مقدمہ لکھ کر واقعتاً اسے شے دگر بنا دیا ہے۔ ان کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ سو برس کے اندر یہ ترجمہ شمالی ہند میں کم از کم آٹھ بار چھپا۔ کبھی کتابی صورت میں کبھی کسی مقالہ کا جزو بن کر۔

۲۔ پانچویں اشاعت ۱۹۴۷ء از مولانا آغا مہدی لکھنوی اور چھٹی اشاعت مشمولہ نظامی جنتری لکھنؤ ۱۹۵۰ء ان سب میں عمدہ ہے اول الذکر میں "دعائے صباح" کے تاریخی وسماجی پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے میں انگریزی ترجمہ بھی لگایا گیا ہے۔ دونوں اشاعتوں میں ترجمہ اردو بھی ہے۔ شرح بھی ۱۹۵۰ء والی اشاعت میں ترجمہ اردو منثور ومنظوم دونوں ہے۔

۳۔ دعا عربی نسخ میں ہے۔ متن عربی کے نیچے پہلے فارسی نثر میں تحت اللفظی ترجمہ ہے پھر غالب بولتے ہیں لیکن اپنی زبان سے غالب نے وضاحت کے لئے کہیں کہیں ایک

(د) استاد نے کہا کہ سیم و زر سے تولے گئے زبان کے خلاف ہے۔ سیم و زر میں تولے گئے صحیح ہے اور ثبوت کے لئے بہت سے اشعار لکھ دیئے (رضا نے حاشیے میں چار شعر ایسے لکھے ہیں جس میں "سے" آیا ہے۔ مگر یہ تقابل و توازن کے لئے ہے۔

اس کے علاوہ اس زمانے کی ادبی محفلوں، اردو پنجابی کا تنازعہ، معاصرین کا انتقال بہت سے دلچسپ و مفید تذکرے ان خطوط میں ہیں۔ "تحریر" دہلی کے جوش نمبر۔ نوح ناروی کی طرف سے ابو الفصاحت کی سند گورنمنٹ سے وظیفہ و خطاب، ابھینندن گرنتھ وغیرہ کا ذکر ہے۔ افسوس کہ تقریباً سو خطوط میں سے صرف ۴۸ ہی شایع ہو سکے

دعائے صباح (ترجمہ منظوم از غالب)

عظیم شخصیتیں نہ کسی قوم کی ملکیت ہوتی ہیں نہ تحقیق کسی کنبہ کی میراث، اس کا حالیہ ثبوت حضرت علیؓ کی دعائے صباح با ترجمہ غالب کا وہ قدیم ترین نسخہ ہے جسے اس برس کالی داس گپتا رضا نے ایک مفید و بسیط مقدمہ کے ساتھ نیا پیراہن بخشا ہے۔

رضا صاحب اردو کے مخلص خادم ہیں۔ بڑے خوش گو، کامل الفن شاعر ہیں اور جوش ملسیانی کے شاگرد رشید اس لئے عروض، معانی بیان و لغت سبھی پر ان کی نظر ہے ان کی کتاب "متعلقات غالب" انھیں تحقیق کا سپاہی بھی ثابت کر چکی ہے۔ ان کا نام اب سند و اعتبار کا درجہ رکھتا ہے۔

نہج البلاغہ کے علاوہ حضرت علیؓ سے منسوب کئی دعائیں اور مناجاتیں ہیں جس میں وہی اعجاز کلامی موجود ہے سلاست، زور بیان اور معنویت یا تہہ داری کے ساتھ بلاغت بیان جس سے آپ کا اسلوب آنکا جاتا ہے۔ دعائے کمیل اور دعائے مشلول کو ان میں فوقیت حاصل ہے۔ ان کے تراجم و شرحیں کئی زبانوں میں منثور و منظوم ہوتی رہی ہیں۔ لیکن دعائے صباح کا پایہ بہ لحاظ استناد بہت قوی نہیں ہے اس میں وہ اسلوب بھی خال خال دکھتا ہے جو علوی اسلوب مانا گیا ہے مگر علامہ مجلسی دوم اور صاحب مصباح سید باقی نے اسے مولا علیؑ سے منسوب کیا ہے۔ چوں کہ یہ دونوں حضرات معتبر و محترم مانے جاتے ہیں اس لئے اس دعا کا چلن عام ہوا۔ اور فارسی میں اس کی شرحیں بھی لکھی گئیں۔

غالب کی علیؑ بھگتی شہرۂ آفاق ہو چکی ہے۔ وہ تو خود کو اس باب میں غالی کہلانا زیادہ پسند کرتے ہیں ان کے اردو فارسی اشعار خطوط و نثر سب میں ان کی بصریت بکھری اور بٹی ہوئی ملتی ہے لہذا دعائے صباح کو ترجمہ کے لئے چننا موصوف نے اپنے تئیں موجب برکت و سعادت گنا ہو گا۔ یہ دعا دیگر دعاؤں سے مختصر ہے۔ شاید اس لئے اسے ترجیح دی ہو۔ اس عہد میں اس کا چرچا بہت رہا ہو گا۔ اب تو اتنا نہیں جتنا مشلول کا ہے۔ مثنوی کی پانچویں بحر رمل مقصور میں غالب نے اس دعا کو فارسی نظم میں ڈھالا اور ۱۲۴ اشعر وں میں کام بن گیا۔ مدتوں بعد ان کے تازہ شیعہ ایک عزیز عباس بیگ نے نولکشور صاحب سے فرمائش کر کے اسے چھپوایا۔ پہلا ایڈیشن غالب کی حیات میں شایع ہو چکا تھا لیکن خبر نہیں کہ مرزا صاحب نے اسے دیکھا بھی کہ نہیں اور اگر دیکھا تو کچھ گل افشاں بھی ہوئے یا مسکرا کے رہ گئے۔ یہی اولین نسخہ بوسیدہ و پارہ پارہ قطع منازل کرتا ہوا کالی داس گپتا رضا کے سامنے آیا۔ آپ نے اس پر ایک ہزار روپے (آج کے کئی ہزار) کی آرتی آتار کے اپنے کتب خانے میں جگہ دی۔ پھر ہو بہو نقل بڑی صفائی درستی سے کرائی۔ اسے اچھے کاغذ پر چھپوایا۔ جلد بندھوائی دیدہ زیب گرد پوش لگا کے اپنے پُر مغز مقدمہ کے ساتھ بازار علم و ادب کے حوالے کر دیا۔ جو یقیناً غالب و حضرت علیؓ دونوں سے عقیدت کا ثمرہ ہے۔ پچیس صفحات کی کتاب پر رضا صاحب نے بیس صفحے کا بیش قیمت مقدمہ لکھ کر واقعتاً اسے شئے دگر بنا دیا ہے۔ ان کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ سو برس کے اندر یہ ترجمہ شمالی ہند میں کم از کم آٹھ بار چھپا۔ کبھی کتابی صورت میں کبھی کسی مقالہ کا جزو بن کر۔

۲۔ پانچویں اشاعت ۱۹۴۸ء از مولانا آغا مہدی لکھنوی اور چھٹی اشاعت مشمولہ نظامی جنتری لکھنؤ ۱۹۵۶ء ان سب میں عمدہ ہے اول الذکر میں "دعائے صباح" کے تاریخی و سماجی پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے میں انگریزی ترجمہ بھی لگایا گیا ہے۔ دونوں اشاعتوں میں ترجمہ اردو بھی ہے۔ شرح بھی ۱۹۵۶ء والی اشاعت میں ترجمہ اردو منثور و منظوم دونوں ہے۔

۳۔ دعا عربی نسخے میں ہے۔ متن عربی کے نیچے پہلے فارسی نثر میں تحت اللفظی ترجمہ ہے پھر غالب بولتے ہیں لیکن اپنی زبان سے غالب نے وضاحت کے لئے کہیں کہیں ایک

(د) استاد نے کہا کہ سیم و زر سے تولے گئے زبان کے خلاف ہے۔ سیم و زر میں تولے گئے صحیح ہے اور ثبوت کے لیے بہت سے اشعار لکھ دیئے (رضا نے حاشیے میں چار شعر ایسے لکھے ہیں جس میں "سے" آیا ہے۔ مگر یہ تقابل و توازن کے لئے ہے۔

اس کے علاوہ اس زمانے کی ادبی محفلوں، اردو پنجابی کا تنازعہ، معاصرین کا انتقال بہت سے دلچسپ و مفید تذکرے ان خطوط میں ہیں۔ "تحریر" دہلی کے جوش نمبر۔ نوح ناروی کی طرف سے ابو الفصاحت کی سند گورنمنٹ سے وظیفہ و خطاب، ابھینندن گرنتھ وغیرہ کا ذکر ہے۔ افسوس کہ تقریباً ۳۰۰ خطوط میں سے صرف ۲۰۰ ہی شایع ہو سکے

دعائے صباح (ترجمہ منظوم از غالبؔ)

عظیم شخصیتیں نہ کسی قوم کی ملکیت ہوتی ہیں نہ تحقیق کسی کنبہ کی میراث، اس کا حالیہ ثبوت حضرت علیؑ کی دعائے صباح با ترجمہ غالبؔ کا وہ قدیم ترین نسخہ ہے جسے اس برس کالی داس گپتا رضا نے ایک مفید و بسیط مقدمہ کے ساتھ نیا پیراہن بخشا ہے۔

رضا صاحب اردو کے مخلص خادم ہیں۔ بڑے خوش گو، کامل الفن شاعر ہیں اور جوش ملسیانی کے شاگرد رشید اس لیے عروض، معانی بیان و لغت سبھی پر ان کی نظر ہے ان کی کتاب "متعلقات غالبؔ" انھیں تحقیق کا سپاہی بھی ثابت کر چکی ہے۔ ان کا نام اب سند و اعتبار کا درجہ رکھتا ہے۔

نہج البلاغہ کے علاوہ حضرت علیؓ سے منسوب کئی دعائیں اور مناجاتیں ہیں جس میں وہی اعجاز کلامی موجود ہے سلاست، زور بیان اور معنویت یا تہہ داری کے ساتھ بلاغت بیان جس سے آپ کا اسلوب آنکا جاتا ہے۔ دعائے کمیل اور دعائے مشلول کو ان میں فوقیت حاصل ہے۔ ان کے تراجم و شرحیں کئی زبانوں میں منثور و منظوم ہوتی رہی ہیں۔ لیکن دعائے صباح کا پایہ بہ لحاظ استناد بہت قوی نہیں ہے اس میں وہ اسلوب بھی خال خال دمکتا ہے جو علوی اسلوب مانا گیا ہے مگر علامہ مجلسی د دم اور صاحب مصباح سید باقی نے اسے مولا علیؑ سے منسوب کیا ہے۔ چوں کہ یہ دونوں حضرات معتبر و محترم مانے جاتے ہیں اس لئے اس دعا کا چلن عام ہوا۔ اور فارسی میں اس کی شرحیں بھی لکھی گئیں۔

پہلی و آخری فرمائش یہی ہوتی تھی۔ اس طرح ان خطوط میں جوش کا بہترین غیر مطبوعہ کلام کافی مقدار میں موجود ہے۔

(۳) فرمایا کہ یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ پنجابی صرف وہ ہے جو گورمکھی ہی میں لکھی جائے اردو ہی میں یونیورسٹی پنجابی کے امتحان بھی لیتی رہی ہے۔

(۴) شعر پر حتی امکان بہت کم اصلاح دیتے تھے زیادہ کانٹ چھانٹ کر کے استادی کی نمائش ان کا شعار نہ تھا۔

(۵) فرمایا کہ برائے مہربانی غلط ہے براہ مہربانی لکھنا چاہیئے۔

(۶) "مت" باالاتفاق متروک ہے۔ فصحائے متاخرین استعمال نہیں کرتے۔

(۷) "چاہت" وصلت، رنگت میں تے زائد و قابل ترک ہے۔ چاہت میں تو بالکل قبیح ہے۔ کیوں کہ چاہ ہندی لغت ہے اس کے ساتھ تے بہ قاعدۂ فارسی نہیں آسکتی زائد کا تو سوال الگ رہا، صرف چاہ کا مفہوم وہی ہے۔

(۸) مرزا اصل میں امیر زادہ کا مخفف ہے۔ مرزا مغلوں کے لیے کثیر الاستعمال ہے مرزا کی جگہ میرزا بھی بولتے ہیں۔

(۹) "فضا" ف کے زبر سے ہے۔ سند لغات کے سوا اور نہیں ہو سکتی۔

(۱۰) کئی مقامات پر رضا صاحب کی ژرف نگاہی، دقت نظر، حرف گیری، کرید و تجسّس کی عادت کا بھی سراغ ملتا ہے وہ استاد سے مرعوب نہیں ہوتے ان پر بھی دبے لفظوں میں اعتراض کر دیتے ہیں لیکن جواب پا کر مطمئن ہو جاتے ہیں کٹ حجتی نہیں کرتے۔

مثلاً (الف) رضا نے کہا کہ "مجھ کو" بدلے "مجھے" ہونا چاہیئے۔ جوش صاحب نے بیسوں اشعار کا حوالہ دے کر بتایا کہ دونوں درست ہیں۔

(ب) گھٹاؤں کو نور پیکر کہنا کہاں تک درست ہے؟ جواب میں اساتذہ کے اشعار نقل کر دیئے گئے۔

(ج) رضا نے لکھا کہ مبارک باد صحیح ہے مبارکبادی نہیں تو جوش نے داغ کا یہ شعر لکھ کر بھیجا۔

ہم تجھے دیتے ہیں نوشاہ مبارکبادی
کرے مقبول یہ اللہ مبارکبادی

تحقیق کے میدان میں بھی اپنی جگہ بنا چکے ہیں۔ اور وہ بھی پیادہ کی نہیں بلکہ شہسوار کی۔ ابھی جو نوادرات ان کی فائلوں میں محفوظ ہیں یا مسودہ کی شکل میں ہیں وہ جب زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر سامنے آئیں گے تو میری بات کا وزن معلوم ہوگا۔ اب انھوں نے شعر گوئی کم کردی ہے مگر پھر بھی تحقیق میں احساسِ تناسب و شستگی کا جوہر لئے ہوئے وہ اندر سے برابر جھلکتی ہے۔

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ ہم "انقلاب"، بمبئی میں نئی کتابوں پر تبصرے کیا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ کئی برس تک جاری رہا۔ ان تبصروں میں کئی کتابیں رضا صاحب کی (خیر سے رضا صاحب اٹھارہ کتابوں کے مصنف ہیں) بھی تھیں۔ چند تبصروں سے (جن کی نقلیں محفوظ رہ گئی رہیں) اقتباس یہاں دیے جا رہے ہیں جن سے کتابوں کے معیار کا کچھ اندازہ کیا جا سکے گا۔ تمام تبصرے اپنے اپنے وقت پر چھپ چکے ہیں۔ اس لئے کسی میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔

مکتوباتِ جوشؔ ملسیانی بنام رضا

مکتوباتِ جوشؔ ملسیانی بنام رضا کی اہمیت صرف اسی لئے نہیں کہ یہ ایک استادِ سخن کے مکتوب ہیں بلکہ اس میں جوشؔ و رضا دونوں کی رفتارِ طبع، علم و ذہن، خوب سے خوب تر کی جستجو، محتاط و بے عیب سیرت وضع داری و بے ریا محبت کی جھلکیاں ہیں۔ اسلوبِ نگارش حد درجہ سادہ و رواں ہے جیسے کاروباری یا رسمی خطوط ہوتے ہیں کہیں سے لگی لپٹی نہیں ہے لیکن یہ خطوط ایک ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیوں کہ اس میں بہت سے فنی و علمی نکات بکھرے پڑے ہیں۔ جوشؔ ملسیانی کی فنِ عروض و زبان پر غیر معمولی دسترس ہی کا نہیں بے پناہ حافظے اور انکساری کا مرقع ان کے یہ خطوط ہیں۔ ہم نے اسے پڑھنا شروع کیا تو پڑھتے ہی چلے گئے۔ درمیان میں کہیں رکے ہی نہیں اور بڑا لطف آیا، بہت سی باتیں معلوم ہوئیں جن میں سے چند آپ کو بھی سناتا ہوں۔

(۱) جوشؔ ملسیانی خط و کتابت میں بہت نستعلیق تھے۔ ضعف و پیری کے باوجود ہر ایک خط کا تشفی بخش جواب خود لکھتے تھے۔

(۲) ہر دوسرے، تیسرے خط میں ایک تازہ غزل رقم کرتے تھے۔ کیوں کہ رضا کی

دیکھیے زمانہ اب
اور کس کسوٹی پر
بے کسی کو کستا ہے

رضا کی شاعری پر بہت سے اہلِ نظر و نقاد اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں اور اجمالی و تفصیلی تبصرے بھی شایع ہو چکے ہیں لیکن رضاؔ کو سمجھنے کے لیے جسٹس جانن سنگھ کا مبسوط مقدمہ بہت کار آمد اور قیمتی ہے جو انھوں نے رضاؔ کے پہلے مجموعۂ کلام "شعلۂ خاموش" پر لکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے رنگا رنگ کلام کا وہی شخص کماحقہ تجزیہ کر سکتا ہے۔ جو مشرق و مغرب دونوں دبستان دانش و ادب کا طالب علم رہا ہو۔ رضاؔ کے کلام میں جگہ جگہ فلسفیانہ خیالات ملتے ہیں۔ ان کی غزل بھی ہست و نیست، زندگی و موت، فنا و بقا، تدبیر و تقدیر، حقیقت و مجاز کے فلسفیانہ رموز و نکات کو اپنے دامن میں لیے نظر آتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ زبان کی سلاست و پاکیزگی اور فنی پختگی بھی ہر جگہ عیاں ہے۔ محبت و عشق کا موضوع بھی ان کے یہاں ایک ابدی صداقت کی صورت میں ہے۔ جس کو غم کی دھونکتی شعلہ ور کرتی رہتی ہے۔ رضا کا غم مایوسی اور قنوطیت کے بدلے بھرپور توانائی و رجائیت بخش ہے۔ حسن کا تصور بھی ان کے یہاں ایک قدرتی روشنی بن کے نمودار ہوتا ہے۔ جس کے آگے ہر شے ماند اور پھیکی پڑ جاتی ہے۔ رضاؔ کی غزلوں کی زمین بہت شگفتہ ہے اور بندش کی چستی اس کا طرۂ امتیاز۔

انھوں نے غزلیات میں بہت سے تجربے کیے ہیں اور بدلتے ہوئے حالات کے تحت اس میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہی ہیں۔ یہ کہنا غلط نہیں کہ اگر وہ اردو کے ماحول میں رہے ہوتے اور یہاں کے تازہ بہ تازہ رجحانات کے ساتھ ان کی شاعری آگے بڑھی ہوتی تو وہ اس وقت ملک کے مقبول شعرا میں ہوتے۔ لیکن کم سے کم مدت میں جس قدر متنوع کلام ان کا شایع ہوا ہے اس لحاظ سے وہ اُردو کے منفرد شاعروں میں ضرور گنے جا سکتے ہیں۔ مگر اس کا کیا کیجیے کہ انھیں مشہور ہونے کا شوق ہی نہیں۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ وہ شعر گوئی کے فن میں کامل ہیں۔ اور صلاحیت شعری کے اعتبار سے وہ شعر کی وادی کو چھوڑ کر

کا تفصیلی تذکرہ ہے جنہوں نے ایسٹ افریقہ کو مادی سیاسی و ثقافتی اور روحانی دولت دی اور خود کو خدمت خلق کے لئے وقف کر دیا۔ اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو ملک کی شکل ہی کچھ اور ہوتی۔

میرا خیال یہ ہے کہ مشرقی افریقہ میں سومالیہ کا ذکر بھی آنا چاہیئے تھا۔ کتاب زیادہ تر ممباسہ و زنجبار کے گرد گھومتی ہے۔ یوگنڈہ تو ہے ہی نہیں جیسے اس میں۔

زنجبار میں زیادہ ترقی سید برغاش کے بعد ہوئی۔ اس لئے ابن ہارب و جمشید کا نام بھی ضروری آنا تھا۔ کتاب آسمانی رنگ کے دبیز گرد پوش و مضبوط جلد سے ڈھکی ہوئی واضح خط میں چھپی ہوئی ہے۔

متعلقات غالب

"رضا صاحب کسی درسگاہ یا اردو ادارے سے متعلق نہیں آپ اردو کی روٹی نہیں کھاتے۔ محض شوق کی خاطر آپ کو اردو سے لگاؤ ہے اور اسے آپ نے اوڑھنا بچھونا بنایا ہوا ہے۔ تجارت کی شوریدگیوں اور خاطر آشوبیوں کے باوجود آپ اتنا تخلیقی اور تحقیقی کام کر لیتے ہیں کہ اس سے ہم طفیلیان اردو کو شرمسار ہونا چاہیئے۔"

"متعلقات غالب" پر ڈاکٹر گیان چند جین کا تعارف (جس کا آخری پیراگراف اوپر نقل کیا گیا ہے) پڑھ کر ہی مطالعہ کا آغاز کرنا چاہیئے۔ جس میں نہایت اختصار کے ساتھ تصنیف و مصنف کے محاسن کو جامع انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً

"افریقہ میں رضا محض شاعر تھے۔ ہندوستان آنے کے بعد آپ کا ادبی محقق کا روپ سامنے آیا ہے۔ غالب کے علاوہ بھی آپ کے تحقیقی مضامین کی تعداد اتنی ہے کہ اوسط حجم کا مجموعہ تیار ہو سکتا ہے۔"

ایک نادر کتب خانہ:۔ رضا صاحب کی دو کتابیں "دعائے صباح ترجمہ غالب" اور "ہندوستانی مشرقی افریقہ میں" صاحبان فکر و نظر سے خاصی داد پا چکے ہیں۔ اور حکومت سے انعام بھی۔ ان تصانیف کے بعد "متعلقات غالب" کا گہرا مطالعہ کرو تو کھلتا ہے کہ رضا صرف خوش کلام و کامل فن شاعر ہی نہیں تاریخ و تحقیق کے میدان میں بھی پایۂ اعتبار و سند رکھتے ہیں۔ کتاب میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے غالب سے متعلق چند

معرکتہ الآرا مضامین ہیں اور کچھ اہم و نادر انکشافات رضا صاحب نے ایک عمر کی گاڑھی کمائی کتابوں کے جمع کرنے میں صرف کر دی ہے۔ ہزاروں کمیاب کتابوں کے علاوہ کئی سو نادر مخطوطات ان کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہیں۔ غالبیات پر ان کے پاس تقریباً ایک ہزار کتابیں ہیں۔ اور غالب کی زندگی میں شایع شدہ دیوان کے پانچوں ایڈیشن بجا دنیا بھر میں صرف تنہا رضا کے پاس ہیں۔

صرف محققین کے لئے؛ رضا صاحب کی تحقیق عام روش سے کچھ ہٹ کے ہوتی ہے وہ مواد کی فراہمی اور چھان بین کر کے تحقیقی یادداشتوں کی فائل بناتے ہیں۔ اب تک ڈیڑھ سو سے زائد فائلیں تیار کر چکے ہیں ذاتی کتب خانے کے مسودات، نوادرات کی چھان بین، تشریح و توضیح پر زیادہ اعتماد و توجہ کرتے ہیں۔ زیر تبصرہ تصنیف میں یہ تمام خصوصیات موجود ہیں۔ کمیاب موضوع پر معلومات کا ڈھیر دیکھنا ہو تو "ذکا شاگرد غالب" کا طویل مقالہ ملاحظہ کیجئے۔ تنقیح و تجزیہ، تاریخ سے نظری لگاؤ اور اس میں درک خاص کے ساتھ اس میں حسنِ انتخاب کا جوہر بھی عیاں ہے۔ "غالب بنام سیاح و میر غلام بابا خان" بھی انکشافاتِ نو رکھتا ہے۔ غالب کے دو غیر مطبوعہ قطعات تاریخ غالبیات میں نیا اور خاص اضافہ ہے۔ دعائے صباح کا پہلا ایڈیشن بھی کم گراں نہیں ہے۔ دعائے صباح کے ناشر مرزا عباس بیگ خواہر زادہ غالب کی مفصل و عجیب سرگزشت بڑی قیمتی شے ہے جس میں مسرت، حیرت و بصیرت کا کافی سامان ہے۔ اس لئے ہمیں گیان چند کی یہ رائے تسلیم نہیں کہ "یہ (مقالے) صرف محققین غالب کے درخور اعتنا ہو سکتے ہیں" مرزا عباس بیگ کے عمر بڑکار جناب افضل بیگ اور معاصر تعلقدار مان سنگھ قائم جنگ کا کھٹا میٹھا تذکرہ بھی اس کی نفی کرتا ہے۔ میرے خیال میں اس مجموعے میں "غزل قدسی اور تضمین غالب" سے زیادہ مضبوط و وزنی مقالہ دوسرا نہیں ہے۔ اس پر تبصرہ آگے آئے گا۔ یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ رضا صاحب دودھ کا دودھ پانی کا پانی کرنے میں پوری دیانت داری سے اور طویل غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔

چوری اور سرقہ توام ہیں۔ دولت کے لئے چوری اور شہرت کے لئے سرقہ تمدن انسان کے ساتھ ساتھ سایہ کی طرح چل رہا ہے۔ چنانچہ معاصرین ہوں کہ متقدمین و متاخرین ہر صاحب کرامت حسب توفیق اس کار خیر میں حصہ بقدر جثہ لیتا رہا ہے۔ بحمد اللہ آج بھی اس

سنّت پر ہم ستّارِ عیوب کے بھروسے عامل ہیں کبھی کبھی یہ پردہ چاک بھی ہو جاتا ہے اگرچہ شاذ و نادر ہی لیکن اس میں بھی ایسی کوئی مصلحت ہوگی۔ "غزلِ قدسی اور تضمین غالب" پڑھیے تو آپ کی ملاقات "برعکس نہند نام زنگی کافور" قاضی عمر ساکن دہلی سے ہوگی۔ ۱۸۵۶ء میں اس "دُزدِ دلاور" نے محمد حسین تحسین کی شب و روز کی محنت بنام "ثمن مدحِ نبی" کو اڑاکر "حدیثِ قدسی" کا لیبل لگایا اور اپنا مال بنالیا۔ بعد میں ایک اور اچکے حاجی شمشیر علی بر آمد ہوئے۔ انھوں نے قاضی صاحب کے بھی کان کتر لیے۔ اب جو غزل قدسی اور اس پر تضمین کی بات آتی ہے۔ تو یا تو قاضی صاحب کا نام آتا ہے ورنہ حاجی جی کا۔ آج تک اصلی مالک کا اتا پتہ بھی کسی کو معلوم نہ تھا۔ رضا نے اس ساری شعبدہ بازی کا پول کھول دیا ہے۔ اور استناد و استشہاد کے ساتھ مال کو اس کے حقیقی مالک سے منسوب کرکے اس ذیل میں پیدا شدہ کئی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے۔ ایک معاصر اہلِ قلم تو یہاں تک کہہ گئے ہیں۔ کہ ؎

مرحبا سید مکی مدنی العربی
دل و جان باد فدایت کہ عجب خوش لقبی

والی غزل کو محمد جان قدسی مشہدی کے متداول دیوان میں نہ پاکر اسے کسی قدسی دہلوی سے منسوب کر ڈالا۔ رضا صاحب نے تمام شکوکِ دلائل و ثبوت سے دور کیا ہے۔ محمد جان قدسی مشہدی:۔ ہم کہتے ہیں کہ ایسی شاعری کوئی دہلوی کرہی نہیں سکتا۔ (امیر خسرو دہلوی کو مستثنیٰ کرکے) جناب والا! قدسی مشہدی تو ایسا باکمال ذہنوں پر چڑھا ہوا شاعر تھا کہ ہمارے اساتذۂ قدیم اس کے اشعار کا بلا تکلف اردو میں ترجمہ بھی کر ڈالتے تھے۔ شعر الہند میں تحریر ہے کہ ایک بار حضرت سودا علیہ الرحمہ نے یہی چمتکار دکھایا تو ایک معاصر سے رہا نہ گیا اور فی البدیہہ منظوم تعریض یوں فرمائی۔

شعر سودا حدیث قدسی ہے
لکھ رکھیں چاہیئے فلک پہ ملک

یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ مشہور و معروف چیزوں کو لوگ کبھی کبھی دوسرے کے نام سے جانے یا انجانے طور پر منسوب کر دیا کرتے ہیں اور ان کو کوئی کچھ نہیں کہتا۔ حال میں احقر نے ایک نامور عالم و محقق کی غیر مطبوعہ کتاب میں بلغ العلیٰ بکمالہ" والا قطعہ سعدی

سے منسوب پایا۔ حالانکہ امام شافعی اس کے متفقہ طور پر مصنف ہیں۔ ان صاحب نے میرے تحر کو مٹانے کے لئے ایک اور صاحب کا حوالہ دیا اور بات آئی گئی ہو گئی۔

غالبؔ تضمین کو گناہ کبیرہ گردانتے تھے اس معروضے کو زندہ شہادتوں سے رضانے باطل کر کے پورا خمسۂ غالبؔ تضمین قدسی کو صحیح صحیح نقل کر دیا ہے۔

غالب سے متعلق بلاشبہ یہ کتاب لائق قدر ہے اس میں قلمی دیوان ذکا تلمیذ غالب کا انتخاب بھی ہے۔ جو مواد اور محنت کے لحاظ سے مستقل طور پر ایک کام ہے۔ اس معیاری کتاب کی پذیرائی کتب خانے، علمی ادارے ارباب ذوق وتحقیق کریں گے ضرور بالضرور

چکبست اور باقیاتِ چکبست

چکبست اردو کے ان خوش نصیب شعرا میں ہیں جن کی حیثیت رومانوی ہے۔ ان کی شاعری وشخصیت میں ایک خاص لذت وکشش ہے۔ اور نثری کارنامے تاریخی اہمیت کے حامل۔

چکبستؔ نے جس زمانے میں آنکھ کھولی اس زمانے میں ادب وسیاست دونوں میدانوں میں نئے نئے خیالات کی رو بہہ رہی تھی۔ حالؔی کی اصلاحی تحریک ردوقبول کے عالم میں تھی۔ کانگریس میں نرم وگرم دل بن چکے تھے۔ مغربی علوم وفنون کا اثر ہر شعبۂ زندگی پر پڑ رہا تھا اور ملی شاعری اپنا روپ سنوارنے لگی تھی۔ چکبستؔ نے کھلی آنکھوں اور بیدار دماغ سے ہر ایک تحریک کا مطالعہ کیا اور اس میں حصہ لینا شروع کیا اور بہت جلد اپنا ایک مستقل مقام بنا لیا۔

"معرکہ چکبستؔ وشررؔ" اردو کے ادبی معرکوں میں سب سے زیادہ شہرت رکھتا ہے۔ اور آج بھی دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ شررؔ کا قلم جانبدار، جارحانہ اور غلو میں ڈوبا رہتا تھا۔ ایک بار انھوں نے حسب عادت مثنوی گلزار نسیم اور اس کے مصنف پر جا وبیجا اعتراضات کی بھرمار کر دی تو چکبستؔ سے رہا نہ گیا اور وہ میدان میں آگئے لیکن گرما گرمی کے باوجود علمی معیار اور توازن کو قائم رکھا۔

چکبستؔ سیاسی اعتبار سے اعتدال پسند گروہ سے وابستہ تھے اور ان کی وکالت میں نثر ونظم کی طاقت صرف کرتے تھے لیکن جو حسن وروانی ان کی نظموں میں ہے، نثر

میں نہیں ہے۔

"چکبست و باقیات چکبست" کی اشاعت اس کا ثبوت ہے کہ اس شاعر کو ہم بھلا نہیں سکتے۔ اس کی شخصیت و کارنامے بار بار یاد کیے جاتے رہیں گے۔ چند سال پہلے ڈاکٹر افضال احمد ان کی حیات و ادبی کارنامے اور خدمات پر ایک کتاب لکھ چکے ہیں اب کالی داس گپتا رضا نے اپنی دقتِ نظری سے اس پر اضافہ کیا ہے اور چکبست کی ادبی خدمات کے ان گوشوں کو سامنے لائے ہیں جو عام نظروں سے اوجھل تھے۔

کتاب کا پہلا حصہ حیات چکبست سے متعلق ہے لیکن اس میں بھی تلاش و تحقیق سے کام لے کر کئی نئے پہلو ابھارے گئے ہیں۔ چکبست کے بارے میں ان کے اہم معاصرین کی کیا رائے تھی ساتھ ہی یہ کہ چند نقادوں نے ان کے ساتھ کیسی بے انصافی سے کام لیا ہے۔ غرض نوے صفحات کے اندر چکبست کی شخصیت، اخلاق، طرز زندگی اور ان پر آئی ہوئی بہت سی واردات کو تحقیقی انداز میں جمع کر دیا گیا ہے۔

حصہ دوم باقیات چکبست کا بیشتر حصہ رسالہ "صبح امید" لکھنؤ کے چیدہ مضامین پر مشتمل ہے۔ یہ رسالہ ۱۹۱۸ء میں چکبست کی ادارت میں شایع ہوتا تھا۔ اور کم از کم چار سال تک جاری رہا تھا۔ اس سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے۔ اسی طرح یہ ایک مستقل اور ضخیم کتاب بن گئی ہے۔ چکبست اعتدال پسندوں کی وکالت کرتے تھے۔ اور عجلت پسندوں کی مخالفت۔ اس حصے کے مطالعہ سے اس عہد کی بہت سی دلچسپ معلومات حاصل ہوتی ہے اور ہوا کا رخ بھی، اور کوائف زندگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ نثر کے بعد حصہ نظم ہے جس میں چکبست کی ابتدائی زندگی کی منظومات کے علاوہ کئی نادر غزلیں اور متفرق اشعار جمع کئے گئے ہیں جو ان کے مجموعۂ کلام صبح وطن میں نہیں۔

لکھنؤ نے میاں حالی کے خوب خوب پرزے اڑائے ہیں۔ چکبست نے بھی اس میں پورا پورا حصہ لیا۔ اس سلسلے کا ایک مضمون "حالی کا ہوا سے لڑنا" باقیات چکبست میں شامل ہے۔ جو بہت پر لطف ہے اور معلومات افزا ہے اور طنز نگاری کا اچھا نمونہ بھی۔

حالی کے ساتھ ساتھ اقبال بھی اہل لکھنؤ کا ہدف رہے۔ اس کا نمونہ بھی ایک

مضمون میں ملے گا۔

چکبست سماج سدھار سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اور عقد بیوگان کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ "صبح امید" ایک سیاسی رسالہ تھا اور اس میں پہلی جنگِ عظیم کے بعد ہندوستان میں نت نئی تبدیلیوں اور حکومت برطانیہ کی مراعات کا ذکر خیر بہت ہے۔ تاریخ و سیاست کے طالب علموں کے لئے اس میں بہت قیمتی مواد موجود ہے۔ بعض رائج اصطلاحات کو چکبست نے بدل بھی دیا ہے مثلاً عدم تعاون کو عدم رفاقت اور انتہا پسندی کو تعجیل پسندی لکھا ہے۔ بہر حال "صبح امید" کے اقتباسات کا مطالعہ بھی بہت مفید ہے۔

"چکبست اور باقیات چکبست" کی ترتیب و تدوین میں تحقیق و تلاش سے بہت کام لیا گیا ہے اور یہ تذکرہ ہے مگر نئی قسم کا۔ پھر بھی چکبست کے تعلق سے، ان کی شاعری کے لحاظ سے ابھی بہت کچھ کام باقی ہے جسے رضا صاحب کر رہے ہیں۔

کتاب لائق قدر ہے۔ دبیز کاغذ، مضبوط جلد، عمدہ گٹ اپ اور حسن باطنی نے اس کی شان بہت بڑھا دی ہے۔

شعورِ غم

سچے شاعر و ادیب کی پہچان اس کی انفرادیت اور آزادیٔ فکر ہے۔ اس کا جذبہ بیدار، دل ہوش مند ہے اور دردمندی سے شش جہات تک کی سیر کراتی ہے اور اس طرح وہ مختلف نظریات، عقائد اور شخصیات کا جائزہ لیتا ہے اور پھر اسے اپنی پسند و ناپسند کے مطابق شعر کا موضوع بناتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض واقعات اور ہستیاں ایسی ہمہ گیر حیثیت رکھتی ہوں کہ اس سے ہر شاعر متاثر ہوا ہو لیکن بات کے کہنے کا انداز اور لب و لہجہ کا فرق اسے امتیازی شکل دے دیتا ہے۔

واقعہ کربلا اور امام حسین کی شہادت تاریخ انسانیت کا سب سے زیادہ درد ناک و جرأت آموز ورق ہے اور ہر مذہب و ملت کے شعراء نے اپنا خراجِ عقیدت اور آنسوؤں کی بھینٹ شہدائے کربلا کو پیش کی ہے۔ ہندوؤں میں میاں دلگیر بہت ہی نامور مرثیہ گو گزرے ہیں۔ امام حسین کے شش ماہے بچے حضرت علی اصغر کے

تیر ستم سے شہید ہونے کی پر الم داستان ایک فرانسیسی شاعر نے بڑے دل گداز انداز میں نظم کی ہے۔ مشہور محقق و شاعر جناب کالی داس گپتا رضا بھی ایسے ہی سلسلہ کی ایک کڑی ہیں جن کی شہدائے کربلا اور پنجتن پاک سے عقیدت و محبت ابتدائے سنِ شعور سے چلی آرہی ہے۔ آپ کے مجموعہ ہائے سخن میں ایک مجموعہ "اجالے" صرف اسلامیات اور حسینی شاعری پر مشتمل ہے۔

رضا صاحب فطرتاً حق گو، حق پسند اور حق شناس ہیں۔ ان کی زندگی عمل کوشی اور ضابطۂ اخلاق کی پابند ہے۔ جرأت و بے باکی، حقیقت نگری، انصاف پسندی، جبر و ظلم سے نفرت ان کی خمیر میں داخل ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے اوصاف رکھنے والے کو امام حسین سے بہتر ہیرو اور آئیڈیل نہیں مل سکتا۔ اسی لئے ان کے اشعار میں والہانہ عقیدت کے ساتھ عرفان و صلابت ہے۔ اور کلام سے خلوص اور سچائی ٹپکی پڑتی ہے۔ انھوں نے تحقیق کے سلسلے میں بے شمار قدیم ایرانی اور ہندوستانی مراثی کا غائر مطالعہ کیا ہے اور اس طرح "شعورِ غم" کے اندر غم کا سمندر سمٹ کر آگیا ہے۔ رضا کا کہنا ہے کہ آلِ محمدؐ نے اپنی قربانیوں سے غم کو اتنا معتبر بنا دیا ہے کہ اس پر بنی نوعِ انسانی فخر کر سکتا ہے۔

کیا کیا جواہر آلِ محمدؐ لٹا گئے
دائم رضا بشر کو رہے کا غرورِ غم

اور کربلا کے شہیدوں کا نام لینا ہی دل کو جرأتِ کوہ شکن عطا کرتا ہے۔

دل کی قوت کے لئے نام شہیداں لے کر
پھر ہمیں قصرِ ستم گار گرانا ہے یہاں

اس بند میں چھ بند کا ایک مسدس "دشتِ کربلا" بھی شامل ہے جس میں بڑے ڈرامائی انداز میں کربلا کی خونچکاں داستان کی تیز رفتار جھلکیاں پیش کر کے فنکاری کا کمال دکھایا گیا ہے۔ اس نظم کو پڑھ کر واہ بھی نکلتی ہے اور آہ بھی۔

ایک قادر الکلام شاعر ہونے کے ناطے رضا نے نوحہ، مرثیہ، حزنیہ نظم ہر نمونہ پیش کیا ہے جس میں پختگی سے زیادہ برجستگی ہم کو متاثر کرتی ہے اور جوشِ اظہار اس سے کہیں زیادہ ہے۔

بہہ رہا ہے تیری پیشانی سے اک دریائے نور
آفتاب دیں میں ہے تجھ سے تمازت اے حسین

ساتویں محرم سے آلِ نبیؐ پر پانی بند کر دیا گیا تھا اور دریا پر پہرے بٹھا دیئے گئے تھے۔

"دریا کے کنارے" ایک جدید طرز کا نوحہ ہے جس میں محاکات و منظر نگاری کی خوبی سے سننے والے کے تصور میں چودہ سو برس پہلے کی تصویر ابھر آتی ہے لیکن معنوی حسن کے ساتھ۔ اس کا ایک بند یہ ہے۔

منھ سوکھ گیا ہے جو حسین ابن علی کا
افسوس ہے پانی کو بھی اس تشنہ لبی کا
اس وقت برا حال ہے خشکی کا تری کا
انجام جو ہے پیش نظر آلِ نبیؐ کا
سب نقش یہ دیوار ہیں دریا کے کنارے

"ہم شعور غم" پر کچھ زیادہ توجہ اس لئے دے رہے ہیں کہ اس میں بین کا حصہ بہت پُر اثر ہے اور کسی غیر مسلم کے لئے یہ منزل پالینا ایک تائید غیبی ہے۔ "خون شہیداں" پوری نظم ہے اسے دیکھئے یا متفرق اشعار پر نظر ڈالیئے۔ درد و فریاد اس سے پھوٹی پڑتی ہے۔

بھائی نہ رہے، بچے نہ رہے
بے پردہ ہوئے وہ پاک حرم
قسمت نے چنا تھا روز ازل
یہ وقت حسینی گھر کے لئے

اس چھوٹی سی کتاب میں رباعیات، قطعات، قصیدہ بھی ہے اس کا اقتباس تو دینا مشکل ہے البتہ ایک قطعہ نقل کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں۔

شاعری کیا ہے خیالوں کی فراوانی ہے
بیقراری ہے، نحوست ہے گراں جانی ہے
ہاں مگر آلِ محمدؐ کے لئے وقف ہو جب
سحر اعجاز ہے، برکت ہے، دُر افشانی ہے

ایک دوسرا شعر ملاحظہ ہو۔

دیکھا ہے بارہا یہ رضا دل کی آنکھ سے
نورِ رسولؐ ، نورِ خدا سے جُدا نہیں

حضرت علی مرتضیٰ کی توصیف میں بی بی فاطمہ زہرا کی مدح میں ان کے قصائد و قطعات خاص طور سے توجہ و تحسین کے مستحق ہیں اور امام حسین کا تو کہنا ہی کیا ان کے بارے میں ایک شعر سے کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔

ابن علی کے پاک قدم کی جو دھول ہے
چشم رضا میں گلشن عظمت کا پھول ہے

امید ہے کہ رضا صاحب کی یہ پیش کش بارگاہ امام میں بھی مقبول ہو گی اور امام کے محبوں میں بھی "شعور غم" کے مرتب جناب اعجاز سیمابی ہیں جو خود بھی اردو کے ایک اچھے اور کہنہ مشق ادیب ہیں۔

سہو و سُراغ

بلا شبہہ آزادی کے بعد تحقیق میں واقعیت کا رنگ آیا ہے اور قاضی عبدالودود کے پیچھے مالک رام، مولانا عرشی، رشید حسن خاں، انصار اللہ نظر، گیان چند جین، ابو محمد سحر، مرتضیٰ حسین فاضل، وحید قریشی جمیل جالبی، مشفق خواجہ، عابد پیشاوری، تنویر احمد علوی، نثار احمد فاروقی، کالی داس گپتا رضا وغیرہم کے نام ایسے ہیں جن کی کاوش اور طرز تحقیق سے ہم کو یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کو محقق کے منصب اور تحقیق کی ذمہ داریوں کا ایک گونہ کامل احساس ہے۔ کسی ایک مسئلہ میں حدِ آخر تک بحث کرنا، واقعات کی کرید اور چھان بین، بھول چوک کی طرف سخت نگرانی، ادعاییت سے گریز نے ان کے قلمی کارنامے کو معیاری حیثیت دی ہے۔ ان لوگوں نے ادب کے کئی تاریک گوشوں کو منور کیا ہے اور بڑے بڑوں پر متانت کے ساتھ انگلی رکھی ہے۔

نئی نسل والوں سے اگر اس طرح کی بات کی جائے تو وہ سُننا اور قبول کرنا تو درکنار بڑے بھڑے اور ایک ادنیٰ تصرف کے ساتھ خواجہ میر درد کا شعر جڑ دیتے ہیں۔ آپ بھی سنیئے۔

کارِ تحقیق بن آتا ہے اسی سے جس کو
درد کی طرح کبھو فکر نہ ہو روزی کا

بہت خوب اس لیے کہ "سہو و سراغ" کے مصنف پر تو یہ مثل چپک ہی جائے گی مگر کیا کہوں کہ میں نے ایسے محقق بھی دیکھے ہیں جن کے یہاں ہفتہ میں ایک وقت تو فاقہ ضرور ہوتا تھا اور رہا یہ کہ روزی کی فکر نہ ہو تو آدمی محقق کیا بنے گا شیطان ضرور بن سکتا ہے۔ حق یہ ہے کہ محقق کے لئے سودائی ہونا شرط ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس کی طبیعت مشکل پسند ہو۔ کالی داس گپتا رضا جب شاعر زیادہ اور محقق کم ہوا کرتے تھے اس وقت بھی ان کو فنِ شعر گوئی و لغت میں مغز پاشی بے حد عزیز تھی محقق کے لئے لگاتار محنتِ شاقہ کی عادت کے ساتھ وسیع دماغ، فولادی ذہن اور اعلیٰ درجے کی امانت داری اور حافظہ کی ضرورت ہے۔ اس پر مستزاد اس کی اپنی وسیع معلومات اور ذوقِ سلیم۔ کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ تحقیق صرف خشک موضوعات پر دماغ سوزی کا کا نام ہے نہیں بلکہ اس کا معنوی تعلق دل سے بھی ہے۔ سچے محقق کے لئے کشادہ دل بے نیازِ سود و نقصان، درد مند، بے تعصب بھی ہونا لازمی ہے۔

کالی داس گپتا رضا ہمارے بنائے ہوئے اصول موضوعہ پر کس قدر پورے اترتے ہیں مجھے کہنے کی ضرورت نہیں۔ "سہو و سراغ" میں اگر سارے تحقیقی و تنقیدی مضامین ہی ہوتے تو غالباً مجھے وضاحت کرنی پڑتی لیکن "سہو و سراغ" صرف ادبیات کے بھولے بسرے گرے پڑے ریزوں کی فراہمی نہیں بلکہ خود رضا کی شخصیت کا مکمل سراغ بھی فراہم کرتا ہے۔ اس مجموعہ مضامین کو رضا کی چند اور منتخب تحریروں سے آراستہ کیا گیا ہے جو طنز و مزاح، انشا پردازی خاکہ نگاری کے بہترین نمونے ہیں ان ہی مضامین کے بین السطور سے نقطے ابھرتے ہیں اور خاتمہ کتاب پر کالی داس گپتا رضا کا ایک مکمل مرقع تیار ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر کوئی شخص مرتب کا دیباچہ نظر انداز کر کے بڑھ جائے تب بھی مرتب کا مدعا پورا ہو جائے گا۔

رضا کا نظریۂ تحقیق کیا ہے؟ اس کا جواب ایک فقرہ میں یہ کہ گدڑی کے لعل و جواہر کو بازار میں لانا۔ چنانچہ ان کے موضوعات میں لکھنؤ کے قدیم مطعون، گمنام مظلوم اساتذہ اردو کے ہند و شعرا ہی نہیں بلکہ مرثیہ گو کو خاص مقام حاصل ہے۔

پچھلے چند برسوں سے وہ چکبست پر کام کر رہے ہیں اس کا خاص سبب یہ ہے کہ اس کو ابھی تک قرار واقعی نہ پہچانا گیا نہ اسے اس کا اصلی مقام دیا گیا ہے۔ غالبیات میں بھی نوادرات کی تلاش ہی کو وہ ترجیح دیتے ہیں اور غلط العوام کو فصیح کہنے سے قطعاً انکار کرتے ہیں۔ اس تعلق سے ان کے جتنے مضامین شائع ہوئے ہیں وہ سبھی معیاری رسائل کی زینت بنے ہیں اور ان میں ندرت، ثقاہت زورِ علمی کے ساتھ حسن بیان بھی ہے۔

"سہو سراغ" کئی حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصہ سہویات کا ہے مگر اسے صرف غالبیات تک محدود رکھا گیا ہے اور معاصرین و پیشرو محققین کی فروگذاشت بتائی گئی ہے لیکن اس کے علاوہ جو تحقیقی مضامین اور ہیں ان میں بھی سہو نمائی کا چلن ملتا ہے مثلاً مولانا فضلِ حق کا ایک تاریخی قصیدہ وغیرہ۔

چند مضامین کی سرخیاں درج ہیں اسی سے مواد و کیفیت کا اندازہ ہو جائیگا۔

۱۔ چند قدیم ہندو شعرار ۲۔ قدیم ہندو شعرا کی چند نعتیں ۳۔ فصیح الملک داغ اور اودھ پنچ ۴۔ مرزا جان جاناں مظہر اور رائے کیول رام ۵۔ چند مشہور شعرار اور ان کے خالق ۶۔ چکبست اور طنز و مزاح ۷۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی بحیثیت شاعر۔

کتاب کا پہلا حصہ جتنا سنگین و اہم ہے آخری حصہ اتنا ہی لذیذ و شیریں۔ "عبدل بابا" ایک تمثیلی خاکہ ہے جو بہت بھرپور ہے اور فطری بھی۔ "حسینا" دردمندی، اخلاص و وفا کا ایک منظر نامہ ہے۔ "تو ہمارا تخلص" "ہم ایڈیٹر تھے" "حکیم راؤ امیں خاں" طنز و مزاح کے شہ پارے کہے جا سکتے ہیں۔

"پہلے ہمارا تخلص عاقل تھا اور یہ انتخاب کوئی یوں ہی نہیں کیا گیا تھا اس میں یک زبردست نکتہ تھا ہم ذرا قدیم قسم کے شاعر و ادیب تھے اور ہمارے زمانے سے پہلے شعرائے کرام چہار حرفی تخلص کے زیادہ مشتاق ہوتے تھے۔ حق تو یہ ہے کہ چہار حرفی تخلص والے شعرار مشہور و مقبول بھی ہوتے تھے۔ جیسے آتش، ناسخ، مومن اور پھر سب پر بھاری خود چچا غالب، غرضیکہ ہمیں یقین کامل تھا کہ ہم اسی عاقل تخلص کے بل بوتے پر اگر غالب نہیں تو آتش، ناسخ یا مومن کے ہم پلہ تو ثابت ہو کے ہی رہیں گے۔"

حسن و اخلاق کے روایتی امانت دار بھی ہیں۔ مگر "انتخاب آتش و غالب" از چکبست کی ترتیب و اشاعت سے یہ کھلتا ہے کہ زبان اردو کے فروغ و خدمت کا جذبہ ان کے تمام محاسن پر حاوی ہے اس سلسلے میں وہ صرف گفتار کے ہی نہیں بلکہ کردار کے بھی دھنی ہیں۔ جتنی محنت اور وقت میں انھوں نے اس انتخاب کو مختلف رسائل سے جمع کیا ہے اور اسے احتیاط و دقتِ نظر کے ساتھ صاف صوف کر کے کتابی شکل دی ہے اس سے کم مدت میں اپنے اشعار کا انتخاب کر کے چھپا سکتے تھے۔ اس انتخاب سے ان کی اردو اور چکبست سے غیر معمولی خلوص و شغف کے ساتھ ساتھ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ نام و نمود ان کا مقصد اعلیٰ ہرگز نہیں ہے۔

چکبست بلاشبہ ایک نابغۂ روزگار شخصیت تھے اور جس طرح وہ صفِ اول کے سخنور تھے اسی طرح بہترین سخن شناس بھی تھے۔ اپنے ماہنامہ صبح امید لکھنؤ میں انھوں نے یہ سلسلہ شروع کیا اور پہل آتش و غالب ایسے گرانڈیل شعراء سے کی اور بقول خود اس انتخاب میں یہ اصول مدنظر رکھا کہ اسی رنگ کے اشعار چنے جائیں جو کہ سادگی اور پاکیزگی کے جوہر سے خالی نہیں۔ اور مذاق سلیم کی قدر دانی کے محتاج ہیں۔ چنانچہ چکبست نے آتش و غالب دونوں کے یہاں اس اصول کو برتا ہے اور کہیں کہیں پوری پوری غزل میں سے صرف دو تین اشعار منتخب کئے ہیں۔ باقی کو دیوان میں رہنے دیا ہے۔

چکبست عام بڑے آدمیوں کی طرح جوانی میں وفات پاگئے اور یہ کام مکمل نہیں ہو سکا۔ نہ آتش کے دیوان دوم تک پہونچ پائے نہ اسے کتابی شکل دے پائے اور مدتوں ایک بڑے شاعر کا یہ اہم کام رسائل کی فائلوں میں چھپا رہا لیکن میں تو اسے چکبست کے خلوص کا ایک کرشمہ کہوں گا کہ نصف صدی گذر جانے کے بعد ایک چکبست نواز اٹھا جو شاعر بھی تھا اور باریک بیں محقق بھی۔ اس نے اس لخت لخت کو جمع کیا اور بہت عمدگی کے ساتھ زیور طبع سے آراستہ کر کے اہل ذوق کی خدمت میں پیش کر دیا۔

قدیم شعراء کے کلام کا انتخاب کا سلسلہ حسرت موہانی نے اردوئے معلیٰ میں شروع کیا اور قدیم اساتذہ کی غالب تعداد ایسی تھی جن کے دیوان کا انتخاب مشقت پسند حسرت

پھر بھی اس کتاب میں "سہو و سراغ" کا دلچسپ حصہ بہت کم ہے جو بار بار کھٹکتا ہے۔ مرتب اگر اس میں تھوڑا اضافہ کر دیتا تو ایسا نہ ہوتا۔ کتاب کا باطنی حسن اوپر تک پھوٹ آیا ہے اور اس نے "سہو و سراغ" کے چہرے کو بھی حسین و تابناک بنا دیا ہے۔ جتنا مشکل کام بچوں کا نام رکھنا ہے اس سے زیادہ کتاب کا۔ اور اس کے نام میں بڑی جدت و نفاست ہے۔ کتابت و طباعت و تزئین میں بھی فطری ہنرمندی سے کام لیا گیا ہے۔ اس طرح اسے دیکھنے سے آنکھ روشن ہوتی ہے اور پڑھنے سے دل شاد۔ خالص علمی و تحقیقی مضامین کی تعداد نسبتاً کم رکھی گئی ہے اور یہ بھی اچھا ہے تاکہ کتاب ہر حلقے میں مقبول ہو۔

انتخابِ آتش و غالب

بمبئی ایک صنعتی شہر ہے۔ یہاں تجارت اور حرفت کا بول بالا ہے۔ اخلاق و معاشرت میں سودا بازی گھر کیے ہوئے ہے۔ ہر کام چھٹ پٹ والا ہوتا ہے ذہن و ضمیر سب کا سب بکاؤ مال ہے۔ استحصال کا سکہ چلتا ہے۔ کماؤ کھاؤ بٹورو اور اڑاؤ یہاں کا مذہب ہے۔ مگر اسی خرابے میں چند افراد ایسے بھی بستے ہیں جو یہاں کی زندگی کے حریف بن کر جی رہے ہیں۔ ان میں سے ایک ہیں کالی داس گپتا رضا صاحب جو اپنی دنیا الگ بسائے ہوئے ہیں۔ مالدار ہونے کے باوجود علم کی فضیلت کے قائل ہیں۔ پکے ہندو ہوتے ہوئے بھی محمدؐ و آلِ محمدؐ کے مداح ہیں۔ مدتوں بیرونِ ہند کی ہوا کھا کر بھی اپنی روایتی تہذیب کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ اس برے وقت میں بھی اردو کا دل و جان سے ساتھ دے رہے ہیں۔ صرف اعلیٰ و معیاری ادب کی تخلیق ہی نہیں کرتے بلکہ اسے چھپوا کے کھپانے کی بھی دردسری مول لیتے ہیں۔ اپنے دس سال کے قیام بمبئی میں انھوں نے جتنا مفید و منتخب لٹریچر اردو کو دیا ہے اس کی برابری بہت سے بیش رو اہل قلم بھی نہ کر پائیں گے۔

رضا صاحب کی حالیہ تصنیف "سہو و سراغ" نے ان کی ہم صفت موصوف شخصیت کو آشکارا کر دیا ہے۔ اس سے قبل لوگ ان کے شاعر و محقق کے روپ جانتے تھے مگر اب پتہ چلا کہ بہت سے فنون لطیفہ میں ان کا دخل ہے اسی کے ساتھ ساتھ وہ

نے کر ڈالا تھا۔ لیکن ان کے یہاں اصول قدیمانہ تھا اور اس میں زیادہ تر فنی باریکیوں زبان و بیان و معنی کا لحاظ رکھا گیا تھا۔ چکبست چاہتے تھے کہ قدما کے کلام کا وہ حصہ پیش کریں گے جو تصنع اور آورد سے پاک ہے اور اصل شاعری کی تصویر ہے۔ اور اس طرح وہ جدید خیال کے لوگوں کی بے توجہی و بدظنی کو دور کرنا چاہتے تھے۔ مگر افسوس کہ آتش و غالب کے انتخاب کے بعد ان کو موت نے مہلت ہی نہ دی اور مفید منصوبہ تشنۂ تکمیل رہ گیا۔

آتش و غالب کا انتخاب اب تک اتنا ہو چکا ہے۔ جس کو یادداشت کی بنا پر گننا بھی مشکل ہے۔ نیاز فتح پوری سے خلیل اعظمی تک بیشتر ادیبوں نے اس پر کام کیا ہے۔ امید ہے کہ اہل ذوق اس کی خاطر خواہ پذیرائی کریں گے اور مرتب کی محنت و کاوش مشکور ہوگی۔

شعاعِ جاوید

رباعی کی کامیابی کے لئے قوافی کی موزونیت، الفاظ کی شیرینی معانی کی لطافت، تشبیہات و استعارات کی ندرت کے ساتھ ساتھ موسیقی کے نقطۂ نظر سے دل پسند آہنگ کی بھی ضرورت ہے۔ رباعی میں نغمگی و ترنم کا عنصر لازم ہے اس لئے اس کے اوزان مقرر کئے گئے ہیں اس سے باہر چار مصرعے ہوں گے۔ قطعہ ہوگا۔ رباعی نہیں ہوگی۔ عام طور سے مفعول، مفاعیل، مفاعلین فع یا کا وزن زیادہ متداول و مستعمل ہے آسانی کے لئے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ کا سانچہ سامنے رکھ کے بھی رباعی کہہ سکتے ہیں۔ اسی لئے بابا طاہر عریاں کے چار مصرعی قطعات اور اقبال کی دوبیتی کو رباعیات سے منسوب کرنے والے کو گمراہ کن کہا جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ فکر کی وحدت کو قائم رکھتے ہوئے ہر دو شعری مربوط و مؤثر کلام رباعی نہیں ہوا کرتا۔

اس تمہید کی ضرورت یوں پیش آئی کہ کالی داس گپتا رضا جو کم و بیش نصف صدی سے ہر صنف میں طبع آزمائی کرکے داد سخن حاصل کر چکے ہیں۔ قدرت کلام اور فن مہارت کے اعتبار سے انفرادیت منوانے اور غزل و نظم کے کئی مجموعے شائع کرنے کے بعد رباعی کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی رباعیات بہت گٹھی اور

نکھری ہوئی، معنویت سے بھرپور اور پُرشکوہ و اعلیٰ رتبہ کی حامل ہیں۔ انھوں نے لفظوں کی تراش خراش میں بھی بڑی ہنرمندی و دقت سے کام لیا ہے۔ اور مضامین میں بھی علو اور صلابت کا خیال رکھا ہے۔ رضؔا کی رباعیات یک رنگی نہیں ہیں بلکہ اس میں اندازِ بیان کے مختلف انداز ملتے ہیں۔

رضؔا کی رباعیاں زندگی کے تجربات اور کائنات کی ہست و بود، احساسات کی بلندی و پستی کی پروقار تصویریں ہیں۔ جس میں شاعر نے لہجہ کی چاشنی کے ساتھ لفظوں کے برمحل استعمال سے رنگ بھرا ہے۔ ان رباعیوں کو پڑھیے تو پتہ چلے گا کہ شاعر نے خیالات کے پیکر کا لحاظ کرکے اسے الفاظ کا لباس تو دیا ہی ہے اس سے آگے یہ کہ مصرعوں کی حرکت کی رفتار بھی کا فی ناپ تول کے رکھی گئی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے بالکل درست لکھا ہے کہ یہ رباعیاں ہمارے عہد میں رباعی گوئی کا اعلا معیار قائم کرتی ہیں۔

رضؔا صاحب کے پاس گیان بھی ہے اور دھیان بھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان دونوں صفات سے متصف ان کی شخصیت نظم یا غزل میں نہیں رباعیات ہی میں دکھائی دیتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

محتاط رہو اور پھر د اپلے گہلے
کیوں دیکھ کے کوہِ زیست چھاتی دہلے
بس تازہ دموں سے ساز کر لینا ہے
ہر سانس سے تین چار سانسیں پہلے

اس رباعی میں لفظی و معنوی بہت سے محاسن جمع ہیں اگر اس کا تجزیہ کیا جائے تو طوالت ہوگی۔ لہذا یہاں ہم بغیر کسی خاص اہتمام کے چند رباعیات نقل کرتے ہیں اور فیصلہ اہل نظر کے حوالے کرکے مجبوراً محفل برخواست کرتے ہیں۔

تا آخر دم، دل سے جواں رہتا ہے
بیزارِ جہاں، مستِ جہاں رہتا ہے
مذہب بھی ٹھہر جاتا ہے اک نقطے پر
انسان سدا رواں دواں رہتا ہے

ظلمات میں مستور ہے منزل تیری
افلاک سے بھی دور ہے منزل تیری
کیوں آج تک اے گرم روی کے حامی
بے سایہ و بے نور ہے منزل تیری

حسن اتفاق سے جیسا کلام ہے کتابت بھی اسی معیار کی ہے۔ ڈیڑھ سو سے زائد رباعیات، نو صفحے کا مقدمہ (از ڈاکٹر گوپی چند نارنگ) اور اتنی عمدہ کتابت، گٹ اپ کاغذ کی نفاست کے لحاظ سے قیمت کم ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب بہت جلد سے جلد فروخت ہو جائے گی اور معیاری ادب کے شائقین کو پوری آسودگی حاصل ہو گی۔ ناشر تناظر پبلی کیشنز ہر طرح داد و تحسین کے مستحق ہیں۔

کلیاتِ چکبست (نظم)

سال نو کے آغاز میں اردو کے مستند محقق و شاعر کالی داس گپتا رضاؔ نے سلسلۂ چکبست کی تیسری کتاب شایع کرکے بروقت بہت بڑا کام کیا ہے کہ یہی سال چکبست کی سویں سالگرہ کا ہے وہ ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے تھے اور بھری جوانی میں مرگ مفاجات کا شکار ہو گئے۔

"کلیات چکبست" میں شاعر کی تمام و کمال کائنات کو دور و نزدیک سے تلاش کرکے چھان پھٹک کر، کسوٹی پر کس کے بڑے احتیاط و سلیقے سے چن دیا گیا ہے۔ اور اگر گٹ اپ، طباعت، کتابت، کاغذ، روشنائی، خط اور چھاپے خانے کی تعریف غالب کی زبان میں کی جائے تو مناسب نہ ہو گی۔ لیکن بات یہیں تک نہیں بلکہ کچھ اور آگے جاتی ہے، مصنف کے مبسوط مقدمہ، سنین کے اندراج و حواشی نے کتاب کو آنکھیں دے دی ہیں تو فہرست و اشاریہ نے عینک۔ کاغذ اپنی صفائی اور روشنی میں آئینہ ہے اور تحریر اس کا سنگار۔

مقدمہ فاضلانہ ہے نہ عالمانہ، بلکہ وہ چکبست کے فنی عوامل اور عہد و ماحول کا فکری تجزیہ اور تحقیقی خاکہ ہے۔ جس میں منظر و پس منظر چولی دامن کی طرح ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں اور معلومات میں قیمتی اضافہ ہوتا ہے۔ نثر جان دار سلیس و رواں ہے۔ چکبست پر مواد و اسلوب، زبان و بیان کے تعلق سے جو بے جا اعتراض دانستہ

ونادانستہ کیئے گئے ہیں، شواہد واسناد کے ساتھ اس کا مسکت جواب دیا گیا ہے۔ غالب آتش، چکبست کے تقابلی اشعار کا حصہ دلچسپ بھی ہے اور بصیرت افروز بھی۔

رضا صاحب کوئی بات مبہم اور سرسری طور پر کہنے کے عادی نہیں، ان کا ہر فیصلہ کاوش و تحقیق کی دین ہوتا ہے اس لیئے دو ٹوک، بے لاگ اور ناقابل تردید بھی ہوتا ہے۔ "چکبست وباقیات چکبست" میں بھی ان کا یہ جوہر جگہ جگہ نمایاں ہے اور یہاں بھی۔ ان کی تحقیق مرغ وماہی کے تابع ہے نہ ذاتی و شخصی پسند وناپسند کا مرغولہ، انھوں نے مقدمے کے آخری حصے میں صاف کہہ دیا ہے کہ چکبست سے ان کی دلچسپی کسی منفی جذبے یا جوشِ ولا کے سبب سے نہیں ہے نہ چکبست کی شاعری میں اس کثافت کا شائبہ موجود تھا۔ ان کے خیال میں چکبست کا جو مقام تھا اردو ادب نے ان کو اب تک نہیں دیا اور ان پر لکھنے والوں نے بھی ڈھنگ سے نہیں لکھا اس لئے اس منفرد و قدآور شاعر کی شناخت کا بار انھوں نے اپنے سر لے لیا۔ اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ میرے خیال میں اس کتاب کے بعد چکبست شناسی کے نئے پیمانے ضرور بنائے جائیں گے۔

چکبست تنگ نظری، تعصب سے بہت بلند تھے، لکھنؤ کی گنگاجمنی تہذیب اور کشمیری پنڈتوں کی شرافت و رواداری روزِ روشن کی طرح آشکار ہے۔ رضا صاحب کی زاد بوم اور خاندان دونوں کو دردمندی و محبت کے رشتہ میں ایک امتیازی درجہ حاصل ہے۔ کوئی نقاد یا محقق کسی ادیب و شاعر کو علمی تقاضوں کے تحت موضوعِ سخن بناتا ہے ورنہ وطنیت و قومیت کے گرداب میں پھنسنے والا خود بھی ڈوبتا ہے۔ اور اپنے اصنام کو لے ڈوبتا ہے۔ طبیعت و مزاج کا میلان فکر و عمل کی مماثلت ضرور ایک کو دوسرے کے قریب کرسکتی ہے۔ جس طرح مصر کے ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے نابینا شاعر ابوالعلیٰ مصری کو ریسرچ کا موضوع بنا کر شہرۂ آفاق کر دیا اور سرمد کو ابوالکلام آزاد نے۔

چکبست کے شعری محاسن سے حقیقی آشنائی اور ان کے کلام کی باریکیوں کو اجاگر کرنے کے لیے کئی ایک خوبیاں درکار ہیں۔ اوّل تو کلاسیکی ادب پر کامل دسترس پھر شاعر اور اس کے شعری مزاج میں خود کو رنگ ڈالنا اور چکبست کے تعلق سے

اب ایک ایسی کتاب پر تبصرہ پیش کیا جاتا ہے جو رضا صاحب کی تصنیف یا تالیف نہیں ہے بلکہ خود رضا صاحب کی زندگی اور کام پر لکھی گئی ہے۔ کتاب کیا ہے، کیسی ہے ملاحظہ کیجیے۔

کالی داس گپتا رضا (تحقیق و شاعری کی روشنی میں)

اول اول جب یہ کتاب برائے تبصرہ ناچیز کے ہاتھ لگی تو جی نے کہا چلو میاں ایک آسان کام ملا۔ خوب آرام سے فرصت کے وقت بلا پڑھے جو موج میں آیا لکھ ماروں گا کہ آخر یہ ایک مداح کا نذرانۂ عقیدت ہی تو ہے اور بندہ بھی اسی برادری کا ایک فرد ٹھہرا۔ لیکن جب حسب عادت صفحات پر انگلیاں چلنے لگیں تو تحریر نگاہوں کی چھیڑ چھاڑ بھی شروع ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد میں اسے اول آخر، درمیان سے پڑھ رہا تھا۔ پھر بھی بات بنی نہیں۔ اور فیصلہ کیا کہ باقاعدہ ایک کتاب کی طرح اس کا غائر مطالعہ کرنا چاہیئے کہ کتاب کافی دلچسپ ہے اور میں نے اول تا آخر پڑھا اور کتاب ختم کر کے دم لیا۔

ظفر ادیب کا کہنا ہی کیا۔ اردو کے مخلص درویش صفت خادم، جانے پہچانے ادیب و شاعر اور صحافی پوری عمر خامہ فرسائی میں گزار دی مگر ناوابستگی اور غالب کی ناطرفداری کے باعث نہ آسمان چڑھے نہ چمک سکے گو یہ کتاب موصوف نے بڑی تیز رفتاری یا عجلت کے ساتھ مرتب کی ہے پھر بھی اپنے حسن سلیقہ اور تجزیاتی صناعی کا پورا استعمال کر کے اسے مستقل تصنیف کی حیثیت دے دی ہے۔

ہر چند ظفر ادیب کا طرز روائتی ہے جس پر نئی نسل کے انسان کو دور کی آواز کا گمان ہوتا ہے۔ مگر کتاب کی ترتیب میں انھوں نے ایک نیا طریقہ اپنایا ہے اور پرانے ڈھرے سے ہٹ کر رضا کی شخصیت سیرت، کمال ہنر کو خود ان ہی کی تخلیقات یا تحریروں یا دوسروں کے تاثرات و تبصرے کے تناظر میں اس طرح ابھارا ہے کہ اس میں افسانوی لذت پیدا ہو گئی ہے۔

خود ظفر ادیب بھی اس کتاب میں جگہ جگہ سر نکالے ہوئے ہیں یہ بھی ایک خاص

رخ ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ صرف دو بار رضا صاحب سے مل سکے ہیں، لیکن ان کی تصنیف و اشعار کی دنیا سے ان کو گہرا علاقہ رہا ہے۔ اور مدتوں اس سمندر میں شناوری بھی کی ہے۔ اسی لیے ان کے تجزیے اور تاثرات میں صداقت کا عنصر جھلکتا ہے۔

میرے خیال میں رضا صاحب کے نصف درجن شعری مجموعے اور اس سے زائد تخلیقی، تالیفی مجلدات کا تمام و کمال بلکہ بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد اس کی تلخیص تحلیل و تشریح کرتے ہوئے پڑھنے والوں پر ایک اثر مرتب کرنا ہی دشوار ہے۔ اس میں جتنی محنت و دقت درکار ہوتی ہے اسے وہی لوگ جان سکتے ہیں جن کو ایسے ہمت آزما کام کا سابقہ ہوا ہو۔ رضا صاحب کی رنگا رنگ و پہلو دار بلکہ تہہ دار شخصیت اور ادبی کاوشوں کے جائزے کے لیے ظفر ادیب ہی جیسے کثیر المطالعہ و کہنہ مشق شاعر و ادیب کی ضرورت تھی۔ اس کا ثبوت ہم کو جگہ جگہ ملتا ہے۔ تحقیق کا سنگلاخ، میدان ہو کہ شاعری کی نرم و نازک وادی، وہ کہیں بھی اجنبی نظر نہیں آتے، بلکہ کہیں کہیں تو اپنا نقش بھی چھوڑنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ایسے مواقع کم ہیں ــ مثلاً چکبستؔ سے والہانہ عقیدت کے باوجود وہ کھلے دل سے اس کا اظہار کرتے ہیں کہ طنز و مزاح چکبستؔ کی طبیعت کی چیز نہیں ..... طنز تو خیر مگر مزاح ان سے بالکل میل نہیں کھاتا۔"

کالی داس گپتا رضا کے کلام اور تحقیقی کام کو مشاہیر ادب نے سراہا ہے۔ مالک رام، علی جواد زیدی، خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر گیان چند، شمس الرحمٰن فاروقی، خلیق انجم، نسیم انہونوی، اعجاز صدیقی، مخمور سعیدی، شکیل بدایونی، ڈاکٹر صفدر آہ، اور دوسرے کئی مستند و معروف اہل قلم کے تاثرات سے ہم کو یہ کتاب آگاہ کرتی ہے جسے ظفر ادیب نے بڑی خوبی ہنرمندی کے ساتھ چھاپاں کیا ہے اور موقع یہ موقع اس کی وضاحت کر کے اسے اپنا لیا ہے۔

اغلب یہ ہے کہ کتاب پر نظر ثانی نہیں ہو سکی۔ کہیں کہیں تکرار ہے لیکن اس کا زیادہ احساس نہیں ہوتا ہے۔ کتاب کو ختم کرنے کے بعد تسکین و لذت دونوں ملتی ہے اور کچھ مفید معلومات بھی۔ رضا صاحب کی زندگی کے سبھی رخ اس میں

سمٹ کر آ گئے ہیں۔ اور ان کے بارے میں کچھ غلط فہمیوں کا ازالہ ہو گیا ہے۔ یہ کتاب بہت کچھ دیتی ہے اور بہت سی کتابوں کے مطالعہ کی زحمت سے بچا لیتی ہے اسے پڑھنے میں کہیں بھی تھکاوٹ یا اکتاہٹ نہیں محسوس ہوتی ہے اگر اس طرح کی کتابیں اردو کی دیگر اہم شخصیات پر لکھی جائیں تو ضرور مقبول ہوں گی اور ایک اچھا کام بھی ہو گا۔

رضا صاحب کے طرز سخن اور انداز نظر سے واقفیت کے لئے یہاں ظفر ادیب کے بہت سے منتخب اشعار میں سے دو شعر پیش کر کے اسی تبصرہ کو تمام کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

نہالِ آرزو نازک ہے اتنا
صبا کی چوٹ بھی سہتا نہیں ہے
یہ ہے پہچان مستوں کے لہو کی
وہ پستی کی طرف بہتا نہیں ہے

طباعت وکتابت و قیمت مناسب ہے۔

رضا کی بوقلمونی شخصیت اور ادبی کارنامے اس قدر متنوع اور پھیلے ہوئے ہیں کہ اس کے لئے واقعی ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے، مضمون و مقالہ میں اس کا خاکہ ہی آجائے تو بہت ہے۔ اور یہ تحریر تو غالباً ادھورا خاکہ بھی نہیں بنا سکی خیر یار زندہ صحبت باقی۔

مانک ٹالا

فن، ادب اور انسانیت کی منظم

تکون

بنیے کا پوت (بلکہ سپوت) مسیں بھیگتے ہی سب سے پہلا عشق لکشمی (دولت) سے کرتا ہے۔ اگر وہ تھوڑی بہت آنا کانی کرتا بھی ہے تو لکشمی خود اس سے پریم کی پینگیں بڑھانا شروع کر دیتی ہے۔

نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات ـــــ کہ وہ لکشمی کو گھر میں ڈال لیتا ہے۔

لیکن اردو ادب میں تین کپوت بنیے یعنی گوپال متل، گیان چند اور رام لال نابھوی ایسے بھی پیدا ہوئے ہیں کہ جنہوں نے لکشمی کی بجائے سرسوتی (علم و ادب) سے آنکھ مٹکا کیا۔ اور آج تک اپنے کئے کی سزا بھگت رہے ہیں۔

کالی داس گپتا رضا نے آغازِ سبزہ ہی سے دونوں بہنوں سے آنکھ مچولی شروع کر دی تھی۔ ان کی خاطر چلّے کھینچے۔ ملک بدر ہوا۔ (بس رانجھے کی طرح کان پھڑوا کر جوگی نہیں بنا۔ لیکن ـــــ) نجانے کیا کیا ریاض کئے کہ بالآخر دونوں ہی کو رام کر کے گھر میں ڈال لیا۔ ان دونوں بہنوں کی خاطر چلّے تو میں نے بھی کھینچے تھے در بدر کی ٹھوکریں اور ملک ملک کی خاک بھی چھانی تھی۔ لیکن میرے حصے میں سب دور کا جلوہ ہی آیا ـــــ !

گھر میں ایک ستی ساوتری اور بھی ہے۔ جو ان کے دو بچوں کی ماں ہے لیکن یہ تینوں دیویوں سے یکساں پیار محبت اور برابری بلکہ "قومی یکجہتی" کا سلوک کئے جا رہے ہیں۔ حالانکہ "بنیا میرج کوڈ" کے مطابق وہ صرف دو ہی شادیوں کے حق دار تھے اور روادار بھی۔ یعنی لکشمی دیوی کے بعد ماں باپ اور/ یا اپنی پسند

کی ایک 'مجازی' دیوی سے !

لیکن وہ ادیب ہی کیا کہ جس کی گھٹی میں روایت شکنی نہ ہو !

مگر گپتا رضا کی روایت شکنی اردو کے ان جدید ادیبوں کی سی بغاوت نہیں تھی جو ٹیڑھا میڑھا، یا سَر کے بَل چل کر شہرت کی بس کے پیچھے بھاگتے ہیں اور اخیر میں گردِ راہ سمیٹ کر سمجھ بیٹھتے ہیں کہ بہت بڑی دولت حاصل کرلی۔ مگر جب وہ اس دولت کے پٹارے کو بڑی بے صبری اور اشتیاق سے کھولتے ہیں تو آموں کی بجائے گٹھلیاں ہی ہاتھ آتی ہیں۔ پھر جب ان گٹھلیوں کے دام بھی وصول نہیں ہو پاتے تو قارئین کی بد ذوقی، زمانے کی ناقدری اور گردشِ گردوں کی ناہنجاری ـــــ تینوں کی ایسی تیسی پھیرتے ہوئے کاتبِ تقدیر کے ساتھ ساتھ ماں باپ کو بھی کوستے رہتے ہیں کہ انھوں نے انھیں قبل از وقت کیوں پیدا کیا۔ حالانکہ وقت سے پہلے یا پیچھے اُن کے پیدا ہونے کا جواز ہے نہ مصلحت !

شریف گھرانوں میں جب کوئی لڑکا پیدا ہوتا ہے تو والدین اس کے چہرے کے تیور اور ماتھے کی ریکھائیں دیکھ کر ہی سرپٹ لیتے ہیں کہ لاڈلا بڑا ہو کر ادیب یا شاعر بنے گا اور اس کے جیتے جی اسے رو پیٹ کر صبر کا پتھر سینے پر رکھ لیتے ہیں کہ اس کا مرنا جینا ایک برابر ہوتا ہے۔ ویسے ولیوں کے گھر میں بھی تو بھوت پیدا ہوا ہی کرتے ہیں !

لیکن گپتا رضا ایسا کائیاں نکلا کہ پیدا ہونے پر نہ اس نے چہرے کے تیور دکھائے اور نہ ہی ماتھے کی ریکھاؤں کا اتا پتا دیا۔ چنانچہ ماں باپ نے اُس کی پیدائش کی خوشی میں لڈّو بانٹے۔ ست نرائن کی کتھا اور ہَوَن یگیہ کرایا۔ برہمنوں کے لئے بھوج اور غریب غربا کے لئے لنگر کا انتظام کیا۔ اور نوزائیدہ کے لئے ہر خاص و عام نے حسبِ توفیق اور حسبِ حال دعائیں دیں۔

مگر بنیے کے فہم و فراست اور قلم لاکھ طاقت ور سہی لیکن کاتبِ تقدیر کا لِکھا کون مِٹا سکتا ہے ؟ چنانچہ وِدھاتا کی پریرنا اور ترغیب سے اس کا نام کالی داس گپتا رکھ دیا گیا کہ آگے چل کر اسے اردو ادب کا کالی داس بننا تھا۔ ورنہ پیارے لال اور مکند لال (رضا کے دوسرے بھائیوں کی طرح) کے قافیہ پر

اس کا نام رام لال یا شام لال بھی تو رکھا جا سکتا تھا اور نہیں تو آج کل کے جدید شاعروں کی طرح اگر بحر۔ قافیہ اور ردیف کا قتلِ عام ہی منظور ہوتا تو اس کا نام لکشمی داس بھی رکھا جا سکتا تھا۔ لیکن لکشمی تو بنیے کے گھر کی داسی ہوتی ہے وہ اس کا داس کیسے بن سکتا تھا!

شومیِ قسمت سے اگر اس کا نام لکشمی داس ہو جاتا تو وہ لکشمی ہی کا داس بن کر رہ جاتا اور جو اس نے اپنی تحقیق کا دربار سجانے کے لئے اُردو کی ہزاروں نادر و نایاب کتابیں اور سیکڑوں مخطوطے حاصل کرنے کی خاطر دونوں ہاتھوں سے دولت لٹائی ہے وہ اس کے بینک اکاونٹ کی شوبھا بڑھا رہی ہوتی۔ اور وہ برلا، ٹاٹا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا رہا ہوتا۔

لیکن اس کے نصیب میں تو اُردو تحقیق و ادب کا برلا اور ٹاٹا بننا لکھا تھا۔ بہر کیف اس کی اِن "بے راہ رویوں اور عیاشیوں" کے باوجود لکشمی دیوی رسم وفا نبھائے چلی جا رہی ہے۔ اور اپنی آٹھوں مرمریں باہیں اس کے گلے میں حمائل کیے بیٹھی ہے!

گیان رضا سے میری پہلی ملاقات پندرہ بیس برس پہلے نیروبی میں ہوئی تھی۔ میں بھی لکشمی دیوی کے تعاقب میں اکثر نیروبی کے چکر کاٹتا رہتا تھا۔ لیکن جیسا کہ پہلے ذکر کر چکا ہوں میرے حصے میں بس دور کا جلوہ ہی آیا ــــــ!

بطور ایک شاعر گیان رضا سے میرا غائبانہ تعارف تو بہت پہلے سے تھا۔ لیکن نیروبی کے ان گنت پھیروں کے باوجود ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں بہت ہی کم آمیز شخص ہوں (شاید ہندوستان کے جغادری ادیبوں کے بھاری بھرکم تن و توش اور ناؤ نوش سے مرعوب ہونے کے باعث احساسِ کمتری کا شکار تھا یا پھر اپنی افتادِ طبع کا قصور تھا۔!) دوسرے میں شعر و شاعری کا آدمی بھی نہیں تھا کہ شعر کی نزاکت اور لطافت دل کے مقام کے نیچے نیچے اور سر کی سطح کے اوپر اوپر سے ہو کر گزر جاتی ہیں

آج سے پندرہ سولہ سال پیشتر جب نیروبی گیا تو رضا کے پہلے مجموعۂ کلام "شعلۂ خاموش" کی شہرت کا غلغلہ تھا، جو کہ لگ بھگ اسی زمانے میں نہایت

اہتمام اور ظاہری اور باطنی حسن و آرائش کے ساتھ مارکیٹ میں آچکا تھا۔ ہمارے ایک مشترکہ دوست چمن لال چمن کینیا براڈ کاسٹنگ سروس میں ایک اعلیٰ عہدے پر متمکن تھے۔ اُن سے یوں ہی سرسری طور پر رضا اور ان کی کتاب کا ذکر چھیڑا تو کہنے لگے دو ایک روز میں رضا سے ملاقات کرا دیں گے۔ چمن صاحب کو اپنا ایک "حساب" بھی چکانا تھا۔ یعنی کہ "شعلۂ خاموش" کی اشاعت کی خوشی میں رضا پر ایک "وہسکی پارٹی" واجب الادا تھی۔ لیکن بقول چمن، رضا پینے کے تو کیا، پلانے کے بھی روادار نہیں تھے۔ (غالباً اسی لئے شعر و شاعری کی محفلوں اور مشاعروں میں جانے سے گریز کرتے تھے) یعنی سراپا زاہد خشک اور شاعروں کی اصطلاح میں اول درجے کے بخیل!

اس زمانے میں میں رندِ بلانوش نہیں تو زاہدِ خشک بھی نہیں تھا۔ شاعر اور متشاعر دونوں کلاس کے دوستوں کی کمپنی میں کبھی کبھار دُخترِ رز سے فلرٹ کر لیا کرتا تھا۔ لیکن اس کی زہرناک کڑواہٹ کے باعث عشق "مجازی" کی حد تک نوبت نہیں آئی تھی۔ چنانچہ میرے لئے رضا سے ملاقات کے لئے سکاچ پارٹی کوئی خاص یا اضافی کشش کا باعث نہیں تھی۔

بہرحال ایک روز چمن کے وسیلے اور وساطت سے رضا سے ان کے گھر پر ملاقات ہو ہی گئی۔ رضا (میری طرح ــــ!) بہت ہی نستعلیق قسم کے انسان نکلے۔ (طبیعت میں بھی میری ہی طرح) تکبّر نام کو نہیں تھا ــــ دولت کا نہ علمیت کا ــــ (یہاں تھوڑی سی اپنی تعریف مقصود تھی ورنہ ایک پھکڑ کا تکبّر سے کیا واسطہ ــــ!) بلکہ رضا صاحب پہلی ملاقات میں "شعلۂ خاموش" ہی رہے یہاں تک کے اپنی "شورشِ پنہاں" کا بھی احساس نہ ہونے دیا۔

دراصل رضا صاحب میری ہی طرح (یہاں اپنی تعریف مقصود نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے) بہت ہی کم آمیز شخص ہیں۔ ایک ہی دو ملاقاتوں میں گھل مل نہیں جاتے۔ بلکہ اس کے لئے کچھ مشترکہ ذہنی رابطہ چاہتے ہیں۔ بہرحال دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا۔ اور دونوں کی ملاقات برابری کی سطح پر ہوئی جیسے فاتحِ اعظم سکندر کی اگست رشی سے ہوئی تھی ــــ!

میرا نیروبی آنا جانا تو لگا ہی رہتا تھا۔ ہر سفر پر ایک آدھ مرتبہ ان کے دولت کدے پر ملاقات ہو جاتی اور ہر مرتبہ ان کی اسکاچ ویل (Scotch well) مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوتا رہتا۔

پھر کرنا خدا کا کیا ہوا کہ میری ان روز روز کی مہمان نوازیوں سے تنگ آکر (میری گلی کے، سانجھ سویرے، مارے سو سو پھیرے!) رضا نے نیروبی سے ہجرت فرما جانے کا منصوبہ بنایا۔ اور اپنے اصلی وطن کا رُخ کیا۔ لیکن جس ڈر سے (یعنی میری روز روز کی مہمان نوازیوں سے بچنے کے لئے) انھوں نے ہجرت فرمائی تھی اس کا مداوا نہ ہو سکا۔ یعنی ملک بھر کی خاک چھاننے کے بعد آخر شامتِ اعمال سے قرعۂ انتخاب بمبئی کے نام پڑا کہ یہاں کاروباری دنیا کے شناوروں کے لئے کاروبار کا بحرِ بے کراں اپنی شوریدہ سری کے باعث ایک چیلنج کا درجہ رکھتا ہے۔ اور رضا صاحب بھی خطروں سے پنجہ لڑانے سے نہیں چوکتے۔ چنانچہ رضا صاحب سود و زیاں کی پروا کیے بغیر کود پڑے اس بحرِ ناپیدا کنار میں!—— اور ہمارے سمندِ شوق کو تازیانہ تو کیا مہمیز کی ضرورت بھی نہ پڑی۔ اور پھر وہی رضا کی گلی کے، سانجھ سویرے، سو سو پھیرے!

سالہا سال تک رضا صاحب کی ضیافتیں اڑانے کے بعد آخر ایک روز ہماری بھی غیرت اور حمیت نے جوش مارا۔ اور ہم نے بھی ایک روز ان کی دعوت کر ڈالی دراصل ہمارے تحت الشعور میں یہ جذبہ کروٹیں لے رہا تھا کہ ایک مرتبہ ہماری مہمان نوازی کا مزہ چکھ لیں گے تو ہمیشہ کے لئے عبرت پکڑ لیں گے۔ اور میرا اندازہ بھی یہی ہے کہ ہمارا تیر نشانے پر بیٹھا ہے۔ آگے کی بھگوان جانے کہ وہی سبھوں کے دلوں کے بھید جاننے والا ہے!—— (ترغیب دینے والا بھی تو وہی ہے!)

قصہ مختصر۔ نیروبی سے ہجرت کر کے رضا صاحب نے آخر بمبئی میں اپنا آسن جما لیا یہیں سے رضائی ہجرت کے (لحاف کے معنی والی رضائی نہیں۔) سنہ کا آغاز ہوتا ہے۔ اور یہیں سے اردو تحقیق و ادب کے جغادریوں کے ایوانوں میں زلزلے کے جھٹکوں کا آغاز بھی ہوتا ہے۔

بمبئی میں قدم جمانے کے بعد رضا نے یک لخت کانٹا بدلا اور اپنے ذوق کی گاڑی کو تحقیق کی پٹری پر چڑھا دیا۔ اور اس قدر تیز رفتاری سے دوڑایا کہ لگ بھگ دس

برس کے عرصہ میں بارہ چودہ تحقیقی کتابیں لکھ ماریں۔ ان کی اس رفتار کو دیکھ کر گمان گزرا کہ وہ بھی دوسرے دانش وروں کی طرح شہرت کی گاڑی کو بھاگ کر پکڑنے کے لئے آمادے ہو رہے ہیں۔

لیکن یکے بعد دیگرے میں نے جب یہ کتابیں پڑھیں تو احساس ہوا کہ فی الواقعی انھوں نے ان کی تخلیق میں بہت دقتِ نظر اور کدو کاوش سے کام لیا ہے۔

زرِ کثیر خرچ کر کے انھوں نے اپنا خود کا کتب خانہ تو بنایا ہی تھا اور اسے نادر اور نایاب کتابوں اور مخطوطوں سے بھی سجایا ہی تھا تاہم انھوں نے تحقیق کے لئے سچائی اور حق کی کھوج میں ملک بھر کی چھوٹی بڑی لائبریریوں کی خاک بھی خوب چھانی۔

کچھ ادیب، محقق، شاعر وغیرہ سستی شہرت کے حصول کی خاطر سنسنی پھیلانے کے لئے کوئی چونکا دینے والی چیز لکھ مارتے ہیں۔ رضا نے بھی اپنی تحریروں سے چونکایا تو ضرور مگر سستی شہرت حاصل کرنے کی خاطر سنسنی پھیلا کر نہیں بلکہ اپنی محنت۔ لگن اور ریاض سے تحقیق کی دنیا کو نئی نئی جہتوں سے روشناس کرا کر۔

سچائی کی جستجو میں نہ جانے انھوں نے اپنا کتنا خون سُکھایا ہوگا اور نہ جانے کتنی راتوں کی نیند حرام کی ہوگی۔

رضا نے غالباً سب سے پہلے اردو ادب کی دنیا کو اس وقت چونکایا جب کہ انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ مشہور مرثیہ گو شاعر چھنو لال دلگیرؔ نے تبدیل مذہب نہیں کیا تھا۔ نہ پہلے نہ پیچھے۔ وہ ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوا اور زندگی کے آخری لمحے تک ہندو ہی رہا۔ اس معاملے میں بڑے گھمسان کا رن پڑا تھا۔ مقابلہ ایک بڑے جغادری اور محترم ادیب کے ساتھ تھا اور وہ تھے جناب مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم۔

مسعود صاحب بہت بڑے عالم فاضل اور محقق ہی سہی لیکن ان میں ایک خامی بھی تھی کہ وہ تحقیق کی راہ چھوڑ کر اپنے ہیرو کی وکالت کرنے لگ جاتے تھے۔

اس بات کا ثبوت جناب ذکی کاکوروی اپنی کتاب "مطالعہ" (مطبوعہ: مرکزِ ادب اردو۔ لکھنؤ۔ اشاعت ۱۹۷۳ء) میں اپنے پہلے ہی مقالے "واجد علی شاہ اختر —— انسان مصنف اور شاعر —— (پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کے ایک مقالہ کا سرسری جائزہ) میں دیتے ہیں، لکھتے ہیں کہ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب صاحب نے واجد علی شاہ

جیسے عیاش اور رنگیلے بادشاہ کی وکالت کی خاطر۔
"مقالہ کا بیشتر مواد غیر مستند تاریخی ماخذ سے لیا۔ بیشتر حوالوں کے اقتباسات غلط سلط انداز میں نقل کیے..... ان کو موضوع سے صحیح واقفیت قطعی نہیں اور ان کی جملہ تاریخی تحقیق سطحی اور محدود ہے....." (صفحہ ۱۴۴)

طوالت کے ڈر سے میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا ورنہ ذکی صاحب نے جناب رضوی ادیب کی تحقیق واستدلال کا جس طرح تار و پود بکھیرا ہے وہ پڑھنے اور عبرت پکڑنے کی چیز ہے۔

جناب رضوی ادیب صاحب نے اسی طرح کے غیر مستند اور غیر ذمے دار محققوں کے حوالوں کے غلط سلط اور گمراہ کن اقتباسات سے چھنو لال دلگیرؔ کے موضوع کی بھی آرائش فرمائی تھی۔

اس کے جواب میں رضا صاحب نے انتہائی مستند حوالوں اور ٹھوس دلائل سے جو تردید کی تھی اردو کے دانشوروں نے عموماً اس کی سراہنا کی تھی۔

ڈاکٹر صفدر آہ مرحوم نے بھی اپنی تحقیق کی روشنی میں رضا صاحب کے موقف کی حمایت میں لکھا تھا۔ اس کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مسعود صاحب GRACE FULLY اپنے غلط موقف سے دستکش ہو جاتے لیکن انھوں نے صفدر آہ کو ایک نہایت ہی قہر آلود خط رقم فرمایا جس کا مضمون کچھ اس طرح کا تھا کہ "کل کے لونڈے کی حمایت میں آپ میری چالیس برس کی دوستی پر خاک ڈال رہے ہیں۔" وغیرہ وغیرہ (یہ خط ڈاکٹر صاحب نے پہلے مجھے دکھایا تھا بعد میں رضا صاحب کو۔ اور رضوی صاحب کی اس بات کو ناپسند کیا تھا۔)

ایک مسلمان میں عموماً ایک خوبی یہ دیکھنے میں آتی ہے کہ وہ جب کسی شخص سے دوستی محبت اور چاہت کا رشتہ قائم کرتا ہے (چاہے وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو) تو وہ اس سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہے۔ اور اس کی خاطر اپنا نفع نقصان، آگا پیچھا سوچے بغیر اپنی جان تک قربان کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ دوسری طرف ایک خامی یا کمزوری بھی ہوتی ہے کہ جب وہ کسی غیر مسلم کی خوبیوں، علمیت اور/ یا رفعتوں سے بے حد متاثر ہوتا ہے تو سوچتا ہے کہ کاش وہ مسلمان ہوتا۔

چنانچہ جب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی منشی پریم چند کی کہانی۔ ناولوں اور مضامین سے بے حد متاثر ہوئے (خاص کران کے ناول چوگانِ ہستی سے) تو انھوں نے آخر پریم چند سے کہہ ہی دیا

"جب ان کا ناول چوگانِ ہستی نکلا تو میں نے خوش ہو کران سے کہا کہ اس کا مصنف مسلمان کیوں نہیں ہو جاتا۔ تو اس پر ہنسا کیے اور بولے تو یہ بولے کہ "کیا ہندو کیا مسلمان سب ایک ہی ہیں"۔ (معاصرین۔ بار اول۔ ۱۹۷۹ء ص ۱۶۹-۱۷۰)

قارئین کی دل چسپی کے لیے یہاں مولانا دریابادی کا ایک اور واقعہ بھی بیان کرنا چاہتا ہوں اگرچہ زیرِ تحریر موضوع سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

مولانا دریابادی پورے سترہ سال تک ملحد رہے تھے۔ مذہب سے انھیں خدا واسطے کا بیر ہو گیا تھا۔ لیکن مشہور ہندو عالم اور مفکر لالہ بھگوان داس کی مذہب اور فلسفۂ مذہب کے بارے میں تحریر کردہ کتابیں پڑھ کر دوبارہ "مشرف بہ اسلام" ہوئے تھے۔ اس حد تک کہ پریم چند کو اپنے ایک خط میں فخر سے لکھتے ہیں کہ میں اسلام کے بارے میں انتہائی FANATIC ہوں۔

مولانا صاحب نے "معاصرین" ہی میں بھگوان داس جی کے بارے میں "رشی بھگوان داس" کے عنوان کے تحت ایک بہت ہی پیارا اور عمدہ مقالہ تحریر فرمایا ہے۔ (ص - ۵۲ - ۵۴)

ہندو بھگوان داس جی کا ذکر کرتے وقت عموماً لالہ بھگوان داس یا بابو بھگوان داس ہی لکھتے ہیں لیکن مولانا صاحب انھیں "رشی بھگوان داس" کہتے ہیں۔ اس مقالے کی آخری سطریں نذرِ قارئین ہیں

"دورِ الحاد میں اگر بھگوان داس سے نہ مل لیا ہوتا تو میں خدا معلوم افکار کی کن پستیوں تک جا پہنچتا۔ ہندوؤں کی مشہور دینی کتاب بھگوت گیتا کا انگریزی ترجمہ انھیں کا کیا ہوا دیکھا تھا اور اچھا خاصا نفع اس سے حاصل کیا۔ حکمت مطلقہ کن کن لوگوں کو کن کن موقعوں پر اور کن کن صورتوں سے ذریعہ اور واسطہ ہدایت و رہنمائی کا بناتی رہتی ہے!"

مولانا دریابادی کی روایت کی ہوئی پریم چند کی بات "کہ کیا ہندو کیا مسلمان سب ایک ہی ہیں" ایک سچے محقق پر عین صادق آتی ہے، اور رضا بھی اس پر پورے اترتے ہیں۔ تحقیق میں صحیح نتائج پر پہنچنے کے لیے رضا نے کبھی عقیدت یا جذباتیت کا دامن نہیں تھاما۔

سچ تو یہ ہے کہ ایک سچے محقق کے لیے قلم کے علاوہ جن چند TOOLS OF TRADE کی ضرورت ہے وہ یہ ہیں:-

(۱) لگن اور ریاض۔ (۲) حزم و احتیاط۔ (۳) غیر جانبداری۔ (۴) حافظہ۔ (۵) اور صحیح فیصلے پر پہنچنے کی صلاحیت۔

میں ان سب باتوں کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ بہر حال اتنا کہنا چاہوں گا کہ میں نے منشی پریم چند کی تحقیق کے سلسلے میں بہت سے اردو اور ہندی کے محققوں کی کتابوں کا مطالعہ کیا تو معلوم پڑا کہ ان کی بیان کی گئی بہت سی تفصیلات میں کئی جگہوں پر نہ صرف تضاد تھا بلکہ بہت سے غلط نتائج بھی اخذ کئے گئے تھے۔ اور پریم چند کے فن و ادب پر جو فیصلے نافذ کئے گئے تھے وہ حقائق کی روشنی میں نہیں بلکہ جذباتیت کے تحت کئے گئے تھے۔ اس گمراہ کن تحقیق کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پریم چند پر تحقیق کرنے والے مستقبل کے اسکالر ہمیشہ غلط سلط نتیجوں پر پہنچتے رہیں گے۔

سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ آج کے اکثر محققین میں ریاض اور لگن کا فقدان ہے۔ "کاتا اور لے دوڑی" کا دور دورہ ہے۔

لیکن رضا کی کتابوں کے مطالعے سے اسی نتیجے پر پہنچنا پڑتا ہے کہ انھوں نے ایک ایک سطر پر بہت ہی دقّتِ نظر سے کام لیا ہے۔ تحقیق کے حوالوں کے لیے خود نایاب و نادر کتابیں اور مخطوطے بیش بہا قیمت پر حاصل کیے۔ اگر چہ یہ ہر ایک کے بس کا کام نہیں ہے۔ لیکن ریسرچ لائبریریوں کے دروازے تو ہر کسی کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔

رضا نے نہ صرف اپنی کتابوں اور مخطوطوں کے سرمایے سے استفادہ حاصل کیا بلکہ ملک بھر کی ریسرچ لائبریریوں کی بھی خاک چھانی ہے۔ نتیجہ سامنے ہے کہ آج بڑے سے بڑا محقق بھی ان کی تحقیق پر حرف زنی کرنے سے پہلے نتائج کو بار بار پرکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔

تحقیق بہت دقت طلب صنف ہے۔ افسانہ اور ناول کی بات تو خیر چھوڑ دیجیے۔ اگر آپ کو شاعری پر تحقیق و تنقید کرنا ہے تو اس کے لیے آپ کو فن قافیہ و عروض اور زبان و بیان کی باریکیوں اور نزاکتوں سے کما حقہ، واقفیت کی ضرورت ہے۔ ہمارے کتنے محقق و نقاد ایسے ہیں جنھیں ان سب باتوں کا کافی وشافی علم ہے؟

اگر چہ رضا اس معاملے میں خوش قسمت ہیں کہ انھیں جوش ملسیانی جیسے عظیم شاعر اور زبان داں کی شاگردی کا فخر حاصل ہے۔ لیکن جوش صاحب کے تو سینکڑوں شاگرد تھے۔ وہ کیوں رضا کے درجے تک نہیں پہنچ پائے؟ —— اس مقام پر پہنچنے کے لیے رضا کو خون پسینہ ایک کرنا پڑا۔ راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کرنا پڑا۔ اور یقیناً اپنے کاروبار کا بھی کافی حرج کیا ہوگا۔

غالب پر تحقیق کی سینکڑوں کتابیں موجود ہیں۔ اگر کوئی چاہے تو صرف ایک درجن کتابوں کی مدد سے محض پندرہ روز میں مربوط و مبسوط تحقیق کی کتاب مرتب کر سکتا ہے۔ لیکن رضا نے غالب پر قلم اٹھایا تو وہاں سے شروع کیا جہاں دوسرے لوگ اپنا موضوع ختم کر چکے تھے۔ اور ان کے پاس غالب پر کہنے کے لیے کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ لیکن رضا نے غالب پر اپنی تحقیق سے ثابت کر دیا کہ ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ مشکل بس یہی ہے کہ آج کی نسل میں اس کے لئے خلوص، دقت نظر اور علم و ریاض کا فقدان ہے۔

اسی طرح رضا نے انتہائی جانسوزی اور ریاضت سے چکبست پر تحقیق کر کے اردو ادب کے سرمایے میں چار کتابوں کا اضافہ کیا ہے۔ چکبست کا نام سبھی جانتے پہچانتے ہیں اور حسب ضرورت اس کا تذکرہ بھی کر دیا جاتا ہے۔ کبھی کبھار چھوٹا موٹا مضمون بھی لکھ دیا جاتا ہے۔ لیکن اس نے ادب، تنقید، شاعری اور صحافت کے میدان میں اردو کی جو خدمات کی ہیں وہ سارا سرمایہ جہاں تہاں بکھرا پڑا تھا۔ اس کو مربوط و مبسوط صورت میں پیش کرنے کی آج تک کسی نے ضرورت ہی نہ سمجھی۔ لیکن رضا نے بجانے کن کن کاوشوں اور جگر کاویوں سے اس کی زیادہ سے زیادہ تخلیقات کو نہ صرف ایک جا کر کے اردو ادب کے ایک بیش بہا سرمایے کو ضائع ہونے سے بچا لیا ہے، بلکہ اپنی ان کتابوں پر عالمانہ مقدمے لکھ کر چکبست کے کام کو چار چاند بھی لگا ئے ہیں۔

رضا نے ان سارے کاموں کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلے۔ اور کس قدر جانفشانی اور جانسوزی سے کام لیا ہے وہ ان کا دل ہی جانتا ہے۔ انھوں نے نہ صرف کتابیں ہی جمع کیں بلکہ ان کی مدد سے قدیم و جدید شعری و نثری ادب اور عہد بہ عہد کے فن، روایت، کتابت، تاریخ، علم قافیہ و عروض کا دوسری زبانوں کے علم و ادب کو سامنے رکھ کر گہرا مطالعہ بھی کیا ہے۔ اور اپنے حافظے لگن اور ریاضت کی مدد سے ان سب علموں کو اپنے ذہن میں جذب کر کے اردو ادب کو نئی نئی جہتوں سے روشناس کرایا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اب اردو ادب کے خود ساختہ "دانشور" ان کی ان خدمات کو سراہنے اور ان کا اعتراف کرنے لگے ہیں۔ حالانکہ "منوایا گیا ہوں" کے مصداق انھیں اپنا وجود منوانے کے لیے سخت کاوش کرنی پڑی ہے۔ لیکن انھوں نے یہ کاوش ادبی مجلسوں، سیمناروں، اپنی کتابوں کی اپنے ہی خرچے پر نقاب کشائی پر صرف نہیں کی بلکہ ان ساری خرافات سے وقت بچا کر مطالعہ اور تحقیق میں صرف

کی۔

قصہ مختصر ایک بنیے کے قلم نے راجپوت کی تلوار کی طرح ہر خاص و عام سے اپنا لوہا منوالیا ہے۔

اب جہاں رضا کے کام کو کئی طرح سے سراہا جا رہا ہے وہاں دنیا کے دستور کے مطابق ان کے کچھ حاسد بھی پیدا ہو گئے ہیں۔ حاسد وہی شخص بنتا ہے جو خود تو کچھ کر نہ سکے یا اگر تھوڑا بہت اوٹ پٹانگ کام کر تو لے لیکن خواہ مخواہ میں اپنی اہلیت و قابلیت کے مقابلے میں ضرورت سے زیادہ امیدیں باندھ بیٹھے۔ آخر کار ایسا محقق صلہ و ستائش کی نعمتوں سے محروم رہتا ہے۔ نتیجے میں اس کی ساری اہلیت دوسروں کی ٹانگ گھسیٹنے تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔

اسی پایہ کا ایک "عظیم" معلم، محقق اور مقرر دو ایک سال پہلے دہلی سے ایک سیمینار یا کانفرنس کے سلسلے میں پاکستان گیا تھا اور وہاں یہ "انکشاف" فرمایا تھا کہ کالی داس گپتا رضا کی ساری ریاضت سید جمیل الدین مرحوم کی تحقیق کے مسودوں کی مرہونِ منت ہے۔ یہ صاحب اس قدر کائیاں نکلے کہ انھوں نے یہ "انکشاف" پاکستان میں جا کر کیا تاکہ یہ ہر قسم کی گزند سے محفوظ رہیں۔

ان حضرت کی اخلاقی اور ذہنی پستی بلکہ دیوالیہ پن کا کچا چٹھا ان ہی کے ایک پاکستانی پروفیسر دوست نے رضا کے نام اپنے ایک خط میں تفصیل سے بیان کر دیا تھا۔ چنانچہ سند کے طور پر جب یہ خط دہلی کے ایک موقر جریدے میں شائع ہوا تو ادبی حلقوں میں تہلکہ مچ گیا۔ اور یہ حضرت آج تک اس داغ کو پیشانی پر چپکائے ہوئے منہ چھپائے پھرتے ہیں۔

اگر چہ رضا صاحب کو ان کی کاوشوں کے سلسلے میں اردو کی کئی اکاڈمیوں نے انعام و اکرام سے نواز کر ان کی محنت کی داد دی ہے لیکن رضا صاحب کو ان کی محنت، عرق ریزی، ریاضت اور لگن کا سب سے بڑا انعام ایک تہی دست، فقیر منش اور درویش صفت ادیب ظفر ادیب نے دیا ہے۔ گو زمانے نے ظفر ادیب کو بھلا سا دیا ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ خود ایک صاحب طرز شاعر، ادیب اور ناقد ہیں ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ ادب کے چسکے نے ان کی ساری جائز جائداد بکوا دی لیکن انھوں نے آج تک کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا حتیٰ کہ اصلی یا فرضی بیماریوں کا بہانہ بنا کر اردو کی انجمنوں اکاڈمیوں اور صاحب ثروت لوگوں کے آگے جھولی بھی نہیں پھیلائی۔

ظفر صاحب سے بہت عرصہ پہلے میری دو ایک مختصر سی ملاقاتیں بھی ہوئی تھیں۔ وہ آج کل (جب صحت اجازت دے) ٹیوشنیں کر کے اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ پال رہے ہیں۔

اردو ادب کی تاریخ میں ایسا تو نگر فقیر میں نے آج تک دیکھا ہے نہ سنا ہے!

رضا صاحب کو اس تو نگر فقیر نے کیا انعام دیا؟

ظفر صاحب نے رضا کے شعری مجموعوں اور تحقیق کی کتابوں سے متاثر ہو کر ایک طویل و مبسوط مقالہ لکھا جو ایک ضخیم کتاب کی طباعت کا متقاضی تھا۔

مقالہ لکھ کر انھوں نے رضا صاحب کے پاس ارسال کر دیا کہ جہاں وہ اپنی کتب کے نشر و اشاعت کے اپنے ادارے سے اپنی کتب شائع کرتے ہیں وہاں سے یہ کتاب بھی شائع کر دی جائے۔ ظفر صاحب کے اپنے کچھ وسائل تو تھے نہیں کہ وہ خود ہی زر کثیر خرچ کر کے اسے چھاپ دیتے یا چھپوا لیتے۔

رضا صاحب نے یہ مقالہ جو ایک فائل میں منسلک تھا۔ لگ بھگ ایک سال تک اپنی میز پر رکھ چھوڑا۔ اس پر مٹی کی دبیز تہہ اس لیے نہیں جم پائی تھی کہ ان کا ملازم ہر روز ان کے دفتر اور میز کرسیوں کی صفائی کرتا رہتا ہے۔

میں جب کبھی ان کے دفتر جاتا اس فائل پر ضرور نگاہ پڑ جاتی۔ اس کا عنوان اور ظفر ادیب کا نام پڑھتا۔ لیکن اس سلسلے میں نہ کبھی انھوں نے ذکر کیا اور نہ میں نے پوچھا۔

آخر ایک روز میرے تجسس نے زور پکڑا اور میں نے اس فائل کے بارے میں استفسار کیا تو پتہ چلا کہ ظفر ادیب صاحب نے رضا صاحب پر ایک طویل اور جامع مقالہ لکھا ہے جس کا عنوان تھا

"کالی داس گپتا رضا تحقیق و تالیف اور شاعری کی روشنی میں۔"

مفصل بات چیت سے معلوم ہوا کہ جناب ظفر ادیب صاحب نے یہ مقالہ شائع کرانے کے لیے ارسال کیا تھا اور کئی ماہ سے یاد دہانی پر یاد دہانی کرا رہے ہیں اور اس کی اشاعت پر مصر ہیں۔ لیکن چونکہ مقالہ خود رضا صاحب کی ذات اور کام پر تھا اس لیے وہ کسر نفسی کے باعث اسے چھپوانے کے لیے تیار نہیں ہو پا رہے تھے۔

میں نے یہ فائل پڑھنے کے لیے طلب کر لی۔ ہفتہ عشرہ کے اندر اندر یہ مقالہ ختم کر کے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کا نہ چھپوانا ظفر ادیب صاحب کی محنت اور کاوش کے ساتھ ناانصافی ہی نہیں بلکہ بہت بڑا ظلم ہوگا۔

چنانچہ میں نے اجازت طلب کر کے اس مقالے کو اپنے خرچ پر شائع کرایا۔ منفعت کا تو سوال ہی نہیں تھا اور میں گھاٹے میں بھی نہیں رہا۔

لیکن ایک فائدہ یہ ہوا کہ ایک بہت ہی اچھی نیک سیرت اور پیاری بزرگ شخصیت کی محنت ٹھکانے لگی اور ان کی خواہش کا احترام ہونے کے ساتھ ساتھ کالی داس گپتا رضا جیسے دقت طلب محقق، شاعر اور ادیب کے فن و شخصیت پر ایک اعلیٰ پایے کی یادگار بھی قائم ہو گئی۔ اب تو خیر سے رضا صاحب کے کارناموں پر جناب راہی قریشی کو ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری بھی مل چکی ہے اور سنا ہے کہ وہ ضخیم مقالہ بھی جلد چھپ کر منظر عام پر آرہا ہے۔ پرماتما رضا صاحب کو اور مراتب سے بھی سرفراز کرے۔

: جذبۂ انسانیت ہی کشتی
پار لگا سکتا ہے

ڈاکٹر
حمیرہ خاتون

رضا

پٹنہ میں

۱۹/مارچ ۱۹۷۹ء کی صبح کو، جب میں جناب قاضی عبدالودود کے یہاں پہنچی تو وہ معمول سے زیادہ خوش نظر آرہے تھے میں سمجھ گئی کوئی خاص بات ضرور ہے کچھ وقفے کے بعد قاضی صاحب خود ہی بولے۔

آج کالی داس گپتا رضاؔ آرہے ہیں۔ ساتھ میں ان کی بیوی ساوتری بھی ہیں۔

کیا بمبئی سے وہ لوگ آرہے ہیں میں نے پوچھا

نہیں الہ آباد سے۔ قاضی صاحب نے جواب دیا پھر ایک دم سنجیدہ ہو گئے اور کہا عجیب مشکل ہے ہمارے یہاں رضاؔ صاحب کو کوئی پہچانتا بھی نہیں ہے۔ گاڑی تو ان لوگوں کو لانے اسٹیشن جارہی ہے لیکن اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ ان لوگوں کو Receive کس طرح کیا جائے۔

کیا یہاں رضا صاحب کو کوئی بھی نہیں پہچانتا؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔ میرے علم میں صرف ایک شخص ہیں وہ ہیں اسرار جامعی۔

لیکن اب تک وہ بھی یہاں نہیں آئے ہیں میں نے انھیں بلا تو بھیجا ہے پھر قاضی صاحب نے کچھ سوچا اور سنبھل کر بیٹھ گئے پاس ہی میز پر کچھ کتابیں رکھی ہوئی تھیں ان میں رضا صاحب کی کچھ کتابیں تھیں۔ قاضی صاحب نے ایک کتاب مجھ سے مانگی شاید "شعلۂ خاموش"۔ اس کا صفحہ پلٹ کر رضا صاحب کی فوٹو کو خود بغور دیکھا پھر مجھے وہ تصویر دکھائی اور کہا ان کا چہرہ کافی بھرا بھرا سا پر گوشت ہے اگر تم اسٹیشن چلی جاؤ تو کیا انھیں پہچان لوگی؟

ضرور۔ میں نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔ اچانک کسی کے پاؤں کی چاپ محسوس ہوئی پلٹ کر دیکھتی ہوں تو جناب اسرار جامعی تھے۔ قاضی صاحب کے چہرے پر خوشی اور سکون کی لہر دوڑ گئی وہ ان سے مخاطب ہو کر کچھ ضروری ہدایتیں دینے لگے اور پھر میری طرف

متوجہ ہوئے۔

رضا صاحب قیام کہاں کریں گے ؟ میں نے قاضی صاحب سے پوچھا۔ کسی اچھے ہوٹل میں۔ انہوں نے جواب دیا۔ پھر کہا کہ میں انھیں اپنے گھر ٹھہراتا لیکن اس وقت قاعدے کا کوئی گیسٹ روم نہیں ہے انھیں تکلیف ہو جائے گی۔

جناب کالی داس گپتا رضا صاحب کی شخصیت کوئی ڈھکی چھپی نہیں۔ ان کے مضامین کچھ کتابیں اور قاضی صاحب کے نام خطوط میری نظر سے گذر چکے تھے۔ قاضی صاحب اکثر باتوں باتوں میں ان کا ذکر بھی کرتے رہتے تھے کہ کس طرح ایک مدت تک مشرقی افریقہ میں رہے اور کاروبار کرتے رہے ان کی شخصیت تجارتی کاروبار میں بھی گم ہے۔ افریقہ میں اپنے ارد گرد جو کچھ دیکھا اسے بھی کتابی شکل (ہندستانی مشرقی افریقہ میں) پیش کر دیا لیکن اردو سے انھیں غیر معمولی لگاؤ ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ رضا صاحب اردو ماحول سے بہت دور ہوتے ہوئے بھی اپنے فن کو اجاگر کر رہے تھے انھیں اپنے ملک کے تازہ بہ تازہ رجحانات کے ساتھ چلنے کا موقع نہ ملا۔ سچ تو یہ ہے کہ ایک فن کار کو صحیح ماحول نہ ملنا اس کے لئے گھٹن کا باعث ہے۔ بہر حال رضا صاحب کا ذوق شاعری زندہ رہا اردو سے ان کی گہری وابستگی اور الفت ان کے اشعار میں محسوس کی جاسکتی ہے۔

افریقہ سے ہندستان آنے کے بعد رضا صاحب کا تحقیقی رجحان اجاگر ہوا ان کے تحقیقی مضامین کی تعداد بھی خاصی ہے۔ ایک دن قاضی صاحب انھیں خط لکھ رہے تھے اتفاق سے میں اسی وقت ان کی خدمت میں حاضر ہوئی انہوں نے فرمایا کہ میں نے اپنے خط میں رضا صاحب سے پوچھا ہے کہ آپ کو تحقیق کا چسکا کیسے لگ گیا؟

جو لوگ تحقیق سے اپنا ربط ظاہر کرتے ہیں قاضی صاحب سب سے پہلے ان کا مزاج پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں یعنی ایسے لوگ مزاج محققانہ رکھتے ہیں یا نہیں کیوں کہ کسی پکی شہادت کے بغیر وہ خود بھی کسی بات کو نہیں مانتے ہیں ان کے لئے ہر لفظ خواہ تقریر میں ہو یا تحریر میں قابل توجہ اور اہم ہے۔ صداقت اور حقیقت سے بیان کا رشتہ، دلیل اور دعویٰ کی ہم آہنگی، جملوں میں لفظوں اور عبارت میں جملوں کا باہمی ربط یہ سب ایسے امور ہیں جن کی قاضی صاحب کے نزدیک بنیادی اہمیت ہے۔ وہ بات کا مفہوم وہی لیتے ہیں جو الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے ان کا خیال ہے کہ ایک محقق کے لئے تحقیق اور ذاتی تعلقات میں کوئی مناسبت نہیں۔

جو شخص تحقیق میں خیال خاطر احباب کا لحاظ رکھتا ہے اس کے مزاج کو تحقیق سے مناسبت نہیں۔

رضا صاحب ہوٹل ستکار پہونچنے کے بعد ملاقات کی غرض سے فوراً قاضی صاحب کی رہائش گاہ محلہ (بھنور پوکھر) تشریف لائے۔ ساتھ ہی مسز ساوتری گپتا رضا بھی تھیں۔ اور جناب اسرار جامعی گویا راہ نمائی کر رہے تھے۔

قاضی صاحب بھی سراپا انتظار اپنے ڈرائنگ روم میں موجود تھے ان کی طویل علالت نے انھیں خاصا کمزور کر دیا ہے لیکن مہمان نوازی کا بے پناہ جذبہ وہ رکھتے ہیں۔ کوئی مہمان آنے والا ہو یا گھر میں موجود ہو تو باورچی اور نوکر کو ضروری ہدایتیں دیتے رہتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح کی تکلیف مہمان محسوس نہ کرے۔ وہ مجسم اخلاق ہیں اور فطری طور پر مہمان نواز۔ ملک کے مشہور ادیبوں محققوں سے ان کے گھر پر ملاقات ہوتی ہے وہ بہت ہی خندہ پیشانی سے باہر کے آئے ہوئے ادیبوں، اور اسی طرح کے دوسرے لوگوں کو اپنے گھر ٹھہراتے ہیں چنانچہ رضا صاحب کے انتظار میں وہ اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے بہت خوش نظر آرہے تھے اور بیچ بیچ میں ان کے تحقیقی کام کی تعریف کیے جا رہے تھے۔

رضا صاحب آئے۔ قاضی صاحب کمزوری کے باوجود ان کے استقبال کے لئے مسکراتے ہوئے کھڑے ہوئے۔ رضا صاحب بصد احترام ان سے ملے مصافحہ کیا اور ان کے بائیں جانب بیٹھ گئے۔ میں اور مسز ساوتری رضا دوسرے صوفہ پر۔ اسرار جامعی اور جناب قاضی مسعود (قاضی صاحب کے صاحبزادے) ایک طرف۔

باتیں ہونے لگیں۔ رضا صاحب سے بچوں کی خیریت اور سفر کے حالات پوچھنے کے بعد قاضی صاحب ایک دم سے اپنے تحقیقی میدان میں اتر گئے۔ ایک عمر کی تحقیق سے حاصل کردہ معلومات کو نہایت سادگی اور اختصار کے ساتھ بیان کرنے لگے۔

موضوع گفت گو غالب تھے۔ اور ان کے فرضی استاد عبدالصمد۔ انھوں نے کہا کہ غالب کے سوا دنیا کے کسی شخص کو عبدالصمد سے واقفیت نہیں ہے۔ مجھے قاضی صاحب کا ایک مقالہ "غالب کا ایک فرضی استاد" یاد آگیا جس میں تقریباً انیس دلائل پیش کر کے انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ عبدالصمد (بطور غالب کے استاد) کا کوئی وجود ہی نہ تھا یہ مقالہ شاید علی گڑھ میگزین غالب نمبر میں شائع ہوا تھا۔

انھوں نے غالب کی عربی سے ناواقفیت کی بھی مثالیں دیں اور پھر ایک دم سے مولانا حالی کا ذکر چھیڑ دیا۔

حالی نے غالب کے جھوٹ کی حمایت کی انھوں نے غالب کو سچا آدمی قرار دیا اور بتایا کہ اپنے استاد عبدالصمد کے بارے میں جو کچھ کہا صحیح ہے اور ایک طرف یہ بھی کہا کہ مرزا کی زبانی یہ سنا گیا ہے کہ "چونکہ لوگ مجھ کو بے استادا کہتے تھے اس لئے میں نے ان کا منھ بند کرنے کے لئے ایک فرضی استاد گھڑ لیا

اس کے باوجود وہ اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ عبدالصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد تھے" قاضی صاحب کا لہجہ تھوڑا گرم ہو گیا۔

اس زمانے میں حالی "یادگار غالب" سے بہتر کتاب لکھ سکتے تھے چوں کہ ان کے پاس ذرائع تھے اطلاعات تھے" قاضی صاحب پھر دھیمے لہجہ میں بات کرنے لگے۔

قاضی صاحب "خیات سعدی" کا بھی ذکر کرنے لگے انہوں نے کہا کہ اس میں بھی حالی نے سعدی کی کذب بیانی کو نظر انداز کیا ہے۔

رضا صاحب خاموش بیٹھے ہمہ تن گوش قاضی صاحب کی گفتگو سن رہے تھے آخر انھوں نے اپنی خاموشی توڑی اور قاضی صاحب سے اس نکتہ پر اتفاق کیا اور کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاں جہاں غالب نے جھوٹ بولا ہے حالی نے اس کی پردہ پوشی کی کوشش کی ہے یا اس جھوٹ میں اضافہ کر دیا ہے۔ پھر بھی حالی کے بیانات یکسر غلط نہیں ہو سکتے۔ کہیں کوئی سچائی بھی ضرور ہے۔

رضا صاحب اپنا جملہ ختم کر کے ایک دم سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مجھے کچھ تعجب سا ہوا۔ لیکن قاضی صاحب نے زبردستی انھیں اسی جگہ بٹھا دیا اور شاید یہ کہا کہ "آپ میرے عزیز اور پیر و ہیں۔ یہیں بیٹھے رہیئے، کوئی مضائقہ نہیں۔ وجہ میری سمجھ میں آگئی۔ بات یہ تھی کہ قاضی صاحب اپنے مہمانوں کو ہمیشہ اپنے دائیں طرف بٹھاتے تھے اس دن معمول میں فرق آگیا تھا۔ اور رضا صاحب نے بائیں طرف کی نشست سنبھال لی تھی پھر نہ جانے انھیں کس طرح پتہ چل گیا جو اٹھ کھڑے ہوئے۔

ٹرے میں ناشتہ پھل مٹھائیاں سج سجا کر نوکر سامنے سے نمودار ہوا۔ ہم لوگ ناشتہ سے لطف لینے لگے۔ اور قاضی صاحب صرف ایک کپ سادی چائے سے۔

رضا صاحب نے باتوں باتوں میں قاضی صاحب سے ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے بارے میں بتایا تھا کہ ایک بار انہوں نے سوال کیا کہ آپ کس کو بڑا شاعر مانتے ہیں غالبؔ یا اقبالؔ کو رضا صاحب نے غالبؔ کو ترجیح دی تھی۔ اسے قاضی صاحب نے قبول کیا۔

رضا صاحب نے ایک اطلاع قاضی صاحب کو یہ دی کہ اقبال کی کتاب "بانگِ درا" کا وہ نسخہ جو انہوں نے اپنے استاد تھامس آرنلڈ کو پیش کیا تھا وہ جلد ہی ان کے کتب خانہ میں داخل ہونے والا ہے اور رضا صاحب کے حالیہ خط سے معلوم ہوا کہ وہ تاریخی نسخہ ۱۷/ اپریل ۱۹۷۹ء کو ان کی لائبریری کی زینت بن گیا۔

رضا صاحب کی لائبریری اس وقت ہندستان میں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ اس نادر کتب خانہ کی نشو و نما پر رضا صاحب نے اپنا خاصہ سرمایہ صرف کیا ہے وہ اہلِ علم حضرات جنہوں نے ان کے کتب خانہ کی سیر کی ہے اس کی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔ تذکروں، لغات، دواوین اور قدیم رسالوں کے نادر ذخیروں کے علاوہ نادر مخطوطات بھی خاصی تعداد میں ہیں۔ بقول ڈاکٹر گیان چند جین "دنیا میں آپ ہی کا کتب خانہ ایسا ہے جس میں غالبؔ کی زندگی میں شائع شدہ دیوان کے پانچوں ایڈیشن موجود ہیں"۔ [۱]

قاضی صاحب گفت گو میں رکتے نہیں ہیں تھکتے بھی نہیں۔ موضوع بدلتے ہوئے گھنٹوں باتیں کرتے ہیں چنانچہ وہ باتیں کرتے ہی جا رہے تھے کہ رضا صاحب نے گفت گو کو ایک موڑ دیا اور منشی چھنو لال دلگیر کے بارے میں ذکر چھیڑ دیا۔ دلگیرؔ کو بحیثیت مرثیہ گو شہرت ملی تھی۔ لیکن بات ان کے مذہب کی تبدیلی کے بارے میں ہو رہی تھی۔ اس لئے کہ ایک زمانہ میں جناب مسعود حسن رضوی ادیب اور ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری اس بات پر مصر تھے کہ دلگیرؔ مسلمان ہو گئے تھے۔ اس بحث میں ایک طرف رضا صاحب تھے جو اس واقعہ کو قبول کرنے کو تیار نہ تھے لیکن ان دونوں اصحاب نے دعوے کئے تھے اور قاضی صاحب کا حوالہ بھی دیا تھا کہ وہ اس تبدیلیِ مذہب کو مانتے ہیں۔

چنانچہ رضا صاحب نے قاضی صاحب سے اس کی وضاحت چاہی تو انہوں نے اس سے انکار کیا۔

۱۔ متعلقات غالب ص ۹

رضا صاحب نے پھر ایک نو دریافت مخطوطہ اصل اور فوٹو اسٹیٹ کاپی بھی انھیں دکھائی۔
قاضی صاحب نے بہ نظر غائر اس کا مطالعہ کیا آخیر میں ترقیمہ پڑھا پھر اس کے نیچے اپنے قلم سے ریمارکس لکھنے لگے۔ مجھے اشتیاق ہوا آخر کیا لکھا جا رہا ہے اس لئے کہ قاضی صاحب کے ریمارکس لکھنے کے بعد رضا صاحب مطمئن نظر آرہے تھے۔ میں نے جھک کر پڑھنے کی کوشش کی۔

قاضی صاحب نے لکھا تھا۔

"میں نے قطعہ (مخطوطہ) دیکھا اس خیال کو تقویت ہوتی ہے کہ دلگیر آخر تک ہندو ہی رہے۔" قاضی عبدالودود ۱۹ مارچ ۱۹۷۹ء"

رضا صاحب نے ایک بیاض بھی قاضی صاحب کی خدمت میں پیش کی "بیاضِ جمیل" یہ بیاض رضا صاحب کے دوست سید جمیل الدین بغدادی کی تھی جن کے بارے میں رضا صاحب نے فرمایا کہ مرحوم ماہرین غالبیات سے کچھ نہ کچھ لکھوا کر ان کے دستخط لے لیا کرتے تھے اور رضا صاحب ہی نے اس کا نام "بیاضِ جمیل" رکھ دیا تھا۔ انہوں نے قاضی صاحب سے بصد احترام یہ خواہش ظاہر کی کہ اس بیاض پر وہ بھی کچھ تحریر فرما دیں۔ قاضی صاحب نے اپنے مزاج کے مطابق ایک ندرت پیدا کی اور عنوان لکھا "غالب کے وہ اشعار جو مجھے پسند نہیں"۔ رضا صاحب مسکرانے لگے کیوں کہ اس میں کچھ اشعار ایسے بھی تھے جو پسند کئے جاتے تھے۔ اور پھر رضا صاحب ہنستے ہوئے بولے

ان اشعار میں جنہیں آپ پسند نہیں کرتے کئی ایسے بھی ہیں جنھیں عام طور پر لوگ پسند کرتے ہیں۔

لیکن اس کا کیا جائے کہ جو مجھے پسند ہیں وہ اور لوگوں کو پسند نہیں۔ قاضی صاحب نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

مسز ساوتری گپتا رضا اور میں پاس ہی بہ ظاہر خاموش بیٹھے تھے لیکن اس علمی، ادبی مجلس میں بڑا لطف آرہا تھا۔

میں نے مسز ساوتری گپتا رضا سے رضا صاحب کے شب و روز کے بارے میں پوچھا، کیوں کہ بزنس کی الجھنیں کچھ کم نہیں ہوتی ہیں اس کی شوریدگی کے باوجود وہ تخلیقی تحقیقی کام کیلیے وقت کیسے نکال لیتے ہیں؟۔

اردو سے ان کی لگن تو کم سنی ہی سی ہے تجارت کے اہم کاموں کے لئے رضا صاحب کے پاس اتنا وقت نہیں ہے جتنا علمی، ادبی کاموں کے لئے۔

مسز ساوتری گپتا رضا نے جواب دیا اور مجھے ڈاکٹر گیان چند جین کے کچھ جملے یاد آگئے جو انہوں نے رضا صاحب کے متعلق لکھا ہے۔

"اردو ان کا ضمنی شغل ہے لیکن وہ اپنے کاروباری دفتر میں صرف تین گھنٹے بیٹھتے ہیں۔ اور اردو کے مطالعہ کے لئے روزانہ کم و بیش دس گھنٹے دیتے ہیں۔"[۱]

ہم درس گاہ والوں کو واقعی شرم سار ہونا چاہیئے۔ وہ شخص جو کسی درس گاہ یا ادارے سے تعلق نہ رکھتا ہو محض شوق کی خاطر اردو سے اتنا گہرا لگاؤ؟ میں سوچنے لگی۔ مجھے رضا صاحب کی عظمت کا احساس کچھ زیادہ ہی ہوا۔

اب خاصی دیر ہو چکی تھی ہم لوگ سب رخصت ہونے کے خیال سے اٹھے۔ قاضی صاحب نے رضا صاحب سے دوسرے روز ڈنر قبول کرنے کا وعدہ لیا اور مسکراتے ہوئے ہم سبھی کو رخصت کیا۔

۲۰ر مارچ ۱۹۷۹ء

آج خدا بخش لائبریری مجھے جانا تھا صبح سویرے ہی اپنے کاموں سے فارغ ہو کر لائبریری کی راہ لی۔ رضا صاحب بھی وہاں آنے والے تھے ان سے وہاں بھی ملاقات ہوگی اس احساس سے خوشی ہو رہی تھی اس لئے کہ رضا صاحب اور مسز ساوتری گپتا رضا کو میں نے خوش اخلاق اور ملنسار پایا۔ ان لوگوں کی گفتگو سے ان کی روشن خیالی کا اندازہ ہوا خصوصاً رضا صاحب کی شخصیت میں خاصی اثر آفرینی ہے۔

لائبریری میں پہونچی تو معلوم ہوا کہ جناب عابد رضا بیدار (ڈائرکٹر) شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ رضا صاحب معہ اپنی اہلیہ اور اسرار جامعی کے وہاں موجود تھے۔ رسالہ "صبح امید" کے کچھ شمارے بکھرے ہوئے تھے اور رضا صاحب مطالعہ میں غرق۔ پاس ہی ڈاکٹر اطہر شیر بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ انھیں شاید دوسری بار رضا صاحب سے ملنے کا موقع ملا تھا۔ مطالعہ کے دوران کبھی کبھی ان دونوں میں دل چسپ باتیں بھی ہوتیں، یہاں تک کہ دن کے ۲ بج گئے۔

---

[۱] متعلقاتِ غالب ص۹ کالی داس گپتا رضا

رضا صاحب نے "صبح امید" کے کچھ شمارے اپنے ساتھ ہوٹل ستکار لے جانا چاہے لیکن لائبریری کے اصول وضوابط سے یہ معاملہ باہر کا تھا۔ اراکین لائبریری نے اپنی معذوری ظاہر کی۔ پھر بھی باہر سے آئے مہمان کی دل شکنی انھیں گوارا نہ تھی۔ ایک حل نکالا، شرط یہ لگادی کہ قاضی صاحب اگر تحریری ذمہ داری اس بات کی لے لیں تو یہ ممکن ہے چنانچہ قاضی صاحب کی خدمت میں ایک خط روانہ کیا گیا۔ انھوں نے تحریراً ساری ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ رسالے رضا صاحب کو مل گئے اور وہ خوشگوار موڈ میں واپسی کے ارادے سے اٹھے گیٹ تک پہونچتے ہی پروفیسر ذکی الحق رکشہ پر نظر آئے میں نے انھیں سلام کرتے ہوئے رضا صاحب کی طرف اشارہ کیا فوراً وہ رکشہ روک کر ان سے ملنے چلے آئے تعارف ہونے پر دونوں بڑی گرم جوشی سے ملے وہیں پر علمی گفتگو چھڑ گئی۔ پروفیسر ذکی الحق صاحب نے میر حسن پر اہم کام کیا ہے اس پر انھیں ڈی لٹ کی ڈگری بھی ملی ہے اسی کے متعلق باتیں بھی ہوتی رہیں۔ رضا صاحب نے غالبؔ سے متعلق کچھ باتیں کیں۔ تحقیقی مضامین میں انھوں نے بہت سی غلط فہمیوں کو دور کیا ہے اس لیے بہت سے حقائق پر پھر سے روشنی ڈالی۔ اس طرح باتوں باتوں میں بیس پچیس منٹ کیسے گذر گئے کچھ پتہ نہ چلا۔ پھر ان لوگوں نے ہوٹل کا راستہ لیا اور میں نے گھر کا۔

قاضی صاحب کا یہ اصول رہا ہے کہ جب بھی باہر سے آئے ہوئے مہمان ادیبوں اور پروفیسروں کو چائے یا ڈنر پر دعوت دی تو ساتھ ہی شہر کی بھی کچھ معزز ہستیوں کو شریک دعوت کر لیا۔ اس طرح اس علم وادب کی محفل میں بڑی رنگارنگی رہتی ہے چنانچہ رضا صاحب کے اعزاز میں جو دعوت دی گئی اس میں جناب کلیم الدین احمد، مسز کلیم، جناب جیونند سنگھ، (ممبر پبلک سروس کمیشن)، مسز جیونند سنگھ اور جناب اسرار جامعی وغیرہ تھے

مسٹر جیونند سنگھ کی شخصیت میں بڑی کشش ہے اردو رسیا ہیں اور اردو ادب سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ اصل میں یہ فارسی اردو کی گود میں پروان چڑھے۔ شاہ صادق نہنگ (جھنگ) میں ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے اسکولنگ شور کوٹ میں ہوئی اور کالج کا زمانہ ملتان اور لاہور میں گذرا یعنی سنہ ۱۹۴۰ء تا سنہ ۱۹۴۴ء ملتان میں گذرا اس کے بعد لاہور گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے لیا۔ فارسی میں اول آیا کرتے تھے اور ادب سے لگاؤ فارسی ہی کے تلطے پیدا ہوا۔ یہ وہی وقت تھا جب اقبالؔ کی غزلوں کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ "بانگ درا"

اور ”بال جبریل“ پڑھ کر ملتان ہی میں جیونند بابو اقبال کے دیوانے ہو گئے اور لاہور آتے ہی ”پیامِ مشرق“ کو سینے سے لگالیا اس کتاب سے چاہت کا یہ حال ہے کہ گھر سے سفر تک ہمیشہ ان کے ساتھ رہتی ہے۔ جیونند بابو کے لئے یادِ ماضی عذاب ہے۔ وہ اپنے کالج کے زمانے کو مزے لے لے کر بڑی حسرت سے یاد کرتے ہیں۔ وہ وقت، وہ معاشرہ ہندو مسلم یکتائی، پنجاب کا خوب صورت خوشگوار موسم، گھوڑ سواری، زمینداروں کی آن بان، ہمدرد دوست، بس بولتے ہی چلے جاتے ہیں۔ اس وقت ان کے سارے تاثرات کی غمازی ان کا چہرہ کرتا ہے اور آواز و الفاظ بھی۔

لاہور میں ”اقبال ڈے“ کے سلسلے کا ایک واقعہ سنا رہے تھے جب کہ اس کے مشاعرے کو سر عبدالقادر Preside کر رہے تھے انہوں نے اتنی موثر تقریر کی کہ حاضرین کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس پر غضب یہ کہ ایک لڑکے نے اقبال ہی کے لب و لہجہ میں ان کی کوئی نظم پڑھی۔ سر عبدالقادر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ مجمع سے بھی ضبط گریہ نہ ہو سکا۔ جیونند بابو اقبال سے اور قریب ہو گئے۔

جیونند بابو قاضی صاحب کی بڑی عزت کرتے ہیں لیکن دعوت کے روز تو غضب ہو گیا وقت مقررہ پر سارے مہمان پہونچ گئے اور نہیں پہونچے تو جیونند بابو۔ قاضی صاحب نے ایک دم گھڑی دیکھی اور پھر میری طرف نگاہ کی۔ میں تو کانپ گئی۔ پانچ منٹ اور گذرے تو میری بیتابی بڑھنے لگی۔ ٹیلیفون کی طرف دوڑی۔ نیلو (جیونند بابو کی لڑکی) بولی پاپا ابھی سیر کے لئے نکلے ہیں۔ میں پھر چکرا گئی۔ قاضی صاحب نے جیونند بابو کو بلانے کی ذمہ داری مجھے سونپی تھی اور انھوں نے دعوت قبول بھی کر لی تھی۔

قاضی صاحب وقت کی پابندی میں بہت سخت واقع ہوئے ہیں۔ میں ڈرائنگ روم میں جانے کی ہمت نہیں کر رہی تھی۔ چنانچہ پانچ منٹ کے وقفہ کے بعد پھر میں نے فون کیا نیلو بولی پاپا آگئے بات کیجئے۔ میں نے کہا بھیا کیا غضب کرتے ہو۔ قاضی صاحب انتظار کر رہے ہیں۔ جیونند بابو چونک پڑے۔

میرے ذہن سے ایک دم یہ بات نکل گئی۔ مجھے بڑی شرمندگی محسوس ہو رہی ہے میں قاضی صاحب کے سامنے کہوں گا کیا؟ تم ہی کوئی راستہ بتاؤ۔ جیونند بابو نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں کہا۔

آپ آتو جائیں۔ بات تو کچھ بن ہی جائے گی۔ اور واقعی بات بن گئی میں نے قاضی صاحب کی سوالیہ نگاہوں کے جواب میں عرض کیا کہ بس وہ لوگ آنے ہی والے ہیں۔

اس وقت قاضی صاحب اور رضا صاحب کے مابین فرہنگ آصفیہ کے مصنف موضوع گفتگو تھے اور قاضی صاحب ان کی صریح غلطیوں پر روشنی ڈال رہے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ لفظ "اشرافت" کا آصفیہ میں وہی معنی ہے جو "شرافت" کا۔ اشرافت باب الف میں ہے اور شرافت باب ش میں طباعت کی غلطی کا مطلقاً احتمال نہیں۔ لفظ اشرافت کہیں اور نہیں ملے گا یہ اپنے وجود کے لئے واہمۂ مؤلف کا رہین منت ہے۔ اسی طرح کچھ اور لفظوں کو انہوں نے پیش کیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے لفظ احد بالضم پر انہوں نے کہا کہ یہ حیرت انگیز غلطی ہے۔ سورۂ اخلاص قرآن کی سب سے مختصر سورۃ ہے اور کروڑوں مسلمان اسے روز نماز میں پڑھتے ہیں اس کی پہلی آیت کا آخری لفظ احد ہے۔ عبدالاحد مسلمانوں کا ایک مقبول نام بھی ہے۔ آصفیہ میں یہ بھی نہیں لکھا ہوا ہے کہ احد خدا کے ۹۹/ ناموں میں سے ایک ہے۔

اصل میں قاضی صاحب کی باتیں محققانہ طور پر ثبوت اور حوالوں کے ساتھ ہوتی ہیں وہ بول رہے تھے اور دوسرے لوگ ہمہ تن گوش سن رہے تھے

رضا صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ سید احمد دہلوی کو داغ مستند نہیں مانتے تھے۔

قاضی صاحب نے ڈاکٹر گیان چند جین کا ذکر ان کے مضمون "بت شکن محقق" کے سلسلے میں چھیڑ دیا کہ نہ جانے ڈاکٹر جین کو مجھ سے کیا دشمنی ہے جو اس طرح لکھا اگر ان کو کسی دعویٰ کی صحت میں شک ہے تو وہ اسے پیش کریں اسناد کی کثرت پر اعتراض ہے اس سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ غالب کا مطالعہ کس قدر قلیل ہے مگر رضا صاحب نے ڈاکٹر گیان چند کو اچھے طریقے سے DEFEND کیا۔

جناب کلیم الدین احمد صاحب خاموشی سے سب کچھ سُن رہے تھے۔ رضا صاحب نے ان کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا۔

ان دنوں آپ کا مشغلہ کیا ہے۔؟

ایک دھماکہ اور ہونے والا ہے۔ کلیم صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ان کی مراد ان کی حالیہ کتاب "اقبال ایک مطالعہ" سے تھی۔

رات کے گیارہ بج گئے۔ اس علم و ادب کی محفل میں لذیذ کھانے کے ساتھ بڑی اچھی اچھی باتیں سننے کو ملیں اور کافی رات گئے یہ مجلس برخاست ہوئی۔

۹۹

سیکولرزم کے پُرجوش حامیوں اور سوشلسٹ انسان نوازوں کو اب آئینی فتح کے لیے جنگ چھیڑنا ضروری ہے تاکہ علیحدگی کی ایک ایسی دیوار کھڑی کی جائے جس کے ایک طرف سماجی اور سیکولر معاملات ہوں اور دوسری طرف روحانی اور مقدس امور ہوں، جو چیزیں سیزر کی ہیں وہ سیزر کو سونپ دو اور جو خدا کی چیزیں ہیں وہ خدا کو سونپ دو" سیکولرزم آئین کی بنیاد ہے۔

مذہب اپنی زوال پذیر حالت میں ایک خوفناک شیطان ہے جب روحانی جہالت میں پھنسے ہوئے عوام رشیوں، پیغمبروں اور سنتوں کی تعلیمات کے روحانی جوہر کو فراموش کر دیتے ہیں، اور اس متبرک لغویت کو بوسہ دیتے ہیں کہ درست ہو یا غلط مذہب میرا ہے اور میرے اہلِ مذہب کا تعلق مجھ سے ہے۔"

اگر مذہبیت کی قیمت انسانی شرافت، سیکولر ہوش مندی، سوشلسٹ سیاسی تنظیم اور روحانی جمہوریت کی قربانی ہے تو ہمیں اس بیماری سے بچنا ضروری ہے۔ اس بیماری کی جڑیں دینیاتی امراض کی تثلیث میں دبی ہوئی ہیں۔ پھیلے ہوئے توہمات، غیر منطقی مافوقیت اور ایک مقدس فرمانروا طاقت کے آگے عاجزانہ خود سپردگی۔

جسٹس وی آر کرشنا آئیر

یوجنا ۱۵ اگست ۱۹۸۵ء

حمیرہ خاتون

رضاؔ کے ادبی کارناموں پر ایک نظر

بیسویں صدی کے بعض دوسرے شعرا کے برخلاف کالی داس گپتا رضاؔ منتخبات کے شاعر نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کو جدیدیت اور ترقی پسندی کے خانے میں محدود نہیں کیا۔ حالاں کہ وہ جدید ہی دور کے ہیں۔ لیکن جدیدیت سے دور۔ ابہام، الجھاؤ، معمائی اشارے ان کے کلام میں نہیں ملتے۔ وہ سلیقہ کے شاعر ہیں اور ان کے کلام میں ان کا سلیقۂ اظہار سامنے آتا ہے۔ انہوں نے مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی شعری تخلیقات میں غزلیں، نظمیں، گیت، قطعات، رباعیات اور مرثیے بھی ہیں۔ مضامین کے اعتبار سے ان کے کلام میں کافی تنوع ہے وہ ایک حساس اور فطری شاعر ہیں۔ واقعات اور اپنے محسوسات کو اشعار کے ڈھانچے میں ڈھال دیتے ہیں۔ ان اشعار میں تاثیر کا بڑا سبب جذبات کا خلوص اور صداقت ہے۔ حسن بیان کی دلآویزی نے اس میں اور بھی چار چاند لگا دیے ہیں۔ تشبیہات میں بڑی تازگی اور افکار میں بڑی ندرت ہے۔ سادگی و پرکاری کے کرشمے جابجا نظر آتے ہیں۔ مصرعوں کی چستی اور روانی و ہم آہنگی پڑھنے والوں پر ایک خاص خوشگوار اثر چھوڑ جاتی ہے۔ تہذیب و شرافت سے گرا ہوا کوئی شعر نہیں۔ یہ کمال قوت گویائی۔ یہ زبان رضا صاحب نے ایک طویل مدت کی تہذیبی مسافت کے بعد حاصل کی ہے۔

جناب رضاؔ کے چار مجموعے "شعلۂ خاموش" "شورش پنہاں" "شاخ گل" اور "شعاع جاوید" شائع ہو چکے ہیں۔

رضا صاحب کا پہلا مجموعۂ کلام شعلۂ خاموش سنہ ۱۹۶۸ء میں منظر عام پر آیا۔ اس

وقت وہ اپنے وطن سے دور بہت دور کینیا (افریقہ) میں تھے اور بیس سال کی مدت وہیں گزار چکے تھے۔ وطن سے اس طویل غیر حاضری اور کاروبار کی بے پناہ مشغولیت میں بھی جذبۂ شاعری پلتا رہا۔ فن کے لیے صحیح ماحول نہیں تھا۔ ان کی شاعری کی رہنمائی ان کا اپنا فطری شوق کر رہا تھا۔ اور اپنی زبان سے ان کا بے پناہ خلوص بھی۔

زبان کے سلسلے میں یہ ہیں ان کے تاثرات :

تجھ سے میں اے حسینۂ اردو
لوگ کہتے ہیں پیار کرتا ہوں
پیار ہی تجھ سے میں نہیں کرتا
جان تجھ پر نثار کرتا ہوں

اور شاعری کے سلسلے میں

"لمبی اور خاموش راتوں میں جن میں میرے افکار کے سوا اور کوئی میرا ساتھی نہیں ہوتا، فکر سخن ہی صرف میرے لیے رفاقت کا سامان بہم نہیں پہونچاتی بلکہ ایک ایسی ادبی جدوجہد کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے جو پچھلے بیس سال سے میں ہندوپاک سے دور کینیا (مشرقی افریقہ) کے ایک نہایت کاروباری اور غیر ادبی ماحول میں کرتا آرہا ہوں"[1]

غیر ادبی ماحول میں ادبی جدوجہد قابل تعریف ہے۔ جہاں رضا صاحب نے شعر و سخن کی محفل سجائی اور اردو کی شمع جلائے رکھی وہاں وطن سے طویل دوری نے ان کے جذبہ میں شدت پیدا کر دی۔

"شعلۂ خاموش" میں تقریباً ڈیڑھ سو غزلیں ہیں شان تغزل سے بھرپور غم جاناں کے ساتھ ساتھ غم دوراں کا بھی ذکر ہے۔

نظمیں موضوع اور فکر کے اعتبار سے اہم ہیں ان میں بعض سماجی، تہذیبی، اور انسانی مسائل کے محور پر بھی گھومتی ہیں۔ ماخوذات، گیت اور ہندی آمیز نظمیں قابل توجہ ہیں۔ افریقہ کی تحریک آزادی اور برطانوی استبداد کو بھی موضوع سخن بنایا ہے ان نظموں سے افریقی عوام کی آزادی کی جدوجہد سامنے آتی ہے اور ان کے بہادرانہ کارناموں

---

[1] شورش پنہاں از کالی داس گپتا رضا۔ دیکھیے عرض حال

کا علم بھی ہوتا ہے۔

ٹیگور کی بعض نظموں کا بڑا خوب صورت ترجمہ ہے۔ کہیں کہیں معاشی ناانصافی کا بھی ذکر دکھ کے ساتھ ملتا ہے۔ رضا صاحب نے انسانی تہذیب کے بعض المیوں کو بڑے کرب کے ساتھ محسوس کیا ہے لیکن انھوں نے اپنے تاثرات کو پیش کرنے میں لب و لہجہ کو خطیبانہ نہیں ہونے دیا ہے۔

ہماری شاعری جو دکنی دور سے لے کر غالب تک مختلف منزلیں طے کرتی ہے۔ ہمارا بیش قیمت سرمایہ ہے یہ شاعری مواد اور اسلوب دونوں اعتبار سے تبدیلیوں کے عمل سے گذری ہے اور اس سے اردو زبان کو بڑی توانائی حاصل ہوئی ہے۔ لیکن ہندستان میں، مغربی نظام حکومت، مغربی علوم، مغربی تہذیب نے ہی اس طرز فکر اور طرز احساس کو تبدیلی سے دوچار کیا جس کے نتیجے میں ہماری شاعری میں ایک نیا دور آیا۔ انگریزی زبان کی شاعری اور نظم نگاری سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد محمد حسین آزاد اور حالی نے اردو نظم نگاری کے فروغ اور اس کی ترویج کے ذریعہ اردو شاعری کی اصلاح کی کوشش کی نئی نظموں سے لوگوں کو روشناس کرایا۔ اقبال نے اسے ایک اور نیا موڑ دیا۔ چکبست کی قومی شاعری کی لے تیز ہو گئی۔ چنانچہ رضا صاحب نے اس دور کے شعرا میں حالی، اقبال، چکبست سے اثر قبول کیا اور اپنا رنگ بھی بھرا۔ سلجھے اور سنبھلے ہوئے انداز میں۔ حب الوطنی کی لے لیے ہوئے کئی نظمیں ہیں ایک خوب صورت نظم "صحرا" ہے اس نظم کا پہلا اور آخری شعر پیش خدمت ہے

ہے پر سکوت کتنا یہ ریت کا سمندر
سو شور شیں نچھاور ایک اس کی خامشی پر

ذوق نمو نہیں ہے کھٹکا نہیں خزاں کا
اس کو خطر نہیں ہے کچھ جور آسماں کا

غزلوں کے کچھ اشعار

دھندلے سے ہو رہے تھے میری زیست کے نقوش
خون جگر نے ان میں نیا رنگ بھر دیا

جہاں بھی ترک الفت کا تصور کر لیا میں نے
وہیں رکتی ہوئی عمرِ رواں معلوم ہوتی ہے

پھولوں میں دل کشی ہے نہ پتوں میں تازگی
مالی بدل گیا ہے کہ موسم بدل گیا

"شورشِ پنہاں"، سنہ ۱۹۷۰ء میں رضا صاحب کا دوسرا مجموعۂ کلام منظرِ عام پر آیا۔ یعنی "شعلۂ خاموش" کے ٹھیک دو سال کی قلیل مدت کے بعد ایک اور نیا مجموعہ سامنے آگیا۔ غزلوں، نظموں، رباعیوں، قطعوں سے بھرپور۔ بعض نظمیں مذہبی خیالات سے رضا صاحب کے پرخلوص لگاؤ کو پیش کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر "ترک دنیا کیوں" اور "بھگوان بدھ کا تیاگ" سے ان کے تعلق کا پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے افریقہ میں بھگوت گیتا کی گیانیشوری (مراٹھی نظم)، کو سمجھنے کی کوشش کی اور بدھ کی زندگی اور فلسفہ کو بھی۔

گم شدہ نغمے، بے مائگی، میرے پروردگار وغیرہ ان کی خوب صورت نظمیں ہیں، ان میں رضا صاحب کا بیدار شعور سامنے آتا ہے، اور فکر بھی، کہیں کہیں رومانی اثرات بھی ہیں۔ جیسے ان کی نظم "گم شدہ نغمے"۔

یہ دو بند دیکھیے۔

جیسے تاریک فضاؤں میں چمکتے جگنو
جیسے کانوں میں کسی شوخ کے ہلتے بُندے
جیسے ہنگامِ سحر پھولوں پہ شبنم کے گہر
جیسے مہتاب کی کرنوں کے روپہلے تحفے

کاش ان گم شدہ نغمات کی ہلکی سی جھلک
کہیں ان ڈھونڈتی آنکھوں کو دکھائی دیتی
میرے کانوں کو جو حاصل نہیں قربت نہ سہی
دور ہی سے کوئی آواز سُنائی دیتی

غزلوں کے کچھ اشعار

نہ سنائے گی زباں اب غم و درد کا افسانہ

نئے موڑ مڑ رہا ہے مری فکر کا زمانہ

دم لینے کو منزل پہ ٹھہرنا بھی تو آئے

مرنے کی طرح آپ کو مرنا بھی تو آئے

ممکن ہے کہ دیوانہ کوئی چین سے رہ لے

اس دور میں انسان تو خوش رہ نہیں سکتا

جب دیکھا اسے فکر و حقیقت کی نظر سے

پیکر ہی نیا پردۂ تصویر سے نکلا

"شاخ گل" رضا صاحب کا تیسرا مجموعۂ کلام ہے اس میں بھی اچھی خاصی تعداد میں نظمیں، غزلیں اور رباعیات ہیں۔ دو نظمیں تو وہی ہیں جو "شورش پنہاں" میں شائع ہو چکی ہیں "ترک دنیا کیوں" اور "بھگوان بدھ کا تیاگ"۔

کچھ نظمیں "قدیم مصریوں کے ادب" کے سلسلے میں ہیں اور دوسری نظمیں جیسے مہاتما گاندھی ایک بھکاری، وحشی جی اٹھا، لہو کا لالہ زار، شعور، گھٹن اور دیوار اس بحرانی دور کے اثرات ہیں جب فرقہ وارانہ ہنگامے ہو رہے تھے شاعر اگر حساس اور غیور ہے اور اس میں حقیقت سے آنکھ چرانے کا رجحان نہیں تو اس کے یہاں کرب بے چینی اور حزن و ملال کی پرچھائیاں لازمی ہیں۔ رضا صاحب نے بھی اس دور انتشار اور بحران میں بعض ایسے ہولناک مناظر دیکھے ہیں جو انتہائی کرب انگیز تھے اور انسانی تاریخ انھیں صدیوں تک یاد رکھے گی۔

"لہو کا لالہ زار" کا ایک بند

زرا سا مڑ کے اب جو کی نگاہ

کوئی نہیں تھا رہ گذار میں

مگر مرے لہو کا ہر نشاں
بدل چکا تھا لالہ زار میں

اور شعور ہمایہ خوب صورت بند

چمن کا رنگ سر رشتہ نظر کا
اسے حسنِ حقیقی سے نہ جوڑو
جھکی ڈالی سے کلیاں توڑنا کیا
کوئی زنداں کوئی زنجیر توڑو

"شعاع جاوید" میں صرف رباعیاں ملتی ہیں اس میں کہیں کہیں ان کے لہجے کی لے تیز ہو گئی ہے اور فکر گہری۔ کہیں مکالماتی انداز بھی ہے کہیں تحیر اور استیعجاب کو سامنے رکھا گیا ہے کہیں فلسفیانہ اور حکیمانہ رنگ بھی بھر اگیا ہے لیکن جہاں فکر گہری ہے اور رضا صاحب فکر کا مرکز انسان اور انسانیت کو ٹھہراتے ہیں وہاں رضا صاحب کا فن قد آور ہو گیا ہے۔

رباعی کی تعریف کرتے ہوئے گوپی چند نارنگ فرماتے ہیں۔ "ان رباعیوں میں سوچنے والا ذہن ملتا ہے اور حقائق کو سمجھنے والی نظر ملتی ہے اور ایک ایسا فلسفۂ حیات جو ذاتی بصیرت اور سوچ کی دین ہے جو دل پر چوٹ پڑنے سے مرتب ہوتا ہے" [۱]

رباعیوں کے کچھ نمونے۔

دو لمحے کی روشنی میں ڈھل جاؤنگا
شدت کی تپش ہو گی پگھل جاؤنگا
روشن نہ کوئی شمع کہیں کر دینا
ہر رنگ میں میں آپ ہوں جل جاؤنگا

آفاق ادھر کھولے ہوئے ہے باہیں
بھرتا ہے ادھر رات دن انسان آہیں
بہتی ہے ندی، بہے نہ پہچانیں ہم
اور پیاس سراب سے بجھانی چاہیں

باقی نہ رہے دل میں ہے جو کچھ کہہ جا
لاوا جو ابل رہا ہے اس میں بہہ جا
یا جست لگا آہوئے صحرا کی طرح
یا ضبط کے چنگل میں تڑپتا رہ جا

اُجالے۔ اسلامی رنگ کے اشعار کا یہ چھوٹا سا مجموعہ چند نعتوں، سلام، رباعیات اور قطعات سمیٹے ہوئے ہے۔ رضا صاحب نے مشرقی افریقہ میں غیر ادبی ماحول کو گویا ادبی بنا دیا۔ ہندستانی تو وہاں موجود ہی تھے جن میں شعرا بھی تھے لیکن ذوق کو بھرپور ماحول نہ مل رہا تھا۔ رضا صاحب کے وہاں پہونچنے کے بعد محفلوں اور مشاعروں نے لوگوں کے ذوق کو ابھارا۔ بزم میلاد النبی، مجلس مرثیہ، اقبال ڈے، جشن دیوالی وغیرہ منایا جانے لگا۔ رضا صاحب کا اسلامیات پر مشتمل یہ مجموعہ ان کی وسعت نظری کو سامنے لاتا ہے۔ بقول ڈاکٹر گیان چند جین۔

"میرے علم میں اس دور کے وہ تنہا غیر مسلم ہیں جن کی اسلامی نظموں کو ایک مجموعے کی سمائی درکار ہوئی۔ سچ تو یہ ہے کہ مسلم شعرا بھی کتنے ہیں جنھوں نے اسلامیات پر مشتمل کوئی مجموعہ شائع کیا ہو۔"[۱]

رضا صاحب کا ایک قطعہ ہے۔

وہ سنا نغمہ کہ مطرب بھی تمنّاں خواں ہو جائے
شانِ دربارِ رسول اور نمایاں ہو جائے
اے رضاؔ ذکرِ نبی میں وہ حقیقت بھر دے
بزم کی بزم تری نعت پہ رقصاں ہو جائے

نعتیہ غزل کے کچھ اشعار

طائرِ بے بال و پر، بے آشیاں میں ہی تو ہوں
اوجِ پرواز و سکونِ آشیاں تو ہی تو ہے

---

[۱] متعلقاتِ غالب۔ تعارف ص۸

بے قراروں کو ہے تیرا آسرا بعدِ خدا
رُوحِ دل تو ہی تو ہے تسکینِ جاں تو ہی تو ہے

جام و مینا سے نہیں ہم کو سرو کار مگر
آپ کے نام پہ آجائے تو مستی اچھی

"شعورِ غم" اسلامی نظموں کے مجموعے "اجالے" کے دوسرے باب (باب شہادت) سے اخذ کر کے اور کچھ باقی ماندہ کلام شامل کر کے ترتیب دیا گیا ہے اس کے آخری چوتھائی حصہ میں "شوقِ تولاّ" ہے جس میں منقبت کے اشعار ہیں۔ اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ رضا صاحب احوال امام حسینؓ سے کتنی گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ کہیں کہیں تو سچ مچ ایسا لگتا ہے کہ کسی شیعہ شاعر کے تاثرات ہیں۔ یہاں پر ان کا فن نہیں بلکہ دل کی گہرائی سے نکلی ہوئی بات ہے جو دل میں اتر بھی رہی ہے۔

تیری عزت، تیری عظمت سے اجازت مانگ کر
کہہ رہا ہوں قصۂ حق و صداقت اے حسینؓ

ابن علیؓ کے پاک قدم کی جو دھول ہے
چشمِ رضا میں گلشنِ عظمت کا پھول ہے

دیکھا ہے بارہا یہ رضا دل کی آنکھ سے
نورِ رسول نورِ خدا سے جدا نہیں

ایک اور قطعہ ہے

دشت کربل کی وہ اک شام بیاں کون کرے
قصۂ آفت و آلام بیاں کون کرے
اے حسینؓ۔ آپ کا آغاز تھا آغوشِ رسولؐ
کیا ہوا آپ کا انجام بیاں کون کرے

سائی لینٹ فلیم (THE SILENT FLAME)

چھوٹی بڑی بتیس نظموں کا مجموعہ ہے اس کی اکثر نظمیں "شعلۂ خاموش" سے ترجمہ ہیں۔ رضا صاحب کا کمال فن ہے کہ انھوں نے انگریزی شاعری کی فضا میں رنگ بھر دیا ہے۔ اس سے انگریزی زبان پر ان کی قدرت سامنے آتی ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ تحقیق و تخلیق کے سلسلے میں فرماتے ہیں

"تنقید و تخلیق کا ساتھ تو اکثر دیکھا ہے لیکن تحقیق و تخلیق میں ایک طرح کا تناقض ہے۔ تخلیق میں ساری کارگذاری جذبے اور وجدان کی ہے جہاں تعقل کے پر جلتے ہیں لیکن تحقیق کا سارا کاروبار ہی منطقی نوعیت کا ہے جہاں عقلیت کی حکومت ہے ..... کالی داس گپتا رضا کا معاملہ دوسرا ہے ..... ان کی شاعری کے تین مجموعے "شعلۂ خاموش"، "شورش پنہاں" اور "شاخ گل" اس سے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ رباعیات کا یہ مجموعہ (شعاع جاوید) چوتھا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تحقیق کی بادہ پیمائی بھی جاری ہے" ع ا

رضا صاحب کی محنت لگن، جستجو سے کسے انکار ہو سکتا ہے اصل میں ان میں کام کرنے کی اہلیت بھی بے پناہ ہے۔ مستقل کتابیں بھی تصنیف ہو رہی ہیں اور مضامین بھی شائع ہو رہے ہیں۔ تقریباً اسیؔ مضامین بیش تر تحقیقی مختلف رسائل میں چھپ چکے ہیں۔ بات یہ ہے کہ تحقیق کی دنیا میں جس کرید، جستجو، محنت اور ذمہ داری کے جذبہ کی ضرورت ہے وہ رضا صاحب میں موجود ہے۔ ہمارے تحقیقی سرمایہ کی عمر ابھی ایک سو سال بھی نہیں ہے۔ اس کی کوتاہیاں ہم پر روشن ہیں۔ اس کے باوجود اردو میں ایسے ایسے عالم اور محقق موجود ہیں جن کا موازنہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے محققوں سے کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً حافظ محمود شیرانی، جناب قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی عرشی وغیرہ پروفیسر گیان چند جین، جناب رشید حسن خاں، جناب مشفق خواجہ وغیرہ ان کے ساتھ ساتھ ہیں اور ہیں جناب کالیداس گپتا رضا جن کی تحقیقی رفتار اب نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ سہو وسراغ، دعائے صباح، متعلقات غالب، انتخاب آتش و غالب، چکبست اور

ع ا شعاع جاوید۔ دیباچہ

باقیات چکبست کلیات چکبست جیسے کارنامے پیش کر کے اردو تحقیق کی دنیا کو انھوں نے بہت کچھ دیا ہے اور بہت کچھ دیتے رہیں گے اول تو اردو سے ذوق و شوق، پھر تحقیق کا چسکا لگ چکا ہے بقول، پروفیسر گیان چند جین!

"..... میں گپتا صاحب کو ایک شاعر اور محقق کی حیثیت سے جانتا تھا لیکن یہ اندازہ نہ تھا کہ میدان تحقیق میں وہ کتنے آگے بڑھ چکے ہیں"۔ ؏۱

خوش نصیبی سے مجھے بھی رضا صاحب سے ملنے کا شرف حاصل ہوا ہے ۱۹۷۹ء میں وہ پٹنہ جناب قاضی عبدالودود سے ملنے تشریف لائے تھے۔ کافی دیر تک تحقیقی مسائل پر باتیں ہوتی رہی تھیں۔ قاضی صاحب دوران گفتگو نہ رکتے ہیں نہ تھکتے ہیں۔ چنانچہ وہ موضوع بدل بدل کر ان نکات پر روشنی ڈال رہے تھے۔ غالبؔ، حالیؔ، عبدالحقؔ، اقبالؔ وغیرہ زد میں آ رہے تھے اور رضا صاحب بصد احترام سن بھی رہے تھے اور اپنا نقطۂ نظر بھی پیش کرتے جا رہے تھے۔ پھر منشی چھنولال دلگیر کی بات چھڑ گئی، گو بحیثیت مرثیہ گو دلگیرؔ کو شہرت ملی تھی لیکن بات ان کے تبدیلِ مذہب کے بارے میں ہو رہی تھی اس لیے کہ رضا صاحب ایک زمانے میں ایک طرف اور دوسری طرف جناب مسعود حسن رضوی ادیب اور ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری تھے۔ چند لوگوں نے قاضی صاحب کے حوالے سے کہا تھا کہ دلگیر مسلمان ہو گئے تھے لیکن رضا صاحب نے جب قاضی صاحب سے اس بات کی حقیقت دریافت کی تو انھوں نے انکار کیا۔

سہو و سراغ

۱۹۸۰ء میں یہ کتاب منظر عام پر آئی۔ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ "سن رکھو تم فسانہ ہیں ہم لوگ" "سہو و سراغ" اور "رفتار قلم"۔

(۱) پہلے حصے میں کئی اہم شخصیتوں کے تذکرے ہیں جو نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں یہ تحقیقی کاوش بہت سے نئے گوشے سامنے لائی ہے جس سے کئی نئی راہیں کھلتی ہیں۔

(ب) "سہو و سراغ" کے مختصرات غالبیات کے ذیل میں آتے ہیں۔ غالبؔ سے رضاؔ صاحب کو بڑی دلچسپی ہے اس حد تک کہ برصغیر میں سب سے بڑا "غالب کلکشن" آپ

۱؎ متعلقات غالب۔ تعارف

کی لائبریری میں موجود ہے۔ یہاں اسی سلسلے میں بھول چوک جو کئی کتابوں میں رہ گئی ہے اس کے اور تحقیق شدہ مواد کے آئینے میں نئے انکشافات ہیں جس کے ذریعہ ہماری علمی وادبی معلومات میں اضافہ کیا گیا ہے۔

(ج) رفتار قلم۔ کچھ ایسے مضامین ہیں جن سے مصنف کی علمی کاوشوں اور ذاتی مشاہدوں پر روشنی پڑتی ہے۔

"چکبست اور باقیات چکبست" سنہ ۱۹۷۹ء انتخاب آتش وغالب سنہ ۱۹۸۰ء اور کلیات چکبست" سنہ ۱۹۸۱ء میں شائع کر کے رضا صاحب نے خاصہ تحقیقی سرمایہ پیش کیا ہے۔

"چکبست اور باقیات چکبست" نثری انتخاب اور شعری انتخاب پر مشتمل ہے جس میں چکبست کی بھرپور نمائندگی ہوئی ہے بکھرے ہوئے نثر و شعر کو یکجا کرنے میں جو زحمت رضا صاحب کو برداشت کرنی پڑی ہوگی اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو خلوص، محنت اور سنجیدگی سے کام کرنے کے عادی ہوں۔

"انتخاب آتش وغالب" میں رضا صاحب نے چکبست کے انتخاب کلام آتش و غالب پر روشنی ڈالی ہے اور اس انتخاب کے بارے میں چکبست کے خیالات بھی رسالہ "صبح امید" سنہ ۱۹۱۸ء کے شمارے میں موجود ہیں جسے اس کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے۔

"کلیات چکبست" میں ترتیب کلیات اپنی جگہ پر اہم ہے۔ ساتھ ہی "حرف اول" میں رضا صاحب نے تحقیقی معلومات کا ڈھیر لگا دیا ہے۔ بحیثیت شاعر چکبست کا فن کتنا قد آور ہے اس کے بارے میں رضا صاحب فرماتے ہیں۔

"پنڈت برج نرائن چکبست خود ایک مایۂ ناز ادیب اور شاعر تھے۔ اگر میر، غالب، انیس اور اقبال کو روایتی درجہ بندی سے بالاتر مان کر مقابلے میں شامل نہ کیا جائے تو چکبست کو اردو کے درجۂ اول کے شاعروں میں جگہ دی جائے گی۔"

چکبست کی یہ خوش نصیبی ہے کہ انھیں رضا صاحب جیسا معتبر محقق میسر آ گیا۔ انھوں نے اتنی قلیل مدت میں چکبست کے متعلق تین کتابیں شائع کر دیں اور شاید ایک دو زیر طبع اور زیر ترتیب بھی ہیں۔

"متعلقات غالب": اس کتاب کی اشاعت سنہ ۱۹۷۸ء میں ہوئی۔ یہ غالب سے متعلق تحقیقی مضامین پر مشتمل ہے اور بقول پروفیسر گیان چند جین

"یہ مضامین عام دلچسپی کے نہیں۔ یہ کلام غالب کے رسیاؤں کے ڈھب کے بھی نہیں یہ صرف محققین غالب کے درخورالتفات ہو سکتے ہیں۔ ان مضامین میں رضا صاحب نے بہت سی غلط فہمیوں کا پردہ چاک کیا ہے بہت سے حقائق کو پہلی بار افشا کیا ہے۔"

رضا صاحب نے "مخمسات قدسی" کے دو مرتبین کا، جو مرتب اول کا ادبی سرقہ کرتے ہیں، پردہ چاک کیا ہے اور اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ "تضمینات قدسی" کا یہ مجموعہ دلی کے کسی مشاعرے کا گلدستہ نہیں ہے بلکہ یہ نظمیں محض مراسلت کے ذریعہ فراہم کی گئی ہیں۔

غالب کے بھانجے مرزا عباس بیگ اور موخرالذکر کے عم مرزا افضل بیگ کے سوانح غیر معروف ماخذ سے جمع کر کے ان پر بھرپور روشنی ڈالی ہے غالب کے دو غیر مطبوعہ فارسی قطعات بخط غالب دریافت کر کے غالبیات میں اضافہ کیا ہے اس کے علاوہ غالب کے شاگرد ذکا کے بارے میں تفصیلات کا ڈھیر لگا دیا ہے بہت سارے تاریخی قطعات کا تجزیہ بھی کیا ہے

پروفیسر گیان چند جین کا تعارف بھی اہم ہے اس لیے کہ اس سے صرف رضا صاحب کی زندگی اور کارناموں پر روشنی نہیں پڑتی بلکہ ان کی قابل فخر نجی لائبریری پر بھی۔ پاکستان میں جناب مشفق خواجہ کی لائبریری اور ہندستان میں رضا صاحب کی لائبریری نے اردو دنیا میں اب دھوم مچادی ہے نادر مخطوطات کے علاوہ تذکروں، لغات، دواوین اور قدیم رسالوں کا ذخیرہ ہے اور بقول ڈاکٹر گیان چند جین

"یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ دنیا میں آپ ہی کا کتب خانہ ایسا ہے جس میں غالب کی زندگی میں شائع شدہ دیوان کے پانچوں اڈیشن موجود ہیں۔

.... غالب پر جتنا بڑا کلکشن آپ کے پاس ہے اتنا کہیں اور نہیں ہو سکتا"

"دعائے صباح" کا منظوم ترجمہ مرزا غالب نے کیا اور ان کے بھانجے مرزا عباس بیگ کے ایما پر مطبع نول کشور لکھنؤ نے چھاپا۔ اس کی اولین اشاعت کا نسخہ رضا صاحب کے غالب کلکشن میں موجود ہے جو اور کہیں نہیں ملتا۔

رضا صاحب اس کی آٹھ دیگر اشاعتوں کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ مذہبی نظم ہونے کی وجہ سے غالب اس دعا کے معانی و مطالب سے کلی طور پر بہرہ ور رہے ہوں گے اگرچہ ان کا

عربی علم قطعاً محدود تھا مگر کلاسیکی فارسی سے غالب کی گہری واقفیت اظہر من الشمس ہے۔
میں نے ان نکات کی طرف قاضی صاحب کی توجہ دلائی۔ انھوں نے فرمایا کہ غالب عربی مطلق نہ جانتے تھے۔ فارسی کا مطالعہ محدود تھا ورنہ قاطع برہان میں ایسی ایسی غلطیاں نہ ہوتیں۔ شاعر ہونا اور بات ہے اور زبان کا محقق ہونا اور بات۔ اقبال بھی زبان کے محقق نہ تھے۔ بہرحال اس مثنوی کے دوسرے پہلوؤں پر بھی رضا صاحب نے تحقیقی اور تدقیقی نظر ڈالی ہے۔ ان کی کاوش قابل تحسین ہے۔

"مکتوبات جوش ملسیانی" اور منشورات جوش ملسیانی سنہ ۱۹۷۶ء اور سنہ ۱۹۷۷ء میں منظر عام پر آئیں۔ رضا صاحب نے ایک طویل مدت اپنے وطن سے دور افریقہ میں گذاری۔ چنانچہ خط و کتابت کے ذریعہ انھوں نے اپنے بزرگ اور نامور استاد سے بہت کچھ حاصل کیا اور ان کے خطوط کو سمیٹ کر شائع کر دیا۔ خطوں کے حاشیے میں دیے ہوئے نوٹ بڑے قیمتی ہیں جو فیض، استاد اور واقعات کو سمجھنے سمجھانے میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ ساتھ ہی ان خطوں سے رضا صاحب کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کا فطری ذوق و شوق، استاد سے عقیدت اور کتنے کثیر المطالعہ ہیں، یہ ساری باتیں سامنے آتی ہیں۔

ہندستانی مشرقی افریقہ میں۔ رضا صاحب نے یہ کتاب دو جلدوں میں مرتب کی ہے جلد اول میں افریقہ اور مشرقی افریقہ کی تاریخ اور جغرافیہ کے ساتھ ساتھ ان ہندستانی بزرگوں کے حالات اور کارنامے ملتے ہیں جنھوں نے اس ملک کی ترقی میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں اور دوسری جلد ابھی زیر ترتیب ہے اس میں اردو کی ثقافتی تاریخ پیش کرنے والے ہیں ؎ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

قمر جلال آبادی

ذاتی تاثرات

ایک مدت سے جناب کالی داس گپتا رضا صاحب کا نام سن رہا تھا۔ وہ جناب جوش ملسیانی کے شاگرد ہیں اس لیے میرے دل میں ان کے لیے احترام کا جذبہ تھا۔ ان سے ملنے کی آرزو تھی جو ۱۹۸۲ء کے آغاز میں پوری ہوگئی۔ میری رہائش گاہ پر "بزم فکر وفن" کا مشاعرہ تھا اس میں شرکت کے لیے میں نے رضا کو دعوت دی۔ رضا آئے اور مشاعرہ ان کی صدارت میں ہوا۔ ان کے چہرے پر ایک تبسم تھا اور اس تبسم نے چاروں طرف ان کے دل کی خوبصورتی بکھیر دی۔ ان کا شعر پڑھنے کا انداز پرسکون ہے۔ اس میں داد لینے کی تڑپ نہیں۔ جیسے وہ خود کو سنا رہے ہوں جیسے وہ جانتے ہیں کہ شعر اچھے ہیں۔ "تحسین ناشناس" انہیں پسند نہیں اور "سکوت سخن شناس" کا انہیں گلہ نہیں۔ کم گو ہیں کم آمیز ہیں مشاعروں میں نہیں جاتے ہنگامہ پسند نہیں کرتے۔ میں نے کافی زور دیا تو میرے ہاں مشاعرے میں آئے۔ احباب کے اصرار پر انھوں نے چند پرانی غزلیں سنائیں۔ کچھ شعر یاد رہ گئے ہے

فطرتِ انساں ازل ہی سے رہی رندی پسند
کتنے ہیں ایسے بشر جو پارسا ہو کر رہے

یہ سات آسماں تو پرواز دل کو کم ہیں
ہر آسماں کے اوپر سو آسمان ہوتے

ضرورت کیا کہ تیرا مدعائے دل بھی ہم جانیں
ترے ہونٹوں کی جنبش ہی بھلی معلوم ہوتی ہے

ممکن ہے کہ دیوانہ کوئی چین سے رہ لے
اس دور میں انسان تو خوش رہ نہیں سکتا

اس ملاقات میں رضا اپنی محبت کے ایسے نقش چھوڑ گئے جو آئندہ ملاقاتوں کا پیش خیمہ بن گئے۔

رضاؔ سے میری دوسری ملاقات "بزم فکر وفن" کے ایک اور مشاعرے میں جناب قاسم قریشی کی رہائش گاہ پر ہوئی تو وہ مشاعرہ بھی آپ ہی کی صدارت میں ہوا۔ اس مشاعرے میں ایس ڈی باتش بھی شامل ہوئے جو چند سال پہلے فلمی دنیا کے مشہور مغنی تھے اور ان کا گایا ہوا ایک نغمہ ع "خاموش نگاہیں یہ سناتی ہیں کہانی" بہت مقبول ہوا تھا۔ رضا صاحب باتش سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ رضاؔ کی شخصیت کا ایک اور پہلو نمایاں ہوا۔ رضا باقاعدہ کلاسیکی میوزک سیکھ چکے ہیں اور عین ممکن تھا کہ سب ان کے پیچھے پڑ جاتے کہ آپ اپنا کلام ترنم سے سنائیں۔ لیکن رضا بال بال بچ گئے۔ اپنے کلام کا تو ہر شاعر عاشق ہوتا ہے لیکن رضا دوسروں کا کلام بڑے غور سے سنتے ہیں۔ شعر اچھا لگے تو داد دیتے ہیں ورنہ خاموش رہتے ہیں۔ کسی شعر میں فنی سقم ہو تو منہ پر نہیں کہتے مگر ان کے اندر کا محقق اور نقاد جاگ اٹھتا ہے ادبی محفلوں میں وزن اور فن سے گرے ہوئے شعر سنانے کو وہ "بے ادبی" کہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ غلط ادب کی ترویج روکی جائے۔ اس مشاعرے میں رضاؔ صاحب کا کلام بہت پسند کیا گیا ان کی زبان اور فنی خوبیوں کو سراہا گیا۔ کچھ شعر تو بار بار سنے گئے۔ اس مشاعرے کے چند شعر بھی اب تک یاد ہیں۔

پار اترنے تک از بر رہا
کس کو اب ناخدا یاد ہے

دل ہی روئے پلک تر نہ ہو
یہ بھی اک حسنِ فریاد ہے

وہ وسعتِ گلزارِ ارم میں مری ہستی
مجھ ایسا قفس دوست وہاں رہ نہیں سکتا

کشتۂ شوق سناتا جا کہانی اپنی
نسلِ آئندہ پہ تھوڑا سا کرم کرتا جا

رضاؔ سے میری تیسری ملاقات پونا میں ہوئی۔ ہم کچھ شاعر بمبئی سے وہاں ایک مشاعرے کے سلسلے میں گئے تھے۔ پونا میں رضاؔ کا اپنا مکان ہے۔ مشاعرے سے پہلے ہم کچھ شاعر ان کی رہائش گاہ پر گئے۔ وہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں رضاؔ نے چائے کا "مصرع" کہنے میں دیر کی تو میں نے کہا۔ قبلہ ہم لوگ چائے پئیں گے رغالباً انھوں نے یہ ڈپارٹمنٹ اپنی رفیقۂ حیات پر چھوڑ رکھا ہے کہنے لگے "میں دیکھوں دودھ ہے یا نہیں" وہ اٹھے نہیں صرف اٹھنے

کے لیے تھوڑی جنبش کرکے بیٹھ گئے اتنے میں ان کی رفیقہ حیات کی آواز آئی "میں ابھی چائے بھیجتی ہوں" ظاہر ہے کہ اس کے بعد ایک نہیں دو دور چلے۔ چائے کا بھی اور شاعری کا بھی "حضرت داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے" شاعر لوگ جم گئے۔ رضا پونا کی تنہائی میں شعر و شاعری اور تنقید و تحقیق کا کام کرنے جاتے ہیں۔ جب ہم لوگ پہنچے تو خدا معلوم وہ کسی غزل میں الجھے ہوئے تھے کسی کو تنقید کا نشانہ بنا رہے تھے یا تحقیق کی بھول بھلیاں میں گم تھے لیکن ہم لوگوں نے ان کا لحاظ نہیں کیا۔ ایسی شاعری بھی کس کام کی کہ یار یاروں سے مل نہ سکے۔ "نقاد" قسم کی "مخلوق" کے بارے میں میں نے رضا کو مصور پکاسو کی زندگی کا ایک واقعہ سنایا۔ رضا خوب ہنسے۔ ایک دن صبح صبح ایک نقاد پکاسو سے ملنے آیا۔ پکاسو نے کہا۔ چلو دریا پر گھومتے بھی ہیں اور باتیں بھی کرتے ہیں دریا پر نہایت خوشگوار موسم تھا۔ پنچھی نغمہ سرا تھے پکاسو اور وہ نقاد ان کے نغموں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ نقاد نے کہا "یہ پنچھی فن کار ہیں" اتنے میں ایک کوا آیا اور اس نے زور زور سے کائیں کائیں شروع کر دی۔ پکاسو نے کہا۔ "یہ نقاد" ہے۔

لطیفہ گوئی اور شاعری کی اس محفل میں رضا بالکل ڈوبے رہے اور ذرا بھی بیزاری کا اظہار نہیں کیا۔ یہ ان کا ظرف تھا۔ رضا کے کچھ شعر اتنے شگفتہ تھے کہ میں نے نوٹ کر لیے ؎

بھاگتا ہے مرنے سے زندگی پہ مرتا ہے
کیسی کیسی راہوں سے آدمی گزرتا ہے

میں تو تھک کر راہ کنارے بیٹھ گیا تھا
آنے جانے والے حال بتاتے ہوں گے

ہم نہ مانیں گے خموشی ہے تمنا کا مزاج
ہاں بھری بزم میں وہ بول نہ پائی ہو گی

جدھر خود گیا تھا ادھر لگا لے گیا
نہ جانے کدھر راستا لے گیا

یہ اسیران بلا اپنے ہی قیدی نکلے
کوئی پہرہ تو نہیں تھا در زنداں کے قریب

کوئی ہنگامہ نظر آتے تو قرباں ہو جاؤں
کب سے کاندھوں پہ لیے پھرتا ہوں ہستی کی صلیب

وصالِ دوست سے آگے کوئی منزل نہیں رہتی
اب اے عمرِ رواں تیرے ٹھہرنے کا مقام آیا
مجھے اے دوست اب کچھ ڈر نہیں لگتا حوادث سے
میں اپنے غم شرابِ ناب کے ہاتھوں میں تھام آیا

ایک دن رضاؔ سے ملاقات کی لہر آئی۔ تو میں بمبئی میں ان کے گھر پہ پہنچا۔ میں نے کہا۔ "میں آپ کے بارے میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں اس کے لیے ذاتی گفتگو کی بھی ضرورت پڑے گی۔" کہنے لگے مہینے میں ایک بار آجایا کیجئے میں نے احتیاطاً بہت کم باتیں کیں اس لیے یہ "رعایت" ابھی تک قائم ہے ورنہ شاید سال میں ایک بار کی نوبت آجاتی۔

دراصل ذہنی طور پر رضاؔ بہت ہی کم آمیز ہیں۔ شاید اس لیے کہ ہر وقت ان کے دل و دماغ میں ادبی مسئلے گھومتے رہتے ہیں۔

حال ہی میں رضاؔ سے پونا کے ایک مشاعرے میں پھر ملاقات ہوئی۔ اس مشاعرے کے صدر بھی رضاؔ ہی تھے۔ ریاض احمد خاں نے اس مشاعرے میں حکیم رازؔی کے مجموعۂ کلام کی اور میں نے ماہانہ "اسباق" پونا کے خاص نمبر علامہ محوی صدیقی لکھنوی نمبر کی رسم جراءادا کی۔ یہ مشاعرہ جواہر لال نہرو میموریل ہال میں تھا۔ یہ لوگ رضاؔ سے خطبۂ صدارت کی امید رکھے ہوئے تھے۔ انھوں نے اس کا افتتاح اس رُباعی سے کیا۔

اس بزمِ سخن اس سے عبارت کی ہے
یہ شعر سنانے کی جسارت کیا ہے
بس یہ کہ میں خادم ہوں یہ محفل مخدوم
خدمت ہی تو ہے اور صدارت کیا ہے

میں پھر ان کے چند شعر نوٹ کرنے پر مجبور ہو گیا اگر کسی کو یہ خیال ہو کہ مجھے رضاؔ کے کلام میں صرف خوبیاں ہی کیوں نظر آتی ہیں تو یہ میرا قصور نہیں رضاؔ کا قصور ہے وہ شعر اچھے کیوں کہتے ہیں۔ رضاؔ کے یہ شعر سنئے دیکھیں آپ میرے ہم نوا بنتے ہیں یا نہیں۔ ایک قطعہ میں کیا قافیے نکالے ہیں رضاؔ نے ؎

ہم میں گل گشت کی کہاں طاقت
یہ بڑے کام نو بڑوں کے ہیں
آپ کے چند حرفِ دل جوئی
ہم کو ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ہیں

اور یہ اشعار:

جلوۂ عام کے دھوکے میں چلے آئے تھے

بند ہوگا درِ جاناں یہ خبر کس کو تھی

موت ہی مانگتے آئے تھے کہ بیزار تھے ہم
زیست ہے یاس کا درماں یہ خبر کس کو تھی

چپکے سے دماغ میں در آئے
یادوں کے سفیر بن بلائے

اس کو وہ خرد کو کیا کردیں
دیوانے سے کب اٹھایا جائے

بستیاں غریبوں کی بہ گئیں تو ہنسنا کیا
سیلِ اشک کی زد میں آپ کا نگر بھی ہے

جیسے ہی خبر انساں کو ملی در کھلنے لگے ہیں جنت کے
اس عیش و ہوس کے ہنگے نے ہر کام ادھورا چھوڑ دیا

جو اپنے سفر کا اک کا ہو رہزن سے اسے کس بات کا ڈر
آمد پہ مری اکثر یہ ہوا تقدیر نے رستا چھوڑ دیا

دنیا کے مصیبت خانے میں تقدیر نے جنت سے لاکر
صحرا میں کھلے اک گل کی طرح انسان کو تنہا چھوڑ گیا

منزل کی دھوم دھام سے جب جی اچٹ گیا
رہگیر جیسے سینکڑوں رستوں میں بٹ گیا

اب کوئی ڈھونڈ ڈھانڈ کے لاؤ نیا وجود
انسان تو بلندیٔ انساں سے گھٹ گیا

منزل کہیں ملی نہ ملی لیکن اے رضا
منزل کے اشتیاق میں رستہ تو کٹ گیا

نہ کشتی نہ ماجھی نہ ہمت نہ زور
اب اس پار جو لے گیا لے گیا

چمن کا حسن سمجھ کر سمیٹ لائے تھے   کسے خبر تھی کہ ہر پھول خار نکلے گا

میں تو کچھ ذاتی تاثرات لکھنے بیٹھا تھا۔ اور شعروں کی بھرمار ہوگئی۔ ویسے شاعر سے شعروں

کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یقیناً شعر شاعر کے کردار کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ کبھی کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں ریاض خیرآبادی نے کبھی شراب نہیں پی تھی لیکن شراب پر بہترین شعر کہے ہیں۔ لیکن عام طور سے یہی ہوتا ہے کہ شراب پینے والے جگر اور عدمؔ کے شراب پر شعر تاثر میں ریاض کے شعروں سے کم نہیں ہیں۔ بلکہ عدمؔ کا ایک شعر سینکڑوں شعروں پر بھاری ہے۔

میں میکدے کی راہ سے ہو کر گذر گیا
ورنہ سفرِ حیات کا کتنا طویل تھا

رضا کے کلام میں کسی کمتر درجے کے عامیانہ شعر کا نہ ہونا ان کے کردار کی عظمت کا گواہ ہے ان سے چند ذاتی ملاقاتوں میں مجھے یہی احساس ہوا کہ ادیب شاعر نقاد اور محقق کے علاوہ رضا ایک بلند انسان ہے۔ وہ عمل میں یقین رکھتا ہے بیکار باتوں میں نہیں۔ وہ مستحق شاعروں ادیبوں کی تن من دھن سے سیوا کرتا ہے۔ وہ محبت سے رام ہو سکتا ہے چالاکی سے نہیں۔ وہ چالاکوں سے زیادہ چالاک ہے۔ شاعر اس کے پاس اپنے دیوان بھیجتے ہیں وہ اپنا قیمتی وقت صرف کر کے ان کی اصلاح کرتا ہے لیکن جتاتا نہیں۔ ان کی اشاعت میں مدد کرتا ہے لیکن کسی کو خبر ہونے نہیں دیتا۔ جھوٹ سے نفرت کرتا ہے سچ کا غلام ہے۔ اپنے مذہب کا احترام کرتا ہے اور دیگر مذہبوں کا بھی۔ غیبت کسی رنگ میں اسے پسند نہیں۔ کسی شاعر ادیب، نقاد یا محقق کا مقام وہ خود طے کرتا ہے اس کے لیے کسی کی سفارش نہیں چل سکتی۔ جدید شاعری اور نثری نظموں کا زیادہ قائل نہیں حالانکہ خود اس کی شاعری میں جدید خیالات شامل ہیں۔ آپ رضا کو صرف قدیم رنگ کا شاعر نہیں کہہ سکتے۔ وہ مغرور نہیں ہے لیکن بیحد خوددار ہے۔ بزرگوں کی عزت کرتا ہے۔ جوش ملیانی کا نام آتا ہے تو اس کا سر ادب سے جھک جاتا ہے اور وہ استاد کے سادہ طرز زندگی کی تعریف میں بے خود ہو جاتا ہے ان کے فن کی تعریف کرتا ہے ان کی اصلاحیں دہراتا ہے ان سے ملاقاتوں کے قصے سناتا ہے۔ دنیا کے سب لوازمات ہوتے ہوئے بھی خود اس کی زندگی استاد کی طرح سادہ ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں شہرت حاصل کرنے کے باوجود وہ ایک طالب علم ہے۔ سچے لوگوں کی قدر کرتا ہے جب تک کوئی سچائی پر چلتا ہے اس کا ہم سفر رہتا ہے۔ انسان بدلا رضا کا راستہ بدلا تنقید کے معاملے میں رضا کا دل جو صحیح سمجھتا وہ کہتا ہے وہ شخصیتوں سے نہیں دبتا۔ ایک

حال ہی کے انٹرویو میں رضا نے کہا ہے جو آدمی تحقیق کے میدان میں آجائے وہ مخالفت مول لے ہی بیٹھے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اب قدما کی لنظیں غزلیں آپ کو وہ لذت نہیں دیتیں جو آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے دیتی تھیں اب روایت اردو ادب پر اتنی حاوی نہیں ہے فضا پر حاوی ہو تو ہو لیکن ادب پر نہیں اب اساتذہ کی تقلید نہ تو کوئی پاکستان میں کرتا ہے اور نہ ہندوستان میں۔ غالب اپنی جگہ اٹل ہے کیوں کہ اس نے فکر انگیز کہا اور وہ ذہنوں میں گھس گیا ہے۔

اس معاملے میں میں رضا کی رائے سے پورا اتفاق نہیں کرتا لیکن میں اس بات کی رضا کو داد دیتا ہوں کہ جس بات کو وہ صحیح سمجھتا ہے وہ اس کے اظہار کا دم رکھتا ہے۔ ورنہ تنقید ایک مذاق ہے۔ اسی انٹرویو میں رضا نے ایک اور چونکانے والی بات کہی ہے۔ اگر کسی شاعر کی تعریف کی جائے تو عام طور سے وہ کہے گا۔ "بندہ کس قابل ہے" لیکن رضا نے ایسا کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ سوال کرنے والے صاحب نے ان سے کہا۔ "مجموعی طور پر نقاد حضرات کی شاعری پھیکے پن کا شکار رہی ہے آپ کے یہاں بھی غزلوں میں کہیں کہیں اس طرح کے بوجھل پن کا احساس ہوتا ہے" رضا نے جواب دیا۔ اس کا قصور تحقیق میں نہیں، اس میں نہ ڈھونڈیے۔ میں سمجھتا ہوں میں ایک اچھا شاعر ہوں معمولی شاعر نہیں ہوں۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ جب میں اپنے مدِ مقابل شعراء کو دیکھتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں کچھ شاعری نہیں بلکہ زبان اور شعری مزاج بھی ان کا کمزور ہے لیکن میرے ہاں آپ کو یہ چیزیں نہیں ملیں گی۔ یہ اچھی بات ہے کہ رضا یہ نہیں کہتے بندہ کس قابل ہے اس پر ایک سچا واقعہ یاد آرہا ہے یہ واقعہ جب بھی یاد آتا ہے مجھے ہنسی آجاتی ہے۔ ایک بار ایک بہت بڑے کلاسیکل ڈانسر بمبئی کے ایک فلم ساز سے ملے۔ فلم ساز نے کہا۔ "مجھے آپ کے فن سے بہت فائدہ ہوگا آپ بہت بڑے ڈانسر ہیں۔" ڈانسر نے کہا۔ "حضور میں کس قابل ہوں۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ میں تو بہت ہی نالائق ہوں۔" فلم ساز نے کہا اچھا ہوا آپ نے مجھے بتا دیا آپ جا سکتے ہیں کیوں کہ آپ تو کچھ جانتے ہی نہیں۔" اب اس نے بات پلٹی۔ اجی کون کہتا ہے فن رقص میں مجھ سے بہتر ہندوستان میں کون ہے اور فلم ساز ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گیا۔

ڈاکٹر آدم شیخ نے ایک مضمون میں لکھا ہے۔

"ایک مرتبہ رضا صاحب کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ اس مختصر سے وقفہ میں مجھے رضا صاحب کی ان کے خاندان سے محبت کا اندازہ بھی ہوا وہ گھر والوں سے دوستانہ ماحول میں ملتے ہیں،

ان کا بیٹا ان کا ساتھی لگتا ہے اور ان کی بیگم۔؟ اب میں کیا کہوں؟ کوئی تعجب نہیں اگر یہی محترمہ ان کے تغزل کا مرکز ہوں ڈاکٹر صاحب کے تاثرات میں چند سطور بڑھانا چاہتا ہوں۔ رضا صاحب کی بیٹی ایک لکھ پتی باپ کی بیٹی ہوتے ہوئے بھی ایک سکول میں کام کر رہی ہے روپے کے لیے نہیں بلکہ اس لیے کہ وہ کرم یوگی رضا کی بیٹی ہے۔

رسول کریمؐ نے فرمایا ہے "کسی شخص کی خوبیاں یا خامیاں جاننا چاہو تو اس کی بیوی سے دریافت کرو" میں سمجھتا ہوں اردو ادب سے رضا کی محبت کا بیان کرنے کے لیے اگر ایک پوری کتاب لکھ دی جائے تو اس کا اتنا اثر نہیں ہو گا جتنا ان کی رفیقۂ حیات شریمتی ساوتری دیوی کے ایک مضمون کی ان چند سطروں میں ہے۔

"میرے لیے ان کے ساتھ نباہ کرنے میں سب سے بڑی دشواری یہ رہی ہے کہ یہ اکثر اوقات اپنے کتب خانے میں منہمک رہتے ہیں۔ کبھی کبھی تو کسی مسئلے میں اتنے مستغرق ہو جاتے ہیں کہ کئی کئی دن ان سے بات کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ اسی انتظار میں رہتی ہوں کہ ان کا مضمون ختم ہو تو کچھ بات کروں۔ کبھی کبھی تو غصے میں کہہ بیٹھتی ہوں کہ غالب تو مر گیا۔ مگر ہمارے لیے مصیبت کھڑی کر گیا۔"

نذیر فتح پوری
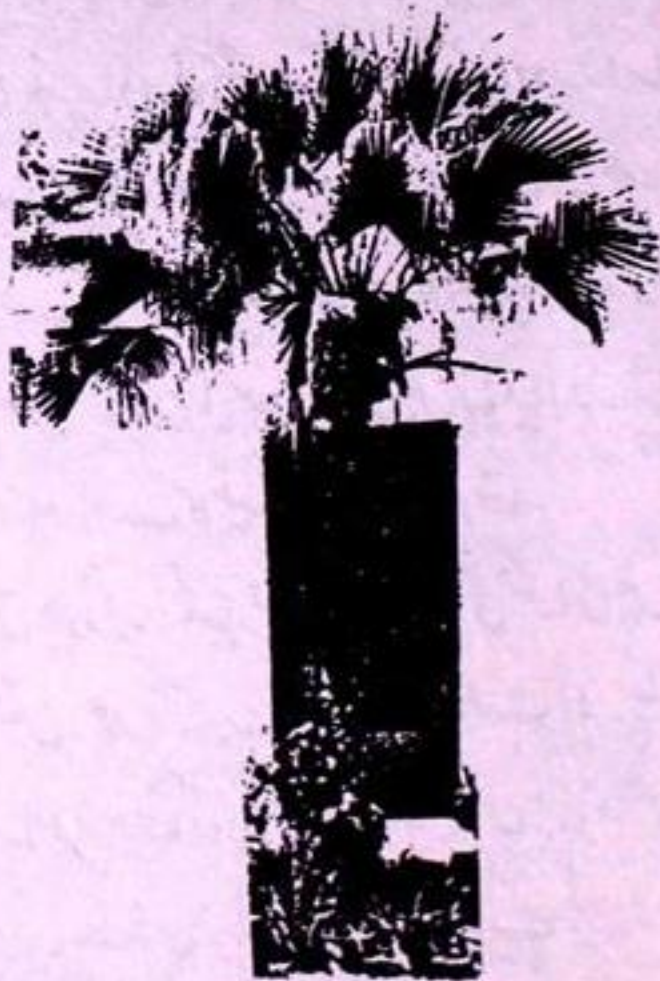
رضا صاحب

کالی داس گپتا رضا کا پہلا شعری مجموعہ "شعلۂ خاموش" ۱۹۶۸ میں شائع ہوا تھا اس مجموعہ کی تمام شاعری ملک سے دور ایک ایسے خطے کی دین ہے جہاں سے شعر تو کجا ایک مصرع تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس خطہ کا نام نیروبی ہے جو مشرقی افریقہ میں ہے رضا صاحب کا دولت کدہ شعر و ادب کا مرکز تھا۔ رضا صاحب کے علاوہ بھی نیروبی میں چند شعراء موجود تھے جن کا ذوقِ شعر گوئی رضا صاحب کے گھر سجی محفلوں ہی کی بدولت پروان چڑھا تھا، دن بھر کی کاروباری مصروفیات سے نبٹ کر جب وہ تنہائی کے گوشوں میں "فکر و فن" کی شمع روشن کرتے تو ہر طرف نور کی کرنیں پھوٹ پڑتیں انہیں کرنوں کے تار میں گندھا ہوا ان کا پہلا مجموعہ "شعلۂ خاموش" جب انڈو پاک کے اربابِ ذوق اور پرستارانِ شعر و ادب کے سامنے آیا تو آنکھیں خیرا ہو گئیں انڈو پاک کے ادبی رسائل میں بھرپور حاصل تبصرے ہوئے اربابِ فہم و فراست نے دل کھول کر داد دی اس غیر متوقع پذیرائی نے آگ پر تیل کا کام کیا اور دو سال بعد "شورشِ پنہاں" بھڑک اٹھی اور ۱۹۷۰ء میں نظموں اور غزلوں کا دوسرا انتخاب بھی چھپ گیا ادبی حلقے میں اس کی جو پذیرائی ہوئی اس سے رضا صاحب کی کشتِ فکر مہک اٹھی، لہلہاتے تخیل میں کلیاں چٹاک چٹاک گئیں شبنمی احساس ساون کی پھواروں میں نہا گیا اور "شاخِ گل" نے لچک کر اپنے وجود کا احساس دلا دیا یہ رضا صاحب کا تیسرا مجموعۂ کلام تھا۔

مذکورہ تینوں کتابیں عبدالحمید بوبیرے مرحوم کی نگرانی میں صبح امید پبلیکیشنز بمبئی کے زیر اہتمام چھپ کر منظرِ عام پر آئیں۔ عمدہ کتابت، بہترین طباعت اور چکنے کاغذ کی یہ کتابیں جہاں اپنے ظاہری حسن اور انفرادیت کی مظہر ہیں وہاں ان میں محاسنِ شعر کے اعلیٰ نمونے بھی پائے جاتے ہیں، رضا صاحب نے جس زمانے میں بھی شعر کہے ہیں وہ زمانے کے شعراء میں جدت پسند اور منفرد اسلوب کے حامل رہے ہیں۔

غزل، نظم، النعت، رباعی اور قطعہ، رضا صاحب نے ہر صنفِ سخن میں جولانیٔ طبع کے

جوہر دکھائے ہیں، ان کی ذات جہاں علم و دانش کا مخزن ہے وہاں مایۂ فکر کی بھی ان کے یہاں کمی نہیں ہے ان کا تخلیقی شعور جوہرِ شاعری سے مزین ہے اس لیے کلام میں فصاحت و بلاغت کے ساتھ ساتھ شعری طنطنہ بھی موجود ہے۔

رضا صاحب براہِ راست بات کہنے کے عادی ہیں اس لیے ان کی غزلیں ابہام سے پاک ہیں البتہ اب اپنی آزاد نظموں میں وہ ابہام کے التزام کو ترجیح دینے لگے ہیں۔

رضا صاحب کی تخلیقات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آئندہ بھی لکھا جائے گا کیونکہ رضا صاحب کی شاعری اُمڈے ہوئے جذبات اور پھیلے ہوئے احساسات کی غماز ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے قاری کو فہم و فراست اور نقد و نظر کی دعوت بھی دیتی ہے۔ ان کے فکری رجحانات کا تعلق براہِ راست انسانیت کے سکھ اور دکھ سے ہے، ایک عام آدمی کی طرح رضا صاحب حالات کی عنایت کردہ محرومیوں کے شاکی ہیں مگر وہ ایک جری اور باہمت انسان کی طرح زندگی کی توانائی اور دائمی تاب و تواں کے محافظ بھی ہیں۔

رضا صاحب شاعری میں غنائیت کو ترجیح دیتے ہیں، شاعری ان کی نظر میں تب تک شاعری نہیں جب تک وہ نغمہ کی زبان نہ بن جائے۔

رضا صاحب کی شاعری ترسیل و ابلاغ کا بہترین نمونہ ہے۔

رضا صاحب سے میری پہلی ملاقات "اسباق" کے توسط سے ہوئی تھی۔ کہیں اسباق کا اعلان دیکھ کر انھوں نے زرِ سالانہ بھجوا دیا تھا اس کے بعد جب وہ پونا تشریف لائے تو مجھے بلا بھیجا دورانِ گفتگو اس بات کا انکشاف ہوا کہ موصوف دس برسوں سے مسلسل پونا آجا رہے ہیں یہاں خائف اسٹار اپارٹمنٹ میں ان کا فلیٹ ہے دس سال کے طویل عرصہ میں پونا کے کسی بھی شاعر سے ان کی ملاقات نہیں ہوئی اس بات پر رضا صاحب نے افسوس بھی کیا اور حیرت بھی۔

رضا صاحب ہر دو چار مہینوں کے بعد جب دو چار دنوں کے لیے پونا تشریف لاتے ہیں تو دو چار بار میری ملاقات ان سے ضرور ہوتی ہے اور ہر ملاقات ان کی طرف سے ایک نیا انکشاف، نئی تحقیق اور نئی کہانی میرے ہاتھ میں تھما دیتی ہے۔ اور غالب اور چکبست سے متعلق میں نے ان کی زبانی جو کچھ بھی سنا ہے۔ اس کا اتفاق پہلے کبھی نہیں ہوا۔ جگہ تاریخ اور سنین کے حوالے سے جب وہ غالب کا دورہ اس کی زندگی کے حالات اور ز

اس کے شاگردوں کا احوال بیان کرتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے وہ غالب کے ہم عصر رہ چکے ہوں۔ غالب شناسی میں رضا صاحب ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ حالی کے بعد غالب کو نمایاں کرنے والوں میں رضا صاحب کا نام بھی سرفہرست ہے۔ چکبست کی شاعری اور زندگی پر تو رضا صاحب سے بڑھ کر کسی نے کام کیا ہی نہیں اور نہ کوئی آئندہ کر سکتا ہے۔ رضا صاحب اعلیٰ درجے کے رباعی گو بھی ہیں۔ "شعاع جاوید" کے عنوان سے ان کی بے مثال رباعیوں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ رباعیوں میں فکر انگیزی کے ساتھ ساتھ ان پر ایک دیدہ ور اور حساس شاعر کی فنکارانہ چابکدستی اور اسلوب کی پختہ کاری کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔

رضا صاحب شخصی اعتبار سے بھی وضع قطع کے انسان ہیں۔ ان کی طبیعت میں منکسر المزاجی اور رواداری بدرجہ اتم موجود ہے، خوش اخلاقی اور خوش گوئی انہیں قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی ہے وہ بے حد حساس اور نازک دل کے مالک ہیں، وسیع القلبی اور ذہنی فراوانی کی ان کے یہاں کمی نہیں۔

رضا صاحب کام کو فوقیت دیتے ہیں خود کام کرتے ہیں اور کام کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں تخلیقی اور تحقیقی کام کی تکمیل کے دوران انہیں زبردست مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن وہ حوصلہ کا دامن نہیں چھوڑتے، اپنے صبر و ضبط کی بے پناہ قوت کے باعث وہ کڑے سے کڑا مرحلہ اور پتھریلے سے پتھریلا راستہ مسکرا کر طے کر لیتے ہیں۔

رضا صاحب کو اردو زبان و ادب سے دلی رغبت ہے وہ اردو کو فروغ دینے کے لیے دوہری خدمات انجام دیتے ہیں جہاں وہ اُردو کے دامن کو تخلیقی اور تحقیقی جواہر پاروں سے مالا مال کرتے ہیں وہاں اردو کتب کی نشر و اشاعت کے لیے ان کا اپنا ایک پبلیکیشنز بھی ہے۔ نفیس تخیل، نفیس تخلیق، نفیس طبیعت اور نفیس کتابیں۔ رضا صاحب زندگی کے ہر شعبے میں نفاست پسند ہیں ان کی شخصیت جس قدر پرکشش ہے اتنی ہی منفرد طبیعت ان کی زبان میں ہے۔ وہ کہتے جائیں آپ سنتے جائیں، نہ وہ تھکیں، نہ آپ ہاریں۔

رضا صاحب پچھلی دہائی سے شہرت کے آسمان پر ہیں۔ یہ شہرت جلسوں، مشاعروں اور سیمیناروں کی پروردہ نہیں بلکہ شہرت کی دیوی ان کے مسلسل کام کی وجہ سے ان کے حضور سجدہ ریز ہوئی ہے۔ یہاں پھر ان کے کام کا ذکر آتا ہے۔ کام سے وہ کبھی نہیں تھکتے۔ جب بمبئی کی کاروباری زندگی سے اکتا جاتے ہیں تو رضا صاحب پونا تشریف لے آتے ہیں۔ پونا

ہیں آکر ان کا تخلیقی شعور ایک دم جاگ اٹھتا ہے۔ ہر ملاقات پر تازہ غزلیں، جدید نظمیں اور توبہ نور رباعیات، ان کے یہاں تخلیق کا ایک سیلاب سا امڈ آتا ہے۔

بمبئی میں قلم بند کیے اپنے تمام مضامین کی نوک پلک سنوار کر ان کو آخری نظر سے گزارنے کا عمل وہ پونا ہی میں انجام دیتے ہیں، رات رات بھر جاگ کر کتابت شدہ میٹر کی پروف ریڈنگ بھی پونا ہی میں کی جاتی ہے۔

پونا میں ان کی آمد کے بعد سے یہاں کی ادبی مجالس اور مشاعرہ گاہوں میں انقلاب سا آگیا ہے یہاں ان کی صدارت میں اکثر اسباق ٹرسٹ کی جانب سے آل انڈیا مشاعرے ہوتے ہیں جن کی کامیابی میں رضا صاحب کی شرکت کا بڑا ہاتھ ہے۔

اراکین اسباق اور رضا صاحب کے مابین ایک ناقابلِ فراموش تعلق استوار ہے۔ پہلی ملاقات میں وہ جس وارفتگی اور محبت سے پیش آئے تھے آج اس میں شدت پیدا ہوتی جارہی ہے ہمارے اور ان کے بیچ کوئی تکلف نہیں، اجنبیت نہیں۔ پردہ نہیں، راز نہیں۔ سب کچھ روزِ روشن کی طرح عیاں، اسباق کی بقا اور ترقی کے لیے صحت مند مشورے اور حتی المقدور تعاون۔

ہماری اڑچن اور پریشانیوں کا کوئی سدِباب نہیں لیکن ان کی حوصلہ افزا باتیں زخموں پر مرہم کا کام کرتی ہیں۔

پونا میں کتنے ہی دن کا قیام کیوں نہ ہو وہ کم از کم ایک شام حکیم رازی صاحب کے مطب پر ضرور تشریف لاتے ہیں ان کی اہلیہ محترمہ جتنی دیر کیمپ کی خوبصورت دکانوں میں شاپنگ کرتی ہیں اتنی دیر علم و ادب کا یہ ابرِ بے پناہ حکیم صاحب کے آسمانِ مطب سے برابر تشنگانِ ادب اور طالبانِ شوق کو سیراب کرتا رہتا ہے۔

رضا صاحب ہمارے عہد کی معتبر پہچان ہیں۔ تحقیق میں ان کا مقام وہی ہے جو شاعری میں میر و غالب کا۔ تنقید میں بھی وہ کسی سے ہیٹے نہیں اگرچہ وہ اس کا اقرار نہیں کرتے۔ رضا صاحب بذاتِ خود تنقید کے قائل نہیں اپنے اس موقف پر میری موجودگی میں ڈاکٹر عصمت جاوید سے ان کی ایک مدلل اور طویل مگر تعمیری بحث ہو چکی ہے۔ دونوں کی باتیں اس قدر مدلل، پُر مغز اور معلوماتی تھیں کہ میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ طرفین اپنے اپنے موقف پر ہمالیائی انداز سے ڈٹے رہے اور میں ادب پاروں سے اپنا دامن بھرتا رہا۔

ظفر ادیب مرحوم نے رضاؔ صاحب پر ایک مکمل کتاب لکھی ہے جسے جناب مانک ٹالا نے اپنے ادارے سے شائع کیا ہے۔ قمر جلال آبادی، اعجاز سیمابی بھی ان پر مسلسل لکھ رہے ہیں (ان کے مضامین ابھی تک منظرِ عام پر نہیں آئے ہیں) ڈاکٹر گیان چند نے بھی رضا صاحب کی فنی اور عروضی معلومات پر اپنے مضامین میں پر زور بحث کی ہے۔ مشہور شاعر اور ادیب راہی قریشی نے رضا صاحب پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ ماہنامہ شاعر نے ان پر بھرپور گوشہ شائع کیا ہے جس کی حیثیت خود ایک نمبر کی سی ہے۔ ملک کی متعدد اکیڈمیوں نے انہیں مختلف انعامات سے بھی نوازا ہے لیکن یہ پذیرائی اور انعامات ان کی ادبی خدمات اور صلاحیتوں کے سامنے کوئی کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ وہ ایسے اعزازات سے قطعی بے نیاز ہیں ؎

اب کہاں لوگ اِس طبیعت کے

محمد ایوب واقف

ایک تاثر

اردو زبان کے سیکولر مزاج نے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دوسرے فرقوں کے افراد کو بھی اپنا گرویدہ بنایا اس کی اصل وجہ یہ رہی تھی کہ اس کے خمیر میں محبت، انسان دوستی، یگانگت اور رواداری کے عناصر بھرپور شکل میں داخل تھے۔ چونکہ اردو زبان کے اس طرزِ سلوک کے ساتھ جذبے کی بے پناہیت اور خلوص و نیک نیتی کی ہمہ گیری وابستہ تھی اس لیے بلا تفریق مذہب و ملت لوگ اس کی طرف دیوانہ وار لپکے اور اسے سینے سے لگایا چنانچہ آپ دیکھیں گے تو پتہ چلے گا کہ اردو کی ارفع اور پر شکوہ و پر وقار محفل میں امیر خسروؔ، میرؔ، غالبؔ، داغؔ اور اقبالؔ کے ساتھ ساتھ ہرگوپال تفتہ، لالہ سری رام، منشی نولکشور، چکبست، جوش ملسیانی، پریم چند اور فراق گورکھپوری جیسے ائمۂ فکر و دانش بھی شریک ہیں۔

برصغیر کی گنگا جمنی تہذیب کی پروردہ اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی چہیتی اور منھ لگی اس البیلی اور سریلی زبان کے جاں نثاروں میں ہندوؤں کی تعداد کسی دور میں بھی کم نہیں رہی ہے اور نہ ہی ہندو اردو زبان کی خدمت میں مسلمانوں سے کسی طرح پیچھے رہے ہیں چنانچہ آج بھی آپ دیکھیں گے تو اردو کے کارواں میں ہندو ادیب و شاعر نمایاں مقام کے حامل ہیں۔ مالک رام، گیان چند جین، جگن ناتھ آزاد، راجندر سنگھ بیدی کون ہے جو ان کی اردو دوستی اور ان کے ادبی مقام سے انحراف کی جرات کر سکتا ہے۔

جناب کالی داس گپتا رضا ہمارے عہد کے ایک ایسے ہی فنکار ہیں۔ آپ عقائد کے اعتبار سے ہندو ہیں لیکن اردو اور اردو کے ادبی و تہذیبی سرمائے کے ایک ایسے عاشقِ نامدار ہیں کہ اردو کی ادبی تاریخ میں ایک محترم اور منظم شخصیت کی حیثیت سے حین حیات ہی محفوظ

ہو گئے ہیں۔ زمانے کی بادِ سموم ان کے نام نامی اور ان کے فن کی پرکاری و نادرہ کاری کو صفحۂ ہستی سے مٹانا بھی چاہے تو مٹا نہیں سکتی اس لیے کہ اس کے نقوش بہت گہرے ہیں۔

کالی داس گپتا رضا اور اردو زبان دونوں لازم و ملزوم بن چکے ہیں اردو ان کی بول بات اور گفتگو کی ہی زبان نہیں بلکہ ان کا اوڑھنا بچھونا اور ان کا دین و ایمان بن چکی ہے وہ جہاں بھی ہوتے ہیں اس کے ذکر اور اس کے چرچے سے ارد گرد کی فضا کو معطر اور خوشگوار بنا دیتے ہیں جب وہ ہندوستان سے ہزاروں میل دور نیروبی کے غیر اردو ماحول میں تھے تو وہاں بھی انھوں نے مادر وطن کی اس حسین و جمیل زبان کی شعر و شاعری کا بازار گرم رکھا اور جب سالہا سال کے دیارِ غیر کے قیام کے بعد اپنے وطن عزیز کو واپس آئے تو ان کی اردو دوستی اور ان کی ادبی مصروفیتوں میں اور اضافہ ہو گیا اور اب تو اردو زبان کے ساتھ ان کا عشق اس مقام تک پہنچا ہے کہ ع

من تو شدم تو من شدی .....

کالی داس گپتا رضا صاحب گزشتہ ایک دہے سے بمبئی میں اقامت پذیر ہیں اور میں بھی اتفاق سے یہیں پر مقیم ہوں لیکن ان سے ملاقات کے مواقع بیش از بیش نہیں ملے۔ دراصل گپتا صاحب سے بالمشافہ گفتگو کے مواقع ملتے بھی کم ہیں اس کا سبب یہ نہیں کہ وہ ملنے جلنے کے قائل نہیں یا وہ بہت عدیم الفرصت ہیں دراصل ان سے ملاقات اور ان سے گفتگو کے مواقع کی عدم دستیابی کی اصل وجہ ان کی گوشہ نشینی اور نام و نمود کی خواہش سے بے توجہی ہے ان کے سارے کاروبارِ زندگی ان کے گھر اور ان کے دفتر تک محدود ہیں۔ وہ مجلسی اور نمائشی طور طریق کے انسان نہیں ہیں ادبی مشیخت، عیاری و شعبدہ بازی ان کا شیوہ نہیں۔ اپنی شہرت اور فنکارانہ عظمت کی ڈگ ڈگی بجانے سے انھیں خدا واسطے کا بیر ہے۔ سادہ دلی و سادہ نفسی، ذہن کی صفائی و طراوت حلم و انکساری اور عجز و فروتنی وہ خوبصورت عناصر ہیں جن کے اختلاط سے ان کی پہلودار اور مقناطیسی شخصیت کا تانا بانا تیار ہوا ہے اللہ نے انھیں دولت سے نوازا ہے لیکن امیرانہ کر و فر اور غرور تملّق کا مظاہرہ کرتے انھیں کسی نے نہیں دیکھا۔

اگرچہ زمانے کی کچھ روشیں اور قدریں فی زمانہ بدل گئی ہیں ماضی میں ارباب فکر و دانش شور و غل کی زندگی سے دور کنج تنہائی میں بیٹھ کر فکر و فن کی شمع روشن کرتے تھے اور پروانے فکر و فن کی روشنی سے مسحور ہو کر اس پر ٹوٹے پڑتے تھے لیکن اب علم و ادب کی دنیا کا حال بدلا ہوا ہے اب علم کم ہے اور اس کا شور زیادہ ہے اب شام میں ہمارا شاعر کوئی غزل کہتا ہے تو صبح کو شہنشاہ غزل

کہلانے کی سبیلیں تلاش کرنے میں سرگرداں ہو جاتا ہے ادیب الثاشاید ہی کوئی مضمون لکھ کر ادیبوں کی فہرست میں شامل ہونے کے سوجتن کرتا ہے کالی داس گپتا رضا صاحب اس نوع کی شہرت اور نمود و نمائش کے قطعاً طلبگار نہیں ہیں انھیں ابھی بھی اس امر پر یقینِ کامل ہے کہ علم اور فکر کی گہرائی جہاں بھی ہو گی بحرِ علم کے شناور ایک نہ ایک دن اس کا پتہ ضرور چلالیں گے۔ اگرچہ رضا صاحب کا یہ راستہ اور ان کا یہ ادبی اصول مشکل اور جگر خراش ہے لیکن وہ ہوشیار ہیں کہ اس پر عمل پیرا اور کاربند ہیں اس لیے کہ دائمی عظمت اور مقبولیت کا راستہ یہی ہے باقی راستے وقتی چکاچوند کے راستے ہیں جو ذرا دیر تک راہروِ کو روشنی دکھا کر اسے اندھیروں کے غار میں ڈھکیل دیتے ہیں اور پھر کہیں ڈھونڈھے سے بھی اس کا نشان نہیں ملتا۔

میں نے ابھی کسی مقام پر آپ سے کہا ہے کہ گپتا صاحب سے میری ملاقاتیں کم ہی رہی ہیں لیکن اب اس قدر کم بھی نہیں رہی ہیں کہ ان کی شخصیت کے داخلی و خارجی عناصر کو سمجھنے میں مجھے کوئی دشواری پیش آئی ہو۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کی شخصیت کے اصل روپ کو تلاش کرنے میں مجھے کچھ منفی صورتوں سے گزرنا پڑا ہے دراصل سچائی کا یہ مطالبہ بھی ہوتا ہے کہ اس پر ایمان لانے سے قبل کذب و ریا پر ایک نگاہ ڈال لی جائے ایسی صورت میں بہکنے اور بھٹکنے کے اندیشے کم سے کم ہو جاتے ہیں۔

اب یہ تو یاد نہیں کہ یہ کس سال کی بات ہے لیکن آپ اتنا جان لیں کہ گپتا صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی شخصیت کی ظاہری نمود و نمائش کچھ اس طرح کی تھی کہ مجھ پر اس کا اثر تو ہوا لیکن دل میں یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ اس ظاہری نمود و نمائش سے ان کے باطن کا کیا تعلق ہے اور جب تک باطن کی صفائی و ستھرائی اور عمدگی و پاکیزگی کا علم نہ ہو اس وقت تک کسی کے بارے میں وثوق سے کوئی رائے قائم کرنا کارے دارد والا معاملہ ہے۔

بہر حال آمد و رفت بڑھی بیگانگی اور تکلفات کی ساری بندشیں ایک ایک کر کے ٹوٹیں اور اجنبیت کی جگہ پر آہستہ آہستہ شناسائی اور بے تکلفی کا رنگ حاوی ہوا تو پتہ چلا کہ حضرت رضا ظاہراً جتنے نفیس اور صاف ستھرے نظر آتے ہیں اور شکلاً جتنے من بھاونے ہیں اندر سے بھی انھیں خوبیوں اور خوبصورتیوں کے حامل ہیں یعنی ان کے ظاہر و باطن میں بعد اور تضاد نہیں بلکہ یک رنگی و یکسانیت ہے ان کے ظاہر و باطن کی یہی یکسانیت دراصل ان کی عظمت کا درخشندہ نشان ہے۔

ہمارے سماج کی یہ بہت پرانی روایت ہے کہ جب کوئی شخص زندگی کے کسی میدان میں

نیک نامی اور ناموری حاصل کرتا ہے تو فتنہ پردازوں کی ریشہ دوانیاں اس کے آگے پیچھے چلنا شروع کر دیتی ہیں ایسے لوگ بہتان تراشی اور ہرزہ درائی کے ذریعہ اس کی نیک نامی کو بٹہ لگانے کی گھناونی سازش شروع کر دیتے ہیں۔ کالی داس گپتا رضا کو اس طرح کے حالات کا بھی سامنا کرنا پڑا ہے شاعری کے ساتھ ساتھ فن تحقیق نگاری میں جب انھوں نے اعلیٰ تحقیق کے نمونے یکے بعد دیگرے پیش کرنا شروع کئے اور اردو کے سربرآوردہ محققین کی صف میں اپنا بلند مقام بنانا شروع کیا تو بعض شر پسند ذہنوں کو یہ بات پسند نہیں آئی اور انھوں نے کچھ حقیقت سے عاری اور بعید از قیاس باتوں کو ان سے منسوب کر دیا۔ مگر گپتا صاحب کا کمال یہ ہے کہ اس طرح کے حوصلہ شکن ماحول کے باوجود انھوں نے طبیعت میں تنفر نہ پیدا ہونے دیا اور نہ ہی کبھی کسی کے لیے بازاری الفاظ یا سوقیانہ کلمات استعمال کئے ان کی متانت اور سنجیدگی ان کی ثقاہت اور رواداری جو انھیں ان کے بزرگوں سے ورثے میں ملی تھی ہر حال میں قائم رہی وہ چاہتے تو ظاہرداری اور زمانہ سازی کے لیے فتنہ پردازوں کی ریشہ دوانیوں کے خلاف مورچہ بنا سکتے تھے لیکن ان کی سلامت روی اور ان کے مزاج کی نرمی اور ملائمت نے انھیں ہر فتنے سے علیٰحدہ رکھا اور بس وہ اپنے تحقیقی کاموں میں ہمہ وقت مصروف رہے اس کا خوشگوار نتیجہ یہ سامنے آیا کہ لوگ ان کی محنت اور جگر خراشی کے آہستہ آہستہ قائل ہونے لگے اور اب تو وہ اردو تحقیق نگاری کے ایک اہم ستون کا درجہ اختیار کر گیے ہیں اور لوگ ان کی تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں کا لوہا ماننے لگے۔ قاضی عبدالودود ہوں، یا گیان چند جین، مالک رام ہوں یا صباح الدین عبدالرحمٰن سب ان کے مداح و معترف ہیں۔

کالی داس گپتا رضا کی شاعری ہو یا ان کی نثر نگاری ادب کے ان دونوں گوشوں میں انھیں بلند مقام حاصل ہو چکا ہے عقیدے اور فکر کے اعتبار سے نہ وہ جدیدیئے ہیں اور نہ روایت پسند میرا خیال ہے کہ ایک صاف ذہن کے ادیب و شاعر کے لیے اس قسم کے لیبلوں کی ضرورت بھی نہیں ہوتی شاعر اور ادیب کو بنیادی طور پر پہلے عمدہ انسان ہونا چاہیے انسانیت اور اخلاق کی اعلیٰ قدروں کے لیے اس کے سینے میں درد اور تڑپ ہونی چاہیے یہ چیزیں اگر ہیں تو پھر اسے کسی اور لیبل کی ضرورت نہیں اچھا اور تعمیری ادب اچھے ذہن کی ہی پیداوار ہو سکتا ہے جدیدیت اور ترقی پسندی سے اگر اعلیٰ اخلاقی اقدار کا تحفظ نہیں ہوتا تو پھر ادب کے یہ دونوں ہی رخ بے معنی اور بے مقصد ہیں مسرت کا مقام ہے کہ گپتا صاحب کی شاعری اور نثر کا آبگینہ انسانی زندگی کے ان جواہر پاروں سے مزین ہے ان کی سوچ میں تخریب کے عناصر نہیں تعمیری کوائف پوشیدہ ہیں ان کا ذہن پراگندہ نہیں پاک وصاف

ہے اس لیے گپتا صاحب کی شاعری بھی اچھی ہے اور نثر نگاری بھی۔ تعصب اور تنگ نظری کی عینک اتار کر غیر جانبداری کے ساتھ اگر "شعلۂ خاموش"، "شورش پنہاں" اور "شعلۂ جاوید" وغیرہ کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ان میں انسانی زندگی کو سنوارنے اور نکھارنے کے بہت سارے راستوں کی نشاندہی ہے مشرقی ذہن کے وہ اوصاف جن کی کارفرمائی مولانا شبلی، مولانا حالی، اقبال سہیل اور سیماب اکبرآبادی وغیرہ کے کلام میں بہتر ڈھنگ سے ہوتی ہے جناب کالی داس گپتا رضا کے کلام میں بھی نظر آتی ہے۔ اس لیے اگر شبلی، حالی، اقبال سہیل اور علامہ سیماب اکبرآبادی کے کلام کے زندہ رہنے کی ضمانت دی جاسکتی ہے تو پھر میں کہوں گا کہ جناب کالی داس گپتا رضا کا کلام بھی زندہ رہے گا کیونکہ پیغام تو ایک ہی ہے پیغام کی ترسیل کے لیے استعمال کئے جانے والے پیرائے میں تضاد ہے اور اس طرح کے تضاد سے پیغام کی اہمیت داغدار نہیں ہوتی۔

گزشتہ تین چار دہوں سے غالب ہمارے اردو محققین پر بری طرح مسلط ہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ غالب پر لکھنا فیشن بن گیا ہے میں سمجھتا ہوں غالب پر جس قدر کتابیں اور مضامین لکھے گیے اردو کے کسی اور شاعر پر نہیں لکھے گیے (اگرچہ پچھلے دس برسوں میں اقبال پر بھی اچھا خاصہ کام ہوا ہے لیکن ابھی اتنا نہیں ہوا جتنا غالب پر ہوا ہے) ایسے میں غالب پر کوئی نیا خیال یا نیا نقطہ پیش کرنا یا ان کی زندگی کے کسی اچھوتے پہلو کو طشت از بام کرنا دشوار گذار امر ہے لیکن یہ بات بھی بلاشبہ مسرت بخش اور توجہ طلب ہے کہ جناب کالی داس کی مطبوعات "دعائے صباح"، "متعلقات غالب" اور "غالبیات چند عنوانات" غالب سے متعلق ایسی تصانیف ہیں جو غالب کی حیات اور ان کے فن کے بعض انتہائی اہم گوشوں پر روشنی ڈالتی ہیں ان تصانیف کی ترتیب و تدوین کے ذریعہ جناب رضا نے اردو کے محققین کو یہ باور کرایا ہے کہ موضوع کتنا ہی گھسا پٹا ہو اگر تحقیقی ذوق اور دقیقہ آفریں طبیعت ہو تو نئے گوشے اور اچھوتے پہلو تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ غالبیات چند عنوانات جو ان کی تازہ ترین تصنیف ہے علمی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جارہی ہے۔

دراصل کالی داس گپتا رضا صاحب کا سب سے اہم اور بنیادی کام وہ ہے جو انھوں نے چکبست پر کیا ہے۔ چکبست ہماری اردو شاعری کا ایک اہم نام ہے ان کی قومی و وطنی شاعری نے اردو کے شعری سرمایے کو بہت وقیع اور گرانقدر بنایا ہے چکبست کے کلام میں ایک ایسی محیر العقول فصاحت اور معجزانہ بلاغت ہے کہ اس کے مطالعہ سے وقت کے بڑے بڑے فصحا بھی انگشت بدنداں رہ گیے۔ زبان اخلاق، شاعری، سیاست، فلسفہ تعلیم اور مذہب اور ایسے انگنت موضوعات پر انھوں نے اس درجہ

خوبصورتی سے نظمیں اور غزلیں کہی ہیں کہ قاری ان کے مطالعہ سے دم بخود ہو کر رہ جاتا ہے حیرت ہے کہ مجمع کمال کا ایسا مہر تاباں ایک طویل عرصہ تک گوشۂ اہمال میں کیوں پڑا رہا۔ کالی داس گپتا رضا صاحب یقیناً ہماری تمام تر توجہ اور ستائش کے مستحق ہیں کہ انھوں نے چکبست کے بکھرے ہوئے کلام کو بڑی محنت اور جانفشانی سے جمع کیا اور پھر کلیات چکبست" کی شکل میں انتہائی قرینے اور سلیقے کے ساتھ شائع کیا۔ کلیات چکبست کا مقدمہ اور اس کے حواشی کی بھی بڑی اہمیت و افادیت ہے کیونکہ ان کے ذریعہ عہد چکبست کے گوناگوں ادبی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی معاملات و مسائل کی عکاسی ہوتی ہے انصاف کی نگاہ سے اگر دیکھا جائے تو کلیات چکبست مواد اور معیار دونوں ہی حیثیت سے اردو ادب میں ایک زبردست اور قابل قدر اضافہ ہے چکبست کی شاعری کے مقام اور معیار کے تعین میں اس سے پوری مدد ملے گی۔

کالی داس گپتا رضا صاحب کا ایک بڑا اور قابل ستائش کام یہ بھی ہے کہ انھوں نے اردو کے درجنوں ایسے شاعروں کو قعر گمنامی سے نکالا ہے جن کے نام اور کام دونوں سے ہماری واقفیت نہیں کے برابر تھی اردو کے ان گمنام شاعروں پر ان کے تعارفی مضامین ہندوستان کے متفرق رسائل اور اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔

عین اختتام پر رضا صاحب کے بارے میں یہ کہنا حق بجانب ہو گا کہ ان کی ادبی شخصیت بڑی بھرپور اور پہلو دار ہے اپنی اس مسلم الثبوت ادبی شخصیت کی تعمیر میں کیا کیا ہفت خواں طے کرنے پڑے ہیں اس کا اندازہ ان کی تصانیف اور درجنوں مضامین کے مطالعہ سے بخوبی ہو جاتا ہے اردو زبان اور ادب کی تشکیل اور ترقی کے لیے ان کی ذات بڑی بابرکت اور کارآمد ہے ہم اردو والوں نے اگر ان کی اردو خدمات کی قدر و ستائش سے دانستہ یا نادانستہ طور پر پہلوتہی کی تو یہ بات یقیناً احسان فراموشی کے مترادف ہو گی۔

اعجاز سیمابی

چراغاں

Multi-dimen-
-sional

کرۂ گیتی کے کسی بھی معاشرے میں کثیر الجہات شخصیتوں کی اہمیت اس وجہ سے زیادہ قابل قدر ہے کہ وہ تعداد میں نہ ہونے کے برابر قلیل ہوتی ہیں۔ یہی اُن کی افادیت و قیمت ہوتی ہے۔

محترم کالی داس گپتا رضا ان میں سے ایک ہیں۔ میں موصوف سے اس وقت سے آگاہ ہوں جب ان کا اولین مجموعۂ کلام "شعلۂ خاموش" جب وہ مشرقی افریقہ میں تھے، ہندوستان کے عروس البلاد بمبئی کے ماہنامہ "صبح امید" کے ادارے کے تحت اشاعت کی منزل میں تھا۔ عجیب اتفاق ہے کہ مدیر صبح امید مرحوم عبد الحمید بوبیرے نے مجھ کو ہی اشاعت کا پروف ریڈر مقرر کیا تھا۔ پھر "شورش پنہاں" دوسرا مجموعۂ کلام وجود میں آیا، اس کی اشاعت تک بابوجی (گپتا رضا صاحب) نقل مکان کر کے بمبئی میں سکونت پذیر ہو چکے تھے۔

عبد الحمید بوبیرے مرحوم کی نواسی کی شادی کے موقع پر مجھے صابو صدیق پالی ٹکنک میں موصوف سے پہلی بار بالمشافہ شرف نیاز حاصل ہوا۔ فوٹو پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ شعلۂ خاموش کے مبصّر کی حیثیت سے وہ مجھ سے غائبانہ متعارف ہی تھے۔ موصوف سے یہ پہلی ملاقات بہت مختصر رہی بمشکل تمام پندرہ منٹ۔ اس کے بعد جبکہ ان کی کئی کتابیں اُردو ادب میں اضافہ کا باعث بن چکی تھیں۔ خوش قسمتی سے ایک دن وہ بھی آیا جب میں موصوف سے اُن کے دفتر واقع میرین لائنس چرچ گیٹ میں ملا اور قصّہ کوتاہ ملازم بھی ہو گیا۔ یہ وہ ملازمت تھی جس کے متمنی امیدوار بڑے بڑے تھے۔

خیر اب آہستہ آہستہ مجھے اُن کو قریب سے دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے کا موقع ملا۔ اور اس طرح اس کثیر الجہات شخصیت کے فضائل کے پردے میرے سامنے اٹھنا شروع ہوئے۔ پہلی بات جلد ہی یہ محسوس ہوئی کہ یہ شخص کسی بھی قسم کے فضول شوق سے قطعی مبرا ہے۔ فیصلہ کرنے کا مقام ہے کہ جو شخص بیڑی، سگریٹ حد یہ کہ میٹھے پان تک کا شوقین نہ ہو اُسے آخر دوسرا کون سا شوق مبارک ہو سکتا ہے۔ جیسے جیسے وقت آگے بڑھتا رہا۔ ہر بار کچھ نہ کچھ نیا اندازِ فکر و عمل میرے سامنے آ

رہا۔ اور میں نے اپنے طور پر اُن کو کیا کچھ پایا یہ آئندہ سطور میں ملاحظہ کیجیے۔

ہاں تو میں نے بابوجی کو ایک شریف الطبع ایسا انسان محسوس کیا جس پر حرف زنی کھیل نہیں اگرچہ میں انہیں معصوم نہیں گردانتا۔ ان کی شخصیت کا اس سے بڑا اجاد داور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ ہر ملاقاتی کے ذہن و دل سے محو نہیں ہو پاتے۔ اخلاق کریمانہ واوصاف حمیدہ سے مزین یہ شخصیت اس لیے کثیر الجہات ہونے کا دعویدار ہو سکتی ہے کہ وہ ایک وقت میں عظیم شاعر، فنِ عروض کی معلومات کے خزانے، نثری انشائیہ پر خاصے قادر، تحقیق کے مردِ میدان اور ناقابلِ فراموش ہیرو ہونے کے علاوہ تجارتی امور میں یگانۂ روزگار اور خاصے دولت مند، انگریزی ادب کے دلدادہ اور قابلِ رشک مطالعہ کے حامل، ہاکی کے بہترین کھلاڑی، ہاتھ دیکھنے میں یدِطولیٰ رکھنے والے اونچے درجے کے شطرنج کھیلنے والے، ہومیو پیتھی کے زبردست مسیحا ڈاکٹر، ستار، طبلہ بجانے میں ماہر، گائیکی کے کلاکار پھر اس سب سے ہٹ کر بخیر، متواضع، دردمند، شریف شوہر، معاون آقا، مشفق باپ اور کام آنے والے دوست انسان ہیں۔ کسی کی مصیبت پر تڑپنے کے عادی، لیکن اس کا اظہار الفاظ سے کم اور عمل سے زیادہ کرتے ہیں۔ کسی حاجت مند کی ضرورت پوری کریں تو یہ محسوس ہو کہ ایک قسم کی ندامت کا احساس لیے ہوئے ہیں۔ وہ محاورہ ہے کہ اس طرح عطا کرو کہ ایک ہاتھ کا علم دوسرے ہاتھ کو نہ ہو، وہ بابوجی میں نظر آیا۔ ایک عجیب قسم کی لجاجت محسوس کرتے ہیں گویا ان پر قرض واجب الادا ہے جس کی ایک قسط خوش مدے ادا کر رہے ہیں۔ مالی مداد، علمی تعاون، مشاورتی عمل میں وہ اس طرح پیش آتے ہیں گویا یہی ان کا کام ہے جسے وہ فرض سمجھ کر ادا کر رہے ہیں۔ پھر اس پر ظرف عالی کا یہ مظاہرہ کہ نوکِ زبان پر بھی بات نہیں آسکتی۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ وہ بے شمار شعری اصلاحات کا کام کرتے ہیں۔ جانے کہاں کہاں سے بڑے بڑوں کا کلام نظرِ ثانی کے لیے آتا ہے اور وہ اسے چشم زدن میں اس طرح پایۂ تکمیل کو پہنچا دیتے ہیں گویا نہایت سوچ وچار اور محنت کے بعد یہ کام انجام پایا ہو۔

بڑے لوگ تو بہت دیکھے ہیں مگر بابوجی کی بات ہی کچھ اور ہے۔ اور یہ غالباً آخری نمونہ ہیں جسے عرفِ عام میں اپنی مثال آپ کہتے ہیں۔

بابوجی کبھی "چھوٹا ہاتھ" ثابت نہیں ہوئے "چھوٹا" ہاتھ اس طرح کہ بابوجی فلکچوایشن Fluctuation کو اپنے dealings میں لانا پسند نہیں کرتے۔ مثلاً آپ نے آمد و رفت CONVEYANCE کا کوئی بل bill مبلغ تیرہ روپے ۲۵ پیسے پیش کیا وہ اسے بغیر کسی اعتراض کے OK کر کے پورے چودہ روپے یا پھر موڈ میں ہوئے (جیسا کہ اکثر رہتے ہیں) تو پندرہ روپے پورے

ادا کریں گے۔

وہ کسی کی بھی پریشانی پر کافی حد تک تڑپ اٹھتے ہیں، ان کی تڑپ لفظی نہیں، بلکہ عملی بشکل تعاون ہوتی ہے۔ میرے علم میں ایسے بزرگ بھی ہیں کہ زندگی میں تو بابوجی نے اُن کے ساتھ ان گنت احسانات کیے، اگرچہ ان کا احساس دوسروں، یعنی دیکھنے اور سننے والوں کو تو ہوا لیکن خود متعلقہ شخصیت کو نہیں ہوا۔ اگر بالفرض محال ہوا ہی تو کم ہوا۔ ان کی موت وزیست کی کشمکش کے موقع پر بھی بابوجی نے یہ کہہ کر سلوک کیا کہ "ان کا وقت آخر ہے ممکن ہے کچھ خدمت میرے ذریعہ ہو جائے"۔ یہ جذبہ بابوجی میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

حسابات کے سلسلے میں ایک بات خوب یاد آئی۔ ذرا معیار شرافت تو دیکھئے۔ آپ کوئی بھی بل پیش کیجیے جس میں کسی بھی مقام تک بس یا لوکل ٹرین کا کرایہ آپ نے ۲ روپے ۳۰ پیسے درج کیا ہے اور آئندہ آپ نے اسے بجائے زیادہ کرنے کے (چونکہ مہنگائی کے دنوں میں اضافہ کا ہی امکان ہے) ۲۵ پیسے درج کیا تو بابوجی کسی بھی عنوان سے یہ ظاہر کر دیں گے کہ وہ کرایہ پہلے ۳۰ پیسے تھا اور اب ۲۵ پیسے کس طرح ہے۔ یا یہ غلط یا وہ غلط لیکن اس کا اثر عملی طور پر وہی ہوگا جو بیان کیا جا چکا ہے (کہ بل سے زیادہ ادا کر دیتے ہیں) اس طرح کی حسابی ہوشمندی میں ظرف کا عالی ہونا معمولی بات نہیں ہے۔ ملازمین کی اصلاح کا ایک یہ بھی طریق ہے کہ وہ دیانتداری سے کام لیں، اور غلط بیانی نہ کر سکیں یہی وجہ ہے کہ آپ ہمیشہ یہی کہا کرتے ہیں کہ بڑے لوگوں کی ایک بڑائی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ معمولی باتوں کو نظرانداز کر دیتے ہیں، یہ نہیں کہ وہ جانتے نہ ہوں، وہ احمق نہیں ہوتے، نہ انہیں احمق بنایا جا سکتا ہے۔

بابوجی کا ایک طریقۂ کار یہ ہے، جو انتہائی قابل قدر اور ستائش کا حقدار ہے کہ وہ اپنے ملازم کو کبھی جواب نہیں دیتے، جواب دینے سے میری مراد ملازمت سے جواب دینا یعنی برخواست کرنا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنی مرضی سے کچھ بھی طریقہ اختیار کرے۔ یہ اس کے قوت ہاضمہ یا خاندانی نجابت پر منحصر ہے۔ پھر بھی بابوجی اس کے معاون ثابت ہوتے ہیں۔ قطرہ قطرہ یہ بات چھوٹے صاحب (بابوجی کے صاحبزادے) میں بھی آتی جا رہی ہے۔ عطاو بخشش بابوجی کی گھٹی میں شامل ہے اور پھر یہ کام اس طرح انجام دیا جاتا ہے کہ سامنے والا خفت محسوس نہ کرے۔ ضرورت مند کے جذبات کا احترام اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے۔

ملازمین سے حقیقی آقا کا تعلق قائم رکھنا بابوجی کے طرزِ عمل سے ظاہر ہے۔ وہ ان کے ساتھ

شفقت کا برتاؤ اپناتے ہیں، صرف زبانی تسلی نہیں دیتے بلکہ ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔ ملازمین کو ان کے سہارے کا انحصار ان کو حد درجہ مطیع ہونے میں مدد دیتا ہے۔ بابوجی اکثر کہا کرتے ہیں کہ نوکر رکھنا تو آسان ہے اُن کو قائم رکھنا کتنے لوگ جانتے ہیں۔ ان کو رکھنا اولاد کو پرورش کرنے سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ ذرا سوچیے کہ جو شخص ان زریں خیالات کا عملی انسان ہو۔ اس کی توصیف کے لیے الفاظ کی تلاش آسان نہیں ہے۔

حسن انتظام کی صلاحیت سے بابوجی پوری طرح انگریزی تنظیم discipline اور بھارتی تہذیب کے آداب کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ ایسا تو کہیں دیکھا نہیں ہے کہ ملازمین کو ایک دوسرے کی تنخواہ کا علم نہ ہو۔ بس یہ محسوس ہو کہ اس کے جملہ اخراجات کے کفیل ہیں۔ اس طرح ایک اہم بات جو انتظامی امور میں ملازمین کو باہمی جذبۂ رقابت سے محفوظ رکھتی ہے وہ بس یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے گریڈ آف پے اینڈ پرسن pay and person سے واقف نہ ہو سکیں تبھی ایک دوسرے کے تئیں ہمدردی کا رویہ باقی رہتا ہے۔ بابوجی نے ایڈمنسٹریشن کے اس راز کو اپنی زندگی میں نہایت حسن اور استقلال کی صلاحیت سے اپنایا ہے۔ اگر ملازمین یہ محسوس کرتے ہیں کہ ایک دوسرے کے جملہ اخراجات دفتر سے پورے کیے جاتے ہیں۔ تو حسد کے پیدا ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا بلکہ یگانگت اور ایک دوسرے کے تئیں تعاون کی فضا قائم رہتی ہے۔

بابوجی عقیدے کے طور پر ایک آریہ سماجی خاندان سے ہیں۔ اور اُن کو ایسا ہونے پر ناز ہے۔ یہ تعصب نہیں ہے بلکہ اپنے عقیدے کی پختگی پر ایمان کی شناخت ہے۔ غالباً میری دانست میں پہلے وہ آریہ سماجی ہیں جو اس قدر وسیع النظر ہیں کہ غیر اقوام کے مذہبی رہنماؤں کا ذکر سنتے ہیں تو چہرے پر شکن نہیں پڑتی بلکہ انتہائی ذوق سے محو گفتگو ہو کر اضافہ کا باعث بنتے ہیں ایسے موقع پر موصوف کے چہرے پر ایک خاص حقیقی چمک ہوتی ہے جسے روحانی تجلی کہہ لیجیے۔ ایک واقعہ سنئے اور ان کی روحانی عظمت کے قائل ہو جائیے۔ باندرہ میں ایام عزا کے دوران ایک مجلس ہونے والی تھی، اس کی دعوت آپ کو دی گئی۔ چونکہ چندہ پہلے ہی ادا کیا جا چکا تھا۔ مقررہ دن پر بابوجی نے انتہائی گرمجوشی سے فرمایا کہ "بھئی ہمارا تبرک نہ بھول جانا،، میں نے دوسرے دن تبرک پیش کیا تو نہایت عقیدت اور خندہ پیشانی سے اس طرح قبول فرمایا گویا کسی مہان باوا کے ہاتھ نمرتا کے ساتھ پرشاد قبول کر رہے ہوں۔ دیکھا آپ نے ایسے بھی آریہ سماجی ہوتے ہیں۔

شفقت پدری سے تو اولاد ہی واقف ہو سکتی ہے لیکن ملازمین بھی اس سے کچھ کم واقف

نہیں ہیں، چونکہ موصوف کا طرز عمل۔ ملازمین نیز متعلقین کے ساتھ نہایت درجہ مشفقانہ ہے۔ ذرا غور تو کیجئے کہ انھوں نے ایک معمولی حیثیت سے بھی کم درجہ کے ایک لڑکے کو اپنے یہاں رکھ لیا اولاد کی سی نگہداشت کی، اس کی تعلیم کا بندوبست کیا اسی کی مرضی سے شادی کی جس میں ہر طرح کا بوجھ اٹھایا اس کے گھر کا بندوبست، جب بچے ہوئے تو ان کے راشن پانی ناشتہ، تعلیم صحت کے اخراجات کے کفیل عرصے تک رہے اور آج جب وہ خود پرنٹنگ کے کام میں الگ سے مصروف ہے اس میں بھی موصوف کا تعاون ہر طرح ہے۔ خود راقم الحروف کے بارے میں آخر کون سی خواہش یا ضرورت ہے جسے اللہ نے ان کے ذریعہ تکمیل تک نہ پہنچایا ہو میں چھ چھ مہینے تک تبدیلی آب ہوا کی غرض سے باہر رہا ہوں لیکن مجال کہ خرچ میں کبھی کوئی کمی محسوس کی ہو، یہ مبالغہ نہیں سراسر حقیقت ہے کہ مجھے جب سے بابوجی کی خدمت میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے مجھے ابھی تک وہ لمحہ یاد نہیں جب میری کوئی بات رد کی گئی ہو چاہے وہ اپنے بارے میں ہو یا کسی غیر سے متعلق ہو، اکثر طلب سے زیادہ عطا ہوا۔ "لو شاید اتنے میں کام نہ بنے"

مجھے بابوجی کے مسلمان بٹلر کا قصہ بھلانے پر بھی نہیں بھولتا کہ آپ نے ایک ایسے اہم نازک موقعہ پر اس کی کثیر رقم سے مدد کی اگر ایسا نہ کیا جاتا تو وہ کہیں کا نہ رہتا۔ مجھے بٹلر کا رویہ بھی یاد ہے کہ اس نے آہستہ آہستہ رقم واپس کر کے ہی سانس لی۔ ورنہ ایسے بھی میری نظر میں ہیں جنھوں نے لاکھوں کے ہیر پھیر میں ڈال دیا، اور عظیم نقصان کا باعث ہوئے مگر بابوجی نے اف نہ کی بلکہ انا اللہ و انا الیہ راجعون کہہ کر صبر کر لیا۔

ملازمین پر خصوصی توجہ گویا وہ گھر کے ہی افراد ہوں، متعلقہ احباب سے ایسا سلوک برتنے والے کہ جس کی مثال دوسری نظر نہ آئے۔ ایک دلچسپ واقعہ سنیئے کہ ایک شخص جو بابوجی سے کسی بھی رشتے سے متعلق نہ تھا کسی اور سیٹھ کے گھر میں کام کرتا تھا لیکن بابوجی کے حاتم ہونے کا اسے بھی فائدہ پہنچ چکا تھا۔ وہ آیا اور اس بہانہ امداد کا طالب ہوا کہ اس کی ماں مرگئی ہے۔ آخر دوسری بار بھی وہ اسی بہانہ سے آیا۔ بابوجی نے بیگم صاحبہ سے کہا کہ اس کی مدد پھر کر دو اور یہ کہو کہ اب بار بار ماں کو نہ مارا کرے آخر یہ آواگون کب تک جاری رہے گا۔ اب کوئی نیا بہانہ تلاش کرے۔

کوئی شخص طبی مشورہ کی غرض سے آتا ہے تو فوری اس پر توجہ شروع کر دیتے ہیں یا پھر اگر مرض پیچیدہ ہوا تو کیس کو باقاعدہ اسٹڈی کر کے دوائیں تجویز کرتے ہیں بلکہ بیشتر خود منگوا کر دیتے ہیں خود میرے ذریعہ جانے کتنے مریض شفایاب ہو چکے ہیں، جن کی شکل تک سے بابوجی واقف نہیں ہیں۔ ہیں

نے اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو بمبئی کے چند بڑے ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کو بابوجی سے مشورہ کرتے دیکھا ہے۔ اور ان کی تشخیص پر سر نیاز خم کرتے دیکھا ہے۔ وہ لوگ نہایت ادب سے بابوجی کا ذکر خیر کرتے ہیں۔

موصوف کے دفتر کے قریب مسقطی کورٹ مشہور رہائشی عمارت ہے جس میں عباس بھائی جونپوری لفٹ مین ہیں۔ ان کے پاس ایک زمانہ میں میں بھی رہا ہوں۔ اس بنا پر عباس بھائی بابوجی سے متعارف ہوئے۔ کبھی کبھی شام دفتر کے بعد سرراہ بابوجی سے ملاقات بھی ہو جاتی تھی۔ عباس بھائی بابوجی کی انسانیت نواز خصلت سے بہت متاثر تھے۔ ایک بار کافی دنوں تک عباس نظر نہ آئے۔ بابوجی کے دریافت کرنے پر میں نے ان کی بیماری کا حال بتلایا کہ ایک پارسی لیڈی ڈاکٹر نے کولھے کی ہڈی پر انجکشن دے دیا جس سے تکلیف بڑھ گئی ہے اور وہ چلنے پھرنے سے معذور ہیں۔ بابوجی فوراً دفتر کے بعد میرے ہمراہ مسقطی کورٹ لفٹ مین کے کوارٹر میں گئے، واقعی عباس بھائی سے اٹھا نہ جاتا تھا اور وہ رونے لگے کہ اتنا بڑا آدمی ان سے ملنے آیا ہے اور وہ اس کو کھڑے ہو کر استقبال کرنے کے بھی اہل نہیں ہیں۔ بابوجی نے اشارے سے تسلی دی اور ہومیو پیتھک کی ایک دوا تجویز کر کے مجھے لانے کا حکم دیا۔ خود ہی قیمت بھی دی۔ میں نے دوا عباس بھائی کو لا کر دی اور وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک ہی دن میں چاق و چوبند پھرنے لگے، اس طرح کے اور بھی بہت سے واقعات ہیں جن سے بابوجی کی انسان دوستی کے جذبے کی فراوانی ثابت ہوتی ہیں۔

تہواروں پر بابوجی خاص بخشش دیتے ہیں۔ مسلم اسٹاف (جو خوش قسمتی سے میں ہوں) ہمیشہ فائدے میں رہتا ہے کہ اپنے تہواروں کے علاوہ ہندو تہواروں پر بھی مستفیض ہوتا ہوں۔ اپنی ضرورت کی تکمیل کرنے میں کوئی بھی ملازم بابوجی کو بے وقوف نہیں بنا سکتا چونکہ وہ اس کا موقع ہی فراہم نہیں ہونے دیتے اور طلب کے سوا عطا کرتے ہیں کم از کم شریف المغز حاجت منداس گناہ سے محفوظ رہتا ہے۔

مظلوم سے دلی ہمدردی بابوجی کی فطرت میں شامل ہے۔ میرے نزدیک یہی سبب ہے کہ بابوجی کو اہل تشیع حضرات سے انس ہے۔ میں نے خود غور کیا ہے کہ اکثر افراد جن کی گزر اوقات چندے کی فراہمی پر ہے آتے رہتے ہیں اور مایوس نہیں لوٹتے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ انکم ٹیکس عمارتوں کے عقب میں مشہور بزرگ حضرت بہاء الدین بابا کا مزار ہے وہاں سے ایک شخص سال میں دو بار عرس کے چندے کی غرض سے آیا۔ بابوجی نے اس سے کہلوایا کہ کیا ان بزرگ کا عرس ششماہی ہوتا

ہے جو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ان کو بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا۔ میں نے خود غور کیا ہے کہ باؤجی اپنے ملازمین کے ساتھ بلڈنگ کے ملازمین پر بھی یکساں مہربان ہوتے ہیں۔ ایک شفیق آقا کی طرح بے تکلف ہوکر ان کے دکھ درد میں ہاتھ بٹانا کتنے لوگوں کا کام ہے۔ ملازمین سے وہ صرف دو باتوں کے خواہاں ہوتے ہیں۔ ڈسپلن اور آداب۔ لفٹ مین ہو یا واچ مین یا گیٹ کیپر باؤجی ان سب سے یکساں برتاؤ کرتے ہیں۔ اور ان کے حقوق کا لحاظ کرتے ہیں۔

متعلقین سے برادرانہ انسانی سلوک کی بات سنئے تو حیرت میں ڈوب جایئے۔ ایک عظیم استاد شاعر جو اپنے فن کے یگانہ روزگار تھے ان کی امداد اتنی کی کہ بعض احباب نے باؤجی کو ان کا شاگرد سمجھنے میں تکلف نہ کیا۔ اگرچہ ایسا نہیں تھا۔ وہ تو باؤجی کی محض غریب نواز طبیعت کا عظیم اظہار تھا، ورنہ وہ استاد شاعر تو خود باؤجی کی فنی اور علمی استواری کے معتقد تھے۔

بہت سے شعراء کو تہنیتی نظمیں کہہ کہہ کر لاتے بھی میں نے دیکھا ہے۔ تاکہ فیضیاب ہوں۔ مگر حسب منشا فیضیاب ہونے کا نشا کی انسان خدا سے بھی ہے۔ ایسے افراد کی امداد کرنا بھی باؤجی کا طرز خاص رہا ہے۔ ان میں کس کس کے نام آپ کو گنواؤں۔ بہت سے نوجوان شعراء بہت سے بزرگ شعراء بھی میری فہرست میں موجود ہیں۔ بس یہ خوف ہے کہ "پردہ جو اٹھ گیا تو بھید کھل جائے گا"۔ ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔

ایک انتہائی خوش گلو، خوش شکل شاعر اپنی ایک تہنیتی نظم کتابت کرا کے فریم میں میرے ذریعہ باؤجی کو پیش کرنے آئے جب میں نے اُسے پیش کیا۔ تو باؤجی نے ایک نگاہ ڈالی اور تبسم فرمایا پھر گویا ہوئے کیا دیا جائے۔ ساٹھ روپے تو چھ شعری غلطیوں کے فی غلطی دس روپے کے حساب سے کٹ گئے، بیس روپے کا فریم سمجھ لو جیسے وہ واپس لے جا سکتے ہیں، دس روپے کی کتابت ہوگی۔ اب اگر سو روپے دیے جائیں تو صرف دس روپے بچتے ہیں" پھر خوب ہنسے اور انعام سے نواز کر رخصت کر دیا۔ مرحوم مختار امروہوی نے بھی ایک تہنیتی نظم کہی تھی۔ وہ قدرے پسند فرمائی اور دیر تک لطف لیتے رہے۔ اس موقع پر عابد حسین عابد باندوی مؤلف "ذکرِ رضا" کے بے لوث ظرف کے باؤجی آج تک معترف ہیں۔ جنھوں نے تادم تحریر ہمارے باؤجی سے شرف نیاز حاصل نہیں کیا۔ اگرچہ ایسا کرتے کی انھوں نے قسم بھی نہیں کھائی ہے، لیکن تجارتی مصروفیت نے ابھی تک ملاقات کا موقع فراہم نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے ایک طویل نظم ذکرِ رضا لکھی ہے جو شائع ہو چکی ہے۔

مجھے دفتر کے کیبن میں جب بھی فرماتے ہیں۔ تو پہلے نہایت خندہ پیشانی سے "بازار کا حال" پوچھتے ہیں۔

• بازار کے حال" سے باؤجی کا مدعا عام حالات کی جانکاری کا ہوتا ہے۔ یہ باؤجی کی پسندیدہ اصطلاح ہے،

جس سے ان کے مافی الضمیر کی اس تہہ کا اندازہ ہوتا ہے، جو اُن کے اندر کے تجارتی انسان کے انہماک سے عبارت ہوتا ہے، جس سے "روزگار" چلتا ہے۔ اس کے بعد میرے بارے میں کوئی نئی بات ظہور میں آئی ہو تو اسے دریافت فرما کر احتیاط و احتیاج کے عملی اطوار سے نوازتے ہیں۔ کبھی کوئی غزل کہہ لی تو حافظہ پر زور دے کر شعر سناتے چلے جاتے ہیں، اس کی وجہ تسمیہ بھی بتاتے ہیں۔ شعری حسن و فنکاری سے متعارف بھی کرتے جاتے ہیں۔ یا میں نے دوران داد و تحسین کوئی بات اپنے احساس کے مطابق کہی تو اسے سنجیدگی سے قبول فرما کر خود میرے احساس کی مجھے داد دیتے ہیں۔ یہ شعر فہمی کی داد ہوتی ہے اور پھر میرے علم میں اضافہ کرتے ہیں۔ جب تک غزل کاغذ پر نقل نہیں کر لیتے اسے حافظہ میں محفوظ رکھتے ہیں۔

ایک انتہائی تعجب خیز بات سنیئے آپ کہیں کسی کا بھی کوئی مصرع دو یا سہ حرفی کم کر کے سنا دیجیئے تو بابو جی فوری طور پر اصل لفظ جسے آپ سناتے ہوئے بھول گئے، فرما دیتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ اس کا ہم وزن دوسرا لفظ بتا کر مصرع میں موزونیت پیدا کر دیں بلکہ اصل لفظ بیان کر دیں گے کہ "یہ رہ گیا" متقدمین و جدید دونوں شعراء کے کلام کے بارے میں یہ حقیقت آزمودہ ہے۔ بارہا ایسا بھی ہوا ہے کہ بعد میں یہ اس سے بہتر لفظ بطور متبادل بتا دیتے ہیں لیکن اصل لفظ جو شاعر کی نوک زبان و قلم سے ادا ہوا ہے، اسے ضرور بتا دیتے ہیں۔

اردو زبان و ادب پر عالمانہ عبور ہے۔ فارسی کے آزمس ہیں۔ انگریزی ادب میں خاصا دخل اور زندگی میں اس کی چھاؤں۔ عربی ذخیرۂ الفاظ سے کما حقہ واقفیت تاہم باقاعدہ عربی نہیں جانتے، جس کا اعتراف کرتے ہیں۔ لیکن مستعمل اصطلاحات خاصی تعداد میں ازبر ہیں مثلاً الحمد اللہ، ماشاء اللہ، لاحول و لاقوۃ الا باللہ، انا اللہ وانا الیہ راجعون وغیرہ۔ اور ان کے برجستہ استعمال سے آگاہ ہیں شعر گوئی میں عظیم دستگاہ ہے جو آجکل عنقا ہے۔ فن عروض کے سلسلہ میں کہتے ہیں۔ "کہ ہم بنیئے ہیں ناپ تول ہمارا کام ہے۔" زود گوئی کی ایسی مشق کہ فوری طور پر کیسے ہی سنجیدہ سے سنجیدہ کام میں مصروف ہوں، شعر فکر کر کے اس طرح لکھاتے چلے جاتے ہیں، جیسے کوئی ذہین مشاق و ماہر شخص اسٹینو کو ڈکٹیشن دیتا ہے۔ تصحیح کا بھی یہی عالم ہے، توجیہہ و توضیح بھی کرتے جاتے ہیں، اسناد متقدمین سے اس طرح دیتے ہیں جیسے کل ہی کی بات ہو، جو ان کے سامنے پیش آئی ہو۔ عظیم شخصیتوں کا اعتراف بھی دل و جان سے کرتے ہیں۔ لیکن خواہ مخواہ کی تعریف نہیں کرتے۔ قاضی عبدالودود مرحوم کی تحقیق کے قائل ہیں۔ کلیم الدین مرحوم سے بھی گاڑھی چھنتی تھی۔ ڈاکٹر گیان چند جین کو اردو عالم کی حیثیت دیتے ہیں۔ غالب کی پرواز فکر اور اصطلاح و ترکیب بندی پر گھنٹوں بے تکان بات کرتے چلے جاتے ہیں۔ بابو جی غالب کی ایک ایک بات

کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ کوئی اپنے بزرگوں کے بارے میں بھی اتنی معلومات فراہم نہیں کر سکتا۔
غالبیات پر مہارت ایسی کہ تلاش کرنے پر بھی دوسرا نہ مل سکے۔ غالب کی شخصیت و شاعری کے کسی بھی
گوشے پر اس طرح گفتگو فرماتے ہیں گویا ان پر اس کا سب کچھ واضح ہے۔ پھر اس پر انتقاد اور اس کی
ردوقدح پر بحث مستزاد۔ موضوع کیسا ہی خشک ہو اسے طراوت بخشتے جاتے ہیں۔ اس میں متانت
کے ساتھ شوخیوں کی چھکاریاں پیدا کرتے جاتے ہیں۔ پھر غالب کے جذبات کا کلی احترام۔ حدیہ کہ لاکھوں روپے
کے ہیر پھیر والا اکاؤنٹ کرتے وقت بھی یہی عالم رہتا ہے۔ مجال ہے کہ بات میں جھول پڑ جائے۔ یا
بے ربطی کا احساس ہو جائے۔ نہ اکاؤنٹ میں غلطی ہوتی ہے، جس کے لیے ان کا دعویٰ ہے کہ آج
تک ان سے اکاؤنٹ میں غلطی نہیں ہوئی۔ یہ معمولی نہیں، انتہائی غیر معمولی بات ہے۔

میں بابوجی سے اپنی مختصر صحبت میں اکثر بہت سے موضوعات پر استفسار کرکے مستفید ہوتا ہوں۔
ایک بار ایک دلچسپ بات میں نے یہ دریافت کی کہ "بابوجی آپ بڑی بڑی شخصیتوں سے ملاقات کرنے
تشریف لے جا چکے ہیں۔ آپ اُن سے ملنے خالی ہاتھ تو نہ جاتے ہوں گے"۔ بابوجی نے اسکا جواب مسکرا کر
یہ دیا۔ "تم جو سوچتے ہو، ٹھیک ہے"۔ پھر میں نے عنوان کے بہت سے بکھرے ہوئے ورق یکجا کر کے
پھلوں کی ٹوکریاں، اور لڈوؤں کے پیکٹ تیار کر لیے جو بابوجی لے جاتے رہے ہوں گے۔ پھر جب
میں نے اپنے گیس ورک guess work کو پیش کیا تو صرف یہ فرمایا کہ "یہ کام
تو ڈاکٹر راہی کے کرنے کا تھا"۔

بابوجی نام و نمود و غیر ضروری شہرت سے دور بھاگتے ہیں۔ جانے کتنے عہدوں کی پیش کش
کہاں کہاں سے آتی رہتی ہے لیکن وہ صرف معذرت کر دیتے ہیں۔ بارہا ایسا بھی ہوا کہ موصوف سے
خصوصی التجا با درخواست بھی کی گئی، لیکن انھوں نے ہمیشہ ارمانوں کا خون کیا۔ بابوجی فرماتے ہیں کہ
"شہرت کے لیے نہیں بلکہ ضرورت کے لیے کام کرنا فرض ہے۔ نام آوری کے پیچھے بھاگنے والے
کام نہیں کرتے یا پھر خام کام کرتے ہیں"۔ اس کا مفہوم میرے نزدیک یہ بھی نہیں ہے کہ وہ اپنے
مقام سے آگاہ نہیں ہیں۔ عجیب بات ہے کہ اپنی منزلت سے آگاہی رکھنے والے اشخاص ہی "بے نیاز
نمود" ہوتے ہیں۔ اور یہی بلند مقام پر فائز ہونے کی درخشاں شناخت ہے۔

ذہن اس قدر تہہ تک رسائی کرنے والا کہ ادھر کسی نے بات کی اور ادھر فیصلہ کن جواب
دے دیا۔ میں نے ایسے fast calculating mind کم دیکھے ہیں۔ مثلاً میرے ایک عزیز کرم
فرمانے ایک بار مجھ سے یہ دریافت کیا کہ "کیا گپتا رضا صاحب دفتر میں بیٹھنے لگے ہیں؟" رچوں کہ

موصوف اس سے قبل بیمار تھے) میں نے اثبات میں جواب دے دیا۔ جب یہ ذکر خود موصوف قبلہ بابو جی صاحب سے کیا گیا تو آپ نے ہنس کر برجستہ جواب دیا" کہنا تھا کہ وہ (یعنی خود گپتا رضا صاحب) ریٹائرڈ ہو گئے ہیں" اس فیصلہ کن برجستگی سے یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ بابو جی کو اپنے گرد و پیش کے افراد کی ذہنیت کا بھرپور علم ہوتا ہے۔ اور وہ جلد یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اس جملہ سے دریافت کنندہ کا مقصد کیا ہے۔

آپ کوئی نیکی بابو جی کے ساتھ کر دیجئے گویا آپ نے اس شخص کے دل میں گھر کر لیا۔ زندگی بھر اس بوجھ کو محسوس کر کے اس کا حق ادا کرنے کے لیے سوچتے رہیں گے اور وقت پڑنے پر خوب کام آئیں گے۔ اس سے وہ نیکی کا بوجھ ہلکا نہیں کرتے بلکہ اپنی تہذیبِ نفس کو تسکین دیتے ہیں۔ پھر خودداری کو بھی مقام دیتے ہیں، ذہن کو بلند اور صاف رکھتے ہیں۔ دل و نگاہ میں بلندی پسند فرماتے ہیں تاکہ سامنے والے کسی قسم کی ہتک محسوس کر کے خفیف نہ ہوں۔ کتنے ایسے ہیں جو اس طرح دوسروں کے کردار کو معیاری بناتے ہیں۔

ہمہ گیر شخصیت اگر بابو جی کے قسم کی ہو تو اس میں چار چاندیوں لگ جاتے ہیں کہ وہ اپنے طور پر انتہائی کامل ہیں۔ ہماری تہذیبی روایات کا بہترین مرقع ہیں۔ بزرگ کسی بھی مذہب و ملت کے ہوں، ان کا احترام و ادب سے ذکر کرتے ہیں۔ اگر کوئی کسی بات پر الحمد اللہ کہے تو خوشی کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ شخص کچھ بھی سہی، ناشکرا نہیں ہے۔

بابو جی ایک خوش پوش انسان ہیں، اب تو گھر سے باہر سفاری سوٹ آپ کی پوشاک ہے کبھی جاڑوں میں سوٹ پر نیک ٹائی بھی لگا لیتے ہیں۔ سوٹ کا کپڑا نہایت قیمتی ہوتا ہے جسے بقول خود بیگم صاحبہ خرید کر لاتی ہیں۔ گھر پر کناری دار دھوتی کا تہمد یا پاجامہ اور لکھنوی کرتا استعمال کرتے ہیں۔ جوتا بغیر جراب کے نہیں پہنتے۔ نین و نقش کے اعتبار سے ویسے ہی ہیں جیسے پنجابی ہوتے ہیں۔ میرے ایک اہم استفسار پر فرمایا کہ "میں نجس نہیں رہتا"۔

بابو جی نہایت باوقار انداز میں نگاہیں نیچی کر کے چلنے کے عادی ہیں، کہیں تو بہ شکن حسن نظر پڑا تو ذہن کو پراگندگی سے محفوظ کرنے کے لیے چشمہ اتار لیتے ہیں۔ فطری طور پر ایک اور بات ان میں یہ پائی جاتی ہے کہ وہ جہاں بھی بیٹھتے ہیں، چھا کر بیٹھتے ہیں۔ جانے کیوں دوسرا کمتری محسوس کرنے لگتا ہے۔ بھلے ہی وہ خاموش رہیں۔ اور جب بولتے ہیں تو اندازِ گفتگو میں ایک خاص رکھ رکھاؤ، موقع کی نزاکت کے اعتبار سے متانت و تبسم کی فضا قائم کرتے ہیں۔ کسی عنوان پر بات کرتے ہیں،

تو اضافہ ہی اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ موضوع کو گرفت سے نکلنے نہیں دیتے۔ معلومات کے پرت کے پرت کھولتے چلے جاتے ہیں، گویا سامنے والے پر موضوع و عنوان کے عرفانی چودہ طبق روشن ہو رہے ہوں۔ بات کہنے کا دلکش انداز تاثیر سے لبریز لہجہ، ایسے موقع پر ان کے حافظہ کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

سانولی رنگت، خد و خال جاذب نظر، بھرے ہوئے چہرے پر دبدبہ و متانت کے آثار۔ آنکھوں میں ہلکی ہلکی سُرخی، اُبھرے اُبھرے پپوٹے۔ بالوں میں اب خاصی سفیدی آچکی ہے۔ نشست میں بالا پنے کی ادائے دلنوازی، چال میں پورا پاؤں رکھ کر چلنے کا ایسا طریق کہ قدم زمیں کی سانسیں شمار کرتے محسوس ہوں۔

میں اُن لوگوں میں ہوں، جن کو بابو جی نے پسند سے زیادہ نباہا ہے۔ وہ بسا اوقات ایسی خصوصیات کا حامل مجھے بتاتے ہیں کہ میں خود بھی ایسا کبھی اپنے بارے میں سوچ نہیں سکتا۔ وہ میرے مزاج سے کما حقہ واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موصوف کو مجھ سے ایک قلبی لگاؤ ہے، مجھے کوئی خوش فہمی اپنے بارے میں نہیں ہے لیکن یہ سچ ہے کہ بابو جی نے مجھے نوکر نہیں اپنے گھر کا ایک ایسا فرد سمجھ لیا ہے، جو بڑھاپے میں قدم رکھ چکا ہے اور اکثر بیمار رہتا ہے۔ کیا ایسے افراد خاندان کو پرورش کرنے کے بجائے گھر سے نکال باہر کیا جاتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ یہ احساس بھی مجھ میں بابو جی ہی کا پیدا کردہ ہے۔

آداب معاشرت، الطاف و کرم، خوش سلیقگی اور علم و فن کے جوہر کی نمایاں شناخت بابو جی ہیں اور اس شناخت کا ذریعہ ان کی اہلیہ محترمہ ہیں جنہیں ہم سب بیگم صاحبہ کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ چونکہ مرد کی خصلت کے معیار کو برقرار رکھنے میں اگر شریک حیات اپنے حسن ایثار و شرافتِ نفس کو دخل نہ دے تو مرد وہ نہیں بن سکتا جو وہ ہوتا ہے۔

لندن کے بیشتر مارکٹنگ اسٹورس میں جو شوکیس و ونڈو ڈسپلے کہلاتے ہیں، ان میں اشیائے فروخت کے نمونے سلسلہ وار رکھے جاتے ہیں، سب سے اوپر کے خانے میں 'ماڈل' ہوتا ہے اس کے نیچے دوسرے نچلے خانوں میں ماڈل نہیں ہوتے۔ میں واضح رہے کہ ماڈل صرف ایک ہوتا ہے اور اس کے پیپرز pieces کئی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ماڈل فروخت نہیں کیا جاتا، قیمت صرف ماڈل پیپرز کی ہوتی ہے۔

اردو تحقیق اور شعر و ادب کا ماڈل بلا مبالغہ کالی داس گپتا رضا ہیں۔ اور وہ برائے فروخت نہیں۔

کالی داس گپتا رضاؔ دیارِ شاعری میں

پروفیسر گوپی چند نارنگ،
صدر شعبۂ اُردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ

تنقید و تخلیق کا ساتھ تو اکثر دیکھا ہے۔ لیکن تحقیق و تخلیق میں ایک طرح کا تناقض ہے تخلیق میں ساری کارگزاری جذبے اور وجدان کی ہے۔ جہاں تعقّل کے پر جلتے ہیں، لیکن تحقیق کا سارا کاروبار ہی منطقی نوعیت کا ہے جہاں عقلیت کی حکومت ہے۔ تاہم اجتماعِ ضدین کی استثنائی صورتیں خال خال نظر آجاتی ہیں۔ مولوی عبدالحق اور محمود شیرانی شاید سُخن گوئی کے معاملے میں کورے تھے۔ وحید الدین سلیم اگرچہ اچھے شاعر تھے، لیکن زندہ وہ افاداتِ سلیم اور وضعِ اصطلاحات کی بدولت ہیں، ان کی شاعری کو زمانہ بھول گیا۔ دتاتریہ کیفی نے شعر میں بہت زور مارا اور اپنی لسانی تحقیق کو وہ شعر گوئی کا پاسنگ بھی نہ سمجھتے ہوں گے، لیکن ان کی شاعری دیکھتے ہی دیکھتے ان کی زندگی ہی میں رد ہوگئی۔ معاصرین میں قاضی عبدالودود کا معاملۂ شعر پردۂ خفا میں ہے۔ البتہ امتیاز علی عرشی اور گیان چند جین مُنہ لگاتے ہیں، لیکن دعوائے سخن کا نہیں فرماتے۔ کالی داس گپتا رضا کا معاملہ دوسرا ہے۔ یہ نہ صرف مُنہ لگاتے ہیں بلکہ پے بہ پے چھلکاتے ہیں، اور اگرچہ لفظاً دعوا نہیں کرتے، معناً ضرور دعوے دار ہیں۔ وہ یوں کہ ان کی شاعری کے تین مجموعے شعلۂ خاموش، شورشِ پنہاں اور شاخِ گل اس سے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ رُباعیات کا یہ مجموعہ بفضلہٖ چوتھا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تحقیق کی بادیہ پیمائی بھی جاری ہے اور غالب، چکبست، جوش ملسیانی اور غیر معروف شعرائے اُردو کے بارے میں انھوں نے معلومات کے گہرہائے آبدار کا جو ڈھیر لگایا ہے اور اصنامِ خیالی کی پرستش کرنے والوں کو اپنی تحقیقات سے جیسا ششدر کیا ہے، وہ دیکھنے سے تعلّق رکھتا ہے۔ اس سب کو شش و

کاوش کو جو چیز مہمیز کرتی ہے، وہ ان کی ریاضت، لگن، جستجو اور تڑپ ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ شاعری جس نرمی، گداز، وفور اور ماورائیت کا تقاضا کرتی ہے ان کے مزاج میں وہ بھی موجود ہے، اور اس کا قوی امکان ہے کہ رضا کا ادبی سفر شعر گوئی ہی سے شروع ہوا ہو، اور ان سے پہلا گناہ عشق کی اسی وادی میں سرزد ہوا ہو۔

جو شخص تحقیق میں سر کھپاتا ہو اس کی طبیعت کو مشکل پسندی سے یک گونہ مناسبت تو ہوگی ہی۔ رُباعی کو مشکل صنف کہا گیا ہے۔ شاید ہیئت کے اعتبار سے نہیں، معنی کے اعتبار سے کہ تین مصرعوں میں بات کو کھولنا اور چوتھے میں مکمّل کرنا صرف مصرعے جوڑنے کا معاملہ نہیں بلکہ کچھ پیچ معنیاتی فضا کا ہے، یعنی ایسی بات پیدا کرنا جو تین مصرعوں میں کُھل سکے اور چوتھے مصرعے میں مکمّل بلکہ اکمل اس طرح سے ہو کہ نکتہ آفرینی کا حق ادا ہو جائے یہ ہے رُباعی کا کمال ـــــ کتنے اہلِ کمال اس پر پورے اُترتے ہیں، چار مصرعوں کی "جگل بندی" تو سب کر لیتے ہیں۔ رضا کی رُباعیوں کو پڑھ کر خوشی یوں ہوئی کہ ان میں خیال کی رَتّی کو پکڑنے، اس کے رنگوں کو گرفت میں لینے اور ان سے اظہار کا ہیولا تیار کرنے کا جوہر ملتا ہے ـــــ رُباعی miniature سطح پر سوچ کا کھیل ہے اور ان رُباعیوں میں سوچنے والا ذہن ملتا ہے اور حقائق کو سمجھنے والی نظر ملتی ہے، اور ایک ایسا فلسفۂ حیات جو ذاتی بصیرت اور سوچ کی دین ہے جو دل پر چوٹ پڑنے سے مرتب ہوتا ہے اور جسے صحیح یا غلط کے پیمانوں سے نہیں ناپا جا سکتا بلکہ جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت کو سمجھنے کی یہ تڑپ نفسِ انفرادی اور نفسِ کلّی کو الگ الگ واحدوں کے روپ میں نہیں بلکہ شعورِ کلّی کے طور پر دیکھنے اور سمجھنے کی کاوش سے عبارت ہے۔ مصدرِ ہستی کی بحث بھی جگہ جگہ ہے، لیکن اس کا مرکز و محور ماورائی حقیقت یا ذہنی تجرید نہیں بلکہ وجود کا وہ احساس ہے جو سینے میں الاؤ کی طرح روشن ہے یا ذہن میں آگہی کی شمع بن کر اُجالا کرتا ہے:

دو لمحے کی روشنی میں ڈھل جاؤں گا
شِدّت کی تپش ہوگی پگھل جاؤں گا
روشن نہ کوئی شمع کہیں کر دینا
ہر رنگ میں، میں آپ ہوں، جل جاؤں گا

شو شنکر وشنُ مُبدھ ردُریش اکال
گیانی دھیانی اننت آدی سُکھ پال
یا تُو اس میں ہے یا یہ سب کچھ تجھ میں
بدمستیٔ باطن ہیں کوئی حال نہ قال

اس رُباعی کے پہلے دو مصرعوں کی فضا "کال" سے "اکال" اور "پرتھوی" سے "پاتال" تک لے جاتی ہے، اس کے لہجے میں صدیوں کی کھنک ہے، آریائی فکر کے تسلسل میں شو شنکر قبل تاریخ دھندلکوں کا علامیہ ہے جسے رودریش، "اکال" اور "اننت"، "آدی" نے اور بھی لازمانی بنادیا ہے چوتھے مصرعے تک پہنچتے پہنچتے انسانی وجود کی مرکزیت کی توثیق تو ہو ہی جاتی ہے لیکن تیسرے مصرعے میں گیتا کے "وراٹ" رُوپ کی طرف اشارہ ہے جس کی رُو سے برہمہ کائنات کے ذرّے ذرّے میں تو ہے ہی لیکن پوری کائنات برہمہ میں چھپی ہوئی ہے، یعنی کائنات اور وجود کے تمام کوائف وشواہد ومظاہر تو ذات باری سے ہیں، لیکن ذات باری ان مظاہر سے ماورئی ہے بلکہ وراء الورئی ہے۔ اس معنی میں کہ کائنات کا کل وجود صرف اتنا ہے کہ حقیقت مطلقہ (وراٹ) کے صرف مُنہ میں سما جائے۔ اب آگے چلیے تو شعورِ کلّی کے اس ادراک کے لیے نفسِ انفرادی پر اصرار کی لے بڑھتی ہوئی ملے گی، یعنی ازل اور ابد کے رازوں کا محرم سوائے اس خاک نہاد بندۂ گندہ کے کون ہو سکتا ہے، خودی (Self) پر یہ اصرار اپنی الگ جہت رکھتا ہے۔ یہ فلسفہ چوں کہ عینیت سے معمور ہے، اس کا منتہا تاریکی نہیں، نور ہے۔ انسان کو فانی تسلیم کرتے ہوئے بھی اس کے دوام پر زور ہے۔ چنانچہ یہ اثباتِ ذات سحر کی بشارت پر منتج ہوتا ہے۔

ہے کس کی ضیا شام وسحر میرے سوا
ہے کس کی چمک، زینتِ زر میرے سوا
ہے کون، سوا میرے، ازل سے آگاہ
ہے کون ابد کا راہبر میرے سوا

فانی نہ کہو، ہوتا ہے کم اس کا وقار
انسان کا ہوتا ہے دوامی کردار
مایوس ہو کیوں وقت کی ظلمت سے کوئی
ہر رات سے پیدا ہیں سحر کے آثار

ان رُباعیوں کے مطالعے سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ یہ شاعر رسم و رہِ عام کا شکار نہیں، اس میں انفرادیت کی شان ہے۔ ذیل کی رُباعی کی ماورائیت بغیر تخلیقی سرشاری کے ممکن نہیں۔ آفاق کا باہیں کھولنا، کائنات کی لامحدود اور انام وسعتوں کا مظہر ہے۔ انسان کا آہیں بھرنا زندگی کے المیے کا آئینہ دار ہو سکتا ہے، بہتی ہوئی ندی شاید وقت ہے جس کے تسلسل کے بھید کو انسان پہچان نہیں سکا اور سراب وہ آرزوئیں ہیں جن کی پیاس کبھی نہیں بجھتی۔

آفاق اُدھر کھولے ہوئے ہے باہیں
بھرتا ہے اِدھر رات دن انساں آہیں
بہتی ہے ندی، بھید نہ پہچانیں ہم
اور پیاس سراب سے بجھانی چاہیں

لیکن اقرارِ ذات تصویر کا صرف ایک رُخ ہے اگر اس شاعری پر اخلاقیات کا شائبہ ہو تو مسلّمات سے گریز اور ان پر سوالیہ نشان قائم کرنے کا انداز بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ زندگی اثبات ہی اثبات نہیں، نفی کا سودا بھی ہے۔ ہر حقیقت خود اپنی تردید ہے اور اگر مظاہر خالق کی رضا کے تابع ہیں تو وہ "غلط رنگ میں رنگنے کا ذمہ دار" بھی ہے۔ اسی طرح رحمت اگر "قائم دائم" ہے تو پھر "سزا جزا" کے کیا معنی؟ ایک اور جگہ مذہب کو رہنما نہیں بلکہ زندگی کے پیچھے چلنے والی حقیقت بتایا ہے، اور آخر میں دُنیا کو اوّل اور خدا کو بعد میں دکھایا ہے یعنی دُنیا کا وجود ہے تو خالق کے وجود کا اقرار بھی ہے، ورنہ نہیں۔ اس نوع کے خیالات مسلّمات پر سوالیہ نشانات لگاتے ہیں۔

جو رہ گئی ان سُنی، وہ تلقین ہوں مَیں
تردید میں پلٹا ہوا آئین ہوں مَیں
اے سب کو غلط رنگ میں رنگنے والے
بے رنگ بھی ہے رنگ، تو رنگین ہوں مَیں

رحمان ہے تو سزا جزا رہنے دے
تکبیر کے پرچم کو گڑا رہنے دے
اب جشنِ بہار، اب خزاں، یہ سب کیا
اک بار جو کھل گیا کھلا رہنے دے

تا آخرِ دم، دِل سے جواں رہتا ہے
بیزارِ جہاں، مستِ جہاں رہتا ہے
مذہب بھی ٹھہر جاتا ہے اِک نقطے پر
انسان سدا رواں دواں رہتا ہے

دانشور، صاحبِ نظر، فلسفہ داں
اک بھی تو نہیں واقفِ آغازِ جہاں
"واقف ہے بس خدا" نہیں وہ بھی نہیں
دُنیا پہلے بنی، خدا بعد ازاں

ذیل کی دو رُباعیوں میں فعل کی ساخت دیکھیے۔ "بھر لو" "کر لو" "کہہ جا" "بہہ جا" سے گمان ہوتا ہے کہ ان میں تلقین کا لہجہ ہے:

ہاں کود پڑو، ریا سے دامن بھر لو
بے راہ روی کی موج پر پگ دھر لو
وہ سامنے ہے حسد کا سُوکھا دریا
ارمان شناوری کا پورا کر لو

باقی نہ رہے دل میں ہے جو کچھ کہہ جا
لاوا جو اُبل رہا ہے اس میں بہہ جا
یا جست لگا آہوئے صحرا کی طرح
یا ضبط کے چنگل میں تڑپتا رہ جا

اگر ان میں تلقین ہے تو کیا کرنے کی؟ ریا سے دامن بھر لو، بے راہ روی کی موج پر پگ دھر لو، یا حسد کے سوکھے دریا میں شناوری کا ارمان پورا کر لو، کیا یہ طنز نہیں؟ ابنائے روزگار کی کم ظرفی اور تنگ نظری پر۔ اسی طرح اگر دل میں لاوا اُبل رہا ہے تو اخراج کے دو ہی راستے ہیں یا تو جست لگائی جائے آہوئے صحرا کی طرح یا پھر صبر کا دامن تھاما جائے۔ گویا انتخاب کی راہ کھلی ہے، اخلاقی تلقین یہاں بھی نہیں۔ اکثر و بیشتر رُباعیوں میں اشارے ہیں دانش و خرد کے۔ ذیل میں "پھل بعد میں قسمت آزمانا پہلے" پر نظر پڑتے ہی خیال ہوتا ہے کہ شاید اس میں گیتا کے نِش کام کرم یعنی بے غرض عمل کی تلقین ہو گی۔ بُنیادی سوال مسلّمات سے انحراف کا ہے۔ مذہب اور زندگی میں کون اوّل ہے، یا خدا اور دُنیا میں کون اوّل ہے، اسی طرح منزل کا مسئلہ تو بعد کا ہے، پہلی شرط سفر ہے۔ سفر ہی نہ ہو تو منزل کا تصوّر کیا معنی۔ ایک اور جگہ جاہل اور خردمند اور نیک اور بد کے مروجہ تصوّرات پر سوالیہ نشان قائم کیا ہے۔ اقرار صرف انسان کے وجود کا ہے جہاں جہل لامحدود ہے اور عقل محدود۔

پھل بعد میں، قسمت آزمانا پہلے
ہو لیجیے رستے پہ روانا پہلے
پھر پوچھیے رہبر سے سوال بن کر
منزل پہلے کہ چلتے جانا پہلے

جاہل یا صاحبِ خرد کوئی نہیں
بس ہم ہیں اور نیک و بد کوئی نہیں
ہاں یہ ہے کہ عقل کی ہزاروں ہیں حدیں
اور جہل و نادانیت کی حد کوئی نہیں

اتنی بات ظاہر ہے کہ رضا کے خیالات میں مرکزیت فرد کی فردیت اور انسان کی انسانیت پر اصرار سے پیدا ہوتی ہے۔ ذیل کے کلام میں "وقت سے آگے نکل جانے" کی تڑپ یا "خیرات ہوں بانٹے کوئی بٹ جاتا ہوں" کی اُمنگ خاصی نمایاں ہے۔ ذیل کی رُباعیوں کا موضوع انسان ہے، وجود کا احساس رکھنے والا انسان، "قتل گہہ ترب میں تقدیر کی ہر ضرب" سہنے والا اور درد و کرب کا لذت چشیدہ اور رمز آشنا انسان جس کو احساس ہے کہ دکھ درد سے چھٹکارا نہیں، اور اُلجھنوں سے اماں نہیں۔ یہ قسمت کا ایسا دھنی ہے جس کے لیے نہ کہیں دھوپ ہے نہ چھاؤں۔ یہ سعی و عمل کا خواہاں ہے لیکن نہ ہاتھ اپنے ہاتھ ہیں نہ پاؤں اپنے پاؤں۔

ہاں، حال کی پیروی سے ٹل جائیں گے
مستقبل کی صدا میں ڈھل جائیں گے
تم وقت کے ہمراہ نہ پاؤ گے ہمیں
ہم وقت سے کچھ آگے نکل جائیں گے

خیرات ہوں، بانٹے کوئی بٹ جاتا ہوں
ٹکر ہو تو چٹان سا ڈٹ جاتا ہوں
چلتا ہوں، جہاں تک بھی رہے صدق کا ساتھ
جب ساتھ چھٹے، راہ سے ہٹ جاتا ہوں

گھر ہے نہ کوئی در ہے نہ بستی ہے نہ گاؤں
کچھ سعی و عمل کر سکوں وہ ہاتھ نہ پاؤں
کہتے ہیں کہ دھوپ چھاؤں ہے یہ دنیا
مجھ ایسوں کی قسمت میں کہیں دھوپ نہ چھاؤں

طوفاں سے نکل آؤں یہ ممکن ہی نہیں
دکھ درد سے چھٹ جاؤں یہ ممکن ہی نہیں
خود ساختہ اُلجھنوں کا دلدادہ ہوں
پل بھر بھی اماں پاؤں یہ ممکن ہی نہیں

ذرہ ذرہ قتل گہہِ حرب سہی
ہر سمت سے تقدیر کی اک ضرب سہی
لیکن ہے مزہ پھر بھی جیے جانے کا
دُنیا نہ سہی، درد سہی، کرب سہی

وسعت میں اپار ہے بیابانِ درد
پاتال سے بھی نیچے ہے پایانِ درد
صدیاں کٹ جائیں غم گساری کرتے
جب جا کے کہیں ہوتا ہے عرفانِ درد

بیابانِ درد کے سفر میں اگر کہیں سُکھ کا سایہ ہے تو فطرت کی آغوش میں۔ معلوم ہوتا ہے رضا کو اس حقیقت کا شدید احساس ہے، بعض رُباعیاں اسی تاثر کا پتا دیتی ہیں، ان میں کہیں صبح کی کیفیت ہے کہیں شام کی، کہیں موسموں کا بیان ہے اور کہیں اماوس کے اندھیرے یا پونم کی چاندنی کا اور حق بات ہے کہ ہر جگہ فطرت سے ربط کا احساس زندہ ہے:

خاموش نگہ کر لفظ و معنی کا جہاں
پایل کر عبودیت کا احساسِ جواں
نازک سے قدم کر دھڑکنیں گیتوں کی
اے رقصِ ظہورِ صبح، اے سحرِ رواں

یہ کون کُھلے رستے بڑھی آتی ہے
مَیں نیند میں ہوں اور یہ اِٹھلاتی ہے
اتنے میں سحر بانکتی آ کر بولی
"بندی ہے آداب بجا لاتی ہے"

رنگین شفق، شوق کو بھڑکاتی ہے
شام آتشِ خنداں سے بھڑی جاتی ہے
ہنستا ہے سماں، کھلتے ہیں تارے ہر سو
روتا ہے کوئی "رات چڑھی آتی ہے"

پت جھڑ نے جو کوچ ناگہاں بول دیا
پرِ مردگیِ زیست میں رس گھول دیا
مُنہ بند تھا مدّت سے اور اب گلشن نے
وہ راگ الاپے ہیں کہ جی کھول دیا

ہر سمت رواں دواں ہے کالا دریا
تاریک مہیب بے محابا دریا
دل کیسا بہا جاتا ہے پستی کی طرف
ہے رات اماوس کی کہ غم کا دریا

ہر سو ہے رواں دواں روپہلا دریا
پُر نور ضیا بار مصفّا دریا
دل کیسا بہا جاتا ہے خنداں خنداں
یہ رات ہے پونم کی کہ ہنستا دریا

معاشرتی اور سماجی حالات کے بدلنے سے عام انسانی قدروں کی جو تباہی ہوئی ہے اور سیاسی حالات کی تبدیلی سے اُردو کا دائرہ جس تیزی سے سکڑنے لگا ہے، ایسے میں کوئی لگن، محنت اور محبت سے معمور نظر آتا ہے تو لگتا ہے گویا اندھیرے میں کوئی چراغ روشن ہو گیا ہو۔ مجھے کالی داس گپتا رضا کا وجود اسی کی مثال معلوم ہوتا ہے۔ حال ہی میں بمبئی کی ایک ملاقات میں انتظار حسین نے اُن سے کہا "ویسے تو کالی داس گپتا بھی زندہ ہی ہے

مگر رضا آپ کس خوشی میں ہیں"۔ رضا نے جواب میں اپنے نوحوں اور سلاموں کا مجموعہ "شعورِ غم" ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ان کی شاعری کسی عروضی اُستاد یا عالم کی ذہنی مشق معلوم نہیں ہوتی، وہ ایک ایسے انسان کی آواز ہے جو دلِ دردمند اور ذہن رسا رکھتا ہے، اور لفظ و معنی کی شیرازہ بندی سے لُطف اور رس کی وحدت پیدا کر سکتا ہے۔ رضا تحقیق میں تحقیق کا اور شاعری میں شاعری کا حق ادا کرتے ہیں۔ اُمید ہے اردو سے ان کی محبت خود ان کے لیے تو لازم رہے گی ہی، دوسروں کے لیے بھی متعدّی ثابت ہو گی۔

شعاعِ جاوید

رمز شناس رباعی گو

کالی داس گپتا رضاؔ کی یہ رباعیاں جو کم و بیش چالیس سال کی مشقِ سخن کی آئینہ دار ہیں ہمارے عہد میں رباعی گوئی کا اعلا معیار قائم کرتی ہیں۔ یوں تو عشقیہ جذبات یا مناظرِ فطرت کی عکاسی یا زندگی کے روزمرہ معاملات کی تصویر کشی پر مبنی رباعیات بھی کہی گئی ہیں، اور ایسی رباعیاں بھی کم نہیں ہیں جن میں خود کلامی کی کیفیت ملتی ہے۔ لیکن رباعی اپنا بہترین اظہار شاید اسی وقت حاصل کرتی ہے جب اس میں حیات و کائنات کے بنیادی مسائل، انسان اور دُنیا کے رشتوں، یا انسانی اور غیر انسانی ذہن کے تصادم کی داستان بیان کی جائے۔ کالی داس گپتا رضا کی رباعیاں بیشتر فکری رنگ کی حامل ہیں۔ لیکن ان کی فکری سرگرمیاں خطابت کا رنگ لے کر رباعی میں نمایاں ہوتی ہیں۔ ہر چند کہ یہ وہ خطابت نہیں ہے جو واعظ یا سیاست داں کو زیب دیتی ہے۔ لیکن یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ شاعر عام انسانی سطح سے کچھ بلند ہو کر عام شاعرانہ آواز سے کچھ اُونچی آواز میں گفتگو کر رہا ہے۔ ان رباعیوں میں فلسفیانہ موشگافی کی سعی نہیں ہے بلکہ افکار کا نچوڑ برجستہ مصرعوں میں ڈھل گیا ہے۔ رباعی میں چاروں مصرعے برابر کے ہونا بھی نہیں چاہیے۔ احسن یہ ہے کہ پہلے مصرعے میں جو مقدمہ بیان کیا جائے اس میں کچھ تمت بیان کی سی کیفیت ہو۔ تیسرے مصرعے تک آتے آتے پہلے مصرعے کے اسرار نمایاں ہوں اور چوتھا مصرع تمام باتوں کی تکمیل کر دے۔ کالی داس گپتا رضاؔ نے رباعی کے اس نازک تقاضے کو بڑی خوبی سے پورا کیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان رباعیوں میں ہیئت کا وہ تنوع نہیں ہے جو رباعیوں کے ایک پورے مجموعے میں ممکن ہو سکتا ہے۔ کالی داس گپتا رضاؔ نے زیادہ تر انھیں اوزان کو استعمال کیا ہے جو متداول ہیں۔ لیکن انھوں نے اسلوب میں تنوع ضرور برقرار رکھا ہے۔ چنانچہ مکالمہ، بیانیہ، خطابیہ، کئی رنگ ان رباعیوں میں ملتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ یہ مجموعہ نہ صرف رباعی کے رمز شناسوں بلکہ شاعری کے تمام شائقین میں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ گزشتہ چند برسوں میں ہمارے ملک میں رباعی گوئی کی جو نئی لہر اٹھی ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اپنی تمام مشکلوں کے باوجود اس صنفِ سخن میں کس قدر وسعت اور امکانات موجود ہیں۔ یہ مجموعہ بھی ان وسعتوں اور امکانات پر دال ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی

عبداللہ کمال

(رباعیاتِ رضا)

زندگی کا مہذّب منظر نامہ

"... اگر ان رباعیوں میں کوئی فلسفہ نہیں ہے، کوئی اخلاقی تعلیم نہیں ہے، کوئی دقیق نکتہ نہیں ہے، تو نہ ہو ـــ بحث صرف یہ ہے کہ شاعری اور شاعری کے ساتھ زبان کی خوبی اور صفائی ہے یا نہیں ـــ؟ یعنی خیام اگر حکیم نہ ہوتا تو کم از کم شاعر ہوتا یا نہیں ـــ؟"
(شبلی: شعر العجم ص ۲۰۶)

بالکل یہی سوال "شاعِ جاوید" پر قلم اٹھاتے وقت میرے سامنے بھی تھا۔ یعنی کالی داس گپتا رضاؔ اگر ایک صاحبِ طرز ادیب اور رقابلِ اعتبار محقق نہ ہوتے تو شاعر ہو سکتے تھے یا نہیں؟" "شاعِ جاوید" اور رضاؔ صاحب کی دیگر شعری کاوشوں پر ایک معروضی نگاہ ڈالنے کے بعد اس کا جواب مستحکم اثبات میں ملتا ہے۔

رباعی شاعری کی سب سے مشکل اور خطرناک صنف ہے۔ یہ ایک ایسی ناگن ہے، جو سپیرے سے پوری توجہ اور ارتکاز چاہتی ہے۔ سپیرے کی نگاہیں بھٹکیں اور بین پر اس کی گرفت ذرا سی ڈھیلی ہوئی کہ اس نے ڈس لیا۔ اس لیے اس مشکل اور خطرناک صنفِ سخن سے صرف منتہی جوجھتے ہیں۔ کیوں کہ اس میں نہ صرف بحور و اوزان پر مکمل گرفت ضروری ہے، بلکہ زبان پر بھی شاطرانہ عبور اور ماہرانہ قدرت ناگزیر ہے۔ دراصل زبان ہی وہ واحد ذریعہ ہے، جس سے شاعر زندگی سے ہم رشتگی کا اظہار و اعلان کرتا ہے اور اپنی داخلی تحریک کو بصری پیکر عطا کرتا ہے۔ بقول محمد حسن عسکری: "اشیا قلبِ ماہیت پا کر لفظ بن جاتی ہیں"، شاعر بظاہر تو انفرادی سطح پر زبان کے تجربے سے دوچار ہوتا ہے، درحقیقت ہر وہ شخص، جو اسے سنتا یا پڑھتا ہے، اس کے ذہنی سفر اور لفظیاتی تجربے میں شریک ہوتا ہے۔ اس طرح انفرادی سے انفرادی تجربہ بھی اجتماعی شعور

بن جاتا ہے ۔"زبان کی خوبی اور صفائی" سے غالباً شبلی کی مراد بھی یہی ہے کہ شاعر اپنی داخلی تحریک کو خارجی عوامل سے ہم آہنگ کر کے لفظی پیکر عطا کرنے میں کتنی قدرت اور مہارت رکھتا ہے۔ رضا صاحب زبان کی اس کسوٹی پر بھی کھرے اترتے ہیں۔

یوں تو رضا صاحب کی دوسری اصنافِ شعری بھی اسی خوبی وصفائی زبان، وسعتِ فکر اور لطافت و نفاستِ تخیل سے مملو ہیں، لیکن رباعیوں میں پروازِ فکر جس وقار، تمکنت، تہہ داریت اور انسانی جذبۂ خیر سگالی سے آشنا ہوئی ہے، اس سے ان کے ذہنی افق کی وسعت اور رباعی کی امکانی حدود میں کشادگی کا اندازہ ہوتا ہے۔

"شعاعِ جاوید" کی رباعیاں گذشتہ چار دہائیوں پر محیط ہیں۔ ترتیب اگرچہ الٹی رکھی گئی ہے لیکن کتاب کا معکوسی مطالعہ نہ صرف شاعر کے تدریجی ذہنی ارتقا کی نشاندہی کراتا ہے، بلکہ یہ رباعیاں زندگی کے رنگین و سنگین مگر مربوط و مبسوط منظر نامے کی شکل میں ابھرتی ہیں اور ان کا فکری کینواس چونکہ عمودی نہیں افقی ہے، اس لیے زندگی کے تقریباً تمام زمینی انسلاکات پر اپنی گرفت قائم رکھتے ہوئے ماورائی تفکیر و تخیئل کے در پر دستک دیتی ہیں ـــــــ رباعی سے متعلق کسی تکنیکی بحث میں الجھنے کے بجائے میں زندگی کے اس ارتقاپذیر منظر نامے کا ایک اجمالی جائزہ لینا مناسب سمجھتا ہوں۔

"شعاعِ جاوید" کی بیشتر ابتدائی رباعیاں (زمانی اعتبار سے) وطنیت اور انسانی اور اخلاقی قدروں کی شکست و ریخت کا اشاریہ اور علامیہ قرار دی جاسکتی ہیں۔ لیکن اس وطنیت میں جو زیر سطح اشاریت اور رمزیت ہے، وہ اسے ترقی پسندوں کی نعرہ بازی سے الگ کرتی ہے۔ اس کے علاوہ آزادی سے قبل اور بعد کے عبوری دور میں اعلا انسانی قدروں کی پامالی کا احساس داظہار بھی ان رباعیوں میں مکمل شعری عرفان اور تخلیقی بے تکلفی کے ساتھ ہوا ہے، جس سے شعریت اور صحافت کے درمیان خط تفریق قائم اور واضح ہوتا ہے۔

قوم پرستی، وطن پرستی یا حب الوطنی سے متعلق رضا صاحب کی اپنی ایک نظر ہے اور یہ نظر جہاں مہاتما گاندھی کے نظریۂ عدم تشدد کی نفی کرتی ہے، وہیں یہ احساس بھی قوی کرتی ہے کہ رضا صاحب Second Hand Thinker نہیں ہیں۔ ذیل کی چند رباعیاں اس کا ثبوت ہیں ـــــ

جو قوم خودی دل سے مٹا بیٹھے گی
نام اپنا وہ مُردوں میں لکھا بیٹھے گی

بلّی بھی اگر ہوگی ضعیف ولاغر
کان اپنے وہ چوہوں سے کٹا بیٹھے گی

سب سچ سہی، وشواس، سمادھی، بھکتی
شکتی کا جواب تو فقط ہے شکتی
باتوں سے نہیں ماننے کی یہ دنیا
پتھر کو کبھی جونک نہیں لگ سکتی

ہوتی نہیں اپنوں سے عداوت اچھی
ہوتی نہیں غیروں کی اطاعت اچھی
سُن لے، اے بندۂ غلامی سُن لے
تعمیلِ غلامی سے بغاوت اچھی

فولاد کا دِل، عزمِ مصمّم لے کر
میدان میں آ، ہمّتِ ضیغم لے کر
مجبوریٔ آلام کے پھندے سے نِکل
شہ زوری و تدبیر کا پرچم لے کر

جو یاد تجھے درسِ محبت ہوتا
یا دل میں ذرا جوشِ شجاعت ہوتا
ہوتا نہ کبھی عرصۂ دنیا میں ذلیل
اے کاش، تجھے شوقِ شہادت ہوتا

حبّ الوطنی کا ایک ذیلی جذبہ ہے قومی یک جہتی، لیکن اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اس کے بغیر جذبۂ حبّ الوطنی نہ صرف تِشنہ رہتا ہے، بلکہ نامکمل اور مشتبہ بھی۔ رضا صاحب کی ابتدائی رباعیوں میں یہ دونوں جذبے دو توانا لہروں کی طرح ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اور جذبۂ

حبّ الوطنی وسیع قومی تناظر میں اپنی وحدت کی تکمیل و تصدیق کرتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ چند رباعیاں ملاحظہ ہوں:۔۔۔

باتیں اک دوسرے کی سہنا سیکھو
دریا میں یہ رنگِ موج بہنا سیکھو
بے سود ہیں یہ دیر و حرم کے جھگڑے
مل جل کے پڑوسیوں سے رہنا سیکھو

انجام جھگڑنے کا کبھی نیک نہیں
بیٹھو تو سہی، فیصلہ ہوتا ہے یہیں
بندے کو جو بندے سے لڑایا تو کیا
ناخن سے جدا ماس بھی ہوتا ہے کہیں

انساں نے اخوّت کا صنم توڑ دیا
برباد کیا دیر، حرم توڑ دیا
گھبرا کے ہوا پیار جہاں سے رخصت
غم کھا کے تمناؤں نے دم توڑ دیا

آزادی کے لیے لڑی جانے والی لڑائی اور اس میں صرف ہونے والے سمندروں خون کو ضیاع تو نہیں کہیں گے کہ بہر حال اس کا جو مقصد تھا، وہ عظیم تھا۔ لیکن آزادی کے بعد تقسیم کی لعنت کے طفیل جو خون بہا، وہ یقیناً رائگاں گیا کہ فرقہ پرستی کے عفریت کی نذر ہوا۔ وہ لمحۂ لرزاں کہ انسان شیطان بن گیا تھا اور انسانیت کی دروپدی برہنہ سرِ بازار ہو رہی تھی یہ قیاس گذرتا تھا کہ طاغوتی قوتوں کی سرکشی کے آگے لاہوتی نظام معطل ہو کر رہ گیا ہو ـــــ نئی نسل کے لیے یہ باتیں اب قصے کہانیوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں، لیکن وہ آنکھیں، جو ان بہیمانہ مناظر پر خون ہوئیں اور وہ سینے، جو براہِ راست اس طوفانِ خاک و خون کی زد پر تھے اور شق ہوئے ؟ان کے سامنے وہ سارے مناظر آج بھی ساکت و جامد ہیں۔ ایک عام نظر ان مناظر میں صرف خوف، خون، نفرت اور انتقام ہی دیکھے گی کہ تاریخ کے سرد خانے میں یہی کچھ محفوظ

ہیں، لیکن ایک دِل درد مند رکھنے والے شاعر کی نگاہ سکوت و جمود کی بالائی تہوں کو توڑ کر انسان کی بے بسی، بے چارگی اور معصومیت تلاش کرلے گی ــــ رضا صاحب کا تعلق اُس (Age group) کے شاعروں سے ہے، جنھوں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ادراک کیا کہ انسان محض ایک معمول ہے، کرشمہ تو کوئی اور دکھا رہا ہے ــــ

تسلیم کہ دنیا ہے کرشمہ تیرا
مانا کہ قیامت ہے اشارہ تیرا
شیطان کی باگ کر نہ ڈھیلی یارب
بن جائے نہ ہر کام تماشہ تیرا

بے درد نہ تھا اتنا ریاکار نہ تھا
ہر بات پہ آمادۂ پیکار نہ تھا
نخوت نے سکھائی اسے عصیاں کوشی
انسان حقیقت میں گنہگار نہ تھا

فلسفۂ جبر و قدر کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ فرقۂ جبریہ انسان کو مجبورِ محض سمجھتا ہے۔ لَاتَحَرّکُ اِلّا بِاِذنِ اللہ (اللہ کی مرضی کے بغیر کسی شے میں حرکت نہیں ہو سکتی) انسان جو کچھ کرتا ہے اس میں اس کی مرضی کا کوئی دخل نہیں ہوتا ــــ تو پھر نیکی بدی کا ذمّہ دار اسے کیوں ٹھہرایا جائے۔ سزا جزا، جنّت دوزخ کا تصوّر کیوں؟

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا (میرؔ)

یگانہ کے یہاں بھی اس کا خوب صورت اظہار ہوا ہے ــــ

چارہ نہیں کوئی جلتے رہنے کے سوا
سانچے میں فنا کے ڈھلتے رہنے کے سوا
اے شمع تری حیاتِ فانی کیا ہے
جھونکا کھاتے سنبھلتے رہنے کے سوا

(یگانہ)

رضا صاحب اس تصورِ فکر میں یگانہ کے ہمسر تو نہیں، ہم قدم ضرور ہیں ــــ

بے سود ہیں تدبیر و عمل کی رسمیں
پیمان محبت کے، وفا کی قسمیں
چلتا جا، جیسے بھی چلائے تجھ کو
تقدیر کی باگ ڈور کس کے بس میں

فرقۂ قدریہ کے عقیدے کے مطابق انسان مجبورِ محض نہیں ہے۔ بلکہ ایک نفسِ مطمئنہ کا مالک ہے۔ اسے قوتِ مدرکہ بخشی گئی ہے، جو ہر پل اس کے لئے بھلے بُرے کی تمیز و تفریق روا رکھتی ہے اور وہ بھلا یا بُرا کرنے پر خود قدرتی کا مالک ہوتا ہے۔ ورنہ اچھے برے اعمال، سزا جزا اور دوزخ جنّت کا تصور ہی نہیں ہوتا۔

رضا صاحب کے حالات یگانہ کے مقابلے میں خوش گوار، حوصلہ بخش اور یقینی ہیں، فطرتاً وہ خود بھی ایک حوصلہ مند، پر اعتماد اور مستقل مزاج شخصیت کے مالک ہیں۔ اس لیے وہ زیادہ دور تک یگانہ کے ساتھ نہیں چلتے، بلکہ غالب کی طرف دیکھتے ہیں، جس نے غم کو جنت بنا دیا ہے اور جو اپنی شمعِ ماتم خانہ کو بھی برق سے روشن کرنے کا جگر رکھتا ہے، لیکن زندگی اس کے یہاں غم اور موت کے درمیان قید ہے ــــ

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

رضا صاحب اس فلسفے کو تسلیم تو کرتے ہیں، لیکن انھوں نے غم اور موت کے درمیان اس معلّق اور مقیّد زندگی میں بھی کوشش و عمل سے ایک طرب ناک جہاں کے امکان کی نشاندہی کی ہے ــــ

غم سے ملے راحت، یہ کہاں ممکن ہے
نالوں سے فقط جی کا زیاں ممکن ہے
کوشش کرو ہنس ہنس کے جیے جانے کی
کوشش سے طرب ناک جہاں ممکن ہے

ــــ کوشش حرکت ہے، حرکت زندگی ہے اور زندگی عمل سے ہے، تعطّل سے نہیں۔

روشن ہے، بجھی ہوئی یہ قندیل نہیں

توقیر ہے، ہر سانس کی تذلیل نہیں
ہر لمحہ سفر، جنبش پیہم ، کوشش
یہ زیست عمل کا دن ہے، تعطیل نہیں

اور چوں کہ یہ دونوں نظریات خود انسان کے وضع کردہ ہیں، اس لیے یہ ظاہر سی بات ہے کہ انسان خود اپنی ذات میں نفی بھی ہے اور اثبات بھی۔ یعنی وہ بیک وقت مجبور بھی ہے اور مختار بھی ہے۔ لیکن اس مجبوری اور مختاری کی بھی کچھ حدیں ہیں۔ کیوں کہ قادر مطلق بہر حال کوئی اور ہے، انسان نہیں۔ بقول یگانہ ــــــ

ہوں صید کبھی اور کبھی صیاد ہوں میں
کچھ بھی نہیں بازیچۂ اضداد ہوں میں
مختار، مگر اپنی حدوں میں محدود
ہاں ، وسعتِ زنجیر تک آزاد ہوں میں (یگانہ)

رضا صاحب اس "وسعتِ زنجیر" کی آزادی کو تسلیم کرتے ہوئے بھی اپنی شخصیت کے حوصلہ مندانہ اظہار کے امکان کو نظر انداز نہیں کرتے ــــــ

باقی نہ رہے دل میں ہے جو کچھ کہہ جا
لاوا جو ابل رہا ہے، اس میں بہہ جا
یا جست لگا آہوئے صحرا کی طرح
یا ضبط کے چنگل میں تڑپتا رہ جا

زندگی کے اس منظر نامے کا سب سے اہم اور مرکزی کردار انسان ہے۔ انسان جو عظیم ہے ، رفیع ہے ، وسیع ہے۔ دنیا کا کوئی بھی عقیدہ، کوئی بھی مذہب انسانی عظمت، رفعت اور وسعت کو نہیں پہنچ سکتا۔ کیوں کہ مذہب یا عقیدے کی ایک حد متعین ہے۔ مگر انسان لامحدود ہے ــــــ

تا آخرِ دم دل سے جواں رہتا ہے
بیزارِ جہاں مستِ جہاں رہتا ہے
مذہب بھی ٹھہر جاتا ہے اک نقطے پر
انسان سدا رواں دواں رہتا ہے

یہی لامحدودیت انسان کو تکمیلیت (Perfectionism) کی جانب لے جاتی ہے۔ تکمیلیت جو زمان و مکان سے ماورا ہے اور بقول رچرڈ بیچ یہی تصورِ جنت ہے ــــ "HEAVEN IS NOT A PLACE, AND IT IS NOT A TIME-HEAVEN IS BEING PERFECT." (JONANTHAN LIVING STONE SEA GULL. P:55) (جنت نہ تو کوئی مقام ہے اور نہ وقت۔ جنت اپنے آپ میں مکمل ہونے کا نام ہے۔)

ہاں حال کی پیروی سے ٹل جائیں گے
مستقبل کی صدا میں ڈھل جائیں گے
تم وقت کے ہمراہ نہ پاؤ گے ہمیں
ہم وقت سے کچھ آگے نکل جائیں گے

لے ڈوبے گی خامشی، کوئی دم ہنس بول
ایک اک کرکے وجود کی گرہیں کھول
آزاد فضاؤں میں بھی کرلے پرواز
اے زہد و عبودیت کے بندے پر تول

انسان کو زندہ، متحرک، مضطرب، پُرامید اور پُرمسرت رکھنے میں سب سے بڑا ہاتھ درد کا ہے۔ یوں تو ہر دلِ کو درد کی دولت سے نوازا گیا ہے، لیکن اس کا عرفان اس وقت ہوتا ہے، جب نظر حقیقت شناس ہو جاتی ہے اور زندگی کا سب سے بڑا المیہ غالباً یہی حقیقت شناسی ہے۔ بقول یگانہ ــــ

سمجھتے کیا تھے، مگر سنتے تھے ترانۂ درد
سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سنا نہ گیا (یگانہ)

درد رضاؔ صاحب کا بھی پسندیدہ موضوع ہے۔ انھوں نے اپنی بیشتر رباعیوں میں درد کو مختلف جہتوں سے انگیز کیا ہے ــــ

جب میں نے حقیقت کی نظر پائی تھی
دکھ درد کا موسم تھا، گھٹا چھائی تھی

دن چڑھنے میں باقی تھے ابھی تنو لمحے
اور رات بہت نیچے اتر آئی تھی

دکھ درد میں مضمر ہیں خوشی کے آثار
پت جھڑ سے پھوٹتا ہے حسنِ گلزار
تصغیر نشانی ہے بڑا ہونے کی
غنچوں سے کھلا کرتے ہیں گل خوشبودار

لیکن فلسفۂ درد اتنا آسان نہیں۔ یہ کوئی سطحی اور عمومی جذبہ نہیں ــــ

درد تو ہے پاتال سے گہرے دل کے اندر اترا ہوا
رات کے گہرے سناٹے میں بنجارے کی تانیں کیا (عبداللہ کمال)

رضا صاحب نے درد کی وسعت ناپنے کے لیے ایک پیمانہ مقرر کیا ہے ــــ

وسعت میں اپار ہے بیابانِ درد
پاتال سے بھی نیچے ہے پایانِ درد
صدیاں کٹ جائیں غم گساری کرتے
جب جا کے کہیں ہوتا ہے عرفانِ درد

ــــ اور درد کی معراج یہ ہے کہ وہ انسان اور خدا کے درمیان رشتۂ عبودیت قائم کرتا ہے ــــ

بندہ ہوتا ہے یا خدا ہوتا ہے
کیا جانیے بندگی میں کیا ہوتا ہے
اک نہر سی رہتی ہے رواں آنکھوں سے
سینے میں درد سا بھرا ہوتا ہے

ــــ اور پھر، انسان اور درد کے وسیع تناظر میں انفرادی شناخت کی منزل آتی ہے۔ یہ انفرادی شناخت دراصل عرفانِ ذات بھی ہے اور انسانی کائنات میں چاند، سورج اور سیاروں کی دریافت بھی، ادراک بھی۔ یعنی شاعر کا انفرادی اظہار دراصل اجتماعی شعور کا علامیہ ہے۔ کائنات کا ہر رنگ اس کے وجود سے پھوٹتا ہے اور اسی کے وجود میں ضم ہو جاتا ہے۔ اور یہی زندگی

کے اس مہذب منظرنامے کا نقطۂ عروج ہے۔

ہاں ہاں، ویرانہ میں ہوں، بستی میں ہوں
پسپائی میں ہوں، پیش دستی میں ہوں
تو وہم ہے، سوگوارِ ہستی تو ہے
میں روح ہوں، ورثہ دارِ ہستی میں ہوں

ہے کس کی ضیا شام و سحر میرے سوا
ہے کس کی چمک زینتِ زر میرے سوا
ہے کون سوا میرے ازل سے آگاہ
ہے کون ابد کا راہبر میرے سوا

دو لمحے کی روشنی میں ڈھل جاؤں گا
شدّت کی تپش ہو گی، پگھل جاؤں گا
روشن نہ کوئی شمع کہیں کر دینا
ہر رنگ میں، میں آپ ہوں، جل جاؤنگا

سورج میں ہوں، چاند میں ہوں، ہالا میں ہوں
اوّل سے اخیر تک اجالا ہوں میں
بخشی ہے حیات کو شعاعِ جاوید
ظلمات کو مات دینے والا میں ہوں

یگانہ کا ایک شعر ہے۔

خود پرستی کیجیے، یا حق پرستی کیجیے
آہ، کس دن کے لیے ناحق پرستی کیجیے (یگانہ)

یگانہ کی خود پرستی اور حق پرستی کے سیاق و سباق مختلف تھے اور وہ اس میں حق بجانب بھی تھا۔ لکھنؤ کے نام نہاد مذہب پرستوں اور دیوالیہ پن کے شکار کوتاہ قامت شاعروں نے

اپنی جہالت اور کھوکھلے پن کو چھپانے کے لیے یگانہ کے غرورِ تخلیق سے جنم لینے والے عظیم شاعر کا گلا گھونٹ دیا اور وہ محض اپنی عزتِ نفس کی لڑائی میں چوکھی لڑتا ہوا ضائع ہوگیا ـــــ رضا صاحب کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وہ نہ کبھی معاشی عدم استحکام کا شکار ہوئے اور نہ ہی انہیں اپنی عزت نفس کی لڑائی لڑنے کی ضرورت پڑی۔ یوں بھی اب حالات بدل چکے ہیں۔ اب کسی میں اتنی جرأت نہیں ہو سکتی کہ محض مذہب کی آڑ لے کر جینے کے انسانی حقوق سلب کرلے۔

معاشی تحفظ کے احساس نے رضا صاحب کو غرور آشنا نہیں کیا، بلکہ ایک آسودہ سی نرمی اور انکسار بخش دیا۔ ان کا دلِ دردمند ایک ایسے سوز، ایک ایسے گداز سے ہم کنار ہوا، جو بالعموم مشیت سے درویشوں اور فقیروں کو ودیعت ہوتی ہے۔ چنانچہ، رضا صاحب کی شخصیت میں یگانہ جیسی خود پرستی کی آمیزش تو نہیں ہوئی، لیکن حق پرستی کا وہی تیور رہا، جو ایک بندۂ مومن کی شان ہوتی ہے ـــــ

خیرات ہوں، بانٹے کوئی بٹ جاتا ہوں
ٹکر ہو، تو چٹان سا ڈٹ جاتا ہوں
چلتا ہوں، جہاں تک بھی رہے صدق کا ساتھ
جب صدق چھٹے، راہ سے ہٹ جاتا ہوں

ہاں، اس حق پرستی کے ڈانڈے خودداری سے ضرور جا ملتے ہیں اور خودداری فکرِ سود وزیاں سے بے نیاز ہوتی ہے۔ ایک خوددار شخص نہ تو حالات سے سمجھوتا کرسکتا ہے اور نہ ہی کسی فرعونِ وقت کے آگے جھک سکتا ہے ـــــ

طوفاں میں سہارا ہی نہ پایا ہم نے
مانجھی کو حریف اپنا بنایا ہم نے
جب ڈوبنے پر آئے تو بس ڈوب گئے
تنکے کا بھی احساں نہ اٹھایا ہم نے

زندگی کا یہ منظر نامہ یہاں اپنی معنوی تہذیب و تکمیل کو پہنچتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ باقی ماندہ رباعیاں اس معنیاتی سطح سے الگ ہیں۔ میں نے آغازِ گفتگو ہی میں یہ عرض کیا تھا کہ تمام رباعیاں مل کر زندگی کا منظر نامہ مرتب کرتی ہیں اور زندگی (MULTI DIMENTIONAL) (مختلف الجہات) ہوتی ہے۔ چنانچہ، یہ رباعیاں بھی اسی ذیل میں آتی ہیں۔ ان میں اگر زندگی کی

دھڑکنیں ہیں، تو زبان و بیان کی تازہ کاری بھی ہے، شوخی بھی ہے، اور شعریت بھی ہے۔ ذیل کی رباعیوں میں زبان کا حسن ملاحظہ کیجیے اور ضرب الامثال اور محاورات کے برمحل اور برجستہ استعمال کی داد دیجیے۔

زردار کو زر سے ہاتھ دھونا ہوگا
خود ساختہ اعتبار کھونا ہوگا
بکرے کی ماں منائے گی کب تک خیر
اک دن تو اسے حلال ہونا ہوگا

اے مادرِ قوم، اشکوں سے غم دھوتی ہے؟
غدّار کی موت پر تو کیا روتی ہے؟
جس گاؤں میں بولے نہ سحر کو مرغا
اس گاؤں میں کیا صبح نہیں ہوتی ہے؟

پت جھڑ نے جو کوچ ناگہاں بول دیا
پژمردگیٔ زیست میں رس گھول دیا
منھ بند تھا حدّت سے اور اب گلشن نے
وہ راگ الاپے ہیں کہ جی کھول گیا

ہے عمرِ اخیر اور نہ دیکھو بھالو
آنکھوں میں ہیں جو خواب انھیں کو پالو
جی کھولو، قلم ہاتھ میں لو، الٹو ورق
محفوظ ہے جو ذہن میں سب لکھ ڈالو

محتاط رہو اور پھر دہلے پہ دہلے
کیوں دیکھ کے کوہِ زیست چھاتی دہلے

بس تازہ دموں سے ساز کرلینا ہے
ہر سانس سے تین چار سانسیں پہلے

آخر الذکر رباعی تجدید زیست کی عزیمت کا اظہار بھی ہے اور GENERETION GAP کو پُر کرنے کی ایک سعیٔ مشکور بھی۔

فارسی رباعی میں عمر خیام اور اردو رباعی میں جوشؔ کا نام شوخیٔ بیان کے ذیل میں حرفِ آخر مانا جاتا ہے۔ خمریات نے اس شوخی کو کچھ اور بھی تیز دھار، کاٹ دار لہجہ عطا کیا ہے۔ اس کے علاوہ جوشؔ نے اپنی رباعیات کو جو خوب صورت مکالماتی TOUCHES دیے ہیں، وہ اس کی اپنی انفرادیت ہے۔ مثلاً ـــــ

کل رات گئے عین طرب کے ہنگام
سایہ وہ پڑا پشت سے آ کر سرِ بام
تم کون ہو؟ جبریل ہوں۔ کیوں آئے ہو؟
سرکار، فلک کے نام کوئی پیغام؟ (جوشؔ)

کل رات گئے مست تھی جب بادِ نسیم
شبنم میں نہا رہی تھی پھولوں کی شمیم
اک حور نے ساغر سے نکل کر یہ کہا
میں روحِ مئے ہوش ربا ہوں، تسلیم (جوشؔ)

رضاؔ صاحب کے یہاں خمریاتی مستی تو نہیں، ہاں، اپنی ہستی کی مستی ضرور ہے۔ ذیل کی رباعی خود کلامی کی خوب صورت مثال ہے ـــــ

میں کون؟ نقیضِ بدگمانی ہوں میں!
اگیانی ہوں؟ ہرگز نہیں، گیانی ہوں میں
باطل ہوں؟ کبھی نہیں میں سچائی ہوں میں
فانی ہوں؟ غلط ہے، غیر فانی ہوں میں

اور اس رباعی میں شوخیٔ طبع ملاحظہ کیجیے۔ یہ شوخی یقیناً جوشؔ کی طرح رندانہ نہیں ہے، لیکن اس کے شاعرانہ ہونے میں بھی کوئی کلام نہیں ـــــ

یہ کون کھلے رستے بڑھی آتی ہے
میں نیند میں ہوں اور یہ اٹھلاتی ہے
اتنے میں سحر پائینتی آکر بولی
بندی ہے، آداب بجا لاتی ہے

چند ایسی رباعیاں بھی ملاحظہ کر لیجیے، جو اپنے مکمل شعری تلازمات اور لفظی تناسبات کے ساتھ تخلیقی عمل سے گذری ہیں اور جن کی میرے خیال سے تشریح و توضیح ممکن نہیں ان کی لطافت اور نازکی کو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے ــــــ

خاموش نگہ کہ لفظ و معنی کا جہاں
پایل کہ عبودیت کا احساس جواں
نازک سے قدم کہ دھڑکنیں گیتوں کی
اے رقصِ ظہورِ صبح، اے سحر رواں

احساس شرر رنگ، نظر شعلہ بجاں
باندھا ہے عجب ضبطِ محبت نے سماں
اے رازِ دروں، اور دروں، اور دروں
اے دردِ نہاں، اور نہاں، اور نہاں

گڑ گڑ گڑ آسماں پہ بادل گرجا
بڑھنے لگا انتظار درجہ درجا
پیاسی دھرتی پکار اٹھی مستی میں
اے موجِ سحابِ شوق، پاگل کر جا

"شعاعِ جاوید" کے اس اجمالی مگر معروضی مطالعے کے بعد یہ بات بلا جھجک کہی جا سکتی ہے کہ رضا صاحب اگر محقق نہ ہوتے تو ایک اہم اور قابلِ ذکر شاعر ضرور ہوتے۔ اس جملے میں ایک اضافہ یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ ان کی تحقیق کی ژرف نگاہی اور مشکل پسندی اس بات کی متقاضی ہے کہ وہ شاعری میں اپنے لیے رباعی گوئی کا مشکل میدان ہی منتخب کریں کہ یہی ان کے شایانِ شان بھی ہے۔

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی

رباعی اور رضائیت
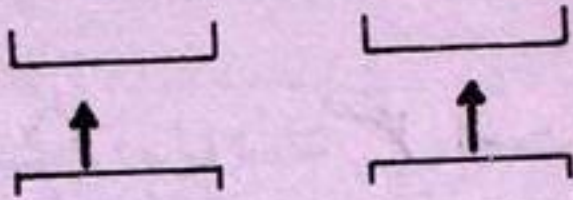
جناب کالی داس گپتا رضا اپنی متعدد تصانیف منجملہ شعری کاوشات کی روشنی میں آج کل جس شہرت و احترام کے حامل ہیں اس سے اردو ادبی طبقے بہ خوبی واقف ہیں۔ "شاعرِ جاوید" ان کی رباعیات پر مشمول شعری مجموعہ ہے جو ہر اعتبار سے درخورِ اعتنا ہے۔ رباعیات سے رجوع ہونے کے بیشتر صنفِ رباعی پر روشنی ڈالنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ فنِ رباعی سے مخاطب ہوئے بغیر بات ادھوری رہ جاتی ہے۔

رباعی معروف و حسین صنف شاعری ہے۔ اردو و فارسی کے شعرا صدیوں سے رباعیاں کہتے آئے ہیں۔ فنِ رباعی نگاری کا تاریخی تناظر بھی خاصی دلکشی کا حامل ہے۔ اقبال نے "رباعیاتِ محروم" کے دیباچہ میں لکھا کہ "فارسی شاعری میں رباعی بہت پرانی چیز ہے۔ عروضیوں نے تو اس کی بحر کو عربی اوزان سے نکالا ہے لیکن جدید تحقیقات نے یہ عقیدہ پیدا کر دیا ہے کہ رباعی کا وزن اسلامی زمانے سے پہلے کا ہے......
بہر حال یہ مسلّم ہے کہ رباعی خالص ایرانی چیز ہے، وہ ایران ہی میں پیدا ہوئی اور وہیں اس نے پرورش پائی۔ اس کا نام اگرچہ عربی نام ہے لیکن یہ نام اسے بہت بعد کے زمانے میں دیا گیا۔ تیسری چوتھی صدی ہجری کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ رباعی کو اس زمانے میں ترانہ کہتے تھے اور بالعموم اسے گانے کے لیے تصنیف کیا جاتا تھا...
رفتہ رفتہ اس میں ایسی وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہوئی کہ قصیدہ اور مثنوی تو درکنار، غزل بھی اس کے سامنے ناچیز ہو کر رہ گئی......" (ص ۱۲-۱۱ از دیباچہ طبع اول

رباعیات محروم، مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔ ۱۹۷۱ء طبع سوم)

اقبال کے خیال کی تصدیق درج ذیل ذرائع سے بھی ہوتی کہ رباعی ایرانی نژاد صنفِ شاعری ہے۔

"قدیم الایام میں ایران میں ایک خاص قسم کی نظم جس کو چہار بیتی کہا جاتا تھا، رائج تھی۔ اس کے اوزان غالباً عربی اوزان سے مستخرج نہیں ہیں بلکہ ایران زاد اور مقامی معلوم ہوتے ہیں۔" (رسالہ اردو اورنگ آباد دکن، تنقید نمبر اکتوبر ۱۹۲۲ء)

"لیکن بحکم آنکہ زمانے کہ دریں وزن مستعمل است در اشعار عرب نہ بودہ است۔ در قدیم بریں وزن تازی نہ گفتہ اند......" (المعجم مولفہ رازی ص۹۰)

"..... بہ آنکہ وزنِ رباعی کہ آں را دوبیتی و ترانہ نیز گویند از بحر ہزج بردں آمد واں را عجم پیدا کردہ اند د بر بیت چہار نوع آوردہ۔" (عروض سیفی ص۸۹۶، یشیاٹک سوسائٹی، بنگال ۱۸۷۲ء)

"وزن رباعی از مخترعات اہل عجم است و بہ ہزج اختصاص می دارد" (ص۵۶ شجرۃ العروض از مظفر علی اسیر۔ نول کشور پریس ۱۸۷۲ء)

"رباعی نوع خاصی از شعر است کہ ایرانیاں اختراع کردہ اند" (رباعیات خیام نیشاپوری مولفہ فروغی و غنی، چاپ تہران ۱۳۲۱ھ)

"رباعی کے باب میں مختصر یہ ہے کہ اس کا ایک وزن معین ہے۔ عرب میں دستور نہ تھا سوائے عجم کے۔ یہ بحر ہزج میں سے نکالا ہے۔ "مفعول مفاعلن فعولن فعلن" مسدس اخرب مقبوض مقصور اس وزن پر فعلن بڑھا دیا ہے۔ مفعول مفاعلن فعولن فعلن زحافات بعض کے نزدیک ۱۸ ہیں اور بعض کے نزدیک ۲۴......"

(ا۔ رقعہ بنام عبدالغفور سرور، خطوطِ غالب حصہ دوم مرتبہ غلام رسول مہر، لاہور

۲۔ نکاتِ غالب مرتبہ نظامی بدایونی ص ۲۸، ۱۹۵۹ء)

"عرب میں رباعی کا دستور نہ تھا۔ شعرائے عجم نے یہ بحر ہزج میں سے اخذ کی ہے" ذکر الفصاحت مولفہ نجم الغنی رام پوری ۱۹۲۶ء) آگے چل کر نجم الغنی نے لکھا ہے کہ بحر ہزج سے مخصوص ۲۴ اوزان ہوتے ہیں مگر ان کے باہم اشتراک سے کم از کم ۸۲۹۴۴ اشکال نمودار ہو سکتے ہیں۔

ان اوزان کے خرافات سے بچنے کا ایک یہ گر بتایا جاتا ہے کہ رباعی کے ہر مصرع کا پہلا رکن مفعولن یا مفعول ہوتا ہے اور آخری رکن فعَل فاع، یا فع میں سے کوئی ایک ہونا چاہیے۔ بقیہ دو درمیانی ارکان مفاعلن، مفاعیل، فعول، فاعلن سے لیے جا سکتے ہیں۔ چاروں مصرعوں کا وزن علیحدہ ہو سکتا ہے۔

بحر ہزج کے دائرہ اخرم جس کا پہلا رکن مفعولن ہوتا ہے، اور دائرہ اخرب جس کا پہلا رکن مفعول ہوتا ہے دونوں کے اشتراک سے پیدا ہونے والی شکلیں غرض کہ بے شمار بھی ہو سکتی ہیں اور ۲۴ تک محدود بھی کی جا سکتی ہیں۔ عالمی عروضیات سے واقف کار ادبا، اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ شعری ہیئتیں مرور ایام کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں بالخصوص بیسویں صدی کے اس حصّے میں جب سائنس اور تکنالوجی کی حیرت انگیز ترقی اور ظفریابی سے متعدد علوم و فنون کے مابین کھڑی دیواریں گرتی چلی جارہی ہیں اُردو عروض کو شکست و ریخت سے کون روک سکتا ہے اور تخریب سے زائیدہ تعمیر سے کس طرح روگردانی کی جا سکتی ہے۔ پہلے قطعہ، مثال کے طور پر، چار مصرعوں سے زاید بھی ہو سکتا تھا مگر آج کل دو اشعار ہی پر مشتمل ہو گیا ہے۔ پہلے بھی ایران میں دوبیتی، ترانہ اصناف مروج تھیں جن کو بعد میں رباعی کے نام سے مشرف بہ عربی کیا جانے لگا۔ بابا طاہر کی رباعیاں دائرہ اخرم کے تحت آتی ہیں نہ دائرہ اخرب کے گرداب میں گھرتی ہیں۔ اقبالؔ کے کلام میں بے شمار ایسی رباعیاں بھی ملتی ہیں جو رباعی کے اوزان کی چہار دیواری میں مقید نہیں ہیں۔ اردو عروض کو جامد و ساکت غالی علامیوں کی کمی نہیں ہے مگر ان کی ڈفلی کے راگ ان ہی کے گوش شنوا تک محدود رہتے ہیں۔

فنی پس منظر سے کہیں زیادہ اہم بات رباعی کی معنوی دروبست ہوتی ہے۔
نیز اس سے ابھرنے والی صوتی کیفیت و سرخوشی۔ رباعی کے چار مصرعوں کو غزل کے
دو مصرع سمجھنا چاہیئے، جیسے ایک اچھے شعر کے دونوں مصرعوں میں معنوی و صوری
ارتباط و اختلاط نیز انسلاکاتی ملتزمات و مستیزات بصد نمو پزیری پائے جاتے
ہیں اسی طرح ایک اچھی رباعی میں یہ سب کے سب اوصاف بہ حسن و خوبی
پائے جاتے ہیں ؎

ذکر جو آگیا قیامت کا　　　بات پہنچی تری جوانی تک

کے مصداق، رباعی کو فارسی زاد صنفِ شاعری بتاتے بتاتے اس کی
ہیئت تک پہنچ جانا لاشعوری خطوط خیال سے عبارت سمجھنا چاہیے کیوں کہ میں
اکثر و بیشتر ایک الجھن سے دو چار ہو جاتا ہوں بالخصوص یہ سمجھتے ہوئے کہ رباعی فارسی
صنفِ شاعری ہے نیز فارسی اور سنسکرت زبانوں کے مابین خاندانی رشتہ ہے
تو رباعی اور شلوک کے مابین بھی رشتے تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ تلاش و جستجو جب
مہم جوئی تک جا پہنچی تو نوادرات بھی ہاتھ آئے مثلاً درج ذیل عمر خیام کی رباعی
پیش ہے ؎

تا بود دلم ز عشق محروم نہ شد　　　کم بود ز اسرار کہ محروم نہ شد
اکنوں کے می بنگرم از روئے خرد　　　معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

بھرت ہری کے اس شلوک سے ؎

यदा किं चिज्ज्ञो ऽहं द्विप सममदांध : समभव :
तदा सर्वज्ञोऽस्मीत्यभव दव लिप्तं मम मन : ।
यदा किं चित्किंचिद् बधजन सकाशा दव गतं
तदा मोरर्वो ऽस्मीति ज्वर इव मदो मे व्यपगत : ।।

لفظ بہ لفظ عبارت معلوم ہوتا ہے۔ بھرت ہری کے اور بھی متعدد شلوک
خیام کی رباعیوں میں معنوی صدائے بازگشت کی طرح سمائے ہوئے بلکہ چھائے
ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح رباعیات عمر خیام میں ہفت اُپدیش کے خیالات

کی مکمل دروبست نظر آتی ہے۔ مثال کے بطور ؎

گرچہ غم و رنج من درازی دارد — عیش و طرب تو سرفرازی دارد
بر دہر مکن تکیہ کہ دوران فلک — در پردہ ہزار گونہ بازی دارد (خیام)

धनवानिति हि मदस्ते किं गत विभवो विषादमुपयासि ।
कर नि हतकदुक समाः पातोत्पाता मनुष्याणाम ॥ (ہت اُپدیش)

خیام کی محولہ رباعی ہت اُپدیش کے شلوک کی معنوی تناسخ کی واضح مثال ہے۔ ملحوظ رہے، میرے معروضات کا قطعاً مطلب یہ نہیں ہے کہ خیام کے یہاں مالِ مسروقہ برآمد ہوتا ہے۔ فارسی، سنسکرت، لاطینی، یونانی وغیرہ زبانیں چوں کہ ایک ہی لسانی خاندان سے متعلق ہیں لہٰذا بہت سے دل نہاد خیالات عوام میں سکۂ رائج کا درجہ رکھتے ہوں گے نیز اصنافِ شعری میں بھی نزدیک کی روایات وغیرہ مروج رہی ہوں گی۔ تحقیق طلب ہے یہ پہلو کہ رباعی اور شلوک میں عروضی مماثلت کہاں تک ہے۔ سنسکرت زبان کے عالموں سے رجوع کرنے اور شلوک کے عروضی دروبست سے متعلق استفسار سے پتہ چلتا ہے کہ شلوک ۸ ماتراؤں سے لے کر ۲۰ ماتراؤں میں کہے ملتے ہیں۔ بالفاظ دیگر سنسکرت زبان کے متعلقہ عروضی نظام میں رباعی ایسی جکڑبندیاں نہیں ہیں۔ پرانی فارسی میں بھی یہ صنفِ شاعری بحرِ ہزج کے دائرہ اخرب و اخرم میں مقید نہیں تھی۔ معنوی سطح پر نیز کسی مخصوص خیال پر ارتکاز اور اس کی بست و بند میں رباعی اور شلوک دونوں ہم رشتہ نظر آتے ہیں۔ شلوک سے متعلق ایک رائے توجہ طلب ہے۔

"In short verses the Hindus excel. Their mastery of form, their play of fancy, their depth and tenderness of feeling, are all exquisite .... of many who wrote such verses, the greatest is Bharatrihari ....."

(Anther W. Ryder quoted, Ed. M.V. Doren, Casell)

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم، اور بس مگر درج بالا معروضات کے بغیر بات ادھوری رہ جاتی بالخصوص اس لیے کہ معنوی سطح پر رباعیاتِ رضا شلوک کے ثغور تک پہنچ جاتی ہیں حالاں کہ عروضی اعتبار سے انھوں نے اپنی رباعیوں میں مخصوص ۲۴ اوزان سے باہر قدم نہیں بڑھایا ہے۔ لیکن ان کے کہے ہوئے بے شمار قطعات ایسے ہیں جن کو معنوی ارتفع و ارتقار کے لحاظ سے راقم الحروف رباعیات کے تحت شمار کرنے کی جانب متمائل ہو سکتا ہے۔

"شعاعِ جاوید" میں مشمول رباعیات دل و دماغ کی جملہ خوبیوں کی آئینہ دار ہیں۔ رضا صاحب ایک ہمہ جہت شخصیت کے حامل ہیں۔ اگر ہند و ضمیات سے استفادہ کرتے ہوئے یہ کہا جائے کہ ان پر سرسوتی اور لکشمی دونوں مہربان ہیں تو اس میں ذرہ برابر تعلی نہ ہو گی۔ کہا یہ جاتا ہے کہ یہ دونوں دیویاں ایک ساتھ نہیں نوازتیں مگر رضا صاحب کو دونوں نے درخورِ بوسہ ریزی سمجھا ہے۔ ثروتِ علم کے ساتھ ساتھ خوش نصیبیٔ مال وزر دونوں بہ فیض محنت و کاوش ان کو حاصل ہیں۔ وہ اچھے شاعر بھی ہیں اور ژرف بیں محقق اور نقاد بھی ہیں۔ مزید برآں، وہ صاحب مال وزر بھی ہیں۔ وسیع المطالعہ و مشاہدہ ہونے کے سبب وہ جو کچھ کہتے اور لکھتے ہیں وہ گراں قدر بھی ہوتا ہے اور قابلِ توجہ بھی۔ وسیع المطالعہ ہونے کا واضح ثبوت ان کی تصانیف سے بھی ہوتا ہے، مثال کے طور پر ان کی ایک تصنیف "شاخِ گل" میں رگ وید منڈل ۱۰، سوکت ۳۲، سنت گیانیشور، بھگوان بودھ، امرت منتھن، قدیم مصریوں کا ادب، غرض کہ تمام مذہبیات و ضمیات پر نظمیں شامل ہیں۔ "شعاعِ جاوید" میں مشمول نیز دوسرے شعری مجموعوں میں مشمول رباعیاں بھی رضا صاحب کے دائرۂ علم و فکر کی بھرپور غمازی کرتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ آریہ دھرم سے ان کو دلی محبت ہے، نیز دیگر مذاہب کا احترام و تکریم ان کے اوصاف حسنہ میں شامل ہیں یعنی وہ انسان دوست ہیں اور انسانیت کو پروان چڑھانا ان کا نصب العین ہو گیا ہے یہ سب کچھ بے سیاق و سباق نہیں کہا جا رہا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس پس منظر کے بغیر رباعیاتِ رضا کو نہیں سمجھا جا سکتا مگر اس کا یہ مطلب نہیں نکالنا چاہیئے کہ ان کی رباعیوں کو فٹ نوٹس (Foot notes) کی ضرورت ہے۔ نہیں، بالکل نہیں لیکن پوری

تفہیم کے لیے یہ پس منظر پیش رہے تو اچھا ہے۔ ظفر ادیب نے اپنی تحقیقی تصنیف "کالی داس گپتا رضا، تحقیق و تالیف اور شعر کی روشنی میں" منجملہ دیگر تصانیف "شعاعِ جاوید" کا بھی بھرپور جائزہ لیا ہے۔ نہ جانے کیوں موصوف نے اس بات پر واشگاف طور پر روشنی نہیں ڈالی کہ "شعاعِ جاوید" کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟

"شعاعِ جاوید" دراصل سوی تر (Savitur) ہے، جس کا ذکر گائتری (Gayatri) میں بھی ملتا ہے۔ یہ "شعاع جاوید" یعنی سوی تر بہت بڑے مفاہیم پر محیط ہے جن کو پورے منتر کی معنویت کے پس منظر ہی میں سمجھا جا سکتا ہے۔ پورا منتر یہ ہے۔

OM

Bhur bhuvah suah

Tat savitur varenyam

Bhargo devasya dhimahi

Dhiyo yō nah prachodayat

یعنی، ادم (وہ رمز آگیں صوت جو جمیع اوصاف جبروت پر محیط سمجھی جاتی ہے) ارض و سمائیز ما فوق الارض و سما ہم آریہ مراقبہ کرتے ہیں۔ "سوی تر" کا جو ضیار و بصیرت کا منبع و مخرج، ہمارے دل و دماغ کا حاکم و خالق ہے یعنی آب و تاب، کام و دہن، لازوال توانائی تخیّل، خالقِ ارض و سمائیز ما فیہا کا حاکم ہے۔ اسے "سوی تر" ہماری رہنمائی کر، تو خالقِ کون و مکان ہے، جملہ آلایشوں سے بالاتر ہے، سرچشمہ راحتِ تمام ہے، یہ تو لفظی ترجمہ ہے جو ظاہر ہے ناکافی ہے۔ منتر ہذا کا مطلب و مفہوم رگ وید کے سیاق و سباق، تقدس، طرزِ حیات پر محیط ہے۔ ایک لفظ "سوی تر" ہی کو لیجیے۔ سوی تر سورج بھی ہے، سادتری یعنی تخلیق کارانہ صلاحیت نیز جمالیاتی حسّایت بھی ہے۔ پوری کائنات کو آغوش میں لیے ہوئے توانائی بھی ہے۔ بصیرتِ دل و دماغ بھی ہے۔ دل ہے، خرد ہے، روحِ رواں ہے، غرور ہے۔ (آفتاب از اقبال)۔

از تو ایں سوز و سرور اندر وجود　　از تو ہر پوشیدہ را ذوق نمود
تو فروغ صبح و من پایانِ روز　　در ضمیرِ من چراغ بر فروز

(پس چہ باید کرد ۔ اقبالؔ)

رضاؔ صاحب کی علمیت ان سب خیالات پر محیط ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ لاالٰہ الا اللہ اور एको ब्रह्म द्वितीयो नास्ति (برہم کو چھوڑ کر کوئی دوسری شے نہیں ہے)، ہمہ اوست، ہمہ از اوست، فنافی اللہ، بقاباللہ وغیرہ کے مفاہیم ان کے ہاں جزو دل و دماغ نظر آتے ہیں۔ وہ گیتا ہی نہیں بھگوان بودھ (بدھ غلط طور پر مروج ہو گیا ہے) دھمّ پدا (Dhammapada) یعنی جس کو سنسکرت میں دھرم پتھ کہیں گے وغیرہ سب ہی کا، دافر واقفیت رکھتے ہیں لہذا مذہبیات وفکریات ان کی طبیعت میں رچ بس گئے ہیں۔ جس کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے کلام میں پائی جانے والی فکریاتی تنظیم کو "رضایت" کہنا غالباً غیر مدلل نہ ہوگا یہ فکری تنظیم خاصی وسیع و مرتفع ہے اور اس کی اساس ہے، ہمیشہ سرگرم عمل رہنے کا غیر فانی جذبہ جس کو "شعاعِ جاوید" بھی کہا جا سکتا ہے۔ رضاؔ صاحب کی شعوری ولاشعوری صفاف دلی نے اپنی رباعیات پر مشتمل مجموعہ کلام کو "شعاعِ جاوید" کا عنوان دیا ہے۔ دیکھیے یہ رباعیاں ؎

سورج میں ہوں، چاند میں ہوں، ہالا میں ہوں　　اوّل سے اخیر تک اجالا میں ہوں
بخشی ہے، حیات کو شعاعِ جاوید　　ظلمات کو مات دینے والا میں ہوں

معنوی اعتبار سے محولہ رباعی اس حدیث قدسی الانسان سرّی وانا سرّہٗ (یعنی انسان میرا باطن ہے اور میں انسان کا باطن ہوں)۔ بیدلؔ کے اس شعر ؎

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرد چمن درا
توز غنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بہ چمن درا

(بڑے ستم کی بات ہے کہ تجھے ہوس سیر سرد و چمن کی طرف مائل کرے۔ ارے تو خود غنچہ سے کم شگفتگی نہیں رکھتا۔ دل کا دروازہ کھول چمن یعنی الوہیت کے چمن میں داخل ہو جا۔)

اور مہا بھارت جس کو پانچواں وید تصور کیا جاتا ہے، اس کے بھیشم پَرو (भीष्म पर्व) میں بھیشم نے اس استفسار پر کہ سب سے بڑی حقیقت کیا ہے جواب دیا "آدمی" اور گیتا کے فلسفۂ عمل جو "دل بہ یار دست بکار" پر استوار ہے وغیرہ سے یہی منتج ہوتا ہے جو رضاؔ نے درج بالا رباعی میں کہا ہے۔ اسی اصول کو اپنا رہنما بنا کر وہ سرگرم عمل رہے ہیں۔ دھمپدا کا یہ شلوک ان پر چسپاں ہوتا ہے۔ پالی متن کو عالمی صوتیات میں ملاحظہ فرمائیں۔

Saddho silena sampanno
yasobhogasamappito
Yam yam padesam bhajati
Tattha tatth' ewa pujito

(Dhammapada ÷ 21: 14)

(یعنی، حسن اعتقاد و اوصاف حسنہ سے بھرپور شہرت و ثروت والا جہاں کہیں مسافرت کرتا ہے عظمت و عزت حاصل کرتا ہے)

اب رضاؔ سے رجوع کیجیے ؎

ظلمات میں مستور ہے منزل تیری
افلاک سے بھی دور ہے منزل تیری
کیوں آج تک اے گرم روی کے حامی
بے سایہ و بے نور ہے منزل تیری

معلوم ہے راہ اور ہمت باقی
دو چار قدم ہی کی ہے زحمت باقی
اب دیر نہیں میرے خدا ہونے میں
صرف ایک جنم کی ہے مسافت باقی

ہے کس کی ضیا رشام و سحر، میرے سوا
ہے کس کی چمک، زینتِ زر میرے سوا
ہے کون، سوا میرے، ازل سے آگاہ
ہے کون ابد کا راہبر میرے سوا

فانی نہ کہو، ہوتا ہے کم اس کا وقار
انسان کا ہوتا ہے دوامی کردار
مایوس ہو، کیوں وقت کی ظلمت سے کوئی
ہر رات سے پیدا ہیں سحر کے آثار

جو رہ گئی ان سنی، وہ تلقین ہوں میں
تردید میں لپٹا ہوا، آئین ہوں میں
اے سب کو غلط رنگ میں رنگنے والے
بے رنگ بھی ہے رنگ، تو رنگین ہوں میں

بندہ ہوتا ہے یا خدا ہوتا ہے
کیا جانیے بندگی میں کیا ہوتا ہے
اک نہر سی رہتی ہے رواں آنکھوں سے
سینے میں درد سا بھرا ہوتا ہے

شو شنکر وشنو بدھ رودریش اکال
گیانی، دھیانی اننت آدی سکھ پال
یا تو اس میں ہے یا یہ سب کچھ تجھ میں
بدمستی باطن میں کوئی حال نہ قال

درج فوق رباعیات دافر دغائر اہمیت کی حامل ہے اور اس نوعیت کی رباعیات "شعاعِ جاوید" کے ہر صفحہ پر نظر آتی ہیں۔ ان سب کا پس منظر فکریاتی ہے۔ گوپی چند نارنگ نے تقریظ میں رباعیات کی معنیاتی فضا کی جانب اشارۃً بھی بہت کچھ کہا ہے اور خوب کہا ہے مگر موخر الذکر رباعی کی وضاحت کرنے میں قدرے لغزش بھی کر گئے ہیں۔ کال اکال کی اصطلاحیں بآسانی سمجھ میں نہیں آتیں۔ سنسکرت بالخصوص ویدک سنسکرت میں کال کے معنی زمان و مکان دونوں پر محیط ہوتے ہیں لہذا اکال کا مفہوم ہے "ماورا، زمان و مکان"۔ نارنگ صاحب رودریش سے بھی نا آشنا نظر آتے ہیں۔ رودریش دراصل شو ہی کو کہتے ہیں نیز شنکر ہی کو کہتے ہیں۔ آریائی تثلیث، برہمہ، وشنو، مہیش" جو صرف الٰہیاتی جہات و ابعاد اوصاف ہی پر محمول ہے، عیسائی تثلیث (خدا، فرزند، پاک روح) سے مماثلت نہیں رکھتی بلکہ سانکھیہ اور نیائے جیسے فلسفے اس کو شونیہ (शून्य) یعنی خلائیت ہی کے مترادف سمجھتے ہیں۔ ملحوظ رہے سانکھیہ اور نیائے کے دبستانِ فکر عینیت کے دھندلکوں میں نہ پھنس کر معروضیت کو منتہائے فکر و نظر سمجھتے ہیں اور اس طرح ان کا یہ استدلال جدلیاتی استدلال سے ہم آغوش نظر آتا ہے۔ شعور کے ارتقا و ارتفع کا سلسلہ جنبانی چلتا رہا ہے اور چلتا رہے گا۔ مطلق بھی اضافی ہوتا ہے۔ حقیقت مطلقہ؛ جس کا ذکر نارنگ صاحب نے کیا ہے کوئی شے نہیں ہوتی۔ نیائے اور

سائنٹیفک فلسفوں میں وہ صرف (Generalisation) یعنی صرف تعمیم ہی ہوتی ہے۔ یہ بڑے نکتے کی بات ہے جس کو ہر کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ کال اکال کے ذکر سے بات سے بات پیدا ہو گئی ویسے نارنگ صاحب کی رائے کو قطعاً بالائے طاق نہیں رکھا جاسکتا۔ شاعر کے مافی الضمیر کا تمائل وراٹ روپ یعنی گیتا کے متذکرہ عظیم الجثہ ظہورِ یزدانی کی جانب بھی رہا ہوگا۔ مدہوشی و سرخوشی باطن ماورائی ہو جاتی ہے۔

بد پردہ ہائے وہمی ما را حجاب دیدہ	دیدیم روئے جاناں ایں پردہا دریدہ
عیاں از ذرہ ذرہ جلوۂ دلداری بینم	نہاں در برگِ گل گلشنِ بے خاری بینم
ہمہ از کافر و مومن جمالِ یاری بینم	بدستش سبحۂ نے گردنش زنار می بینم
مثال لعبتہ بازی گراں ایں پیکر اند	کہ در جنبش ہمہ از جنبش یک تار می بینم

(طالب فرخ آبادی۔ دیوان کاشف الاسرار)

رباعی ہذا کا معنوی پس منظر وسیع و بسیط اور اس میں مستعمل الفاظ کی بست و نشست دلکش آہنگ سے معمور ہے۔ جز میں کل، کل میں جز دیکھنا، شعور و لاشعور کی حدود کا انضمام وغیرہ پر محیط کیفیت نیز ضمیاتی کرداروں کا ذکر کرتے ہوئے فکریاتی منسلکات (Associations) سے معنیاتی تغور کی جانب رواں دواں اثباتیت پر ارتکاز وغیرہ ایسی خوبیاں ہیں جن کو حاصل کرنے کے لیے ریاض بھی چاہیے اور فن کارانہ ریاضت بھی۔ رباعی درخورِ ستائش ہے۔ مگر ایک سخن گسترانہ بات زباں تک آگئی ہے تو معذرت کے ساتھ پیش ہی کر دوں۔ لفظ "بدمستی" محلِ نظر ہے، جس کے معنی ہیں نشے میں چور کیفیت، بہت غفلت، بدمعاشی وغیرہ رباعی میں بہ معنی انتہائی سرخوشی و سرجوشی استعمال کیا ہے مگر چوں کہ بدمعاشی بھی معنوں میں شامل ہے لہٰذا اس کے بجائے کوئی دوسرا لفظ لانا چاہیے تھا۔ میرا خیال غلط ہو سکتا ہے۔ "سرجوش یا مدہوش" لایا جا سکتا تھا یا مصرع، اگر مستی لانا ناگزیر تھا مستی کے ساتھ یوں بھی کیا جا سکتا تھا، یعنی ع

ہے مستیٔ باطن میں کوئی حال نہ قال

اور، مدہوش / سرجوش میں جو بھی زیادہ موزوں ہو لیا جا سکتا تھا، یعنی

مدہوشیٔ　　باطن میں کوئی حال نہ قال

سرخوشیٔ　　"　　"　　"　　"

سرمستیٔ　　"　　"　　"　　"

میری رائے ممکن ہے غلط ہو بہر کیف مجھے "بدمستی" چشم نشیں نہیں معلوم ہوتی۔ ویسے بدمستی بھی غلط نہیں ہے، صرف خیال اپنا اپنا، پسند اپنی اپنی کی بات ہے اور بس

ایک اور رباعی ملاحظہ ہو ؎

دانش ور، صاحبِ نظر، فلسفہ داں　　اک بھی تو نہیں واقفِ آغازِ جہاں
واقف ہے بس خدا "نہیں، وہ بھی نہیں"　　دنیا پہلے بنی، خدا بعد ازاں

بالکل ملتے جلتے خیالات رگوید کے ایک شلوک میں بھی ملتے ہیں اور جس کو شری اربند (Aurobind) نے اپنے شعری شاہکار SAVITRI میں اپنے طرز پر یوں شروع کیا ہے ؎

It was the hour before the Gods awake.

(زائیدگان نور کے بیدار ہونے سے پیشتر ......)

"دیوتا خلق ہوئے ارض کی تخلیق کے بعد　　کون ہے پھر جو کرے منکشف اسرار شہود"

(رگ وید مترجم آثر لکھنوی)

آگے چل کر مفہوم تشکیک تک جا پہنچتا ہے، رباعی میں پیش کردہ تشکیک سے مماثلت رکھتا ہے۔ دراصل، اس کو تشکیک کہنا زیادہ صحیح بات نہیں ہے کیوں کہ سالک کی تشکیک منفی نہیں ہوتی۔ بلکہ آتم گیان आत्मज्ञान تک رسائی کے لیے ایک قدم، ایک بڑھتا ہوا قدم کے مفاہیم پر محیط تشکیک۔

ویدک درشن یعنی وید میں متشرح علم و عرفان میں ایک نہایت دلچسپ وضاحت ملتی ہے۔ دل و دماغ کے ارتقار سے متعلق چار کوش (कोश) یعنی مرحلوں کا ذکر ملتا ہے۔

احساس و زندگی پر مرتکز مرحلہ　　प्राणमय कोश

نفسیات　"　"　"　　मनोमय कोश

علم آگہی　"　"　"　　ज्ञानमय कोश

عمل پیرائی برتر تخلیقی مرحلہ — विज्ञानमय कोश

متذکرہ بالا مراحل سے سالک و شاعر دونوں کو گزرنا پڑتا ہے۔ صرف علم کی تحصیل کافی نہیں ہے۔ تحصیل کردہ علم پر عمل پیرا ہونا بڑی بات ہوتی ہے۔ بہ حیثیت رضا صاحب کی شاعری विज्ञानमय कोश یعنی فی الواقع منزل تخلیق پر پہنچی ہوئی شاعری ہے ؎

جو شعر کہا لبِ طہارت سے کہا
جی جان سے احترام و عزت سے کہا
ہے قابلِ درگزر، غلط بھی میرا
جو کچھ بھی کہا میں نے محبت سے کہا

رضاؔ کا شعری شعور اساساً فلسفیانہ ہے، وہ فلسفہ جس کو ابنِ رشد مذہب سے بالاتر سمجھتا تھا۔ نہ جانے کتنی رباعیوں سے یہی تاثر ملتا ہے اور رباعیوں کے ساتھ اگر قطعات کو بھی شامل کر لیا جائے کیوں کہ معنوی فضا کے اعتبار سے جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے دونوں اصناف میں کوئی فرق نہیں ہے، تو وہ تاثر اور بھی گہرا ہونے لگتا ہے۔ مثال کے لیے یہ رباعیاں پیش ہیں ؎

تا آخرِ دم، دل سے جواں رہتا ہے
بیزارِ جہاں، مستِ جہاں رہتا ہے
مذہب بھی ٹھہر جاتا ہے اک نقطے پر
انسان سدا رواں دواں رہتا ہے

جاہل یا صاحبِ خرد کوئی نہیں
بس ہم ہیں اور نیک و بد کوئی نہیں
ہاں یہ ہے کہ عقل کی ہزاروں ہیں حدیں
اور جہل و انانیت کی حد کوئی نہیں

خاموش نگہہ کہ لفظ و معنی کا جہاں
پایل کہ عبودیت کا احساسِ جواں
نازک سے قدم کہ دھڑکنیں گیتوں کی
اے رقصِ ظہورِ صبح، اے سحر رواں

مگر صرف فلسفیانہ نکات کو اوزانِ شعری میں پابہ زنجیر کر دینا شاعری، اصلی شاعری سے عہدہ برا ہونا نہیں کہا جا سکتا۔ فلسفیانہ خیالات میں منطق کی برودت ہوتی ہے جس کا ازالہ کرنے کے لیے جذبات بلکہ موزونیٔ و ہم آہنگیٔ جذبات کی حرارت ہی ان کو شعری سانچوں میں ڈھالتی ہے۔

فلسفیانہ نکات کے بعد، رضا کی رباعیوں کا ایک اور دلکش پہلو بھی توجہ طلب ہے۔ نفسیاتی و عمرانیاتی خصوصیات بھی گیرائی اور گہرائی کی حامل ہیں۔ ملاحظہ ہوں درج ذیل رباعیات ؎

ہٹتے نہیں، ہلتے نہیں، اڑ جاتے ہیں
ظاہر کے یہ دیندار وہ پتھر ہیں رضاؔ
محتاط کوئی کتنا ہو لڑ جاتے ہیں
جو چلتی ہوئی راہ میں گڑ جاتے ہیں

قانون کو سیم و زر میں تلتے دیکھا
اڑتی ہے جو خاک عدل کے رستوں میں
اکثر بھرم انصاف کا کھلتے دیکھا
منصف کو اسی خاک میں رلتے دیکھا

انساں نے اخوت کا صنم توڑ دیا
گھبرا کے ہوا، پیار جہاں سے رخصت
برباد کیا دیر، حرم توڑ دیا
غم کھا کے تمناؤں نے دم توڑ دیا

ڈرنا نہ خدا سے، آدمی سے ڈرنا
واقف ہوں ترے خمیر سے میں اے دل
پرہیز اپنوں سے، غیر کا دم بھرنا
خو ہے تری انسان کو رسوا کرنا

وارفتہ و نادار کا ماتم کیسا
کیوں روتے ہو محتاج کے مر جانے پر
بے یار و مددگار کا ماتم کیسا
جینے کے گنہگار کا ماتم کیسا

افلاس و عذاب ہے، مے و محفل ہے
گھنگرو کی صدا کہ آہ کچھ فرق نہیں
انسان کے افکار میں سب شامل ہے
ہنگامۂ کائنات، رقصِ دلِ ہے

جب راس نہیں کوئے مشقت کی ہوا
لیڈر بن کر اڑا شرابِ شہرت
اے دل نہ جھجک، کفر کے بازار میں آ
خلقت تو ازل ہی سے ہے راضی بہ رضا

زردار کو ہاتھ زر سے دھونا ہوگا
خود ساختہ اعتبار کھونا ہوگا

بکرے کی ماں منائے گی کب تک خیر
اک دن تو اسے حلال ہونا ہوگا

سب سچ ہی، وشواس، سمادھی، بھگتی
شکتی کا جواب تو فقط ہے شکتی
باتوں سے نہیں ماننے کی یہ دنیا
پتھر کو کبھی جونک نہیں لگ سکتی

جو قوم خودی دل سے مٹا بیٹھے گی
نام اپنا وہ مُردوں میں لکھا بیٹھے گی
بلی بھی اگر ہوگی ضعیف و لاغر
کان اپنے وہ چوہوں سے کٹا بیٹھے گی

درج بالا رباعیات میں کیا کچھ نہیں ہے۔ سیاسی شعور، سماجیاتی حالات سے واقفیت، ترقیاتی نقطۂ نظر، احتجاجی آہنگ وغیرہ خصوصیات شعری جلوہ گری میں کرن کرن موجود ہیں۔ کروٹ کروٹ خیالات کا جذباتی معادلات میں ظہور بہت بڑی بات ہے۔ آپ گنگ وجمن میں دہلوی زبان میں خیالات کی جذبات میں کشید اور پیش کش کے پیش نظر رضا کو صفِ اوّل کے شاعروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ان کا پیش نہاد انسانی فلاح وبہبود ہے۔ ان کو مہدی کا انتظار ہے۔ نہ اوتار کا۔ ان کو "انسان" کا انتظار ہے ۔

اُکتا گئے ہادیوں کا بھرنا بھرتے
کچھ بن ہی نہیں پڑتی ہے کرتے دھرتے
شیطان کا روپ لے ہی لے گی دنیا
انسان کا انتظار کرتے کرتے

جواہر لال نہرو کی انسانیت کو بطور نصب العین سمجھتے ہوئے جو رباعی کہی ہے وہ ہر اعتبار سے بیش لفظ ہے، کلیدی آہنگ ہے "شاعرِ جادید" کا ۔

دل سیلِ تعصب میں بہا جاتا ہے
اور ذہنِ رسا پیچھے رہا جاتا ہے
کہیے انھیں ہندو، انھیں مسلم کہیے
انسان تو۔ نہرو کو کہا جاتا ہے

الغرض رضا کی رباعیات میں ان کے دل و دماغ کی جملہ خوبیاں شعری مئے صد آتشہ کی سرخوشیوں سے معمور و سرشار ہو اٹھی ہیں۔ وہ مشرقی افریقہ سے ۱۹۷۰ء میں واپس آئے اور ۱۲-۱۴ سال کے قلیل عرصے ہی میں انھوں نے درجنوں کتابیں شائع کر دیں۔ چکبست و مطالعہ چکبستیات کا احیاء کیا، غالب پر گراں قدر کام کیا نیز اپنے شعری مجموعے بھی اردو حلقوں کو پیش کیے۔ وہ تالیف کا گُر بخوبی جانتے ہیں، تنقید کے میدان میں بھی وہ خاصے دقیع ہیں اور اپنا جوہر دکھا رہے ہیں۔ بہ حیثیت رباعی نگار بھی ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

صائب دو چیز می شکند قدر شعر را
تحسین ناشناس و سکوتِ ہنر شناس

یہ مفروضہ غلط ثابت ہوا ہے کہ ہندوستان کے مذاہب قومی یکجہتی لانے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہر مذہب بھان متی کا پٹارہ ہے جس میں اپنوں کے لیے پیار محبت ملے گا اور غیروں کے لیے نفرت سے لے کر رواداری تک کے ملے جلے جذبات ملیں گے۔ چنانچہ ہماری مذہبی امتیاز سے بالاتر مملکت میں واحد قابلِ اعتبار صحیفہ ہمارا آئین ہے۔

حالانکہ آئین سائنسی رویّہ اور سائنسی مزاج پیدا کرنے کا پابند ہے، مگر ہمارے بیشتر لیڈر سنتوں، سادھوؤں، فقیروں، جیوتشیوں کا دامن تھامے ہوئے ہیں۔ یہ توہمات زوال کے دنوں میں سلطنت روما کے حکمرانوں اور جرمنی میں اعلیٰ طبقے کے نازیوں کی حالتِ زار کی یاد دلاتے ہیں۔

جمال قدوائی*

عبدالاحد سازؔ

عمران ۱۶ نومبر ۱۹۸۱ء

چار مصرعوں کا سمندر

کسی اچھے اور بلند پایہ شاعر کا صنف رباعی کی طرف مائل ہونا لازمی نہ سہی، تاہم رباعی ایک ایسی صنف سخن ضرور ہے جو اپنی ساخت اور نوعیت کے تقاضوں کے اعتبار سے کسی بھی پختہ کار اور قادر الکلام شاعر کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔ رباعی کے تقطیع اوزان کے معنوی و موضوعاتی امتیاز جو رباعی کو اساتذہ نے عطا کیے ہیں مل ملا کر ایک ایسے مربوط و مرکب انتظام کا نقشہ پیش کرتے ہیں جس کو اپنے دستِ اختیار میں لے لینا ایک عمر کی فنی ریاضت کے بغیر ناممکن ہے۔ رباعی کے چار مصرعوں کا ایک کامیاب رباعی گو شاعر وقت کے ہمراہ لہروں کے زیر و بم پر تیرتا، غوطے لگاتا، کبھی سمندر کے اندرونی نظارے سے لطف اندوز ہوتا اور کبھی ایک جھٹکے کے ساتھ سطح پر آنکلتا ہوا، تفہیم کی منزل تک پہونچتا ہے۔ کالی داس گپتا رضاؔ کے مجموعۂ "شاعِ جاوید" کے بالاستیعاب مطالعے سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ رضاؔ صاحب اس چار مصرعوں کے سمندر کے صوری مدوجزر اور معنوی رموز و اسرار، دونوں کا خاطر خواہ احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ وہ نہ صرف رباعی کے مروجہ تقاضوں کو پورا کرتے ہیں بلکہ آواز کے زیر و بم کو فکری نشیب و فراز کے ساتھ ہم آہنگ کر کے الفاظ و معنی کی کشاکش کے درمیان سے اظہار کی ایک سمت متعین کرنے کا سلیقہ بھی رکھتے ہیں اور یہ ان کی فن کارانہ چابکدستی کی دلیل ہے۔ تکنیکی حسن و خوبی کی مثال کے طور پر ان کی یہ رباعیاں پیش کی جا سکتی ہیں۔

دیکھو، پرکھو نظر سے سب خال و خط
جو بات دلیل سے نہ ثابت، غلط
مسحور نہ کر دے تمہیں سحر، آواز

ڈفلی ڈفلی ہے اور بربط بربط

یہ دیر کہ مسجد، یہ طرب گہ، کہ کھنڈر
اللہ رے یہ وسعتِ نظر، یہ منظر
رہتے ہیں آپ تو فلک پر، جیسے
ہم اہل فلک سے ایک منزل اوپر

شیو شنکر، وِشنو، بُدھ، دُرویش، اکال
گیانی دھیانی اننت آدی سکھ پال
یا تو اس میں ہے، یا یہ سب کچھ تجھ میں
بدمستی باطن میں کوئی حال نہ قال

جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے رباعی عموماً گہرے اور گمبھیر فلسفیانہ موضوعات کی متحمل ہوتی رہی ہے رضا صاحب کے ہاں بھی ایسے موضوعات بیشتر ملتے ہیں۔ عام طور سے انسانی زندگی حیات وکائنات ہی کے تعلق سے بات کہی گئی ہے۔ لیکن جو بات زیادہ اہم ہے وہ یہ کہ ان رباعیوں کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے ان موضوعات کو محض مروج ہونے کی وجہ سے اپنی فنی وفکری رسائی کے ثبوت کے طور پر نہیں اپنایا۔

بلکہ اپنے حیات اور رویۂ فکر کے اظہار کے لیے صنف رباعی کو مناسب گردانتے ہوئے اپنی تسکینِ باطنی کے لیے منتخب کیا ہے۔ ان ساری رباعیوں کے درمیان جو فکری وموضوعاتی ہیں ان کے اپنے ذاتی نظریۂ حیات کا ایک ڈوراسا رینگتا ہوا نظر آتا ہے یہ ڈورا جو کہیں دلیل کی طرح واضح ہے اور کہیں کنائے کی طرح خفی اور غیر مرئی ایک عجیب انفرادی انداز میں مختلف رباعیوں کو مربوط وہم آہنگ کیے ہوئے ہے۔ رضا صاحب کے نظریات کے ماخذ کیا ہیں؛ یا ان کے پیچھے عقیدے، فکر مشاہدے کی کیا کیا پرتیں ہیں۔ اس پر ایک سیر حاصل مضمون الگ سے لکھا جا سکتا ہے۔ اس مقالے میں اس تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ ان کی رباعیوں میں فکر سے اظہار تک پہنچنے کا تخلیقی عمل کچھ یوں ہے کہ شاعر فکری اور منطقی مدارج طے کرتے

کرتے یک بہ یک بڑی دلپذیری کے ساتھ وجدانی آہنگ میں ڈھل جاتا ہے اور ان ہی خطوط پر اس کے افکار و محسوسات اظہار کی روشنی کو مس کر لیتے ہیں۔

روشن ہے، بجھی ہوئی یہ قندیل نہیں
توقیر ہے ہر سانس کی تذلیل نہیں
ہر لمحہ سفر جنبش پیہم، کوشش
یہ زیست عمل کا دن ہے تعطیل نہیں

جو رہ گئی ان سُنی وہ تلقین ہوں میں
تردید میں لپٹا ہوا آئین ہوں میں
اے سب کو غلط رنگ میں رنگنے والے
بے رنگ بھی ہے رنگ تو رنگین ہوں میں

نے شام کے سائے، نہ سحر کے انداز
ٹھہراؤ نظر کا، نہ خرد کی پرواز
آفاق فنا صفت۔ سکوتِ پیہم
انسان، نحیف سانس، ہلکی آواز

انفس و آفاق سے ہٹ کر جہاں رضا صاحب نے سماجی حالات و کوائف کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ وہاں شعاع جاوید کی نسبتاً کمزور رباعیاں تخلیق ہوئی ہیں۔ ان میں سے نہ صرف یہ کہ عمومیت ہے بلکہ ان کا مصلحانہ اور خطیبانہ انداز آرٹسٹک تاثر کو کم کرنے لگتا ہے، جس میں باقی کی رباعیاں ہوئی ہیں۔

رباعی میں اسلوب کی ندرت اور ہیئت کش کے اچھوتے پن کا تجربہ جوئے شیر لانے سے کم نہیں، زمانے سے مروجہ اسالیب میں رباعی کہی جا رہی ہے اور اس کے مصرعوں کی صوری و معنوی ترتیب بھی کم و بیش یکساں رہی ہے۔ اقلیدس یا جیومیٹری کے تھیورم THEORAM کی طرح پہلے مصرع میں مسئلے کو اٹھایا جاتا ہے۔ دوسرے اور تیسرے مصرع میں اسے ثبوت کے (Q.E.D) والے مرحلے تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ مصرعوں کی ترتیب میں الٹ پھیر کر بھی

لیا جائے تو ایک منطقی تجزیہ کا سا انداز برقرار رہتا ہے۔ رضا صاحب کے ہاں بھی کئی رباعیاں اس ناگزیر فارمولے کے زیر اثر ہیں۔ لیکن ساتھ میں کئی ایک رباعیاں ایسی بھی ہیں جن میں اس تجزیئے سے یکسر انحراف کیا گیا ہے۔ مصرعوں کے درمیان منطقی تجزیئے کی جگہ ایک داخلی تاثر و ارتباط پیدا کیا گیا ہے کہیں کہیں ابلاغ کے تسلسل کے درمیان دانستہ ایک خلا کی سی کیفیت اس طرح رکھی گئی ہے کہ رباعی کی مجموعی ترتیب اس خلا کو بیک وقت محسوس بھی کرواتی ہے اور پُر بھی کرتی ہے۔ اور یہ سارا عمل اس اعتماد اور فن کاری سے برتا گیا ہے کہ نہ شاعر کے اظہار کی نارسائی کا کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے نہ قاری کے ساتھ ابلاغ یا ترسیل کا کوئی المیہ ہے۔

محتاط رہو اور پھر و اپلے گہلے
کیوں دیکھ کے کوہ زیست چھاتی دہلے
بس تازہ دموں سے ساز کر لینا ہے
ہر سانس سے تین چار سانسیں پہلے

صناعِ ازل نے کیا بنائی بستی
پندار، خمار، ہوش مندی مستی
ایک ٹھاٹھیں مارتا بپھرتا دریا
ہستی، ہستی، چہار جانب ہستی

"شعاعِ جادید" میں کالی داس گپتا رضا مجموعی طور پر اگر بڑے رباعی گو شعرا کے ہمسر نہیں تو ان کے قریب تر ضرور نظر آتے ہیں۔ نیز اسلوب کی ندرت اور انفرادی دریافت کی تازگی رباعی کو جدید تر شعری رجحانات سے قریب کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اس طرح رضا صاحب کی رباعیوں کے توسط سے اس صنف میں مزید امکانات کی تلاش کے دروازے کھلتے ہیں اور عصری فکر اور حسیت کے لیے نئی جولاں گاہیں میسر آتی ہیں۔ یہی "شعاعِ جادید" کی اصل اہمیت اور قدر و قیمت ہے۔

عبداللہ کمال

رضا صاحب کی غزلیہ شاعری

نئی صداقتوں کے تناظر میں

نئی غزل پر کلیم الدین احمد کا بہت بڑا احسان ہے۔

کلیم صاحب نے غزل کو "نیم وحشی" کہہ کر رعایت برتی ہے۔ ورنہ غزل تو ایک مکمل وحشی صنفِ سخن ہے اور ہمیشہ ایک ایسے رنگ ماسٹر کی منتظر رہتی ہے، جو اپنی بے پناہ مہارتِ فن سے اسے اپنا تابع فرمان کرلے ــــ میر سے غالب تک جن جن شاعروں نے اسے مسخر کیا ہے، انھیں شاعر سے زیادہ رنگ ماسٹر کہنا مناسب ہے۔

میر سے غالب تک غزل کا سفر دراصل دل سے دماغ تک کا سفر ہے۔ میر نے غزل کو دل کی جن نرم آنچوں پر سلگنے کا ہنر بخشا تھا، غالب تک آتے آتے ان آنچوں کی لپک دماغ کو چھونے لگی۔ جذبہ، احساس اور فکر کی حدوں کو چھوتا ہوا ذہن کی عمیق سرنگوں میں رنگ، روشنی اور خوشبو کی پچی کاری بن کر رچ بس گیا اور ذہن کی صناعی انسانی آرکی ٹائپ سے مملو ہو کر جب مجرد احساس کے سانچے میں ڈھلی، تو تخلیقی اظہار کی بے ساختگی اور برجستگی سے عاری نہ رہی ــ چنانچہ، شعور کو لاشعور بنانے کا عمل جس ماہرانہ قدرت اور خوبصورت بے ساختگی کے ساتھ غالب کے یہاں ملتا ہے، اس کی نظیر دوسرے شاعروں کے یہاں مشکل سے ملے گی ــ غالب، بلاشبہہ ایک بہت بڑا شاعر تھا ساتھ ہی ایک عظیم کرافٹ مین بھی۔ اس تناظر میں اس کی پوری شاعری کو شعوری شاعری کہنے کی جسارت کرنی پڑے گی۔ یہ تو اس کی فعّالیت کا کمال ہے کہ اس نے تمام فطری انسلاکات کے ساتھ آورد کو آمد بنا دیا ہے۔ اور یہ کوئی عیب نہیں ہے بلکہ اس کی قدرت کاملہ اور عظمت فن کی دلیل ہے۔

غالب نے غزل کو غزال رعنا کبھی نہیں سمجھا۔ غزل اس کے لیے ایک سرکش اور وحشی درندہ ہے اور وہ خود ایک باکمال رنگ ماسٹر، جس نے اس وحشی کو اپنی غیر معمولی مہارت اور چابکدستی

سے رام کر کے تابع فرمان ڈنیم وحشی، کر لیا ہے۔ اور یہی غزل کی معراج ہے۔ اگر اس کی وحشت مکمل طور پر ختم ہو جاتی، تو پھر وہ غزل کے بجائے ایک ویجی ٹیرین صنف بن کر رہ جاتی اور ادب کا ہر برہمن غزل کا دعویدار، بلکہ غزل پر سوار ہوتا۔

اردو شاعری میں غزل ہی ایسی صنف ہے، جس کا مزاج مکمل طور پر غیر جانبدارانہ ہے چنانچہ ترقی پسند ادبی تحریک کے تام پر جن دنوں سوویت یونین کی سیاسی خارجہ پالیسی نے ادبی حمایت حاصل کرنے کی مہم چلائی تو غزل نے اپنی رمزیت، ایمائیت اور غیر جانبدارانہ مزاج کے پیش نظر کسی بھی قسم کے راست خطیبانہ اظہار کے لیے اس سیاسی تحریک کا ادبی بھونپو بننے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تحریک کے زمانہ میں غزل کا وجود زبردست خطرے سے دوچار رہا۔ ترقی پسند شاعروں کی ایک بڑی تعداد نے غزل کی تردید و تنکیر کو اپنا شعار بنا لیا۔ کچھ شعرا نے غزل کو وسیلۂ اظہار بنایا بھی، تو ایک مخصوص مقصدیت اور مشروطیت تک ہی محدود رہے۔ وہ غزل کی بیکرانیت میں اترنے سے خائف رہے اور میر سے غالب تک جس غزل نے دل کی وادی سے دماغ کی کہکشاں تک رفعت خرامی کی تھی، اسے یوٹرن (U Turn) دے کر پیٹ کے جہنم میں جھونکنے کی سعی نامشکور کی۔ یہ دور غزل پر بہت بھاری گذرا کہ اسے اپنی بقا کے لیے قدم قدم پر دفاعی جنگ لڑنا پڑی۔ اور یہ غزل کی وحشی فطرت ہی تھی جو اس دفاعی جنگ میں اس کی بقا کی ضامن بنی۔ یہاں سے غزل کے گرتے ہوئے علم کو نئی نسل کے شاعروں نے سنبھال لیا۔

آج غزل بلاشبہ اپنے روشن تر اور خوبصورت ترین دور میں داخل ہو چکی ہے۔ جدیدیت کا عبوری دور بھی تقریباً گذر چکا ہے۔ لیکن اس عرصہ میں دل اور دماغ کے حسین امتزاج سے جو فضا بنی ہے، اسی خواب رنگ، حقیقت آشنا، جمال پیراہن، فضا میں غزل نے اپنی تطہیر کی ہے اور تشکیل جدید سے گذری ہے۔ آج غزل جتنی ہمہ رنگ، ہمہ گیر اور ہمہ جہت ہے، اتنی پہلے کبھی نہ تھی۔ سخت تعجب ہے کہ اس کے باوجود ہم اصرار کر رہے ہیں کہ غالب ... غزل کا ... حرف آخر ہے .... ؟ یعنی آج بھی غالب کے تعلق سے ہم ایک طرح کی نفسیاتی مرعوبیت (Psychological awe-struckness) کا شکار ہیں اور غالب سے آگے غزل کی تمام امکانی ارتقائی وسعتوں کو محدود و مسدود سمجھتے ہیں۔ غالب یقیناً نابغۂ عصر تھا۔ زندگی اور فن کی ہر جہت میں اس نے اپنی غیر معمولی بصیرتوں کا ثبوت پیش کیا ہے۔ لیکن اس کا

یہ مطلب بھی نہیں کہ غزل غالب کے پہلے قدم میں ہی سمٹ کر رہ گئی۔؟ غالب یقیناً اس بلندی پر نظر آتا ہے کہ جہاں تک اس کے دوسرے ہم عصروں کی رسائی نہیں ہوسکی۔ اس کے باوجود وہ غزل کی لامحدود وسعتوں کو چھونے سے رہ گیا۔ یہ شعر[1] جسے غزل کے منکرین اس کی تنگ دامانی کی دلیل میں پیش کرتے ہیں، دراصل غالب کا عجز بیان ہے۔

آج کی غزل ذات کا عرفان وایقان بھی ہے اور تشکیک وتجسیس بھی۔ آج کی غزل اپنے عہد کے تناظر میں فرد کا المیہ بھی ہے، طربیہ بھی اور رجزیہ بھی۔ آج کا شاعر محض تفنن طبع کے لیے یا سرکار و دربار کی حلقہ بگوشی کے لیے غزل نہیں کہتا۔ بلکہ وہ تمام تر سماجی و سیاسی، تاریخی اور جغرافیائی انسلاکات کے ساتھ .... غزل جیتا ہے۔ آج غزل، نئی نسل کے حساس اور مشاق ہاتھوں میں پہنچ کر اپنی مکمل شناخت کے نشاتِ ثانیہ سے گذر رہی ہے اور آفاقیت اور ماورائیت کے مختلف الابعاد اوصاف سے متصف ہو رہی ہے۔ آج کی غزل غالب سے بہت آگے کی غزل ہے[2]!

غالب کے زمانے میں چاند ستارے محض تشبیہات و استعارات کی حد تک ہی قابل استعمال تھے۔ انسان نے خلا میں چھلانگ نہیں لگائی تھی۔ رائٹ برادرز نے ہوا میں پرواز کا مظاہرہ ضرور کیا تھا، لیکن غالب کی وفات کے چالیس سال بعد۔ آج سائنس نے مختلف شعبہ ہائے زندگی ہی میں نہیں، تسخیر کائنات میں بھی جو حیرت انگیز پیش رفت کی ہے، غالب نے اس کے بارے میں خواب میں بھی خیال نہ کیا ہوگا۔ چنانچہ، آج کی غزل تمام عصری، آفاقی، ماورائی اور سائنسی شعور کے ساتھ غزل ہے۔ غالب کا عہد اگر غزل کا پہلا قدم تھا تو آج کا عہد غزل کا دوسرا قدم ہے۔ آج "دشت امکاں" محض "ایک نقش پا" نہیں، بے کراں وسعتوں سے ہم کنار ہے۔

ان معروضات کی روشنی میں کیا یہ بات مضحکہ خیز نہیں لگتی کہ زندگی تو اپنے تمام زمانی و مکانی انسلاکات کے ساتھ نئی جہات میں ارتقائی پیش رفت کرتی رہی، مگر ایک غزل ہی ایسا لاشخصی تجربہ اور مفلوج صنف تھی، جو غالب کی دہلیز پر ڈھیر ہو کر رہ گئی۔ اور اس ارتقائی سفر میں شریک نہیں ہو سکی؟ یہ نئی نسل کے خلاف ایک سازش ہے۔ یہ جھوٹ دراصل اس لیے اچھالا گیا ہے کہ

---

[1] بقدر شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل　　کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لیے

[2] حوالے کے طور پر ایسے بے شمار اشعار اور شاعر کے نام پیش کیے جاسکتے ہیں، لیکن مضمون کی طوالت اور موضوع سے بھٹکنے کا خوف اس کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ کام اپنے ہم خیال دوستوں پر چھوڑتا ہوں۔ (ع ک)

نئی نسل اس ضمن میں ایک دائمی احساس کمتری میں مبتلا رہے۔ اور غالب سے آگے سوچنے کی جرات نہ کر سکے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ غالب نے غزل کی وحشت کو جس مردانہ بانکپن سے ایک چیلنج کی طرح قبول کیا تھا، اس کے بعد کافی عرصہ تک کوئی شاعر اس چیلنج کو قبول نہیں کر سکا اور غالب طنزیہ مسکراتا رہا۔

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق

ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

چنانچہ غزل غالب تک ایک باوقار نقطہ عروج کو پہنچنے کے بعد آہستہ آہستہ روبہ زوال ہوتی گئی۔ دراصل غالب نے غزل کو جن فکری بلندیوں تک پہنچایا تھا، اس کے بعد کی نسل اسے برقرار نہیں رکھ سکی۔ داغ نے زبان کی لطافت و نفاست سے ایک شوخ، چمک دار اور حسن کار فضا ضرور پیدا کی، لیکن معنوی تہہ داریت اور تخیلی رفعت نہ لا سکے۔ فانی کی یاسیت اور اصغر کے تصوف کی کچھ چنگاریاں ضرور چمکیں، لیکن جگر اور حسرت تک محض ایک سطحی رومانویت ہی باقی رہ گئی۔ البتہ یگانہ نے ایک مردانہ جلال و جمال کے ساتھ اسے سہارا دینے کی کوشش کی۔ اور پہلی بار غزل مرد کے لہجے کے لمس اور حدت سے آشنا ہوئی (آج کا لب و لہجہ بڑی حد تک اسی کی تراشیدہ شکل ہے) مگر غزل کی بدقسمتی کے دن ابھی پورے نہیں ہوئے تھے۔ یگانہ کو اس کی خدمت کا بھرپور موقع نہ مل سکا اور وہ غریب نام نہاد غالب پرستوں سے تصادم کے دوران اپنی ہی آگ میں جل مرا۔ غزل لامرکزیت کا شکار ہوئی اور رہی سہی کسر ترقی پسندوں نے پوری کر دی۔

غالب کے پہلے قدم سے آج کے دوسرے قدم تک غزل کا جو درمیانی زمانہ ہے اس کا آخری حصہ ترقی پسندوں کی نعرہ بازیوں سے پر ہے جس میں کچھ غفلت شعاریاں بھی ہیں، بے اعتدالیاں بھی ہیں، لایعنی اچھل کود سے پیدا ہونے والے گرد و غبار بھی ہیں، غنیموں کے شبخون بھی ہیں اور غزل کی بلند و بالا فصیلوں میں پڑنے والی دراڑیں بھی ہیں۔ بھلا ہو کلیم الدین احمد کا کہ ان کی بروقت ضرب، ضربِ کلیم بن کر ابھری اور غزل کے لڑکھڑاتے قدم سنبھل گیے۔ مجروح فصیلوں کی مرمت شروع ہوئی اور قصرِ غزل کا Renovation ہوا.... اور شاعری کے افق پر چھائے ہوئے ترقی پسندی کے گرد و غبار کے عقب سے نئی غزل طلوع ہوئی۔ آج کی غزل!

نئی غزل کے لیے آج کا ایک حسین تحفہ اس کا تخلیقی اسلوب ہے۔ غزل کے اس تازہ کار اسلوب کو نئے شاعروں کا ایک نادر المثال عطیہ (Contribution) کہا جا سکتا ہے

یہ اسلوب اپنے عہد کی پہچان ہے اور پھر اس کے حوالے سے آج کی غزل کی پہچان ہے جس کے وسیلے سے آج کا شاعر آج کی صداقت کے تناظر میں تشخص کی تعین کاری میں مصروف ہے۔

آج غزل ہی ایک ایسی صنف ہے، جو اپنے اسلوب، ہیت، موضوعاتی تنوع، معنیاتی پھیلاؤ اور اجتہادات کے باعث بلا تکلف عالمی شاعری کے مقابل کھڑی کی جاسکتی ہے۔ اس کی اس ہمہ گیر حیثیت کو آج دوسری زبان کے شاعر بھی تسلیم کر رہے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ آج اردو کے علاوہ ہندی، پنجابی، گجراتی، مراٹھی اور دیگر زبانوں میں بھی غزل داخل ہو رہی ہے۔

نئی شاعری نے آج جو اعتبار حاصل کیا ہے، وہ اسے اپنے عہد کے مزاج و معیار کا درجہ دینے کے لیے کافی ہے۔ بیشتر ترقی پسند شعرا نے بھی محسوس یا نامحسوس طور پر ان اثرات کو قبول کیا ہے۔ فیض، جاں نثار اختر، مخدوم، سردار جعفری اور کیفی اعظمی کے یہاں اسلوب کی سطح پر یہ اثرات بڑی حد تک واضح ہیں۔ اور یہ بات اب پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ نئی شاعری کو یہ اعتبار غزل کی قیادت میں حاصل ہوا ہے۔

نئی نسل میں آج یہ صحت مند رجحان پوری شدت سے جڑ پکڑ رہا ہے کہ شاعری کو کوئی نام نہ دیا جائے۔ قدامت پسندی، ترقی پسندی اور جدیدیت جیسے Lable سے قطع نظر شاعری کو صرف "شاعری" اور شاعر کو صرف "شاعر" قرار دینے پر اصرار کیا جا رہا ہے۔

یہ بات کچھ Abrupt سی تو لگتی ہے مگر غیر منطقی نہیں ہے کہ قدیم اسکول کے بیشتر جواں ہمت شعرا آج نئی شاعری میں اپنی دلچسپی کا اظہار کر رہے ہیں۔ یہ ایک نہ ایک دن ہونا ہی تھا۔ قدیم اسکول بزرگوں کی شریعتِ شعری پر سختی سے کاربند سہی، لیکن نئی نسل کی بوطیقا سے زیادہ دور بھی نہیں، کیونکہ شعر کی اساسی صنف "شعریت" دونوں کے یہاں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ آج کی شاعری میں موجِ تہہ نشیں کی طرح رواں نئے ذہنی رویّے کی طرف قدیم اسکول کی پیش قدمی قابلِ تحسین تو ہے، حیران کن نہیں۔

نئی صداقتوں کو تسلیم کر کے نئی آواز پر لبیک کہنے والے ایسے ہی ایک اعلیٰ ظرف، کشادہ ذہن، تازہ منظر اور جواں ہمت شاعر ہیں جناب کالیداس گپتا رضا۔

میں نے رضا صاحب کی تعریف میں اتنی توصیفی اضافتیں بے وجہ نہیں لگائیں۔ رضا صاحب ابو الفصاحت حضرت جوش ملسیانی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں اس رشتے سے ان کا تعلق داغ اسکول سے ہوا۔ اور ظاہر ہے، داغ قدیم اسکول کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس طرح رضا صاحب

اور آج کی نسل کے درمیان "انقلاب زندہ باد" کی گردباد حائل ہے۔ چنانچہ، رضا صاحب جیسے قدیم اسکول کے نمائندہ شاعر اگر ترقی پسندوں کے "دریائے شور" کو عبور کر کے نئی نسل کے ہم قدم اور ہم آواز ہونے کی سعی مشکور کرتے ہیں تو یقیناً درج بالا توصیفی اضافتوں کے مستحق ہیں۔

رضا صاحب خود کو تحقیق کا آدمی سمجھتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ قاضی عبدالودود کے بعد اس وقت رضا صاحب ہی اس شعبے میں Driver's seat پر نظر آتے ہیں۔ اور جہاں تک شاعری کا تعلق ہے، رباعیوں میں وہ اپنی فنی مہارت کا بھی لوہا منوا چکے ہیں۔ مجھے یگانہ، جوش اور فراق کے بعد رضا صاحب کی رباعیوں میں ہی وہ بات نظر آئی، جسے یگانہ "آرٹ" کہا کرتا تھا۔

رضا صاحب کی رباعیوں کے مجموعہ "شعاع جاوید" پر اپنے مطالعاتی تاثرات پیش کرتے ہوئے ایک رباعی میرے ذہن سے الجھ کر رہ گئی تھی۔

محتاط رہو، اور پھر و اپلے گھلے
کیوں دیکھ کے کوہِ زیست چھاتی دہلے
بس تازہ دموں سے ساز کر لینا ہے
ہر سانس سے تین چار سانسیں پہلے

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے میں اسے "تجدید زیست کی عزیمت اور Generation gap کو پُر کرنے کی سعئ مشکور" کہہ کر آگے بڑھ گیا تھا۔ خیال یہ تھا کہ بھلا ایک قدیم رنگ سخن کا روایتی شاعر تازہ دموں سے کیا ساز کر سکتا ہے! رضا صاحب کی غزلوں نے بھی کبھی مجھے اس طرح Attract نہیں کیا کہ تھوڑی دیر رک کر ان پر غور ہی کرنے کی زحمت کرتا۔ سوائے ان کی استادانہ قادرالکلامی کے، جس کا بھرپور مظاہرہ ان رباعیوں میں بھی ہوا ہے، میری دلچسپی کا اور کوئی سامان ان کی غزل میں نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن گذشتہ دنوں ماہنامہ "شاعر" (جلد ۵۴ شمارہ ۹) میں ان کا طویل "گوشہ" شائع ہوا، تو اس میں ان کی کچھ نئی غزلیں بھی شامل تھیں ان غزلوں نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ یہ شخص واقعی جاگتے ذہن اور دل کی دولتِ بیدار کا مالک ہے اور یقیناً اپنے "تازہ دم" successors کے ساتھ چل سکتا ہے۔ یہ معمولی بات نہیں۔ کوئی تنگ ظرف، کم نظر اور زنگ خوردہ ذہن کا مالک شخص اس جرات کا اہل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ان کی نئی غزلوں کا مطالعہ میرے لیے ناگزیر ہو گیا۔

رضا صاحب کی نئی غزلوں کا مطالعہ میرے لیے ایک خوشگوار تجربہ ثابت ہوا۔ جگہ جگہ تازہ کار لمحوں پر تخلیقی گرفت کے چاند ستارے اور نئی سوچ کے سورج نظر آئے مکمل عصری شعور کے ساتھ نئے آفاق وجہات پر فکری کمند رضا صاحب کی غزل کے امکانات کو روشن کر رہی تھی۔

آسماں سا مجھے گھر دے دینا
خاک ہو جاؤں، تو پر دے دینا
جو پتہ پوچھیں مرا، تم ان کو
مٹھی بھر گردِ سفر دے دینا

لیکن اس نئے امکانی سفر سے یہ قیاس کرنا مناسب نہیں کہ انھوں نے شاعری کی کلاسیکی روایتوں سے انحراف کیا ہے۔ رضا صاحب ان نام نہاد جدیدیوں جیسے نہیں، جو ردِ ماضی کو کارِ ثواب سمجھتے ہیں۔ وہ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ ہماری کلاسیکی روایتیں آج کی شاعری بالخصوص غزل کے لیے ناگزیر ہیں کہ ان سے ہماری غزل ایک مستحکم بنیاد اور داخلی ارتکاز سے متصف ہوتی ہے۔ کل کے حوالے سے آج کو جینا کوئی عیب کی بات نہیں۔ دیکھیے کس خوبصورت انداز سے رضا صاحب اس کا اعتراف کرتے ہیں۔

بوتا ہوں نئی نویلی فصلیں
پُرکھوں کو لگان دے رہا ہوں

کہتے ہیں، جو وقت کا ساتھ نہیں دیتے، وقت ان کا ساتھ نہیں دیتا۔ ترقی پسندوں کے پسِ کارواں رہ جانے کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے پیش روؤں کو "رجعت پسند" قرار دے کر بڑی بے مروّتی سے رد کر دیا تھا۔ اب انھیں اپنے آگے صرف غبار نظر آتا ہے۔ غبار سے آگے نئی نسل کے سفر برادر قدموں کو ان کی کم نگہی دیکھنے سے قاصر ہے۔ اور چونکہ وہ خود مر رہے ہیں، اس لیے پوری کائنات انھیں مائلِ مرگ نظر آ رہی ہے۔ مگر ان کے اندر اتنا بھی حوصلہ نہیں کہ خود احتسابی کے عمل سے گذریں۔ اس شعر میں رضا صاحب کا اشارہ غالباً اسی طرف ہے۔

کوئی بھی موت مرو، زندگی تو زندہ ہے
گیے پلوں کو نئے وقت میں شمار کرو

نئی راہوں پر چلنا ہی آسان نہیں ہوتا، نئی راہ تلاش کرنا تو بڑی دور کی بات ہے۔ وہ بھی غزل جیسی مرد افگن صنف میں؟ اور اس پر مستزاد قدیم اسکول کی ریاضت اور مخصوص ذہنی تربیت ...؟ مگر ایک شوقِ پرخلوص اور عشقِ نبرد پیشہ سے جو جھنے والے "مرد" کی جراتِ رندانہ ....؟ غزل کی وحشت کو لطافت اور سرکشی کو دلکشی میں منقلب کرنے کا آرٹ .... کسی معمولی دل گردے والے کا کام نہیں۔ ہر قدم پر ایک نئی راہ ... اور ہر نئی راہ ایک اور نئی راہ کا اشارہ ...... ایک چیلنج۔

ہم وہ دریا ہیں، جو چٹان سے ٹکرا کر
ڈھونڈ لیتے ہیں نئی راہ، پلٹ جاتے نہیں

شوق کہتا ہے، ڈھونڈتے رہیے
کوئی انجانا راستا ہے ابھی

adjusting abilities

رضا صاحب اپنی داخلی بصیرت، ذہنی غیر مشروطیت اور کے سبب بڑی بے تکلفی سے نئی نسل کے ہم قدم ہو کر ان کے شخصی تجربوں میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی شب گرد (ذہنی) رفاقتوں میں اپنے ان رفیقانِ پارینہ پر حسرت کی نظر ڈالتے ہیں، جو ان کی فکری تخلیقی پیش رفت میں ان کا ساتھ دینے سے قاصر رہے اور اپنے اپنے تحفظات کی طرف پسپا ہو کر فراموش گار لمحوں کا رزق بنے۔

کیا پوچھیے کہ چھوڑ کے ساتھی کدھر گیے
سر پر اندھیری رات تھی، سب اپنے گھر گیے

اور اب ... رضا صاحب اس عہد کی بے چہرگی، لاسمتیت اور لامقامیت ہی نہیں جی رہے ہیں، بلکہ اس پر ایک دانشورانہ تجزیاتی نظر بھی ڈالتے جا رہے ہیں۔ جس میں تیقن سے تشکک کی کونپل پھوٹ رہی ہے اور خواب بھی آسیب بننے کے مراحل سے گذر رہا ہے۔ واضح رہے کہ یہ مشکوک لاسمتیت اور مقامیت غالب کے اس[۱] Frustration سے قطعی مختلف ہے۔ یہ دراصل منفی قوتوں negative forces سے تصادم کے نتیجہ میں پیدا

۱؎ "رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو" (پوری غزل)

ہونے والی فضا ہے ؎

کوئی چھپر، کوئی کھڑکی، کوئی دیوار نہیں
یہ نگر بادِ مخالف نے بسایا ہوگا!
لاکھ جی چاہے گا، دستک پہ یقیں مت کرنا
گھر وہی آئے گا جو خواب میں آیا ہوگا

میں تجھ کو کیا خواب دے سکوں گا، میں خود ہوں اب تک ادھورا سپنا
عجب کہ تجھ کو خبر نہیں ہے، تری ہی آنکھوں میں پل رہا ہوں

عرفانِ ذات سے پہلے خواب خواب آنکھوں میں چاند ستاروں کا موسم ہوتا ہے اور ایک دھنک رنگ آسمان عرصۂ سفر۔ مگر شعور جب عرفان کی منزل میں داخل ہوتا ہے، تو منظر یک لخت بدل جاتا ہے۔ خود آگہی ایک عظیم کرب کی صورت نس نس میں اتر جاتی ہے اور قوتِ متخیلہ قوتِ مدرکہ میں ضم ہو کر بے حسن، بے رحم حقائق بھی سامنے لاتی ہے۔

فہم و فکر کی دھرتی، آسماں نہیں بنتی
میں نے بو کے دیکھے ہیں اس میں چاند تارے تک

پھر یہ چھوٹی سی مگر بنیادی حقیقت تسلیم کرتے ہی بن پڑتی ہے کہ آدمی صرف آدمی ہے۔ اور یہ افق افق پھیلی دھرتی ایک حقیقی، مگر لامحدود عرصۂ جہدِ بقا۔ اور وہ دھنک رنگ آسمان کے تخیلی عرصۂ سفر سے باہر آجاتا ہے۔

میں سیدھا سادا سا آدمی ہوں، یہ دھرتی ہی سیر گہ ہے میری
نہ چاند تاروں سے بھڑ رہا ہوں، نہ آسمانوں پہ چل رہا ہوں

یہ اعتراف شکست نہیں، اعتراف حقیقت ہے۔ آج کا آدمی، اپنی زمینی پہچان سے ماورا ہو کر خلائے بسیط میں اپنی حیثیتِ زمانی کی تعین کاری کر رہا ہے۔ آسمان اس کی حدِ نگاہ ٹھہرا، تو کہیں خلا اس کے دل کی بے تابی و بے چینی کا غبار تو نہیں؟ رگوں میں ٹوٹتے لہو کا سلسلہ کرۂ خاک سے جڑے کہ کرۂ اثیر سے؟ لہو میں لہلہاتے آتش فشاں میں جنتِ درد کا شکارا ابھی تو تیر رہا ہے.... آدم آج بھی تو اپنی حوا کو صدائیں دے رہا ہے...... کہ اب تو بس...

کوئی شریان کٹے، کوئی کلیجہ پھٹ جائے
یہ لہو کب سے مرادر لیے گھومے ہے

یہی وہ درد ہے جس نے آج خلانوردی میں بھی آدمی کی زمینی پہچان کو باقی رکھا ہے۔ اور وہ مادی حصار میں بھی زمینی اقدار کو تحفظ فراہم کر رہا ہے ..... مادہ پرست روس کے خلائی جہاز میں زمین سے ہزاروں میل دور، راکیش شرما، جب روحانی تقویت کے لیے یوگا کی مشقیں کرتا ہے، تو مارکسسٹ منظریہ جدلیاتی مادیت ریت کی دیوار کی طرح ڈھیتا نظر آتا ہے۔ یہی وہ درد ہے جو آدم سے ایں دم تک، زندگی کے ہر قصے کی قدرِ مشترک ہے ..... ماضی کے مکمل آدمی سے آج کی پاش پاش، ٹوٹی بکھری شخصیت تک، روح کی تڑپ ہے ..... ایک اکائی ہے۔

پاش پاش لاشے سے، خوں خون آرے تک
درد ہی کا قصہ ہے، غم سے غم کے مارے تک

آدمی کل بھی خائف تھا۔ آج بھی خائف ہے۔ اس لیے کہ وہ کل بھی خدا نہیں تھا۔ آج بھی بندہ خدا ہے۔ کل وہ درخت کے کھوکھلے تنے میں روپوش ہو گیا تھا، تو وہ اس کا خوف بشریت تھا۔ خدا کی ذات سے مایوسی اور عدم اعتمادی کی شعوری غلطی نہیں تھی وہ ضبط، کہ جب خوں آشام آرہ درخت کے تنے کے ساتھ ساتھ اس کے تن سے اس کا سر بھی جدا کر رہا تھا، اور وہ کلیجے کو پھاڑ نکلنے والی ہزاروں دل خراش چیخوں کو اپنے دل ہی میں دفن کر رہا تھا..... وہ ضبط، وہ برداشت اس کے عشق اور اعتماد کی معراج ضرور تھی۔ یہ شعر آفاقی قدروں کا حامل ہے اس روئے زمین پر جب تک آخری آدمی بھی زندہ ہے، یہ شعر زندہ رہے گا..... اور درد جب تک آدمی کی مشترک قدر ہے، آدمی زندہ رہے گا..... زندگی کا سفر جاری رہے گا..... سود وزیاں کے احساس کے بغیر۔

وہ ایک اشک خشک تو پلک پہ ہے
اثاثہ غم کا صرف ہو گیا تو کیا

مگر سوال یہ ہے کہ کب تک ؟ مشینی بالادستی انسانی زندگی کی معصومیت، تحیر اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کو چاٹتی جا رہی ہے..... آدمی کے اندر کا آدمی جسے مفکروں نے 'ضمیر' کا نام دے رکھا ہے، مادی افادیت اور مقصدیت کے عنصر کی بھینٹ چڑھتا جا رہا ہے..... آدمی آہستہ آہستہ کھوکھلا ہوتا جا رہا ہے..... ایسے میں کہیں وہ جمالیاتی احساس اور جذبے کی نزاکت نہ فنا ہو جائے، جو ان مشینی گھڑگھڑاہٹوں اور زندہ دھڑکنوں کے بیچ حدِ فاصل ہے... اور جس کی پھوٹ زندگی کے صحرا پہ پڑتی ہے، تو چشمے ابلتے ہیں، پھول کھلتے ہیں، خوشبو پھیلتی ہے..... اور جسے آخری پونجی کے طور پر بچانے کے لیے شاعر، مصور، مفکر اور دانشور اپنے اپنے

محاذ پر ڈٹے ہوئے ہیں... اور اپنے خونِ جگر سے جس کی حیات کاری میں مصروف ہیں ۔ رضا صاحب کو ان حقائق کا احساس بھی ہے اور عرفان بھی۔ ان کی غزل بتدریج اس شعور کی آنچ پر دم پُخت ہو کر نئے رنگ و آہنگ کی لذت پکڑ رہی ہے۔

تو کہاں ٹوٹ کر ملا ہے ابھی
چند صدیوں کا فاصلہ ہے ابھی

نہ جانے کیسی گھڑی سے گذر رہے تھے ہم
کہ جاگتے نہ رہے، نیند بھی نہیں آئی

دل اک درخت، زمیں بوس بادو باراں سے
رتیں گذر گئیں، کونپل ہری نہیں آئی

چلے تھے لے کے لبِ خشک، لوٹ بھی آئے
پر اب کے راہ میں کوئی ندی نہیں آئی

لامنظریت کی یہ فنکارانہ امیجری محض لفظی پیکر تراشی نہیں، اس میں رضا صاحب کی طویل ریاضتِ فن بھی شامل ہے اور مجاہدۂ زبان بھی۔ لفظیات کا یہ تخلیقی استعمال نہ صرف ان کی فنی مہارت کی دلیل ہے، بلکہ ان کے یہاں بڑی شاعری کے امکانات بھی روشن کرتا ہے۔

دراصل یہ رضا صاحب کی اپنی تخلیقی فعالیت بھی ہے، جس نے قدیم اسکول سے جدید اسکول تک اس طویل اور تازہ کار جست کے لیے انھیں آتش زیر پا کیا۔ یہ محض فیشن اور تتبع میں اوڑھا ہوا رنگ نہیں ہے کہ تیزابی لمحوں میں اڑ جائے گا یہ ان کے شخصی تجربوں اور شب بیدار لمحوں میں جگر کاوی کرنے سے پیدا ہونے والا رنگ ہے۔ اس میں کسی تصنع کی گنجائش نہیں۔ تخلیقی عمل کے دوران آنے والے حروف کٹیلے ضرور ہو گئے ہیں مگر خلوصِ تخلیق کی مہکار بھی سمٹ آئی ہے۔ اور پلکوں پر چلنے کی نزاکتِ احساس اور ایک Craftsman کی احتیاط بھی۔

ورق ورق مہک تو پھیلتی گئی
کٹیلا حرف حرف ہو گیا تو کیا

کوئی جزیرہ بھی تو نہیں آنکھوں میں
پلکوں پر چلنا ہے، پھسل مت جانا

مشینی جبریت کے نتیجے میں روحانی مادی تصادم سے پیدا ہونے والی اس پیچیدہ فضا میں فرد کو ایک طرف اپنی بے بسی اور بے وقعتی کا شدید احساس ہے، تو دوسری طرف بے یقینی اور عدم تحفظ کا آسیب اس کی جاگتی آنکھوں میں کابوس بن کر رہ گیا ہے۔ آج وہ اپنے Discuss میں Drawing Room کو بھی Bedroom fear کرتے ہوئے ڈرتا ہے۔ پہلے ویران سنسان مقامات پر ہی رہزن کا خوف ہوتا تھا، آج بھری پری سڑکوں کا ایک ایک موڑ حادثہ بکف ہے۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک سلامتی سے پہنچ جانے کی ضمانت بھی نہیں دی جاسکتی۔ امان بس اسی میں ہے کہ اپنے بکھرے وجود کی کرچیاں سمیٹو اور اپنے خول میں سمٹ جاؤ۔ یہ احساس رضا صاحب کے یہاں بھی بیدار ہے۔

جہاں مڑوگے، وہیں حادثے کا امکاں ہے
یہیں تھمے رہو کچھ دیر کے لیے، لوگو!

عرفان و آگہی کا کرب وہ مقامِ معلوم ہے، جہاں سے گمشدگی و بے خبری کی شہر پناہ شروع ہوتی ہے۔ ہر عارف و آگاہ کو ایک نہ ایک دن اس چہار دیواری میں پناہ لینی ہی پڑتی ہے۔ شرط عارف و آگاہ ہونا بھی ہے۔ رضا صاحب اس شرط پر پورے ہی نہیں اترتے، بلکہ اس بے خبری کو رفاہِ عام کے لیے مشتہر کرنا بھی مناسب سمجھتے ہیں۔

رہتی ہے رگ و پے میں کہیں بھیس بدل کے
اے بے خبری، تیرا اتا پتا جان لیا ہے

کل کا دن بے خبری کا ہوگا
سارے پرچوں میں خبر دیدینا

اس معروضی مطالعے کی روشنی میں یہ قیاس کرنا ممکن ہے کہ رضا صاحب کی غزلیہ شاعری غزل کی نئی صداقتوں کی تائید و تصدیق میں ایک خاص اعتبار کی فضا پیدا کرنے میں کامیاب ہوگی اور نئے معنیاتی آفاق کی جہت کھولے گی!

اسلم انصاری (پاکستان)

شب نشین و سحر شناس

رضا کی غیر مطبوعہ شاعری کا ایک مطالعہ

شاعری، ــــ زندگی کے داخلی اور خارجی جذبوں کے تال میل سے ابھرتی ہے اسی لیے اس کے آئینہ خانے میں انفس و آفاق ایک ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، خارجی کائنات کے انتشار اور بے معنویت کو ایک معنی خیز داخلی تنظیم عطا کرنا ــــ اور جذبات و تخیلات کے غیر مرئی ہیولوں کو ایک خارجی مظہریت عطا کرنا ــــ شاعری کا اولین منصب ہے، غیب و شہود کے اس اتّصال کے بغیر اچھی شاعری وجود میں نہیں آسکتی۔ کسی شاعرانہ اظہار کے فکری اور تہذیبی مضمرات کیا ہوسکتے ہیں، اس سے قطعِ نظر..... شعر کو سب سے پہلے پیکر اور اس کی روحِ لطافت کے لیے ایک نقطۂ اتّصال (سنگم) تخلیق کرنا ہوتا ہے اور پھر جہاں تک غزل کا تعلق ہے، اس کی لطافت، ایمائیت، خیال انگیزی اور وسعت پذیری سے آج تک کوئی انکار نہیں کرسکا۔ یہ صنف صدیوں پر پھیلے انسانی تجربوں، تہذیبوں کی داخلی امنگوں اور خارجی احوال کو کمال فنی مہارت کے ساتھ سمیٹتی چلی آئی ہے۔ اپنے محبوب کی طرح خود غزل بھی ایک نگارِ ہزار شیوہ ہے، جس کا روپ سروپ کسی ایک پیرایۂ اظہار میں ڈھل جانے کے بعد ختم ہو جانے کا قائل نہیں، یہ خود زندگی کی طرح بظاہر لامتناہی دکھائی دیتی ہے، یہ نغموں کے اندر سے نغمے، آوازوں کے اندر سے آوازیں، اور الفاظ کے اندر سے الفاظ برآمد کرتی چلی جاتی ہے، یہ شاعری کا شہرِ چراغاں ہے، ــــ یہ اپنے مجموعی فروغ کے لیے سب چراغوں سے روشنی قبول کرتی ہے، لیکن کسی ایک چراغ کو، ــــ اس کی انفرادی لَو کو، اس ہجومِ چراغاں میں گم نہیں ہونے

دیتی۔

جدید اُردو غزل نے تو بالخصوص انسانی تجربوں کی ایک ایسی دنیا دریافت کرلی ہے، جسے بجا طور پر ایک نئی شعریت یا نئے تغزل کی تجرباتی اساس کہا جاسکتا ہے ـــــ نئی غزل نے تجربے کے براہِ راست اظہار کا بھی ایک ڈھنگ ایسا نکال لیا ہے، جسے کڑے معیاروں والی تنقید بھی غیر شاعرانہ قرار نہیں دے سکتی۔ نئی غزل بھی کلاسیکی غزل کی طرح داخلیت اور خارجیت کے امتزاج ہی سے ابھرتی ہے، لیکن زندگی کے تجربے کی تعبیر نئی غزل میں اس طرح نہیں کی جاتی جس طرح کلاسیکی غزل میں کی جاتی تھی۔ نئی غزل ـــــ فنی لوازمات سے کہیں زیادہ تجربے کی سچائی اور انسانی اور نفسیاتی قدر و قیمت کو اہمیت دیتی ہے۔ بعض اوقات اس میں ایک نئی جمالیاتی جہت کا بھی اضافہ کیا سکتا ہے، ـــــ جو نئے غزل گو کا اپنا 'فردوسِ خیال' ہے۔ جس کے آئینے میں اس کی خواہشِ جمال اور لاشعوری ہیئتِ جمال منعکس ہوتی رہتی ہے۔ کالیداس گپتا رضا مجھے نئی غزل کے ایسے ہی شاعر دکھائی دیتے ہیں جن کے ہاں روایت کے گہرے شعور کے ساتھ ساتھ تجربے کی نئی سمت بھی ہے، اور ایک نئی جمالیاتی دنیا کی تشکیل بھی۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ لفظ "کالیداس" سے ـــ (شکنتلا کے حوالے سے) ہمارے ذہنوں میں بیک وقت اچھی شاعری اور عظیم ڈرامے کا تصور ابھرتا ہے۔ اسی لیے جدید اُردو غزل میں یہ نام ایک 'قدیم نئے پن' کا احساس دلاتا ہے۔ جناب کالی داس گپتا رضا کا کلام پڑھتے ہوئے مجھے ایک ایسے ہی 'قدیم نئے پن' کا احساس ہوا' جو روایت کی توسیع اور تجربے کے نکھار سے پیدا ہوتا ہے، ـــ اگرچہ رضا صاحب کے مجموعۂ کلام 'شب نشیں' میں ان کی بعض آزاد اور پابند نظمیں بھی شامل ہیں، لیکن بنیادی طور پر وہ ایک غزل گو شاعر ہیں۔ ان کے ہاں غزل کی روایت ایک رچاؤ کے ساتھ موجود ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ غزل کو اس کے تہذیبی سیاق و سباق کے ساتھ بھی سمجھتے ہیں۔ اور عصری زندگی کے احوال و کوائف کو غزل کے موضوعات میں شامل کرنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ "شب نشیں" کی غزلوں میں شعریت کی پہلی سطح تغزل ہی کی ہے جو کسی بھی غزل گو کا سرمایۂ افتخار ہوتا ہے۔ یہ تغزل یا

شعریت رضا صاحب کے ہاں روایت کے ساتھ ساتھ زندگی کے گہرے شعور سے ابھرتا ہے، — اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میر صاحب کی طرح وہ بھی شعر کہنے اور زندگی کرنے کے ہنر کو باہم مترادف خیال کرتے ہیں۔ اسی لئے ان کے ہاں تغزل اور شعورِ حیات ایک ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان غزلوں میں اس طرح کے اشعار میرے اس خیال کی تائید میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔

چلے بھی آؤ کہ لَو دے اُٹھیں درو دیوار
اندھیرے اپنی گھنی کاکلیں سنوار چکے
اکیلے کرنا ہے طے مجھ کو وقت کا صحرا
جو ساتھ چلتے تھے وہ قافلے سِدھار چکے

ہمارے بگڑے مقدر کو اب سنوارے کون
کسے پکارا تھا ہم نے، ہمیں پکارے کون
بہار، پھول، سحر، رنگ، بُو، صبا، شبنم
یہ سب تو دامنِ گلچیں کے ہیں، ہمارے کون

کوئی بھی فصل ہو، شاملِ رہا ہی کرتی ہے
چمن کے شور میں نازک سی ایک آہٹ بھی
اسیر بربط و مضراب! گوش بَر آواز
مقام رکھتی ہے جھونکوں کی گنگناہٹ بھی

اور یہ شعر تو فراقؔ کے طرزِ تغزل کی یاد دلاتے ہیں:۔
چمک رہی ہے حیات آنسوؤں کے پرتو سے
کسے خبر ہے فلک کیا ہے، چاند تارے کون

اڑتا پھرتا غبار ہر سُو
یہ دشتِ رواں کبھی چمن تھا
کیا روح دمک دمک اٹھی تھی
کندن سا خیال کا بدن تھا

اس نوع کے بے شمار اشعار ہیں جو "شب نشیں" کے شعری آب و رنگ کا سرمایہ ہیں۔ لیکن رضاؔ صاحب کے ہاں اپنے لہجے کو دریافت کرنے اور اپنی آواز کو پا لینے کی کامیاب صورتیں بھی موجود ہیں، جو انھیں جدید غزل میں ایک منفرد مقام عطا کرنے کی ضامن ہو سکتی ہیں، ــــ یہ بات اس لیے بھی صحیح ہے کہ وہ زندگی کے چھوٹے بڑے تجربے سے گریزاں نہیں، بلکہ انھیں اپنے شعری یا تخلیقی تجربے کی اساس بنانے کے قائل ہیں، اسی لیے ان کے ہاں جدید غزل کے نئے طرزِ احساس کے فنی اور جمالیاتی نقوش بھی نمایاں ہیں، ــــ مثلاً ذیل کے اشعار میں روایت اور انفرادی تجربے کا کامیاب امتزاج، ــــ اور نئے طرزِ احساس کی صورت پذیر ہیئتیں صاف دکھائی دیتی ہیں:۔

نئے یُگ کی تھی بشارت کہ کہانی؟ کیا تھا
شاہدِ صبح کا پیغامِ زبانی کیا تھا!
میرا سایہ جو مرے ساتھ جیا، ساتھ مرا
ازلی دوست تھا یا دشمنِ جانی، کیا تھا!
جب تو یادوں سے نکل بھاگا تو افتاد بڑی
قرب میں ورنہ ترے بُعدِ زمانی کیا تھا

بجھے بجھے حروف کو ملے کہاں سے روشنی
معلّمی کے نور کو نصاب میں نہ ڈھونڈنا
رضاؔ جو اصل ہے سو ہے، خیال و خواب کچھ نہیں
چمن کی لہلہاہٹیں سراب میں نہ ڈھونڈنا

ہاں بہت سخت، بہت بھاری ہے یہ بارِ خرد
جیتے جی سر سے نہ گر جائے، اُٹھائے رکھنا

یہ آخری شعر صحیح معنوں میں نئے عہد کے انسان کا شعر ہے — جو خرد کے بوجھ کو اُٹھانے سے تھک تو گیا ہے، لیکن زندگی کے ساتھ اس کا عہد (COMMITMENT) ہی یہی ہے وہ جیتے جی اس بوجھ کو اٹھائے رکھے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ شعر عصرِ حاضر کی انسانی صورتِ حال (HUMAN SITUATION) کا ایک خوب صورت بیان ہے۔ یہ بارِ خرد اگر ایک بار انسان کے کندھوں سے گر گیا تو پھر شاید کبھی نہ اٹھایا جا سکے۔ رضا صاحب کے ہاں نئے عہد کے انسان کا کرب، اس کی دُبدھا (DILEMA) — اُس کا احتجاج، — اور اس کی پیش بیں اور پیش گو (PROPHETIC) آواز کا پر تو بھی ملتا ہے جو انھیں عصرِ حاضر کے انسانی مطالب کے بہت قریب لے آتا ہے، مثلاً چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

اُتر جائے گا غُل میں چترِ شاہی
میں گونگے وقت کی گز بھر زباں ہوں
کھُلے بازار کھُل کھیلوں کوئی دم
دبی دولت ہوں، فریاد و فغاں ہوں

مجھے آہستہ سے آواز دینا
کہیں چونکا نہ دینا خامشی میں
مرا بچپن، مری خوشیاں، مرے خواب
دھواں سی کچھ لکیریں روشنی میں

میرے وہم و گماں تک آپہنچا
راستے سے بھٹک گیا کوئی

مرا وجود ہے مبہم، مگر وجود تو ہے

افق کے پار سہی، اور میں کہیں نہ سہی
مجھی کو نے کے مکمل ہوئی شبیہِ حیات
اخیر نقش تو ہوں، نقشِ اوّلیں نہ سہی

رضا صاحب کے ہاں زندگی کے وہ تجربات ومشاہدات بھی ہیں جو عامۃ الورود تو ہیں لیکن ان کی عمومیت کو شعری تجربات میں سمونا اور انھیں تغزل یا شعریت کا آب ورنگ عطا کرنا آسان نہیں، لیکن رضا صاحب اس مشکل کو آسان کرتے دکھائی دیتے ہیں، وہ اپنی قریبی زندگی اور اس کے داخلی انعکاسات کو کسی طرح نظرانداز نہیں کرسکتے، اور شاید یہی وجہ ان کی غزل کی ایک ایسی جہت ہے جو انھیں اردو کے جدید غزل گوؤں میں ممتاز کرسکتی ہے، ــــ تہذیب جو فن کی اساس ہے، فن کار کے لیے ایک نہایت شخصی مفہوم اور ذاتی پس منظر کا درجہ بھی رکھتی ہے۔ جھیل کے بغیر کنول اور شاخ کے بغیر گلاب کا تصور نہیں کیا جاسکتا اسی طرح ہر سچا فن پارہ، ــــ اپنی قریب المنظر زمینوں سے پھوٹتا ہے یہ اور بات ہے کہ اگر بیج قدر آور درخت کا ہے تو زندگی کے کئی آفاق اس کی رسائی میں آجاتے ہیں، اور کئی دیدہ ونادیدہ دنیائیں اس کی تماشہ گاہ بن جاتی ہیں۔ رضا صاحب نے اپنی قریب المنظر زندگی کو بیان کرنے کے لیے ــــ غزل کی مروّجہ شعری لغت میں اس رنگ کا بھی اضافہ کیا ہے، جسے قدیم نقادانِ فن 'بھاشا' کے لفظ سے یاد کرتے ہیں، ــــ میرا مطلب ہے کہ جب رضا صاحب اپنی غزل میں مانوس ہندی الفاظ کی آمیزش کرتے ہیں، تو اس سے ان کی شاعری میں کوملتا اور نغمگی کا اضافہ ہوتا ہے۔

ٹھٹھرتی رات بھی ہے، کوئی دیکھتا بھی نہیں
الاؤ جلتا ہے، مٹھی بھر آگ ہی لے لیں

شگون لے چکے ہم، پوتھیاں بچار چکے
برا ہی وقت اگر ہے تو من کو مار چکے

پہلی کرن پنگھٹ پر آئی
یا نکلی اوشا بن ٹھن کے
کیا جانے کیا کھیل ہے جاری
پردے میں اس نیل گگن کے
چار دشاؤں پر بھاری ہیں
چار گلاب ترے گلشن کے
اندر سے دو ٹکڑے ہو کر
آؤ بھریں سوانگ ملن کے

اے بے ہمت، ڈھیلے ڈھیلے
جینا برحق، جی لے، جی لے
اک عالم ان میں بستا تھا
ہائے وہ نیناں نیلے نیلے

چار سُو یاس، مگر اک امید
روشنی راج محل پر جیسے!

میں سمجھتا ہوں کہ 'شب نشیں' ـــــ اس لیے شب نشیں ہے کہ اسے زندگی کی بے معنویت کی رات کا سامنا ہے، لیکن وہ اس رات کے معنی اس کی خیال وخواب کی سی کیفیتوں، اس کے ان کہے بھیدوں، اس کے ستاروں، اس کے خاموش جنگلوں، کچے پکے راستوں، پنگھٹوں ـــــ اور پگڈنڈیوں اور انکھڑیوں میں تلاش کر رہا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ـــــ وہ جنگل کے کناروں پر آباد بستیوں کے مکینوں سے بھی اس رات کے معنی پوچھ لیتا ہے، اگرچہ ـــــ اس کے سوالوں کے جواب بھی خود اسی کے باطن سے پھوٹتے ہیں۔ یہ جواب بیشک دستِ شل پر محنت کے داغوں کے مشابہ ہیں، ـــــ لیکن اگر سوال وجواب دونوں ایک ہی ہوں تو فن کار ان کو زیادہ دیر تک الگ نہیں رکھ سکتا۔

دلِ ناکام پہ حسرت کا نشاں
داغِ محنت، کفِ شل پر جیسے
میری تکمیلِ تمنا کی نہ پوچھ
کام رکھا ہوا کل پر جیسے

دل نے جس شے کو بہ ہر رنگ جواں دیکھا ہے
زندگی نے اسے بے تاب و تواں دیکھا ہے

"شب نشیں" ـــــ میں فنی پختگی، وسعتِ نظر، اور ایک خوب صورت شعری آہنگ کے تمام آثار موجود ہیں جو اس مجموعے کو جدید اُردو شاعری اور بالخصوص جدید غزل کی دنیا میں ایک مستقل قدر و قیمت عطا کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اس مختصر سے تبصرے کو میں رضا صاحب کے ان اشعار پر ختم کرتا ہوں۔ جو مجھے بے حد پسند آئے۔

ایک سودا ہے، لٹا آتے ہیں مالِ اخلاص
ہم نے قسمت کو، کہ گاہک کو کہاں دیکھا ہے

لحظہ لحظہ سرودِ زنجیر
قیدی کی نجات بن گیا ہے
محفل میں رضا کا یوں پہنچنا
افسوس کی بات بن گیا ہے

ہم تو سمجھے تھے، گذر آئے چمن سے بچ کر
کتنی گنجائشیں دامن میں رفو کی نکلیں
جب گلے سے مرے زنار پکڑ کر کھینچا
ساتھ لپٹی ہوئی سو رمزیں وضو کی نکلیں

اب اندھیروں سے بھاگنا کیسا
اب تو ہو ہی گئی سحر جیسے
غم کے آنسو، چراغِ دیر و حرم
جگمگائیں گے رات بھر جیسے
شاعری جیسے جوئے خونِ جگر
موجِ تفہیم، چشمِ تر جیسے

لیکن مجھے لگتا ہے کہ اگر میں 'شب نشیں' میں سے اپنے تمام پسندیدہ اشعار نقل کرنے لگوں تو یہ مختصر سی تحریر ایک طویل انتخاب بن جائے گی۔ بہر حال کوئی بھی خوش ذوق قاری اور دیانت دار نقاد 'شب نشیں' کی پرجوش پذیرائی کرنے کو جذباتی مبالغہ نہیں کہہ سکتا۔

اسلم انصاری
گورنمنٹ کالج ملتان (پاکستان)
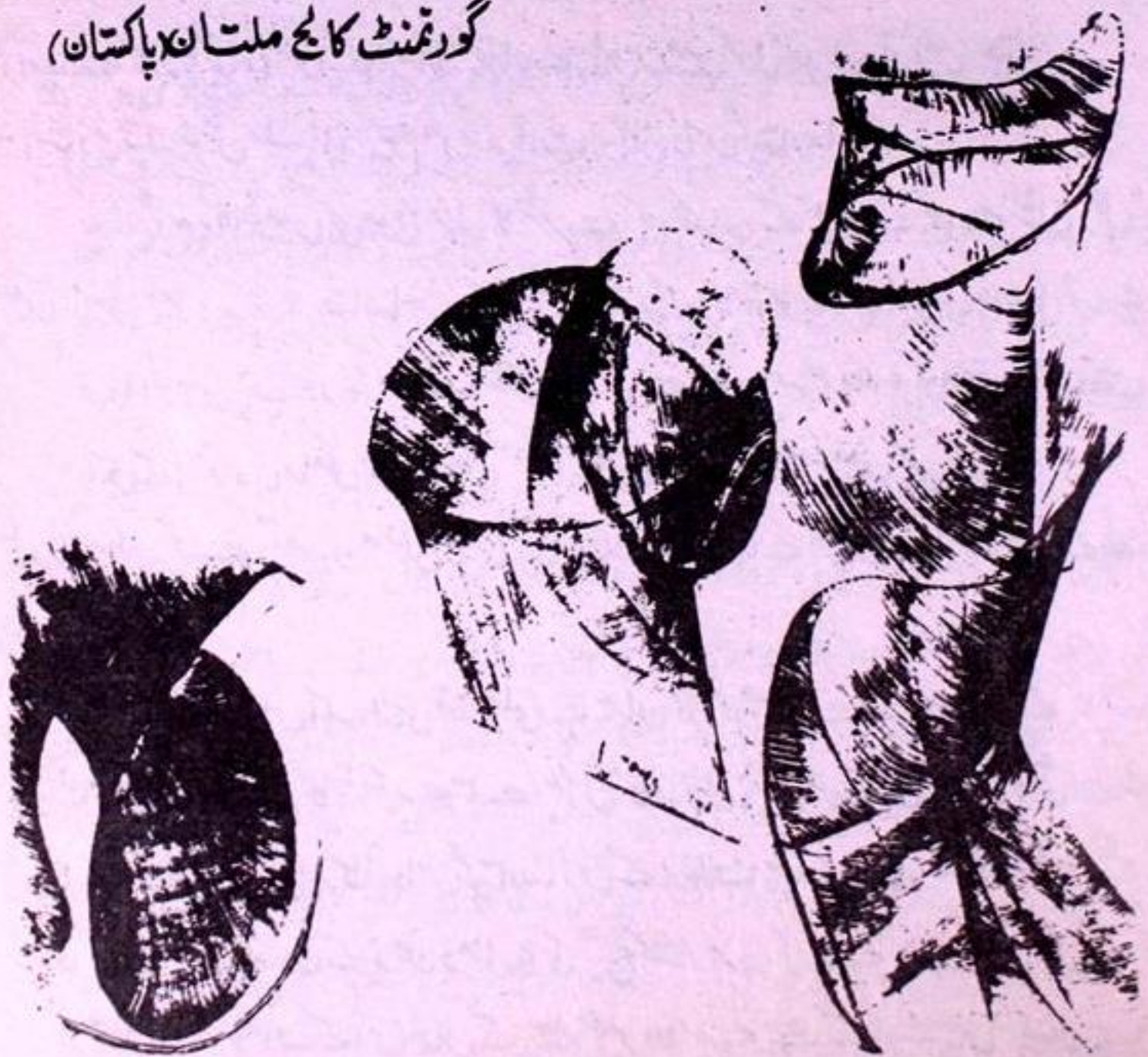
ظفر ادیب

رِضا

غزل کے بدلتے لہجے

"بدلا ہوا رنگ دیکھ کر زیر لب مسکراتے رہے یا صرف ہونہہ کر دیتے رہے۔ میں نے جب یہ شعر پڑھا ؎

کیا روح دمک دمک اٹھی تھی
کندن سا خیال کا بدن تھا

تو آپ سے نہ رہا گیا، ہنس کے فرمایا "تمہارے پڑوس میں کوئی جدید یہ تو نہیں رہتا"
"استاذی قبلہ جوش ملسیانی مرحوم" (چند یادیں) کالی داس گپتا رضا

یہ غالباً ۱۹۷۴ء میں کہی ہوئی غزل کا شعر ہے، کیونکہ ان کے تیسرے مجموعے "شاخِ گل" میں شامل نہیں یہ مجموعہ رضا صاحب کے عرض حال کے ساتھ جو ۲۸ دسمبر ۱۹۷۳ء کی تحریر ہے ۱۹۷۴ء میں چھپا اور رضا صاحب حضرت جوش سے ۲۷ دسمبر ۱۹۷۴ء کو ملاقات کرتے ہیں اسی کے اشعار کی حامل تھے غزلیں "سہیل" (گیا) اگست ۱۹۸۰ء میں چھپی ہیں، اور ڈاکٹر علیم اللہ حالی اپنے مضمون "کالی داس گپتا رضا کے فنی کارنامے" میں رضا کی غزل کے بارے میں لکھتے ہیں

"غزل میں ہمیں ایک ایسی فضا ملتی ہے جہاں کارزار ہستی سے فرار حاصل کر کے گوشۂ عافیت میں پڑے رہنے کا شائبہ ہوتا ہے، غزل کا ماحول ہمیں تن آسانی، عیش کوشی اور لذت یابی کی طرف لے جاتا ہے اور کالی داس گپتا رضا اس کے برخلاف بیداری، عمل، فکر اور ترتیب و تنظیم کے قائل ہیں اس لئے ان کے ذہن و مزاج کی صحیح کشاد غزل کی بجائے نظموں میں نظر آتی ہے"

میں ڈاکٹر موصوف کے اس خیال کے پہلے نہیں دوسرے حصے کے بارے میں صرف یہ کہوں

گا کہ یہ گمان ضرور گذرتا ہے لیکن یہ حقیقت نہیں ہے، یہ بھی درست ہے کہ رضا غزل کے ماحول سے ربع صدی الگ تھلگ رہے ہیں لیکن غزل کے مزاج سے وہ کسی نہ کسی طرح متعلق ووابستہ رہے ہیں۔ تحقیق کی جانب رجوع سے غزل کے مزاج اور ان میں قدرے بُعد بھی واقع ہوا ہے لیکن وہ اس سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکے ہیں چاہے ان کے یہاں نظموں کا پلّہ بھی غزلوں کے برابر ہوتا ہوا دکھائی پڑتا ہے، شاید معیار کے اعتبار سے نہیں مقدار کے لحاظ سے

جس رجحانِ طبع کی جانب ڈاکٹر موصوف نے اشارہ کیا ہے وہ تو ان کی گھٹّی میں پڑا ہوا تھا جوش صاحب نے اپنے دبستان سے وابستگاں کے لئے اس سلسلے کے متعدد آداب متعین کیئے ہوئے تھے اور وہ ان آداب سے انحراف گوارا نہ کرتے تھے۔ اس لئے ان کے یہاں روایتی غزل کے روایتی عناصر نہیں آنے پاتے۔ اس سے ان کی غزل کا لہجہ نظم کا لہجہ تو نہیں ہوا لیکن اس کے قریب آپڑا یا قریب آپڑنے کا دھوکا بنا "رہی بات کارزارِ ہستی سے فرار" کی ــــ تو وہ غزل اب کہاں ــــ ہاں، کہیں کہیں کوئی آواز سنائی دے جاتی ہے، شاید اس کے آثار ہر آنے والے دور میں بھی سُنے جائیں لیکن رواج کی کہیئے تو وہ بات آئی گئی ہو گئی۔

جدید شاعری کی بحث بہت طویل ہے اور یہ موقع و محل بھی نہیں اس کا ــــ حضرت جوش صاحب نے جس جدیدیت کے اثر کی جانب اشارہ فرمایا ہے وہ جدیدیت نہیں جدیدیت کا بہروپ ہے، صرف لفظیات یعنی لباس ــــ روح سے عاری بلکہ جسم سے بھی محروم ــــ یہ ترقی پسند شاعری کے دور میں بھی ہوا، صرف کسی ایک تراش اور انداز لباس سے کوئی چیز وہی نہیں ہو جاتی، روح کی بات تو بہت دور رہی، جسم کی شباہت بھی نہیں آنے پاتی۔

وہ چھ غزلیں جو رضا صاحب کی "سہیل" میں چھپی ہیں اور غالباً تازہ ترین ہیں، تازہ سے مراد یہ ہرگز نہیں کہ وہ اسی سال کی ہیں، ہو سکتا ہے کہ وہ گذشتہ چھ برسوں میں کہی گئی ہوں، کیونکہ یہ ذوق تحقیق کی نذر ہو گیا۔ تحقیق سے یکلخت عدم وابستگی دشوار ہے بلکہ بعض حالات میں ناممکن۔ میں تو اس ناوابستگی کو بھی بہت بڑی بات مانتا ہوں جب نظم کی جانب سے غزل کی طرف آیا جاتا ہے، یا غزل سے نظم کی سمت ــــ بہت کم لوگ ہیں جو نظم اور غزل یکساں معیار کی کہہ سکتے ہیں اور نظم میں نظم کی روح اور غزل میں غزل کی روح لا سکتے ہیں۔ یوں بات بنالینے کی بات اور ہے، غزل کہنا یا نظم کہنا ایک الگ سی بات ہے ــــ میں ان چھ غزلوں کی بات کر رہا تھا جس میں میرے خیال کے مطابق وہی لہجہ پایا جاتا ہے جو مضمون کے شروع میں دیئے ہوئے شعر میں ــــ اس لہجہ کے اشعار کی بعض غزلیں شاخ

گل" میں بھی ہیں۔ ان غزلوں کے ممتاز شعر دیکھئے۔

کوئی کہہ بیٹھا حدیثِ زندگی
اک دیا بجھ کر دھواں دینے لگا

○

چمن نے تو ہزاروں گل کھلائے
ہمیں مرجھا گئے اس تازگی میں

○

رگ رگ میں رقصِ ناز، توبہ
غم غمزۂ ذات بن گیا ہے

○

شانتی پر آ کر من ٹھہرا
نام کئی رکھے بھگون کے
اندر سے دو ٹکڑے ہو کر
آؤ بھر لیں سوانگ ملن کے

○

یاس کس دستِ غیبی کی ہے منتظر
راستے میں لٹی پالکی کی طرح

○

نہیں مرہون منت رہبروں کا
وہیں پہنچیں گی راہیں میں جہاں ہوں

○

اب اس لئے کا عمومی لہجہ دیکھئے

جل کے صحرا جب دھواں دینے لگا
دل نویدِ کارواں دینے لگا
جب بگولے نقشِ پا بھی لے اڑے
خارِ خوں خوردہ نشاں دینے لگا

○

مرا بچپن، مری خوشیاں، مرے خواب
دھواں سی کچھ لکیریں روشنی میں
خزاں کے ڈر سے برگ و بار لرزاں
وہ جی رہنے کی خواہش تھرتھری میں

○

دل بھیگی رات بن گیا ہے
یادوں کی برات بن گیا ہے
پلکوں پہ گھٹا، دھنک نظر میں
جو بن برسات بن گیا ہے
لحظہ لحظہ سرودِ زنجیر
قیدی کی نجات بن گیا ہے

○

ٹکڑے چن کر بکھرے من کے | کھول لے رستے نوجیون کے
سوداگر جائے گا اک دن | سپنے لے کر گاؤں سجن کے

٥

ضبط سے کام لو میرے جی کی طرح | لب شکستہ نہ ہونا کلی کی طرح
دل کو مہکا گیا اشکِ شرمندگی | پہلے چھینٹے کی سوندھی نمی کی طرح
زندگی تو ہمیشہ سے جلدی میں ہے | پربتوں سے اترتی ندی کی طرح
تیرے قدموں تلے ہی جگہ ہے مری | ایک مسلی ہوئی پنکھڑی کی طرح

٥

کھلے بازار کھل کھیلوں کوئی دم | دبی دولت ہوں فریاد و فغاں ہوں
اجالوں نے مجھے دھندلا دیا ہے | میں اب بجھتے چراغوں کا دھواں ہوں

کیا غزل کا مزاج بھی ان اشعار کی کروٹوں سے نہیں جھانک رہا ہے؟
یہ ہے، رضا کی غزل کا موجودہ لہجہ یا یہ ہے ان کی غزل کے ارتقا کا وہ مرحلہ جہاں وہ پہنچکر ٹھہر گئے ہیں اور شاعری کے بجائے تحقیق کے ہو گئے ہیں۔

آغاز کیا، رضا نے اس مرحلے سے

وہ مرا ظرف آزماتے ہیں
پاس آ آ کے دور جاتے ہیں

رضا آپ بیتی نمبر (فن اور شخصیت میں لکھتے ہیں

"مئی ۱۹۳۹ء کا مہینہ تھا، شدت کی گرمی تھی، شام کو غروب آفتاب کے بعد ہوسٹل (ایل۔ آر دوآبہ ہائی اسکول جالندھر شہر) کی چھت پر نیاز احمد، گورچین سنگھ، محمد اسماعیل رمیش وغیرہ کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا کہ مجھے گرہ سوجھی اور میں نے اونچی آواز سے کہا "(مصرع طرح تھا ؎

پاس آ آ کے دور جاتے ہیں)

اور لکھتے ہیں

چند ماہ پہلے رسالہ مستانہ جوگی لاہور میں ایک غزل پڑھی

تھی، بیدار خدا حافظ، رفتار خدا حافظ بہت پسند آئی اور بے اختیار سات آٹھ شعر کہہ ڈالے یہ میری پہلی مکمل غزل تھی، صرف مطلع یاد ہے۔

کہتا ہے تجھے دل سے بیمار خدا حافظ
اے پیار خدا حافظ، اے یار خدا حافظ

قریب قریب بیشتر اردو شعرا یونہی اپنی شاعری کا سفر شروع کرتے ہیں، استثنائی صورتیں بھی ہیں لیکن وہ دو ہی حالتوں میں پائی جاتی ہیں۔ ایک تو وہ کہ اردو غزل (شاعری) کے ماحول سے دور کا علاقہ ہو، اگرچہ بعض پہلوؤں سے یہ کم ہی ہوتا ہے کسی نہ کسی طرح سے اثرات پہنچ ہی جاتے ہیں پھر بھی جراثیمی کیفیت وہ سمیت نہیں لیے ہوتی یعنی اتنی زیادہ روایت میں ڈوبی نہیں ہوتی جتنی مضافات میں..... دوسری یہ کہ محض دیکھا دیکھی رگِ شعریت نہ پھڑک اٹھی ہو، پڑھ لکھ جانے سے (مناسب طور پر) اور جذبات واحساسات کو کسی یکایک جھنجھوڑ سے حسِ شعریت میں حرکت آگئی ہو، اس دوسری صورت میں مختلف انداز سے کوئی شاعر اپنا آغاز کرتا ہے، میرے علم میں ایسی کئی مثالیں ہیں، خود میں بھی اس وارده کا مجسمہ ہوں۔

رضا صاحب کا پہلا مجموعۂ کلام "شعلۂ خاموش" ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا، اس میں ۱۴۴ صفحات پر غزلیں ہیں اس ۲۸۰ صفحے کے شعری مجموعے میں سے (تمہیدی نثری حصے کے علاوہ) گیارہ صفحے "ادھورے خاکہ" سے متعلق خارج کردیئے جائیں (جو غزل ہی کے اشعار پر مشتمل ہے) تو دوسری اصناف کے لیے صرف ۱۳۵ صفحات ہوئے ہیں ۱۹۴۲ء کی غزل سے ۱۹۶۷ء تک کی غزل اس میں موجود ہے۔ اس مجموعے کی پہلی غزل کہنے کے سال میں رضا صاحب چودہ سال کے ہوئے تھے۔ ۱۹۴۲ء کا لہجہ دیکھیے۔

حسن جابر کے ستم کب تک سہیں	کیا قیامت تک یونہی جیتے رہیں
بے وفا ہم کو کہیں گے وہ ضرور	چاہے ہم ان کی وفا پر مر رہیں
کب تک ان کے در پہ دیں آواز ہم	کیوں عبث محو جبیں سائی رہیں
چھوڑ دی دل سے رضاؔ نے مے کشی	اب بلا سے لوگ شک کرتے رہیں

آرزوؤں کا تعاقب چھوڑ دیں
آؤ حدِ ضبط پر دم بھر رُکیں
دل وفاداری سے واقف ہی نہیں
الفت باہم کا دم کیوں کر بھریں
اے رضا کرنا نہ ان پر اعتماد
وعدہ جو ہر بار ہی جھوٹا کریں

اور یہ لہجہ ۱۹۵۷ء میں پایا جاتا ہے

ہم دورِ خزاں میں کیوں چھوٹے اب صحن چمن میں کیا ہوگا
ہم اپنے وطن اب جائیں کیا اب اپنے وطن میں کیا ہوگا
کہتے تھے لوگ جسے مجنوں جب غور کیا نکلا انساں
جو نور تھا اس کے چہرے پر وہ لعلِ یمن میں کیا ہوگا
ناکام محبت کے آنسو ہوتے ہیں نہایت پاکیزہ
جو پانی ان آنکھوں سے بہا وہ گنگ و جمن میں کیا ہوگا
جس محنت سے جس الفت سے میں تیرا نقش بناتا ہوں
یہ جذبہ نقش بنانے کا، اک ماہرِ فن میں کیا ہوگا

اسی سلسلے کا یہ بھی

حسن کے قرب سے مسحور ہوا جاتا ہوں
دین و دنیا سے بہت دور ہوا جاتا ہوں
تیرے جلوؤں کا کوئی ذکر چھڑا ہے شاید
دو قدم چلنے سے معذور ہوا جاتا ہوں
اے رضا اتنی زیادہ مری تعریف نہ کر
تیری باتوں سے میں مغرور ہوا جاتا ہوں۔

۱۹۶۷ء میں رضا غزل کا یہ لہجہ اپناتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں

نہ بھولے سے بھی اس کی باتوں میں آنا
نہ بننا بُرے تم برا ہے زمانا
نگاہوں میں منزل کا دھندلا سا خاکہ
ہوا کارواں اھلِ غم کا روانا
کبھی مل کے ہم فیصلے پر نہ پہنچے
کبھی میں نہ مانا کبھی دل نہ مانا
رضا حال کے ساتھ تم کیا چلوگے
تمہارا زمانہ ہے گزرا زمانا

اور یہ بھی .....

راہ پر لے آئے گی سرمستیٔ دل ایک دن ۔۔۔ آپ بھی ہو جائیں گے رندوں میں شامل ایکدن

مہرباں جن پر رہے ہم۔ تھے وہی نامہرباں ۔۔۔ کیا گراں گزرا تھا ہم پر رنگِ محفل ایکدن

آپ جیسوں سے امید دوستی کیا کیجئے ۔۔۔ ایک دن رحم سراپا ہیں تو قاتل ایکدن

رگیا کمسن رضا ناقدریٔ احباب سے ۔۔۔ ورنہ فنّ شعر میں ہوتا وہ کامل ایکدن

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مرحلے میں غزل کے لہجے کے عناصر پر تھوڑی سی روشنی ڈال دی جائے۔ یقیناً بعض امور کے بارے میں تو سب ہی متفق ہوں گے، لیکن بعض باتیں اس سلسلے میں خیالات ظاہر کرنے والے کی انفرادیت اور اس کے مزاج سے تعلق کی روشنی میں دیکھی جائیں گی، غزل ہر قسم کی کرختگی کو گوارا نہیں کرتی، یہ اعتدال سے زیادہ نفس گرم سے بھی مرجھا جانے والی صنفِ سخن ہے، ہر پہلو کی نرمی، شیرینی اور نغمگی مع رقصیدگی اس کا اثاثہ ہیں، ایمائیت اور اشاریت میں جو اختصاریت کی خصوصیات یا بنیادیں ہیں اس کا حسن ہے، زبان و بیان کی گھلاوٹ بھی اہم اجزا میں سے ہے ان سب کے علاوہ افکار، جذبات اور احساسات کی نوعیت ہی حقیقتاً اس کے جسم میں روح کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کی نسبت سے اس کا اظہار بھی نوع بہ نوع ہو جاتا ہے، یہ بات ہر شبہ سے بلند ہے کہ اس کی بلند آہنگی تخاطب کی حد کو نہیں چھوتی، وہ لہجہ غزل کا لہجہ (میرے خیال میں) نہیں رہتا جس میں کوئی تحتی لہر اور وجد کی کیفیت محسوس نہ کی جائے۔ افکار چاہے کیسے ہی اور کتنے ہی عصری ہوں لیکن اس اظہار اور لباس کے وہ غزل کے مرہون منت ہی رہتے ہیں" ورنہ انھیں ٹاٹ باہر" ہی سمجھنے پر آمادہ ہونا پڑے گا۔

آپ دیکھئے کہ رضا پچیس برس کی غزل میں اس لہجے کو کہاں تک نباہنے میں کامیاب ہوتے ہیں، افکار کی بات دوسری ہے، اگرچہ وہ بڑی ہی اہمیت رکھتے ہیں، غزل کے لہجے کو ایک اور انداز کے خدوخال دینے میں ــــ اس مدت میں افکار کی نوعیت میری رائے میں بے فرق ہی رہی ہے، 'شورش پنہاں' دوسرا مجموعۂ کلام ہے، یہ ۱۹۷۰ء میں چھپا اور اس میں شاید ۳۱ اگست ۱۹۶۹ء تک کا کلام ہے، کیوں کہ اس تاریخ کی تحریر عرض حال ہے، اس مجموعے کی غزلوں کے بارے میں جناب صفدر آہ صاحب فرماتے ہیں۔

"رضا کی غزلیں شگفتہ زمینوں میں ہیں اور بامزہ ہیں ساتھ ہی ان کے دوسرے اصناف میں خاصی روانی ہے لیکن چوں کہ ان کی شاعری کا

ارتقاء ہندستان کے باہر ہوا ہے لہٰذا بعض جگہ ان کا انداز بیان رائج الوقت روایات سے الگ نظر آتا ہے لیکن اس کے باوجود ان کے سیاق میں کہیں غرابت نہیں آتی ہے بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ خود ایک نیا انداز پیدا کر رہے ہیں ،،

کن باتوں کے پیش نظر انداز بیان کو رائج الوقت روایات سے الگ کہہ دیا گیا، کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ پھر اسی کے ساتھ سیاق میں غرابت کا نہ آنا تسلیم کیا اور صرف یہ کہہ کے گزر جانا کہ "وہ خود ایک نیا انداز پیدا کر رہے ہیں،" اس سے بات نہیں بنتی، کچھ اس سلسلے میں بتایا بھی جانا چاہیئے تھا۔

غزلوں کی تعداد اس مجموعے میں اٹھائیس ہے، کسی پر غزل کا سن درج نہیں کیا گیا، شاید اس کی ضرورت اس لیے نہیں سمجھی گئی کیوں کہ یہ مختصر مدت میں کہی ہوئی غزلیں ہیں اور پھر ان میں لہجے کی یکسانیت بھی پائی جاتی ہے مگر زیادہ سنبھلا ہوا اور سنورا ہوا — اگرچہ یہ نوید پہلے ہی مطلع میں دیتے ہیں۔

نہ سنائے گی زباں اب غم و درد کا فسانہ
نئے موڑ مڑ رہا ہے مری فکر کا زمانہ

یہ احساس غنیمت ہے، لہجے میں ایک نئی رمق سی جان پڑتی ہے اور یہ رمق ایسے خدوخال اختیار کرتی ہے۔

تمغے سے شجاعت کے مزیّن مجھے کر جا
اے شوقِ شہادت تو رگِ جاں میں اتر جا

آغوشِ قضا دیکھ کے بے طور بکھر جا
تو زندۂ جاوید ہے اٹھ، جی سے گزر جا

مٹ جانے کو ہے عظمتِ انساں کا نشاں تک
اے نقشِ وفا صفحۂ گیتی پہ ابھر جا

وہ پھوٹی کرن اس کی، مہتاب بشر سے
اب اے رخِ پژمردۂ آفاق نکھر جا

○

اے ستم زدہ! غم سے درگذر
رات جا چکی ہوگئی سحر

اہلِ ارض کی پیاس دور کر
اے سحابِ تر! عرش سے اُتر

○

زندگی نذرِ بتاں کیا معنی
آدمی اور فغاں کیا معنی

معنیٔ زیست ہیں خنداں رہنا
رات دن غم کا بیاں کیا معنی

○

حقدار کو حق دلانے والا انساں نیا ہے آنے والا
خوش باش حیات کے غموں سے عالم ہے نجات پانے والا

○

دم لینے کو منزل پہ ٹھہرنا بھی تو آئے مرنے کی طرح آپ کو مرنا بھی تو آئے
ملاح بھی ہے ناؤ بھی ہے دل بھی ہے لیکن بے کھٹکے ہمیں پار اترنا بھی تو آئے

اس لہجے سے وہ دبستانِ داغ سے کہیں اور پہنچے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، گاہ حالی کی آواز سنائی دینے لگتی ہے، گاہ یگانہ بولنے لگتا ہے اور جگر گنگنانے لگتا ہے، گاہ اقبال کا آہنگ پایا جانے لگتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لہجے میں کچھ آگے بڑھے ہیں۔ اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ پہلے لہجے نے ابھی تک دامن نہیں چھوڑا ہے یا اس سے یہ پورے طور پر دامن نہیں چھڑا سکے ہیں

اس سمت بھجن ہوتے ہیں اس سمت فغاں ہے
وہ تیری مناجات ہے یہ میری زباں ہے

○

بہت تم نے جفائیں کیں بہت ہم سے ستم اٹھے خبردار اے ستم گارو! نہ اب آگے قدم اٹھے

○

جلا دیتا ہوا گلزار ہستی کے نہالوں کو گزر جا اے دلِ خوددار تو مثلِ صبا تنہا،

یہ لہجہ بھی اسی زمانے میں پایا جاتا ہے اور اپنے رنگارنگ روپ دکھاتا ہے

چھٹتی ہیں گھٹائیں بھی چاند بھی نکھرتا ہے میرے سُونے آنگن میں کون پاؤں دھرتا ہے

○

تضحیک میرے غم کی ہو، میں سہہ نہیں سکتا اے نالہ! اجازت کہ میں چپ رہ نہیں سکتا

○

کشتۂ شوق سُناتا جا کہانی اپنی نسل آئندہ پہ تھوڑا سا کرم کرتا جا

○

شجر ہو، کوہ ہو، ہفت آسماں ہو پرِ پرواز کو سب آشیاں ہیں

یہ ملی جلی آوازوں کا لہجہ دوسرا لہجہ ہے۔ شاید تیسرے لہجے کا پیش خیمہ، اور وہ تیسرا لہجہ ان

دونوں لہجوں کا مرکب بھی ہے اور ایک نیا لہجہ بھی۔

"شاخ گل" تیسرا مجموعۂ کلام ہے، اس میں ۱۹۷۳ء تک کی غزلیں ہیں، کیوں کہ اس کا عرض حال ۱۸/ دسمبر ۱۹۷۳ء کی تحریر ہے، یہ مجموعہ چوبیس غزلوں کا حامل ہے۔ یہ غزلیں تقریباً ساڑھے چار برس کی مدت میں کہی ہوئی ہیں جب کہ اس سے پہلے کے مجموعے میں اس سے کم مدت میں کہی ہوئی غزلیں اٹھائیس ہیں۔ یعنی شاعری کی جانب رضا صاحب کا رجوع اور بھی کم ہوا اور تحقیق کی جانب زیادہ سے زیادہ مائل ہوتے چلے گئے۔

اس مجموعے کی شاعری سے متعلقہ روش کے بارے میں رضا صاحب لکھتے ہیں

"شاخِ گل" میں کوشش کی گئی ہے کہ زبان حتی الوسع بامحاورہ اور موضوع کے مطابق ہو، "فارسی امیز اردو اور ہلکی پھلکی ہندی نما اردو، دونوں اسالیب کو استعمال میں لایا گیا ہے۔

اور اپنے اجتہادی رجحان کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"متقارب ومتدارک کے مزاحف اوزان میں بعض جگہ ہندی اوزان کے پیش نظر مسلمہ اصول سے انحراف کو جائز رکھا گیا ہے ایک دو نظمیں روایتی بحر وزن کی ترتیب سے ہٹ کر بھی ہیں مگر ان میں رکن برقرار رکھے گئے ہیں میں جدید شاعری کا مخالف نہیں مگر اردو میں سپاٹ نثری نظموں کا قائل نہیں

موضوع کے مطابق زبان کا استعمال لہجے سے گہرا تعلق رکھتا ہے اس میں زبان کے کسی اسلوب کی (فارسی آمیز اردو یا ہلکی پھلکی ہندی نما اردو) شرط نہیں ہوتی، جدید شاعری کا مخالف نہ ہونا رضا صاحب کے صحت مند ذوق کا پتہ دیتا ہے، نثری نظموں کا قائل نہ ہونا دوسری بات ہے، یہ جدید شاعری کا مخالف نہ ہونا ہی ہے، جس نے ان کی غزل کے مؤخر دور میں غزل کے لہجے پر اثر ڈالا ہے اور ایک نیا انداز یا لہجہ نکالا ہے جو اظہار کے پہلو سے جدید شاعری کے بہت قریب جا پڑا ہے، لفظیات تو بیشتر مقامات پر اپنا روپ نکھارتی ہے لیکن کہیں کہیں روح بھی گنگنا اٹھتی ہے۔

یہاں غزل کے لہجے پر نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ کس حد تک یہ پہلا لہجہ ہے اور کس حد تک دوسرا لہجہ اور کس پہلو سے اور کس حد تک تیسرا لہجہ۔

خار ہے اصل گلستاں یہ خبر کس کو تھی
غنچہ ہے نالۂ خنداں یہ خبر کس کو تھی

موت ہی مانگتے آئے تھے کہ بے زار تھے ہم
زیست ہے یاس کا درماں یہ خبر کس کو تھی

○

چپکے سے دماغ میں در آئے
یادوں کے سفیر بن بلائے

کب تک دکھ کا دھواں سا
کب تک غم کے مہیب سائے

بہروپیو! روپ کی دہائی
تسکینِ نظر کو کوئی آئے

آنکھوں سے نکل گیا اندھیرا
تارے سے پلک پہ جگمگائے

پت جھڑ کو رہنما بنا کر
کلیوں نے عجیب گل کھلائے

○

بستیاں غریبوں کی بہہ گئیں تو ہنسنا کیا
سیلِ اشک کی زد میں آپ کا نگر بھی ہے

غم کی چار دیواری زندگی کے گرداگرد
آدمی کا زنداں بھی آدمی کا گھر بھی ہے

○

جس نے اک عہد کے ذہنوں کو جلا دی ہوگی
میرے آوارہ خیالات کی بجلی ہو گی

میری ناکامی حالات کے دھارے کے سوا
ایک ندی بھی تو بے آب نہ بہتی ہو گی

○

ہمارے در سے طلب گار اور کیا پائے
دہکتے ڈھیر سے مٹھی بھر آگ لے جائے

○

گھٹی گھٹی سی بجھی بجھی سے کرنوں والے
اے اندھیارے کے سورج! یہ کیسے اجالے

کانٹوں سے بچنے کا اے دل! ایک ہی رستا
رنگ برنگے پھولوں کی دیوار بنا لے

دھوپ کی ایک جھلک کو کتنے دن ترسیں گے
ہم بیچارے، دھول کے جھنپے، دھند کے پالے

کبھی تو وایو منڈل بھیگے دکھ بہہ جائیں
باڑھ پر آئے دریا، برسیں سکھ کے جھالے

○

جنگل میں مزا نہ شہر میں لطف
یہ کون پڑا ہے جی کے پیچھے

○

کوئی نچوڑ کے گیسو چمن کی پیاس بجھائے
زمانہ ہو گیا کلیوں کو مسکرائے ہوئے

پھر جمع ہیں بکھری آرزوئیں — پھر دل کا چراغ جل اٹھا ہے
اُف رے یہ ابال سوزِ دل کا — ہر اشک دھواں اگل رہا ہے

○

دو دن کو گلشن پہ بہار آنے کو ہو گی — پنچھی دل میں راگ سدا کے گاتے ہوں گے
پھولوں سے بھی رُت کا روپ نکھرتا ہو گا — کانٹے بھی موسم کا ہاتھ بٹاتے ہوں گے

○

ہوا کی سسکیاں دیں گی گواہی — گزرنے کے نشاں دیکھو نہ دیکھو

غزل میں گیت کا لہجہ میر تقی میر کے لہجے کے خاندان سے ہے، غالباً اسی لیے میر کا لہجہ نہیں اپنایا جاسکا۔ کہ ان کے لہجے میں اور گیت کے لہجے میں جو فرق ہے اسے نہ پہچانا گیا اور نہ اس کی روح کو رگ رگ میں اتارا گیا۔ یا تو گیت کا لہجہ اختیار کیا گیا۔ یا میرؔ کے لہجے کا بہروپ بنایا گیا، روپ تو میرؔ کا دل اور میرؔ کی زندگی چاہتا ہے، اور یہ مشکل ہی ہے شاید یہ دین صرف خدا ہی کے بس میں ہے رضا کے یہاں گیت کا لہجہ پایا جاتا ہے، انھوں نے کچھ گیت بھی کہے ہیں جو ہر ایک مجموعے میں شامل ہیں اور بہت اچھے ہیں مگر اس لہجے کو غزل کے لہجے کے خاندان کا فرد بنانا سب کے بس کا نہیں، رضا کے یہاں یہ گیت کا لہجہ جگنو کی جگمگاہٹ کے انداز میں یہاں وہاں کوندکوند جاتا ہے۔ اسی کو انھوں نے "ہلکی پھلکی ہندی نما اردو" کا اسلوب کہا ہے۔

پل پل مالا پھیرو نہ بکھیرو — لیکن پگ پگ پیار بکھیرو
پھوٹ رہا ہے من سے اُجالا — دور ہٹو جیون کے اندھیرو

○

یہ رنگ روپ تو ذہن و نظر کی لذّت ہے — نقوش ڈھاتے چلو دائرے مٹاتے چلو

○

کیوں نہ چلیں سب مجھ سے بچ کر — پتھر سا رستے میں گڑا ہوں

○

یہ آج کے انسان، الٰہی توبہ — چہروں کے چمن زار، دلوں کے جنگل

○

تارے بھی چھپے چاند بھی ڈھلا — جب کہیں ہوا پھول کا جنم

وقت سرگراں، زندگی خفا — ہونٹ ہونٹ خشک آنکھ آنکھ نم
اپنے وقت پر کھلتے ہیں سبھی — تارے وقت شب، پھول صبحدم

○

کوئی ہنگامہ نظر آئے تو قرباں ہو جاؤں — کب سے کاندھوں پہ لیئے پھرتا ہوں ہستی کی صلیب

○

جدھر خود گیا تھا لگا لے گیا — نہ جانے کدھر راستہ لے گیا
ترا غم طلوعِ سحر سے حسیں — مجھے کیسا مجھ سے چھڑا لے گیا

○

ہم تو ل بیٹھے صبحدم انساں کو سلئے سے — سورج کے سر پہ آتے ہی سایہ سمٹ گیا
کیا جانے کس چٹان سے ٹکرا گیا ہے دل — چلتا ہوا سفینہ اچانک الٹ گیا
اب کوئی ڈھونڈ ڈھانڈ کے لاؤ نیا وجود — انسان، تو بلندیٔ انساں سے گھٹ گیا
منزل پہ گردِ وہم و گماں تھی وہ ڈھل گئی — رستے میں عقل و ہوش کا پتھر تھا ہٹ گیا

○

دنیا کے مصیبت خانے میں تقدیر نے جنت سے لاکر — صحرا میں کھلے اک گل کی طرح انسان کو تنہا چھوڑ دیا

یہ رضا کی غزل کے لہجے تھے ۱۹۷۳ء تک۔ جس کا سلسلہ شروع ہوا روایت سے اس روایت سے جو جوش اسکول سے میل کھاتا تھا، راستے میں کئی مرحلوں سے گذرتا ہوا آیا، جدید لفظیات کے لہجے تک، اور تھا ابھی تشکیل پذیری (IN MAKING) میں کہ رضا اور کہیں دل لگا بیٹھے، اب جو رہ رہ کر ہوک اٹھتی ہے تو وہی جدید لفظیات کا لہجہ دامن تھام لیتا ہے، اور کہیں کہیں موقع پاکر دوسرے لہجے بھی در آتے ہیں جو کبھی ان کے ساتھی رہے تھے، یہی لہجہ "سہیل" (گیا) کی غزلوں میں رونما ہوا ہے، جو یقیناً بہت خوش آب اور خوش آئند ہے مگر اس کا کیا کیجئے کہ اس لہجے کا باغباں اب دوسری روشوں میں جا پڑا، پھر بھی رضا کے ہر لہجہ میں رہتی ہے "دل کی رام کہانی" ہی۔ یعنی انفرادی اور نجی کیفیت و احساسات کی ترجمان، اگرچہ ان کے یہاں زندگی کی اجتماعی اور انسانی قدروں کی جھلک بکثرت موجود ہے۔

رضا غزل گو نہیں، ناظم نہیں، وہ شاعر ہیں، غزل کے بھی شاعر اور نظم کے بھی شاعر اور ایک اچھے شاعر۔

کرشن کمار کول حال نیروبی

مشرقی افریقہ کا ایک گمنام شاعر

(مورخہ ۵ مئی ۱۹۶۷ء)

۱۹۵۸ کے آخر یا ۱۹۵۹ کے شروع کی بات ہے کہ رسالہ "آج کل" میں ایک دلچسپ مگر لطف شعر و شاعری سے بھرپور مضمون "سعود بن سعد العیری سواحلی زبان کا ایک مشہور شاعر" کے عنوان سے میری نظروں سے گذرا۔ چوں کہ سواحلی زبان کی نظموں کا ترجمہ نہایت صاف۔ رواں اور سلیس اردو میں کیا گیا تھا اس لیے مصنف کا نام بھی میں نے بڑے اشتیاق سے پڑھا اور اسی لیے وہ ذہن میں محفوظ بھی ہو گیا۔ میں اس وقت ہندوستانی سفارت خانے کے ساتھ سنگاپور میں مقیم تھا۔ اتفاقاً ۱۹۶۵ء میں میرا تبادلہ بحیثیت پریس اٹیچی ہندوستانی سفارت خانہ کینیا نیروبی میں ہو گیا یہاں ہندوستانی کافی تعداد میں بستے ہیں اور مقامی ریڈیو پر ہندوستانی پروگرام بھی براڈکاسٹ ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہاں ہر ماہ اردو مشاعرہ بھی نشر کیا جاتا ہے۔ جس میں مقامی شعراء اپنی استعداد کے مطابق حصہ لیتے ہیں۔ میں چوں کہ شاعری کا دلدادہ ہوں اس لیے آنے والے ماہانہ مشاعرے کا منتظر رہا۔ مقررہ تاریخ اور وقت پر مشاعرہ شروع ہوا اور میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب میں نے سنا کہ "مشاعرے کے صدر جناب کالیداس گپتا رضا" ہیں اور فوراً میری سمجھ میں آگیا کہ سعود بن سعد العیری" پر مضمون لکھنے والے یہی صاحب ہیں جنھوں نے سات برس پہلے میرے ذہن کو چونکایا تھا۔ مشاعرہ طرحی تھا اور مصرعِ طرح تھا "اثر رہا ہی نہیں اب مری دعاؤں میں"۔ سات آٹھ شعراء نے حصہ لیا تھا۔ آخر میں رضا صاحب نے اپنا کلام سنایا۔ زبانی یادداشت سے آپ کے تفننِ طبع کے لیے چند اشعار درج ذیل کرتا ہوں۔ صحت زبان و فن اور پاکیزگی و شیرینی کلام آپ پر بخوبی واضح ہو جائیں گے۔

خدا کا نام لیا پار ہوگئی کشتی — شمار ہونے لگے ہم بھی ناخداؤں میں

زمانہ حسن، نزاکت، بلا، جفا، شوخی — سمٹ کر آ گئے سب آپکی اداؤں میں

قیامت اور بھی ظالم نے توڑ دی مجھ پر — مری وفاؤں سے زور آگیا جفاؤں میں

تری نگاہِ کرم نے ہمیں یہ عزت دی — ہمارے نام کی پوجا ہوئی گداؤں میں

غزل سے پہلے رضا صاحب نے چند رُباعیاں بھی پیش کی تھیں ان میں سے دو یہاں درج کی جاتی ہیں۔ دیکھیے دونوں رُباعیاں پختہ رُباعی گو کی کہی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ چوتھا مصرعہ جو رباعی کی جان ہوتا ہے باقی تین مصرعوں کے ساتھ کس قدر مربوط ہے۔

زردار کو ہاتھ زر سے دھونا ہوگا
خود ساختہ اعتبار کھونا ہوگا
بکرے کی ماں منائے گی کب تک خیر
اِک دن تو اُسے حلال ہونا ہوگا

قانون کو سیم و زر سے تُلتے دیکھا
اکثر بھرم انصاف کا کھُلتے دیکھا
اُڑتی ہے جو خاک عدل کے رستوں میں
منصف کو اسی خاک میں رُلتے دیکھا

اگر میں یہ مشاعرہ اپنے کانوں سے نہ سن رہا ہوتا تو کسی حالت میں بھی یقین نہ کر سکتا کہ چالیس سال سے بھی کم عمر کا یہ ہندو شاعر جس نے مقابلتاً اس چھوٹی عمر کے تقریباً بیس سال ہندوستان سے باہر کینیا مشرقی افریقہ کے صدر مقام نیروبی ہی میں گذارے ہوں۔ صحیح اور صاف اردو میں اس قدر اچھے شعر کہہ سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے رضا صاحب سے نیاز حاصل کرنے کا تہیہ کر لیا اور اگلے ماہانہ ریڈیائی مشاعرے پر ان سے ملاقات ہوئی۔ نہایت خلیق، ملنسار اور اصول و وضع کا پابند پایا۔ اگرچہ مطالعہ کافی ہے مگر ان میں ہر طرح علم و ادب کی جستجو کا جذبہ کار فرما پایا۔ گھر میں اچھی خاصی لائبریری ہے۔ جس میں لگ بھگ دو ہزار کتب جمع ہیں مگر پچانوے فی صدی انگریزی ہیں۔

رفتہ رفتہ مراسم اس قدر بڑھے کہ ان کے ہاں آنا جانا بھی شروع ہو گیا اور ایک دن باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ آپ کا شعر و شاعری کا شوق فطری ہے اور اسے موجودہ معیار تک پہنچانے

یں دو استادوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ پہلے جناب ،کمال کرتار پوری کا جو حضرت جوش ملسیانی کے فارغ الاصلاح اور صفِ اوّل کے شاگردوں میں ہیں اور بجائے خود استاد تسلیم کیے جاتے ہیں اور بعد ازاں خود حکمرانِ فن وسخن ابو الفصاحت قبلہ جوشؔ ملسیانی — تلمیذ رشید فصیح الملک حضرت داغؔ دہلوی کا۔ دونوں اساتذہ کے تین سو سے زائد خطوط اصلاحِ فن وسخن سے متعلق رضاؔ صاحب کے نام ہیں نے خود دیکھے جن کو رضاؔ صاحب جان کی طرح عزیز رکھتے ہیں اور اس وقت کے منتظر ہیں جب کہ ان کو کتابی صورت میں شائع کیا جا سکے گا۔ مجھ پر اب کہیں جا کر کھلا کہ رضاؔ صاحب کا کلام، نئے نئے خیالات اور نادر مضامین کے علاوہ فنِ سخن پر کیوں کر پورا اترتا ہے۔
آپ ایسی شاعری کو پسند نہیں کرتے جو صرف عجزِ طبیعت کی وجہ سے بحر و قافیہ اور دیگر شرائطِ شعر گوئی سے آزاد کر دی گئی ہو۔ آپ ردیف و قافیہ کی دلکش قید کو بشرطیکہ اس کو نبھایا جا سکے، اردو شاعری کا ایسا سرمایہ سمجھتے ہیں جسے اساتذۂ قدیم و جدید نے بڑی محنت سے اکٹھا کیا ہے۔ چنانچہ ایک رباعی میں فرماتے ہیں ؎

برسوں سے رواں دواں ہو جس رستے پر
جس راہ میں لٹ گئے ہوں عزت، گھر، زر
چھوڑو نہ اسے شاعرو۔ یہ ٹھیک نہیں
بوڑھے کو نئی پگڑی سجے گی کیوں کر

اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ رجعت پسند محض ہیں۔ آپ پاکیزہ، مضامین و خیالات اور صفائی زبان و بیان کے قائل ہیں اور نہیں چاہتے کہ شعر گوئی اور نثر نگاری میں کوئی فرق روا نہ رکھا جائے۔ آپ کی شاعری میں روایتی رنگ بہت کم ہے اگرچہ ہر حال میں کوشش یہی کی گئی ہے کہ صحتِ زبان، بحور و اوزان، قافیہ و ردیف اور دوسرے محاسن و معائبِ شعری کا جہاں تک ممکن ہو سکے خیال رکھا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ نفسِ مضمون کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ جیسے کہ "باغ و راغ" میں ؎

اِدھر گلاب کے پھولوں پہ گیت بھونرے کے — اُدھر ہیں ٹوٹے ہوئے سازِ زندگی کے تار
اِدھر جو قطرہ گرا گر کے بن گیا موتی — اُدھر جو ابر اُٹھا وہ برس گیا بے کار
اِدھر ہے ابرِ بہاری چمن کا رکھوالا — اُدھر سموم ریاست کی مالک و مختار

"پرستشِ ناتمام" میں ؎

اگر نہیں حسن کوئی طاقت تو عشق پر کون شے ہے غالب
اگر ہے تیرِ نظر خیالی تو یہ کلیجے کے پار کیوں ہے
پہونچ کے منزل پہ موت دیکھی تو دل نے پھر یہ سوال پوچھا
کہ تیری سب کوششوں میں حائل یہ ہستیٔ مستعار کیوں ہے
یہ باتیں سُن کر کہا رضا نے یہ "کیوں" کا قصہ نہ چھیڑ غافل
جواب اس کا وہ دے سکے گا جو لے کے آیا ہے ذوقِ کامل

"راہِ عدم کے راہی" میں ؎

ہستی کیا ہے موت کا سایہ اس کے نیچے ستائیں ہم
موت ہے کیا ہستی کا سمندر غوطہ لگائیں کھو جائیں ہم
باہر نکلیں موت کا سایہ غوطہ لگائیں تو روپوش

راہِ عدم کے ہم راہی ہیں ہم میں ہے چلنے کا جوش
کیوں نہ چلیں ہم کیوں نہ بڑھیں ہم شانہ بشانہ دوش بدوش

رضا صاحب بڑے فارغ البال، سخی اور غریبوں پر ترس کھانے والے انسان ہیں۔ اتنے بڑے کاروبار کے باوجود ان کی پوشاک کی شان و شوکت صرف دفتر تک ہی محدود رہتی ہے۔ اور گھر پلٹتے ہی آپ اسی سادگی کی تصویر بن جاتے ہیں جو ان کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ ان کے شراب سے متعلق اشعار صرف ان کے شاعرانہ تاثرات کو ہی ظاہر کرتے ہیں ورنہ آپ نے کبھی "اس نسرد بے پناہ" کو چکھا تک نہیں۔ امیر ہونے کے باوجود (کنجوسی کی نہیں) انکسار اور سادگی کی زندگی گذارنا پسند کرتے ہیں۔ یہ اشعار اسی اصول کے آئینہ دار ہیں ؎

زر اگر پاس بھی ہے چین کہاں ملتا ہے — غنچۂ دل تو فقط صبر ہی سے کھلتا ہے
کبر زر میری نظر میں بار پا سکتا نہیں — حسن بن کر بھی مرے دل کو لبھا سکتا نہیں

شان و شوکت سے قطع نظر ہم نے دیکھا اک خاک بسر
جو بانکپن اس نے پایا تھا وہ سرو سمن میں کیا ہوگا
ہزار دیکھے حسینِ دوراں جمیل، طناز، حشر ساماں
مگر جو ہے سادگی میں پنہاں کسی میں وہ بانکپن نہ پایا

رضا صاحب اب پچھلے چھ سات سال سے اصلاح نہیں لیتے یہ نہیں کہ وہ خود کو فارغ الاصلاح یا استاد خیال کرنے لگے ہیں بلکہ ان کی کاروباری مصروفیات اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ وہ شعر و شاعری کے لیے وقت ہی نہیں نکال سکتے۔ یوں بھی ڈاک کے ذریعے دور دراز ملک سے اصلاح لینا اور دینا کارے دارد۔ وہ اساتذہ اور اسلاف کی قدر کرنے والے ہیں اور استاد سے مزید مشورہ نہ کر سکنے کا انھیں احساس ہے۔ کہا ہے ؎

پوچھتا ہے کیا دلِ ناشاد سے
کام نکلے گا نہ کچھ فریاد سے
اے رضا جو ہے سخن دانی کا شو
دور کیوں ہے خدمت استاد سے

اور پھر مجبوراً اپنے دِل کو یوں تسلّی دیتے ہیں ؎

گو ہزاروں کوس کا ہے فاصلا
قرب حاصل ہے مجھے استاد کا
دِل کو دِل سے راہ ہوتی رضاؔ
دور ہیں استاد تو بھی کیا ہوا

ظاہر ہے کہ باوجود طویل "جلا وطنی" کے آپ کا موجودہ معیارِ سخن صرف استاد کی کچھ برسوں کی شاگردی کا نتیجہ نہیں ہو سکتا اور وہ بھی جب کہ اصلاح کا تمام کام خط و کتابت کے ذریعے ہوتا رہا ہو۔ یہ صلاحیت یقینی طور پر وہبی ہے۔

آپ فطرتاً تنہائی پسند ہیں اور ہزاروں مواقع میسر ہونے کے باوجود نام و نمود کی بالکل خواہش نہیں رکھتے۔ آج سے کوئی سوا سال پہلے آپ نے مجھے، عزیز دوست کی طرح، ایک طویل خط میں اپنے متعلق یوں لکھا تھا۔

"..... میں نے جب اپنی اسکول کی زندگی کے پانچویں سال میں قدم رکھا تھا تو دو شعر خود بخود میری زبان پر آ گئے تھے یہی میری شاعری کا آغاز تھا۔ پنجاب کے جس گاؤں (مکندپور ضلع جالندھر۔ حضرت جوشؔ ملسیانی کے سسرال بھی یہیں ہیں) میں میں پل کر جوان ہوا۔ اُس کا ماحول اس قدر غیر شاعرانہ تھا کہ وہاں ایک دو کے سوا آج تک بھی کوئی نہیں جانتا کہ میں شعر بھی کہتا ہوں اور جب میں نے اپنی عمر کے سولہویں سال میں گاؤں کے ایک بڑے جلسے میں صدرِ جلسہ کے اعزاز میں ایک قصیدہ سا پڑھا تھا تو لوگوں نے مجھے اس بنا پر شاباشی دی تھی کہ میں نے کسی شاعر کے دیوان سے صدرِ جلسہ کے لیے ایک اچھی نظم کا انتخاب کیا ہے۔ اس بات سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکیں گے کہ میری مشقِ سخن کا زمانہ صرف میرے اور میرے استاد کے درمیان کی گئی خط و کتابت ہی میں بند ہے..... چھ سال کی مشقِ سخن کے بعد میں نے موسیقی

سیکھنی شروع کی۔ تاروں کی جھنکار اور طبلے کی تھاپ نے میرا ذوقِ موسیقی لوگوں تک پہنچایا اور وہ مجھے ستار نواز کی حیثیت سے جاننے لگے مگر انھوں نے یہ کبھی نہ جانا کہ سنگیت کی لہریں تو اس چاند کی محض چند کرنیں ہیں جو میری قسمت کی تاریک رات میں چمک رہا ہے۔ اور جسے میں شاعری کے نام سے تعبیر کرتا ہوں۔ میری بندھی گھٹی روح تقریباً اٹھارہ سال گاؤں کی سادہ لوحی میں قید رہ کر آزاد ہوئی۔ مگر یہ آزادی قید سے بھی بدتر ثابت ہوئی۔ کیونکہ یکایک مجھے افریقہ کے جنگلوں میں آب و دانہ کی جستجو میں جانا پڑا۔ ابتدائی عمر کے یہ اٹھارہ سال زیادہ تر کھیل کود، تعلیم، شعر و شاعری اور سنگیت میں گزرے۔ سب سے زیادہ مجھ پر شاعری اثر انداز ہوئی اور لوگ سب سے کم میرے اس پہلو سے روشناس ہوئے۔

اِس دن رات کے ضبط نے مجھے خاموش تو نہیں لوگوں سے خائف ضرور بنا دیا۔ اس قدر خائف کہ اب ایسے آدمی کے سامنے جو میرے آمد سے مانوس نہیں ہے چند منٹ کی حاضری بھی میرے لیے ایک مشکل ہے۔ مجھ سے بہت دیر حاضر نہیں رہا جاتا ہے اور مجھے فوراً تنہائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ مجھے تنہا ہو کر وہ سکون۔ اطمینان اور راحت میسر آجاتے ہیں جس کی مجھے اور میرے پسندیدہ شوق کو ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ شعر و شاعری کی لگن مجھے دنیاوی زندگی کی قید سے ایک دن بے موت آزاد کرا دے گی۔ میں نے یہ شعر غالباً اپنے ہی لیے کہا ہے ؎

موت کا بھی نہ اٹھانا پڑا احساں سر پر
قیدِ ہستی سے مجھے عشق نے آزاد کیا،،

ڈانتے نے یہ شعر ہی نہیں کہے بلکہ نگینے پیش کیے ہیں ؎

"Who never ate his bread in sorrow,
Who never spent the midnight hours,
Weeping and waiting for the morrow,
He knows you not, ye heavenly powers."

یعنی جس نے غم و الم کے دن نہیں گزارے اور جو کل کے انتظار میں نالۂ نیم شبی سے بے خبر ہے اُس نے خدا اور اُس کی طاقت کو نہیں پہچانا۔ آدسکر وائلڈ نے بھی ایک جگہ کہا ہے کہ بغیر غم زدہ ہوئے انسان معراج کو نہیں پا سکتا۔ خود کو نہیں پا سکتا اور خدا کو بھی نہیں پا سکتا۔ جب تک انسان ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونا نہیں سیکھتا وہ انسانیت کی بہترین

قدروں سے ناواقف رہتا ہے۔ غرض یہ کہ یورپی مفکر کو بھی حزن ویاس کے ساتھ ساتھ انسانی ہمدردی سے بہتر کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی اور ایشیائی مفکر بھی انسان کی عاجزی اور مجبوری پر ہزاروں سال سے آنسو بہا رہا ہے۔ محض اس لیے کہ یہ احساس فطری ہے اور انسانیت کا سب سے بڑا جوہر ہے۔ رضا صاحب میں یہ جوہر کوٹ کوٹ کر بھرا ہے اور ان کی غزلوں نظموں وغیرہ میں جا بجا اور نمایاں طور پر اس کی جھلک ملتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

پرایوں کا گلہ کیا اب تو اپنے بھی پرائے ہیں
مری ہستی بھی مجھ سے بدگماں معلوم ہوتی ہے

آنکھوں میں شرافت بھی رقصاں منہ سے ہمدردانہ بھی
فریاد یہ بے کس کی لیکن ہر کان کو بہرا دیکھا ہے

دلِ حزیں سے دھواں غم کا اور اٹھنے دے
انھیں گھٹاؤں سے دریا بہائے جاتے ہیں

وقت پڑنے پر بنے گا یار کون
غم زدوں کا ہے یہاں غمخوار کون

روتے روتے تھک گئے رک رک کے دم آنے لگا
ہچکیوں نے آکے ٹکڑے کر دیے فریاد کے

مجھ سے قیمت نہ مانگ اے ساقی
تنگدستی کی انتہا ہوں میں

وہ کلی ابھی تھی جو ادھ کھلی تجھے علم ہے اسے کیا ہوا
وہ چمن میں خستہ پڑی ملی اسے دستِ شوق مسل گیا

جو آرزو کبھی اٹھی اسی میں دفن ہوئی
ہم اپنے دل میں ہزاروں مزار رکھتے ہیں

حسرت۔ رنج۔ مصیبت۔ آفت سب کو بساتا ہوں دل میں
دل رکھنا بھی فرض ہے میرا گھر آئے مہمانوں کا

ترے نام پر جو فدا ہوا تری راہ میں جو فنا ہوا
یہ غبارِ غم سے اٹا ہوا اسی راہ رَو کا مزار ہے

ہر ایک اشک نے پلکوں پہ آکے یہ جانا
گہر بھی خاک میں اکثر ملائے جاتے ہیں

بہت شل ہو گئے طولِ سفر میں دست وپا اپنے
کہاں تک ساتھ دیں گے ہم ترا اے دکھ بھری دنیا

زوالِ شاہاں پہ رو لیا ہے غنی کا ماتم بھی ہو لیا ہے
کچھ اشک اس پر بھی چشمِ گریاں بدن نے جس کے کفن نہ پایا

رنگ و بو کو ہوا ہی ہونا تھا | باغباں تیری یاد ہو بے کار
سبزۂ پائمال کہتا ہے | باغ میں خواہشِ نمو بے کار

کیا داغِ دلِ زار دکھاتے ہو مجھے تم | یہ شمع مری بزم میں ہر رات جلی ہے
جب رونے پہ مجبور کریگا غمِ دنیا | ہم دامنِ محبوب سے رولیں گے لپٹ کر
وہاں کانٹے بے شک مسرت سے ہونگے | گلستاں میں پھولوں کو راحت نہ ہوگی

ناکام محبت کے آنسو ہوتے ہیں نہایت پاکیزہ
جو پانی اِن آنکھوں سے بہا وہ گنگ و جمن میں کیا ہوگا

لہو صحرا نشینوں کا نہیں اعجاز سے خالی
جہاں دو بوند پہ جائے وہیں گلزار ہو جائے

مگر اِن مثالوں سے یہ سمجھ لینا درست نہ ہوگا کہ رضا صاحب کا بیشتر کلام حزن و یاس اور قنوطیت ہی کا حامل ہے۔ آپ کے کلام میں ہمت و بلند حوصلگی اور عزم و استقلال کے بھی اعلیٰ نمونے ملتے ہیں اور وہ حزن و یاس کے پہلو بہ پہلو پائے جاتے ہیں۔ جس سے کلام کا لطف دو چند ہو گیا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

اے مسافر جی نہ چھوڑ اپنے ارادے سے نہ ٹل
دل اگر منزل میں ہے تو ہر قدم منزل میں ہے
آنے والے دور میں امید خوشیوں کی بجا
عزمِ راسخ ہے تو سب کچھ اپنے مستقبل میں ہے
لے ہی آئے گی تمہاری یاد سطحِ آب پر
ڈوب جائیں گے اگر دریائے بے ساحل میں ہم
قضا کو دیکھ کے ہم مسکرائے جاتے ہیں
ہوائے تند میں شمعیں جلائے جاتے ہیں
فغاں سے ہاتھ اٹھا زندگی کو تلخ نہ کر
وہ راگ چھیڑ جو مستی میں گائے جاتے ہیں

گردشِ افلاک ہم کو پیس سکتی ہے اگر
اہلِ ہمت کے لیے ایسی سزا کچھ بھی نہیں
لہو کے چھینٹوں سے رنگ اور بھی نکھرتا ہے
وہ نقش ہوں جسے صدمے مٹا نہیں سکتے

عمر کی کشتی بہی جاتی ہے اپنی موج میں
کوئی اندیشہ اسے ساحل پہ لا سکتا نہیں
اِک ذرا سے درد کا چارہ کریں سو سو طرح
اس قدر بن کر رہیں کیوں ہم غلامِ زندگی
موت پر سمجھو کہ پائی فتح اس انسان نے
جس نے سمجھا موت کو قائم مقامِ زندگی

حسن والوں کی خوشامد کیا ضرور
آپ اپنے عشق کو کامل کریں
اپنے ماضی پر بھروسا آبہ کے
آؤ ہم کچھ فکرِ مستقبل کریں
عاشقوں کا کمال ہے جینا
اور مرنا کوئی کمال نہیں

کہکشاں چاند ستارے ہیں مرے نقشِ قدم
کون کہتا ہے فلک تک مری پرواز نہیں
عالمِ قدس کو کیوں منزلِ آخر سمجھوں
اس قدر پست مری ہمت پرواز نہیں
کیوں دل کی کلی ایک زمانے سے ہے لب بند
گرنا ہو تو گر جائے ٹپکنا ہو تو ٹپکے

ڈر نہ جائیں گے کوئی اہلِ وفا
آندھیاں اٹھا کریں اِدبار کی
زمانا اگر مجھ کو تنہا بھی کر دے
مجھے زندگانی سے وحشت نہ ہوگی

ہم وہ نہیں جو بھاگ کے ساحل کی لیں پناہ
موجوں کے ساتھ ساتھ لڑیں گے بھنور سے ہم
ایسی بد حالی کا جینا کچھ نہیں
دوسری صورت نکالی جائے گی

آپ کے بعض شعر اس قدر نازک برجستہ اور عمدہ ہیں اور زبان و فن کے اعتبار سے اتنے استوار ہیں کہ آپ پر بے اختیار اہلِ زبان میں سے ہونے کا گمان ہوتا ہے واقعی وہ جوہر جو قبلہ جوش ملسیانی اور ان کے حلقہ داروں کا طرۂ امتیاز ہے۔ رضا صاحب میں بھی بڑی حد تک موجود

اور وہ اس دور دراز ملک میں جہاں لوگ اردو زبان سے تقریباً بے بہرہ ہیں اور جہاں کوئی استاد تو کیا خود رضاؔ صاحب کے مقابلے کا بھی کوئی شاعر موجود نہیں اردو شعر و شاعری کی مشعل اس طرح روشن کیے ہوئے ہیں کہ اسے بادِ مخالف کا کوئی جھونکا بجھا تو کیا خوف زدہ بھی نہیں کر سکتا۔ اشعار تعقیدِ لفظی سے قطعی اور تعقید معنوی سے اکثر و بیشتر پاک ہیں۔ مضامین کی کمی نہیں۔ فارسی بقدرِ ضرورت ہی استعمال کرتے ہیں۔

اب کچھ اور اشعار پیش کرتا ہوں جس سے رضاؔ صاحب کے کلام میں مزید رجحانات کا اندازہ لگایا جا سکے اور میری اوپر کہی گئی بات کی بھی تصدیق ہو سکے مگر انھیں ہرگز ہرگز رضاؔ صاحب کے کلام کا انتخاب نہ سمجھا جائے کیوں کہ ایسا کرنا ذخیرۂ کلام سے سراسر بے انصافی ہوگی جو ان کے دفتر اور گھر میں جگہ جگہ بکھرا پڑا ہے ؎

بزمِ عشرت میں بھی تھا میں بیقرار — بیٹھے بیٹھے کوئی یاد آتا رہا

طوفان کو ساحل کی خموشی پہ رشک — ساحل کی تمنا کہ وہ طوفاں ہوتا

گلزار محبت میں بصد ناز پلی ہے — یوں اس کو نہ مسلو یہ میرے دل کی کلی ہے

پھر پھر کے مرے پاؤں یہیں لاتے ہیں مجھ کو — شاید انھیں معلوم ہے یہ تیری گلی ہے

صبحدم پھول چننے جاتے تھے — کوئی کانٹا بھی چبھا تو ہوگا

مجھ سے مخلص کو غیر کیوں سمجھے — اس کو پیتل کہا جو سونا تھا

ہار کر بھی جیتتے ہیں خوش نصیب — غم زدوں کی جیت میں بھی ہار ہے

ہوتی رہی اُدھر مری بے ہوشیوں کی بات
اور اِس طرف میں ہوش میں آ آ کے پی گیا

دوزخ۔ بہشت، موت، حیات، اہل شرع و پند
میکش نظامِ دہر سے گھبرا کے پی گیا

میری نگاہِ شوق سے پا کر وقارِ حُسن
تم مجھ سے روٹھ جاؤ گے ایسا گماں نہ تھا

خیالِ دوست میں کھویا گیا تھا — حضورِ دوست میں پایا گیا ہوں

حیات و موت سے ہوں خوب واقف — بہت اس راہ سے آیا گیا ہوں

اِک نہ اِک موج اکھاڑ پھینکے گی — ہے درختِ کنارِ جو بے کار

ضبط دِل کے بغیر اے واعظ
صوم بے فائدہ وضو بے کار

میں صدقے ترے اے سرشک ندامت
تو موتی کا موتی ہے پانی کا پانی

اسی لیے ہونٹ پی لیے آنسو
ضبطِ اُلفت کے پاس نے مارا

آنسوؤں سے بھی یہ نہیں بجھتی
مجھ کو آنکھوں کی پیاس نے مارا

بیٹھے بٹھائے آج یہ کس کے خیال نے
میرے سکونِ قلب کو برباد کر دیا

گنہ کی لذتیں برباد کر دیں گی مرے دل کو
گنوا دے گا یہ شیشہ آب و تاب آہستہ آہستہ

شکر کرتا ہوں کہ ناشاد کو دل شاد کیا
بھول کر بھولنے والے نے مجھے یاد کیا

بڑے خلوص سے اس کو قبول کرتا تھا
مرا سلام غرضمند کا سلام نہیں

ان کی نظریں تو ان کی نظریں ہیں
اپنی نظروں سے گر گیا ہوں میں

آپ جو کچھ مجھے سمجھتے ہیں
اس حقیقت کو جانتا ہوں میں

اِک ناز و ادا کی موج سی تھی دم بھر کو اٹھی پھر بیٹھ گئی
تم جس کو جوانی کہتے ہو ہم نے وہ زمانا دیکھا ہے

روزِ محشر سے کم نہیں ہوتیں
چار گھڑیاں تری جدائی کی

اُوپر کے اشعار غزلوں سے ہیں چوں کہ آپ نے بہت سی نعتیں اور سلام بھی کہے ہیں! اس لیے میں غزلیات کا باب اس وقت تک مکمل نہیں سمجھتا جب تک کہ ایک نعتیہ غزل کے دو تین اشعار بھی شامل مضمون نہ کر لوں۔ دیکھیے کیا عمدہ شعر کہے ہیں ؎

اسوۂ شاہِ رُسلؐ کا جو ہوا دیوانہ
اس نے تعمیرِ طریقت کی اٹھائی اچھی

جام و مینا سے نہیں ہم کو سروکار مگر
آپ کے نام پہ آ جائے تو مستی اچھی

دین اسلام ہوا اور محمدؐ ہادی
وحی یہ اتری کہ دونوں میں نبھےگی اچھی

رضا صاحب کی فکرِ رسا نظموں میں بھی عاجز و مجبور نہیں۔ ہندی اور اردو کے امتزاج سے جو بے عطف و اضافت نظمیں انھوں نے کہی ہیں بڑی خوب صورت ہیں۔ رباعیاں اور قطعے

بھی کافی تعداد میں موجود ہیں۔ آپ کا انگریزی ادب کا مطالعہ بھی کافی وسیع ہے اور آپ نے چند انگریزی نظموں کو بھی اردو نظم کا جامہ پہنایا ہے جو نہایت پاکیزہ ہے۔ گیت بھی کہے ہیں اور سب کے سب اردو عروض اور قوافی کے مطابق ہیں۔ طوالتِ تحریر کے خوف سے مزید بحث کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔

میں نے رضا صاحب سے درخواست کی ہے کہ وہ اپنے کلام کو جو اِدھر اُدھر بکھرا پڑا ہے اور میرے خیال میں بہت عمدہ ہے اکٹھا کر کے مجموعے کی شکل میں شائع کرا دیں۔ وہ اس درخواست پر غور کر رہے ہیں بلکہ بشرطِ فرصت اس کام کو شروع کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ اگر یہ مجموعہ شائع ہو گیا تو مجھے یقین ہے کہ اس جلا وطن شاعر کے کلام کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ خصوصاً جب کہ وہ اردو کے وطنِ عزیز سے ہزاروں میلوں کے فاصلے پر ہے اور اس سرزمین پر رہتا ہے جہاں اردو نہ بولی جاتی ہے اور نہ پڑھی اور لکھی جاتی ہے۔ جہاں اردو کا کوئی رسالہ یا اخبار شائع نہیں ہوتا۔ صرف چند ایک اردو کے متوالے ہیں یا پھر ہیں ہمارے جواں سال، جواں فکر اردو کے شیدائی خاکپائے اساتذہ کالیداس گپتا رضاؔ صاحب۔

محمد لطیف نیروبی

مشرقی افریقہ کا ایک مشّاق شاعر

(ماہنامہ شاعر بمبئی دسمبر ۱۹۶۸ء)

رنج نے غم نے یاس نے مارا — اُن سے ملنے کی آس نے مارا
اس سے دیوانگی ہی بہتر تھی — ہم کو ہوش و حواس نے مارا
سی لیے ہونٹ پی لیے آنسو — ضبطِ اُلفت کے پاس نے مارا
آنسوؤں سے بھی یہ نہیں بجھتی — ہم کو آنکھوں کی پیاس نے مارا
یہ بھی جینے میں کوئی جینا ہے — تجھ سے ملنے کی آس نے مارا

اے رضاؔ موت کا تو خوف نہیں
دل کے خوفِ دہراس نے مارا

جب میں اگلے دِن رضاؔ صاحب کے دولت کدے پر اُن کے کلام پر قبلہ جوشؔ ملسیانی کی اصلاحات[1] کا اس غرض سے مطالعہ کرنے کے لیے گیا۔ کہ نفسِ مضمون کے لیے ابتدائی کلام کا اندازہ کرسکوں تو مندرجہ بالا پہلی غزل میرے سامنے آئی۔ غزل کے دوسرے شعر کا اصل مصرعِ اوّل یہ تھا: "جوشِ سودا کرم انھیں کلہے"۔ جس کو کاٹ کر حضرتِ جوشؔ ملسیانی نے موجودہ مصرع "اس سے دیوانگی ہی بہتر تھی" کردیا تھا۔ اسی طرح پانچویں شعر کا اصل مصرعِ اوّل یہ تھا: "آج تک جی رہے ہیں ہم اے دوست" جس کو قلم زد کرکے جوشؔ صاحب نے "یہ بھی جینے میں کوئی جینا ہے" کردیا تھا۔ اس کے علاوہ اور

---

[1] جولائی ۱۹۵۶ء کے بعد وہ حضرت جوشؔ ملسیانی سے بوجہ مصروفیت اصلاح کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکے یوں بھی ہزاروں میل کی دوری اس کام کو دشوار تر کردیتی ہے۔۔۔

کوئی اصلاح یا ترمیم نہیں ہوئی تھی۔ تاریخِ غزل جو کاغذ پر درج ہے ۱۹۵۳-۱۰-۱۵ تھی۔ حاشیے میں استادِ باکمال نے یہ ریمارکس لکھے۔ "غزل اچھی ہے۔ دو شعروں کو ترقی دینے اور زیادہ ربط پیدا کرنے کے خیال سے ترمیم کی گئی ہے۔ جوش ملسیانی"

کیا آپ اس پر یقین کر سکتے ہیں کہ جب یہ غزل کہی گئی تھی تو رضا صاحب کی عمر پچیس چھبیس سال سے زیادہ نہ تھی اور انھیں وطنِ عزیز چھوڑے ہوئے پانچ سال ہو چکے تھے یا اس پر کہ وہ یوپی کے نہیں بلکہ پنجاب کے رہنے والے تھے اور انھیں اہلِ زبان کی صحبت میں ایک دن بھی رہنے کا موقع نہیں ملا تھا یا اس پر کہ وہ اب چالیس سال کے ہو چکے ہیں اور ان سے ہندوستان اور پاکستان کے اردو نواز حضرات بے خبر محض ہیں۔ اور ان کا کمال (کچھ ان کی لاابالی طبیعت کے سبب) قعرِ گمنامی میں پڑا ہوا ہے۔

ظاہر ہے کہ ۱۹۴۷ء میں جب رضا صاحب نے کینیا (مشرقی افریقہ) کی سرزمین پر قدم رکھا تھا تو اس وقت ان کی عمر بیس بائیس سال رہی ہوگی۔ جواں سال شاعر نے کینیا کے دارالحکومت نیروبی میں ایسے حلقے کو موجود پایا جو اُردو سے کچھ نہ کچھ آشنا تھا۔ ان دنوں نیروبی میں مجالس مشاعرہ منعقد ہوتی تھیں اور عوام کو دلچسپی ہونے کی وجہ سے مشاعروں کی محفلیں خاصی پُر رونق ہوتی تھیں۔ رضا صاحب کا سنجیدہ شاعرانہ ذوق چند ہی دنوں میں نمایاں ہو گیا۔ اپنی تنقیدی نظر اور اپنے کلام کے محاسن سے اُنھوں نے کینیا میں منعقد ہونے والی شعری محفلوں میں اپنے علم و ہنر کا سکّہ بٹھا دیا اور ایک ممتاز درجہ حاصل کر لیا۔ وہ ادبی محفلوں میں شمعِ محفل ثابت ہوئے۔ مشاعروں میں رضا صاحب کی شمولیت مشاعرہ کی کامیابی کی دلیل ہونے لگی اور سامعین بے تحاشا داد دینے لگے۔ اُن کا اعلیٰ مقام قائم ہو گیا جو آج تک ہے۔

رضا صاحب ذاتی طور پر شریف النفس، خلیق، ملنسار مگر خود دار اور صاف گو انسان ہیں۔ اُس چراغ کی طرح ہیں جو خود جلتا ہے مگر اہلِ محفل کو روشنی بخشتا ہے۔ ان کی محفلیں پُرلطف ہوتی ہیں۔ گھنٹوں گذار کر بھی انسان یہی محسوس کرتا ہے کہ وقت کم رہا۔ کسی بھی موضوع پر بات چھڑ جائے رضا صاحب اُس پر گھنٹوں قوی دلائل پیش کر سکتے ہیں، جو سننے والوں پر اثر کیے بغیر نہیں رہتے۔ میں یہ بات تجربے کی بنا پر کہہ رہا ہوں کیوں کہ مجھے رضا صاحب کے ہم مجلس ہونے کا اکثر موقع ملتا رہتا ہے۔ آپ نے بارہ تیرہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔ پہلے حضرت کمال کرتارپوری اور پھر مدّت تک ابوالفصاحت حضرت جوش ملسیانی سے مشورہ

سخن کرتے رہے۔ یہی سبب ہے کہ آپ رضا صاحب کا کلام خار وخس سے پاک پائیں گے اور اس میں زبان دفن کا التزام ملے گا۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ اگرچہ ہندو پاک کا وہ ماحول جس میں چوٹی کے اساتذہ اپنے اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں، رضا صاحب کو میسر نہیں آیا، پھر بھی وہ محض اکتسابِ علم اور خاموش مگر لگاتار مشقِ سخن کے سبب زبان وفن سے خوب خوب واقف ہیں۔ رضا صاحب کو صبح سے شام تک انگریزی لکھنے بولنے کے باوجود، (کیوں کہ یہاں پڑھے لکھے لوگوں کی زبان یہی ہے) اردو زباں سے والہانہ محبت ہے۔ چنانچہ آپ نے اکثر جگہ اس عقیدت اور محبت کا اظہار کیا ہے۔

ہندو ہے نہ مسلم ہے رضا مذہب اُردو
دونوں ہی کی آغوش میں یہ پھولی پھلی ہے

جائیں تو کدھر جائیں بتا اے بتِ اُردو
برباد ترے رُوپ کے، مارے تری لٹ کے

میں جس پہ فدا ہوں — وہ اُردو زباں ہے

تجھ سے میں اے حسینۂ اُردو — لوگ کہتے ہیں پیار کرتا ہوں
پیار ہی تجھ سے میں نہیں کرتا — جان تجھ پر نثار کرتا ہوں

یہی شیفتگی جو رضا صاحب کو اُردو سے ہے، اگر دوسرے لوگوں کو بھی ہو یا بہ الفاظِ دیگر اُردو زبان کو جب تک ایسے ہند وفن کار میسر آتے رہیں گے جو بجا طور پر سرشار۔ چکبست۔ جوش ملسیانی۔ فراق گورکھپوری جیسی ہستیوں کے خوشہ چیں کہے جانے پر فخر محسوس کرتے ہوں۔ (جن میں سے ایک رضا صاحب بھی ہیں) تو اُردو کبھی نہیں مر سکتی۔

تنقید نگاروں نے بجا کہا ہے کہ شاعری کا کرشمہ یہ ہے کہ شاعر کے خیالات اور احساسات اس کے دلی جذبات کے سانچے میں ڈھل کر زبان سے نکلیں اور سننے والے کے لیے ایک نقش ونگار کا عالم پیدا کر دیں اور چوں کہ گوشِ شاعر میں زبان کا چٹخارہ اس کی نغمگی قدرتی طور پر سمائے ہوئے ہیں، اس لیے وہ لفظوں کو اس سلیقے سے ترتیب دے کہ ان میں عالمِ نقش ونگار کے علاوہ موسیقی

کا اثر بھی پیدا ہو جائے۔ شاعر اپنے کلام کے آئینے میں ان محسوسات کا عکس دکھانے کی کوشش کرے جو اس کے دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر ابھرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اعلیٰ شاعری کا دار و مدار جذبات کی نقاشی خوب صورت اور سلیس زبان کے استعمال پر ہے۔ جس قسم کے جذبات شاعر کے دل میں ہوں گے، اُسی قسم کے جذبات سُننے والے کا دل بھی محسوس کرے گا۔ رضا صاحب کے اِن اشعار میں جذبات کی عکاسی اور زبان کی رنگینی دیکھیے۔ میرؔ کی زمین میں انھوں نے چند اشعار کہے ہیں ؎

میں وہ داغِ غم ہوں بشر کی جبیں پر | جسے گریہ ہر وقت دھوتا رہے گا
مشیّت خبر دے گئی ہنستے ہنستے | کہ اِنساں خوشی میں بھی روتا رہے گا
کہاں تک تجلّی دکھاتے رہو گے | کہاں تک کوئی ہوش کھوتا رہے گا

غزل میں اُن کا اپنا رنگ ہے۔ انھوں نے غزل کی روایتی شان کو برقرار رکھتے ہوئے اُس کے اُسلوبِ بیان کو خاص اپنے سانچے میں ڈھالا ہے۔ نئے نئے مضامین کچھ اپنے ہی انداز سے باندھے ہیں ؎

خوش باش کہ زیست کے غموں سے | انساں ہے نجات پانے والا
مغرور نہ ہو کمالِ فن پر | چھٹتا بھی ہے اُبر چھانے والا
ہر روز قضا کا روپ بھر کر | ڈھونڈے گا ہمیں بھلانے والا

بڑے خلوص سے اس کو قبول کرنا تھا | مرا سلام غرض مند کا سلام نہیں

لہو صحرا نشینوں کا نہیں اعجاز سے خالی | جہاں بہہ جائیں دو بوندیں وہیں گلزار ہو جائے

ہزار دیکھے حسینِ دوراں، جمیل، طنّاز، حشر ساماں
مگر جو ہے سادگی میں پنہاں کسی میں وہ بانکپن نہ پایا

میں صدقے ترے اے سرشکِ ندامت | تو موتی کا موتی ہے، پانی کا پانی

میری نگاہِ شوق سے پاکر وقارِ حسن　　تم مجھ سے روٹھ جاؤ گے ایسا گماں تھا

ہوتی رہی اُدھر مری بے ہوشیوں کی بات　　اور اس طرف میں ہوش میں آ آ کے پی گیا

خدا کا نام لیا پار ہو گئی کشتی　　شمار ہونے لگے ہم بھی ناخداؤں میں

رضا صاحب نے نظمیں، قطعات، رُباعیات اور گیت وغیرہ سب کچھ کہا ہے اور ان میں قدیم و جدید رجحاناتِ شاعری کو بہ طریقۂ احسن سمویا ہے۔ ان کی نظموں سے ان کے بے پناہ قوتِ بیان کا اظہار ہوتا ہے۔

زندگی کے فلسفے میں کون نہیں الجھا اور کس نے اسے سلجھانے کی کوشش نہیں کی، مگر زندگی ایک سوال ہے جس کا جواب سوائے خود زندگی کے اور کسی کے پاس نہیں۔" اے زندگی بتا دے" میں بہ بظاہر آسان مگر مشکل استفسارات میں شاعرانہ نزاکت کچھ بندوں میں ملاحظہ ہو ے

ہے خواہشِ نمو کیا
کِھلنے کی آرزو کیا
گلزار رنگ و بو کیا
میں کیا ہوں اور تو کیا

اے زندگی بتا دے

سامان دلبری کے
انداز عاشقی کے
سب طور دل لگی کے
دشمن ہیں کیوں ہنسی کے

اے زندگی بتا دے

گلزار اور جنگل
مہتاب اور بادل
شہباز اور کوئل
کس کے لیے ہیں پاگل　　اے زندگی بتا دے

"باغ و راغ" ایک چھوٹی سی مگر نہایت دلکش نظم ہے جسے اردو کی نیچرل شاعری میں ایک اچھا اضافہ کہنا چاہیے۔ تین اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اِدھر گُلاب کے پھولوں پہ گیت بھونرے کے
اُدھر ہیں ٹوٹے ہوئے سازِ زندگی کے تار
قدم قدم پہ اِدھر پھول پیشوائی کو
اُدھر اُلجھنے کو دامن سے بے قرار ہیں خار
اِدھر جو قطرہ گرا گر کے بن گیا موتی
اُدھر جو ابر اٹھا وہ برس گیا بے کار

اسلامی لٹریچر میں بھی رضا صاحب نے قابلِ قدر اضافہ کیا ہے، "معرکۂ کربلا" کے مخمس کے دو بند ملاحظہ ہوں ؎

منھ سوکھ گیا سب کا، حسینؓ ابنِ علیؓ کا
افسوس ہے پانی کو بھی اس تشنہ لبی کا
وحشت میں برا حال ہے خشکی کا تری کا
انجام سبھی دیکھتے ہیں آلِ نبیؐ کا
سب نقش بہ دیوار ہیں دریا کے کنارے

ہو فرض ادا خوف بُری کا نہ بھلی کا
بے شک تھا یہی طور علیؓ ایسے ولی کا
نیزے پہ ہے سر اٹکا ہوا ابنِ علیؓ کا
ہر ذرہ نذر آلِ محمدؐ کی گلی کا
سردار سرِ دار ہیں دریا کے کنارے

ایک نعت کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔ معانی کے ساتھ ساتھ سلاستِ زبان سونے پر سہاگہ ہے۔

قلبِ انساں سے نکالا موت کا ڈر آپؐ نے
زندگی کو آپؐ نے بخشا مقامِ زندگی
صبحِ یثرب کا جن آنکھوں نے نظارہ کر لیا
ان کے حصے میں کہاں آتی ہے شامِ زندگی

کینیا کی مشہور جھیل "لیک نواشا" نظم میں نئی نئی تشبیہوں اور استعاروں سے انھوں نے کام لیا ہے:

آبِ معطر ہوش کا قاتل   خمرِ مقطر ہستی کا بل
آبِ صفا پر دھند لاسفینہ   خالِ رُخِ بے داغ حسینہ
اُڑتے ہیں جگنو شب کو فضا میں   سونے کی افشاں جیسے ہوا میں
اس کا نظارا سحرِ مسلّم   مرہم کا بل خندۂ پیہم

پریتم کی یاد میں ایک عورت کے منھ سے بے عطف و اضافت اور ہندی نما زبان میں نہایت خوب صورت اشعار کہلوائے ہیں:

ہر ڈال پھلوں سے بوجھل سی ہریالی میں موتی شبنم کے
ہر پنچھی مست ہواؤں میں گاتا تھا سُروں میں پنچم کے
میں مُورکھ مست رہی اپنے ایسے ہی پریم وچاروں میں
اُس سمت اُجالا سورج کا جا پہنچا چاند ستاروں میں

اسی طرح "کرشن کنہیا آؤ" میں ہلکے پھلکے ہندی کے الفاظ اور بے عطف و اضافت زبان ایک عجیب سماں باندھ دیتی ہے:

دیکھتے ہیں سب رستہ تمہارا   گھر گھر بَن بَن تم کو پکارا
گذرا جیون روتے دھوتے   شام کبھی آئے تو ہوتے
کیا خالی جھولی نہ بھروگے   یہ اِچھا پوری نہ کروگے

رضا کے گیت بھی بڑے سُریلے ہیں اور لطف یہ ہے کہ سب اُردو قواعدِ عروض کے مطابق ہیں۔ ایک گیت ملاحظہ ہو۔

مجھ کو کون جگانے آیا
چپکے چپکے دھیرے دھیرے   کس نے مجھے چونکایا
مجھ کو کون جگانے آیا

اُوڑھ کے جیسے پوَن کا آنچل
کاڑھ کے گھونگھٹ ڈال کے کاجل   پلٹ کے اپنی کایا
مجھ کو کون جگانے آیا

پریم مگن ہوں جانوں کیونکر

سوتے میں پہچانوں کیونکر پریتم ہے یا چھایا

مجھ کو کون جگانے آیا

رُوپ کی چُنری رنگ کے گہنے

پیار کے تن پر پیار سے پہنے سپنوں کے سنگ آیا

مجھ کو کون جگانے آیا

اب صرف دو رُباعیاں درج کر کے مضمون ختم کرتا ہوں ؎

خیرات سے بیگانہ، کرم سے بالا بے وجہ نہیں کوڑی بھی دینے والا

کنجوس جو مائل بہ سخاوت ہو کبھی سمجھو کہ ہے کچھ دال میں کالا کالا

انسان نے اُخوت کا صنم توڑ دیا برباد کیا دیر، حرم توڑ دیا

گھبرا کے ہوا پیار جہاں سے رخصت غم کھا کے تمناؤں نے دم توڑ دیا

طوالت کے خوف سے ان کے کلام کا مزید انتخاب نہیں دے رہا ہوں اور نہ ان کے کلام کے سلسلے میں کوئی مبسوط مضمون لکھ سکا ہوں۔ تاہم مری دلی تمنا ہے کہ رضا صاحب جیسے شاعر کو بازارِ کمال میں لایا جائے تاکہ ان کی قدر ہو سکے۔ یہ فدائے اردو اور قدردانِ زبان، اردو کے مراکز ہند و پاک میں جگہ پانے کے قابل ہے۔

ساحر شیوی نیروبی

رضا اور ان کی شاعری

آج سے تیرہ سال قبل کی یاد میرے ذہن میں اب تک تازہ ہے۔ جب کہ میں ۸ ارمارچ کو ترکِ وطن کرکے تلاش روزگار میں ممباسہ (مشرقی افریقہ) کی بندرگاہ پر اترا تھا اور میرے سامنے نیا ملک تھا۔ نئے لوگ تھے۔ نئی زبان تھی، نیا ماحول تھا۔ کتابوں میں افریقہ کے متعلق بہت کچھ پڑھا تھا اور لوگوں سے بھی سنا تھا۔ میں نے اسی خاک کے قدم لیے۔ اس وقت میری عمر اٹھارہ سال کی تھی اور میری شاعری کی صرف تین سال۔ ممباسہ سے اپنے احباب و اقارب کے ہمراہ تین سو میل کی دوری پر نیروبی پہنچا۔ خیال تھا نیروبی ہی میں مستقل سکونت ہوگی۔ مگر چھ سات ماہ یہاں رہنے کے بعد تلاش روزگار نے کسموپہنچا دیا۔ (جو کینیا میں لیک وکٹوریہ کے کنارے واقع ہے) افریقہ میں میری زندگی کا زیادہ تر حصہ یہیں بسر ہوا۔ اور میری شاعری نے یہیں ہاتھ پاؤں نکالے۔

کسمو میں چھ سات سال اس طرح گذرے کہ نہ کوئی ادبی مشغلہ اور نہ کسی ادیب و شاعر سے واسطہ۔ رات دن کام میں کولھو کے بیل کی مانند جٹا ہوا، ایک گھٹن سی محسوس ہوتی۔ زندگی پھیکی پھیکی سی معلوم دیتی۔ محض زندگی کے دن گذار رہا تھا۔ البتہ نیروبی سے کبھی کبھار ریڈیو پر مشاعرے نشر ہوا کرتے تھے۔ جو میں بڑے شوق سے سُنا کرتا تھا۔ اس زمانہ میں نیروبی میں اگرچہ مبتدی تھے مگر کافی شعرا تھے۔ اور بڑی چہل پہل رہا کرتی تھی۔ لیکن میں ان ادبی مشاغل سے دو سو میل دور تھا کبھی ایسا موقع نصیب نہ ہو سکا تھا کہ مشاعرے میں شریک ہوں۔ مشاعرے بزم سخن نیروبی کے زیر اہتمام ہوا کرتے تھے۔ جس کے روحِ رواں صدرِ محترم کالی داس گپتا رضا تھے اور سکریٹری مومن علی حیدری۔ رضا صاحب نے بزم سخن نیروبی کے ذریعے جو خدمت کی وہ قابل ذکر ہے اور ناقابل فراموش ہے۔ ہندو پاک میں تو اکثر شعراء کا اپنا ادبی حلقہ ہوتا ہے۔ اور اساتذہ کے ذریعے

انھیں اپنی زبان کو سنوارنے اور نکھارنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ مگر غیر ملک میں جہاں شمع اردو کی ایک کرن بھی نہیں پہنچی ہے جہاں صرف اندھیرا ہی اندھیرا ہو، وہاں چراغ اردو ادب کو روشن کرنا اور جلائے رکھنا ایک ناممکن سی بات ہے۔ مگر یہ سب رضا صاحب کی خدمات کا نتیجہ ہے کہ آج یہاں اردو ادب کے شائقین نظر آتے ہیں اور ہر طرف اردو کے چراغ فروزاں ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ افریقہ میں رضا صاحب کی حیثیت میر کارواں کی سی ہے۔

ایک روز بزم سخن کے سکریٹری مومن علی حیدری کسموتشریف لائے، بزم ادب کسمو دجو میرے چند دوستوں نے مل کر بنائی ہے) کی طرف سے ان کے اعزاز میں مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ مشاعرہ کے بعد شعر وادب پر گفتگو ہونے لگی۔ باتوں باتوں میں انھوں نے رضا صاحب کا ذکر بھی چھیڑا۔ میں ادھر ان کی باتیں بھی سن رہا تھا اور ادھر دل رضا صاحب سے ملاقات کے لیے بیتاب ہوا جارہا تھا۔ ایک مدت سے یوں بھی خواہش تھی۔ مگر تب فاصلہ زیادہ تھا اور اب کچھ کم ہو رہا تھا۔ مومن علی حیدری صاحب سے بھی اچھی جان پہچان ہوگئی تھی۔ ان کی وساطت سے رضا صاحب سے ملاقات کی امید بھی قوی تر ہوگئی تھی۔

ایک دفعہ وائس آف کینیا کے ہندوستانی سکشن کے ڈائرکٹر کسمو آئے۔ ایک ریڈیائی مشاعرے کے لیے "طرح مصرع" دے گئے۔ اس طرح میں لگ بھگ سو شعر میں نے کہے تھے جو کسمو کے مختلف دوستوں میں شعرار کی تعداد بڑھانے کے لیے تقسیم کرنے تھے کیونکہ کسمو میں خود کہنے والے صرف دو ہی تھے۔ ایک ناچیز ا در دوسرے چودھری محمد یوسف، مگر اب مشکل یہ تھی کہ ان اشعار پر اصلاح کس سے کرائی جائے کیوں کہ اس وقت تو کیا مجھے اب بھی اپنے قلم پر بھروسہ نہیں ہے۔ میں نے حیدری صاحب سے عرض کی کہ آپ ان غزلوں پر نظر ثانی کر دیں۔ مشاعرے کے لیے دن بہت کم تھے۔ غزلیں بمبئی سے اصلاح ہو کر واپس وقت پر ملنی مشکل تھیں۔ حیدری صاحب نے کہا یہ کام میرا نہیں۔ رضا صاحب کا ہے اور وہ غزلیں اپنے ساتھ نیروبی لے گئے۔ رضا صاحب کی اصلاح کردہ غزلیں دیکھ کر میرے دل میں ان کے لیے اور بھی عقیدت پیدا ہوگئی۔ ان سے ملنے کا شوق اور بھی بڑھ گیا۔

حلقہ گفتوش نیروبی کے زیر اہتمام ہر سال نیروبی میں اقبال ڈے پر مشاعرے ہوتے رہے ہیں۔ ۱۹۶۲ء کے اقبال ڈے پر جس کے صدر پاکستانی ہائی کمشنر تھے، حیدری صاحب نے کسمو کے شعرا کو بھی مدعو کیا تھا۔ اور اسی مشاعرے میں میری پہلی ملاقات کالی داس گپتا رضا صاحب سے

بھوئی حیدری صاحب نے رضا صاحب کی شخصیت کے متعلق جو کچھ فرمایا تھا میں نے اسے حرف بہ حرف صحیح پایا۔ رضا صاحب نہایت شریف النفس وسیع القلب خوش اخلاق اور با مروت و شرافت انسان ہیں۔ ملنسار تو ہیں ہی، مجھ سے بھی بڑے تپاک سے ملے۔

سرزمین پنجاب نے اردو ادب کو بڑے بڑے مشاہیر عطا کئے ہیں۔ علامہ اقبال۔ جوش ملسیانی تلوک چند محروم۔ حفیظ جالندھری۔ جگن ناتھ آزاد۔ ساحر لدھیانوی۔ فیض احمد فیض اور بہت سے دوسرے اسی زمین کی ایک گمنام سی ہستی رضا صاحب کی بھی ہے۔ جو فضیلۂ علم و فن اور نور خیالات سے بہ کمال خاموشی مشرقی افریقہ میں شمع اردو کو روشن کیے ہوئے ہیں۔ چالیس سال کی عمر ہی میں ان کا کلام بغیر کسی جھجک کے اعلیٰ شاعری کی کسی بھی محفل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ پندرہ سال کی عمر ہی میں وہ شعر کہنے لگے تھے۔ ابتدا میں انھوں نے حضرت کمال کرتارپوری سے مشورۂ سخن کیا۔ اور پھر ان ہی کے مشورے سے قبلہ جوش ملسیانی کے تلامذہ میں شامل ہوئے۔ کمال صاحب خود بھی حضرت جوش ملسیانی کے فارغ الاصلاح تلامذہ میں ہیں اور بڑے نغز گو شاعر ہیں۔

شاعر ذاتی طور پر تعارف کا محتاج ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کی شاعری رسالوں وغیرہ کی موجودگی میں عام طور پر کبھی تعارف کی محتاج نہیں رہتی مگر وطن سے ہزاروں میل کے فاصلے پر رہنے کی وجہ سے رضا صاحب کو اپنی ذات اور ان کی شاعری دونوں کو منظر عام پر لانے کا موقعہ نہیں مل سکا ان کی اپنی طبع بھی نام و نمود کی خواہش سے کافی گھبراتی ہے۔ وہ بیس سال سے بھی کم عمر میں افریقہ چلے آئے یہی وجہ ہے کہ میں نے حتی الوسع انھیں اپنے ہندوستانی شعراء سے متعارف کرانا اپنا فرض سمجھا اس وقت برعظیم ہند و پاک میں بھی فن شعر و سخن کو جاننے والے خال خال ہی نظر آئیں گے۔ رضا صاحب بساط شعر و سخن کی پٹی ہوئی نرد نہیں۔ بلکہ کامل کھلاڑی ہیں۔ آج کل نام نہاد جدید شعراء نے (چند ایک کے سوا) ایسا طوفان بدتمیزی اٹھا رکھا ہے کہ شاعری گڈے گڑیا کا کھیل ہو کر رہ گئی ہے۔ عجز طبیعت کی وجہ سے مصرع کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا، نااہلیت کے سبب عروض سے لاپروائی برتنا چند ایک ایسی کمزوریاں ہیں جن پر وہ ناز کرتے ہیں۔ اور اساتذہ کی پگڑی تک اچھالنے سے باز نہیں آتے۔ رضا صاحب نے یہ رباعی شاید ان ہی کے لیے فرمائی ہوگی ؎

ہر نظم کو شاعری پہ دھبا کہیے ۔۔۔ ہر شعر کو خامیوں کا ابا کہیے

اک نظم میں سو بحریں اکٹھی ہوں اگر ۔۔۔ کیوں اس کو نہ چوں چوں کا مربا کہیے

رضا صاحب نے فن کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ان کی زبان متروکات سے پاک اور ٹکسالی ہوتی ہے اور ان کا طرزِ بیان لفظوں کا انتخاب، تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال حسین اور جامع ہے جو نام نہاد جدید شعرا کی دسترس سے قطعی باہر ہے۔ آپ ان کا کلام دیکھ کر ضرور کہہ اٹھیں گے کہ ان کا یہ مقطع غلط بیانی پر مبنی نہیں ہے

رضا فیضِ استاد ہے تجھ پر ایسا فصاحت ترے آگے بھرتی ہے پانی

آپ نے سستی شہرت اور نام و نمود سے بے نیاز ہو کر خلوص و حقیقت سے ہم آہنگی پیدا کی ہے زندگی اور ادب کی قدروں کو شعر و فن کے صحیح سانچوں میں ڈھالا ہے۔ جدید خیالات کے ساتھ ساتھ قدیم روایاتی شان اور دلکشی کو بھی برقرار رکھا ہے جدید رجحانات اور نئی قدروں کو اپنایا ہے۔ ان کے یہاں قدیم و جدید ادب کا جو حسین امتزاج ملتا ہے۔ وہ قابلِ تحسین ہے۔

رضا صاحب نے شاعری کی تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی فرمائی ہے اور ہر صنف میں امتیاز حاصل کیا ہے غزل، نظم، رباعی، قطعہ، گیت غرض کہ جب بھی وہ قلم کو جنبش دیتے ہیں تو فکر و بیان کی بلندیوں کو چھو لیتے ہیں۔ ان کے گلشن کا کوئی پھول نہ خوشبو سے بے بہرہ ہے اور نہ وہ مرجھایا ہوا ہے، نہ داغدار، نہ بے رنگ۔

غزل شاعری کی جان ہے اس میں نئے نئے خیالات کو اچھوتے انداز میں اس طرح پیش کیا جاسکتا ہے کہ وہ تیر و نشتر کی طرح دل میں اترتے چلے جاتے ہیں واردات قلب شدت جذبات کا بیان غزل کی وہ امتیازی خصوصیات ہیں جو اس کو دیگر اصناف سخن سے جدا کرتے ہیں اور اگر طرزِ بیان جیت ہو تو ایک معمولی سا مضمون بھی اثر چھوڑے بغیر نہیں رہتا۔ مثلاً رضا کا یہی شعر دیکھیے

وہاں بجلیاں رقص کرتی ملیں گی یہی ہے مرے آشیاں کی نشانی

اس شعر میں کوئی نیا پن یا اچھوتا خیال پیش نہیں کیا گیا۔ اس خیال کا اظہار اکثر شعرا نے کیا ہے مگر اس کے طرزِ بیان میں جو حسن ہے وہ شعر پڑھتے ہی شراب کی مستی کی طرح دل و دماغ پہ چھا جاتا ہے۔ ایک دفعہ میں نے آپ سے جگر مرادآبادی کی مشہور غزل "ساقی کی ہر نگاہ پہ بل کھاکے پی گیا"، کی زمین میں کچھ اشعار کی فرمائش کی آپ نے جو اس وقت پامال زمین میں پھول کھلائے ہیں ان کی بہار سے آپ بھی لطف اندوز ہوں

دم بھر کو بھول سا گیا میں زاہدوں کی بات رندوں کے جوشِ نوش کی شہ پاکے پی گیا

تابؔ کو دیکھو دیکھ کر ابر سیاہ کو
توبہ کے حال بد پہ ترس کھا کے پی گیا

دوزخ بہشت موت حیات اہل شرع و پند
میکش نظام دہر سے گھبرا کے پی گیا

ہوتی رہی ادھر مری بے ہوشیوں کی بات
اور اس طرف میں ہوش میں آ آ کے پی گیا

گزرا جو باغ دہر سے مینا بدست میں
پھولوں کی بو سے جام کو مہکا کے پی گیا

رضاؔ صاحب نے اپنے کلام میں نئی نئی ترکیبیں بھی تراشی ہیں اور غرابت کا شائبہ تک نہیں۔ کلام بہت پاکیزہ ہے۔ کوئی شعر عامیانہ رنگ کا نظر نہیں آتا۔ جہاں تک ہو سکے وہ روزمرہ کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ انھیں فارسیت اور بڑے بڑے الفاظ استعمال کرنے سے حتی الوسع گریز ہے، فرماتے ہیں۔

فارسیت ہی زبان ہے تو مجھے ناز نہیں
میری نظروں میں تکلف کبھی ممتاز نہیں

قابلِ فہم زباں ہو تو سخن کا ہے مزا
طوطیٔ ہندوستان بلبلِ شیراز نہیں

گذشتہ چند سالوں سے عمر کے ساتھ ساتھ رضاؔ صاحب کی شاعری میں ایک انقلاب سا آگیا ہے۔ خیالات اور پختہ ہو گئے ہیں احساسات میں گہرائی آگئی ہے۔ حیات کی صحیح نقاشی اور تاثرات کی مکمل صورت ملنے لگی ہے۔ ندرتِ مضامین، پروازِ تخیل اور حسین استعاروں کی دلفریبی دو چند ہو گئی ہے۔ آگہی، حق بینی اور فطرت شناسی کے نمونے جو انسانیت کے روشن پہلو ہیں۔ آپ کے ہاں بکثرت ملنے لگے ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

سراغ منزلِ ہستی کسی کو مل نہ سکا
ہمارے دیکھتے کتنے ہی کارواں گذرے

کہکشاں چاند ستارے ہیں مرے نقشِ قدم
کون کہتا ہے فلک تک میری پرواز نہیں

جو ان نظروں میں سب کچھ جاوداں ہے
یہ کس نے کہہ دیا فانی ہے دنیا

یہ غلط ہے حسن ہے آتش فشاں
عشق خود ہی شعلۂ خاموش ہے

ہم وہ نہیں جو بھاگ کے ساحل کی لیں پناہ
موجوں کے ساتھ ساتھ لڑیں گے بھنور سے ہم

وفا کی راہ میں گلگشت ہی نہیں کافی
ملیں جو خار بھی ان کا بھی احترام کریں

طوفان کو ساحل کی خموشی پر رشک
ساحل کی تمنا کہ وہ طوفاں ہوتا

تم نہ مانے میری دعاؤں کو
دہریے تک خدا کو مان گئے

طوفاں سے کہو سر مری کشتی سے نہ پٹکے
دریاؤں کا پالا ہوں میرے پاس نہ بھٹکے

مجھ کو خوابیدہ دیکھ کر قسمت
پاس ہی سے گذر گئی ہو گی

ہر ایک اشک نے پلکوں پہ آکے یہ جانا — گہر بھی خاک میں اکثر ملائے جاتے ہیں

بندگی کے لئے تیار ہو دل بھی ورنہ — رات بھر جاگتے رہنے میں بھی کیا ملتا ہے

ناکام محبت کے آنسو ہوتے ہیں نہایت پاکیزہ — جو پانی ان آنکھوں سے بہا وہ گنگ و جمن میں کیا ہوگا

ادھر دورِ نمو رکھا ادھر فصلِ خزاں رکھدی

بشر کی ناتواں ہستی پھر ان کے درمیاں رکھدی

جب بے سروساماں تھا تو شہروں کی طلب تھی — اب با سروساماں ہوں تو صحرا کی طلب ہے

جنھیں غرور ہے دولت کا جاہ و حشمت کا — ہم ایسے لوگوں کو خاطر میں لا نہیں سکتے

رضاؔ وہ یاس کے کانٹے ہوں یا امید کے پھول — ہم اپنے سینے سے سب کو لگائے جاتے ہیں

اب رضاؔ صاحب کی غزلوں کے چند ایسے اشعار ملاحظہ فرمائیے جن میں دقیق مطالب اتنی سلیس زبان میں بیان کئے گئے ہیں کہ ان پر کسی استاد کے شعروں کا گمان ہوتا ہے۔ اس حالت میں جب کہ چالیس سال کی عمر کے پچھلے بیس سال انھوں نے ہندوستان سے باہر گذارے ہوں۔ سلاست زبان کا یہ اکتساب اور بھی حیرت افروز ہے۔ چھوٹی بحروں کی غزل سے تین تین شعر اس لیے پیش کیے گئے ہیں تاکہ آپ کو ان کی سلیس اور ٹکسالی زبان کے صحیح رجحانات کا اندازہ ہو سکے۔

مرے مرنے جینے کی کیا پوچھتے ہو — ابھی باخبر تھا ابھی بے خبر ہوں

بشر ہونا اپنا نہیں بھولتے تم — مگر بھول جاتے ہو میں بھی بشر ہوں

رضاؔ مجھ کو بے کار کیوں جانتے ہو — فقط خوب ہی میں نہیں خوب تر ہوں

مجھ سے قیمت نہ مانگ اے ساقی — تنگ دستی کی انتہا ہوں میں

آپ جو کچھ مجھے سمجھتے ہیں! — اس حقیقت کو جانتا ہوں میں

ان کی نظریں تو ان کی نظریں ہیں — اپنی نظروں سے گر گیا ہوں میں

سی لیے ہونٹ پی لیے آنسو — ضبط الفت کے پاس نے مارا

آنسوؤں سے بھی یہ نہیں بجھتی — ہم کو آنکھوں کی پیاس نے مارا

اس سے دیوانگی ہی بہتر تھی — ہم کو ہوش و حواس نے مارا

رضاؔ صاحب ہر چند اپنے وطن سے دور فارغ البالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مگر وطن کی دوری یہاں ان کے دل کو تڑپا رہی ہے۔ وہ اپنے ایک شعر میں اپنی غریب الوطنی کا شکوہ یوں کر رہے ہیں۔

بہشت میں گو نہ تھا کوئی غم تھا چار سو اک نشاطِ پیہم
مگر رضاؔ کا نکل گیا دم وہاں جو اپنا وطن نہ پایا

رضاؔ صاحب نے جس طرح بادۂ تغزل کے ساغر رنگین چھلکائے ہیں اسی طرح ان کی نظمیں بھی اسی پائے کی ہیں کہ نہ ان میں ابہام ہے نہ نعرہ بازی۔ انھوں نے جدید شاعری کی دھن میں فن و بیان سخن کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ وہ صرف اس حد تک جدید ہیں جس حد تک عصر حاضر کے ہر باشعور اور ہر باذوق شاعر کو ہونا چاہیے۔ رضاؔ کی نظموں میں صرف حقیقت ہی حقیقت جھلکتی ہے۔ ان کے موضوعات میں تنوع ہے۔ انھوں نے اپنی ذات کو ابھارنے کی غیر شاعرانہ اور خود غرضانہ حرکت کبھی نہیں کی۔ ان کی نظموں میں معاشی ناہمواریوں کے گلے ہیں۔ معاشرتی زیادتیوں سے بیزاری ہے اور انسانیت کی غیر منصفانہ صورتوں کے خلاف احتجاج ہے۔ وطن کی محبت کے نغمے ہیں۔ باہمی اخوت ہے۔ اور حسن فطرت کی تعریف ہے۔ ان کی ایک نظم "ہماری دوستی" کے دو بند دیکھیے اور بے غرضانہ دوستی کا خیر مقدم کیجیے۔

حیران نہ ہوں آپ کہ ہم دوست ہیں پھر بھی — گو نام میرا ہندو ہے اور اس کا مسلمان
حیران نہ ہوں آپ کہ لڑتے ہی نہیں ہم — گو اس کا ہے معبود خدا میرا ہے بھگوان
حیران نہ ہوں آپ کہ ہم کیوں ہیں برابر — گو مذہباً اک سی نہیں ہم دونوں کی میزان

جس دور کی آغوش میں ہم دوست بنے تھے
مذہب کے محافظ ابھی پیدا نہ ہوئے تھے

اس وقت سے ہم دوست ہیں جب صلح تھی ہر سمت — انسان کا انسان سے جھگڑا نہ ہوا تھا
اخلاق و مساوات ہی تھے لعل و جواہر — دنیا کو زر و مال پہ غرہ نہ ہوا تھا
ہر شخص کی تھی ظاہر و باطن میں صفائی — کھوٹے پہ کھرے ہونے کا دھوکا نہ ہوا تھا

ہم دوست فقط دوست ہیں دنیا ہی نہ دیں ہم
اس دور کے انسان ریاکار نہیں ہم

ایک نظم "کوئی نہ آئے میرے منتشر خیالوں میں" کا ایک بند ملاحظہ فرمائیں۔

مجھے خیال کی دنیا اجاڑ لینے دو — گڑی ہیں دل میں جو پھانسیں اکھاڑ لینے دو
حسیں امید کے پردوں کو پھاڑ لینے دو — کوئی دم اور مجھے غم کی آڑ لینے دو

کوئی نہ آئے میرے منتشر خیالوں میں

نظم کالی رات کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

غم زدوں کے لیے ساتھی نہیں بڑھ کر تجھ سے　　ملبی ہونے پہ ترے کرتے ہیں وہ کتنا ناز
رہزنوں فتنہ گردں یاس کے ماردں کے لیے　　تو کسی شوخ حسینہ کی ہے اک زلف دراز

آسام میں ۱۹۵۰ء میں جو بھونچال آیا تھا۔ اس کی منظر کشی انھوں نے کس دردناک اور دل دہلا دینے والے انداز میں کی ہے۔

یوں مہیب آوازاٹھیں دہر کو دہلا گئیں　　بدلیاں ساون کی جو ہیں آگ سی برسا گئیں
ندیاں پھٹ کر جو پھیلیں کل زمیں پر چھا گئیں　　مچھلیاں بدبو کے مارے ساحلوں پر آگئیں
قطرہ قطرہ زہر کر ڈالا فنا کے جام نے

اشک جو ٹپکے وہ گرتے گرتے دریا ہو گئے　　جسم دب کر خاک میں آزاد دنیا ہو گئے
وہ مکان جو آسرا تھے آج دھوکا ہو گئے　　آنکھ جھپکی تھی وہ سب ساماں مہیا ہو گئے
جو چھپا رکھے تھے اس روز خراب انجام نے

"ہند کا سپاہی" میں سپاہی کا دل اس طرح ابھارتے ہیں جیسے میدان جنگ میں اس کے شانہ بہ شانہ لڑ رہے ہوں۔

جس کی تعظیم کو سر جھکتے ہیں وہ سر ہے تو　　جس کی قیمت نہیں لگ سکتی وہ گوہر ہے تو
خود غرض جو نہیں وہ قوم کا نوکر ہے تو　　دشمنوں کو جو نگلتا ہے وہ اژدر ہے تو
اسپ ہمت کو تو ہی ایڑ لگا سکتا ہے
تو ہی افواج مخالف کو بھگا سکتا ہے

قوم کے داغ ذلالت کو مٹانے والے　　کھل گئے ہیں تیری کنجی سے جفا کے تالے
سینۂ رہ پہ تری گرم روی کے چھالے　　تونے کیا کیا نہ عدو رن میں بھسم کر ڈالے
جیت کر آتا ہے جب ایسا سماں ہوتا ہے
تری صورت پہ فرشتے کا گماں ہوتا ہے

ان کی دوسری نظمیں بھی آج ہمارے ادب کا گراں قدر حصہ ہیں۔ محنت کشوں سے، نوجوان سے، تنہائی، مہارانی لکشمی بائی، بارش، ان وغیرہ یہ نظمیں حقیقت پسندی اور واقعات نگاری کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان کی ایک نظم "رکشہ والے سے" کا ایک بند ملاحظہ فرمایئے۔

تجھے میں جانوں گا اس وقت جب تری ہمت　　ہر اک رعونت و بیداد کو کچل دے گی

کرے گی اونچا زمانے میں پرچم انصاف
ستم گری کے ہر آئین کو بدل دے گی

چونکہ آپ کو مبسوط اور طوفانی نظمیں لکھنے کا موقع اور فرصت بہت ہی کم ملتی ہے لہذا بعض اوقات وہ ان سے دور بھاگنے کی کوشش میں رباعیات اور قطعات کا سہارا لیتے ہیں۔ رباعی کے اوزان مخصوص ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ فن عام لوگوں اور شاعروں کی سمجھ میں نہیں آتا بعض لوگ قطعات کو لاعلمی سے ردیف اور قافیہ کو مصرعہ اول، ثانی اور چہارم میں مساوی رکھ کر اسے رباعی کہتے ہیں۔ یہ درست نہیں ہے۔ رباعی قطعات کے اوزان میں نہیں کہی جاسکتی۔ رضا صاحب کی چند رباعیاں ملاحظہ کیجیے۔

ہر وقت غم قوم مٹاتے رہنا
ہر حال میں کام آسکے آتے رہنا
تم بحر شجاعت کے شناور ہو رضاؔ
طوفاں میں بھی کشتی کو چلاتے رہنا

○

ڈرنا نہ خدا سے آدمی سے ڈرنا
پرہیز اپنوں سے غیر کا دم بھرنا
واقف ہوں ترے ضمیر سے میں اے دل
خو ہے تری انسانوں کو رسوا کرنا

○

باتیں اک دوسرے کی سہنا سیکھو
دریا میں برنگ موج بہنا سیکھو
بے سود ہیں یہ دیر و حرم کے جھگڑے
مل جل کر بھائیوں سے رہنا سیکھو

○

قطعات سے لطف اندوزی حاصل کیجیے۔

عیش، آرام، خوشی، کھیل تماشا دنیا
فکر کا، رنج کا اندوہ کا سایہ دنیا
باوجود اتنی دورنگی کے بھی حیران ہوں میں
کس بنا پر لب انسان پہ ہے دنیا دنیا

دل آرا، دلربا، دلبر، دلآرام
خوشی و آشتی ہی اس کا پیغام
دوام اہل فنا کو بخشتی ہے
ہے اس پر بھی محبت کتنی بدنام

رضاؔ کا قلم ایک بانسری ہے جس سے میٹھے میٹھے سروں میں رسیلی گیت نما نظمیں پھوٹتی ہیں۔

بے برسے گذرا ہے ساون
پیاسا جنگل پیاسا گلشن
بھر دے ان کا خالی دامن
اے تاروں کی آنکھ کے کاجل
اے کالے منڈلاتے بادل

سوکھے ہونٹ ہنسی مرجھائی
سوکھا پھول کلی مرجھائی
ہر اک شاخ ہری مرجھائی
کھل کے برس اک کر دے جل تھل
اے کالے منڈلاتے بادل

بڑھ کر پیچھے ہٹتا جائے
گھن گرجن کے بم برسائے
دور ہی سے کیوں ہم کو ڈرائے

اے بازیگر، نٹ کھٹ چنچل　　　　اے کالے منڈلاتے بادل

اُن کا ایک اور گیت ملاحظہ فرمایئے۔

پھر سے سویا پیار جگادو　　　　من ساگر میں پھینک کے کنکر　　　　اک طوفان اٹھادو......

جاگے پیار تو دنیا جاگے　　　　سورج نکلے اندھیرا بھاگے

بہہ جائے خوشیوں کی ندیا　　　　وہ سنگیت بہادو　　　　پھر سے سویا......

تم ہی تو ہو پریمی کی آشا　　　　مکھ سے کرو پھولوں کی برکھا

دھیان میں پریمی کے آکر تم　　　　پریم کے پھول کھلادو　　　　پھر سے سویا......

تم دایو ہو شیتل شیتل　　　　آئی ہو پی کر گنگا جل

سب کے من کی چنچلتا کو　　　　پیار سے شیت بنادو　　　　پھر سے سویا......

آپ کا قلم نعت اور سلام میں بھی کم معجز نما نہیں ہے۔ چونکہ مضمون طویل ہو گیا ہے اس لیے ایک ہی نعت کے دو بندوں پر اکتفا کرتا ہوں۔

فرش پر سلطنتِ عرش کے والی آئے　　　　لے کے مالک سے دل و ہمتِ عالی آئے

مظہرِ جلوہ گہِ شانِ جلالی آئے　　　　یہ خبر عام ہوئی باغ کے مالی آئے

چمن دہر کی ہر شاخ ثمر دار ہوئی

ہر کلی پھول بنی پھول سے گلزار ہوئی

اے رسولؐ آپ کو اللہ کی رحمت کی قسم　　　　دل معصوم کی میراثِ رسالت کی قسم

عشق اللہ کی قسم اور رنگ نبوت کی قسم　　　　نور دیں، نور ہدیٰ نور طہارت کی قسم

زیست کے راز کو انسان پر افشا کر دیں　　　　ہر نظر کو حق و باطل سے شناسا کر دیں

مجھے امید ہے کہ اس مضمون کو پڑھ کر جو رضا صاحب کی ہمہ صفت ذات اور شاعری کے کسی پہلو کو بھی اجاگر کرتے میں کامیاب نہیں، اردو نوازان کا مزید کلام پڑھنے کے خواہشمند ہوں گے۔ اگر ایسا ہوا تو میں اپنی محنت کو اکارت نہیں سمجھوں گا اور ہندوستان میں اردو طبقہ کی ہر دلعزیزی کی داد دوں گا۔

(ماہنامہ صبحِ امید بمبئی مارچ اپریل ۱۹۶۸ء)

شعلۂ خاموش

پیش نامہ

از آنریبل جسٹس جان سنگھ
بی ایس سی (آنرز) لندن بیرسٹرایٹ لاجج ہائی کورٹ کینیا

میرے نوجوان دوست کالیداس گپتا رضا نے اپنے مجموعۂ کلام کا مسودہ میرے ہاتھوں میں دیا اور میں نے اُسے سرسری طور پر کھولا تو جس شعر پر پہلے پہل میری نظر پڑی وہ یہ تھا ؎

جورِ دُنیا سے ہوں شل بیل کے کندھوں کی طرح
ڈھونڈھتا پھرتا ہوں اِنصاف کو اندھوں کی طرح

چونکہ میں رضا کے مزاج کو اچھی طرح جانتا ہوں اس لئے مجھے یہ شعر پڑھ کر کوئی خاص تعجب نہیں ہُوا۔ وہ نہایت صاف گو اِنسان ہے اور میں نے "شعلۂ خاموش" کا دیباچہ لکھنے کی ذمّہ داری لینے سے پہلے اپنے آپ کو پُورے طور پر رضا کی صاف گوئی کی سختیاں برداشت کرنے کے لئے تیار کر لیا تھا اور واقعی مجھے ان سختیوں سے دوچار ہونا بھی پڑا۔

انصاف کے متعلق رضا کی ایک رباعی ملاحظہ ہو ۔

قانون کو رسیم دزر سے تلتے دیکھا ۔ اکثر بھرم انصاف کا کھلتے دیکھا

اڑتی ہے جو خاک عدل کے رستوں میں ۔ منصف کو اسی خاک میں رلتے دیکھا

میرا تعلق بھی قانون اور عدالت سے ہے۔ مگر مجھے یقین کی حد تک امید ہے کہ یہ رباعی میری کورٹ سے متاثر ہو کر نہیں کی گئی ہو گی اور میں دل سے چاہتا ہوں کہ اس رباعی کا کسی بھی کورٹ پر اطلاق نہ ہو سکتا ہو۔ شاعر ایسی دنیا میں رہتے ہیں جو صرف ان کی اپنی ہوتی ہے اور جسکے لئے ضروری نہیں کہ وہ اس دنیا سے بھی میل کھائے، جس میں عام انسان بستے ہیں۔ تاہم ایک نقطۂ نظر پر بڑے بڑے مدبّروں کو یکجا دیکھا ہے۔ چنانچہ پروفیسر ہیرلڈ لاسکی اپنی کتاب "DEMOCRACY IN CRISIS" میں فرماتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں انصاف کا پلڑا مقابلتاً امیر طبقے کی طرف زیادہ جھکتا ہے لیکن رضا صرف منصفوں اور عدالتوں ہی پر نہیں برستا وہ اپنے طبقے یعنی زرداروں پر بھی یکساں طور پر حملہ آور ہوتا ہے اور اگر موقع ملے تو دولتمند کی کھال کھینچ کر رکھ دیتا ہے۔

زرداروں سے انصاف کی امید نہ رکھنا ۔ مکّاروں کے مکّار ہیں ظاہر کے یہ سچے

نادار کی رگ رگ سے لہو چوس ہی لیں گے ۔ انسان کے جامے میں یہ شیطان کے بچے

ممکن ہے یہ بات درست ہو اور ایسا ہی ہوتا ہو۔ میں نہیں جانتا۔ رضا چونکہ اس طبقے سے تعلق رکھتا ہے اس لئے وہ بہتر جانتا ہو گا اور یقیناً جو کچھ بھی اس نے کہا ہے اور جس ایمانداری سے کہا ہے اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی غالباً کسی غریب ہی کی ترجمانی کرتے ہوئے اس نے کہا ہو گا ۔

دار مجھے دہر میں رہنے نہیں دیتا

دولتمندی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اس کی آواز بلند سے بلند تر ہوتی جاتی ہے

جس کو چاہو خرید لو زر سے   آج کل حفظِ آبرو بے کار

رعنا کے کہنے کے مطابق دولت کی ہوس ایک خطرناک مرض ہے ؎

خواہشِ زر اِک بلا سے کم نہیں

مایۂ عبرت ہے انجامِ ہوس

اور وہ خود دولت کے متعلق اپنے مطمحِ نظر کو اس طرح بیان کرتا ہے ؎

کبرِ زر میری نظر میں بار پا سکتا نہیں   حسن بن کر بھی مرے دل کو لُبھا سکتا نہیں

شعراء کے دواوین "حسن" کے تذکرہ و توصیف سے بھرے ہوتے ہیں، رعنا کے اپنے مجموعۂ کلام میں بھی حصۂ غزل دوسری اصنافِ سخن کے برابر ہے۔ اس لئے اردو شاعر کے لئے واقعی یہ بہت بڑی قربانی کہی جا سکتی ہے۔ اگر غرورِ دولت اُنکے دل کو "حسن" بن کر بھی لُبھا نہ سکے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مال و زر انسان کو قوّت بخشتا ہے مگر یہ قوّت اُس شخص کی قوّت سے بہت مختلف ہوتی ہے جو خود دار ہو۔ دیکھئے رعنا اِس بارے میں کیا کہتا ہے ؎

کسی زردار کی گردن کا جُھکانا آساں   ایک خوددار کی گردن کا جھکانا مشکل

رعنا کو اس بات میں کوئی شُبہ نہیں ہے کہ مال و زر کی بخشی ہوئی قوّت عارضی ہوتی ہے وہ جوانی اور امارت دونوں کو بلحاظ پائیداری ایک سا سمجھتا ہے، کہتا ہے ؎

دھوکا ہے جوانی بھی امارت کیطرح   اس حُسنِ دو روزہ پہ تو مغرور نہ ہو

وہ بھی بہت سے لوگوں کی طرح اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ زرداری کا ایک نہ ایک دن خاتمہ ہوگا ؎

زردار کو ہاتھ زر سے دھونا ہوگا   خود ساختہ اعتبار کھونا ہوگا

بکرے کی ماں منائے گی کب تک خیر   اِک دن تو اُسے حلال ہونا ہوگا

مگر میں اِس رُباعی کے معنی یہ نہیں لیتا کہ واقعی ایک وقت ایسا آجائیگا جبکہ دنیا میں کوئی امیر آدمی باقی نہ رہے گا۔ میرے خیال میں رضا صرف اس دن کا اُمیدوار ہے (اور ہم اس اُمید میں اس کے ساتھ ہیں) جب مفلس بھی سوسائٹی میں وہ جگہ حاصل کرلیگا جو دولتمند صرف اپنی دولت کے سہارے حاصل کئے بیٹھا ہے۔

زرداری کو چھوڑکر رضا جب تصویر کے دُوسرے رُخ یعنی افلاس کو دیکھتا ہے تو وہ پھر اُسی نتیجے پر پہنچتا ہے کہ فی زمانہ شرافت کو تولنے کا باٹ امارت ہی ہے اگر شرافت کا انحصار انسان کے اوصاف پر ہوتا تو مفلسوں کو بھی سوسائٹی میں وہی درجہ ملتا جو دولتمند کو ملتا ہے، اُس کے خیال میں یہ سراسر بے انصافی ہے کہ وہ آدمی جو محض حصولِ دولت کے لئے ہر بے جا طریقہ استعمال کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے بھی قابلِ احترام سمجھا جائے۔ رضا کی نظر میں دولت کا فخر، بے جا ستم شعاری کی بنیاد ہے ؎

ظلم و استبداد کی جڑ ہے امارت کا غرور

رحم اگر باقی ہے تو افلاس کے ماروں میں ہے

مُفلس کی حالت دنیا میں کس قدر ناگفتہ بہ ہوتی ہے اس کا اندازہ شاذ و نادر ہی لگایا جاسکتا ہے رضا مفلس کی بدحالی کا نقشہ کس خوبی سے کھینچتا ہے یہ ایک عاشق اور مفلس میں مکالمے کی صورت میں ملاحظہ کیجیے ؎

عاشق نے کہا میں ہی بڑا صابر ہوں	مُفلس نے کہا صبر مرا رہبر ہے
عاشق نے کہا میں ہوں بڑا دشت نورد	مفلس نے کہا دشت تو میرا گھر ہے

غریبوں کے ساتھ آج تک جو سلوک ہوتا رہا ہے اور ہوتا ہے رضا اُس سے سخت نالاں ہے اور وہ ہرگز ہرگز اُس دن تک اِنتظار نہیں کرنا چاہتا۔ جب غریبوں کے ساتھ بے جا برتاؤ کی اِصلاح اپنے آپ ہوجائیگی۔ وہ اس بات سے بھی سخت مایوس ہے کہ روزِ اوّل ہی سے

نظامِ جہاں نے غریبوں کے ساتھ یہ ناروا سلوک روا رکھا ہے۔ مگر اس ظلم سے بہرہ ور ہونے بھی اس نظامِ غلط کی اصلاح کرنے کی جرأت نہیں کی ۔

یہی ابتدا سے نظامِ جہاں ہے کہ ہنستے ہیں جابر بلکتے ہیں مُفلس
ہیں جتنے بھی اسکو غلط کہنے والے کسی میں بغاوت کی ہمت نہ پائی

جس ملک میں بلحاظ آبادی غریبوں اور محتاجوں کی تعداد امیروں اور دولتمندوں سے کہیں زیادہ ہو وہاں حب الوطنی اور غریبوں سے محبت میں ایک گہرا رشتہ قائم ہو جاتا ہے اس لئے رضا بھی اس بات پر خوش ہے کہ ۔

کچھ دردِ مفلسی بھی ہے حُبِّ وطن کے ساتھ
کر شکر دل ہیں جو یہ نگینے جڑے گئے

جب کوئی اپنے آبائی گھر یا وطن کو کسی غیر ملک میں جا کر آباد ہونے کے لئے چھوڑتا ہے تو قدرتی طور پر اس کو بڑا صدمہ پہنچتا ہے۔ ذیل کا شعر رضا کے اس احساس کا ترجمان ہے جو اُسے قریباً بیس برس پہلے ہندوستان چھوڑ کر کینیا آنے کے فوراً بعد ہوا تھا ۔

غُربت میں دن گزارنے نکلے تھے ہم مگر
دو ہی قدم پہ آنے لگے اپنے گھر کے خواب

کپلنگ کو غیر ممالک کی سیاحت کے بعد کہنا پڑا تھا "جو صرف انگلینڈ کے نام سے واقف ہیں وہ انگلینڈ کی سرزمین کی خوبیوں کو کہاں جان سکتے ہیں" ورڈزورتھ اس سے بھی پہلے کہہ چکا تھا: میں نے انجان لوگوں میں سفر کیا جو سمندر پار ملکوں میں رہتے ہیں تب کہیں جا کر کُھلا کہ اے مادرِ وطن انگلینڈ! مجھے تجھ سے کتنی والہانہ محبت ہے ۔" رضا نے حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے دل کو اس طرح تسلی دی ۔

غربت میں رہ کے اور بڑھے گی وطن کی قدر ‎ ‎ ‎ ‎ اچھا ہوا رضا جو وطن سے نکل گیا

کچھ عرصہ ہندوستان سے باہر رہ کر وہ یہ لکھنے پر مجبور ہوا ۔ ؎

یوں مضطرب ہیں رہ کے ہم اپنے وطن سے دُور

جیسے تڑپ رہے ہوں عنادل چمن سے دُور

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ لوگ ایک ملک سے دُوسرے مُلک میں جا جا کر آباد ہوتے رہے ہیں آج کے زمانہ میں بھی ہر سال ہزاروں بلکہ لاکھوں انسان نہ صرف اپنی اطاعت قانوناً تبدیل کرتے پائے گئے ہیں، بلکہ اپنی دلی محبّت بھی غیر مُلک کیلئے وقف کرتے دیکھے گئے ہیں۔ ان حالات میں اپنایا ہوا ملک ہی احساساتِ حبّ الوطنی کو ظاہر کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے، چنانچہ رعنا نے مشرقی افریقہ (خصوصاً کینیا) کو بہت سی خوبصورت نظموں کا موضوع بنایا ہے قطعہ "اوروکینیا" "کینیا ٹاڈے" اور "صحرا" وغیرہ عنوانات سے نظمیں کینیا کے قومی ترانے کا ترجمہ اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں ۔ ایک نظم "بارش" میں جو ممباسہ کینیا میں کہی گئی تھی ذیل کا شعر ہندوستان کے حوالہ سے کہا گیا ہے ؎

کہ ساون کی گھٹا لائی ہے بارش

سندیسہ دیس سے آیا ہے ہم کو

مجموعۂ کلام میں کچھ اشعار ایسے بھی ہیں جو موشی۔ ٹانگانیکا میں کہے گئے تھے ۔ کلمنجارو KILIMANJARO (جو برّاعظم افریقہ میں موشی کے قریب سب سے اونچا پہاڑ ہے اور جو اپنی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں لئے ہوئے عظیم خودداری کے ساتھ ایستادہ ہے) کا حوالہ دیتے ہوئے رعنا کہتا ہے ؎

گھر پلٹ جاتا بہت پہلے ہی میں کھا کے شکست

کام آئی میرے خودداریِ کلمنجارو

رعنا کو کچھ سال ممباسہ میں بھی رہنا پڑا ۔ ممباسہ دُنیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ہے ۔ ابن بطوطہ نے چودھویں صدی میں اس کی سیاحت کی تھی اور واسکوڈا گاما پندرھویں صدی

میں اس سے ہوکر گزرا تھا۔ ملٹن نے اپنی مشہور تصنیف PARADISE LOST میں اس کا ذکر کیا ہے۔ مگر اب اس کی وہ پہلی سی شان وشوکت نہیں رہی اور نیروبی (جو ایک جدید شہر ہے) اس پر بدرجہا سبقت لے جا چکا ہے۔ رضا کا نیروبی واپس آنا ٹھہر چکا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ کسی وجہ سے اس کے پلٹنے میں دیر ہوگئی تھی۔ چنانچہ اُس نے اپنے احساس کو اس طرح سپردِ قلم کیا ہے ؎

کوئی دن اور ابھی ممباسے میں رہنا ہوگا

درِ نیروبی رضا تجھ پہ ابھی باز نہیں

ان نظموں کے علاوہ جن کا حوالہ میں نے اُوپر دیا ہے۔ مشرقی افریقہ پر رضا نے اور نظمیں بھی کہی ہیں جو مشرقی افریقہ کے لوگوں کے لئے خاص طور پر دلچسپی کا باعث ہونگی، کیونکہ ان کے لئے وہ منظر اور واقعات بالکل سامنے کے ہیں اور ہندوستان اور پاکستان میں پڑھنے والوں کے لئے بھی لُطف سے خالی نہیں ہونگی کیونکہ ان کی غلامی کے دنوں میں اس قسم کی شاعری مُطالبۂ آزادی کیلئے خاص طور پر کشش کا باعث ہوتی تھی۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء میں کینیا کے عظیم رہنما جوموکینیاٹا اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اس واقعے کو "... داخلِ زنداں ہونا" کے عنوان سے ایک پُرزور نظم میں بیان کیا گیا ہے۔ نظم اس طرح شروع ہوتی ہے ؎

کسے قیدی بنایا جا رہا ہے	قفس میں کون لایا جا رہا ہے
خُدایا یہ کہیں وہ تو نہیں ہے	یہ ہوگا کون اگر جومو نہیں ہے
وہی ہے جو رہے جا کا نشانہ	اُسی کا آج ہے گھر گھر فسانہ

شاعر آگے چل کر عالمِ حیرت میں پوچھتا ہے ؎

یہ کیا؟ کچھ ساتھ اسکے اور بھی ہیں؟	ستمگاری کے کشتے اور بھی ہیں؟

بلاشبہ اس کا اشارہ ایچنگ انیکو۔ بلڈاڈ گگیا۔ فریڈ کیباتی کنگو کرومبا۔ پال انگئی اور دوسروں کی طرف ہے جو جومو کینیاٹا (جو اس وقت کینیا کے پریسیڈنٹ ہیں) کے ساتھ بیک وقت گرفتار کر لئے گئے تھے۔ رضا کہتا ہے کہ وہ اپنی مادرِ وطن سے پیار کرتے ہیں اور وہ اپنی زندگیوں سے اتنا پیار نہیں کرتے جتنا کفن سے مانوس ہیں۔ وہ قومی سپرٹ کے درخشندہ ستارے ہیں، وہ شاہین ہیں جو قومیت کی بلندی پر پرواز کرتے ہیں۔ وہ جومو کینیاٹا کو قید کرنے والوں کو خطاب کرتے ہوتے کہتا ہے ؎

مگر اے صدق کو جھٹلانے والو — وہ انصاف سے ہٹ جانے والو
تمہارا وقت اب بالکل قریں ہے — یہ دن تھا دور لیکن اب نہیں ہے
کوئی پل میں طبیعت شاد ہوگی — یہ دھرتی ظلم سے آزاد ہوگی

اس کے ساتھ ہی ایک نظم اور ہے، جس کا عنوان ہے "قید سے رہائی اور طلوعِ آزادی" جسکے دو پہلے شعر اور آخری شعر اس طرح ہیں ؎

شہیدوں کی شہادت رنگ لائی — وطن سے اُن کی اُلفت رنگ لائی
ستمگاروں کی۔ لو۔ تقدیر پھوٹی — درِ زنداں کھلا تقدیر پھوٹی
نہ کیوں پلٹے گی اِس دھرتی کی کایا — رہیگا جس پہ کینیاٹا کا سایا

بارہ شعر کی ایک نظم میں خوبصورت جھیل نواشا کا بیان ہے۔ اس نظم کی زبان میں فارسیت زیادہ ہے۔ غالباً کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معنی پیدا کرنے کے لئے ایسا کیا گیا ہے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

دُور سے جیسے سیم کی چادر، جس کو جھنجوڑے موجۂ صرصر
دھوپ میں پانی جامِ منوّر، سبزۂ ساحل ارضِ مُصوّر

اور بھی بہت سی حب الوطنی سے متعلق نظمیں مجموعۂ کلام میں پائی جاتی ہیں ایک چھوٹی سی

نظم "اے ہم وطن" غالباً ہندوستان اور کینیا کی آزادی حاصل کرنے سے پہلے کہی گئی تھی۔
شدتِ جذبات کا اندازہ ذیل کے شعر سے لگایا جا سکتا ہے ؎

جس کے پھل کھا کے غلامی سے ہو نفرت تجھ کو
اپنی فطرت کے چمن میں وہ شجر پیدا کر

جھانسی کی رانی لکشمی بائی پر چونسٹھ شعروں کی ایک نظم ان واقعات کی ایماندارانہ قلمی تصویر ہے جو شجاعت اور بہادری کی تاریخی تحریرات میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ رہیں گے۔ خیالات کے سیلاب اور روزِ زبان و بیان میں اوّل سے آخر تک کہیں بھی کمی محسوس نہیں ہوتی۔
فیصلہ کن لڑائی کے دم بدم بدلتے ہوتے واقعات کو نہایت چابکدستی سے بیان کیا گیا ہے۔ زبان و بحر کو اس طریقے سے منتخب کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کی دلچسپی شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے، انجام کار یہ نظم صرف شاعری ہی کے لحاظ سے ایک کامیاب تخلیق نہیں ہے۔ بلکہ نہایت معقول اور موزوں اسٹائل کی بنا پر ہمیشہ زندہ رہنے کے قابل ہے۔
مجھے یقینِ واثق ہے کہ پڑھنے والے اس نظم سے اسی طرح لطف اندوز ہوں گے جس طرح میں ہوا ہوں۔ شروع و آخر نظم کے دو دو اشعار جو ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ نظم کا لبِ لباب حیرت انگیز اختصار اور جامعیت کے ساتھ پیش کرتے ہیں ؎

مُسلّم یہ بات ہے حیات بے ثبات ہے
قرار کس کو ہے یہاں رہی کوئی نہ شے یہاں

جہانِ بے ثبات میں بہادری کی بات میں
کسی کو جو قیام ہے وہ لکشمی کا نام ہے

ہیمو بقال ایک اور دلچسپ تاریخی نظم ہے، مگر ہیمو مرد تھا اور لکشمی بائی عورت۔ مزید براں ہیمو اُس دشمن سے جنگ آزما ہوا جو اَب مدّت سے بھلایا جا چکا ہے مگر لکشمی بائی نے اس

دشمن کے خلاف لڑائی لڑی جس پر فتح پانے کی کوششیں ۱۹۴۷ء تک جاری رہیں (حتیٰ کہ دشمن ہمیشہ کے لئے پسپا ہوا) اسی وجہ سے لکشمی بائی کے کارناموں کے تاثرات ابھی ہندوستانی ذہن میں جذباتی طور پر محفوظ ہیں۔ تاہم رضا کا یہ شعر ایک اہم واقعے کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ہندوستانی تاریخ کو ہیمو کی زندگی سے مربوط کرتا ہے ؎

نہ آنکھ میں تیر اس کے لگتا تو آج ہیمو کے ڈنکے بجتے
رضا مغل سلطنت کے پائے اُٹھے ہی ہیمو کی لاش پر تھے

"ہند کا سپاہی" کی بنیاد وہ واقعات ہیں جو ابھی ہندوستان کے بچوں کے دماغوں میں بھی تازہ ہیں۔ بلاشک و شبہ اس نظم سے ہر کوئی لطف اندوز ہوگا۔

رضا بار بار اپنے دل پسند موضوع (غریبوں اور مزدوروں کی ناگفتہ بہ حالت) کی طرف پلٹتا ہے: "رکشا کھینچنے والے" کو اپنی حالت سدھارنے اور غرورِ امارت کو ختم کرنے کی اس طرح ترغیب دیتا ہے ؎

تجھے میں جانوں گا اُس وقت جب تری ہمت | سرِ رعونت و بیداد کو کچل دے گی
کرے گی اونچا زمانے میں پرچمِ انصاف | ستم گری کے ہر آئین کو بدل دے گی

تقسیم ہندوستان کے بعد کینیا کے ہندوستانیوں کے امن میں بھی اکثر ایسی باتیں خلل ڈالتی رہی ہیں جبکہ ہندوستان اور پاکستان سے خواہ کتنا بھی تعلق ہو مگر کینیا کا دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ نام نہاد لیڈروں کی خود غرضانہ کارروائیوں نے یہ مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ کچھ ایسے ہی جھگڑوں کا عکس رضا کی شاعری میں ملتا ہے۔ ہندی اور اُردو کے سوال کے جواب میں وہ کہتا ہے ؎

ہندو ہے نہ مسلم ہے رضا مذہبِ اُردو
دونوں ہی کی آغوش میں یہ پھولی پھلی ہے

رعنا کے دوستوں کی ایک بڑی تعداد مسلمانوں کی ہے اور اس کی نظم "ہماری دوستی" اس دیرپا دوستی کی وضاحت کرتی ہے ؎

حیران نہ ہوں آپ کہ ہم دوست ہیں پھر بھی
گو نام ہے ہندو میرا اور اس کا مسلمان
جس دور کی آغوش میں ہم دوست بنے تھے
مذہب کے محافظ ابھی پیدا نہ ہوئے تھے

درحقیقت رعنا کا یہی زاویۂ نظر یہاں بھی موجود ہے ؎

رعنا حال کے ساتھ تم کیا چلوگے — تمہارا زمانہ ہے گذرا زمانہ

"شعلۂ خاموش" میں معرکۂ کربلا ولادتِ رسول" نعتیہ غزل" کی طرح کے عنوانات ایسے عقیدت مندانہ لکھے ہیں جو شاید ایک مسلمان سے بھی ان سے بہتر نہ کہے جا سکتے تھے۔ رعنا نے بیشک مسلمانوں کے اعتقادی رجحانات کو سمجھنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور نتیجۂ افکار کو نہایت ایمانداری سے صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے۔ عظیم مذہبی رہنماؤں سے اسکی محبت بھی بے انتہا ہے اور وہ ان کی تعریف و توصیف کا بے حد قائل ہے۔ رعنا کو اسلامی روایات اور رسومات سے بھی کماحقہ، واقفیت ہے ایک متعصب ہندو کے لئے یہ کہنا شاید دشوار ہے کہ

نظارہ کیا کرتے رہ رفتوں کا سفر میں کیا لطف ہم کو ملتا
بہشت سے ارض تک جب آئے فرشتے دم بھر کا بِ آئے

وہ ہو کے نادم آتے رعنا کے مزار پر
چپ چاپ اک چراغ جلا کر چلے گئے

مگر ہندو ہونے کے ناتے وہ اپنے مذہبی عقاید سے بھی ناواقف نہیں ہے ؎

حیات و موت سے ہوں خوب واقف — بہت اس راہ سے آیا گیا ہوں

یہ صیغہ واحد متکلم میں مسئلہ تناسخ کی طرف اشارہ ہے۔

پیشتر اس کے کہ ہم رضا کی خیالی اور دقیق شاعری کی طرف متوجہ ہوں آؤ ہم اُسکے اُن اشعار کو بھی دیکھیں جو زندگی کے اُس عظیم الشان عہد پر کہے گئے ہیں جسے جوانی کہتے ہیں اور جس پر شعرا نے زیادہ تر دھیان دیا ہے وہ کہتا ہے ؎

جواں نظروں میں سب کچھ جاوداں ہے
یہ کس نے کہدیا فانی ہے دنیا

عہد جوانی اس قدر تیز رفتاری سے گزر جاتا ہے کہ پیشتر اسکے کہ انسان اُسکی خوبصورتی اور صحیح امکانات کو پہچانے یہ ہوا ہو چکا ہوتا ہے۔ خصوصاً شاعرانہ صلاحیتیں شباب کو اس وقت تک نہیں محسوس کر پاتیں جب تک کہ یہ ڈھل نہ جائے اور تب کسی قسم کی آہ وزاری بھی گزرے ہوئے شباب کو واپس نہیں لا سکتی۔ رضا نے بھی یہ شعر اُسوقت کے لئے فکر کئے ہیں جب وہ بوڑھا ہوگا ؎

جس میں نظر جوان تھی ہر شے حسین تھی
یارب کہاں گیا وہ زمانہ شباب کا

جوانی کی خوشی کے بعد ہی زحمت ہے پیری کی
اگر کوئی رلاتا ہے ہنسا کر تو یہی دُنیا

میرے خیال میں یہ اچھا موقع ہے کہ رضا نے جس پہلو سے عام انسانی زندگی کو دیکھا ہے اس پر بھی کچھ نظر ڈال لی جائے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ انسان جسے ہموار خوشحالی اور کامیاب زندگی میسّر آئی ہے وہ انسانی زندگی کے مبتدا و خبر کو جاننے کی کبھی کوشش نہیں کرتا ؎

جوانی ہی میں مٹانی ہے دُنیا
خوشی میں کس نے پہچانی ہے دُنیا

اڑی جاتی ہے کشتی زندگی کی　　　محبت ناخدا پانی ہے دنیا

اور ایسے انسان کے لئے عشق کرنا (بازاری عشق نہیں) شرطِ اوّل ہے کیونکہ اخیرِ زندگی میں زندگی کو سمجھنے یا نہ سمجھنے میں کوئی فرق نہیں رہتا کیونکہ انسان فنا ہو چکا ہوتا ہے،

فنا ہوتے تو انساں ہی کو دیکھا
جو سچ پوچھو تو لافانی ہے دنیا

انسان کا اوّل و آخر کوئی نہیں جانتا ہے

نہ پوچھو آدمی کی ابتدا اور انتہا کیا ہے
یہاں دانا بھی چکر میں ہے دیوانہ تو دیوانہ

کیا جانے ہم آئے کہاں سے اور کہاں جانا ہے ہمکو
کیا جانے کیوں قدرت نے بھی بے بہرہ رکھا عالم کو

اگر انسان کیلئے کوئی مقرّرہ منزلِ مقصود ہو بھی تو کیا ہے

پہونچیں گے ہم جب منزل پر دیکھیں گے کیا پائیں گے کیا
منزل پر تو جا پہونچے ہیں واپس بھی ہم آئیں گے کیا

یہ بات انسان کے مقدّر کا کوئی صحیح اِمتحان ہونا خارج از بحث کرتی ہے۔ ہو سکتا ہے ہمارا مقدّر محض اپنی شکل ہی تبدیل کر لیتا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ دنیا و مافیہا ایک بے آغاز و انجام سمندر ہو اور اِنسان اس سمندری زندگی کی معمولی اور دھندلی شکلوں کی طرح ہوں جو سمندر ہی کی محدود فضا میں پیدا ہوتے ہوں۔ وہیں عرصۂ زندگی طے کرتے ہوں اور مر جاتے ہوں۔ بظاہر ایک ہی مقدّر ہے جو انسان کے حصّہ میں آیا ہے جیسا کہ سر آرتھر کیتھ نے بھی کہا ہے "جب ہم مر جاتے ہیں تو ہم ختم ہو جاتے ہیں اور بس" اصل موضوع سے یہ محض ذرا سا انحراف تھا۔ رضا جیسا کہ اُوپر کے شعر سے ظاہر ہے آواگون کے مسئلہ کو تسلیم کرتا ہے۔

جسکا مطلب یہ ہے کہ انسانی جسم فنا ہو جاتا ہے اور روح کا وجود قائم رہتا ہے۔ مگر باوجود اس کے زندگی پھر بھی ایک راز ہی رہتی ہے ؎

راز یہ واعظ نے بھی نہ کھولا اور آیا جامِ مے نوش

مگر ایک بات جو یقینی ہے وہ یہ ہے ؎

آج تک اتنا جانا ہم نے سب ہی جائینگے روپوش

ایک اور بات بھی یقینی ہے اور وثوق سے کہی جا سکتی ہے وہ یہ کہ امیر اور غریب، پارسا اور رند، قانون ساز اور قانون شکن سب ایک ہی منزل (یعنی موت) سے ہمکنار ہونگے ؎

ایک ہی منزل ہے ان سب کی مست ہے وہ یا ہے باہوش

راہ رووں میں سب شامل ہیں شاہ و گدا و خانہ بدوش

اگر انسان کی ہستی ایک حقیقت ہے اور (آواگون کے مسئلہ کے مطابق) مسلسل ہے تو موت اس سلسلہ دار حیات میں محض ایک منزلِ تغیر ہے، مگر بظاہر موت بھی اتنی ہی حقیقی ہے جتنی کہ ہستی بلکہ بعض حالتوں میں موت اسقدر حقیقی ہے کہ ہستی اس کا سایہ معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح موت کو بھی ہستی کا سمندر کہا جا سکتا ہے، کیونکہ یہ نہ ختم ہونے والی سلسلہ وار زندگی کا منبع ہے۔ اس طرح موت ایک ایسا موضوع بن جاتا ہے جو زندگی کے موضوع سے زیادہ دریافت کئے جانے کے قابل ہے۔ رضا ایک جگہ کہتا ہے۔

حیات ملتی ہی اسلئے ہے کہ موت سے آشنا ہو انسان

زندگی اور موت اگرچہ ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتی ہیں مگر بیک وقت موجود رہتی ہیں۔ ایک نہایت دلکش نظم میں رضا زندگی کی بہت سی تردیدات CONTRADICTIONS اور ہم وجود CO-EXISTING حقیقتوں کی فہرست پیش کرتا ہے۔ بہار اور خزاں، شب اور چاندنی، رنج اور غم، حیات اور موت، گل اور خار، حسن کے تیروں کا انہیں آنکھوں سے چھوٹنا

جن آنکھوں سے محبت ٹپکتی ہے وغیرہ وغیرہ مگر سب سے بڑا تضاد اس کی نظروں میں وہ ہے جہاں انسان موت کو نہ ٹلنے والی جانتے ہوئے بھی زندگی سے بے انتہا پیار کرنے سے باز نہیں آتا۔ شاعر صرف اس مجموعۂ اضداد کی طرف توجہ دلاتا ہے مگر ان کی وضاحت نہیں کرتا اس تے وہ اپنی نظم کو "پرسشِ ناتمام" کا نام دیتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ زندگی بغیر تضاد کے نامکمل ہے ؎

لفظِ غم اس میں نہ ہوتا درج تو اے ہم نشیں
نامکمل رہ گئی ہوتی لغاتِ زندگی

حقیقی و مجازی اور متناقص و ہم وجودی چیزوں پر بحث کر چکنے کے بعد شاعر ہوش و بے ہوشی کے امتیاز کو بیان کرتا ہے۔ مشرقی فلسفے میں ایک قدیم روایت چلی آتی ہے۔ جو شاید سب سے پہلے کینا اپنشد میں ریکارڈ کی گئی ہے۔ پنڈت گنگا پرشاد نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

"ہم میں سے وہ جو کہتا ہے کہ وہ اس کو (خدا کو) اچھی طرح سے جانتا ہے وہ دراصل اس کو نہیں جانتا ہوتا مگر وہ جو یہ کہتا ہے کہ وہ اس کو (خدا کو) اچھی طرح سے نہیں جانتا وہ دراصل اسکے راز سے واقف ہے"۔ اس اقتباس کو ذہن میں رکھتے ہوئے رضا کے ان اشعار کی اچھی طرح داد دی جاسکتی ہے۔

کچھ نہیں ہے ہوش و بے ہوشی میں فرق
ہے اسی کو ہوش جو بے ہوش ہے
ہوش جسکو ہے نہیں ہے اس کو ہوش
اور جو بے ہوش ہے ہشیار ہے

یہ طرز بیاں ایک الجھاؤ سا پیدا کر دینے والا ہے مگر کینا اپنشد کے بیان سے زیادہ الجھاؤ پیدا نہیں کرتا۔ اپنشد کا مشہور اور فاضل مصنف فلسفہ یا دینیات پر بحث کر رہا تھا اور کوئی اُسے سادہ اور صاف طرزِ بیان اختیار کرنے میں مانع نہیں تھا۔ مگر اس کے برعکس شاعر کو معانی

اور زبان دونوں کا خاص دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ فکر کرنے کے بعد وہ طرزِ تحریر پر زیادہ توجہ دے وہ ایک ایسا مضمون پیش کرنا چاہتا ہے جسے سب رغبت سے پڑھ سکیں اس لئے وہ ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جن کا فوری اور مکمل اثر ہو۔ بعض اوقات اس کوشش میں وہ اُن تراکیب یا الفاظ کا استعمال کر جاتا ہے جن کو فوری طور پر سمجھنا ذرا دشوار ہو جاتا ہے ANTHOLOGY OF MODERN ENG. POETRY کا ایڈیٹر لکھتا ہے کہ جدید شاعری میں ایک خاص مشکل یہ ہے کہ اس میں وہ نظم جو بظاہر شروع میں غیر واضح معلوم ہوتی ہے بعد میں ایسی پُر معنی ثابت ہوتی ہے کہ ہم اُسے اپنی ادبی زندگی کا سرمایہ بنا سکتے ہیں" ہاپکنس بار بار تلقین کرتا ہے کہ اس کی نظمیں خصوصاً جو پیچیدہ ہیں بلند آواز سے پڑھی جائیں۔ اسی طرح ایک جدید نقاد مرّی نے کہا ہے کہ "میں پہلے پہل ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی شاعری سے اسی وجہ سے متعارف ہو سکا تھا کہ کسی نے اس کی نظمیں مجھے بلند آواز سے پڑھ کر سنائی تھیں۔ اس طرح میں نے شروع ہی میں نظموں کی مٹھاس اور معانی کو محسوس کر لیا تھا، اور مجھے شعر میں کو دلیل کے ترازو پر تولنا پڑا تھا، جس سے روحِ شاعری ضائع ہونے سے بچ گئی تھی"

جو نظمیں دشوار معلوم ہوتی ہیں وہ محض خارجی طور پر غیر واضح ہوتی ہیں ورنہ شاعر ہرگز ہرگز بے معنی لفظوں کے گورکھ دھندے تخلیق نہیں کرتا۔ اُوپر کے ملاحظات رضا کے اُن اشعار کو واضح کرنے میں معاون ثابت ہونے چاہئیں جو ممکن ہے کہیں کہیں الجھن پیدا کرتے ہوں۔ اگرچہ رضا کی نظمیں عام طور پر بہت سادہ اور سلیس زبان میں لکھی گئی ہیں۔

شعراء کے ہاں اکثر نفس SELF اور جذباتی نفس EMOTIONAL SELF میں امتیاز روا رکھا جاتا ہے۔ رضا نفس کو "میں" اور جذباتی نفس کو "دل" کا نام دیتا ہے۔ یہ تقریباً اسی قسم کا امتیاز ہے جو عام طور پر دل اور دماغ کے لئے برتا جاتا ہے جیسے اقبال نے عقل اور عشق کے طور پر استعمال کیا ہے۔ رضا کہتا ہے۔

کبھی مل کے ہم فیصلے پر نہ پہونچے
کبھی میں نہ مانا کبھی دل نہ مانا

عموماً شعراء اپنے اساتذہ سے اپنا مقابلہ کرنا پسند نہیں کرتے تاہم اگر رضا کو ناگوار نہ ہو تو اس کے اُستاد جوش ملسیانی کا ایک شعر پیش کرتا ہوں ؎

بحث میں دونوں کو لطف آتا رہا
مجھ کو دل، میں دل کو سمجھاتا رہا

مگر یہ مسلّمہ معلوم ہوتا ہے کہ نفس یا ذہن کی سرزنش کی اتنی ضرورت نہیں ہے مگر دل پر قابو پانا اشد ضروری ہے ؎

ضبطِ دل کے بغیر اے واعظ   صوم بے فائدہ وضو بے کار

اگر دل قابو میں نہیں تو ہر جذبہ بے لگام ہو جاتا ہے، کیونکہ دل میں ایسا کوئی قدرتی آلہ نہیں ہے جو جذبات کو اپنے آپ لگام دے سکے۔ چونکہ دل کا پیار اور محبت کی نسبت نفرت اور غصّہ کی طرف زیادہ جھکاؤ رہتا ہے۔ اس باعث سے دل پر قابو پانا اور بھی ضروری ہے ؎

نفرت و غصّہ کا طوفان اُٹھانا آسان
دلِ انساں میں محبّت کا جگانا مشکل!

شعراء کے نزدیک دل بڑا ضدی واقع ہوا ہے۔ اس کا نفرت و غصّہ کی طرف جھکاؤ کم و بیش قائم ہی رہتا ہے۔ اگر اس کو قابو میں نہ رکھا جائے (جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے) تو یہ اپنے آقا کے حالِ بد کا اوٹس کی طرح خوب تمسخر اُڑاتا ہے۔ رضا اس قسم کی حالت میں کہتا ہے ؎

اے دل کوئی دن ہنس لے مرے حال پہ تُو بھی
تجھ سے بھی نپٹتا ہوں میں قسمت سے نپٹ کر

اگرچہ رضا قسمت کی کوئی تعریف بیان نہیں کرتا تاہم اس کے خیال میں قسمت کی شاید یہی

تعریف ہے جو اینڈریو مارول نے سترہویں صدی میں ہمیں دی تھی۔ وہ شکایت کرتا ہے کہ قسمت عاشق و معشوق کے درمیان لوہے کی سلاخیں ڈال دیتی ہیں اور ہمیشہ خود کو انکے درمیان کھڑا رکھتی ہے۔ ٹامس سٹینلے کہتا ہے کہ "قسمت جس چیز تک رسائی نہیں ہونے دیتی محبت کو اس کے حصول کی اُمید نہ رکھنی چاہیئے۔" ہنری کنگ بھی قسمت کے ساتھ برسرِ پیکار ہونا چاہتا تھا، مگر وہ جانتا تھا کہ یہ جنگ اس میدان میں لڑی جائے گی جہاں سے کوئی فتحیاب ہو کر نہیں پلٹا۔ مگر رضا کا دلِ گستاخ سے نپٹنے سے پہلے قسمت سے معاملہ طے کرنا اُس عزم کی یاد دِلاتا ہے جو زندگی کی مشکلات کے خلاف سخت جدوجہد کیلئے اشد ضروری ہے ؎

هم وہ نہیں جو بھاگ کے ساحل پہ لیں پناہ
موجوں کے ساتھ ساتھ لڑیں گے بھنور سے ہم

قسمت اور اُس کے خلاف جنگ کے موضوع پر دینیات کے مزاج کی تاریخ میں ایک لگاتار بے ربطی پائی جاتی ہے۔ جب انسان اپنی زندگی کی کامیابی اور ناکامی کو کسی حساب میں نہیں لا سکتا تو اُسے قسمت کا نام دے دیا جاتا ہے۔ عموماً انسان صرف اس چیز کے حصول کے لئے آمادہ ہوتا ہے جو اُسے حاصل ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ مگر کچھ لوگوں کا اِرادہ ایسا آہنی ہوتا ہے کہ وہ اس چیز کو بھی حاصل کر لیتے ہیں جسکا حاصل کرنا ناممکنات میں گنا جاتا ہے۔ ایسا سمجھا جاتا ہے کہ قسمت کے خلاف وہی جنگ آزمائی کر سکتے ہیں اور وہی قسمت کے فیصلے کو آخری فیصلہ نہیں مانتے جو ایسی قوّتِ ارادی کے مالک ہوتے ہیں جو ہر قسم کی رکاوٹ سے آزاد ہو (جیسے سادھو سنیاسی فقیر وغیرہ) جا دبے جا سے ہمیں بحث نہیں رضا بھی انجام کار رضائے خدا کے حق میں دست بردار ہو جاتا ہے کہتا ہے ؎

اگر تو خوش ہے اسی میں تو میں بھی راضی ہوں | میں تیری قید میں بے آب و دانہ اور سہی

تاہم وہ رضائے خدا کی اطاعت کچھ جھجکتے ہوئے قبول کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے اگر خدا کی یہی مرضی ہے تو وہ (رضا) اپنی موجودہ حالت میں رہنے کے لئے تیار ہے مگر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مجھے اور مدت کے لئے اس کی قید میں تب بے آب ودانہ" رہنا پڑے گا۔ اقبال کا شکوہ" اس موضوع پر ایک شاندار مقالہ ہے۔ رضا کا یہ شعر بھی اس موضوع سے متعلق ہے

بدل لوں کس طرح میں حال اپنا
عنایت یہ مرے مولا نے کی ہے

مگر درحقیقت خدا ہے کیا چیز ؎

ترا بھید کوئی نہ پا سکا نہ مقام کوئی بتا سکا
نہ نظر کسی کو بھی آ سکا جو خلا نہاں ہے حُبب میں

رضا کہتا ہے کہ خدا کے وجود کا راز اس خلاء کی طرح ہے جو حباب کے اندر موجود ہے یعنی جس کی موجودگی ہم صرف جانتے ہیں۔ دیکھ نہیں سکتے، اگر دیکھنے کی کوشش کریں تو حباب ٹوٹ جاتا ہے اور بجز شکستِ حباب کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

فقط شاعر کا خدا ہی راز میں نہیں ہے بلکہ انسان کے اپنے کام بھی اکثر راز دارانہ ہیں۔ وہ ہر چیز کا اندازہ اپنے معیار اور اپنی ضرورت کے مطابق کرتا ہے۔ سوامی رام تیرتھ اپنے آپ کو دنیاوی انسان خیال کرتا رہا تاوقتیکہ وہ سنیاسی (فقیر) نہ ہوگیا اور اس کے بعد اُسے دنیا کے وجود اور عدم وجود کی پرواہی نہیں رہی۔ لگ بھگ یہی احساسات ہمارے شاعر کے ہیں ؎

جب بے سروساماں تھا تو شہر دل کی طلب تھی
اب باسروساماں ہوں تو صحرا کی طلب ہے

مگر اس ذہنی کشمکش کا انحصار "اطمینانِ دل" پر ہے جو رضا کے خیال میں عشق کی آغوش میں حاصل

کیا جا سکتا ہے ؎

حکومتِ دل کو رضا عشق کی پناہ میں ڈھونڈھ

یہیں قرار کے سامان پائے جاتے ہیں

اب ہم محبت کے موضوع پر آتے ہیں جو سب شعراء کے لئے (مستورات شعراء کے لئے بھی) دشوار ترین گھاٹی ہے۔ حالی نے کہا ہے ؎

گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے

جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

رُوپرٹ بروک بھی یہی شکایت کرتا ہے کہ اُن کے (شاعروں کے) گیت گندے اور مایوس کن ہوتے ہیں اور ان میں کھوکھلی محبت بھری ہوتی ہے۔ اب ملاحظہ کیجئے کہ رضا کی شاعری تنبیہ بالا کی موجودگی میں کیا پیش کرتی ہے۔ اگرچہ اُسنے (شاید نادانستہ) حالی کی شکایت کا تو جواب دے دیا ہے ؎

اچھا ہوا کہ ہم کو جہنم ہوا نصیب

ہر اک گناہ آتشِ دوزخ میں جل گیا

اس نے رضا کو دوزخ کی آگ میں جلنے دینے کی دھمکی عاشقانہ شاعری سے باز نہیں رکھ سکتی وہ لکھتا ہے ؎

ہمارا پیکرِ تصویر بن کے رہ جانا

تمہارا آنکھوں ہی آنکھوں میں بات کہہ جانا

وہ رند ہوں کہ نہیں حاجتِ خُم و مینا

نظر کا جام ہی کافی ہے میکشی کیلئے

اب اس شعر کا مقابلہ گھانا کی ایک شاعرہ اکواہ للواہ (افسوس وہ اب اس دُنیا میں نہیں ہے)

کے ان افکار سے کیجئے۔

"وہ (میری محبوبہ) کھجوری شراب کو جو بے احتیاطی میں کھجور کے درخت کے ہونٹوں سے پھسل جاتی ہے، لیکر آئی لیکن اُن بے شمار نعمتوں کا جو اُس نے آنکھوں کے ذریعے مجھ تک پہنچا دیں تھیں کون اندازہ لگا سکتا ہے۔"

میں یہ نہیں کہوں گا کہ دونوں میں سے کون اچھا ہے۔ دونوں ہی میں جوہرِ شاعری بدرجہ اتم موجود ہے۔ مجھے اگر اعتراض ہے تو یہ ہے کہ اگر ہوٹل کی ہر ایک ویٹرس WAITRESS یا ہوائی جہاز کی ہر ایک ہوسٹس HOSTESS ہر گاہک میں احساس عشق پیدا کر دے تو محبت ایک ایسا تلاطم پیدا کر دے گی جو یقیناً سکونِ دل کے منافی ہو گا۔

بحرِ محبت میں اور گہرا جانے سے پہلے اور ذرا سا موضوع سے ہٹ کر میں رضا کی اس نظم کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں جو اُس نے "بیوی سے شکوہ" کے نام سے لکھی تھی۔ جو ضرورت سے زیادہ دیر میکے میں رہی اور وعدہ کے مطابق تاریخ مقررہ پر خاوند کے گھر نہیں آئی۔ (اس نظم سے ہرگز ہرگز یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ رضا کی اپنی اہلیہ سے کسی قسم کی ناچاقی ہے۔ یہ محض تخیل ہے) رضا نے اسے شاملِ کتاب کیا ہے اور اُسے چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ یہ نظم نہایت سادہ زبان میں ہے اور شاعرانہ اور بناوٹی آرائش سے پاک ہے، دلچسپی رکھنے والے اصحاب کتاب میں یہ نظم پڑھ سکتے ہیں۔ اس نظم کے موضوعی تقابل کے لئے انگریزی شعراء میں جان ہاسکنز کی ABSENCE رچرڈ لویس کی

TO LUCASTA GOING TO THE WAVES

جان ڈان کی مشہور نظم کا آخری بند LET NOT THY DIVINING HEART ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

شاعرانہ تخیل نے رضا کے جوان کندھوں پر کسی بوڑھے پختہ کار کا سر رکھ دیا ہے،

اور وہ اپنے آپ کو عہد شباب کو پیچھے چھوڑ کر بہت آگے نکل آیا سمجھتا ہے ؎

اِک نازو اَدا کی موج سی تھی دم بھر کو اٹھی پھر بیٹھ گئی

تم جس کو جوانی کہتے ہو ہم نے وہ زمانہ دیکھا ہے

جوانی چند روزہ یا جلد گزر جانے والی ہو تو ہو مگر محبت ایسی چیز نہیں ہوتی۔ ہمارا شاعر محبت کو یہ منصب عطا کرتا ہے ؎

اے عشق ترے راز کو ہم سمجھے تو اتنا

پہونچا جو تیرے در پہ وہ آیا نہ پلٹ کر

ٹامس کیرؔیو بعینہٖ یہی کہتا ہے "سچی محبت اپنے مقام کو کبھی نہیں بدلتی اور نہ ہی سچی محبت کرنے والے کو کبھی پسپائی کی ضرورت پڑتی ہے۔" محبت یا عشق کے آثار آہیں اور فریادیں ہی ہوتی ہیں ؎

روتے روتے تھک گئے ہم رُک رُک کے دم آنے لگا

ہچکیوں نے آ کے ٹکڑے کر دئے فریاد کے

داغِ دل پھول۔ اشک شبنم۔ رنگِ یاس

میری ہستی سربسر گلزار ہے

چند یہ بھی ہیں شرائط عشق کی

دم گھٹے۔ نالے اُٹھیں۔ آنسو بہیں

جان ڈانؔ بھی اپنی نظم LOVERS' INFINITENESSE میں کچھ اسی طرح کے خیالات کا اظہار کرتا ہے "تجھے خریدنے کے لئے میں نے وہ سب خزانہ صرف کر دیا جو لفظوں، قسموں، آہوں اور آنسوؤں پر مشتمل ہوتا ہے۔" مگر ایسا لگتا ہے کہ آہیں اور آنسو محبت کی آگ کو نہیں بجھا سکتے رؔضا کہتا ہے ؎

غم کی تپش نے پھر گرمایا آج مرے ارمانوں کو
جلنا بند نہیں ہوتا ہے دل کے آتش دانوں کا

یہاں شاعر غم کی گرمی اور دل کی بھٹی کا بیان کرتا ہے۔ متعدد انگریزی شاعروں نے اسی طرزِ فکر کو اپنی نظموں کی بنیاد بنایا ہے۔ لارڈ ہربرٹ "آتشِ عشق" کا ذکر کرتا ہے، اور ٹامس کیریو کہتا ہے کہ "اگر کوئی کمزور، زرد جسم (عاشق) نفرت اور بے التفاتی کے عالم میں اپنی گرمی قائم نہیں رکھ سکتا اور کاغذ کی آگ کی طرح جل کر دم زدن میں بجھ جاتا ہے تو وہ عاشق کہے جانے کا حقدار نہیں" آگے چل کر اسی نظم میں وہ "معزز شعلہ" "مقدس شمع" "(عاشق کی) راکھ" وغیرہ کا ذکر کرتا ہے۔ ٹامس سیٹلے اپنی نظم THE REPULSE میں لکھتا ہے۔ "یہ نہیں کہ تیرے شعلے مجھے جلا نہیں سکیں گے بلکہ تو یہ جان لے کہ اس سے پیشتر کہ یہ آگ مجھے جلا دے میں خود ہی اپنے آپ کو راکھ میں تبدیل کر لوں گا" ہنری کنگ اپنی نظم میں اپنے عشق کے شعلے کی عظمت" کا ذکر بڑے فخر سے کرتا ہے۔

فنی نقطۂ نگاہ سے رضا کی شاعری کے متعلق اتنا ہی کہدینا کافی ہے کہ وہ ابوالفصاحت جوش ملسیانی صاحب کا شاگرد ہے جو موجودہ زمانے کے صفِ اول کے شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں اور زبان و فنِ سخن کے مسلمہ اُستاد ہیں اور یہ گویا رضا کے کلام کے فنّی لحاظ سے صاف و پاک ہونے کی از خود ایک سند ہے۔ میں نے پچھلے سولہ سترہ سال میں بڑی دلچسپی کیساتھ رضا کی شاعری کو پھلتے پھولتے اور ترقی کے مدارج طے کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں اُس محنت کو اچھی طرح جانتا ہوں جو اُس نے اپنے اُستاد کی براہِ راست رہنمائی میں کی اور اس کے اس کلام سے بھی خوب واقف ہوں جو اُس نے اپنے اُستاد کی روایاتی مگر عقیدت مندانہ شاگردی کرنے کے بعد کہا۔

اُردو کے وطن سے تقریباً بیس سال کی مسلسل غیر حاضری کے باوجود رضا کی

زبان سلیس درست سادہ اور پاکیزہ ہے اور یہ بات ایک معجزے سے کم نہیں۔ اس کے اُستاد قبلہ جوش ملسیانی جہاں اُستاد حضرت داغ دہلوی کے شاگردِ رشید ہیں اور زبان کی صحت و صفائی کے سختی سے پابند ہیں۔ قبلہ جوش کے متروکات کی فہرست بہت لمبی ہے اور اس راہ پر آسانی سے نہیں چلا جا سکتا ہے مگر رضا ہمیشہ بلحاظ زبان و فن اپنے اُستاد کی ایماندارانہ پیروی کرنے کی کوشش کرتا ہے اور خود بھی زبان کے درست اور سادہ رکھنے میں پکا یقین رکھتا ہے مگر وہ ہرگز ہرگز تنگ نظر، مدعیِ فضیلت اور بے جا نظریہ پرست نہیں ہے وہ ہمیشہ اس اصول کو مدِ نظر رکھ سکتا ہے کہ کوئی اس کے کلام کو پڑھے گا اور اس سے لُطف اندوز ہوگا۔

مجموعۂ کلام میں جو اس وقت پبلک کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے، رنگا رنگ کے موضوعات شامل ہیں جو مختلف بحروں اور نرالے اندازوں میں بیان کئے گئے ہیں۔ اُن میں غزلیں، گیت، انگریزی نظموں کے ترجمے مقامی تاریخی اور دورِ حاضرہ کی نظمیں، قطعے رُباعیاں (رُباعی کے مخصوص اوزان میں) سب شامل ہیں۔

اُردو شاعری میں قافیہ ایک خاص مُقام رکھتا ہے۔ غیر مُقفّےٰ نظمیں گو کبھی کبھی لکھی جاتی ہیں مگر مقبولِ عام نہیں ہیں۔ شاید اسی وجہ سے شعراء کے دواوین میں اس قِسم کی نظمیں کم ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔ رضا قافیوں کو بڑے مؤثر انداز میں استعمال کرتا ہے۔ جو اس کی غزلوں سے ثابت ہے اور جن سے پڑھنے والے یقیناً حظ اُٹھائیں گے

ایک یقینی خاصیت جو رضا کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ وہ اس کے طرزِ بیان کی صفائی اور سادگی ہے، یعنی اس کے "کیا کہا" اور "کِس طرح کہا" میں کوئی شک اور فاصلہ نہیں ہے۔ دیکھئے ذیل کے شعر ؎

وہ اپنے حسن پر نازاں میں اپنے عشق پر نازاں

اُمیدِ صلح بالکل رائیگاں معلوم ہوتی ہے

مرے حق میں دُعا یہ کس نے کی ہے

خلش غم کی جو کچھ تھمنے لگی ہے

چھوڑ چکا ہوں میکدہ توڑ چکا ہوں جامِ مے

واعظ جنابِ شیخ کا اب بھی ہے بار گوش پر

آنکھوں سے شرافت بھی رقصاں منہ سے ہمدردِ زمانہ بھی

فریاد یہ ہے کس کی لیکن ہر کان کو بہرا دیکھا ہے

جینے کی آرزو میں چلا ہے تو چل مگر

ہستی کو بھی سمجھ یہ ہے دھوکا سراب کا

بڑے خلوص سے اس کو قبول کرنا تھا

مرا سلام غرض مند کا سلام نہیں

رُک نہیں سکتی کبھی عمرِ رواں

چیز ہے یہ جانے والی جائے گی

اگر بندگی میں عقیدت نہ ہوگی وہ ہنگامہ ہوگا طریقت نہ ہوگی

زر اگر پاس بھی ہے چین کہاں ملتا ہے غنچۂ دل تو فقط صبر ہی سے کھلتا ہے

رضا جو بُت تراشتا ہے وہ اصلیت کے بہت قریب ہوتے ہیں محض خیالی نہیں ہوتے مندرجہ ذیل شعر میں صبح، پھول، شبنم اور سورج کا بیان دیکھیے ؂

کیا خوب تماشا ہے شبنم نے گہر اپنا

سورج کے بھرو سے پر پھولوں کو سنبھالا ہے

الفاظ کا انتخاب احتیاط سے کیا گیا ہے اور وہ مِل کر ایسی تصویر کھینچتے ہیں جو مستقل ہے۔ اگرچہ شاعر نے شبنم کے موتیوں کو جس مضحکہ خیز صورتِ حال میں لا پھینکا ہے اُس سے طبیعت کو رنج پہنچتا ہے مگر شاعر کا مقصد بھی یہی ہے۔

جب رضا کے تخیّل کی جولانیاں عام الفاظ کو پُرگداز بخشتی ہیں۔ تو پڑھنے والے پر عجیب کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ذیل کے دو شعروں میں وہ (پہلے میں سورج کی اور دوسرے میں چاند کی) نیچرل روشنی کو انسانی حُسن کی تابندگی سے تعبیر کرتا ہے ؎

پھیکا جو پڑ گیا ہے جمالِ آفتاب کا
گوشہ اُٹھا ہے آج یہ کس کی نقاب کا

اِک چاندنی سی جیسے فضا میں بکھر گئی　　حُسن و جمال اس پہ تبسم سازِ لب

رضا اپنے آپ کو کہیں کہیں استعاری اور مجازی معنوں میں فخرِ میخانہ، رندِ بے مثال خاک نشین اور شعلۂ خاموش کے نام دیتا ہے اور اس کی شاعری کا یہی بہترین اور حقیقی خلاصہ بھی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کی یہ خواہش ہے کہ اس کی شاعری ہر قسم کے تعصب اور تکبّر کی آلائش سے پاک ہو اور اس کی ہر بات مدلّل ہو اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کا مجموعۂ کلام اس کی خواہش پر پورا اُترتا ہے۔

چانن سنگھ

۱۷ر جنوری سنہ ۱۹۶۸ء

ساؤتھ "C" ۱۰۔ انڈمان روڈ نیروبی کینیا

شورشِ پنہاں

مقدّمہ

ڈاکٹر صفدر آہ سیتاپوری

تمام فنونِ لطیفہ کی طرح شاعری کے لیئے بھی بھرپور توجہ، خلوصِ فکر، اور حضوریٔ قلب بے حد ضروری ہے۔ شاعر اگر شعر دل و جاں سے نہیں کہتا اور شاعری کو صرف دفع الوقتی کا ایک مشغلہ سمجھتا ہے تو اس کا کلام، کلامِ موزوں تو ہو سکتا ہے لیکن اِس قسم کی تخلیقات کے لیئے ادب میں کوئی جگہ نہ ہوگی۔ شعر کے لیئے یہ مقولہ بالکل درست ہے کہ "از دل خیزد بر دل ریزد"۔ یہ دل ہی کا طلسم خانہ ہے جس کی غیر مرئی اور غیر محسوس لہریں شاعر کے دِل کا تاثّر دوسروں کے دِلوں تک پہنچا دیتی ہیں۔

اِس سراپا حقیقت نظریّے کو پیشِ نظر رکھ کر جب ہم —— کالیداس گپتا رضا کے مجموعۂ کلام شورشِ پنہاں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں بلا شبہ اُن کی عظمت کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ ابھی سالِ گذشتہ ہی کی بات ہے کہ رضا کا ایک ضخیم مجموعہ شعلۂ خاموش ہمارے سامنے آچکا ہے اور آج صرف ایک سال میں پھر تقریباً اُتنا ہی بڑا مجموعہ زینتِ نظر ہو رہا ہے۔ مجھے نہیں یاد آتا کہ آج کل کا کوئی شاعر سال بھر کی قلیل مدّت میں اپنا نیا مجموعۂ کلام پیش کرنے کی جرأتِ رندانہ کر سکا ہے۔

رضا قطعاً ایک باصلاحیت شاعر ہیں لیکن اُنھوں نے بیس سال کی عُمر میں وطن چھوڑا تھا اور آج وہ افریقہ میں چہل سالگی کی منزل پر پہونچ گئے ہیں۔ وطن سے اِس طویل غیرحاضری کے باوجود نہ جانے وہ کون سے مُحرّکات ہیں جنھوں نے اُن کا پُرخلوص ذوقِ شاعری اور بے تصنّع اُردو کا عشق اِس شِدّت کے ساتھ باقی رکھا۔ اُن کا یہ قطعہ بالکل حقیقت ہے ؎

تجھ سے مَیں اے حَسینۂ اُردوُ
لوگ کہتے ہیں پیار کرتا ہوُں
پیار ہی تجھ سے مَیں نہیں کرتا
جان تجھ پر نثار کرتا ہوُں

یہ واقعہ ہے کہ آج اگر رضا اُردوُ ماحول میں ہوتے اور یہاں کے تازہ بہ تازہ رُجحانات کے ساتھ اُن کی شاعری آگے بڑھی ہوتی تو وہ اِس وقت مُلک کے مقبول ترین شاعروں میں شمار ہوتے۔

فن کے لیئے صحیح ماحول کتنا ضروری ہے، اِس کا اندازہ ایک فنکار ہی کرسکتا ہے۔ جس طرح بَسنت کی ہوائیں پھُولوں اور پتّوں میں گوناگوں رنگ بھر دیتی ہیں، اِسی طرح صحیح ماحول میں فن کو بھی شگوفہ کاریوں کے ساتھ ایک نئی زندگی مِلتی ہے۔

مَیں رضا سے ابھی تک مِل نہیں سکا ہوں نہ اُن کی ذات کے متعلق مجھے کوئی معلومات حاصل ہے۔ لیکن اُن کا کلام پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اِس شریف النفس شاعر کو مَیں مُدّتوں سے جانتا ہوں۔ شاعر اپنے قاری میں یہ احساس اُسی وقت پیدا کرسکتا ہے جب اُس کی رُوح اُس کے کلام میں موجود ہو۔

رضا ذہناً ایک "سیکولر ادیب" ہیں، لیکن اُن کا "سیکولر اِزم" لَا مذہبیت نہیں، "ہمہ مذہبیت" ہے۔ ایسے انسانوں میں ایک بڑی،

خوشگوار اور پُرکشش محبت ہوتی ہے' اور یہی بات رضا میں بھی ہے۔ وہ ہندوستان کے ہر مذہب سے محبت کرتے ہیں' کیونکہ اُن کا محبوب ہندوستانی تہذیب میں اِنہی مذاہب کی رُوح اور رَوح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وطن سے دُور رہ کر بھی اُنھوں نے ہندوستان کے مذہبی خیالات سے پُرخلوص رابطہ باقی رکھا۔

ہندوستان میں رہبانیت اور ترکِ دُنیا کا فلسفہ عام تھا۔ لیکن "یوگ وششٹ" اور "بھاگوت گیتا" نے اِس فلسفے کے دوش بدوش فلسفۂ عمل کو بھی مُلک میں مقبول بنایا۔ گیتا کی سب سے بہتر اور اہم منظوم شرح سنت گیانیشور کی مراٹھی نظم "گیانیشوری" ہے' بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ رضا مراٹھی سے واقف نہیں ہوں گے۔ اگر بالفرض وہ مراٹھی جانتے بھی ہونگے تو 'گیانیشوری' کی پُرانی مراٹھی سمجھنا آسان نہیں ہے۔ قطعاً افریقہ میں بیٹھ کر رضا نے صرف وطن کی محبّت میں 'گیانیشوری' کو ترجموں اور شرحوں سے اچھی طرح سمجھا ہوگا' تب ہی تو وہ اپنی نظم "ترکِ دُنیا کیوں"؟ میں گیانیشور اور اُن کے والد وٹھوبا کا مکالمہ اِس بے تکلّفی سے نظم کرسکے ہیں۔ یہ مکالمہ لفظی ترجمہ نہ ہونے کے باوجود بھی 'گیانیشوری' کے مَتن سے بہت قریب پہنچ گیا ہے۔

اُن کی نظم "بھگوان بُدھ کا تیاگ" بھی ہندوستانی فلسفے سے اُن کے تعلقِ خاطر کا پتہ دیتی ہے۔ خیال غالب یہی ہے کہ رضا ۲۰ سال کی عُمر میں یہاں سے بُدھ فلسفہ پڑھ کر نہیں گئے ہوں گے۔ بلاشبہ بُدھ کی زندگی اور اُن کے خیالات کو رضا نے افریقہ ہی میں سمجھا ہے۔ یہ بات وطن سے قلبی لگاؤ کے بغیر ممکن نہیں۔

ہندوستانی فلسفے سے وقوف کی بدولت اُن کی نظر بعض ایسے نکات تک پہنچ جاتی ہے جنھیں آج کے نوجوان آسانی سے نہیں دیکھ سکتے۔ جیسے ہندوستانی فلسفہ "دُکھم دُکھم سروم دُکھم" کا احساس پیدا کرتا ہے

بلکہ کبیرؔ تو دُکھ کو زندگی کے مندر کی روشنی بتاتے ہیں ؎

راجا دُکھیا، پرجا دُکھیا، جوگی کا دُکھ دونا
کہت کبیر سُنو بھائی سادھو کوئی مندر نہیں سونا

رضاؔ ایک انوکھے انداز میں زندگی کو راجع بہ عیش نہیں راجع بہ الم قرار دیتے ہیں ؎

ظاھراً عیش طلب ہے بے شک
باطناً زیست ہے شیدائے اَلم

اسی خیال کو ایک اور پہلو سے بھی کہا ہے ؎

تُو نہ بھی میکدے میں نہیں
غم کدہ اب بھی آباد ہے

رضاؔ کے مطالعے اور ماحول کے متعلق مجھے کوئی علم نہیں۔ لیکن اُن میں قطعاً ایک بیدار شعور نظر آتا ہے۔ زندگی اُن کی نظر میں نظرانداز کرنے کی چیز نہیں۔ وہ اِس کے عقدہائے مالاینحل کو پوری کُرید اور پوری توجہ سے دریافت کرنا چاہتے ہیں جس کی شہادت اُن کی منظومات، سوال[1]، گمشدہ نغمے[2] یہ کون ہے؟ اور احتجاج وغیرہ سے ملتی ہے۔ ان نظموں میں رضاؔ ایک خوش بیاں شاعر کی طرح ایک مُوشگاف مُفکّر بھی معلوم ہوتے ہیں۔

تجسّسِ زندگی اُن کے کلام پر چھایا ہوا ہے۔ ایک قطعے میں وہ زندگی کا ایک اہم رمز بیان کرتے ہیں ؎

زندگی بھی عجیب ہے سودا
سُود ڈھونڈو زیاں نکلتا ہے
کھونے والا ہی غم نہیں کرتا
پانے والا بھی ہاتھ مَلتا ہے

ایک اور جگہ ایک اچھوتا خیال پیش کیا ہے ؎ باقی صفحہ ۴۲۷ پر

اوم پرکاش بجاج

اشعارِ رضا کا دورِ اوّل

ایک مطالعہ

ڈاکٹر اقبال نے شاعری سے متعلق اپنے جذبات کا اظہار اس طرح فرمایا تھا۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کہ حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
مقصودِ ہنر، سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا

اقبال ہی کیا۔ دنیا کے بڑے بڑے ہنرمندوں نے جو اچھی شاعری کے لیے کسوٹی رکھی ہے ان پر پرکھنے سے رضا کی شاعری بیشتر پوری اور کھری اترتی ہے۔

کالیداس گپتا رضا ان گنے چنے اردو شعرائے کرام میں سے ہیں جن کے پاس کہنے کو اسلوب بھی ہے اور بات بھی۔ وہ وجدانی کیفیات میں شعر کہتے ہیں اور شعرگوئی کا حق ادا کرتے ہیں۔ یہ بے حد مسرت کی بات ہے کہ وہ محض فن برائے فن کے قائل نہیں بلکہ فن برائے زندگی کے ترجمان بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شاعری میں افادیت کے قائل ہیں ان کی شاعری کھری ہونے کے علاوہ ہنر کی بلندیوں کو چھوتی ہے۔ وہ جدید قدروں سے منحرف بھی نہیں بہ ایں ہمہ وہ کسی گروہ سے منسلک بھی نہیں۔ نہ وہ کسی سیاسی پارٹی کے ڈھنڈورچی ہیں۔ انھوں نے شاعری، فن کی گہرائیوں میں، لگن کی اگن سے پیدا کی ہے۔ وہبی فکر کے علاوہ بہ لحاظ فن اردو شاعری میں ان کا کمال اور جلال اس ریاض کا نتیجہ ہے جو انھوں نے ابوالفصاحت جوشؔ ملسیانی مرحوم کی رہنمائی سے حاصل کیا ہے وہ اہلِ زبان نہیں لیکن زبان دانی میں کسی سے کم نہیں۔ وہ لاکھ تجاہلِ عارفانہ سے کہیں:-

مشقِ سخن کے طور پہ لکھتا تو ہوں بہت
کھوٹے کھرے کا کرتے ہیں استاد فیصلا

مگر وہ کھوٹے کھرے کو پرکھنا بذاتِ خود جانتے ہیں اور حقیقتاً صاحب کمال ہیں۔ انھوں نے آج سے تیس برس پہلے، ایک مشاعرے کے بعد کہا تھا۔

شاعر کی نہ شاعری کی عزت دیکھی — تحقیر غزل، نظم کی ذلت دیکھی
تھا وہ مشاعرہ مگر آنکھوں نے — اشعار کی بدترین صورت دیکھی

محفل میں کئی ٹاٹ کے پیوند ملے — محفل میں بہت تھوڑے ہنر مند ملے
چالیس میں بس پانچ ہی شاعر ہونگے — باقی جو تھے پینتیس وہ تک بند ملے

ہر نظم کو شاعری پہ دھبا کہیئے — ہر شعر کو خامیوں کا ابا کہیئے
اک بحر میں سو بحریں اکٹھی ہوں اگر — کیوں اس کو نہ چوں چوں کا مربا کہیئے

یہ احساس اس اعتماد کا نتیجہ ہے جو ایک ہنر مند کو فن پر کامل عبور ہو جانے کے بعد میسّر آتا ہے۔ ان کی ایک اور ہنگامی رباعی دیکھیے کہ اس زمانے میں ایسی شاعری کا دور دورہ ابھی باقی تھا۔

اے بزمِ سخن تجھ میں ہیں شامل ہم بھی
ہیں اونچے خیالات کے حامل ہم بھی
اشعار سنائیں گے مفید و سادہ
اشعار کے لکھنے میں ہیں کامل ہم بھی

ان شعری مثالوں سے جو رُبع صدی سے بھی پہلے انھوں نے کہی تھیں، اچھی طرح واضح ہے کہ ان میں جذبۂ خود اعتمادی بدرجۂ اتم ہے اور بہت پہلے سے ہے۔ وہ کہیں احساس کمتری کا شکار نہیں ہوتے۔ وہ ایسے کم آمیز تو نہیں مگر اپنا قیمتی وقت بے کار کی ادبی مجلسوں میں ضائع نہیں کرتے اور یہی وقت اور بیش قیمت وقت وہ اردو ادب کے ان خزانوں کی تلاش کرنے میں صرف کرتے ہیں جن کا خام مواد اتفاق سے ان کے گھر ہی میں موجود ہے۔ اس سلسلے میں ان کے قوی حافظے نے ان کا بہت دور تک ساتھ دیا ہے۔ وہ مفت کی واہ واہ کے

قائل نہیں۔ اچھی شاعری کو اچھا سمجھتے ہیں۔ جہاں کہیں بھی اچھا کلام انھیں ملتا ہے اس کی داد دینے میں وہ بخل سے کام نہیں لیتے۔

ان کے احساسات اور جذبات میں حب الوطنی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ وہ ہندوستان سے بہت دور رہے لیکن اپنے وطن اور اپنے وطن کی خاک کو بھولے نہیں بلکہ وطن کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان رہے۔ وہ ایک اچھے ناظم ہیں "شعلۂ خاموش" میں ان کی نظمیں "ہماری دوستی" "داخلِ زنداں ہونا" "لیک نواشا" "ہند کا سپاہی" "محبِّ وطن کی دعا" "لکشمی بائی" "صحرا" "باغ و راغ" "پرستشِ ناتمام" "راہِ عدم کے راہی" وغیرہ اور "شورشِ پنہاں" میں "خودکشی" "کشمکش" "بھگوان بدھ کا تیاگ" "ترک دنیا کیوں" "گمشدہ نغمے" "یہ کون ہے" "نیا انسان" "بے مائیگی" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان نظموں میں ان کی وسعت نگاہ، ربط اور حسنِ تسلسل جو اچھی نظم کا طرہ امتیاز ہوتے ہیں، بیّن طور پر نظر آتے ہیں وہ کہیں نفسِ مضمون سے بھٹک کر ادھر ادھر نہیں ہوتے۔ حسنِ بیان، انوکھی تشبیہیں، فلسفے کی موشگافیاں ان کی شاعری میں زندگی کا آئینہ بن کر جلوہ گر ہوتی ہیں۔ وہ اس زندگی سے جس سے انھیں والہانہ محبت ہے، بازپرس کرنے سے نہیں چوکتے۔ چنانچہ زندگی کے بارے میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی اپنی نظم "سوال" میں سوال کرتے ہیں۔

اے زندگی بتادے

ہے خواہش نمو کیا

کھلنے کی آرزو کیا

گلزار رنگ و بو کیا

ہم کیا ہیں اور تو کیا

اے زندگی بتادے

سامان دلبری کے

انداز عاشقی کے

سب طور دل لگی کے

دشمن ہیں کیوں ہنسی کے

اے زندگی بتادے

گلزار اور جنگل
مہتاب اور بادل
شہباز اور کوئل
کس کے لیے ہیں پاگل

اے زندگی بتا دے

آغاز تیرا الفت
انجام تیرا فرقت
ہر گام تیرا وحشت
عشرت ہے تو کہ حسرت

اے زندگی بتا دے

افسانہ ساز راتیں
افکار کی براتیں
خوش فہمیوں کی گھاتیں
کیا ہیں یہ سچی باتیں

اے زندگی بتا دے

جاں بخش ہو کہ قاتل
ہشیار ہو کہ غافل
طوفان ہو کہ ساحل
کیوں سب ہیں طرفہ بسمل

اے زندگی بتا دے

بلبل غریق ماتم
ہجراں نصیب شبنم
ہر شے غمِ مجسم
کس کے لیے جئیں ہم

اے زندگی بتا دے

جب آئے گا بلاوا

دم میں نہ دم رہے گا

کیا ہوگا پھر ہمارا

اے عیش چند روزہ

اے زندگی بتادے

اس نظم سے بخوبی پتا چلتا ہے کہ ان کے کلام میں کتنی روانی ہے انھیں اپنے بیان پر کس قدر قابو ہے۔ وہ الفاظ کی نشست میں ایسی چابکدستی سے کام لیتے ہیں کہ قاری جذبات کی رو میں بہہ جاتا ہے۔ بیشک اس نظم کے آخری بند میں قنوطیت کی جھلک ملتی ہے لیکن کہیں بھی احساسِ شکست خوردگی نہیں بلکہ حقیقت بیانی ہے۔ وہ ایک مردِ ہشیار کی طرح زندگی سے چھیڑ خانی کرتے ہیں۔ انھیں زندگی اور زندگی سے متعلق ہر چیز کا علم ہے لیکن تجاہل عارفانہ کے انداز میں وہ پوچھتے ہر چیز زندگی ہی سے ہے۔ اس میں انداز شعریت بھی ہے اور سادگی بھی۔ ان اشعار کو پڑھ کر رونے اور سونے کو جی نہیں چاہتا بلکہ جینے اور جاگنے کو جی چاہتا ہے۔ زندگی سے محبت بیدار ہوتی ہے۔

اس کے برعکس 'سوال' کے آخری بند کا جواب وہ ایک قطعے میں خود ہی دیتے ہیں۔

موت کی بے پناہ گرمی سے — زندگی خشک ہو نہیں سکتی

بیکراں بحر سے نکلتی ہے — یہ ندی خشک ہو نہیں سکتی

وہ زندگی میں نئے افکار نئے کردار نئے شعار اور نئے انسان کے طلب گار ہیں۔ ان کی نظم 'نیا انسان' کا آخری شعر ہے۔

اب کوئی ایسا کہاں جو غم کا دھارا موڑ دے

اے نئے انسان جنم لے، نظم کہنہ توڑ دے

ظاہر ہے کہ وہ دور جدید کے انسان کو وہم اور فرسودہ روایات کی زنجیروں میں جکڑا دیکھنا نہیں چاہتے۔

ان کے قطعات اور رباعیات ان کے خیالات کی گہرائی اور گیرائی کے امٹ نقوش ہیں۔ جن میں علم کا اتھاہ گہرا سمندر کوزے میں بند دکھائی دیتا ہے۔ چند قطعے ملاحظہ فرمایئے:۔

جب میں آتی ہوں جسم خاکی میں — زندگی میرا نام ہوتا ہے

مجھ سے لیتے ہیں کام جینے کا　　مجھ کو مرنے سے کام ہوتا ہے

جب کوئی کام پورا کرنے کی　　خواہش باطنی نہیں رہتی
مدّعا مدّعا نہیں رہتا　　زندگی زندگی نہیں رہتی

جس میں جھوٹی تسلیاں ہی ملیں　　کچھ نہیں لطف ایسے جینے میں
کون دریا کو کر سکا ہے پار　　بیٹھ کر کاغذی سفینے میں

شدّتِ غم سے مانگتا ہے پناہ　　کثرتِ کار سے کرتا ہے
آدمی موت سے نہیں ڈرتا　　آدمی زندگی سے ڈرتا ہے

پہلے پہچانو پھر کرو دعوے　　کون کم تر ہے کون برتر ہے
آدمی آدمی میں ہے انتر　　کوئی ہیرا ہے کوئی کنکر ہے

(شورش پنہاں)

جناب کلیم الدین احمد نے آج سے چالیس برس پہلے لکھا تھا کہ اردو غزل نیم وحشی صنفِ سخن ہے۔ جوش ملیح آبادی مرحوم نے غزل کے اشعار کو کبھی پوبارہ اور کبھی تین کانے سے تشبیہ دی تھی۔ لیکن بقول رشید احمد صدیقی مرحوم غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔ رضاؔ کے کلام میں اردو غزل اپنی خوبیوں سے جلوہ نما ہوئی ہے۔ غزل میں عیوب کو انھوں نے در آنے نہیں دیا۔

ان کی غزلوں کے ادھر اُدھر سے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؂

ہم وہ نہیں جو بھاگ کے ساحل کی لیں پناہ　　موجوں کے ساتھ ساتھ لڑیں گے بھنور سے ہم
جانیں گے کیا ہماری وہ نازک مزاجیاں　　شبنم میں ڈوب جائیں تو ابھریں گہر سے ہم
مٹنا غروب مہر نے ہم کو سکھادیا　　جینے کا ڈھنگ سیکھے طلوعِ سحر سے ہم

روحِ انسانی تو ہے جزوِ خدا　　سو رہی ہے یہ تو پھر بیدار کون
شعر لکھ کر درد کو تسکین، رضاؔ!　　کشتیٔ کاغذ میں اترا پار کون

زندگی بیچ کا ٹکڑا ہے اس افسانے کا
جس کا انجام نہیں ہے کوئی آغاز نہیں
کہکشاں، چاند، ستارے ہیں مرے نقشِ قدم
کون کہتا ہے فلک تک مری پرواز نہیں

عاشقوں کا کمال ہے جینا
اور مرنا کوئی کمال نہیں
وہ جراحت مجھے نصیب ہوئی
جس کی قسمت میں اندمال نہیں

بجا ہی کھیل گئے اپنی جان پر مظلوم
ستم کے گوش پہ فریاد بے اثر رہتی
ہمارے عہدِ محبت کی یاد تم کو کیوں
ہماری نازوں کی پالی ہمارے گھر رہتی

جورِ دنیا سے ہوں شل بیل کے کندھوں کی طرح
ڈھونڈتا پھرتا ہوں انصاف کو اندھوں کی طرح

دم بھر کو بھول سا گیا میں زاہدوں کی بات
رندوں کے جوشِ نوش کی شہ پاکے پی گیا
ہوتی رہی اُدھر مری بے ہوشیوں کی بات
اور اس طرف میں ہوش میں آ کے پی گیا
(شعلہ خاموش)

خرد کی روشنی میں زندگی لگتی ہے کہنہ سی
مگر الفت کے سائے میں نئی معلوم ہوتی ہے
دلِ ساقی میں بھی فیاضیاں اب وہ نہیں باقی
مرے جوشِ طلب میں بھی کمی معلوم ہوتی ہے

میں بھی مٹنے کا نہیں، دستِ کرم رکھتا ہوں
تو بھی اے دستِ ستمگار! ستم کرتا جا

اک عمر سے ہے کشتۂ بیدادِ خزاں وہ
اے زلفِ صبا! پھول کے شانے پہ بکھر جا

ملی ان کو نہ منزل زندگی کی، تو بھی غم کیا ہے
رہ ہستی میں جو بھی تھک کے بیٹھے، تازہ دم اُٹھے

جو اندھیروں میں بل کر اندھیر آئے
ایسی ہر روشنی کی مذمت کرو

آنکھ خیرہ کرتی ہے زیب و زینتِ منزل   رہ گذار پر لاشے دفن کو ترستے ہیں
کھل چکا درِ زنداں، کٹ چکی سلاسل بھی   یہ قفس کے دلدادہ کس جہاں میں بستے ہیں

چھٹتی ہیں گھٹائیں بھی، چاند بھی نکھرتا ہے   میرے سونے آنگن میں کون پاؤں دھرتا ہے
اس طرح ابھرتی ہیں زندگی کی تصویریں   عقل کھینچتی ہے خط، شوق رنگ بھرتا ہے

کبھی باغ باغ ہو کر دلِ زار دیکھ تو بھی   جو چمن لٹا رہا ہے گل و برگ کا خزانہ
جو خزاں میں کھل کے اے گل تو اکڑ رہا ہے اتنا   یہی زیست بن نہ جائے تری موت کا بہانہ

اٹھا لیتی ہے شبنم والہانہ   کوئی آنسو گرا رہتا نہیں ہے
یہ ہے پہچان مستوں کے لہو کی   وہ پستی کی طرف بہتا نہیں ہے

الفت میں ہے وہ رنگ کہ جی اٹھتے ہیں مردے   یہ رنگ مگر زیست میں بھرنا بھی تو آئے

(شورشِ پنہاں)

اب نظموں سے بھی 'مشتے نمونہ از خروارے'۔ ظاہر ہے پوری نظمیں تو نہیں دی جاسکیں۔ تاہم یہ یقین ہے کہ ان مختصر اقتباسات سے بھی یہ حقیقت کھل کر سامنے آئے گی کہ رضا صاحب نظم کہنے پر برسوں پہلے بھی، کتنے قادر تھے۔ پہلے اختصار کے ساتھ چند نظمیں "شعلۂ خاموش" (مطبوعہ ۱۹۶۸ء) سے ملاحظہ کیجیے۔ یہ مجموعۂ کلام ان کے ۲۵ سال کی مشقِ سخن کے زمانے کا احاطہ کرتا ہے۔

ہماری دوستی (ص ۱۴)

اس وقت سے ہم دوست ہیں جب صلح تھی ہر سمت
انسان کا انسان سے جھگڑا نہ ہوا تھا
اخلاق و مساوات ہی تھے لعل و جواہر
دنیا کو زر و مال پہ غرّہ نہ ہوا تھا
ہر شخص کے تھے ظاہر و باطن میں صفائی
کھوٹے پہ کھرے ہونے کا دھوکا نہ ہوا تھا

ہم دوست فقط دوست ہیں دنیا ہیں نہ دیں ہم
اس دور کے انسانِ ریاکار نہیں ہم

داخلِ زنداں ہونا (ص ۴۸)

کسے قیدی بنایا جا رہا ہے — قفس میں کون لایا جا رہا ہے؟
یہ کیا؟ کچھ ساتھ اس کے اور بھی ہیں؛ — ستمگاری کے کشتے اور بھی ہیں!
یہ مشکیں ان کی کیوں باندھی گئی ہیں — یہ توپیں کس لیے گاڑی گئی ہیں
یہ ان کے پاؤں میں زنجیر کیسی — یہ استبداد کی تصویر کیسی
یہ کیسے چیتھڑے ہیں ان کے تن پر — یہ کیسے خون کے چھینٹے بدن پر
قوی مضبوط اعصاب کہاں ہیں — بجائے گوشت ننگی ہڈیاں ہیں

لیک نواشا (ص ۵۱)

آبِ معطر۔ ہوش کا قاتل — خمرِ مقطّر، ہستیِ کامل
طائرِ آبی تان کے سینہ — تیر رہا ہے جیسے سفینہ
دھوپ میں پانی جام منوّر — سبزۂ ساحل، ارضِ مصوّر
نقشِ حسینِ کوہِ لنگوٹ — جھیل نے جیسے کاڑھا ہو گھونگھٹ
اس کا نظارہ، سحرِ مسلّم — مرہمِ کامل، خندۂ پیہم

ہند کا سپاہی (ص ۶۳) کے ٹیپ کا ایک شعر دیکھیے ؎

سعیِ دشمن سے تو دم بھر بھی ہراساں نہ ہوا
اے گراں قدر! تو میداں میں بھی ارزاں نہ ہوا

لکشمی بائی (ص ۷۵)

وہ شیر دل وہ لکشمی — وہ سب دلوں کی لاڈلی
وہ شانِ ہند کا نشاں — تئیس سال کی جواں
جو اپنا شہر چھوڑ کر — محبتوں کو توڑ کر
خیالِ بیم چھوڑ کر — فریبِ دہر توڑ کر
کمرِ عدو کی توڑنے — اجل سے ناتا جوڑنے
جگر کے ٹکڑے کو لیے — سمند زیرِ راں کیے

مصیبتوں پہ ناچتی ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ہزیمتوں پہ ناچتی
عدو کا وار جھیلتی ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ سروں سے انکے کھیلتی
فرنگیوں کو ریلتی ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ سپاہ کو دھکیلتی
بگاڑتی، سنوارتی ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ گوایر میں آئی تھی

وہ دم زدن میں جل گئی ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ زمین تک پگھل گئی
وہ جس کی اتنی ساکھ تھی ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ اب ایک مٹھی راکھ تھی
جہانِ بے ثبات میں ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ بہادری کی بات میں
کسی کو جو قیام ہے ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ وہ لکشمی کا نام ہے

صحرا (ص ۸۶)

اس سرزمین پہ آکر مفقود ہو گیا غم ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ اس خطۂ زمیں پر روتی نہیں ہے شبنم
ہر ایک کی زباں پر صحرا ہے نام اس کا ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ لیکن ہے درحقیقت یہ مفلسوں کی دنیا

باغ وداع (ص ۸۹)

اِدھر شباب کی سرمستیاں ہیں راتوں کو ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ اُدھر پہاڑ سی راتوں میں خامشی بیدار
اِدھر گلاب کے پھولوں پہ گیت بھونروں کے ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ اُدھر ہیں ٹوٹے ہوئے سازِ زندگی کے تار
اِدھر ہے سرو و سمن پر خرام بلبل کا ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ اُدھر ہے ناگ پھنی اور سانپ کی پھنکار
اِدھر جو قطرہ گرا گر کے بن گیا موتی ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ اُدھر جو ابر اٹھا وہ برس گیا بے کار

راہِ عدم کے راہی (ص ۱۰۵)

ہستی کیا ہے موت کا سایہ، اس کے نیچے سستالیں ہم
موت ہے کیا ہستی کا سمندر، غوطہ لگائیں کھو جائیں ہم
باہر نکلیں موت کا سایہ، غوطہ لگائیں تو روپوش
راہِ عدم کے ہم راہی ہیں، ہم میں ہے چلنے کا ہوش
کیوں نہ چلیں ہم کیوں نہ بڑھیں ہم شانہ بشانہ، دوش بدوش

پرسشِ ناتمام (ص ۹۰)

سیاہ تِل آنکھ میں ہے لازم، تو اس سے پیدا ہے روشنی کیوں

اگر سیاہی صفت ہے شب کی، تو چاندنی کا نکھار کیوں ہے

چمن چمن ہے بہار لیکن خزاں کا سب پر ہے خوف طاری

حیات کے ساتھ موت کیسی یہ گل کے پہلو میں خار کیوں ہے

یہ ہیچ کے منزل پہ موت دیکھی، تو دل نے پھر یہ سوال پوچھا

کہ تیری سب کوششوں میں حائل، یہ ہستیِ مستعار کیوں ہے

چند اقتباسات "شورشِ پنہاں" (مطبوعہ ۱۹۷۰ء) سے بھی ملاحظہ کیجیے۔ یہ کلام نسبتاً یا یوں کہیے کہ "شعلۂ خاموش" کی نسبت خاصا نیا ہے اور لبعد سے دو سال کی کاوش ہے۔ اشعار میں جستجو اور قنوطیت کا غلبہ ہے کیوں کہ یہ زمانہ رضا صاحب کے نقلِ ملک کا تھا۔

گمشدہ نغمے (ص ۶۹)

زندگی دیتے ہوئے جیسے ہوا کے جھونکے — جیسے پت جھڑ کے گزرنے پہ پنپتے ہوئے پھول

جیسے برسات میں اشجار کے کھلتے ہوئے رنگ — دم بدم جیسے بدلتے ہوئے گلشن کے اصول

وسوسے جیسے دلِ زار میں میٹھے میٹھے — جیسے عشاق کے ہونٹوں پہ رہے جاتے سوال

جیسے رقاصۂ بسمل کے چھنکتے گھنگرو — شعر میں ڈھلتے ہوئے جیسے سخنور کے خیال

جیسے تاریک فضاؤں میں چمکتے جگنو — جیسے کانوں میں کسی شوخ کے ہلتے بندے

جیسے ہنگامِ سحر پھولوں پہ شبنم کے گہر — جیسے مہتاب کی کرنوں کے رد پہلے تختے

یہ کون ہے (ص ۸۵)

دیارِ نو ، درِ کہن — نگر، ڈگر، دمن، چمن

دماغ، دل، نظر، خبر — شبِ سیہ، حسیں سحر

مکیں، مکاں، زمیں زماں — ہنسی خوشی، زباں بیاں

ہواؤں کی کھُسر پھُسر — رواں دواں سحاب تر

خبر رساں یہ کس کے ہیں — مزاج داں یہ کس کے ہیں

چھپا ہوا، بسا ہوا

یہ کون ہے، یہ کون ہے

بے مائیگی (ص ۹۲)

دوستی؛ دوستی کے معنی کیا؛ راہ میں آتے جاتے مِل لینا؛
غم گُساری؛ یہ غم گُساری ہے! اوپری دِل سے مسکرا دینا؛

چاہوں اپنوں کو؛ میرے اپنے کون مجھ سے اپنے بھی ہیں شناسا کیا؛
آج دیکھوں تو کِن کو جی بھر کر؛ کون ہیں؛ خواہشِ نظارا کیا؛

کہتے ہیں آدمی جنم لے کر ایک دن بنتا ہے وجود حسین
ایسا دُھندلا گر ہے میرا وجود جیسے میں نے جنم لیا ہے نہیں

خود کُشی (ص ۹۸)

کِس نے ساحل سے مجھے آواز دی
کون میرے راستے میں آگیا
وسطِ دریا تک پہنچنا تھا مجھے
کِس نے میرے عزم کو بہکا دیا

اپنے اس انجام پر ذلت پر میں
جیتے جی دوزخ مکانی ہوگیا
آنکھ بھر آئی وفورِ یاس سے
شرم سے دل پانی پانی ہوگیا

چاہتا تھا، سامنے میرے رہیں
مست بھونرے، پھول کلیاں، رنگ روپ
اور میں صحنِ چمن میں بیٹھ کر
ٹھنڈی رُت میں لُوں نئے سورج کی دھوپ

آخر اک شب فیصلہ کر ہی لیا
ڈوب مرنے ہی کی دل میں ٹھان لی
جیسے ہی پانی میں میں داخل ہوا
زندگی نے پیار سے آواز دی

اور میرے عزم کو بہکا دیا

کس نے ساحل سے مجھے آواز دی
کون میرے راستے میں آگیا

لمبی نظموں کے اوپر دیے ہوئے مختصر اقتباسات سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ باوجودیکہ رضا صاحب نے اب اپنی تمام تر کاوش نثری کاموں کے لیے وقف کر دی ہے اور شاعری کو قدرے پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ تاہم ان کے شاعرانہ کمالات سے منہ نہیں موڑا جاسکتا۔ اگر وہ ذرا سا بھی چاہیں تو صفِ اوّل کے فعال شاعروں میں گنے جائیں۔

رضا کی غزلوں اور نظموں کے اشعار زندگی کی عکاسی کرتے ہیں ان میں الجھاؤ نہیں۔ ابہام نہیں۔ معمے نہیں بلکہ ٹھوس اور صاف الفاظ میں حقیقت نگاری ہے جو ہر حال میں شعریت سے بھرپور ہیں۔ ان کے کلام میں اردو شاعری کی ہر صنف سخن کے نمونے ملتے ہیں۔ انھوں نے اچھے اردو گیت بھی لکھے ہیں۔ ان میں 'اے کالے منڈلاتے بادل' 'تم مجھے کب یاد آتے ہو' اور 'جھونکے' قابلِ ذکر ہیں۔ اپنے مطالعہ کی وسعت کو انھوں نے اپنے تک محدود نہیں رکھا بلکہ قارئین کو بھی اپنا شریک بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں دنیا کے اچھے ادب کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ ان نظموں میں شیلے اور ٹیگور کی نظموں کے تراجم بھی ہیں، اقبال کے شعروں پر تضمینوں کے شاہکار بھی

رضا زندگی میں انسانیت کے قائل ہیں۔ اس لیئے وہ سب مذاہب کا احترام کرتے ہیں اس سلسلہ میں ان کا نعتیہ کلام باوقار ہے۔ وہ کرشن کنہیا کے بھی پجاری ہیں اور مردِ حق گورو نانک کی بانی کے بھی دلدادہ۔ حضرت محمدؐ کا بھی احترام ہے اور حسینؓ کی بے مثال قربانی کا اعتراف بھی۔

مجموعی طور پر ان کا کلام لائقِ صد تحسین ہے۔ بقول عرش ملسیانی مرحوم:-

"رضا صاحب کی نظموں اور غزلوں میں ایک سچے شاعر کا دلِ بے تاب دھڑکتا ہے۔ آپ کا رجحان

طبع جذبات انگیز ہے۔ یہ شاعری کی اہم صفت ہے مردہ دل اچھا شاعر نہیں ہوتا“

مرحوم ابر احسنی نے ان کے بے داغ کلام سے متعلق فرمایا تھا۔“حقیقت یہ ہے کہ دیوان میں حرف گیری کی گنجائش نہیں ہے اور معیاری و دلکش اشعار کی کثرت ہے جس کی حقیقت کا اعتراف دیکھنے ہی سے کیا جا سکتا ہے“

طالب کاشمیری مرحوم نے لکھا ہے۔“رضا صاحب امتیاز مذہب و نسل کے خیالات سے بالاتر ہیں اس کا ثبوت ان کے کلام میں جا بجا ملتا ہے۔ اگر ”دیپ مالا“ ایک نظم لکھ کر اپنی عقیدت مندی کا اظہار کیا ہے تو ایک اور نظم خون ریز جنگ کربلا کے دل دوز واقعات کا نقشہ مؤثر انداز میں کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ رضا صاحب نے نامساعد حالات میں جتنی قدرت زبان پر حاصل کی ہے وہ قابلِ ستائش ولائق داد ہے“

رضا کا کلام خلوصِ بے پناہ کا آئینہ ہے اس وسعتِ نظر کی جھلکیاں قدم قدم پر ملتی ہیں۔ ان کا کام دیکھنے کے بعد پتا چلتا ہے کہ اردو ادب میں ان کا مقام کتنا بلند ہے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ مشرقی افریقہ میں گذرا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں مشرقی افریقہ کی زندگی کے آثار نمایاں ہیں اور وہاں کے قدرتی مناظر بھی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ نما ہیں۔

ان کے کلام کے دو مجموعے میرے سامنے ہیں”شعلۂ خاموش“ اور”شورشِ پنہاں“ اور میں نے اس مضمون کو دانستہ رضا صاحب کے ۱۹۷۰ء تک کے ہی مطبوعہ کلام تک محدود رکھا ہے۔ اس کے بعد دو اور مجموعے ’شاخِ گل‘ اور ’اجالے‘ بھی چھپ چکے ہیں۔ حال ہی میں ان کی رباعیات کا مجموعہ بھی چھپا ہے جس کا بہت غلغلہ ہے۔ نیا اور تازہ کلام بھی ان کے پاس کافی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ رضا صاحب کی فکر و نظر کے سوتے باقاعدگی سے جاری ہیں۔ رضا صاحب اپنی گوشہ نشینی اور کم آمیزی کے باوجود جدید ادیب و شاعر تسلیم کیے گئے ہیں اردو ادب میں ان کے تحقیقی کارناموں کے ساتھ ساتھ ان کے تخلیقی کارنامے، غزل نظم قطعہ رباعی گیت نظمِ معرا کی صورت میں زندۂ جاوید رہیں گے۔

مختصراً یہ بھی کہہ دوں کہ ۱۹۷۰ء کے بعد انھوں نے اپنی شاعری کو جو موڑ دیا ہے، اس سے ان کی نئی شاعری اور ۱۹۷۰ء تک کی شاعری میں ایک واضح خط کھنچ گیا ہے۔ مگر رضا صاحب کے یہ افکار تو میرے موضوع سے خارج ہیں۔ اس کا ذکر کسی اور موقعے کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔

رضا کا رنگِ شاعری

ڈاکٹر
اے۔ بی
اشرف
(پاکستان)

کالی داس گپتا رضا کے کم و بیش نصف درجن مجموعہ ہائے کلام شائع ہو چکے ہیں جن میں سے شعلۂ خاموش، شورشِ پنہاں، شاخِ گل، شعورِ غم اور شعاعِ جاوید قابلِ ذکر ہیں۔ اس وقت میرے پیشِ نظر ان کے دو مجموعے شعاعِ جاوید، اور شعلۂ خاموش ہیں۔ شعلۂ خاموش ۱۹۶۸ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ یہ مجموعہ نظموں، گیتوں، قطعات، رباعیات، غزلیات اور متفرقات پر مشتمل ہے، اس مجموعۂ کلام میں ۱۹۴۲ء سے ۱۹۶۷ء تک کی شعری تخلیقات شامل ہیں۔ شعاعِ جاوید ۱۹۴۳ء سے ۱۹۷۹ء تک لکھی جانیوالی رباعیات پر مشتمل ہے جو ۱۹۸۰ء میں طبع ہوا۔ کالی داس گپتا رضا کی شاعری کے بارے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ، جسٹس چانن سنگھ اور شکیل بدایونی اظہارِ خیال کر چکے ہیں۔ مجھے یہ مجموعے جناب پروفیسر لطیف الزماں خاں کی ذاتی لائبریری سے دستیاب ہوئے۔ مطالعہ کرنے کے بعد مجھے تحریک ہوئی کہ میں بھی رضا کے شعری رویوں پر اظہارِ خیال کروں۔

عام طور سے تخلیقِ شعر کے بارے میں جو نظریات رائج ہیں ان میں دو نظریے بطورِ خاص معروف اور اہم ہیں ایک نظریہ یہ ہے کہ شاعر تلمیذ الرحمٰن ہوتا ہے۔ اس پر شعر و سخن کی دیوی عاشق ہوتی ہے اور وہ شعر کہنے پر اسی طرح مجبور ہوتا ہے جس طرح پرندہ گانے پر۔

The poet must sing as the bird must sing

اس نظریے کے مطابق شعری تخلیق میں شعور کو دخل نہیں ہوتا۔ شاعری محض "شیریں دیوانگی" کی پیداوار ہوتی ہے۔ دوسرا نظریہ شعری تخلیق کو شعور کے ساتھ منسلک جانتا ہے۔ یعنی شعر حالتِ دیوانگی یا الہام کی پیداوار نہیں ہوتا بلکہ شعور کو اس میں باقاعدہ دخل ہوتا ہے۔ کوئی ایک لمحہ اچانک شعر کو وجود میں نہیں لاتا بلکہ تحریک پیدا کرنے والا لمحہ ان تلازمات اور تصورات کے خزانے میں ہلچل مچا کر ان میں سے شعر کا ہیولیٰ تیار کرتا ہے، جو

ماضی کے جذباتی اور ذہنی تجربات کی بدولت پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں میرا اپنا خیال یہ ہے کہ پوری حقیقت نہ یہ ہے نہ وہ بلکہ اس کے بین بین ہے۔ جب تک شاعری کی دیوی عاشق نہ ہو شعر کہنا مشکل ہے اور جب تک شعور کی آمیزش نہ ہو شعر مجذوب کی بڑ یا جذباتی رو کے علاوہ کچھ نہیں۔

کالی داس گپتا رضا پر اس پری کا سایہ بھی ہے، جو تخلیق شعر کا باعث بنتی ہے اور اس شعور کا اثر بھی ہے، جو جذبے کو تعقل سے مربوط کر کے "شیریں دیوانگی" کو شعور ذات، شعور زیست اور cognition سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ یہ وہی cognition ہے جو اقبال کے نظریۂ عشق کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہے اور اس کو اندھی قوت بننے سے محفوظ رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کالی داس گپتا کے یہاں محض رومانوی رویوں کی شاعری نہیں ہے بلکہ عرفانِ ذات اور شعور زیست کا رچاؤ بھی ملتا ہے۔ غالباً خارجی سطح پر اس کی ایک وجہ ان کی سیاحت اور اجنبی منطقوں کی طرف ان کا سفر ہے جس کی بدولت ان کا ذہنی افق وسیع بھی ہوا اور بلند بھی۔ اور پھر اسی سیاحت کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی وسیع المشربی ——— گپتا جی مسلکِ انسانیت سے منسلک ہیں۔ ان کے کلام میں کسی ایک عقیدے، ایک مسلک، ایک مذہب کا پرتو یا پرچار نہیں۔ وہ مذہبِ انسانیت سے وابستہ ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری میں ایسے مضامین زیادہ ہیں جن کا تعلق پوری انسانیت کے مصائب و آلام کے ساتھ ہیں۔ وہ ایک روشن ضمیر، روشن خیال اور ترقی پسند نظریات رکھنے والے شاعر ہیں۔ ان کے یہاں مظلوم اور غریب انسان کی حمایت کا رجحان بالکل واضح اور نمایاں ہے۔ وہ ناانصافی، ظلم اور استحصال کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے ہچکچاتے نہیں۔

۱۹۴۳ء کی ایک نظم "میں" کا یہ بند ملاحظہ فرمائیے:۔

میں وہ ہوں جو غیروں کی حکومت سے ہے مُنکر
میں وہ ہوں جو اربابِ رعونت سے ہے مُنکر
میں وہ ہوں جو بیداد کی قوت سے ہے مُنکر
میں وہ ہوں جو انصاف کی ذلت سے ہے مُنکر

میں اپنوں ہی سے برسرِ پیکار نہیں ہوں

(شعلۂ خاموش صہ ۵۲)

۱۹۴۶ء میں لکھی گئی ایک چھوٹی سی نظم "رفیقو اٹھو" میں یہ جذبہ دیکھیے:۔

رفیقو اٹھو، غم و رنج کو فنا کر دو
امید و بیم کا نقارہ بے صدا کر دو
لگا کے آگ سراپردۂ جہالت میں
وطن سے دور بہت دور ہر بلا کر دو
اتار پھینکو روایت کا بوجھ کندھوں سے
سبک روی سے زمانے کو آشنا کر دو
شہید جو ہوئے آزادیٔ وطن کے لیے
تم ان کی خاک کو پوجا سے دیوتا کر دو

(شعلۂ خاموش ص ۵۲)

"محنت کشوں سے خطاب" میں تبدیلی کے کتنے خواہاں دکھائی دیتے ہیں:-

آؤ مظلومو! بدل ڈالیں زمین و آسماں،
آؤ بے بنیاد کر دیں عیش و عشرت کا مکاں
بادِ بیداری میں لہرانے لگے اپنا نشاں
پردۂ ظاہر پہ لائیں جو ہے محنت میں نہاں
اے رضا مل کر دکھائیں جلوۂ مستور ہم
آؤ ذلت کی فضا کر دیں جہاں سے دور ہم

(شعلۂ خاموش ص ۵۸)

"عروسِ وقت تو ہے منتظر حجاب نہ کر" میں آواز یوں ابھرتی ہے:-

اب اٹھ کہ تجھ کو تو اوروں کو بھی جگانا ہے
وفا و عشق کا ساغر انھیں پلانا ہے
نہا پسینے میں پھر خون میں نہانا ہے
حریم قوم میں دل کا دیا جلانا ہے
خوشی سے بیڑا اٹھا، غم کا اکتساب نہ کر

(شعلۂ خاموش ص ۶۰)

ایک رکشا چلانے والے کو یہ شعور دینا ان ہی کا کام ہے۔

تجھے میں جانوں گا اس وقت جب تری ہمت
گر رعونت و بیداد کو کچل دے گی
کرے گی ادیجا زمانے میں پرچم انصاف
ستم گری کے ہر آئین کو بدل دے گی

(شعلۂ خاموش ص۶۵)

انسان دوستی کا جذبہ کالی داس گپتا رضا کے یہاں محبت کے آدرشوں کی پیداوار ہے۔ رضا محبت کا پجاری ہے۔ وہ اس جذبے کو ذات کے خمیر میں گوندھ کر اسے تمام انسانوں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ اس محبت کے سو رنگ ہیں۔ اس میں وسعت ہے۔ وطن کی محبت اس میں سب سے نمایاں ہے۔ وطن کی محبت کا جذبہ انسان کی سرشت میں شامل ہے لیکن اس کا ذائقہ اور زیادہ میٹھا لگنے لگتا ہے جب انسان اپنے وطن سے دور ہو۔ کالی داس گپتا رضا کو برس ہا برس وطن سے دور رہنا پڑا۔ اس لیے وطن کی محبت نے ان کے دل میں محبوبہ کی محبت کا سا درد اور مٹھاس پیدا کر دی۔ بے شمار نظموں میں اس درد کی ٹیس کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس درد نے غالباً ان کے یہاں محبت کا ایک وسیع اور زیادہ گہرا رنگ پیدا کیا ہے۔ اس محبت میں ایثار، قربانی خدمت اور عظمت کے نقوش نمایاں ہیں۔ کبھی یہ محبت اپنے ہم وطن کو ظلم و ستم کے خلاف لڑنے، جرأت اور ہمت سے خلقت کے دل میں گھر کرنے، زور سے جور کو مٹانے اور ظلمتِ یاس کو انوارِ مسرت میں بدلنے کی طرف مائل کرتی ہے۔ تو کبھی لکشمی بائی (رانی جھانسی) کی جرأت، بہادری اور عظمت کے دلکش گیت میں ڈھل جاتی ہے۔ کبھی یہ بے گناہ طلبا پر لاٹھی چارج ہوتے دیکھ کر تڑپ اٹھتی ہے تو کبھی ہم وطن رکشا کھینچنے والے کے دکھ پر احتجاج کرتی نظر آتی ہے۔ یہاں محبت کا کوئی ایک رنگ نہیں بلکہ جیسا پہلے کہا جا چکا ہے سو رنگ ہیں۔ عام طور پر عشق جس گھر سے سر اٹھاتا ہے اس کو بٹھا کر چھوڑتا ہے۔ لیکن گپتا رضا کے لیے یہ عشق زندگی کا پیغام ہے۔ ع

عشق وہ شے کہ سکھایا ہے مجھے جینا جس نے

عشق و محبت کے روایتی مضامین بھی رضا کی غزلوں میں موجود ہیں لیکن ایسے اشعار میں کلاسیکی رنگ موجود ہے۔ ایسے اشعار ہمارے ذوقِ تغزل اور شعورِ شعری کا ناگزیر حصہ بن چکے ہیں۔ ان مضامین کے بغیر غزل کا رنگ پھیکا پھیکا سا لگتا ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

آج پھر لطفِ ملاقات کی ٹھانی میں نے

نوازش نہیں یہ تو پھر اور کیا ہے
تمہارا ہمارے تصور میں آنا

وصالِ دوست سے آگے کوئی منزل نہیں ہوتی
اب اے عمرِ رواں تیرے ٹھہرنے کا مقام آیا

میری خدمت کا خیال آتے ہی
سرِ مغرور جھکا تو ہو گا

میری نگاہِ شوق سے پا کر وقارِ حسن
تم مجھ سے رُوٹھ جاؤ گے ایسا گماں نہ تھا

پھیکا جو پڑ گیا ہے جمال آفتاب کا
گوشہ اٹھا ہے آج یہ کس کی نقاب کا

کبھی دیتا نہیں جو ساتھ میری آرزوؤں کا
تعجب ہے کہ مرتا ہوں اسی اک دشمنِ جاں پر

تنگ آ کر میرے قصے سے وہ یہ کہنے لگے
سلسلہ بے ربط ہے طرزِ ادا پہ کچھ بھی نہیں

غرورِ حسن سنا تھا مگر نہ اس حد تک
کہ خاص کی بھی خطا ہو تو قتل عام کریں

خوشامد سے اگر مطلب نہیں تو آپ فرمائیں
برا لگتا ہے کیوں جب بات ہم دل کی سناتے ہیں (شعلۂ خاموش حصۂ غزلیات)

میں نے کہا ہے کہ گیتا رضا کے یہاں شعورِ ذات اور شعورِ زیست کا توازن ملتا ہے۔ وہ ذات سے کائنات کی طرف بڑھتے ہیں۔ ذاتی جذبات سے انسانی اور کائناتی جذبوں کی تفہیم کرتے ہیں اور پھر اس شعور کو پڑھنے والوں میں بانٹتے ہیں۔ ان جذبوں میں دردمندی، خلوص، محبت، ہمدردی اور ہمت و جرأت مندی کے ساتھ زندگی کرنے کا حوصلہ شامل ہے۔ یہ سب کچھ رضا کی شخصیت کا عرفان معلوم ہوتا ہے۔ ذات کے گیان نے ان کی خودی کو روشن کر کے رموزِ بے خودی سے آشنا کر دیا ہے۔ ان کی شاعری خیالی باتوں کا مجموعہ نہیں ہے گیان دھیان اور مقصد کے ساتھ زندگی گزارنے کا منشور ہے۔ لیکن یہ گیان دھیان خشک ملائیت یا برہمنیت سے مماثل نہیں بلکہ صوفیانہ مسلک اور مزاج کے ہم رنگ ہے۔ اس گیان دھیان کے لیے ورڈز ورتھ کی طرح فطرت کی طرف مراجعت ضروری ہے۔ شاعری میں صرف شعور کی لپک یا پند و نصیحت کا سیل بے پایاں امڈا ہو تو دلچسپی کا کم ہونا فطری بات ہے۔ شاعری میں رومانیت کی چاشنی تحیّر، اسرار اور ماورائیت کے ساتھ ساتھ ادراکِ حقیقت کی حدود کو پھیلا دیتی ہے۔ رضا کے یہاں رومانویت کا رنگ اس شاعری میں ملتا ہے جس میں فطرت کی عکاسی کی گئی ہے۔ لیکن فطرت کی عکاسی محض فوٹوگرافی کی طرح نہیں کی بلکہ اس میں مصور کا تخلیقی شعور کام کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ انسانی جذبوں کو فطرت کے ساتھ ہم آہنگ کر کے اس میں زیادہ گہرائی پیدا کی گئی ہے۔ چند مثالیں دیکھیے۔

رنگینِ شفق، شوق کو بھڑکاتی ہے
شام آتشِ خنداں سے بھری جاتی ہے
ہنستا ہے سماں، کھلتے ہیں تارے ہر سو
روتا ہے کوئی "رات چڑھی آتی ہے"

(شعاعِ جاوید ص ۲۶)

پت جھڑ نے جو کوتج ناگہاں بول دیا
پژمردگیِ زیست میں رس گھول دیا
منہ بند تھا مدت سے اور اب گلشن نے
وہ راگ الاپے ہیں کہ جی کھول دیا

(شعاعِ جاوید ص ۲۵)

ہر سو ہے رواں دواں روپہلا دریا
پُر نور، ضیا بار، مصفّا دریا
دل کیسا بہا جاتا ہے خنداں خنداں
یہ رات ہے پونم کی کہ ہنستا دریا

(شعاعِ جاوید ص ۹۲)

گلزارِ خزاں دیدہ کی توقیر کہاں
برباد و تہی دست کی دنیا نالاں
ہر پتّے کے لب پر ہے کہانی غم کی
ہر پھول کی پلکوں پہ ہیں آنسو لرزاں

(شعاعِ جاوید ص ۸۲)

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے رضا کی ایسی شاعری کے بارے میں بہت اچھی بات کہی ہے۔ لکھتے ہیں۔

"بیابانِ درد کے سفر میں اگر کہیں سکھ کا سایہ ہے تو فطرت کی آغوش میں۔ معلوم ہوتا ہے رضا کو اس حقیقت کا شدید احساس ہے۔ بعض رباعیاں اس تاثر کا پتہ دیتی ہیں۔ ان میں کہیں صبح کی کیفیت ہے کہیں شام کی، کہیں موسموں کا بیان ہے اور کہیں اماوس کے اندھیرے یا پونم کی چاندنی کا اور حق بات یہ ہے کہ ہر جگہ فطرت سے ربط کا احساس زندہ ہے۔"

(شعاعِ جاوید ص ۱۸)

یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ رضا کے یہاں فطرت گونگی بہری نہیں ہے۔ انسانی جذبوں کے ساتھ ہم رنگ بھی ہے ہم آہنگ بھی۔

دید کے قابل لیک نواشا[۱]
داد کے قابل ذوق تماشا
آبِ معطّر ہوش کا قاتل
خمرِ معطّر مستی کا کامل

---

[۱] کنیا کی مشہور جھیل کا نام

دھوپ میں پانی جامِ منور
سبزۂ ساحل ارضِ مصوّر
آبِ صفا پر دھندلا سفینہ
خالِ رُخِ بے داغِ حسینہ
اس کا نظارہ سحرِ مُسلّم
مرہمِ کامل، خندۂ پیہم

(نظم لیک نواشا سے اقتباس شعلۂ خاموش ص۱۵)

نظم "صحرا" کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے

ہے پُر سکوت کتنا یہ ریت کا سمندر
سو شورشیں نچھاور ایک اس کی خامشی پر
بھولا ہوا مُسافر دیتا ہے جب دُھائی
اٹھتے ہیں سو بگولے کرتے ہیں رہنمائی
اس سرزمیں پہ آکے مفقود ہوگیا غم
اس خطۂ زمین پر روتی نہیں ہے شبنم
ہر ایک کی زباں پر صحرا ہے نام اس کا
لیکن ہے درحقیقت یہ مفلسوں کی دنیا

(شعلۂ خاموش ص۸۵، ۸۶)

باغ و راغ" میں فطرت کے حوالے سے زندگی کے تضادات دیکھئے۔

اِدھر کمالِ بشر کی نشانیاں ظاہر
اُدھر نگاہ بشر کے کمال سے بے زار
اِدھر گلاب کے پھولوں پہ گیت بھنورے کے
اُدھر ہیں ٹوٹے ہوئے سازِ زندگی کے تار
قدم قدم پر اِدھر پھول پیشوائی کو
اُدھر الجھنے کو دامن سے بے قرار ہیں خار
روش روش پہ اِدھر مخملی بچھونے ہیں
اُدھر یہ حال کہ جیسے ہو کوئی ماتم دار

اِدھر ہے ابرِ بہاری چمن کا رکھوالا
اُدھر سموم ریاست کی مالک و مختار

(اقتباس شعلۂ خاموش ص۸۹)

رضاؔ کے گیتوں میں فطرت کی عکاسی نے رنگ بکھیرا اور رس گھولا ہے۔

چاند نکل آیا ہے کب کا کالی کالی بدلی سے
چاند سا مکھڑا کب نکلے گا کالی کالی بدلی سے
شیتل شیتل کرنوں سے یہ جیون کب چمکاؤ گے۔ کب آؤ گے.....
آنگن کی پھلواڑی پر اب کچھ بھی نہیں ہے رنگ نہ روپ
تپتے سورج کی کرنوں میں پھیکی پھیکی سی ہے دھوپ
بولو رونق رنگ بھون کی تم واپس کب لاؤ گے۔ کب آؤ گے.....

(شعلۂ خاموش ص۱۳۸)

مالی جاگا بگیا جاگی ہر پنچھی نے لی انگڑائی
سارے گلشن نے منہ دھویا شبنم گنگا جل بھر لائی
تو بھی اٹھ کے جگا دے جگ کو اچھے برے کو نہ رو پگلے
بھور بھئی اٹھنے کا سماں ہے سو کے نہ جیون کھو پگلے
وہ چمکی سورج کی لالی اندھیارے کو ہے یہ گالی
پتا پتا ڈالی ڈالی سب نے جگہ گلشن میں سنبھالی
تو بھی اٹھ اب سو کر یوں دنیا میں پاپ نہ بو پگلے
بھور بھئی اٹھنے کا سماں ہے سو کے نہ جیون کھو پگلے

(شعلۂ خاموش ص۱۴۳)

حبِ وطن، حبِ فطرت اور حبِ انسان کے علاوہ حریت پسندی، انصاف و امن، اقتصادی اور معاشرتی ناہمواری، متنوع انسانی رویوں کے موضوعات پر بھی اشعار موجود ہیں۔ کلاسیکل شعراء میں نظیر اکبرآبادی اور جدید شعراء میں اقبال کے اثرات واضح طور پر رضاؔ کے یہاں دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے نعتیہ کلام، سلام اور مرثیے پڑھنے کے بعد یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ ان کا شاعر مسلمان نہیں ہے۔

کالی داس گپتا رضا کی شاعری میں جدید تر شاعری کے نامانوس ذائقے نہ سہی، ان کے یہاں شعری ابہام، بے ہنگم ایمجری اور ناقابلِ فہم علامتوں کی مثالیں مفقود سہی، مانوس کلاسیکل شاعری، پختہ اور استادانہ رنگ اور روایتی شاعری کا رچاؤ ضرور ملتا ہے۔

قومیت کی بنیاد نوعِ انسانی سے محبت، انسانوں سے پیار اور انسان دوستی پر ہونی چاہیئے۔ یہ نظریہ سبھی کو اپنانا ہے۔ خواہ کوئی خدا میں یقین رکھتا ہے یا نہیں یہ ہماری زندگی کی ڈھال ہے۔ نئے مبنی بر انصاف سماج اور سماجی اقتصادی نظام کے لیے اس جذبے کی کلیدی اہمیت ہے۔

ایس۔ ایم۔ جوشی*

اس کا مستقل علاج یہی ہے کہ لوگوں کے دلوں میں دوسرے انسانوں سے محبت اور پریم کی شمع جلائی جائے۔ حصولِ آزادی کے بعد انسان دوستی کا یہ جذبہ سرد پڑ گیا۔

اگر ہم قومی اتحاد کے موضوع پر سنجیدگی سے غور کرنے کو تیار ہیں تو ہمیں اس بیش قیمت ورثے کو لازماً اپنا ہوگا۔

ڈاکٹر راہی قریشی

رضا صاحب کی شاعری میں ہندو صنمیات
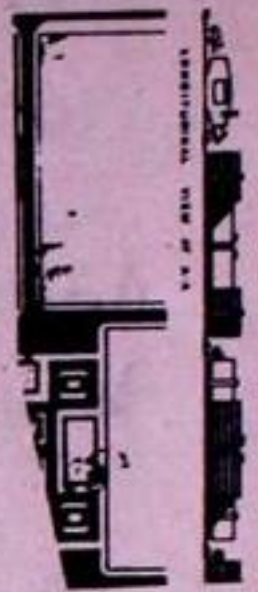
علم الاصنام کی تاریخ اس کرۂ ارض پر انسان کی طرح قدیم ہے۔ آفرینش کے عہد آغاز ہی میں انسان کا معصوم اور سادہ لوح دماغ یقیناً مظاہر فطرت کے تنوع اور کائنات کی لامتناہی وسعتوں سے متاثر اور مبہوت رہا ہوگا۔ انسانی دماغ نے اپنی محدود ترین صلاحیتوں کے پیش نظر اس بیکراں کارخانۂ قدرت کو سمجھنے کی کوشش کی ہوگی، اور اس کے ابتدائی اظہار نے یقیناً علم الاصنام یا "دیومالا" کی تخلیق کی ہوگی۔

اردو زبان نے ہندوستان میں اپنے مشترکہ وطنی، قومی، تہذیبی اور مذہبی ورثے کے تحت دیومالائی عناصر کو اپنے اندر جذب کیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اردو شاعری کے عہد آغاز ہی سے دیومالائی عناصر کا اظہار قومی یک جہتی کا آئینہ دار رہا ہے

ڈاکٹر اعجاز حسین فرماتے ہیں کہ:۔

"ہندوؤں کے مذہبی امور و کردار، جن کے اشارے غزل میں پائے جاتے ہیں، عام طور پر حسب ذیل ہیں۔ بت پرستی، خدا پرستی، گنگا اشنان، ہولی، دیوالی، بسنت، جنم اشٹمی، رام لچھمن، سیتا، کرشن، برہمن، جوگی، زنار وغیرہ۔"

دکنی شاعری نے اپنی فطری معصومیت اور عوام دوستی کے تحت ہندو دیومالائی عناصر کو سب سے زیادہ قبول کیا۔ محمد قلی قطب شاہ اور ابراہیم عادل شاہ کا دکنی کلام اس کا جیتا جاگتا

لہ "اردو شاعری اور مذاہب"، ڈاکٹر سید اعجاز حسین

ثبوت ہے۔ بعد کے دور میں قلی نے اس رنگ شاعری کو زیادہ سلاست اور پاکیزگی عطا کی۔ نظیر اکبر آبادی اردو کے واحد شاعر ہیں، جن کا سارا سرمایۂ سخن اپنی بے تعصبی کے باعث ساری اردو دنیا کے لیے سرمایۂ ناز ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے کہ:

"انیسویں صدی میں اردو گیت کی ابتداء امانت کی "اندر سبھا" سے ہوئی اور "اندر سبھا" کی فضا کا عکس ہے، جس میں بت پرستی کا عمل اور بوقلمونی اور تنوّع کی صفات ہمیشہ عام رہی ہیں۔"؎۱

شمالی ہند کے شعراء مثلاً میر، سودا، حاتم، امانت، انشاء، ذوق، جرأت، اور شاہ نصیر کے کلام میں اردو کے بنیادی کردار یک جہتی کے شواہد بنتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ:

"ہماری متصوّفانہ شاعری کی روایات نہ صرف اردو شاعری کا قابل قدر ورثہ ہیں۔ بلکہ ہمارے غیر مذہبی اور جمہوری قومی نظام زندگی میں ہندو مسلم طرز معاشرت اور سماجی میل جول، تہذیبی دھاروں کے سنگم، یگانگت اور یک جہتی کی بنیادوں کو ابتداء ہی سے مضبوط بنانے والے اینٹ پتھر اور گارا ہیں۔"؎۲

اتحاد و یک جہتی کا یہ رنگ اس قدر گہرا ہے کہ انیس و دبیر کے مرثیوں اور محسن کاکوروی کے نعتیہ قصیدے میں بھی اس کے اثرات برابر جھلکتے ہیں غرض اردو کی صوفیانہ شاعری میں ویدوں کے مسائل کی گونج بھی سنائی دیتی ہے۔ پنڈت امر ناتھ ساحر، دیا شنکر نسیم، درگا سہائے سرور، حسرت موہانی، چکبست اور عصر حاضر میں پنڈت برج موہن، دتاتریہ کیفی، تلوک چند محروم اور جوش ملسیانی وغیرہ کا کلام تصوف اور دیو مالائی عناصر کا حسین سنگم ہے یہاں تک کہ مسلم شعراء نے "رامائن" وغیرہ کو منظوم کیا۔ ترقی پسند شاعری کے دور میں ایسی یک جہتی کی جھلک، مخدوم، سردار جعفری، کیفی اعظمی، جگن ناتھ آزاد، جاں نثار اختر اور مجروح وغیرہ کے کلام میں دکھائی دیتی ہے "جدیدیت" کے تحت اس رنگ کی ترجمانی کرشن موہن، ندا فاضلی، اور عمیق حنفی وغیرہ نے کی ہے۔

؎۱ "اردو شاعری کا مزاج" ڈاکٹر وزیر آغا ؎۲ "آئینۂ نظر" ڈاکٹر ابو الفیض سحر۔

"شعلۂ خاموش" میں رضا صاحب نے ہندو دھنیات کے بعض اہم کرداروں پر اظہارِ خیال کیا اور اپنی عقیدت کے پھول برسائے ہیں۔ ایک سچے ہندو کی طرح انھوں نے مذہبی موضوعات کو اپنے مختلف مجموعہ ہائے کلام میں دل کی گہرائیوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔

"شعلۂ خاموش" میں "دیپ مالا" وہ نظم ہے جو مسدس کی ہیئت میں ہے اور جس میں رام چندر جی کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ رضا صاحب کا اسلوب بیان چکبست سے متاثر معلوم ہوتا ہے۔ چکبست نے اسی موضوع پر "رامائن کا ایک سین" لکھ کر شہرتِ جاوداں پائی۔

"دیپ مالا" میں ہر چند رضا صاحب نے چار ہی بند تحریر کیے ہیں۔ لیکن عقیدت اور احترام کے لحاظ سے یہ نظم شری رام چندر جی کو بہترین خراجِ عقیدت ہے۔ نظم کا مزاج اور آہنگ چکبست کا انداز لیے ہوئے ہے۔ ایک بند ہے!

رام، وہ باپ کے اک لفظ پہ مرنے والا ۔۔۔ بن کی تکلیفوں سے بے خوف گزرنے والا
ڈوب کر موجوں میں ساحل پہ ابھرنے والا ۔۔۔ شیر بن کر سرِ ظالم پہ بپھرنے والا
چاہے ہم اس کو یہ کہہ لیں کہ وہ بھگوان نہ تھا
یہ مگر کون کہے گا کہ وہ انسان نہ تھا

چکبست نے اپنی شہرۂ آفاق نظم "رامائن کا ایک سین" میں رام چندر جی کی اپنی والدہ سے الوداعی ملاقات کے وقت جذباتِ انسانی کی ترجمانی جس والہانہ انداز میں کی ہے، اس سے ان کی فطرت شناسی کے ساتھ ساتھ قدرت بیان بھی ظاہر ہوتی ہے۔[1]

رو کر کہا، خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں ۔۔۔ میں جانتی ہوں، جس لیے آئے ہو تم یہاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں ۔۔۔ لیکن میں اپنے منھ سے نہ ہرگز کہوں گی "ہاں"
کس طرح بن کے آنکھوں کے تارے کو بھیج دوں
جوگی بنا کے راج دلارے کو بھیج دوں

علامہ اقبالؔ نے رام چندر جی کو یوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے[2]

ہے رام کے وجود پہ ہندوستان کو ناز ۔۔۔ اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند
اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی ۔۔۔ روشن تراز سحر ہے زمانے میں شامِ ہند

---

[1] رامائن کا ایک سین۔ چکبست (کلیاتِ چکبست۔ نظم)، ص ۱۹۱ ساکار پبلشرز بمبئی۔ [2] بانگِ درا۔ اقبال ص ۱۹۵

رضا صاحب نے رام کی بارگاہ میں خراج عقیدت پیش کر کے دیوالی کے حقیقی مقصد کو "نور اخلاق کے چراغاں" سے تعبیر کر کے انسان کی خدمت کے لیے مال و زر کی قربانی کو مقصد عظیم بتایا ہے۔ بند کے آخر میں فرماتے ہیں۔

لکشمی پوجا ہی دیوالی کا مقصود نہیں
اے رضا، حلقہ کبھی رام کا محدود نہیں

"شعلۂ خاموش" "میں کرشن کنہیا" کے زیر عنوان نظم میں رضا صاحب کرشن جی کو اس والہانہ وارفتگی کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔

گزرا جیون روتے دھوتے — شام کبھی تو آئے ہوتے
پوچھتے ہیں سب چاند ستارے — آئیں گے کب شام ہمارے
آؤ شام کنہیا آؤ — ! بھارت شکتی بڑھانے آؤ
کیا خالی جھولی نہ بھروگے — یہ اچھا پوری نہ کروگے

ہندو ضمنیات کے ضمن میں "ترک دنیا کیوں" رضا صاحب کی اہم ترین نظم ہے جو ان کے دوسرے مجموعۂ کلام "شورش پنہاں" میں شامل ہے۔ اس نظم کا انحصار "گیتا" کے فلسفۂ عمل پر ہے اور عمل کو چونکہ رضا صاحب "حاصل حیات" سمجھتے ہیں اس لیے ان کا سارا زورِ بیان اس نظم میں موجود ہے۔

پرانوں کے دور میں جو لوگ علم اور معرفت کی زندگی بسر کرتے تھے اور جن کے ذمے فریضۂ ہدایتِ قوم تھا۔ وہ برہمن کہلائے۔ برہمنوں کا تصور تھا کہ خدا تین صورتوں میں جلوہ گر ہوا۔ یعنی "شیو، وشنو، اور برہما"۔ مانا جاتا ہے کہ وشنو نے رام چندر جی کی شکل میں اوتار لیا تھا اور ان کے واقعات کو والمیکی نے "راماین" کے ذریعہ جاوداں کر دیا ہے، وشنو ہی کے ایک اوتار شری کرشن جی تھے۔ ان کی زندگی کا سب سے اہم واقعہ پانڈووں کی رفاقت میں کورووں سے جنگ کرنا تھا۔ اس جنگ میں آخر الذکر کو شکست ہوئی اور یہی جنگ "مہابھارت" کہلائی۔ کرشن جی کی تعلیمات "گیتا" ان کی مقدس کتاب ہے۔

"بھگوت گیتا" ایک زبردست اور گراں قدر ہندو "رزمیہ" ہے، جو دراصل رزم نامۂ مہابھارت کے باب ششم کا ایک حصہ ہے اس کے زمانۂ تصنیف کی تاریخی شہادتیں واضح نہیں تاہم یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ اس کا زمانۂ تصنیف حضرت مسیح سے ایک ہزار سال قبل کا ہے۔

بھگوت گیتا میں بعد کے ادوار میں بہت سے اضافے کیے گیے ہیں۔ اس لیے یہ قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ گیتا کو کس وقت مہابھارت میں ضم کیا گیا۔ مہابھارت کے اشعار کی تعداد بیس ہزار کے لگ بھگ ہے ممکن ہے کہ "عمل" کی تلقین کے لیے کسی ہندو مت اور ہندو فلسفۂ حیات کے عملی پہلو کو ایک جگہ جمع کر دیا ہو۔ گیتا کے بارے میں محمد اجمل خاں رقمطراز ہیں۔

"بھرکیف تاریخی حیثیت سے کچھ بھی ہو۔ لیکن ادبی شہادت اس نظریے کے لیے کافی ہے کہ شاعر نے جس عنوان سے گیتا کو مہابھارت میں ضم کیا ہے اس میں ایسی صنعت گری سے کام لیا ہے، جو اس کامل الفن استاد کے شایان شان ہے، جو کسی بے نظیر ہیرے کو کسی زرّیں مرصّع تاج میں جڑ کر دونوں کی آبرو بڑھاتا ہے...... اب کس کی مجال ہے کہ یہ کہہ سکے کہ گیتا کا نگینہ مہابھارت کی انگشتری میں جمالیاتی حیثیت سے بے محل ہے"۔[1]

گیتا کا طرز بیان سادہ اور فطری ہے۔ اس میں چوں کہ ذات پات کا بیان نہیں پایا جاتا، اس لیے اندازہ ہوتا ہے کہ گیتا کے عہد میں ذاتیں موروثی نہیں تھیں۔ گیتا میں ویدوں کی تعلیمات کا "عطر" موجود ہے۔ جب سماج میں بے عملی پیدا ہوئی تو گیتا کے ذریعہ فطری مذہب کی تعلیمات پیش کی گئیں۔ اسی تعلیم کا لبِّ لباب "بھگوت گیتا" میں موجود ہے۔ گیتا کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ انسان اپنی عملی زندگی میں فرائض کی انجام دہی سے ہرگز غافل نہ ہو۔ نتائج کی پرواہ نہ کرے اور زندگی کو ایثار کی تصویر بنا دے۔

گیتا کی بہترین اور مکمل شرح "گیانیشوری" ہے جسے سنت گیانیشور نے تحریر کیا ہے گیتا کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے رہبانیت اور ترک دنیا کے فلسفے کے دوش بدوش فلسفۂ عمل کو بھی مقبول بنا دیا۔ سنت گیانیشور کی گیانیشوری اسی فلسفۂ عمل کی تفسیر ہے۔

سنت گیانیشور کے والد وٹھل پنت دریائے گوداوری کے کنارے ایک چھوٹے گاؤں (آپے گاؤں) کے مراٹھا ہندو تھے۔ عین عالم شباب میں انھوں نے متعلقین سے علیحدگی

---

[1] بھگوت گیتا۔ محمد اجمل خاں ص۱۹

اختیار کی اور بنارس کے سنت رامانند سوامی کے مشورے سے سنیاس لے لیا۔ لیکن وٹھل پنت کی اہلیہ رکما بائی نے منت سماجت کے بعد سنت رامانند کی اجازت سے اپنے شوہر کو دوبارہ دنیاداری میں ملوث کردیا۔ اسی کے بعد انھوں نے تین لڑکوں یعنی گیان دیو، نورتی ناتھ، سوپان اور ایک لڑکی مکتابائی کو جنم دیا۔ وٹھل پنت کے سنیاس سے واپس آنے اور دوبارہ دنیاداری کے اندر الجھ جانے کو مذہبی رہنماؤں نے قطعی پسند نہیں کیا اور وہ تادم آخران کے عتاب کا شکار رہے۔ یہاں تک کہ انھیں برادری سے خارج کردیا گیا اور ان کے لیے سزائے موت تجویز کی گئی، اسی کے نتیجے میں وٹھوبا اور رکما بائی نے پریاگ کے سنگم میں اپنے آپ کو غرقاب کرلیا۔

والدین کی وفات نے بچوں کو ناقابل بیان مصائب میں مبتلا کیا اور وہ نان شبینہ کے محتاج ہوگئے۔ نورتی ناتھ گیانی تھے لہٰذا انھوں نے گیانیشور (گیان دیو) کی روحانی تربیت کی۔ کچھ عرصہ بعد مذہبی رہنماؤں نے انھیں "پیٹھن" (تعلقہ اورنگ آباد مہاراشٹرا) کے برہمنوں سے "شدھی پتر" کے حصول کا مشورہ دیا اور اس طرح وہ "پیٹھن" پہنچے اور وہاں سے واپسی کے وقت "نیواسہ" میں قیام کیا اور یہیں ۱۲۹۰ء میں پندرہ سال کی عمر میں "گیانیشوری" لکھی۔ اس وقت دیوگیری، (دولت آباد۔ دکن) میں راجہ رام دیو حکمراں تھا۔ ۱۵۹۰ء میں سنت ایکناتھ نے گیانیشوری کو صحت متن کے ساتھ دوبارہ مدون کیا۔

"اصل گیتا کی طرح گیانیشوری میں بھی کل (۱۸) ادھیائے ہیں اور ان ادھیاؤں میں گیتا کے سات سو اشلوکوں کی تفسیر کے طور پر جو مراٹھی اودیاں لکھی ہیں۔ ان کی مجموعی تعداد (۹ ہزار ۳۳) ہے ..... آخری ادھیائے کو گیانیشور نے گیت کا کلس بتایا ہے۔ سابقہ تمام ادھیاؤں کی تلخیص اس میں ہے ....."[1]

گیانیشوری گیتا کا منظوم مراٹھی ترجمہ ہے۔ گیانیشور کا اصل مقصد "عرفان ذات" تھا اور بھگتی کو وہ اس کے حصول کا ذریعہ سمجھتے تھے، وہ ایک عظیم مفکر، بلند مرتبہ، مُبلّغ اور نہایت قادرالکلام شاعر تھے۔ روحانیت، اسلوبِ اظہار اور اجمال واختصار کی اثرانگیزی کے پیش نظر گیانیشوری کو گیتا کی بہترین تفسیر کہا جاتا ہے۔ عوام کو مقصد حیات کی تفہیم کے لیے گیانیشور نے یہ شاہکار

---

[1] مضمون "گیانیشوری ایک مختصر تعارف" پندرہ روزہ قومی راج صفحہ ۴ شمارہ ۲۲ نومبر ۱۹۸۱ء

تصنیف کیا۔ انھوں نے روحانیت کو نہایت آسان زبان میں بیان کیا ہے گیانیشوری "تمثیل" کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے، جس میں بھگوت گیتا کے ایک ایک اشلوک کی وضاحت کے لیے گیانیشو نے بیسوں "اودیاں" تحریر کی ہیں۔

بھگوت گیتا "عمل" کی تعلیم دیتی اور عمل کے صلے سے بے نیاز رہنے کی تلقین کرتی ہے۔ عام مراٹھی داں اسے "ماؤلی" یعنی "ماں" کا درجہ دیتے ہیں۔ گیانیشوری کی بنیادی تعلیمات یہ ہیں کہ فرض حیات کی اہمیت محسوس کی جائے۔ سماج کے پست طبقات کو بلند کیا جائے اور جہدِ حیات بہر حال جاری رکھی جائے۔

سنت گیانیشور کے مسلک میں عبادت خداوندی کو مرکزی اہمیت حاصل ہے وہ ان لوگوں کی بدبختی پر اظہار افسوس کرتے ہیں، جو ذرّے ذرّے میں خدا کا عکس تو دیکھتے ہیں، لیکن اس کے وجود کے منکر ہیں۔ ان کی دانست میں سچا بھگت وہی ہے جو کائنات کی ہر شے میں خدا کی قدرت کا جلوا دیکھتا ہے، عجز و انکسار کو انھوں نے سب سے اہم وصف بتایا ہے اور رواداری پر بھی کافی زور بیان صرف کیا ہے۔ جہالت اور تعصب کی بیخ کنی ان کے نزدیک ناگزیر ہے کیوں کہ ان کا خیال ہے کہ سانپ خواہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، اس کا زہر بہر حال خطرناک ہوتا ہے۔

گیانیشوری مراٹھی ادب کا ایک شاہکار ہے۔ جس کی تعلیمات، روانیِ بیان اور تشبیہات ارفع و اعلےٰ ہیں۔ نادر تمثیل نگاری نے گیانیشوری کو "نادر العصر" صحیفے کا مرتبہ عطا کیا ہے۔ "شانت رس" پورے صحیفے میں روح کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس طرح گیانیشوری کو "شانتی کتھا" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے

"ترک دنیا کیوں؟" رضا صاحب کی ایک اثر انگیز نظم ہے جس کا مرکزی خیال انھوں نے سنت گیانیشور کی شہرۂ آفاق شرحِ گیتا "گیانیشوری" سے اخذ کیا ہے

یہ نظم سنت گیانیشور اور ان کے والد وٹھل پنت (وٹھوبا) کے درمیان ایک مکالمے پر مبنی ہے۔ وٹھوبا ترک دنیا پر مائل ہیں تاکہ شہروں کی ہماہمی اور رواروی سے دور جنگل میں مصروف عبادت و ریاضت رہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ:

قلب کی تسکین و راحت کے لیے بن ہی موزوں ہے عبادت کے لیے

سنت گیانیشور نہایت فلسفیانہ انداز میں اپنے والد کو مختلف طریقوں سے سمجھاتے ہیں۔

مثلاً سہ

جو کرے تفریق زہر و انگبین — وہ فنا فی اللہ ہو سکتا نہیں
شہر و صحرا میں کرے جو امتیاز — اس پہ کیا ہو گا درِ اللہ باز

آگے وہ نہایت استعاراتی انداز میں کہتے ہیں کہ جس طرح ایک شعلے کی چمک، بجلی کی کڑک میں تبدیل نہیں ہو سکتی، جس طرح گھڑا، ابر رواں کا مرتبہ حاصل نہیں کر سکتا، اور عاملِ خبث و بدی کی آرزوئے مآلِ نیک عبث و رائگاں ہوتی ہے، اسی طرح تارکِ دنیا حبیبِ خدا کے مرتبے پر فائز نہیں ہو سکتا۔

جو اَیا وٹھوبا کہتے ہیں کہ بندگی کے لیے دل کا رنج والم سے آزاد ہونا ناگزیر ہے، اس پر گیانیشور معرفتِ الٰہی کے لیے معرفتِ نفس کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کا یہ قول۔ کہ:

محض اپنے نفس کی پہچان ہی — ہے خدائے بحر و بر سے آگہی

گویا "مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ" کی تفسیر ہے۔

جیساکہ بیان کیا گیا ہے گیانیشوری تمثیل نگاری کا شاہکار ہے۔

رِضا صاحب نے بھی تمثیل نگاری کو اس نظم میں پیشِ نظر رکھا ہے۔ اس طرح تقدس کی فضا کے ساتھ ساتھ نظم میں ادبیت کی چاشنی شروع سے آخر تک برقرار ہے۔ "ترکِ دنیا" گو ایک خشک موضوع ہے لیکن رِضا صاحب کے شاعرانہ اور پُر تمثیل اندازِ بیان نے ادبیت پر حرف نہیں آنے دیا۔ گیانیشوری فلسفۂ عمل کی مبلغ ہے اور جد و جہدِ حیات پر آمادہ کرتی ہے۔ نظم کا پہلا شعر گیانیشور کی، اپنے والد سے مخاطبت کے تحت یوں ہے:

کس لیے بزمِ جہاں کو چھوڑ کر — آپ نے بن کو بنایا مستقر

اس سے پہلے ہی شعر میں رِضا صاحب نے گیتا کا سارا فلسفہ سمو دیا ہے کہ ترکِ دنیا مردوں کے شایانِ شان نہیں۔ والد صاحب جواب دیتے ہیں:

دل نہ جب تک فکر سے آزاد ہو — کس طرح وہ بندگی سے شاد ہو
ہے اگر شوقِ وصالِ کبریا — بڑھ کے جنگل سے نہیں کوئی جگہ
اس لیے لازم ہے دنیا چھوڑنا — زندگی سے بھاگنا، منہ موڑنا

ترکِ دنیا پر مائل اور سماجی مقاطعے سے دل برداشتہ وٹھوبا کو گیانیشور یوں سمجھاتے ہیں:

جن کو دنیا کا خدا کا گیان ہے — حق و باطل کا جنھیں عرفان ہے

جانتے ہیں وہ کہ دنیا چھوڑ کر
ہو نہیں سکتے "انا" سے بے خبر
خار، نوک اپنی چھپا سکتا نہیں
دل کا "میں" پر ناز جا سکتا نہیں

"انا" کی نوک خار سے یہ تشبیہہ سمندر کو کوزے میں بند کردینے کے مماثل ہے اور یہ بلیغ انداز بیان ہر طرح ایک سنت کے شایان شان ہے۔

نظم کے اختتامی بند میں "گیانیشوری" کا سارا عرفان سمویا گیا ہے۔ رضا صاحب نے تشبیہات کا وہی اثر انگیز پیرایۂ اظہار اختیار کیا ہے جو گیانیشوری کا سب سے بڑا وصف ہے۔ وٹھوبا کو آخر میں گیانیشور مزید تلقین کرتے ہیں کہ:

لعل مخزن میں ہے یا زیر زمیں
اپنی قیمت کو کبھی کھوتا نہیں
پھول صحرا میں ہے یا گلشن میں ہے
پھول کی بو پھول کے دامن میں ہے
دھوپ مٹی پر پڑے یا برف پر
اس میں رہتی ہے تجلی جلوہ گر
ہر کہیں ہے قادر مطلق کا گھر
کون گھر ہم جائیں یہ گھر چھوڑ کر

اس طرح نظم ختم ہو جاتی ہے۔ وضاحتِ مطلب کے لیے جو تشبیہیں استعمال کی گئی ہیں وہ ایک طرف پاکیزگیٔ اسلوب کی آئینہ دار ہیں تو دوسری جانب ان سے شاعر کی قدرت بیان کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ آخری شعر گویا "فلسفۂ ہمہ ادست" کی تفسیر ہے۔

ایک نکتہ بڑا لطیف ہے۔ نظم کی تمہید میں رضا صاحب نے تحریر کیا ہے کہ "سنت گیانیشور اپنے باپ وٹھوبا کو جو ترک دنیا کر کے بن کو سدھار گیا ہے واپس اپنے گھر لانے کی کوشش کرتے ہیں اور کچھ قیل وقال کے بعد اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں"۔

اس تمہید کے پیش نظر رضا صاحب کے لیے ضروری تھا کہ وہ نظم میں کوئی ایسا شعر پیش کرتے، جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ قیل وقال کے بعد وٹھوبا گیانیشور کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ لیکن نظم کا آخری شعر وہی ہے جو مندرجہ بالا انتخابِ اشعار کے آخر میں درج ہے۔ غور کیا جائے تو یہ آخری شعر اس قدر بلیغ اور وسیع مفہوم کا آئینہ دار ہے کہ اس کے بعد کسی طرح مزید اشعار سے اس بات کی وضاحت کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ وٹھوبا آخر کار اپنے نور نظر کے استدلال سے قائل ہو کر گھر واپس چلے گئے۔ پھر آخری شعر کے مصرع ثانی

کون گھر ہم جائیں یہ گھر چھوڑ کر

میں "گھر" کی تکرار بہت پر لطف ہے جو یقیناً اس کی وضاحت کرتی ہے کہ وٹھوبا نے ترک دنیا پر

اصرار ترک کر کے گیانیشور کی بات مان لی۔ رضا صاحب کے عرض مدعا کے لیے مزید اشعار کی قطعاً ضرورت نہ رہی۔ یہ آخری شعر ان کی قدرت کلام کا بیّن ثبوت ہے!۔

"شورش پنہاں" میں "ترک دنیا کیوں؟" کے بعد "بھگوان بدھ کا تیاگ" دوسری ضمیاتی نظم ہے۔ جس میں رضا صاحب نے ایک مذہبی رہنما کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

بھگوان بدھ ہندوستان کے وہ مقدس رہنما ہیں جنھوں نے اقوام عالم کو اس دنیائے درد والم کے اندھیرے میں اپنے اعتبار سے "نجات" کی ایک نئی روشنی دکھائی۔ ان کی زندگی تیاگ کی ایک ایسی روشن مثال ہے جس کی جلوہ افروزی آج بھی بدستور قائم ہے۔ مہاتما بدھ نے زروجواہر کے سائے میں پرورش پائی حسن وجمال کی آغوش میں عنفوان شباب بسر کیا، لیکن عیش واقتدار پر انھوں نے کاسۂ گدائی کو ترجیح دی۔ شاہان سلف میں ایسی مثالیں نادر نہیں تو کمیاب ضرور ہیں جن کی اولاد عین عالم شباب میں محلوں کے سایۂ عشرت سے کنارہ کش ہو کر کٹیا کی چھایا میں سکون قلب وراحتِ روح محسوس کرے اور اس مسلکِ فقیری کی تبلیغ میں فنا ہو جائے۔

مہاتما بدھ کا نام "سدھارتھ ساکیا منی گوتم" تھا، ولادتِ حضرت عیسیٰ سے پانچ سو سال قبل ۵۶۳ ق م میں ہمالیہ کے زیر سایہ "کپل وستو" کے حکمراں خاندان "ساکیا" میں ان کی ولادت ہوئی۔ خود ان کی والدہ بھی ایک شاہزادی تھیں۔ گوتم کی ولادت سے عین قبل وہ اپنی ریاست کے طریقے کے مطابق اپنے میکے کے لیے روانہ ہوئیں۔ لیکن راہ کے ایک جنگل ہی میں گوتم کی ولادت ہو گئی۔ گویا تقدیر نے اپنا فیصلہ ان کی ولادت کے وقت ہی سنا دیا تھا کہ یہ شاہزادہ محلوں میں عیش وعشرت کے لیے نہیں بلکہ دشت وصحرا میں رشد وہدایت کے لیے پیدا ہوا ہے۔

ان کا لڑکپن اور عنفوان شباب محل کی بے پناہ عشرتوں کے زیر سایہ بسر ہوا۔ انیس برس کی عمر میں وہ اپنی ایک رشتہ دار یشودھرا سے بیاہے گئے۔ کافی عرصہ تک وہ اولاد سے محروم رہ کر عشرت حیات کا مآل سوچتے رہے۔ ایک دفعہ محل کے باہر راہ میں ایک ضعیف العمر شخص کو دیکھا جو بارِ سن وسال سے دہرا ہو رہا تھا۔ آگے بڑھے تو ایک محتاج کو بدحالی وخستگی کی انتہا میں پایا اور کچھ دیر بعد اثنائے راہ ہی میں ایک ایسی لاش دیکھی جو سڑ گل کر پارہ پارہ ہو رہی تھی۔ تصویر حیات کا یہ دوسرا رخ ایک حساس شاہزادے کی تقلیب قلب کا سبب بن گیا۔ اس ناآسودگیٔ روح کا مداوا انھوں نے بھکشوؤں سے دریافت کرنا چاہا اور آخر کار اس نتیجے پر پہونچے کہ تلاش صداقت پر محلوں کے عیش وآرام کو بہر حال قربان کر دینا چاہیے۔

اسی وقت انھیں یہ مژدہ سنایا گیا کہ ان کے گھر شاہزادہ تولد ہوا ہے ہر طرف شورِ مبارکباد و ہنگامۂ مرحبا بلند ہوا۔ لیکن گوتم نے یہ سوچا کہ مجھے اس بندھن کو بھی توڑنے کے جتن کرنے ہوں گے شہزادے کی ولادت کے ہنگامۂ جشن مسرت کے بعد وہ نصف شب کو اپنی اہلیہ کے شبستان میں دبے پاؤں داخل ہوئے۔ حسین شریک حیات اور جمیل جگر گوشۂ معصوم کو ایک نظر دیکھا اور اسی طرح دبے پاؤں اس عشرت گاہ سے نکلے۔ اور پھر اپنے صبا رفتار رتھ میں سوار ہو کر کسی نادیدہ منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر انتیس برس کی تھی۔

طلوع صبح صادق کے قریب وہ ایک دریا کے کنارے پہونچے، اپنی زلفیں تراش لیں۔ لباس شاہانہ اتار پھینکا، ہیرے جواہرات اپنے خادم "چنا" کو عطا کیے اور اسے یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ اس فیصلے کی اطلاع مہاراجہ اور بیوی کو دے دی جائے۔ اس کے بعد وہ خرقہ پوش ہو کر تلاش حق میں سرگرداں ہو گئے۔ اس آزمائش میں چھے برس گزر گئے اور ان کے رفقا یکے بعد دیگرے رخصت ہو کر انھیں پھر ایک بار وسعت صحرا میں تنہا کر گئے۔

آخر کار ایک رات ایک درخت کے زیر سایہ عبادت کے دوران "گیا" میں نزول رحمت خداوندی سے وہ "گوتم بدھ" بن گئے اور اس طرح انھوں نے دردورنج انسانیت کا مداوا (۳۵) برس کی عمر میں حاصل کر لیا۔

یہاں سے وہ بنارس گئے اور اپنے نئے مسلک کی تبلیغ شروع کی اپنے مواعظ میں انھوں نے برہمنوں کے فلسفۂ حیات بعد الموت اور وجود قبل ولادت کی تردید کی اور وجود انسانی کی عظمت کو اپنا مطمع نظر بتایا۔ مزید فرمایا کہ انھوں نے ایک ایسی راہ تلاش کر لی ہے، جو منزل سکون قلب و روح کی طرف جاتی ہے۔ یہی ان کی راہ میں ضبط نفس کی منزل تھی۔

اس دور میں انھوں نے "نروان کی تبلیغ کی" جس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان تمام جسمانی خواہشات سے علیحدہ اور بلند ہو جائے۔ انھوں نے فرمایا کہ انسان اپنے اعمال سے عظیم یا حقیر ہے اور اس عظمت یا حقارت کا رشتہ اس کی ولادت سے قطعاً جوڑا نہیں جا سکتا

ایک دفعہ تبلیغ کے ضمن میں گھومتے گھومتے اپنی آبائی ریاست کپل وستو پہونچے جہاں ان کے والد ہنوز سریر آرائے سلطنت تھے۔ والد نے ان کے "حال زار" کے پیش نظر لعن طعن کی۔ لیکن گوتم بدھ نے جواباً کہا کہ تم نسل شاہان سے متعلق ہو اور میں نسل پیغمبروں سے وابستہ ہو گیا ہوں جنھوں نے قلندری میں سکندری کا کروفر باقی رکھا ہے۔

سارے اہل خاندان ان سے شرف ملاقات حاصل کرکے رخصت ہوگیے لیکن وہ خود اپنی اہلیہ "یشودھرا" سے ملنے تشریف لے گئے۔ اہلیہ نے ان سے ملاقات کے بعد اپنے اکلوتے شہزادے "راہل" کو ان کی خدمت میں پیش کیا۔ راہل نے والدہ کے کہنے پر اپنی وراثت طلب کی۔ گوتم، راہل کے ساتھ روانہ ہوگئے۔ راہ میں ایک درخت کے نیچے انھوں نے راہل سے کہا کہ "تم نے اپنی وراثت طلب کی ہے۔" اور پھر اپنا کاسۂ گدائی راہل کے ہاتھ میں تھمادیا اور اسے بھی اپنے بھکشوؤں میں شامل کرنے کا حکم صادر فرمایا

اسّی برس کی عمر میں وہ صحرا صحرا گھومتے ہوئے "کشی نگر" کے ایک لوہار کی جھونپڑی کے قریب رکے وہاں دوپہر کا کھانا کھایا اور جنگل واپس جاکر پتوں کے بستر پر دراز ہوگئے۔ یہ ان کا آخری وقت تھا اپنے رفقاء سے فرمایا کہ

"یہ نہ سمجھنا کہ چوں کہ ھادی رہنما رخصت ھوگیا، لھذا اس کی تعلیمات بھی ختم ھوگئیں"

"بھگوان بدھ کا تیاگ" رضا صاحب کی نہایت متاثر کن ضیایاتی نظم ہے جس میں مہاتما بدھ کے بے مثال ایثار کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ وہ چاہتے تو ساری زندگی عیش و عشرت کے سایے میں بسر کرسکتے تھے، لیکن اس جویائے معرفت نے عیش امروزہ پر سکون دائمی کو ترجیح دی اور ایک ایسی زندگی بسر کی جو صدیوں کے عبور و مرور کے باوجود آج بھی مشعل ہدایت بنی ہوئی ہے۔

یہ نظم رات کے پرسکون منظر کی عکاسی سے شروع ہوتی ہے۔ گوتم بدھ کے محل کے ادنیٰ و اعلیٰ سب محوِ خوابِ استراحت ہیں، شبستان میں ہے

راہل ایک برس کا بچہ سویا ہوا ہے ماں کے ساتھ
کالی آنکھیں، گورا مکھڑا کومل باہیں، ننھے ہاتھ

گوتم نے ترک دنیا کا عزم صمیم کرلیا ہے، اور وہ کسی کشمکش کے اسیر نظر آتے ہیں۔

کھلی کھلی انگارہ آنکھیں، یہ چہرہ لال گلابی سا
اس کو کب سونے دیتی ہے بکھرے من کی دیا کلتا

آخر کار وہ اپنی دھرم پتنی اور معصوم راہل پر آخری نگاہ ڈال کر راج محل سے رخصت ہوجاتے ہیں۔ رضا صاحب نے اس مفارقت کو یوں پیش کیا ہے ؎

من کا پکا، بات کا پورا، راج محل سے کیا نکلا
گھوڑے پر چڑھ کر دم بھر میں ہوا سے باتیں کرنے لگا

لیکن اس منظر کو انگریزی کتاب Religious Leaders مصنفہ تھامس اینڈ تھامس میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ مہاتما بدھ محل سے نکلے اور رتھ میں سوار ہو کر صبح صادق کے وقت ایک دریا کے کنارے پہونچے اور پھر رتھ چلانے والے کو ہیرے جواہر دے کر رخصت کر دیا۔

اس کے بعد رضا صاحب بیان فرماتے ہیں کہ:

دور کہیں ویرانے میں وہ جا ٹھہرا دم لینے کو
جیسے سنبھلتا ہے ماجھی، منجدھار میں کشتی کھینے کو

اس شعر کا مصرع ثانی نہایت بلیغ ہے، جس میں کشتی کھینے کے لیے ناخدا کا کچھ دیر سنبھلنا، نہایت وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ رضا صاحب نے بحرِ مواج میں ملاح کے کشتی کھینے کے حوصلے کا اظہار کر کے گوتم بدھ کے ان سارے آلام اور مصائب کی تصویر کشی کی ہے جو تیاگ اور ایثار کے بعد پیش آنے والے تھے۔

آخری شعر میں رضا صاحب نے نہایت استعاراتی اسلوب بیان کے تحت گوتم بدھ کے عروج اور ان کے مسلک کے شیوع کو ایک مصرعے میں سمو دیا ہے کہ:

"دن چڑھ آیا، سورج نکلا، پیڑ کی چھایا بڑھنے لگی"

اس مصرعے کے "تینوں حصے" بے حد بلیغ اور وسیع المفہوم ہیں، جس سے تعلیماتِ گوتم کے اجالے، نروان کی ضیاباری اور ان کے مسلک کے سایۂ شفقت کا بے پناہ اظہار ہوتا ہے۔

اس نظم کی بحر کے انتخاب میں رضا صاحب نے اپنی فنی مہارت اور عروض دانی کا ثبوت دیا ہے۔ بھگوان بدھ کے لیے ہندی کی یہ شیریں اور طویل بحر بے حد مناسب و موزوں ہے۔ ساری نظم ہندی کے شیریں سلیس اور رواں الفاظ کا وہ آئینہ خانہ ہے جس میں مہاتما بدھ کی محبوب، مہان اور مقدس شخصیت ہر زاویے سے منعکس ہو رہی ہے۔ نظم سے رضا صاحب کی قدرت بیان کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھیں ہندی کے الفاظ کے بر محل استعمال پر کتنی قدرت حاصل ہے۔ رضا صاحب کی نفسیات نگاری اس نظم میں

درج ذیل شعر میں بڑی لطافت کے ساتھ جھلکتی ہے۔ گوتم بدھ تیاگ کا تہیہ کر کے شبستان میں داخل ہوتے ہیں۔ جہاں ان کی اہلیہ اور معصوم راہل محوِ خواب ہیں۔ وہ اس خیال سے کوئی حرکت نہیں کرتے کہ مبادا دونوں بیدار ہو جائیں۔ نفسیاتی کشمکش کی یہ ساری داستان رضا صاحب نے صرف ایک شعر میں پیش کر دی ہے ؎

گوتم اٹھا، بستر چھوڑا، ایک نظر راہل پر کی
پیار سے پھر پتنی کو دیکھا، من ہی من میں آگیا لی

"من ہی من میں آگیا لینا" کی وسعت مفہوم، وضع داری اور والہانہ کیفیت ناقابل اظہار ہے۔ غرض یہ نظم گوتم بدھ کے بے مثال ایثار کو ایک پاک نہاد شاعر اور بلند مرتبہ انسان کا بہترین خراج عقیدت ہے۔

رضا صاحب کی نظم "امرت منتھن" پر تبصرے سے قبل دیو مالائی کہانی کا مختصر بیان ضروری ہے۔

ہندوستان کی لوک کتھاؤں کے بموجب "دیوتا" نیکی کے اور "راکشس" بدی کے مظہر ہیں۔ ان کی دیرینہ کشمکش مشہور ہے۔ ایک دفعہ دیوتاؤں نے برہما جی سے راکشسوں کی شکایت کی، جس پر برہما جی، دیوتاؤں کو نارائن بھگوان کے پاس لے گئے۔ نارائن جی کی ساری ہمدردیاں دیوتاؤں کے ساتھ تھیں۔ لیکن "درواسا" رشی کی بد دعا سے راکشسوں کو غلبہ حاصل تھا۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ سب دیوتا راکشسوں کے پاس جائیں اور ان سے مل کر "سمندر منتھن" کریں۔ اس سلسلہ میں مندراچل پہاڑ کو "متھنی" بنائیں۔ اور واسکی ناگ کو ڈوری کے طور پر استعمال کریں۔ سمندر منتھن سے چودہ انمول رتن دستیاب ہوں گے۔ جن میں امرت بھی ہو گا۔ یہ امرت دیوتا اگر پی لیں تو امر ہو کر راکشسوں پر غالب رہیں گے۔ راکشسوں نے دیوتاؤں کی تجویز منظور کر لی۔

"دیوتاؤں اور راکشسوں نے مل کر بڑی محنت سے مندراچل پہاڑ کو اپنی جگہ سے اکھیڑا اور اسے گروڑ کی پیٹھ پر رکھ کر سمندر تک لائے اور پھر سمندر کے بیچوں بیچ اسے سیدھا کھڑا کر دیا اس کے بعد سب مل کر پاتال سے واسکی ناگ کو لینے گئے...... سب سے پہلے گنیش کی پوجا کی گئی۔ اور اس کے بعد سمندر متھنے کے مشکل کام کا آغاز

کیا گیا"۔ ؎

سخت محنت کے بعد سمندر سے زہر ہلاہل نکلا، جسے شیو جی نے پی لیا۔ پھر گائے نکلی، اور پھر سفید رنگ کا ایراوت (ہاتھی)، برآمد ہوا۔ پانچویں بار "ستوبا" موتی نکلا، جسے نارائن جی نے حاصل کرلیا۔ چھٹی بار کے متھنے میں "پاریجات" درخت نکلا۔ ساتویں بار "رمبھا" نامی اپسرا برآمد ہوئی۔ آٹھویں باری میں لکشمی جی اور ان کے بعد "وارونی" نامی حسین وجمیل دوشیزہ نکلی۔ اس کے بعد نورانی سراپا والا "دھنونتری" وید باہر نکلا۔ جس کے ایک ہاتھ میں امرت کا کلس اور دوسرے ہاتھ میں "ہری تکی" تھی۔ اسے وہ دیکھتے ہی دیوتا اور راکشس خوشی سے پاگل ہو اٹھے کہ جس چیز کے لیے اتنی مصیبت اٹھارہے تھے آخر وہ دستیاب ہوگئی۔

امرت کے لیے دیوتاؤں اور راکشسوں میں کشمکش شروع ہوئی اتنے میں نارائن جی ایک خوب صورت اپسرا کا روپ دھار کر وہاں پہونچے اور راکشسوں کا دل لبھانے لگے۔ سب اس کے اطراف امرت پینے بیٹھ گئے۔ اپسرا نے دیوتاؤں کی طرف سے امرت پلانا شروع کیا۔ جب سارے دیوتا امرت پی چکے اور سورج اور چاند باقی رہ گئے تو "راہو" نامی راکشس کا ماتھا ٹھنکا کہ امرت تو صرف دیوتاؤں ہی میں ختم کیا جارہا ہے۔ چنانچہ وہ دیوتا کا روپ دھار کر سورج اور چاند کے پاس بیٹھ گیا۔ لیکن سورج نے "راہو" کو پہچان لیا۔ اس اثنا میں وہ امرت پی چکا تھا۔ اچانک "سدرشن چکر" نمودار ہوا۔ اور راہو کا سر کاٹ دیا گیا۔ لیکن امرت کے اثر کے تحت وہ دو ٹکڑے ہو کر بھی زندہ رہا۔ سر "راہو" کی شکل میں اور جسم "کیتو" کے روپ میں۔ غرض دیوتاؤں کے ساتھ "راہو" "کیتو" بھی امر ہوگئے۔ لیکن سورج چاند سے ان کی دشمنی ایسی ہوئی کہ آج تک چلی آتی ہے

ہندو دیومالا کی یہ مشہور کہانی "شاخِ گل" میں "امرت منتھن" کے زیر عنوان ملتی ہے اس نظم کے بارے میں خود رضا صاحب فرماتے ہیں:۔

"امرت منتھن یا سمدر منتھن" ہندو دیومالا کی ایک اہم کتھا ہے اس میں سمندر کو بلو کر امرت نکالے جانے کا ورنن ہے۔ مندر گیری..... منتھنی کا اور آدی شیش سے رسی کا کام لیا جارہا ہے۔ رسی کو ایک سرے

؎ پرانوں کی کہانیاں گوپی چند نارنگ ص ۲۳

ہے دیو یعنی دیوتا اور دوسرے سے دانو یعنی راکشس وغیرہ کھینچتے ہیں یکایک ایک بڑے ہیرے کی طرح چمکتی ہوئی امرت سے بھری گاگر برآمد ہوتی ہے۔ جسے راکشس اڑا لیجاتے ہیں۔ دیوتاؤں کو بے حد مایوسی ہوتی ہے۔ اور وہ بھگوان سے پرارتھنا کرتے ہیں کہ وہ ان کی مدد کرے۔ اتنے میں ایک چھیل چھبیلی نرتکی غیب سے ... موھنی اٹم کرتی ہوئی جلوہ گر ہوتی ہے۔ راکشس اپنے مزاج سے مجبور ہوکر اس نرتکی کے روپ پر مست ہو جاتے ہیں اور امرت کی گاگر ان کے ذہن سے محو ہو جاتی ہے۔ جسے موقع پاکر دیوتا اٹھالے جانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نرتکی کے روپ میں بھگوان وشنو کے سوا اور کوئی نہ تھا!“[1]

نظم ”امرت منتھن“ ڈرامائی انداز میں شروع ہوتی ہے۔

گڑ گڑ گڑ گڑ۔ گھم گھم گھم گھم
جھالے، جھاگ، جھنا جھن جھم جھم

جیسے الفاظ کے استعمال سے سمندر منتھن کی ہیبت ناک فضا پیدا کرنے میں رضا صاحب کامیاب ہیں۔ چاروں طرف ایک بحرِ زخار نظر آتا ہے، اور دیوتا اور راکشس سمندر بلونے میں مصروف ہیں۔ مندر گری نامی پہاڑ سے متھنی کا کام لیا جارہا ہے، اور متھنی کو گھمانے کے لیے آدی شیش کو رسی کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے (ہندو دیومالا کے مطابق اسی شیش ناگ کے پھن پر ساری دھرتی کھڑی ہے۔) اس رسی کا ایک سرا دیوتاؤں کے ہاتھ میں ہے اور دوسرے سرے کو راکشش تھامے ہوئے ہیں۔ ساری کائنات میں ایک شور برپا ہے۔

بھنور، بھیانک ، لہریں پربت
ڈھل ڈھل ڈھل ڈھل لت پت لت پت

دیو اور دانو امرت منتھن کے کام سے تھک کر پسینہ پسینہ ہو گئے ہیں اچانک ایک گاگر نمودار ہوتی ہے۔ رضا صاحب اس کا بیان اس طرح کرتے ہیں ؎

---

[1] شاخ گل (عرض حال)، کالی داس گپتا رضا۔ ص ۱۱-۱۲

ٹھہرو ٹھہرو   رُکو رُکو   وہ کیسا شے ہے   دیکھو دیکھو

کوئی ہنڈا جگ مگ جگ مگ   کوئی گولا، دگدگ دگدگ

چمک دمک سے آنکھیں خیرا   مَن بھر کا ورنی اِک ہیرا

اُتّم، اُجوَل، اگر، اجاگر   یہی تو ہے امرت کی گاگر

اچانک دانوؤں کی نیت میں فتور پیدا ہوتا ہے اور وہ امرت کی گاگر کو اپنے قبضے میں لینے کے جتن کرتے ہیں۔ تاکہ اسے پی کر خود امر ہو جائیں۔ اس مرحلے پر سارے دیوتا عجیب کشمکش کا شکار ہو جاتے ہیں، اور انھیں یہ خوف رہتا ہے کہ اگر دانو "امرت گاگر" کے حصول میں کامیاب ہو جائیں تو ہمارا دیو ہونا خطرے میں پڑ جائے گا۔ چنانچہ وہ بھگوان وشنو کے حضور حصولِ مقصد کے لیے پرارتھنا کرتے ہیں

اس موقع پر آناً فاناً ایک حسین اپسرا جلوہ گر ہوتی ہے۔ جس کے قیامت خیز حسن کو رضا صاحب یوں بیان کرتے ہیں۔ ؎

کجلائے نینوں میں بجلی   چال سے اڑتی پھرتی تتلی

میوہ سی گدرائی باہیں   ترچھی نظریں ٹیڑھی راہیں

موہنی جیسے جگت کی مایا   رو چک جیسے دھوپ میں سایا

زلفیں جیسے شام کی سج دھج   چہرہ جیسے چڑھتا سورج

مورت جیسے روپ کی رانی   جوبن جیسے باڑھ کا پانی

اپسرا کا حسن و جمال دانوؤں کو مسحور کر دیتا ہے، اور موقع سے فائدہ اٹھا کر دیو امرت کی گاگر اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ اس مرحلے پر موہنی آتم ختم ہو جاتا ہے اور دانو کفِ افسوس ملتے رہ جاتے ہیں۔ دراصل اپسرا کے روپ میں بھگوان وشنو رقص کناں تھے۔

اس نظم کے لیے رضا صاحب نے ہندو دیومالائی فضا کی مناسبت سے ایک ایسی بحر کا انتخاب کیا، جو ہندی اوزان سے مماثلت رکھتی ہے۔ نظم میں شروع سے آخر تک ہندی کے سہل اور شیریں الفاظ نے بڑی مترنم فضا قائم رکھی ہے۔ اس نظم میں ڈرامائی عنصر مزید دلچسپی پیدا کرتا ہے۔

دوسرا بند "ٹھہرو ٹھہرو، رکو رکو" سے شروع ہو کر عجیب سنسنی خیز فضا پیدا کرتا ہے۔ اس بند میں "لینا لینا، امرت لینا" محاکات کی بہترین مثال ہے۔ پھر چوتھا بند "موہنی آتم" کے

کے بارے میں یوں شروع ہوتا ہے۔ کہ ایک "رقاصہ" کے مسحور کن رقص سے سارا ماحول نغمہ و سرور میں ڈوب جاتا ہے۔ "رقاصہ" چوں کہ خود "بھگوان وشنو" ہیں، اس لیے رضا صاحب نے کیفیت حسن و شباب کی پیش کش میں آداب و احترام کو ملحوظ رکھا ہے۔ یہ عقدہ نظم کے آخر میں کھلتا ہے۔ کہ

"رقص کناں تھے خود ہی سوامی
رکھشک داتا، انتر یامی"

"عرض حال" کے تحت اس نظم کے بارے میں رضا صاحب نے تحریر فرمایا ہے

"امرت منتھن کی یہ کتھا اردو نظم میں شاید پہلی بار دیکھی جائے گی،
مگر یہ میرا دعویٰ نہیں، قیاس ہے"

شاید رضا صاحب اس دعوے میں سچے ہوں۔ بہر حال یہ نظم ہندو دیو مالائی عناصر پر اردو ادب میں ایک یادگار کی حیثیت رکھتی ہے۔

مذہب بنام

کہا جا سکتا ہے کہ سرکار کے مذہبی رسومات میں حصہ لینے سے کسی خاص مذہب کی تبلیغ پر شمہ برابر بھی فرق نہیں پڑتا۔ مگر مسئلہ یہ نہیں اس طرز عمل سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سرکار نہ صرف مذہبی نظریہ کی حامی ہے بلکہ اسے مدد بھی دیتی ہے۔ اس سے سرکار کا سیکولرزم کا دعویٰ خاصا مشکوک ہو جاتا ہے اور یہ مذہبی تنگ نظری کو سیاسی طور پر باعزت بنا دیتا ہے۔

ان مسائل کا واحد حل یہ ہے کہ بغیر کوئی سمجھوتہ کیے ایک سیکولر اور سائنسی انداز فکر کو بڑھاوا دیا جائے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ گو ہم اکثر اپنی جمہوریت کے سیکولر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ہم میں سے بیشتر سیکولر سے صرف یہ مراد لیتے ہیں کہ دوسرے مذاہب سے روا داری برتی جائے اور اپنے مذہب کو خاص طور پر بڑھاوا دیا جائے۔

عرفان حبیب

بقیہ صفحہ ۳۸۲ سے آگے

آدمی موت سے نہیں ڈرتا
آدمی زندگی سے ڈرتا ہے!

ایک رُباعی کے آخری دو مصرعوں میں شوقِ کشمکشِ زندگی کو یُوں ظاہر کیا ہے ؎

موجوں کے تھپیڑوں سے اُسے لڑنے دو
رہنے دو بھنور ہی میں سفینہ میرا

ایک اور رُباعی کے آخری مصرعوں میں تو رضا نے جیسے زندگی کا راز دریافت کر لیا ہے ؎

پہنچو گے اُسی منزلِ ہستی پہ رضا
سیدھے چلو، اُلٹے چلو، بل کھا کے چلو

اُنھیں ان کی ایک نظم "بے مائیگی" میں سارے مظہراتِ زندگی میں یکسانیت نظر آنے لگی ہے ؎

باغ میں رنگ و بُو کا نام نہیں
خار و گل میں مشابہت کامل
مُستند کچھ نہیں، سَند کیسی
بِلک بے اصل، حقیقت باطل

نظم "کشمکش" میں ایک چونکا دینے والا خیال ہے ؎

وہی اُس پار میری زندگی مجھ سے جُدا ہوکر
دوبارہ مجھ سے آملنے کی سوزش میں تڑپتی ہے

رضا بڑے انسان دوست ہیں۔ اپنی نظم "نیا انسان" میں پہلے انسانیت کی موجودہ پستی سے وہ اس طرح نالاں ہیں ؎

ہوش مندانِ جہاں کو نیند سی آتی ہوئی
مُردنی سی بشرۂ آفاق پر چھاتی ہوئی

دست و بازو کانپتے، قلب و طبیعت مضمحل
حوصلے پژمردہ، سینے سرد، ہمت مضمحل

پھر پیدا ہونے والے "نئے انسان" کو وہ اس طرح پکارتے ہیں ؎

اب کوئی ایسا کہاں جو غم کا دھارا موڑ دے
اے "نئے انساں" جنم لے نظمِ کہنہ توڑ دے

وہ صبحِ نو کی کتنی حسین تصویر پیش کرتے ہیں ؎

ہونے والا ہے نور کا تڑکا
کوئی بجھتا چراغ جلتا ہے
دور سورج افق کے پردے میں
نیم بیدار آنکھ ملتا ہے

رضا کے کلام میں حکیمانہ اور اخلاقی خیالات کی بڑی دلکش فضا ہے۔ عظمتِ عزم کیلئے
وہ کہتے ہیں ؎

شجر ہو، کوہ ہو، ہفت آسماں ہوں
پرِ پرواز کو سب آشیاں ھیں

شاید اس شعر میں اپنے وطن کی پستی کی طرف اشارہ ہے، جسے ممالکِ غیر میں رہنے
والا اور شدت سے محسوس کرتا ہے ؎

زمانہ کوسوں آگے بڑھ گیا ہے
ہم اب بھولی ہوئی اِک داستاں ہیں

محبت میں باحوصلہ رہنے کی تلقین ؎

لاکھ ہوتی رہے شکستِ دل
دل شکستہ نہ ہو محبت میں

یہ قطعہ بھی بڑا فکر انگیز ہے ؎

عقل کو ہیں مصیبتیں کیا کیا
شوقِ تازہ تری بلا جانے
غنچہ کیا جانے مشکلیں گُل کی
رنج و راحت کو طفل کیا جانے

رضا کی شاعری فطری ہے۔ بنیادی طور پر میں انھیں شاعرِ رومان نہیں کہوں گا۔ لیکن اس کے باوجود اُن کے کلام میں جا بجا بہترین رومانیت موجود ہے، جیسے اُن کی غزل کا یہ شعر ؂

آپ بیداد کریں جی بھر کر
اپنی کھل جائے زباں کیا معنی

یا اُن کی نظم "گمشدہ نغمے" کا یہ بند ؂

جیسے تاریک فضاؤں میں چمکتے جگنو
جیسے کانوں میں کسی شوخ کے ہلتے بُندے
جیسے ہنگامِ سحر پھولوں پہ شبنم کے گہر
جیسے مہتاب کی کرنوں کے رُوپہلے تحفے

رضا کی غزلیں شگفتہ زمینوں میں ہیں اور تازہ ہیں۔ ساتھ ہی اُن کے دوسرے اصناف میں خاصی روانی ہے۔ لیکن چونکہ اُن کی شاعری کا ارتقاءُ ہندوستان کے باہر ہوا ہے لہٰذا بعض جگہ اُن کا اندازِ بیان رائج الوقت روایات سے الگ نظر آتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اُن کے سیاق میں کہیں غرابت نہیں آئی ہے بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ خود ایک نیا انداز پیدا کر رہے ہیں۔ یہ بات صحتِ شعور اور ذوقِ عالیہ کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتی ـــــ رضا کے متعلق اور باتیں بھی کہنا تھیں لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ میرے بیانات کہیں رضا کی بے تکلف شاعری اور اُن کے قارئین کے درمیان حائل نہ ہو جائیں۔

میرے نزدیک کسی شاعر کے کلام پر مقدمہ لکھنے میں صرف ضروری باتیں کہنا چاہیئے۔

اس مختصر تعارفِ کلام کے بعد قارئین خود شاعر سے ملیں۔

صفدر آہ

گنیش پوری۔ بمبئی
۲۴-۱۰-۶۹ء

از
راھی قریشی
نذیر فتح پوری

مطبوعہ کلام
کا
انتخاب

از

شعلۂ خاموش	مطبوعہ	۱۹۶۸ء
شورش پنہاں	"	۱۹۷۰ء
شاخِ گل	"	۱۹۷۴ء
شعاعِ جاوید	"	۱۹۸۰ء

غزلیات

(شعلۂ خاموش)

ہم دورِ خزاں میں کیوں چھوٹے اب صحنِ چمن میں کیا ہوگا
ہم اپنے وطن اب جائیں کیا اب اپنے وطن میں کیا ہوگا
جانے دو اسے تم زیرِ زمیں بند اس میں کوئی انساں تو نہیں
بے روح کوئی سوتا ہوگا، تابوت و کفن میں کیا ہوگا
کہتے تھے لوگ جسے مجنوں جب غور کیا نکلا انساں
جو نور تھا اس کے چہرے پر وہ لعلِ یمن میں کیا ہوگا
ناکامِ محبت کے آنسو ہوتے ہیں نہایت پاکیزہ
جو پانی ان آنکھوں سے بہا وہ گنگ و جمن میں کیا ہوگا

کبھی رنجش، مٹی حسرت، ملی راحت، بندھی ہمت
کچھ اس انداز سے اشکوں کا سیلِ تیز گام آیا
کچل ڈالا خزاں نے اس طرح میری اُمنگوں کو
نہ فصلِ گل سے دل بہلا نہ گلشن میرے کام آیا
وصالِ دوست سے آگے کوئی منزل نہیں رہتی
اب اے عمرِ رواں تیرے ٹھہرنے کا مقام آیا
چھپا سورج، چڑھا بادل، گری بجلی، اٹھا طوفاں
مرے نام اس طرح اہلِ شہادت کا پیام آیا

اُڑی جاتی ہے کشتی زندگی کی
محبت ناخدا پانی ہے دنیا
فنا ہوتے تو انساں ہی کو دیکھا
جو سچ پوچھو تو لافانی ہے دنیا
عمل کی علم کی دنیا بناؤ
اسی دنیا کی دیوانی ہے دنیا
نہ بے جا کیجئے تعریف اس کی
ہماری جانی پہچانی ہے دنیا

■

موئے سفید ہجر کا کانٹا تھا غالباً
لگ کر جو میرے پاؤں میں سر سے نکل گیا
نکلا ہر آدمی کے مقدر میں اختلاف
اک پا گیا مراد تو اک ہاتھ مل گیا
پھولوں میں دلکشی ہے نہ پتوں میں تازگی
مالی بدل گیا ہے کہ موسم بدل گیا
غربت میں رہ کے اور بڑھے کی وطن کی قدر
اچھا ہوا رضا جو وطن سے نکل گیا

■

ان کے دل کا غبار دھونا تھا
آج مجھ کو بہت سا رونا تھا
شمعِ مدفن بنے کھڑے کیوں ہو
اب تو ہو بھی چکا جو ہونا تھا
دوست کہتے ہیں، رنج و حسرت کو
بادۂ ناب میں ڈبونا تھا
اے ندامت! وہ اشک سوکھ گئے
جن سے داغِ گناہ دھونا تھا

کیوں دیکھ لیا عشرتِ دنیا سے پلٹ کر
اب سامنا کرتے رہو اِدبار کا ڈٹ کر
اے دل کوئی دن ہنس لے مرے حال پہ تو بھی
تجھ سے بھی نپٹتا ہوں میں قسمت سے نپٹ کر
محبوب کی تصویر میں کیا کیا نہ کشش تھی
سو سمت میں عاشق کی نظر رہ گئی بٹ کر
جب رونے پہ مجبور کرے گا غمِ دنیا
ہم دامنِ محبوب سے رو لیں گے لپٹ کر

■

اک نہ اک موج اکھاڑ پھینکے گی
ہے درختِ کنارِ جو بے کار
فصلِ گل آ رہی ہے دیوانے
اپنے دامن کا یہ رفو بے کار
سبزۂ پائمال کہتا ہے
باغ میں خواہشِ نمو بے کار
ضبطِ دل کے بغیر اے واعظ
صوم بے فائدہ وضو بے کار

◆

آرزوؤں کا تعاقب چھوڑ دیں
آؤ حدِ ضبط پر دم بھر رکیں
مالِ دنیا، دولتِ دل، نقدِ جاں
اک اشارے پر ترے ہم ہار دیں
گو تمنا اور بھی جینے کی تھی
اب مگر قیدِ عدد میں کیا جئیں
دل وفاداری سے واقف ہی نہیں
الفتِ باہم کا دم کیوں کر بھریں

رہِ ہستی سے بہکایا گیا ہوں
جہاں میں جبر سے لایا گیا ہوں

نہ پوچھو میرِ محفل کے کرم کی
بھری محفل سے اٹھوایا گیا ہوں

خیالِ دوست میں کھویا گیا تھا
حضورِ دوست میں پایا گیا ہوں

حیات و موت سے ہوں خوب واقف
بہت اس راہ سے آیا گیا ہوں

◆

حاجتِ ناخدا نہیں مجھ کو
خود ہی کشتی کا ناخدا ہوں میں

آپ جو کچھ مجھے سمجھتے ہیں
اس حقیقت کو جانتا ہوں میں

آنکھ والو! مجھے برا نہ کہو
نقشِ عبرت بنا ہوا ہوں میں

جامِ مے کی رضا نہیں حاجت
ساغرِ غم سے آشنا ہوں میں

◆

روٹھ بھی جائے گا تو رنج نہ ہوگا مجھ کو
عمر بھر دے گا ترا ہجر سہارا مجھ کو

ضبط بھی خوار ہوا رسمِ محبت بھی چھٹی
چند اشکوں نے کہیں کا بھی نہ رکھا مجھ کو

وائے تقدیر کہ نظروں سے گراتے ہیں وہی
جو سمجھتے تھے کبھی آنکھ کا تارا مجھ کو

لوٹ لیتا کوئی دن اور گلستاں کی بہار
تم نے اس عمر میں کیوں شاخ سے توڑا مجھ کو

زمانے کے ہاتھ آ گئی اک کہانی
تری تند خوئی مری بے زبانی
غمِ عشق کا بوجھ اٹھا تو لیا ہے
کہیں لے گرے گی مگر ناتوانی
میسّر ہوا کچھ نہ جُز ناامیدی
بہت خاک ہم نے ترے در کی چھانی
رضاؔ سحر کردے گی آج انجمن پر
تری خوش مذاقی تری خوش بیانی

■

جو گود سے پلکوں کی اب چھوٹنے والا ہے
یہ پیار بھرا آنسو طوفانوں کا پالا ہے
کیا خوب تماشا ہے، شبنم نے گھر اپنا
سورج کے بھروسے پر پھولوں کو سنبھالا ہے
ہنسنے کی تمنا تھی روتے ہی بنی آخر
جو ذہن میں پالا تھا آنکھوں سے نکالا ہے
رکتا ہے نہ بہتا ہے آنسو غمِ الفت میں
رکتا ہے تو سوزش ہے بہتا ہے تو چھالا ہے

■

شکر کرتا ہوں کہ ناشاد کو دل شاد کیا
بھول کر بھولنے والے نے مجھے یاد کیا
موت کا بھی نہ اٹھانا پڑا احساں سر پر
قیدِ ہستی سے ہمیں عشق نے آزاد کیا
آج پھر لطفِ ملاقات کی ٹھانی ہم نے
آج پھر ان کی جفاؤں نے مجھے یاد کیا

◆

لگی دل کی پکھ بجھ نہ جائے گی اس سے
ہے بے کار اشکوں کا طوفان اٹھانا

نوازش نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے
تمہارا ہمارے تصور میں آنا

نگاہوں میں منزل کا دھندلا سا خاکہ
ہُوا کارواں اہلِ غم کا روانا

فکر میں غرق رہا رنج سے لاچار رہا
آدمی جینے کے چکر میں گرفتار رہا

یاد کے پردوں میں چھپ چھپ کے کوئی آہی گیا
ہجر کی رات میں ہر چند خبردار رہا

جس نے دنیا دَنی رشتہ نہ جوڑا تجھ سے
عمر بھر وہ تری نظروں میں گنہگار رہا

صبحدم پھول چُنے جاتے تھے
کوئی کانٹا بھی چبھا تو ہوگا

اپنے دیوانے کو مر جانے دو
قیدِ وحشت سے رہا تو ہوگا

ان کے آگے مرا افسانۂ غم
بے زبانی نے کہا تو ہوگا

رہتا تھا پتّے پتّے کے دل میں میں رات دن
کہنے کو گو کہیں بھی مرا آشیاں نہ تھا

کوتاہیِ نگاہ سے محروم ہم رہے
ورنہ کسی کا جلوۂ تاباں کہاں نہ تھا

اشکوں نے اس کو کردیا دنیا میں مشتہر
وہ رازِ دل کسی پہ جو اب تک عیاں نہ تھا

◆

حسرت، رنج، مصیبت، آفت سب کو بساتا ہوں دل میں
دل رکھنا بھی فرض ہے میرا گھر آئے مہمانوں کا
اے دل نعرہ دین دھرم کا کون سنے گا آج کے دن
ایماں والوں کی نہ چلے گی دور ہے بے ایمانوں کا

■

مرے ضبط کا نہ گلہ کرو مرے بس کی بات نہیں رہی
یہ ہے تیرِ آہ کی خود سری جو کمانِ لب سے نکل گیا
وہ کلی ابھی تھی جو ادھ کھلی تجھے ہے خبر اسے کیا ہوا
وہ چمن میں خستہ پڑی ملی اسے دستِ شوق مسل گیا
مرے آشیاں کی نہ پوچھ کچھ نہیں اب تو اس کا نشان بھی
جو حسد کی آگ سے بچ گیا وہ جنوں کی آگ میں جل گیا

■

کہہ کے افسانۂ غم دل کا ہنسانا دشوار
ٹوٹے مضراب سے بربط کا بجانا مشکل
داستانِ غمِ الفت بھی عجب قصّہ ہے
سُننا آسان نہیں اور سُنانا مشکل
کسی زردار کی گردن کا جھکانا آساں
ایک خوددار کی گردن کا جھکانا مشکل

◆

اہتمام اور اہتمام اس شان سے
ہے یہ وجہِ گرمیِ بازار کون
یہ جنونِ شوق کی تکمیل ہے
جھیلتا ہے ورنہ یوں آزار کون

شعر لکھ کر درد کو تسکیں رضاؔ ؟
کشتیٔ کاغذ میں اترا پار کون

■

گردشِ افلاک ہم کو پیس سکتی ہے مگر
اہلِ ہمت کے لیے ایسی سزا کچھ بھی نہیں
خندہ زن ہے رونقِ انجم پہ بھی ان کی بہار
کون کہتا ہے کہ داغوں کی ضیا، کچھ بھی نہیں
تنگ آ کر میرے قصے سے وہ یہ کہنے لگے
سلسلہ بے ربط ہے، طرزِ ادا کچھ بھی نہیں

◆

قضا کو دیکھ کے ہم مسکرائے جاتے ہیں
ہوائے تند میں شمعیں جلائے جاتے ہیں
امید و بیم ہے کیا انبساط و رنج ہے کیا
یہ جال میرے لیے کیوں بچھائے جاتے ہیں
رضاؔ وہ یاس کے کانٹے ہوں یا امید کے پھول
ہم اپنے سینے سے سب کو لگائے جاتے ہیں

◆

انھیں حیات کی دلچسپیوں سے کیا مطلب
جو خوفِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں
جو آرزو کبھی اٹھی اسی میں دفن ہوئی
ہم اپنے دل میں ہزاروں مزار رکھتے ہیں
حقیر جان کر ان کو نہ توڑ اے مالی
یہ خشک پھول بھی شانِ بہار رکھتے ہیں

اک خلش سی دل میں ہر شام و سحر پاتا ہوں میں
زندگی کو بیشتر اک نیشتر پاتا ہوں میں
ایک مدت شاکیِ تقدیر رہ چکنے کے بعد
خود کو پھر مصروفِ سعیِ بے ثمر پاتا ہوں میں
رازِ دل کس سے کہوں یارب کہ اب یہ حال ہے
ذرے ذرے میں رقابت کا اثر پاتا ہوں میں

ہم شہیدوں کے لہو کی ایک بوند
کتنی ہی آنکھوں میں ڈالی جائے گی
اک دن ان کو آئے گا میرا خیال
اک دن ان کی بے خیالی جائے گی

تیرے چلنے سے کائنات کی نبض
لمحہ بھر کو ٹھہر گئی ہو گی
مجھ کو خوابیدہ دیکھ کر قسمت
پاس ہی سے گزر گئی ہو گی

منکرِ انسان بے شک اہلِ صد اعزاز ہے
جھک گیا جو سر وہ معمولی نہیں ممتاز ہے
آپ کے منہ سے سنوں کچھ یہ تمنا ہی نہیں
میرے دل کی دھڑکنوں میں آپ کی آواز ہے

لہو صحرا نشینوں کا نہیں اعجاز سے خالی
جہاں دو بوند بہ جائے وہیں گلزار ہو جائے
نہ آمادہ کرو شیخ و برہمن کو تعاون پر
بہت ممکن ہے ملتے ہی بہم تکرار ہو جائے

جاگ اے دل چرخ کج رفتار ہے
سو رہا ہے تو جہاں بیدار ہے
ہار کر بھی جیتتے ہیں خوش نصیب
غم زدوں کی جیت میں بھی ہار ہے

◆

کیا داغِ دلِ زار دکھاتے ہو مجھے تم
یہ شمع مری بزم میں ہر رات جلی ہے
پھر پھر کے مرے پاؤں یہیں لاتے ہیں مجھ کو
شاید انھیں معلوم ہے یہ تیری گلی ہے

◆

جب بے سروساماں تھا تو دنیا کی طلب تھی
اب با سروساماں ہوں تو عُزا کی طلب ہے
تنکے کی طرح غم کو جو لے جائے بہا کر
ہر دل کو رضا ایسے ہی دریا کی طلب ہے

■

یہ دل کی دھڑکنیں ہیں یا تری آواز سنتا ہوں
مری ہر سانس تیری ہم زباں معلوم ہوتی ہے
امیدوں کا وہی عالم امنگوں کے وہی عنواں
کسی کی یاد پھر دل میں جواں معلوم ہوتی ہے

◆

اک ذرا سے درد کا چارہ کریں سو سو طرح
اس قدر بن کر رہیں کیوں ہم غلامِ زندگی
موت پر سمجھو کہ پائی فتح اس انسان نے
جس نے سمجھا موت کو قائم مقامِ زندگی

◆

گیت

چھیڑو پھر بینا کے تار

سات سروں میں بھر کے جیون مہکادو سرگم کا اُپ بن
جاگ اٹھے من کا سنسار
چھیڑو پھر بینا کے تار
مدھم مدھم لے میں سناؤ من کی کہانی سب کہہ جاؤ
خوب سُناؤ پران پکار
چھیڑو پھر بینا کے تار
دور کرو سب من کے اندھیرے بس جاؤ گیتوں میں میرے
لے کر اپنی پریم ستار
چھیڑو پھر بینا کے تار

◆

بھور بھئی ۔۔۔!!

مالی جاگا، بگیا جاگی، ہر پنچھی نے لی انگڑائی سارے گلشن نے منہ دھویا، شبنم گنگا جل بھر لائی
تو بھی اٹھ کے جگادے جگ کو، اچھے برے کو نہ رو پگلے
بھور بھئی اٹھنے کا سماں ہے، سو کے نہ جیون کھو پگلے
وہ چمکی سورج کی لالی، اندھیارے کو ہے یہ گالی پتا پتا، ڈالی ڈالی، سب نے جگہ گلشن میں سنبھالی
تو بھی اٹھ، اب سو کر یوں، دنیا میں پاپ نہ بو پگلے
بھور بھئی اٹھنے کا سماں ہے، سو کے نہ جیون کھو پگلے

مجھکو کون جگانے آیا

چپکے چپکے، دھیرے دھیرے، کس نے مجھے چونکایا
مجھ کو کون جگانے آیا

اوڑھ کے جیسے پون کا آنچل
کاڑھ کے گھونگھٹ، ڈال کے کاجل
پلٹ کے اپنی کایا
مجھ کو کون جگانے آیا

پریم مگن ہوں جانوں کیوں کر
سوتے میں پہچانوں کیوں کر
پریتم ہے یا چھایا!
مجھ کو کون جگانے آیا

روپ کی چُنری، رنگ کے گہنے
پیار کے تن پر پیار سے پہنے
سپنوں کے سنگ آیا
مجھ کو کون جگانے آیا

قطعات

(شعلۂ خاموش)

دکھی انسان! محبت کی بسالے دنیا — ہر اندھیرے میں چھپاتی ہے اجالے دنیا
اپنے کردار سے، ہمت سے، قرارِ دل سے — آدمی چاہے، تو دنیا کو بنالے دنیا

طعن و تشنیع کی گفتار میں کیا رکھا ہے — ناروا فخر، اثر صحبتِ جاہل کا ہے
اس سے پہلے، کہ شر انگیز اچھالیں کیچڑ — آؤ ہم سوچیں کہ ہر خاش سے حاصل کیا ہے

یک شے جس کی ہم بھارتی بڑی خودستائی کرتے ہیں، وہ ہے ہماری روحانیت۔ یہ سچ ہے کہ اس سرزمین نے بدھ، مہاتما گاندھی اور دیگر عظیم ہستیوں کی بڑی تعداد کو جنم دیا ہے جو مبتلائے مصائب نوعِ انسانی کے لیے آدرش اور گہری ہمدردی رکھتے تھے لیکن یہ ایک نہایت مشکوک بات ہے کہ کیا ہم بھارتی مجموعی طور پر دوسروں کی نسبت کم مادہ پرست ہیں۔
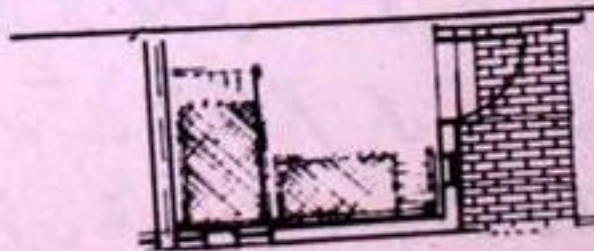
نظمیں

(شعلۂ خاموش)

رفیقو اٹھو

رفیقو اٹھو، غم و رنج کو فنا کردو — امید و بیم کا نقارہ بے صدا کردو
لگا کے آگ، سراپردۂ جہالت میں — وطن سے دور، بہت دور، ہر بلا کردو
اتار پھینکو روایت کا بوجھ کندھوں سے — سبک روی سے زمانے کو آشنا کردو
شہید جو ہوئے آزادیِ وطن کے لیے
تم ان کی خاک کو پوجا سے دیوتا کردو

ہند کا سپاہی

مردِ میدانِ وطن، ہند کی شوکت، شاباش — عاشقِ شانِ وطن، ہند کی طاقت، شاباش
سازوسامانِ وطن، ہند کی عظمت، شاباش — غازیِ آنِ وطن، ہند کی صولت، شاباش
کارناموں سے ترے، شانِ وطن دونی ہے
نامِ نامی سے ترے، آن وطن دونی ہے
ضبط کا پکا ہے تو، قتلِ عدو پر مائل! — بندۂ عشق و وفا، مکر و دغا کا قاتل
بے خطا کام ترے اور ارادے کامل — تجھ پہ غالب نہیں آسکتی کوئی بھی مشکل
سعیِ دشمن سے تو دم بھر بھی ہراساں نہ ہوا
اے گراں قدر، تو میداں میں بھی ارزاں نہ ہوا

جس کی تعظیم کو سر جھکتے ہیں، وہ سر ہے تو
جس کی قیمت نہیں لگ سکتی، وہ گوہر ہے تو
خود غرض جو نہیں، وہ قوم کا نوکر ہے تو
دشمنوں کو جو نگلتا ہے، وہ اژدر ہے تو

اسپِ ہمت کو تو ہی ایڑ لگا سکتا ہے
تو ہی افواجِ مخالف کو بھگا سکتا ہے

تیرے ہاتھوں ہی میں ہے قوم کی عزت عظمت
تیری تلوار سے چمکی ہے وطن کی شہرت
تیری جرأت نے دکھائی ہے نظیرِ جرأت
تیری تدبیر نے بخشی ہے وطن کو ہمت

دشمنوں کو جو کیا تو نے خراب اچھا کیا
اینٹ کا جو دیا پتھر سے جواب اچھا کیا

قوم کے داغِ ذلالت کو مٹانے والے
کھل گئے ہیں تیری کنجی سے جفا کے تالے
سینۂ رہ پہ، تری گرم روی کے چھالے
تو نے کیا کیا نہ عدو، رن میں بھسم کر ڈالے

جیت کر آتا ہے جب، ایسا سماں ہوتا ہے
تیری صورت پہ فرشتے کا گماں ہوتا ہے

دیپ مالا

اے قلم آگے بڑھ، اب رام کا چرچا ہوگا
معبدِ شعر میں بھگوان کا ڈیرا ہوگا
تیری تحریر میں پھر سے وہی نقشا ہوگا
تیرے اسلاف نے ماضی میں جو دیکھا ہوگا

اسی نقشے کی حقیقت کو دلوں میں بھر دے
یوں اماوس کی سیاہی میں اجالا کر دے

رام! وہ باپ کے اک لفظ پہ مرنے والا
بَن کی تکلیفوں سے بے خوف گزرنے والا
ڈوب کر موجوں میں ساحل پہ ابھرنے والا
شیر بن کر سرِ ظالم پہ بپھرنے والا

چاہے ہم اس کو یہ کہہ لیں کہ وہ بھگوان نہ تھا
پہ مگر کون کہے گا کہ وہ انسان نہ تھا

کیوں کہ آساں نہیں انساں کا بھی انساں ہونا
خلقِ مظلوم کے ہر درد کا درماں ہونا
کسی آفت میں، بلا میں نہ پریشاں ہونا
ایک بس کارِ نکو کرنا ہی ایماں ہونا

آج کی دنیا میں جو تخم نکو بوتا ہے
نسلِ آئندہ میں بھگوان وہی ہوتا ہے

آؤ دیوالی کے مقصد کو نمایاں کردیں
نورِ اخلاق سے ہر دل میں چراغاں کردیں
باہمی شمعِ محبت کو فروزاں کردیں
مال و زر کو زرِ اخلاص پہ قرباں کردیں

لکشمی پوجا ہی دیوالی کا مقصود نہیں
اے رضاؔ، حلقہ کبھی رام کا محدود نہیں

باغ و راغ

اِدھر کمالِ بشر کی نشانیاں ظاہر
اُدھر نگاہ، بشر کے کمال سے بیزار
اِدھر شباب کی سرمستیاں ہیں راتوں کو
اُدھر پہاڑ سی راتوں میں خامشی بیدار
اِدھر گلاب کے پھولوں پہ گیت بھونرے کے
اُدھر ہیں ٹوٹے ہوئے سازِ زندگی کے تار
اِدھر ہے سرو و سمن پر خرام بلبل کا
اُدھر ہے ناگ پھنی اور سانپ کی پھنکار
قدم قدم پہ اِدھر پھول پیشوائی کو
اُدھر اُلجھنے کو دامن سے بیقرار ہیں خار
روش روش پہ اِدھر مخملی بچھونے ہیں!
اُدھر یہ حال کہ جیسے ہو کوئی ماتم دار
اِدھر جو قطرہ گرا، گر کے بن گیا موتی
اُدھر جو ابر اٹھا، وہ برس گیا بیکار

اِدھر ہے ابرِ بہاری، چمن کا رکھوالا
اُدھر سموم، ریاست کی مالک و مختار

بارش

پیامِ دل کشا لائی ہے بارش
مرے غم کی دوا لائی ہے بارش
مُغنّی ساز لے کر جھومتے ہیں
سرودِ دل رُبا لائی ہے بارش
دلِ مضطر کے ارماں کیوں نہ مچلیں
نویدِ جاں فزا لائی ہے بارش
غریبوں کی تہی دستی کو مژدہ!
خزانے ہی اڑا لائی ہے بارش

ہوا ہے غرق، غم بھی جامِ مے میں خوشی کی انتہا لائی ہے بارش
ابھی برسی، ابھی تھم بھی گئی ہے کہاں سے یہ ادا لائی ہے بارش
سندیسہ دیس سے آیا ہے ہم کو کہ ساون کی گھٹا لائی ہے بارش
زمانے بھر کو بخشتی زندگانی عجب آبِ بقا لائی ہے بارش
رضاؔ یہ شعر اسی کا ہیں عطیہ
نہ پوچھو، اب اور کیا لائی ہے بارش

تضمین بر شعرِ علامہ اقبالؔ

اِک عالمِ دوراں کو منظور تھی یہ پرسش تاریخ میں قوموں کی، ہستی و عدم کیا ہے
تخریب میں امت کی، تعمیر میں امت کی ذلت کسے کہتے ہیں؟ توقیر و حشم کیا ہے
گرتی ہوئی امت جب، اٹھتی ہے تو دم بھر میں اس آہوئے ذلتیاں کی فطرت میں یہ رم کیا ہے
اک نعرے سے دشمن کے، خائف ہو حمیت کیوں؟ ہنستے ہوئے چہرے پر یہ غلبۂ غم کیا ہے
خطرہ ہو جب امت کو، دشمن کے ارادے سے اس وقت اٹھائے جو، امت وہ قدم کیا ہے
قوموں کے تقاضوں میں، قوموں کی نگاہوں میں انداز ستم کیا ہے، انداز کرم کیا ہے
اقبالؔ بھی آنکلا، سنتے ہی ہوا گویا "میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ امم کیا ہے"
شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر"

گرونانکؒ

پیار اور امن ہے تعلیم گرونانک کی لازمِ انساں یہ ہے تعظیم گرونانک کی
سب مذاہب کی طلب آپ نے کردی پوری کون کرسکتا ہے تقسیم گرونانک کی
وقفِ انساں کے لیے پیار گرونانک کا کبھی جھوٹا نہیں اقرار گرونانک کا
اِک ترازو، یہاں تلتا ہے ہر اک چھوٹا بڑا صاف ہے، سچا ہے بیوپار گرونانک کا

کرشن کنہیا آؤ

کھیل رہی ہے چاندنی من میں
ہنستا ہے جیون ہر آنگن میں
ناد بجا اب تو بھی برہمن
اور اس میں بھر دے وہ جیون
بنسری میں جو پھونک دیا تھا
جس کو بجا گئے کرشن کنہیا
اے گوکل کے گوالے آؤ
ہم کو آکر پھر اپناؤ
دیکھتے ہیں سب رستہ تمہارا
گھر گھر بن بن تم کو پکارا
بنسی میں سندیش سُنا دو
سب کو جیون لکش بتادو
اب تو ہم آدھین نہیں ہیں
دکھ میں نہیں ہیں، دین نہیں ہیں
اب تم کیوں ناراض ہو ہم سے
ہم تو مرے جاتے ہیں غم سے!
کتنے ہی جگ بیت چکے ہیں
کہاں تمہارے پاؤں رُکے ہیں
ہم تو دن یہ منا لیتے ہیں
یوں ہی من کو سمجھا لیتے ہیں
گزرا جیون روتے دھوتے
شام! کبھی تو آئے ہوتے
پوچھتے ہیں سب چاند ستارے
آئیں گے کب شام ہمارے
آؤ، شام کنہیا آؤ
بھارت شکتی بڑھانے آؤ

کیا خالی جھولی نہ بھرو گے؟
یہ اچھا بپوری نہ کرو گے؟

■

حُسن (ٹیگور سے ماخوذ)

اے حُسن! اپنے راز کو الفت کے دل میں ڈھونڈ
آئینہ چند دن کا ہے سامانِ جاں فروز
دریا جو بہہ رہا ہے یہاں ہست و نیست کا
بہنا ہے تجھ کو بھی اِنہیں موجوں میں ایک روز

پاکیزگیِ حُسن کو کہتے ہیں راستی
پاکیزگیِ حُسن میں پنہاں ہے زندگی

غزلیات

(شورشِ پنہاں)

نہ سنائے گی زباں اب غم و درد کا افسانہ
نئے موڑ مڑ رہا ہے مری فکر کا زمانہ
رہِ زیست پر ابد تک چلے ہم مسافرانہ
کبھی آگئے پلٹ کر، کبھی ہو گئے روانہ
کبھی باغ باغ ہو کر دلِ زار دیکھ تو بھی
جو چمن لٹا رہا ہے گل و برگ کا خزانہ
جو خزاں میں کھل کے اے گل! تو اکڑ رہا ہے اتنا
یہی زیست بن نہ جائے تری موت کا بہانہ
یہ رضا کی آرزو ہے کہ سحر کے پھوٹتے ہی
کوئی چپکے سے سنادے اسے دیس کا ترانہ

◆

تمغے سے شجاعت کے مزین مجھے کر جا
اے شوق شہادت تو رگِ جاں میں اتر جا
مٹ جانے کو ہے عظمتِ انساں کا نشاں تک
اے نقشِ وفا صفحۂ گیتی پہ ابھر جا
کیا ساقیٔ جز رس سے طلب گار ہوں ہر بار
اے ابرِ کرم تو کہیں نیت مری بھر جا

اک عمر سے ہے کشتۂ بیدادِ خزاں وہ
اے زلفِ صبا! پھول کے شانے پہ بکھر جا
وہ پھوٹی کرن آس کی مہتابِ بشر سے
اب اے رخِ پژمردۂ آفاق نکھر جا

◆

لاکھ پیار ہو تجھ کو جان سے
راہِ عشق میں جان سے گزر
چاہتا ہے جی توڑ کر قفس
ناچتا پھروں پھول پھول پر
حسن کا بیاں ہو تو کس طرح
آنکھ بے زباں، ہونٹ بے بصر
اوجِ عاشقی ہے فقط یہی
تو بھی بے خبر، میں بھی بے خبر
شعر اے رضا اس طرح کہو
لفظ کم سے کم بات بیشتر

■

بہ رائے دل میں وہ کیوں کر رہے گا
جو اپنے آپ میں رہتا نہیں ہے
اشاروں ہی سے چل جاتا ہے چالیس
زمانہ منہ سے کچھ کہتا نہیں ہے
اٹھا لیتی ہے شبنم والہانہ
کوئی آنسو گرا رہتا نہیں ہے
نہالِ آرزو نازک ہے اتنا
صبا کی چوٹ بھی سہتا نہیں ہے
یہ ہے پہچان مستوں کے لہو کی
وہ پستی کی طرف بہتا نہیں ہے

حق دار کو حق دلانے والا
انسان نیا ہے آنے والا
مجھ سے نہ بگاڑیئے کہ میں ہوں
ہر کام میں کام آنے والا
ہر روز صبا کا روپ بھر کر
ڈھونڈے گا ہمیں بھلانے والا
ان شعلہ رخوں سے کون اُلجھے
یہ کام ہے گھر جلانے والا
اب آپ کے بعد حسنِ گل بھی
نظروں میں نہیں سمانے والا

◆

دم لینے کو منزل پہ ٹھہرنا بھی تو آئے
مرنے کی طرح آپ کو مرنا بھی تو آئے
خواہش ہے کہ گلزار میں اتریں کبھی لیکن
شبنم کی طرح ہم کو اترنا بھی تو آئے
الفت میں ہے وہ رنگ کہ جی اٹھتے ہیں مردے
یہ رنگ مگر زیست میں بھرنا بھی تو آئے
ہر فعل نشاں وہ ہے فنا اور بقا کا
آئینے ہزاروں ہیں سنورنا بھی تو آئے
ملاح بھی ہے، ناؤ بھی ہے دل بھی ہے لیکن
بے کھٹکے ہمیں پار اترنا بھی تو آئے

◆

اس سمت بھجن ہوتے ہیں اس سمت فغاں ہے
وہ تیری مناجات ہے یہ میری زباں ہے
افسانہ نہ سمجھو یہ حقیقت کا بیاں ہے
انسان پہ انسان کو دشمن کا گماں ہے

یہ بحرِ فنا میرے ہی اشکوں کا ہے پانی
یہ ابرِ سیہ میری ہی آہوں کا دھواں ہے
جب روح منور تھی ہر اک دل تھا مُصفّا
یہ دور اسی دور کا دھندلا سا نشاں ہے
چھوڑی ہے رِضا جب سے نشیمن کی تمنّا
خطرہ نہیں صیّاد سے بجلی سے اماں ہے

◆

شام کب ہوتی ہے کس وقت سحر ہوتی ہے
عشق میں کس کو زمانے کی خبر ہوتی ہے
ہم اسیرِ غم و حسرت سہی، لب بستہ سہی
وقت کٹتا ہے بہرحال، بسر ہوتی ہے
جس قدر مجھ کو ڈراتی ہے شبِ ہجر و الم
خواہشِ آہ و بکا اور نڈر ہوتی ہے
رات بھیگی ہو، نظر پاک ہو، دل مائل ہو
ایسے میں آہ و فغاں زود اثر ہوتی ہے
تیری رحمت کو بنا لیتے ہیں منزل تھک کر
بھولے بھٹکوں کی یہی راہ گزر ہوتی ہے

◆

بچھڑ کر کارواں سے راہرو ایسا ہوا تنہا
تھکا تنہا، گرا تنہا، اٹھا تنہا، چلا تنہا
کبھی میخانۂ دل سے اٹھا کرتی تھی قلقل بھی
اب اٹھتی ہے شکستِ شیشہ و خم کی صدا تنہا
جلا دیتا ہوا گلزارِ ہستی کے نہالوں کو
گزر جا اے دلِ خود دار تو مثلِ صبا تنہا
غمِ فردا، نشاطِ عہدِ رفتہ، وحشتِ ہستی
بھری محفل میں ان کا ذکر مجھ کو کر گیا تنہا

مزاجِ دہر بدبختوں کے حق میں کب سنورتا ہے
وہی سب بے وفا یکجا، وہی میں باوفا تنہا

◆

جب کبھی اکیلا پن جی اداس کرتا ہے
یک بیک خیالوں میں کوئی آ اترتا ہے
غازۂ محبت کو روز روز ملنے سے
روح بھی نکھرتی ہے قلب بھی نکھرتا ہے
اس طرح ابھرتی ہیں زندگی کی تصویریں
عقل کھینچتی ہے خط شوق رنگ بھرتا ہے
چھاؤں میں صداقت کی دن گزار لیتا ہوں
رات کی سیاہی میں صبر نور بھرتا ہے
اے رضا تجھے ڈر کیا دین کے تقاضوں سے
آج کے زمانے میں کون ان سے ڈرتا ہے

■

ہاں، دلِ زار! گئے وقت کا غم کرتا جا
دم بدم زیست کو آلام میں ضم کرتا جا
رتبۂ عشق بڑھاتا جا وفا کر کر کے
رفتہ رفتہ غمِ آفاق کو کم کرتا جا
اے میری گور سے بے دید گزرنے والے
دل سے گریہ نہ سہی، آنکھ تو نم کرتا جا
کشتۂ شوق سناتا جا کہانی اپنی
نسلِ آئندہ پہ تھوڑا سا کرم کرتا جا
میں بھی مٹنے کا نہیں دستِ کرم رکھتا ہوں
تو بھی اے دوست ستمگار، ستم کرتا جا

الم سہہ لو، چپ چاپ رو لو
گرہ دل کی منہ سے نہ کھولو
یہ اِک دن دکھائے گا نیچا
بڑا بول ہرگز نہ بولو
نکل آئے گا روپ دل کا
سیاہی خیالوں کی دھولو
ندامت کے آنسو بہا کر
گہر جس قدر چاہو رولو
محبت کو جانچے نظر کیا
اسے دل کے میزاں میں تولو

■

جس کے دل میں تری یاد ہے
غم کے باوصف وہ شاد ہے
بوند بھی مے کدے میں نہیں
غم کدہ اب بھی آباد ہے
پار اترنے تک ازبر رہا
کس کو اب ناخدا یاد ہے
دل بھی روئے پلک تر نہ ہو
یہ بھی اک حسنِ فریاد ہے
سر گذشتِ بشر کچھ نہیں
قصّہ درد و فریاد ہے

■

حرص کی کسوٹی پر زندگی کو کستے ہیں
زر سے کھیلنے والے جینے کو ترستے ہیں
کھل چکا درِ زنداں کٹ چکی سلاسل بھی
یہ قفس کے دلدادہ کس جہاں میں بستے ہیں

آسماں سے رحمت کی بوند بھی نہیں گرتی
ابر زندگی والے اب کہاں برستے ہیں
آنکھ خیرہ کرتی ہے زیب و زینتِ منزل
رہ گزر پر لاشے دفن کو ترستے ہیں
رفتہ رفتہ سمجھو گے، اے رضاؔ زمانے کو
ٹیڑھی سیدھی منزل ہے، ٹیڑھے سیدھے رستے ہیں

■

وہ لاکھ اہلِ خرد ہیں نکتہ داں ہیں
جہاں والے ابھی جاگے کہاں ہیں
نہ جانے کیا تھا غنچے کی چٹک میں
گلوں کی آنکھ سے آنسو رواں ہیں
یہ کس برتے پہ پھولا ہے زمانہ
تنِ لاغر ہے ننگی ہڈیاں ہیں
شجر ہو، کوہ ہو، ہفت آسماں ہوں
پرِ پرواز کو سب آشیاں ہیں
ابھی ہے دور منزل آدمی کی
ابھی شیخ و برہمن درمیاں ہیں

■ ■

کون مستوں کو جکڑ سکتا ہے
ٹوٹتی جاتی ہے زنجیرِ ستم
پوچھتے کیا ہو مصائب کا سبب
فقط اک حرفِ طلب بیش نہ کم

■

خواہشِ عیش و طرب کیا ہم کیا
بے نواؤں کی خوشی کیا، غم کیا
کوسنے والے! بتادے یہ بھی
زخم گفتار کا ہے مرہم کیا

■

خرد کی روشنی میں زندگی لگتی ہے کہنہ سی
مگر الفت کے سائے میں نئی معلوم ہوتی ہے
دلِ ساقی میں بھی فیّاضیاں اب وہ نہیں باقی
مرے جوشِ طلب میں بھی کمی معلوم ہوتی ہے

■

مشیت خبر دے گئی ہنستے ہنستے
کہ انساں خوشی میں بھی روتا رہے گا
مجھے آج تڑپا کے خوش ہونے والا
مرا نام لے لے کے روتا رہے گا

■

سو نشتر اک ساتھ بھی مارے
تو بھی نہیں یہ دنیا قاتل
نظریں بھی منزل میں گڑی ہیں
سنگِ بلا بھی راہ میں حائل

■

کون مستوں کو جکڑ سکتا ہے
ٹوٹتی جاتی ہے زنجیرِ ستم
پوچھتے کیا ہو مصائب کا سبب
فقط اک حرفِ طلب بیش نہ کم

■

خواہشِ عیش و طرب کیا ہم کیا
بے نواؤں کی خوشی کیا، غم کیا
کوسنے والے! بتا دے یہ بھی
زخم گفتار کا ہے مرہم کیا

■

خرد کی روشنی میں زندگی لگتی ہے کہنہ سی
مگر الفت کے سائے میں نئی معلوم ہوتی ہے
دلِ ساقی میں بھی فیاضیاں اب وہ نہیں باقی
مرے جوشِ طلب میں بھی کمی معلوم ہوتی ہے

■

مشیت خبر دے گئی ہنستے ہنستے
کہ انساں خوشی میں بھی روتا رہے گا
مجھے آج تڑپا کے خوش ہونے والا
مرا نام لے لے کے روتا رہے گا

■

سو نشتر اک ساتھ بھی مارے
تو بھی نہیں یہ دنیا قاتل
نظریں بھی منزل میں گڑی ہیں
سنگِ بلا بھی راہ میں حائل

■

دیوانگیٔ دل مری پہلے سے سوا تھی
جب پاؤں مرا حلقۂ زنجیر سے نکلا
فرقت کے شرر کب کا جلا بیٹھے تھے اس کو
دل سے جو دھواں نکلا وہ تاخیر سے نکلا

■

ممکن ہے کہ دیوانہ کوئی چین سے رہ لے
اس دور میں انسان تو خوش رہ نہیں سکتا
غم خانۂ دل صبر و قناعت پہ ہے قائم
سیلابِ بلا میں بھی یہ گھر بہہ نہیں سکتا

■

مدحتِ رنگ و بوئے چمن کس لیے
رنگ و بو دینے والے کی مدحت کرو
بوئے گل کی طرح ہم بھی آزاد ہیں
قید کرنے کی ہم کو نہ جرأت کرو

■

قطعات

(شورشِ پنہاں)

آدمی جانتا ہوں مفلس کو — بے زوروں کو بشر سمجھتا ہوں
عیب جوئی نہیں مرا مسلک — سنگ ریزوں کو زر سمجھتا ہوں

■

تشنۂ خوں ہے نوک کانٹوں کی — میکشی کے نشان پھولوں میں
خشم و نفرت ہے ظرف کانٹوں کا — رنگ و بو کا جہان پھولوں میں

■

جھک کے ڈالی نے پھول سے یہ کہا — حُسنِ فطرت پہ افتخار نہ کر
رنگ و بو دو گھڑی کا سہرا ہے — ایسی عزت کا اعتبار نہ کر

■

کِھل کے زورِ نمو سے اے غنچو! — خود کو ہم پایۂ بہار کرو
بخششِ غیر پر نظر کیوں ہو — اپنی ہمت پہ اعتبار کرو

■

کبر و نخوت کے تیز کانٹوں سے — دامنِ دل نہ تار تار کرو
چند کارِ ثواب ہوں بھی تو کیا — عمر بھر کے گنہ شمار کرو

■

غنچہ و گل کی لے کے دل میں کشش — ذہن میں شوقِ رنگ و بو لے کر
ہم پھریں ریگ دشت پر کب تک — سیرِ گلشن کی آرزو لے کر

فطرتاً سادگی سے ہیں مانوس — صاف، پیمان ہے اپنا
ہم کو پہچاننا نہیں مشکل — دردمندی، نشان ہے اپنا

کیسے دن ہیں یہ، زندگانی کے — رات بھیگی ہوئی، جہاں خاموش
روح تاریک، گُل چراغِ امید — قلب، بے آرزو، زباں خاموش

ابر آلود بھی اگر ہو دِن — مل ہی جاتی ہے روشنی کی جھلک
اب نہیں ملتی کھوج پر بھی مگر — ابنِ آدم میں آدمی کی جھلک

زندگی بھی عجیب ہے سودا — سُود ڈھونڈو، زیاں نکلتا ہے
کھونے والا ہی غم نہیں کرتا — پانے والا بھی ہاتھ ملتا ہے

شدتِ غم سے مانگتا ہے پناہ — کثرتِ کار سے گھبراتا ہے
آدمی موت سے نہیں ڈرتا — آدمی زندگی سے ڈرتا ہے

موتیوں کی چمک نہیں کچھ بھی — روشنیِ ایاغ کچھ بھی نہیں
سامنے نورِ علم و ایماں کے — مال و زر کا چراغ کچھ بھی نہیں

جب دکھاتا ہے باطل اپنا زور — میری، حق پر نگاہ ہوتی ہے
ایسی حالت میں میری جرأت کی — ذاتِ باری گواہ ہوتی ہے

تجھ سے میں اے حسینۂ اردو — لوگ کہتے ہیں پیار کرتا ہوں
پیار ہی تجھ سے میں نہیں کرتا — جان تجھ پر نثار کرتا ہوں

"شورشِ پنہاں"

◆

گمشدہ نغمے

جیسے آوارہ، گنہگار، شرابی چہرے — جیسے مستانہ، بلاخیز، لبالب ساغر
جیسے چڑھتے ہوئے دریا کے بپھرتے دھارے — جیسے شوخی سے ابھرتے ہوئے نوخیز بھنور
زندگی دیتے ہوئے جیسے ہوا کے جھونکے — جیسے پت جھڑ کے گزرنے پہ پنپتے ہوئے پھول
جیسے برسات میں اشجار کے کھلتے ہوئے رنگ — دمبدم جیسے بدلتے ہوئے گلشن کے اصول
وسوسے جیسے دلِ زار میں میٹھے میٹھے — جیسے عشاق کے ہونٹوں پہ رہ جاتے سوال
جیسے رقاصۂ بسمل کے چھنکتے گھنگرو — شعر میں ڈھلتے ہوئے جیسے سخنور کے خیال
جیسے تاریک فضاؤں میں چمکتے جگنو — جیسے کانوں میں کسی شوخ کے ہلتے بندے
جیسے ہنگامِ سحر پھولوں پہ شبنم کے گہر — جیسے مہتاب کی کرنوں کے روپہلے تحفے
جیسے ساون میں درختوں پہ خوشی کے جھولے — جیسے مدہوش ہواؤں میں مچلتے آنچل
جیسے بجلی کے لپکتے ہوئے زندہ شعلے — جیسے بدمست، دھواں دھار، گرجتے بادل
کاش ان گمشدہ نغمات کی ہلکی سی جھلک — کہیں ان ڈھونڈتی آنکھوں کو دکھائی دیتی
میرے کانوں کو، جو حاصل نہیں قربت، نہ سہی — دور ہی سے کوئی آواز سنائی دیتی!

■

ترکِ دُنیا کیوں؟

نظم کا مرکزی خیال سنت گیانیشور کی "گیانیشوری" سے لیا گیا ہے۔ سنت گیانیشور اپنے والد وِٹھوبا کو، جو ترکِ دنیا کر کے بن کو سدھار گئے ہیں، واپس لانے کی کوشش کرتے ہیں اور قیل و قال کے بعد مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں!

گیانیشور:۔ کس لیے بزمِ جہاں کو چھوڑ کر — آپ نے بن کو بنایا مُستقر
وِٹھوبا:۔ قلب کی تسکین و راحت کے لیے — بن ہی موزوں ہے عبادت کے لیے
شہر میں افکار کا ہے اِزدحام — دولتِ دنیا سے لوگوں کو ہے کام
قدرتی پھولوں سے وہ بیزار ہیں — پھول سونے کے انھیں درکار ہیں
میں مگر طبعی چمن پر ہوں فدا — میں نے بن میں اس لیے ڈیرا کیا
گیانیشور:۔ جو کرے تفریقِ زہر و انگبیں — وہ فنا فی اللہ ہو سکتا نہیں
شہر و صحرا میں کرے جو امتیاز — اس پہ کیا ہوگا درِ اللہ باز
آپ جسم و جاں کو لے جائیں کہیں — کیا ملے گا، دل جو قابو میں نہیں
ڈال لیں پردہ، کہ آنکھیں موند لیں — ایک ہے انجام، جو چاہیں، کریں
جس طرح اِک بجھتے شعلے کی بھڑک — بن نہیں سکتی ہے بجلی کی کڑک
اڑتا پھرتا جیسے کہرے کا دھواں — بن نہیں سکتا کبھی ابرِ رواں
جس طرح اک عاملِ خُبث و بدی — آرزو رکھے مآلِ نیک کی
جس طرح پتّوں میں پنہاں پھول پر — باغباں کی جا نہیں سکتی نظر
اِس طرح تارک! دوئی کا شیفتہ — ہو نہیں سکتا حبیبِ کبریا
وِٹھوبا:۔ دل نہ جب تک فکر سے آزاد ہو — کس طرح وہ بندگی سے شاد ہو
محفلِ دنیا کے جب تک ہیں قریں — ہم دوئی، دل سے مٹا سکتے نہیں
ہے اگر شوقِ وصالِ کبریا — بڑھ کے جنگل سے، نہیں کوئی جگہ
گیانیشور:۔ محض اپنے نفس کی پہچان ہی — ہے خدائے بحر و بر سے آگہی

وٹھوبا:- اپنے مرشد کی مدد سے، مہر سے | نفس کو انسان اگر پہچان لے
محوِ لطفِ نفس رہنے کے لیے | لازمی ہے، وہ کسی بَن میں رہے
اس لیے لازم ہے دنیا چھوڑنا | زندگی سے بھاگنا، منھ موڑنا

گیانیشور:- جن کو دنیا کا، خدا کا گیان ہے | حق و باطل کا جنھیں عرفان ہے
جانتے ہیں وہ، کہ دنیا چھوڑ کر | ہو نہیں سکتے ادا سے بے خبر
خار، نوک اپنی چھپا سکتا نہیں | دل کا، "میں" پر ناز، جا سکتا نہیں
شہر و صحرا پر نہ جھگڑا کیجیے! | بندگی پر دل کو پکا کیجیے!

وٹھوبا:- مل کے حق میں، ہو چکے جو ایک ذات | گھر میں رہ کر ان کی کب بنتی ہے بات
خواب میں بھی وہ نہیں کرتے خیال | ہو انھیں مجبوریِ آل و عیال

گیانیشور:- شوکتِ ایوانِ حق کچھ اور ہے | عالمِ عرفانِ حق کچھ اور ہے
اہلِ دل پردے میں رہ سکتے نہیں | وہ دوئی کی بات کہہ سکتے نہیں
نفرت و غصہ نہیں ان کا جہاں | امتیازِ این و آں ان کو کہاں
کام تجنے سے جو ہوں ہم نیک نام | ہے ریاضت بھی تو اک سر گرم کام
آپ فکرِ ترکِ دنیا چھوڑ دیں | امتیازِ شہر و صحرا چھوڑ دیں
آپ کیوں رنگِ دوئی پر ہیں فدا | عارفوں کو جہل سے کیا واسطا
پالیا ہے ہم نے جب عرفانِ حق | چھین لے گا کون اب عرفانِ حق
لعل، مخزن میں ہے یا زیرِ زمیں | اپنی قیمت کو کبھی کھوتا نہیں
پھول صحرا میں ہے، یا گلشن میں ہے | پھول کی بو، پھول کے دامن میں ہے
دھوپ مٹی پر پڑے، یا برف پر | اس میں رہتی ہے تجلّی جلوہ گر
ندیوں کو گو کناروں سے ہے کام | بحر سے بھی ربط ہے ان کو مُدام

ہر کہیں ہے قادرِ مطلق کا گھر!
کون گھر ہم جائیں، یہ گھر چھوڑ کر؟

نیا انسان

ہوش مندانِ زماں کو نیند سی آئی ہوئی
مُردنی سی بشرۂ آفاق پر چھائی ہوئی

خندۂ گفتار میں اشکوں کا دریا موجزن
قہقہوں کی بجلیوں میں گھپ اندھیرا ضوفگن

عدل کا بے خم ترازو، حق کو جھٹلاتا ہوا
ذہن، راہِ منصفی میں ٹھوکریں کھاتا ہوا

نیکیوں کے عارضِ گلنار، مرجھاتے ہوئے
زندگی کے سر پہ غم کے سانپ لہراتے ہوئے

محفل آرائے زماں کو زیست کی دشواریاں
رقص گاہِ روح میں ہر گام دل آزاریاں

پتا پتا غمزدہ، لب پر شکایت خار کی
اوس سی پڑتی ہوئی گلزار پر یک بارگی

دست و بازو کانپتے، قلب و طبیعت مضمحل
حوصلے پژمردہ، سینے سرد، ہمت مضمحل

حسن کے معنی، فقط عورت کا حسنِ دلربا
عشق کے معنی سرِ بازار ہونا بے حیا

معبدِ انسانیت، پاکیزگی کھوتا ہوا
عابدوں کے دل میں باطل جلوہ گر ہوتا ہوا

عاجزوں کے بھیس میں پتلے جفا و جور کے
دل میں عزت اور کی، لب پر ترانے اور کے

حق نگر، حق بات پر بھی شبہ میں پڑتا ہوا
عقلمند اپنے ہی عقل و ہوش سے لڑتا ہوا

اب کوئی ایسا کہاں، جو غم کا دھارا موڑ دے
اے نئے انسان جنم لے، نظمِ کہنہ توڑ دے

بھگوان بدھ کا تیاگ

آدھی رات، مگن، مدھ ماتی، کم کم چمکے ہر تارا
گھٹتی گھٹتی چاندنی پر تھا، بڑھتا بڑھتا اندھیارا

اندر باہر نوکر چاکر، گہری نیند میں سوتے ہیں
اوس کے قطرے پھلواری میں پھولوں کا منہ دھوتے ہیں

راج محل میں راجہ رانی، سجل سجیلی سیجوں پر
لمبی تانے سوئے ہوئے ہیں، راج کی چنتا کو تج کر

راہل ایک برس کا بچہ سویا ہوا ہے ماں کے ساتھ
کالی آنکھیں، گورا مکھڑا، کومل بانہیں، ننھے ہاتھ

چند قدم پر راجکمار، ان باتوں سے بے سُدھ گوتم
سوچ رہا ہے کب وہ چھیڑے تیاگ ترانے کی سرگم

کھلی کھلی انگارا آنکھیں، چہرہ لال گلابی سا
اس کو کب سونے دیتی ہے بکھرے من کی ویاکُلتا

کھوج ضرور کرے گا وہ، کیوں ہم کو دکھوں نے گھیرا
جنم جنم ہم کیوں کرتے ہیں، جھوٹی دنیا کا پھیرا

پا نہ سکے گا کیا یہ پرانی، کسی طرح نروان کا پد — جینے مرنے ہی میں رہنا، کیا ہے یہی آنند کی حد
گوتم اٹھا، بستر چھوڑا، ایک نظر راہل پر کی — پیار سے پھر پتنی کو دیکھا، من ہی من میں آ گیا لی
من کا پکا، بات کا پورا، راج محل سے کیا نکلا — گھوڑے پر چڑھ کر دم بھر میں، ہوا سے باتیں کرنے لگا
دور کہیں ویرانے میں، وہ جا ٹھہرا دم لینے کو — جیسے سنبھلتا ہے مانجھی، منجدھار میں کشتی کھینے کو
لمبے سنہری بال اپنے خنجر سے اس نے کاٹ دیے — پھاڑ دیا شاہی کپڑوں کو، سادہ کپڑے پہن لیے
پھر گھوڑے کی پیٹھ کو ٹھونکا پیادے بن کو موڑ دیا — تن من دھن سے تیاگی نے دنیا سے ناتا توڑ لیا

دن چڑھ آیا، سورج نکلا، پیڑ کی چھایا بڑھنے لگی
شب بھر کی سوئی بن دیوی راج سنگھاسن چڑھنے لگی

کشمکش

وہی میں ہوں، وہی ساحل، وہی موجیں، وہی طوفاں
وہی اس پار میری زندگی
مجھ سے جُدا ہو کر
دوبارہ مجھ میں آملنے کی سوزش میں تڑپتی ہے!

وہی رستے میں حائل ہے سمندر دین و دنیا کا
وہی الفت کی کشتی
ڈگمگاتی، ڈوبتی، بہتی
کہیں ساحل پہ جا لگنے کی خواہش میں تڑپتی ہے

وہی کالی گھٹائیں آسماں پر یاس و حسرت کی
وہی بجلی خیالِ خودکشی کی
مجھ کو رہ رہ کر
جلا کر خاک کر دینے کی کوشش میں تڑپتی ہے

غزلیات

(شاخِ گلؔ)

زور بھی ہے نالوں میں آہ میں اثر بھی ہے
گور میں شبِ غم کی عیش کی سحر بھی ہے

بستیاں غریبوں کی بہہ گئیں تو ہنسنا کیا
سیلِ اشک کی زد میں آپ کا نگر بھی ہے

زندگی کی راہوں میں اک چلن کہاں ممکن
دو قدم کی دوری بھی چاند کا سفر بھی ہے

کور دل کو راحت ہی تیرگی میں ہے ورنہ
آدمی کے دامن میں شمس بھی قمر بھی ہے

غم کی چار دیواری زندگی کے گردا گرد
آدمی کا زنداں بھی آدمی کا گھر بھی ہے

◆

ہمارے در سے طلب گار اور کیا پائے
دہکتے ڈھیر سے مٹھی بھر آگ لے جائے

ملی نہ بھیک تو تھک کر ہم اپنی جھولی میں
کسی غریب کے قدموں کی دھول بھر لائے

ہم اپنی آن کو مرقد بنائیں گے اپنا
جنھیں ضمیر نے مارا شہید کہلائے

غبارِ راہ بنے منھ چھپائے پھرتے ہیں
وہ لاکھوں سنگِ گراں عزم سے جو ٹکرائے
میں وہ صدا ہوں جو حالِ دروں سنائے بغیر
اثر کی کھوج میں در در کی ٹھوکریں کھائے

◆

کانٹوں سے بچنے کا اے دل! ایک ہی رستا
رنگ برنگے پھولوں کی دیوار بنا لے
دھوپ کی ایک جھلک کو کتنے دن ترسیں گے
ہم بیچارے، دھول کے جنمے، دھند کے پالے
کوئی جئے تو کیوں کر اب سادھن ہی یہی ہیں
وِش کے گھونٹ، دھوئیں کی سانسیں، دکھ کے نوالے
جن کے ہاتھ میں ہے وہ تجھ کو لے ڈوبیں گے
ہائے ری بھاشا! باگ تری اب کون سنبھالے
آپ بجا کہتے ہیں ادب میں سب کا ساجھا
لیکن اس کو گٹ بندی سے کون نکالے

◆

ازل سے تا بہ ابد ایک ہی کہانی ہے
اسی سے ہم کو نئی داستاں بنانی ہے
خرد کی باتیں کہاں تک کرو گے دیوانو!
خرد کے نام پر کچھ خاک بھی اڑانی ہے
تمھارے رنگِ جفا کو بھی ہے قیام کہیں
ہمارے عشق کی منزل تو کامرانی ہے
حیات لاکھ ہو فانی مگر یہ سُن رکھیے
حیات سے جو ہے مقصود غیر فانی ہے
سنی سُنائی پہ ترجیح لاکھ بار اس کو
کتابِ دل کی رضا بات آسمانی ہے

ہر گام ہے جہل کار فرما
اِس دور کی آگہی کے پیچھے
مصروفِ عمل ہے خود ہی انساں
ہر غم کے ہر خوشی کے پیچھے
بہہ جاؤ گے اشک سے نہ الجھو
طوفان ہے اس نمی کے پیچھے
سو فکر اک آرزو کی تکمیل
پاگل نہ ہو زندگی کے پیچھے
اک شمعِ ازل کا ہے یہ پرتو
کب چاند ہے چاندنی کے پیچھے

◆

غرور و ناز ! بتا، عرش پر کہ دھرتی پر
کہاں ملیں گے ترے خاک میں ملاتے ہوئے
اصول گرد ہوئے، نظم و ضبط خاک ہوا
چراغ بجھ گئے انسان کے جلائے ہوئے
تنی تنی رہی گردن مرے سفینے کی
گزر گزر گئے طوفان سر جھکائے ہوئے
کوئی نچوڑ کے گیسو چمن کی پیاس بجھائے
زمانہ ہوگیا کلیوں کو مسکرائے ہوئے
بجھی بجھی سی تمنائیں، کھولتی لہریں
گھٹے گھٹے سے خیال آگ سی لگائے ہوئے

◆

ساحل نہ سفینے کا پتا ہے
ہر موج کو انتظار سا ہے
پھر جمع ہیں بکھری آرزوئیں
پھر دل کا چراغ جل اٹھا ہے

انساں کو دقتِ نظر نے
فانی سے امر بنا دیا ہے
اب کون ہے وجہِ ناز مجھ کو
جُز داغ جو دل پہ رہ گیا ہے
اُف رے یہ ابال سوزِ دل کا
ہر اشک دھواں اگل رہا ہے

◆

ہوا کی سسکیاں دیں گی گواہی
گزرنے کے نشاں دیکھو نہ دیکھو
رہے سیلاب کا عالم ہمیشہ
ندی کو بے کراں دیکھو نہ دیکھو
سُنو نغمے کی لَے، پایل کی چھم چھم
چراغوں کا دھواں دیکھو نہ دیکھو
رہے بیدار شوقِ آبیاری
گلستاں کو جواں دیکھو نہ دیکھو
مرے درد و الم رکھو نظر میں
مرے اشکِ رواں دیکھو نہ دیکھو

◆

جب فکروں پر بادل سے منڈلاتے ہونگے
انساں گھٹ کر سائے سے رہ جاتے ہونگے
دو دن کو گلشن پہ بہار آنے کو ہوگی
پنچھی دل میں راگ سدا کے گاتے ہونگے
ہنستی کلی برہن کی چِتا بن جاتی ہوگی
کالے بادل گھر کر آگ لگاتے ہونگے
دکھ میں کیا کرتے ہوں گے دولت کے پجاری
روپ کھلونا توڑ کے من بہلاتے ہونگے

پھولوں سے بھی رت کا روپ نکھرتا ہوگا
کانٹے بھی موسم کا ہاتھ بٹاتے ہونگے

◆

پل پل مالا پھیرو نہ پھیرو
لیکن پگ پگ پیار بکھیرو
کب تک من کو دھیرج دوگے
آس کے سپنو! راکھ کے ڈھیرو!
پیچھا کرنے سے کیا ہوگا
آگے بڑھ کر آگ کو گھیرو
مجھ کو بہت ہے اتنی بھکشا
گھر سے نکلو، در سے پھیرو
دل کو رضاؔ کے روشن رکھنا
نکھری شعاعو، اُجلے سویرو!

◆

مُلا مُلا کے غموں کو گلے لگاتے چلو
کسی کے بھی ہوں الم جزوِ دل بناتے چلو
خراشِ سنگِ حقائق سے کیوں ڈرے کوئی
نئی نظر نئے خوابوں کو آزماتے چلو
یہ دھیمی لو ہی اندھیروں کو راس آتی ہے
ہٹا کے شمس و قمر شمعِ دل جلاتے چلو
رہِ ملال و محن سخت بھی ہے طویل بھی ہے
اسی کے پار ہے منزل، قدم بڑھاتے چلو
رضاؔ یہ تازگیٔ زیست ہی تو سب کچھ ہے
چمن بھی کھلتے رہیں تم بھی لہلہاتے چلو

جانے کس الجھن میں پڑا ہوں
ڈوبا سا ساحل پہ کھڑا ہوں
مجھ کو میری جگہ رہنے دو
انساں ہوں چھوٹا نہ بڑا ہوں
کیوں نہ چلیں سب مجھ سے بچ کر
پتھر سا رستے میں گڑا ہوں
ڈھونڈ آیا پاتال تک انساں
میں موتی دھرتی پہ پڑا ہوں
ہمدردی کا آنسو ہوں میں
ہیرا سا آنکھوں میں جڑا ہوں

◆

دین دنیا کا پجاری نہ سیاست کا نقیب
میں ہوں فنکار، فقط فن و ادب میرے حبیب
ناپتا پھرتا ہے کیا، کون ہے یہ دشت نورد
پاؤں میں موزۂ غم، ہاتھ میں آہوں کی جریب
کامل انسان کی عظمت کو نہ پہنچا کوئی
نہ معلّم، نہ مبلّغ، نہ سخنور، نہ ادیب
جہل ہی بڑھ کے اگر دینے لگے دعوتِ ہوش
آگہی ڈوب نہ جائے تو کہاں جائے غریب
کوئی ہنگامہ نظر آئے تو قرباں ہو جاؤں
کب سے کاندھوں پہ لیے پھرتا ہوں ہستی کی صلیب

◆

جدھر خود گیا تھا لگا لے گیا
نہ جانے کدھر راستا لے گیا
کوئی دے کے مجھ کو شعورِ حیات
مرا "دورِ صبر آزما" لے گیا

گدا لے گیا کب میرے در سے بھیک
صدا میرے لب کی چرا لے گیا
خرد ڈھونڈتی رہ گئی وجہِ غم
مزہ غم کا دردِ آشنا لے گیا
نہ کشتی نہ ماجھی نہ ہمّت نہ زور
اب اس پار جو لے گیا لے گیا

◆

منزل کی دھوم دھام سے جب جی اُچٹ گیا
رہ گیر جیسے سینکڑوں رستوں میں بٹ گیا
افسوس دل تک آنے کی راہیں نہ کھل سکیں
کوئی فقط خیال تک آکر پلٹ گیا
کیا جانے کس چٹان سے ٹکرا گیا ہے دل
چلتا ہوا سفینہ اچانک الٹ گیا
اب کوئی ڈھونڈ ڈھانڈ کے لاؤ نیا وجود
انسان تو بلندیٔ انساں سے گھٹ گیا
منزل پہ گردِ وہم و گماں تھی وہ ڈھل گئی
رستے میں عقل و ہوش کا پتھر تھا ہٹ گیا

◆

ہم کو لے آئی تھی پھولوں کی طلب گلشن میں
چاک ہو جائیں گے داماں یہ خبر کس کو تھی
آہِ مظلوم پکار آئی گلی کوچوں میں
شہر تھا شہرِ خموشاں یہ خبر کس کو تھی
جلوۂ عام کے دھوکے میں چلے آئے تھے
بند ہوگا درِ جاناں یہ خبر کس کو تھی

اُگیں گے پھول خیالوں کے رنگ زاروں سے
خزاں کے گھر سے جلوسِ بہار نکلے گا

◆

آنکھوں سے نکل گیا اندھیرا
تارے سے پلک پہ جگمگائے
گلشن گلشن کھنگال ڈالا
خوشبو خوشبو پکار آئے

◆

پھر بھی زمانہ مجھے غلط سمجھا
جھوٹ پھر بڑھ گیا صداقت سے
بے گنہ دل کو یہ سزا کیسی
کانپ اٹھا نزولِ رحمت سے

◆

سراغ مہر و محبت کا ڈھونڈ لیجیوں نہ کہیں
کہ ان کی راکھ ہوا میں بکھیر آیا میں
شباب پر تھا چمن، انتخابِ گل کیا
تمام پھول نظر میں سمیٹ لایا میں

◆

جو اپنے سفر کا پکا ہو، رہزن سے اسے کس بات کا ڈر
آمد پہ مری اکثر یہ ہوا، تقدیر نے رستا چھوڑ دیا
دنیا کے مصیبت خانے میں، تقدیر نے جنت سے لاکر
صحرا میں کھلے اک گُل کی طرح، انساں کو تنہا چھوڑ دیا

جس نے اک عہد کے ذہنوں کو جلا دی ہوگی
میرے آوارہ خیالات کی بجلی ہوگی
جتنی مل جائے گی کانٹوں کی چبھن لے لوں گا
جو بھی حالت دلِ بے تاب کی ہوگی ہوگی
میری ناکامیِ حالات کے مارے کے سوا
ایک ندی بھی تو بے آب نہ بہتی ہوگی

■

یہ آج کے انسان، الٰہی توبہ
چہروں کے چمن زار، دلوں کے جنگل
دھنوان نچھاور کرے دھن کس دل سے
برسا ہے کبھی ٹوٹ کے پیاسا بادل
اب تجھ کو رضا کیسے کوئی پہچانے
اک پیڑ کی تصویر، جہاں پھول نہ پھل

■

وقت سرگراں، زندگی خفا
ہونٹ خشک، آنکھ نم
تارے بھی چھپے، چاند بھی ڈھلا
جب کہیں ہوا پھول کا جنم
اپنے وقت پر کھلتے ہیں سبھی
تارے وقتِ شب، پھول صبحدم

■

چمن کا حسن سمجھ کر سمیٹ لائے تھے
کسے خبر تھی کہ ہر پھول خار نکلے گا
یہ حکم ہے کہ کوئی راہِ راست پر نہ چلے
ہوا کے گھوڑے پہ کوئی سوار نکلے گا

امرت منتھن

گڑگڑ، گڑگڑ، گھم گھم گھم گھم — جھالے، جھاگ، جھنا جھن، جھم جھم
کیفیت ابتر، حال دگرگوں — ایک ہوئے پاتال اور گردوں
اتھاہ پانی، وشال ساگر — اِدھر اُدھر ہر طرف سمندر
دیو اِدھر ہیں اُدھر ہیں دانو — دیووں میں کس کام کے مانو
مندر گری کی بھاری متھنی — آدی شیش کی اجگر رسّی
بھنور بھیانک، لہریں، پربت — ڈھل ڈھل ڈھل ڈھل لت پت لت پت
دیو اور دانو ہوس کے مارے — ماندے ماندے، ہارے ہارے
تھکن سے سب کا دوبھر جینا — سانس شرارا، جسم پسینا

ٹھہرو، ٹھہرو ــــ روکو روکو — وہ کیا شے ہے، دیکھو دیکھو
کوئی ہنڈا جگ مگ جگ مگ — کوئی گولا، ڈگ ڈگ، ڈگ ڈگ
من بھر کا وزنی اِک ہیرا — چمک دمک سے آنکھیں خیرا
اُتّم، اُجول، اگ، اُجاگر — یہی تو ہے امرت کی گاگر

لینا لینا ــــ امرت لینا — ہاتھ سے گاگر جانے نہ دینا
ہم دانو کیوں چھوڑیں اس کو — دیووں کو فانی رہنے دو

اِس پر دیو بہت گھبرائے — ان کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آئے
اے داتا، اندھیر ہے یہ کیا — کر اب تو ہی ہماری رکھشا
گاگر تو دانو لے بھاگے — رہ گئے ہم آدھوت، ابھاگے
دانو امرت پی جائیں گے — تو ہم دیو نہ کہلائیں گے

آنا فانا چھم چھم، چھم چھم — ڈمرو، گھنگرو، نغمہ، سرگم
بھومی پر وشنو کی پیتری — چھیل چھبیلی، کامنی اُتری
کھلائے نیبنوں میں بجلی — چال سے اڑتی پھرتی تتلی
میوہ سی گدرائی باہیں — ترچھی نظریں، ٹیڑھی راہیں
موہنی، جیسے جگت کی مایا — رو چک، جیسے دھوپ میں سایا
زلفیں جیسے روپ کی رانی — جوبن جیسے باڑھ کا پانی
نٹ کھٹ اہلی گہلی پھرتی — تہہ کی بیٹھی، سطح پہ ترتی

دیکھ کے یہ انداز نرالے — دانو، سُدھ بدھ ہی کھو بیٹھے
برکھا کیا ہے دھوپ کے آگے — امرت کیا ہے روپ کے آگے
جو نہ فنا ہو، کیا وہ ہستی — اچھی ہے دم بھر کی مستی
دانووں کو یوں بے سدھ پاکر — دیو اڑا لے بھاگے گاگر

اِدھر چمک گاگر کی ہوئی کم — اُدھر تھا سب موہنی اتم
کامنی، نغمہ، گھنگرو، پایل — پھُر سے ہوا سب آنکھ سے اوجھل
دیووں کے دھوکے پر جلتے — رہ گئے دانو آگ اُگلتے

رقص کناں تھے خود ہی سوامی
رکھشک، داتا، انتریامی

"امرت منتھن" یا "سمدر منتھن" ہندو دیومالا کے ایک اہم کتھا ہے۔ اس میں سمندر کو بلو کر امرت نکالے جانے کا ورنن ہے۔ یہ کتھا اردو نظم میں شاید پہلی بار دیکھی جائے گی، مگر یہ میرا دعویٰ نہیں —— قیاس ہے۔

(کالی داس گپتا رضا)

مہاتما گاندھی —— ایک بھکاری

وائے قسمت!
اپنی ہی شرمندگی کی
بیڑیاں پہنے ہوئے
یہ اسیرِ انتشار و بیقراری کون ہے ؟

بے سہارا،
در بہ در بے چارگی سے
ہاتھ پھیلائے ہوئے
امن و صلح و آشتی کا یہ بھکاری کون ہے ؟

چُپکے چپکے
اپنے سینے میں جلائے
عظمتِ انساں کی جوت
معبدِ انسانیت کا یہ پجاری کون ہے ؟

دیوار

میں نے اِک دیوار بنائی
جوں توں کرکے، لاکھ جتن سے، محنت سے
گرداگرد اپنے جیون کی اُلجھن کے
میں نے اِک دیوار بنائی
پھر بھی من میں چین نہ ٹھہرا

Truth is God
mkgandhi
Wardha
15 4-35

میں نے اک دیوار بنائی
سُوکھے سُوکھے، چھوٹے چھوٹے تنکوں کی
سوچ وچار کے اڑتے پھرتے تنکوں کی
نادانی کے، ناسمجھی کے تنکوں کی
پھر بھی من میں چین نہ ٹھہرا
میں نے یہ دیوار بھی ڈھائی

میں نے اِک دیوار بنائی
موٹے موٹے، تیکھے تیکھے کانٹوں کی
مان ابھمان کے چبھتے گڑتے کانٹوں کی
طعنوں، مہنوں کے، نفرت کے، کانٹوں کی
پھر بھی من میں چین نہ ٹھہرا
میں نے یہ دیوار بھی ڈھائی

میں نے اِک دیوار بنائی
لال گلابی، نیلے پیلے پھولوں کی
میل ملاپ کے رنگ رنگیلے پھولوں کی
پیار، وفا کے سجل سجیلے پھولوں کی
تب جاکر میرا من بہلا
خوشی بھی ٹھہری، چین بھی ٹھہرا
یہ دیوار نہ ڈھاؤں گا اب
اونچی اسے بناؤں گا اب
میں نے اِک دیوار بنائی

خیالوں کے بُت

نہ جانے کتنے جگوں سے تراشتا ہوں میں
نہ جانے کتنے پہاڑوں کی کوکھ نالاں ہے
نہ جانے کتنے ہتھوڑوں کے سر ہوئے زخمی
نہ جانے کتنے چراغوں کا مجھ پہ احساں ہے
نہ جانے کتنے اُٹھائے ہیں ناز اجالوں کے
مگر یہ کیا، کہ کوئی ان میں بولتا ہی نہیں
نہ تمکنت ہے کسی میں، نہ ہے غرورِ حیات
کسی کے بشرے سے ظاہر نہیں خیال و خبر
کسی کے رُخ سے ہویدا نہیں جنونِ نجات
نہ جانے کیا ہیں جوابات اِن سوالوں کے
کبھی تو چیخ کے ٹوٹے گی ان کی مہرِ سکوت
کبھی تو ان کی رگِ زیست لے گی انگڑائی
کبھی تو ان کے لبِ احتجاج وا ہوں گے
کبھی تو ابھرے گا اِن کا شعورِ گویائی
ہمیشہ چپ نہ رہیں گے یہ بت خیالوں کے

جُہدِ ناکام

ایک برسا ہوا خالی بادل
ایک بے پانی کا چڑھتا دریا
ایک رہرو، جو نہیں گرمِ سفر
ایک منزل، نہیں رستا جس کا
اک بلندی، جو ہے پستی سے بھی پست
ایک گہرائی، نہیں جس کا پتا
جھلملاتی ہوئی اک شمعِ مراد!
ایک ٹوٹے ہوئے چھپّر کا دِیا
دمبدم ایک سمٹتا عالم
بے طرح ایک بکھرتا نقطہ
اک نہ اک چلتا ہوا سحر آواز
ان سُنا ایک سریلا نغمہ
ایک محضر، نہ ملا جس کو گواہ
ایک فرمان، جو مانا نہ گیا
ایک، لَو کھوتا ہوا رنگ محل
اک سسکتا ہوا اونچا ٹیلا
جہدِ ناکام، مشقت، محنت
میں کوئی اور نہیں اِن کے سوا

شعلۂ جاوید

○

دِل سَیلِ تعصّب میں بہا جاتا ہے
اور ذہنِ رسا پیچھے رہا جاتا ہے
کہیئے اِنھیں ہندو، اُنھیں مُسلم کہیئے
انسان تو نہرو کو کہا جاتا ہے

○

سورج مَیں ہوں، چاند مَیں ہوں، ہالا مَیں ہوں
اوّل سے اخیر تک اُجالا مَیں ہوں
بخشی ہے حیات کو شارعِ جاوید
ظلمات کو مات دینے والا مَیں ہوں

○

کیا ہم ہیں کیا ہے آشیانہ اپنا
دُھندلانے لگا ہے اب زمانہ اپنا
یادوں کا سہارا ابھی ہے اب کے دن کا
کاغذ پہ اتارلیں فسانہ اپنا

○

ہے عمرِ اخیر اَور نہ دیکھو بھالو
آنکھوں میں ہیں جو خواب انھی کو پالو
جی کھولو۔ قلم ہاتھ میں لو، الٹو ورق
محفوظ ہے جو ذہن میں، سب لکھ ڈالو

○

پت جھڑ نے جو کوچ ناگہاں بول دیا
پژمردگیٔ زیست میں رس گھول دیا
منھ بند تھا مدّت سے اور اب گلشن نے
وہ راگ الاپے ہیں کہ جی کھول دیا

○

باقی نہ رہے دل میں ہے جو کچھ کہہ جا
لاوا جو اُبل رہا ہے اس میں بہہ جا
یا جست لگا آہوئے صحرا کی طرح
یا ضبط کے جنگل میں تڑپتا رہ جا

○

جی کھول کے کہہ دے جو سنا، جو دیکھا
چُکتا ہے ابھی برابری پر لیکھا
بے کار کے الجھاؤ میں کیا رکھا ہے
اُٹھ پار کر اِبہام کی لچھمن ریکھا

○

ہے کس کی ضیا شام و سحر، میرے سوا
ہے کس کی چمک، زینتِ زر، میرے سوا
ہے کون، سوا میرے، ازل سے آگاہ
ہے کون ابد کا راہبر میرے سوا

○

جو شعر کہا، لبِ طہارت سے کہا
جی جان سے، احترام و عزت سے کہا
ہے قابلِ درگزر، غلط بھی میرا
جو کچھ بھی کہا مَیں نے، محبّت سے کہا

○

نالہ کبھی ہوتا نہیں، درمانِ درد
شیون سے بھی کچھ بڑھتی نہیں شانِ درد
یہ بادِ سحر نہیں، چلے اور تھم جائے
تھمتے تھمتے تھمے گا طوفانِ درد

○

انسان، قیامت سے نہ ڈرنے والا
دریائے الم سے پار اترنے والا
کیا کہیئے اسے پھر، جو نہ دھوکا کہیئے
کہتی ہے خرد "اَمر" کو مرنے والا

○

وہ کل کی ادب گاہ وہ کوئے آزاد
اب بنگلے، کوٹھیاں ہیں ان سے آباد
شاگرد سمیٹا کریں ریزہ ریزہ
پھیلاتے رہیں جہل، اناڑی استاد

○

آہن ہے ملائم نہیں ریشم کی طرح
پَو پھٹتے ہی مرتا نہیں شبنم کی طرح
ڈرتا ہے مگر سخت ہے دل آفت میں
آندھی میں لرزتے ہوئے پرچم کی طرح

○

سچّائی نے رکھا ہمیں غرقِ فریاد
گفتار کے زور پر ہیں اب ہم دل شاد
جاتے جو عدالت میں گزرتی صدیاں
اے شورِ بے دلیل! پائندہ باد

○

وسعت میں اپار ہے بیابانِ درد
پاتال سے بھی نیچے ہے پایانِ درد
صدیاں کٹ جائیں غم گساری کرتے
جب جا کے کہیں ہوتا ہے عرفانِ درد

○

ادبار کی دوپہر، غمِ آتش بار
کرنا ہی پڑا کربِ نہاں کا اظہار
اب فکر کی بھٹی ہے، قلم شعلوں کا
جلتے ہوئے جملے ہیں، پگھلتے اشعار

○

دیوانہ کہاں ، محرمِ اسرار کہاں
چیونٹی ساعدُو کہاں ، وہ جرّار کہاں
کرتے ہو تقابل تو کرو ، پر ڈھب سے
زر مست کہاں اور دلِ بیدار کہاں

○

آفاق اُدھر کھولے ہوئے ہے باہیں
بھرتا ہے اِدھر رات دن انساں آہیں
بہتی ہے ندی ، بہے ، نہ پہچانیں ہم
اور پیاس سراب سے بجھانی چاہیں

○

خیرات ہوں ، بانٹے کوئی بٹ جاتا ہوں
ٹکر ہو تو چٹان سا ڈٹ جاتا ہوں
چلتا ہُوں ، جہاں تک بھی رہے صدق کا ہاتھ
جب صدق چُھٹے ، راہ سے ہٹ جاتا ہوں

○

مدہوش کو جام دینے والا تُو کون
مصروف کو کام دینے والا تُو کون
دن رات رضا ، رضا کی رٹ ؟ واہ رے دِل
بے نام کو نام دینے والا تُو کون

○

خاموش نگہ کہ لفظ و معنی کا جہاں
پایل کہ عبودیت کا احساسِ جواں
نازک سے قدم کہ دھڑکنیں گیتوں کی
اے رقصِ ظہورِ صبح ، اے سحرِ رواں

○

ہر نعرۂ مستانہ میں ساتھی دونوں
باطن میں ہیں بیگانۂ مستی دونوں
آزاد خیالی کہ ترقّی طلبی
ہیں اصل میں تحریص کے قیدی دونوں

○

روشن ہے ، بجھی ہوئی یہ قندیل نہیں
توقیر ہے ، ہر سانس کی تذلیل نہیں
ہر لمحہ سفر ، جنبشِ پیہم ، کوشش
یہ زیست عمل کا دن ہے ، تعطیل نہیں

○

جب بھی کسی محفل میں کبھی ہوتا ہوں
میں نام و نمود سے بری ہوتا ہوں
سب ہوتے ہیں مُنتہی سخن سازی میں
میں کسبِ سخن میں مُبتدی ہوتا ہوں

○

جاہل یا صاحبِ خرد کوئی نہیں
بس ہم ہیں اور نیک و بد کوئی نہیں
ہاں یہ ہے کہ عقل کی ہزاروں ہیں حدیں
اور جہل و انانیت کی حد کوئی نہیں

○

ہاں ہاں، ویرانہ مَیں ہوں، بستی مَیں ہوں
پسپائی مَیں ہوں، پیش دستی مَیں ہوں
تُو وہم ہے، سوگوارِ ہستی تُو ہے
مَیں روح ہوں، وارثِ دارِ ہستی میں ہوں

○

ظاہر میں تو شاعر ہی کہا جاتا ہوں
پوشیدہ میں خود سے بھی ہوا جاتا ہوں
کس موڑ پہ ہے فکر کہ لفظاً معناً
انسان کی روح میں گھُلا جاتا ہوں

○

یہ کچھ دیکھنے والے کی نظر ہے کہ نہیں
کیا ایسا سماں اور بھی دیکھا ہے کہیں
یہ سیلِ نفاست ہے کہ دریائے سحر
اللہ قسم پیار کی جنّت ہے یہیں

○

خواہش ہے کہ اک طوقِ گراں گردن میں
خوشیاں ہی سمیٹتا رہوں دامن میں
کلیوں کے چٹکنے کا بھی اک موسم ہے
بادل بھی گرجتا ہے مگر ساون میں

○

یا جیتے جی لوبھ میں پھنس کر مرلوں
یا تیاگ کی فرحتوں سے جھولی بھرلوں
صدیوں سے کھڑا ہوں اس دوراہے پر میں
خیرات کروں کہ دھن اکٹھا کرلوں

○

جو رہ گئی اَن سُنی، وہ تلقین ہوں میں
تردید میں لپٹا ہوا، آئین ہوں میں
اے سب کو غلط رنگ میں رنگنے والے!
بے رنگ بھی ہے رنگ، تو رنگین ہوں میں

○

طوفاں سے نکل آؤں یہ ممکن ہی نہیں
دکھ درد سے چھُٹ جاؤں یہ ممکن ہی نہیں
خود ساختہ اُلجھنوں کا دلدادہ ہوں
پَل بھر بھی اماں پاؤں یہ ممکن ہی نہیں

○

اے تجھ میں کوئی رنگ نہ بُو، کون ہے تُو
اے گُلشنِ ہستی کے عُدو، کون ہے تُو
پت جھڑ ہے، تغافل ہے کہ بدنظمی ہے
اے خاک بہ رُو! کون ہے تُو، کون ہے تُو

○

جینے کا تو جینا ہے ثمر، لَوٹ چلو
ہونے کا نہیں ختم سفر، لَوٹ چلو
ہے کھوج کا حاصل تو فقط کھوج رضا
جانے کی نہ خواہش کرو، گھر لوٹ چلو

○

واللہ یہ زندگی، یہ رات البیلی
فطرت کے اشارے پہ نظر کھُل کھیلی
جذبات نے توڑ دیں تکلّم کی حدیں
نغمات نے پتھّروں سے ٹکّر لے لی

○

کانوں میں اِک اَن سُنی صدا سی آئی
دامن میں نئی فکر و خبر بھر لائی
تہ خانوں سے لَوٹ سی گئی تاریکی
تخئیل میں یوں سما گئی گہرائی

○

جب میں نے حقیقت کی نظر پائی تھی
دکھ درد کا موسم تھا، گھٹا چھائی تھی
دن چڑھنے میں باقی تھے ابھی ستّر لمحے
اور رات بہت نیچے اُتر آئی تھی

○

تُو ہوگا، صبا ہوگی، سحر پھوٹے گی
یادوں کی وہ دیوار کہاں ٹوٹے گی
دل لاکھ کھنڈر سہی مگر ہے تو سہی
تخئیل وہی اگلا مزہ لوٹے گی

○

ذرّہ ذرّہ قتل گہہِ حرب سہی
ہر سمت سے تقدیر کی اک ضرب سہی
لیکن ہے مزہ پھر بھی جیے جانے کا
دنیا نہ سہی، درد سہی، کرب سہی

○

سیلاب میں دو چار گھڑی رہ تو سہی
جنگل جنگل، نگر نگر، بہہ تو سہی
پھر کہہ کہ تو ہمدرد ہے انسانوں کا
حالات کی چوٹ، پل دو پل، سہہ تو سہی

صنّاعِ ازل نے کیا بنائی بستی
پندار، خمار، ہوشمندی، مستی
اک ٹھاٹھیں مارتا بپھرتا دریا
ہستی ہستی، چہار جانب، ہستی

اٹھتا نہیں ہم سے یہ عذابِ ہستی
اب یاس کو کہیے گا جوابِ ہستی
سَو بار جلائی، نہ جلی آتشِ شوق
اللہ رے، انجمادِ آبِ ہستی

وہ خامہ، وہ افکار، وہ نورِ ہستی
چلتا ہے وہاں ساتھ سرورِ ہستی
کیوں بیٹھا ہے دیوانے! درِ زاہد پر
جا مانگ لے شاعر سے شعورِ ہستی

مرغانِ قفس، فکرِ وطن تک پہنچے
کچھ اور بڑھے، صحنِ چمن تک پہنچے
اس پنچھی کی اُڑان کتنی ہوگی
بے پنکھ اڑے، نیل گگن تک پہنچے

اکتا گئے ہادیوں کا بھرنا بھرتے
کچھ بن ہی نہیں پڑتی ہے کرتے دھرتے
شیطان کا روپ لے ہی لے گی دنیا
انسان کا انتظار کرتے کرتے

رحمان ہے تو سزا جزا رہنے دے
تکبیر کے پرچم کو گڑا رہنے دے
اب جشنِ بہار، اب خزاں، یہ سب کیا
اک بار جو کِھل گیا، کِھلا رہنے دے

رہرو کو نہ جوش سے لبالب کہیے
جب پاؤں وہ منزل پہ دھرے جب کہیے
یہ ضعف، یہ فاصلہ، یہ چھوٹا دم خم
لو، رستے میں دم ٹوٹ گیا، اب کہیے

بن کام کیے، بغیر قربانی کے
جلنے کے نہیں چراغ گھر میں گھی کے
رام آگیا، سچائی، ثابت قدمی
سُن رکھیے یہ تین نام سیتا جی کے

برسوں سے رواں دواں ہو جس رستے پر
اسلاف نے جس راہ میں ڈھوئے پتھر
بدلو نہ اسے، سچ کو نیا نام نہ دو
بوڑھے کو نئی پگڑی سجے گی کیوں کر

آفات و مصائب کا عمل ہے ساقی
ہر وقت یہاں بیمِ اجل ہے ساقی
لازم ہے کہ جامِ مے رہے گردش میں
اب امن و سکوں کا کیا محل ہے ساقی

○

غدّار دکھائیں گے ضرور اپنا فن
خاطر میں نہ لائیں انھیں یارانِ وطن
جس تختِ طلائی پہ براجے ہیں یہ آج
اِک روز بنے گا، یہی ان کا مدفن

مالی نے کہا "روز کا رونا کیا ہے"
غنچوں نے کہا "ہنسنے کا شیوا کیا ہے"
مالی نے کہا "ہنس لو مگر ایک دفعہ"
غنچوں نے کہا "اور تمنّا کیا ہے"

○

تو نغمۂ بے کیف کی ہرلے کو بدل
جس میں نہ نشہ کچھ بھی ہو اس مے کو بدل
اس ردّ و بدل کرنے سے پہلے لیکن
سینے میں دھڑکتی ہے جو اس شے کو بدل

سبزے نے کہا "لے گئی خلوت میری"
شبنم نے کہا "یہ تو ہے عادت میری"
سبزے نے کہا "مجھ کو رُلا دیتی ہے"
شبنم نے کہا "رونا ہے فطرت میری"

○

ہیں بزمِ سخنوراں میں شامل ہم بھی
ہیں تازہ خیالات کے حامل ہم بھی
انعام کے مدّعی نہ ہم کیوں ہوتے
اشعار کے پڑھنے میں ہیں کامل ہم بھی

ہر شاخ خزاں آتے ہی بیکار ہوئی
ہر پنکھڑی کھلنے کی گنہگار ہوئی
مالی نے لہو تک بھی پلایا لیکن
گلشن کی مُندی آنکھ نہ بیدار ہوئی

○

محتاط رہو اور پھرو اہلے گہلے
کیوں دیکھ کے کوہِ زیست چھاتی دہلے
بس تازہ دموں سے ساز کرلینا ہے
ہر سانس سے تین چار سانسیں پہلے

○

یوں کتنوں سے درد اٹھتا الم اٹھتا ہے
غم ڈھلتا ہے لفظوں میں، قلم اٹھتا ہے
وہ آتا ہے محفل میں سخن سنجِ ازل
وہ شعر کی عظمت کا علَم اٹھتا ہے

○

کہتے ہیں، رضاؔ کبھی کہیں پہنچا ہے
بیٹھا ہے جہاں تھک کے وہیں پہنچا ہے
لو، ڈوب گیا کل وہ بھنور سے لڑتے
کیا اب بھی وہ اُس پار نہیں پہنچا ہے

○

اے مادرِ قوم! اشکوں سے غم دھوتی ہے؟
غدّار کی موت پر تُو کیا روتی ہے؟
جس گاؤں میں بولے نہ سحَر کو مرغا
اس گاؤں میں کیا صبح نہیں ہوتی ہے؟

○

تا آخرِ دم، دل سے جواں رہتا ہے
بیزارِ جہاں، مستِ جہاں رہتا ہے
مذہب بھی ٹھہر جاتا ہے اک نقطے پر
انسان سدا رواں دواں رہتا ہے

○

افلاس و عذاب ہے، مے و محفل ہے
انسان کے افکار میں سب شامل ہے
گھنگھرو کی صدا کہ آہ، کچھ فرق نہیں
ہنگامۂ کائنات، رقصِ دل ہے

○

پھل بعد میں، قسمت آزمانا پہلے
ہو لیجیے رستے پہ روانا پہلے
پھر پوچھیے رہبر سے سوالی بن کر
منزل پہلے کہ چلتے جانا پہلے

○

بندہ ہوتا ہے یا خدا ہوتا ہے
کیا جانیے بندگی میں کیا ہوتا ہے
اک نہر سی رہتی ہے رواں آنکھوں سے
سینے میں درد سا بھرا ہوتا ہے

گھونگھٹ رُخِ وقت سے اُلٹ اے دنیا
خانوں میں من و تُو کے نہ بٹ اے دنیا
جس میں نہ تھا امتیازِ پست و بالا
اس اوج کی سمت پھر پلٹ اے دنیا

مستی سے شرابور، مدھر، پیارے گیت
رہتے تھے کبھی لبوں پہ یہ سارے گیت
اے یادِ شباب! گنگنا پھر تو ذرا
گھُٹ گھُٹ کے مرے جاتے ہیں بیچارے گیت

آہستہ ورق اپنے پلٹ اے دنیا
آندھی نہ ہو، محور سے نہ ہٹ اے دنیا
نا راست ہے راہ، اجنبی ہے رہبر
خود اپنے مقام پر پلٹ اے دنیا

نے شام کے سائے، نہ سحر کے انداز
ٹھہراؤ نظر کا نہ خرد کی پرواز
آفاق، فنا صفت، سکوتِ پیہم
انساں، نحیف سانس، ہلکی آواز

صدیوں، مَیں ہوس خانۂ ہستی میں رہا
سونے میں تُلا، چاندی کے دریا میں بہا
لیکن نہ زر و مال ہوئے دامن گیر
کیا صبر نے توقیر بڑھائی ہے، اہا

اک سمت مہک پھولوں کی، غنچوں کی چٹک
اک سمت اناڑیوں کی بے سود بھٹک
الجھاؤ ہے، تنقید جسے کہتے ہو
لے جاؤ مرے آگے سے یہ چھان پھٹک

ہر لحظہ اِدھر اور اُدھر دیکھ لیا
ہر خطرے کو تا حدِّ نظر دیکھ لیا
سو پردوں میں چھپ چھپ کے کیے ہم نے گناہ
اک دیکھنے والے نے مگر دیکھ لیا

"اونچا" اور "اونچا" کی لذت کب تک
"نیچا" کہلانے سے نفرت کب تک
اے انساں، اے فقیر، اے سنیاسی
اور رنگِ فضیلت سے محبت کب تک

○

پیچھے سے یہ کس دوست نے تھاما آنچل
ہر سمت سے گھر آئے خوشی کے بادل
سُکھ چین کی باڑھ آئی، پلکیں بھیگیں
کاجل کی جگہ پھیل گیا گنگا جل

○

دانشور، صاحبِ نظر، فلسفہ داں
اک بھی تو نہیں واقفِ آغازِ جہاں
"واقف ہے بس خدا"، نہیں وہ بھی نہیں
دنیا پہلے بنی، خدا بعد ازاں

○

کب تک یہ برہ ناچ، یہ آنکھیں بوجھل
کب تک یہ پسینہ، یہ تھکن، یہ ہل چل
کر ڈالے لہو، گھنگھروؤں نے دونوں پاؤں
چھم چھم کی جگہ نکل پڑی ہے ڈھل ڈھل

○

مَیں کون؟ نقیضِ بدگمانی ہوں مَیں
اگیانی ہوں؟ ہرگز نہیں، گیانی ہوں مَیں
باطل ہوں؟ کبھی نہیں، مَیں سچائی ہوں
فانی ہوں؟ غلط ہے غیرفانی ہوں مَیں

○

اِک واعظِ مستانہ ہے بزمِ عالم
اِک رندِ بےپیمانہ ہے بزمِ عالم
قصّہ در قصّہ ہے فروغِ ساقی
افسانہ در افسانہ ہے بزمِ عالم

○

گھر گھاٹ نہیں، ٹھیک نہیں، ٹھور نہیں
توقیر سے جینے کا کوئی طور نہیں
حقّا! اس دَور سے نپٹنے کے لیے
آوازِ ضمیر ساجری اور نہیں

○

پرنام کریں شب کو کہ دن کو پوجیں
دو پل بھی تو ایسے نہیں جن کو پوجیں
اے راہبِ غم، عیش کے لمحوں کے سوا
ہم کن کو خدا بنائیں، کن کو پوجیں

○

لہروں کے، بھنور کے پیچ و خم جانتے ہیں
نغموں کے سُروں کے زیر و بم جانتے ہیں
رہنا نہیں آتا ہے فقط دھرتی پر
اُڑنا ہفت آسماں پہ ہم جانتے ہیں

○

ہو آنکھ تو خوبیاں عیاں ہوتی ہیں
پانی ہو تو کشتیاں رواں ہوتی ہیں
برکھا سے نکھرتا ہے گلستاں کا رنگ
انصاف سے اقوام جواں ہوتی ہیں

○

ہاں، کود پڑو، ریا سے دامن بھرلو
بے راہ روی کی موج پر پگ دھرلو
وہ سامنے ہے حسد کا سوکھا دریا
ارمان شناوری کا پورا کرلو

○

اے کور نظر! آہستہ آہستہ
اے خاک بسر! آہستہ آہستہ
دنیا کا جھنجھوڑ شانہ ہلکے ہلکے
اے چوٹ! ابھر آہستہ آہستہ

○

معلوم ہے راہ اور ہمت باقی
دو چار قدم ہی کی ہے زحمت باقی
اب دیر نہیں میرے خدا ہونے میں
صرف ایک جنم کی ہے مسافت باقی

○

یہ عیش رہے گا نہ یہ عشرت ہوگی
آمادہ رلا دینے پہ فطرت ہوگی
سننے ہیں تو بس آج ترانے سن لے
کل ذہن پہ پھر غم کی حکومت ہوگی

○

ممکن نہیں افلاس کا جھگڑا چک جائے
ممکن نہیں سیلاب ہوس کا رک جائے
ممکن ہے کہ اس دور میں زر کے آگے
اک نام کے خود دار کی گردن جھک جائے

○

ہاں، حال کی پیروی سے ٹل جائیں گے
مستقبل کی صدا میں ڈھل جائیں گے
تم وقت کے ہمراہ نہ پاؤ گے ہمیں
ہم وقت سے کچھ آگے نکل جائیں گے

○

طوفاں میں سہارا ہی نہ پایا ہم نے
مانجھی کو حریف اپنا بنایا ہم نے
جب ڈوبنے پر آئے تو بس ڈوب گئے
تنکے کا بھی احساں نہ اٹھایا ہم نے

○

یہ کون کھلے رستے بڑھی آتی ہے
میں نیند میں ہوں اور یہ اٹھلاتی ہے
اتنے میں سحر پائینتی آکر بولی
"بندی ہے، آداب بجالاتی ہے"

○

غم سے ملے راحت یہ کہاں ممکن ہے
نالوں سے فقط جی کا زیاں ممکن ہے
کوشش کرو، ہنس ہنس کے جیے جانے کی
کوشش سے طربناک جہاں ممکن ہے

○

رنگین شفق، شوق کو بھڑکاتی ہے
شام آتشِ خنداں سے بھری جاتی ہے
ہنستا ہے سماں، کِھلتے ہیں تارے ہرسو
روتا ہے کوئی، "رات چڑھی آتی ہے"

○

یاد آیا، کبھی ایک نظر دیکھا ہے
پھر جیسے کہ ہر شام و سحر دیکھا ہے
وہ رقصِ بہیمانہ، قتالِ ہستی
دیکھا نہیں جاتا تھا، مگر دیکھا ہے

○

گاہک کی خوشی پہ خاک ڈالے رہیئے
سکّوں کے حروف کو اجالے رہیئے
لگنے والا ہے ہاٹ، ہٹ دھرمی کا
ایمان کی گٹھریاں سنبھالے رہیئے

از
بلراج ورما

تازہ بہ تازہ
نو بہ نو

غزلیں

جہاں کو کیسی ڈگر پر لگا گیا کوئی
چلا گیا کوئی منزل سے، آگیا کوئی

پیامِ فکر و نظر دے کے میرے گیتوں کو
اکھڑتی سانسوں میں سانسیں ملا گیا کوئی

کہاں کا ہاتھ، کہاں کا نجوم، کیسا نصیب
لکیریں کھینچ کے بے بس بنا گیا کوئی

نہ راستے سے پکارا نہ دی کہیں دستک
خیال و خواب کے دَر وا تھے، آگیا کوئی

میں اک چراغِ سرِراہ، میری ہستی کیا
جلا گیا مجھے کوئی بجھا گیا کوئی

لٹائی سانس کی پونجی، گنوائے کون و مکان
مرے بنانے میں خود کو مٹا گیا کوئی

میں خشک آنکھ کی دولت ہوں، کل کا آنسو ہوں
ڈھلے مکان میں مجھ کو بٹھا گیا کوئی

رضاؔ بدلتے تقاضوں کا ساتھ کیوں چھوڑے
ہنسا گیا اسے کوئی، رُلا گیا کوئی

اندھیری شب میں بھی میں کب رہا اندھیرے میں
بجھے چراغ تو لو دے اٹھیں کئی یادیں

میں کب کا ٹوٹ چکا ضربِ وقت اب بھی ہے
سمیٹے کون مجھے، کون کھول دے بانہیں

یہیں ہیں دفن، اسی دل میں ایک ایک کر کے
لہو لہو وہ امنگیں، وہ سر کٹی لاشیں

پڑے ہیں پاؤں میں ہم بکھری پتیوں کی طرح
ہمارا فرض تو جھکنا ہے، آپ ٹھکرا دیں

سنا تھا لایا ہے کوئی نیا سخن، لیکن
وہی گھسے پٹے نغمے، لٹی پٹی تانیں

نتیجہ اس کا ہو کیا؟ وقت ہی بتائے گا
یہ چھوٹے چھوٹے مقرر، بڑی بڑی بخشیں

دکان کیسے چلے گی اگر یہی ہے جنس
اُدھار ادھار قصیدے، ملاوٹی غزلیں

ہمارا حکم ہے، ہم سے جدا نہ ہو کوئی
ہزار ہلنے لگی ہیں ہماری بنیادیں

جو سرو قد ہیں انھیں رینگ رینگ چلنا ہے
ملی ہیں پستہ قدوں کو بلند محرابیں

ٹھٹھرتی رات بھی ہے کوئی دیکھتا بھی نہیں
الاؤ جلتا ہے، مٹھی بھر آگ ہی لے لیں

کٹا پھٹا ہی پڑا رہ، رضاؔ بشر ہے تو کیا
کوئی چرا کے نہ لے جائیگا تری قاشیں

شب وہی، وہی انجم، کس کو جشنِ نَو کہہ دوں
سُست گام جلوؤں کو کیسے تیز رَو کہہ دوں

سنگِ راہ نے کتنی سختیاں اٹھائی ہیں
جی میں ہے کہ پَل دو پَل اس کو راہرو کہہ دوں

علم و آگہی کچھ بھی روشنی نہیں دیتے
کیوں نہ اِن اجالوں کو اب سمٹتی لَو کہہ دوں

صبح تک جو گندم تھے شب کو ہو گئے کیا کچھ
سب کے سامنے ان کو اب تو کھل کے جَو کہہ دوں

خام نور میں جی کر تھک ہی جاؤں گا اک دن
کیوں نہ ظلمتوں ہی کو، اب سے شمعِ نَو کہہ دوں

آس کی سفیدی کو ضَو تو کہہ نہیں سکتا
اور نام رکھ دیکھوں، اس کو عکسِ ضَو کہہ دوں

منزل آ گئی تو کیا، دل میں آ گیا کچھ اور
وصل کی گھڑی کو بھی، انتظار نَو کہہ دوں

اے رضا، بس اتنا ہے، بات کہہ گزرتا ہوں
وہ تو میں نہیں، ہرگز، اک سنوں تو سَو کہہ دوں

شگون لے چکے ہم، پوتھیاں بچار چکے
براہِ وقت اگر ہے تو من کو مار چکے

ادب کو تھام چکے، علم کو نکھار چکے
بس اب چلو کہ بہت شیخیاں بگھار چکے

نمازِ شکر کی بھی کوئی جا نکل آئے
نمازِ عشق تو ہم ہر کجا گزار چکے

خمول و خواب میں بھی ایسا فتح مند ہوں میں
ہوا و آب و فلک میرے آگے ہار چکے

نمود و نام کا سب اشتہار، نازیبا
زمانہ ہو گیا، ہم یہ نشہ اتار چکے

چلے بھی آؤ کہ لَو دے اٹھیں دَر و دیوار
اندھیرے اپنی گھنی کاکلیں سنوار چکے

اکیلے کرنا ہے طے، مجھ کو وقت کا صحرا
جو ساتھ چلتے تھے وہ قافلے سدھار چکے

جو حافظے کو دیا تو نے، کیسے لوٹاؤں
وَرَق سیاہ کروں تو کہیں ادھار چکے

رضا یہ کہہ دو زمانے سے شکریے کیساتھ
ہم اس کے لطف و کرم کو بہت سہار چکے

چلو حالِ گلشن بہاروں سے پوچھیں
گلوں سے سنیں گل عذاروں سے پوچھیں

کہاں ہے ہمارے وہ سپنوں کا موسم
کھنڈر بن چکی یادگاروں سے پوچھیں

کیا قتل بُلبُل کے نغموں کا کس نے
لہو تھوکتے لالہ زاروں سے پوچھیں

کوئی کیا بتائے گا کِھلنا کلی کا!
بہار آفرینی نظاروں سے پوچھیں

یہ پژمردگی کیسا یہ جوشِ نمو کیا؟
خزاؤں سے پوچھیں بہاروں سے پوچھیں

کسے مستقل اوج بخشا ہے تم نے
صبا کے سحر دم سہاروں سے پوچھیں

ہیں شبنم کے موتی کہ اشک آسماں کے
فلک پر چلیں چاند تاروں سے پوچھیں

مرے راستے تو قفس تک ہی پہنچے
بہاروں کی منزل بہاروں سے پوچھیں

گھنے پیڑ سب داستاں جانتے ہیں
چلو کچھ انھیں رازداروں سے پوچھیں

رِضا! سچ تو یہ ہے، مگن ہو رہیں ہم
نہ گل کو بتائیں نہ خاروں سے پوچھیں

ہمارے بگڑے مقدر کو اب سنوارے کون
کسے پکارا تھا ہم نے ہمیں پکارے کون

بہار، پھول، سحر، رنگ، بو، صبا، شبنم
یہ سب تو دامنِ گلچیں کے ہیں، ہمارے کون

چمک رہی ہے حیات آنسوؤں کے پرتو سے
کسے خبر ہے؟ فلک کیا ہے، چاند تارے کون
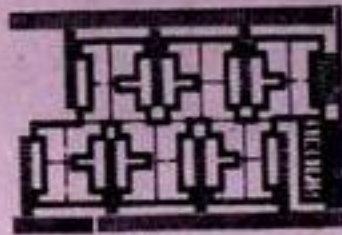
بہار بن کے کہیں جا رہوں گلستاں میں
اجاڑ راہوں میں یوں زندگی گزارے کون

نیا زمانہ سنگھاسن پہ آ بِراجا ہے
سماج سوچ میں ہے آرتی اتارے کون

حسد شعاروں کو انصاف کی کہاں فرصت
گلوں کے ڈھیر مرے واسطے ہیں، وارے کون

لکیریں کھینچ کے بیٹھا ہوں عاجزوں کی طرح
جو رنگ دل میں گڑے ہیں انھیں ابھارے کون

رِضا شعور کے سورج کا کچھ پتہ ہی نہیں
دھندلکا جہل کا ہر سمت ہے، نکھارے کون
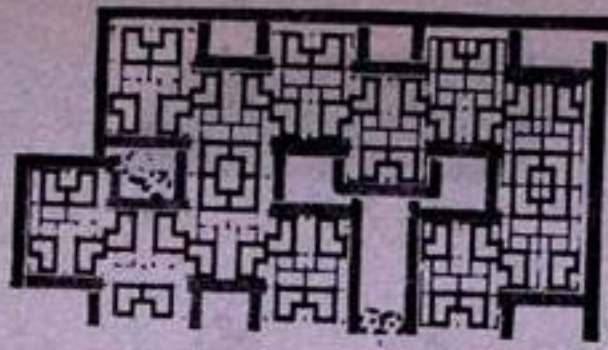
نئے یگ کی تھی بشارت کہ کہانی؟ کیا تھا
شاہدِ صبح کا پیغامِ زبانی کیسا تھا

وہ جو لاوا سا بہا اور مجھے پھونک گیا
آگ تھی اشکوں کی یا شعلوں کا پانی؟ کیا تھا

لڑکھڑاتے سے قدم، پیاسی نظر، جھومتا جسم
یہ سب اک وہم تھا یا رقصِ جوانی؟ کیا تھا

مجھ سے ٹکر تھی کہ تھا جہل کا اپنے اقرار
ہم نشینوں کا وہ شعورِ ہمہ دانی کیسا تھا

میرا سایہ، جو مرے ساتھ جیا، ساتھ مرا
ازلی دوست تھا یا دشمن جانی؟ کیسا تھا

جب تو یادوں سے نکل بھاگا تو افتاد پڑی
قرب میں ورنہ ترے بُعدِ زمانی؟ کیا تھا

کیوں ہو گُم گوشئِ رضا۔ کون تھا وہ
ہادیِ وقت تھا؟ یا حاتمِ ثانی؟ کیا تھا
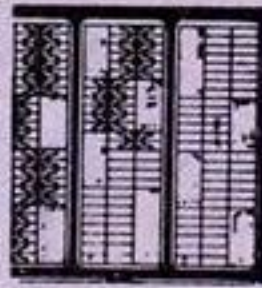
شگفتگیِ زیست کو شراب میں نہ ڈھونڈنا
مشامِ جاں میں ڈھونڈنا، گلاب میں نہ ڈھونڈنا

یہ آگہی کے سربرہ! فقط حسین خول ہیں
بھنور کی کارکردگی حباب میں نہ ڈھونڈنا

بھلا برا پچارنا! نئے خدا بھی ہوں تو کیا
بلندیاں نصیب کی خطاب میں نہ ڈھونڈنا

بجھے بجھے حروف کو ملے کہاں سے روشنی
مُعلّمی کے نور کو نصاب میں نہ ڈھونڈنا

شبانہ روز کام ہی ہنر کا ورثہ دار ہے
کمال کو عذاب یا ثواب میں نہ ڈھونڈنا

مقام اور بھی تو ہیں ترانہ ہائے زیست کے
سرود و نغمہ کو فقط رباب میں نہ ڈھونڈنا

کمالِ فن ہوں میں کہاں حجاب میں پڑا رہوں
نکھر چکا ہوں، اب مجھے نقاب میں نہ ڈھونڈنا

یہ پھیلتی سیاہیاں لغت کہاں بتائے گا
ظہورِ شب کو علم کی کتاب میں نہ ڈھونڈنا

رضا جو اصل ہے سو ہے خیال و خواب کچھ نہیں
چمن کی لہلہاہٹیں، سراب میں نہ ڈھونڈنا

میں تیری نگہ میں اک چمن تھا
یہ حسنِ نظر تھا، حسنِ ظن تھا
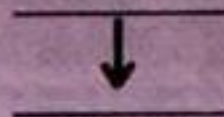
یکتا تھا جو من کا، خستہ تن تھا
وہ قیس کہاں تھا کوہکن تھا

مخمور سی ہو رہی تھیں آنکھیں
رجحانِ گناہ ضو فگن تھا

دنیا مقتل بنی تھی اور دل
اپنے ہی خیال میں مگن تھا

عریاں ہی اٹھے گی اب مری لاش
دامانِ حیا مرا کفن تھا

غم خانہ سا ہو کے رہ گیا ہے
وہ لفظ جو معبدِ سخن تھا

اڑتا پھرتا غبار ہر سو
یہ دشتِ رواں کبھی چمن تھا

کہنے کو تو مر چکی تھی خواہش
باقی مگر اس کا بانکپن تھا

فن کار تھے ہم، نہ تھے کفن کش
زندوں کے لیے ہمارا فن تھا

کیا روح دمک اٹھی تھی
کندن سا خیال کا بدن تھا

گو ہونٹ رضا کے سل گئے تھے
خامے کی زباں سے نغمہ زن تھا

جب یہ کہا سب پیار کا ناٹک جان لیا
روپ نے جیسے ہم پہ نیزہ تان لیا

زہر بھی تم دے دیکھو امرت سمجھیں گے
ہم نے مسیحا تم کو اپنا مان لیا

تم نے سنواری مانگ، ہماری آن بڑھی
وید پڑھے پنڈت نے، ہم نے گیان لیا

آنکھ سے ڈھلکی بوندوں کی سی بات کہاں
پھیر چکے آکاش، سمندر چھان لیا

پچھلی رات کے صدقے، کیا تقدیر کھلی
سر کی بھکشا دے کر دل کا دان لیا

انجانے، ٹھہرے سے یہ پل چھن کیا ہیں؟
باطن کے لمحے ہیں یہ، پہچان لیا

پیار کا گہرا پانی، پر کتنا نرمل
ہم نے ڈوب کے مر رہنا ہی ٹھان لیا

لاکھ ہوں بانکی ٹیڑھی راہیں، اب ہم نے
خود کو مسافر تم کو منزل مان لیا

اب کیوں گھبراتے ہو رضا، کرنی بھوگو
کیوں تم نے بے گانے دکھ کا دان لیا

پیاسا بے پانی کے نل پر جیسے
زیست قربان اجل پر جیسے

دلِ ناکام پہ حسرت کا نشان
داغِ محنت، کفِ شل پر جیسے

موجِ لب، مصرعۂ تر، سیلِ خیال
تیرتا پھرتا ہوں ڈل پر جیسے

تیری پلکوں پہ خوشی کا آنسو
بوند پانی کی کنول پر جیسے

میری تکمیلِ تمنّا کی نہ پوچھ
کام رکھا ہوا کل پر جیسے

اس طرح کا ہے غرورِ نقّاد
اینٹھنا غیر کے بل پر جیسے

چار سو یاس، مگر اک امّید
روشنی راج محل پر جیسے

حسن کے ماتھے پہ خفگی کی شکن
علم کا بوجھ غزل پر جیسے

یوں رضا آج ہے آمادۂ فکر
کوئی تُل جائے عمل پر جیسے

آئینے میں بال پڑ گیا کیوں
پھیلا تھا بدن سکڑ گیا کیوں

تھا موج میں سوچ کا سمندر
جینے کا بھنور سا پڑ گیا کیوں

پت جھڑ تو ہے کوسوں دور ابھی سے
پتا پتا اجڑ گیا کیوں

کیا ہو گئی حاجت اس کی پوری
ملنے والا بچھڑ گیا کیوں

اکھڑا اکھڑا سہی مرا فن
عالم کا نظام اکھڑ گیا کیوں

پل بھر بھی ملا نہ تھا رضا سے
دشمن دھرتی میں گڑ گیا کیوں

جوبن انگارے اگلتا ہو، تمنا یہ ہے
سارا تن آگ میں جلتا ہو، تمنا یہ ہے

ٹوٹا پھوٹا ہی سہی۔ زیست کی ان ٹیسوں سے
ایک نغمہ بھی نکلتا ہو، تمنا یہ ہے

روپ نکھرا رہے ہر وقت تو کچھ بات نہیں
روپ سو رنگ بدلتا ہو، تمنا یہ ہے

دل ہے ساکت تری زلفوں کی مہک سے، یہ کیا؟
کوئی ہنگامہ سا پلتا ہو، تمنا یہ ہے

کھردرے ذہن کو ملتی ہے تو کانٹوں کی زباں
لفظ خود سانچے میں ڈھلتا ہو، تمنا یہ ہے

قہقہے پھوٹ رہے ہوں تو گھٹن ہوتی ہو
دل تڑپنے سے بہلتا ہو، تمنا یہ ہے

کھوج بے پردہ ہو اور فکر ہو گہرائی سی
لمس دکھ درد نگلتا ہو، تمنا یہ ہے

جستجو مچلے نہ مچلے دلِ شاعر میں رضا
لیکن اظہار مچلتا ہو، تمنا یہ ہے

قلم اٹھاؤں مسلسل، رواں دواں لکھ دوں
کوئی پڑھے نہ پڑھے، میں کہانیاں لکھ دوں

جہاں تک آئیں تصور میں، وادیاں لکھ دوں
پھر ان پہ نام تمہارا یہاں وہاں لکھ دوں

کچھ انتظار کے لمحے، کچھ اشک، کچھ شبہے
جگہ بنانے کی دل میں نشانیاں لکھ دوں

جہاں ملے مجھے روٹی، اسے لکھوں دھرتی
جہاں پہنچ نہ سکوں اس کو آسماں لکھ دوں

لکھوں وہ نام کہ جس کو ثبات حاصل ہو
بہار نام کو خارج کروں، خزاں لکھ دوں

نکل چلوں کہیں حسن و جنوں کے جنگل میں
ہرن کی آنکھ میں کاجل کی ڈوریاں لکھ دوں

کہانی ختم ہوئی لیکن اس کا کیا کیجئے
جو لفظ یاد اب آئے، انھیں کہاں لکھ دوں

میں پہلے لکھوں تجھے امن کا پیامی۔ پھر
ہوئیں جو نام پہ تیرے لڑائیاں۔ لکھ دوں

جو ذہن میں ہیں حروف ان کو کام میں لاؤں
جو دکھ پڑے ہی نہ ہوں ان کی داستاں لکھ دوں

کچھ ایسا پتر لکھوں آپ کو جو بھا جائے
سراہوں آپ کے گُن، اپنی خامیاں لکھ دوں

غزل تو کہہ دوں رضا! یہ بھی تو اجازت ہو
جسے تو "ہندی" کہتا تھا وہ زباں لکھ دوں

پیاسا بے پانی کے نل پر جیسے
زیست قربان اجل پر جیسے

دلِ ناکام پہ حسرت کا نشان
داغِ محنت، کفِ شل پر جیسے

موجِ لب، مصرعۂ تر، سیلِ خیال
تیرتا پھرتا ہوں ڈل پر جیسے

تیری پلکوں پہ خوشی کا آنسو
بوند پانی کی کنول پر جیسے

میری تکمیلِ تمنّا کی نہ پوچھ
کام رکھا ہوا کل پر جیسے

اس طرح کا ہے غرورِ نقّاد
اینٹھنا غیر کے بل پر جیسے

چار سو یاس، مگر اک امیّد
روشنی راج محل پر جیسے

حسن کے ماتھے پہ خفگی کی شکن
علم کا بوجھ غزل پر جیسے

یوں رضا آج ہے آمادۂ فکر
کوئی تُل جائے عمل پر جیسے

آئینے میں بال پڑ گیا کیوں
پھیلا تھا بدن سکڑ گیا کیوں

تھا موج میں سوچ کا سمندر
جینے کا بھنور سا پڑ گیا کیوں

پت جھڑ تو ہے کوسوں دور ابھی سے
پتّا پتّا اجڑ گیا کیوں

کیا ہو گئی حاجت اس کی پوری
ملنے والا بچھڑ گیا کیوں

اکھڑا اکھڑا سہی مرا فن
عالم کا نظام اکھڑ گیا کیوں

پل بھر بھی ملا نہ تھا رضا سے
دشمن دھرتی میں گڑ گیا کیوں

جو بن انگارے اگلتا ہو، تمنا یہ ہے
سارا تن آگ میں جلتا ہو، تمنا یہ ہے

ٹوٹا پھوٹا ہی سہی۔ زیست کی ان ٹیسوں سے
ایک نغمہ بھی نکلتا ہو، تمنا یہ ہے

روپ نکھرا ہے ہر وقت تو کچھ بات نہیں
روپ سو رنگ بدلتا ہو، تمنا یہ ہے

دل ہے ساکت تری زلفوں کی مہک سے، یہ کیا؟
کوئی ہنگامہ سا پلتا ہو، تمنا یہ ہے

کھردرے ذہن کو ملتی ہے تو کانٹوں کی زباں
لفظ خود سانچے میں ڈھلتا ہو، تمنا یہ ہے

قہقہے پھوٹ رہے ہوں تو گھٹن ہوتی ہو
دل تڑپنے سے بہلتا ہو، تمنا یہ ہے

کھوج بے پردہ ہو اور فکر ہو گہرائی سی
لمس دکھ درد نگلتا ہو، تمنا یہ ہے

جستجو مچلے نہ مچلے دلِ شاعر میں رضا
لیکن اظہار مچلتا ہو، تمنا یہ ہے

قلم اٹھاؤں مسلسل، رواں دواں لکھ دوں
کوئی پڑھے نہ پڑھے، میں کہانیاں لکھ دوں

جہاں تک آئیں تصور میں، وادیاں لکھ دوں
پھر ان پہ نام تمہارا یہاں وہاں لکھ دوں

کچھ انتظار کے لمحے، کچھ اشک، کچھ شبہے
جگہ بنانے کی دل میں نشانیاں لکھ دوں

جہاں ملے مجھے روٹی، اسے لکھوں دھرتی
جہاں پہنچ نہ سکوں اس کو آسماں لکھ دوں

لکھوں وہ نام کہ جس کو ثبات حاصل ہو
بہار نام کو خارج کروں، خزاں لکھ دوں

نکل چلوں کہیں حسن و جنوں کے جنگل میں
ہرن کی آنکھ میں کاجل کی ڈوریاں لکھ دوں

کہانی ختم ہوئی لیکن اس کا کیا کیجے
جو لفظ یاد اب آئے، انھیں کہاں لکھ دوں

میں پہلے لکھوں تجھے امن کا پیامی۔ پھر
ہوئیں جو نام پہ تیرے لڑائیاں۔ لکھ دوں

جو ذہن میں ہیں حروف ان کو کام میں لاؤں
جو دکھ پڑے ہی نہ ہوں ان کی داستاں لکھ دوں

کچھ ایسا بہتر لکھوں آپ کو جو بھا جائے
سراہوں آپ کے گن، اپنی خامیاں لکھ دوں

غزل تو کہہ دوں رضا! یہ بھی تو اجازت ہو
جسے تو "ہندی" کہتا تھا وہ زباں لکھ دوں

دوست کی ساری دلیلیں من و تو کی نکلیں
میرے حق میں جو گئی باتیں، عدو کی نکلیں

ہم تو سمجھے تھے، گزر آئے چمن سے بچ کر
کتنی گنجائشیں دامن میں رفو کی نکلیں

کیا ہی جھرمٹ تھا تمناؤں کا، لیکن ان میں
جو حسینائیں ملیں تیری ہی خو، کی نکلیں

خون دے دے کے یہ جانا تھا کہ خوں ریز کیا
چند بوندیں بھی نہ پھولوں سے لہو کی نکلیں

جب گلے سے مرے زنار پکڑ کر کھینچا
ساتھ لپٹی ہوئی سو رمزیں وضو کی نکلیں

آرزوئیں تو مری تھیں، مری ہامی بھرتیں
وہ بھی دلدادہ ترے جام و سبو کی نکلیں

بار بار آ کے وہ ادراک سے ٹکراتی ہیں
ساری نظمیں مری تعریف کی بھو کی نکلیں

تھا رضا پہلے بڑا نام مگر بعد ازاں
کتنی کوتاہیاں اس خاک بہ رو، کی نکلیں

مرا لکھا بھی پڑھو، اے لکھے پڑھے لوگو!
اگر سنے نہ کوئی، بات کیا بنے، لوگو!

جدھر مڑو گے وہیں حادثے کا امکاں ہے
یہیں تھمے رہو، کچھ دیر کے لیے، لوگو!

نفس نفس ہے خلا، بزم بزم سناٹا
زباں پہ کچھ نہ کہے، دل ہی کچھ کہے، لوگو!

جو کوئی تاج محل ہو تو احترام کریں
مزارِ راہ نگاہوں میں کیا چڑھے، لوگو!

گناہ، شوق، تمنا، فشار، مجبوری
یہ چھوٹے چھوٹے فسانے ہیں، اے بڑے لوگو!

وہی ہیں ہم جو سیاست کے داؤ پیچوں سے
کبھی زباں پہ کبھی دار پر چڑھے، لوگو!

کسی میں ربط نہ پایا، کوئی زباں نہ بنی
بہت سے حرف الگ ناموں سے لکھے، لوگو!

ہمیں زمانے سے مطلب تھا، سو نکل آیا
کسے ہیں یاد زمانے کے مرحلے، لوگو!
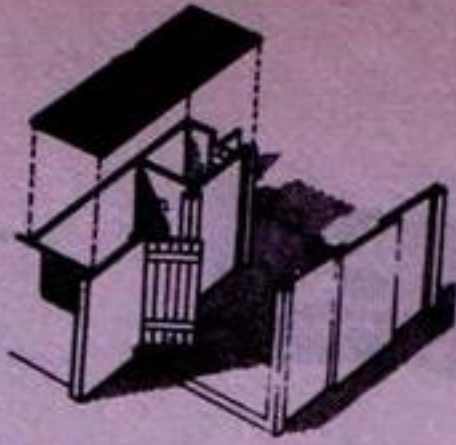
رضا بہ ضد ہے تو جانے دو۔ تم ٹھہر جاؤ
سحر میں دیر ہے، اندھے ہیں راستے، لوگو!

بعد مرے جب مجھ کو اپنے گیت سنانے آؤ گے
کیسی نراشا ہوگی تمکو، کس منہ واپس جاؤ گے

اوبڑ کھابڑ رستوں پر، کے روز چلو گے بچ بچ کر
کس کی دعائیں ڈھونڈو گے، پھر کس کا سہارا پاؤ گے

ایک ہی بہتا ساگر تھا میں جسکو لگا دی تم نے آگ
اب کس پانی میں اترو گے، ناؤ کہاں تیراؤ گے

سپنوں کا پیچھا کرتے ہو، راہ کے روڑے بھی دیکھو
پل دو پل ٹھہرو تو اچھا، ورنہ ٹھوکر کھاؤ گے

میں دن رات جلونگا اور تم ٹک ٹک جلتا دیکھو گے
آنکھ کی جوتی بجھ جائیگی، تم کاجل بن جاؤ گے

اک کوندا سا لپکے گا پھر خاموشی ہی خاموشی
گھٹ کے دھواں رہ جاؤ گے جو بادل سے ٹکراؤ گے

اب بھی رضاؔ کے پاگل پن کی دو اک گھڑیاں باقی ہیں
سب من مانی منوا لو اب پھر کس سے منواؤ گے

اور آگے نہ بڑھیے، رکیے اب
لمبے سایوں سے ہم کو کیا مطلب

کیا بتاؤں، ہیں کون دشمنِ جاں
جو ترے دوست یار ہیں، وہ سب

زندگی موج میں یہی گذری
قطرہ قطرہ بہے ہیں روز و شب

دیوتا دس کروڑ بھی کم ہیں
اپنی مانگیں بھی تو ہیں بیس ارب

کس سے مانگوں! جو رب ہے اچھوں کا؟
یا جو میرا تیرا نہیں ہے رب؟

گم ہوں اپنے میں، یا زپرس نہ فکر
شہر خالی ہے غمکدہ نہ کلب

جب سے تم جل اٹھے دیے کی طرح
بجھ گئے بے طرح ہمارے لب

بھوک بھی میری کھوج بھی میری
یہ بھی ملزوم، وہ بھی غور طلب

تو رضاؔ فلسفی بھی شاعر بھی
تیرے جتنے غلام اتنے رب

عالمِ حُسن تیرا گھر جیسے
ہر ادا اک نیا نگر جیسے

ہر قدم ہے سکون سرتاپا
میری منزل ڈگر ڈگر جیسے

بے بسی، آڑے وقت کی زنجیر
حوصلہ، بعدِ شب، سحر جیسے

تیرے قد تک میں رہ گیا آگر
لگ گئی ہو تری نظر جیسے

جب بھی لوٹا دیں، جو بھی سود بھریں؟
میرے سُکھ، قرض آپ پر جیسے

اب اندھیروں سے بھاگنا کیسا
اب تو ہو ہی گئی سحر جیسے

غم کے آنسو، چراغِ دیر و حرم
جگمگائیں گے رات بھر جیسے

شاعری، جیسے جوئے خونِ جگر
موجِ تفہیم، چشمِ تر جیسے

ہر ندی کے رضا! کنارے دو
ہم اِدھر جیسے تم اُدھر جیسے
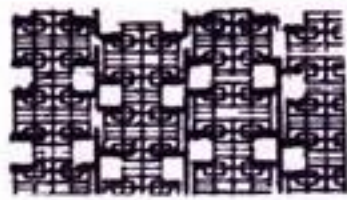
جیسے ہی شب نے سوال اٹھ کے اجالوں سے کیا
بجھ گیا کونے میں جلتا ہوا مٹی کا دیا

زندگی جب سے ہوئی جذب تری سانسوں میں
چند لمحے بھی تو جینے کی طرح میں نہ جیا

واہ واچاہی تو دو ٹکڑے ادھر پھینک دیے
وہ بھی کیا دے سکے اور میں نے بھی کیا مانگ لیا

میں ہو وہ جس نے ترے بکھرے ہوئے سجدوں کو
سلسلہ وار کئی ناموں سے ترتیب دیا

آپ اب پوچھتے ہیں اشکوں کی قدر و قیمت؟
آپ کا بخشا ہوا چاکِ جگر کس نے سیا

کیا کیا میں نے؟ بس اتنا کہ ترے لفظوں کو
خوب ناخوب کے آئینے میں تحقیق کیا

اے رضا! لوگ تو بے کار مرے جاتے ہیں
حسرتِ دل کے سوا کون مرا، کون جیا

دکھ سمویا دماغ میں کس نے — عمر کاٹی سُراغ میں کس نے

جگمگا اٹھی رات بن باتی — رکھ دیا دل چراغ میں کس نے

داغ دے کر چلے گئے تم تو — بھر دیا نور، داغ میں کس نے

کھلے انداز آنے جانے کی — نیو ڈالی ہے باغ میں کس نے

کس نے گم کر دیا رِضاؔ تجھ کو — پھر مدد دی سراغ میں کس نے

سوئے ارماں جب آنکھ جھپکیں گے — دھواں اٹھے گا شعلے لپکیں گے

دیکھنا، چھیڑ بیٹھنا نہ ہمیں — پھوڑے چھل جائیں گے تو ٹپکیں گے

موند کر آنکھ اور سو رہتے — جانتے ہم جو آپ تھپکیں گے

قربتیں تو جہاں بھی ڈھونڈے گا — فاصلے بھی ادھر ہی لپکیں گے

موسلا دھار ابر برسے گا — ہم رِضاؔ بوند بوند ٹپکیں گے

مانگ بھرو ہو، سنگھار کرو ہو — کون سی منزل پار کرو ہو

توڑو ہو اٹھتی کونپل کو — سیدھے دل پر وار کرو ہو

بھول کرو ہو جی کو ڈھا کر — ایک نگر مسمار کرو ہو

دن تھے وہی جب بَیری تھے تم — پیار کا تو بیوپار کرو ہو

بے پانی ڈوبو ہو ایسا — ساحل کو منجدھار کرو ہو

آنکھوں ہی سے کہہ سن لو تم — باتوں میں لاچار کرو ہو

سچ کو جھوٹ کہو ہو پہلے — پھر اس پر اصرار کرو ہو

بے جرمی پر بھی ضِد تم کو — جرم کا بھی اقرار کرو ہو

پل میں کرو ہو جینا مشکل — پل میں ڈھیروں پیار کرو ہو

منزل کی خواہش رکھو ہو — فاصلوں سے انکار کرو ہو

چاہو ہو پاگل نہ بنوں میں — سپنوں کی بوچھار کرو ہو

دل میں رِضاؔ! تم جو ہو سو ہو — باتیں تیکھے دار کرو ہو
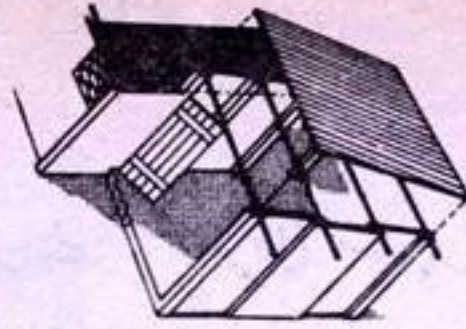
لہروں لہروں بول رہا ہوں
اک نیّا سا ڈول رہا ہوں

دل کو کشادہ کرنا کیسا
کچھ گرہیں سی کھول رہا ہوں

آرزو ہی کیوں؟ جھوٹ سچّے
کتنی زبانیں بول رہا ہوں

ہوں ناپاگل، اپنے دکھوں کا
تیرے سُکھوں سے تول رہا ہوں

ساگر میں اک مٹھی صحرا
ڈالا تھا، اب گھول رہا ہوں

من کے قیدی کیا بھاگیں گے
لو، زنجیریں کھول رہا ہوں

ایک ہی پلڑے، مال بھی دل بھی
کیا جانوں کیا تول رہا ہوں

چُنری کی آمد آمد ہے
رنگ ابھی سے گھول رہا ہوں

کس نے پکارا ذہنِ رضا کو
ہاں، بولو، میں بول رہا ہوں

دو گھڑی کھل کے ہمیں درپہ ملا بھی نہ سکو
ذہن شیشہ تو نہیں ہے کہ جھکا بھی نہ سکو

یہ صدی ختم ہوا چاہے مگر حال وہی
یعنی آرام بھی دو، درد مٹا بھی نہ سکو

ہم سے نغموں کو چھپا رکھو مگر ایسا بھی کیا
اپنے احساس کے دو بول سُنا بھی نہ سکو

میں ترو تازہ، کفِ شوق پہ آسودہ ہوں
وہ گرا اشک نہیں ہوں کہ اٹھا بھی نہ سکو

کون سی منزلِ مبہم پہ کھڑے ہو، یارو!
کھینچ کے آ بھی نہ سکو، ٹوٹ کے جا بھی نہ سکو

کچھ توقع تو بہرحال ہمیں تم سے ہے
یہ بھی کیا، سامنے ڈوبیں تو بچا بھی نہ سکو

لاکھ پلکوں پہ ہے طوفان، مگر اشکوں کی
سرکشی کا ہے یہ عالم کہ بہا بھی نہ سکو

کیا ہوا سر میں ہے جو پھیل رہے ہو اتنے
روزنِ کون و مکاں میں تو سما بھی نہ سکو

اے رضا! کون کہے گا کہ سخن سنج ہو تم
رات دن شعر کہو اور سنا بھی نہ سکو

یہ لمحاتِ نو میرا کیا لے گئے
کچھ آنسو گرے تھے، اٹھا لے گئے

ندی نالے قدریں بہا لے گئے
وفا لے گئے، مدعا لے گئے

کسے ڈھونڈتے ہو کھڑی ناؤ پر
سبھی فاصلے ناخدا لے گئے

مرے پاؤں پر کن بڑوں کا ہے سر
انھیں کا جو میری دعا لے گئے

جو محفل میں ٹھہرے، بنے جاوداں
جو اٹھے، سروں میں ہوا لے گئے

خیالوں نے ڈالی نہ سیدھی کمند
ستاروں کو چھوڑا، گھٹا لے گئے

یہ کیسے جھکولے تھے پندار کے
مجھے پنکھ دے کر اڑا لے گئے

چُنار رہنما ان کو، یہ کیا کیا؟
کہاں سے کہاں نقشِ پا لے گئے

دکھایا کیے وہ فقط روپ رنگ
ہم آنکھوں میں سپنے سجا لے گئے

گھر آنگن میں سونے کا سورج کہاں
کرن تک پڑوسی چرا لے گئے

لبوں پر کہیں کالی داس اب نہیں
بڑے نام گیتا رضا لے گئے

◆

اک نظر، دیکھ! دوستوں کی طرح
کھل اٹھوں گا ترے لبوں کی طرح

نئے چہرے یہ جھرّیاں کیسی
میری ناکام حسرتوں کی طرح

غم کا طوفاں تھما تو گلشن میں
تتلیاں پھوٹیں کونپلوں کی طرح

تیری معصومیت اڑا چاہے
آسمانوں میں بادلوں کی طرح

چاند سورج بھی، تیرا آنچل بھی
سب کا طالب ہوں بے زروں کی طرح

کبھی آ گرتی ہیں تمنّائیں
بھوکے دامن میں روٹیوں کی طرح

یا یہ زنجیر ہیں مرے افکار
پنکھ کھولے ہوئے گلوں کی طرح

تیرے سُکھ، بوجھ، جیسے صدیوں کے
میرے سُکھ ٹیڑھی گردنوں کی طرح

آپ ہر دم رہیں ترو تازہ
جل کو چھوتی ہوئی حدوں کی طرح

کتنی تقدیریں غم کے کوڑے پر
رقص کرتی ہیں انگلیوں کی طرح

گو میں شاعر ہوں، پر برا نہ کہو
کہ نہیں ہوں میں شاعروں کی طرح

اے رضا! اب کہیں قیام کرو
پھر رہے ہو فلک زدوں کی طرح

◆

کفّارہ لڑکپن کا ہے یا لغزشِ پا ہے
کس جام کی مستی میں بدن جھوم رہا ہے

اک جینے کا چسکا ہے، نہ دکھ ہے نہ دوا ہے
لو جیت لیا سب کو مگر جیت میں کیا ہے

دل نرم بچھونے پہ پڑا سوچ رہا ہے
سانسوں سے الجھتی ہوئی یہ پھانس سی کیا ہے

تو رات گئے تک بھی وہی بند کلی تھا
اب صبح کی کرنوں نے بدن کھول دیا ہے

گالوں پہ اتر آئے گا اک پل کی ہنسی سے
یہ بوجھ سا اشکوں کا جو پلکوں پہ لدا ہے

شاعر ہی کرے گا تری تزئین کا سامان
گہنوں کو ترے روپ کی شدت کا گلا ہے

رہتی ہے رگ و پے میں کہیں بھیس بدل کر
اے بے خبری! ترا بیتا جان لیلے ہے

کیا دل سے نہیں ہاتھ سے کھینچی تھی یہ تصویر؟
ہر منظرِ معصوم پہ دھبّا سا پڑا ہے

تو کلکِ رضاؔ! کون سی تانوں میں مگن تھا
جب شہد ٹپک کر ترے نغموں میں گھلا ہے

پل دو پل کیا چیز ہے، دنیا، زمانہ، سب ہمیں
اپنی بیتی سب ہمیں، تیرا فسانہ سب ہمیں

تو بڑا یوں ہے کہ تجھ کو کاٹ کر بر دے دیئے
ورنہ گلشن، برق، بادل، آشیانہ سب ہمیں

تُو لشکلِ آشنا، بس ماجرا دیکھا کیا
منکرِ عشق اور عشقِ والہانہ سب ہمیں

تیری مٹھی میں شکار، اب ساری شہرت تیرے ہاتھ
تیر، تیر انداز، ترکش، دل، نشانہ سب ہمیں

زحمتِ یک گام پر بھی ناز تو کرتا ہے کیا
رہنما، منزل، مسافت، دام، دانہ سب ہمیں

سر براہِ قوم آ کر سب مزا لے جائے گا
گولیاقت، خرچ، خدمت، شامیانہ سب ہمیں

تو مجسم پارسائی، تو سراپا ہوش مند
لڑکھڑانے اور بہکنے کا بہانہ سب ہمیں

بھول جانے اور نہ آ سکنے کا حیلہ تو ہی سب
منتظر، دعوت دہندہ، اہلِ خانہ سب ہمیں

تو رضاؔ بھی ہے تو اتنا پھولنا کس بات پر
میرؔ، انشاؔ، مصحفیؔ، غالبؔ، یگانہؔ سب ہمیں

میرا قلم ساجن کا پتا لکھتا ہے
بول اے دل! تو خط میں کیا لکھتا ہے

دنیا کے سے نقش ابھر آتے ہیں
جب جب واعظ لب پہ خدا لکھتا ہے

مٹتا جاتا ہے کاجل آنکھوں کا
کوئی پتنگا شرطِ وفا لکھتا ہے

آج عدالت شب کو کھلے گی شاید
صبح سے منصف میری سزا لکھتا ہے

مایوسی میں کیوں کر خوشیاں لکھوں
پت جھڑ ہو تو کون ہرا لکھتا ہے

گُن گُن گُن گُن بھنورا سانجھ سویرے
ڈالی ڈالی جانے کیا لکھتا ہے

مل کر ہی اب حال کھلے گا شاید
خط میں تو وہ خود کو خدا لکھتا ہے

بزمِ سخن سے کیا مطلب مستوں کو
حظ لیتا ہے شوق، رضاؔ لکھتا ہے

کیا پوچھیے کہ چھوڑ کے ساتھی کدھر گئے
سر پر اندھیری رات تھی سب اپنے گھر گئے

اب کیا دلیل لائیے رَدِّ ثواب میں
جن وسوسوں پہ ناز تھا وہ تو بکھر گئے

تم ہی قبول کر نہ سکے ورنہ ہم، لہو
لے لے کے جلووں میں تمہارے نکھر گئے

ہم رہ روانِ شوق کو دیوارِ سنگ کیا
ضربِ نظر سے راہ بنائی، گزر گئے

ساون پلٹ کے آ گیا پر آ سکے نہ تم
بادل برس برس گئے، تالاب بھر گئے

مقصود بھی یہی تھا، لگے خرمنوں میں آگ
اب شعلے جو اٹھے ہیں تو چہرے نکھر گئے

گھر ڈھا کے شاہراہ نکالی تو غم نہیں
اصحاب نام میرا ہی تو اس پہ دھر گئے

تعریف کے پُلوں نے ڈبویا ہمیں، رضاؔ
جو راستی کے پل سے چلے، پار اتر گئے

کفارہ لڑکپن کا ہے یا لغزشِ پا ہے — کس جام کی مستی میں بدن جھوم رہا ہے

اک جینے کا چکر ہے، نہ دکھ ہے نہ دوا ہے — لو جیت لیا سب کو مگر جیت میں کیا ہے

دل نرم بچھونے پہ پڑا سوچ رہا ہے — سانسوں سے الجھتی ہوئی یہ پھانس سی کیا ہے

تو رات گئے تک بھی وہی بند کلی تھا — اب صبح کی کرنوں نے بدن کھول دیا ہے

گالوں پہ اتر آئے گا اک پل کی ہنسی سے — یہ بوجھ سا اشکوں کا جو پلکوں پہ لدا ہے

شاعر ہی کرے گا تری تزئین کا سامان — گہنوں کو ترے روپ کی شدت کا گلا ہے

رہتی ہے رگ و پے میں کہیں بھیس بدل کر — اے بے خبری! تیرا پتا جان لیا ہے

کیا دل سے نہیں ہاتھ سے کھینچی تھی یہ تصویر؟ — ہر منظرِ معصوم پہ دھبا سا پڑا ہے

تو کلکِ رضا! کون سی تانوں میں مگن تھا — جب شہد ٹپک کر ترے نغموں میں گھلا ہے

پل دو پل کیا چیز ہے، دنیا، زمانہ، سب ہمیں — اپنی بیتی سب ہمیں، تیرا فسانہ سب ہمیں

تو بڑا یوں ہے کہ تجھ کو کاٹ کر پر دے دیئے — ورنہ گلشن، برق، بادل، آشیانہ سب ہمیں

تو بشکلِ آشنا، بس ماجرا دیکھا کیا — منکرِ عشق اور عشق والہانہ سب ہمیں

تیری مٹھی میں شکار اب ساری شہرت تیرے ہاتھ — تیر، تیر انداز، ترکش، دل، نشانہ سب ہمیں

زحمتِ یک گام پر بھی ناز تو کرتا ہے کیا — رہنما، منزل، مسافت، دام، دانہ سب ہمیں

سربراہِ قوم آ کر سب مزا لے جائے گا — گو لیاقت، خرچ، خدمت شامیانہ سب ہمیں

تو مجسم پارسائی، تو سراپا ہوش مند — لڑکھڑانے اور بہکنے کا بہانہ سب ہمیں

بھول جانے اور نہ آسکنے کا حیلہ تو ہی سب — منتظر، دعوت دہندہ، اہلِ خانہ سب ہمیں

تو رضا بھی ہے تو اتنا پھولنا کس بات پر — میر، انشا، مصحفی، غالب، یگانہ سب ہمیں

میرا قلم ساجن کا پتا لکھتا ہے
بول اے دل! تو خط میں کیا لکھتا ہے

دنیا کے سے نقش ابھر آتے ہیں
جب جب واعظ لب پہ خدا لکھتا ہے

مٹتا جاتا ہے کاجل آنکھوں کا
کوئی پتنگا شرطِ وفا لکھتا ہے

آج عدالت شب کو کھلے گی شاید
صبح سے منصف میری سزا لکھتا ہے

مایوسی میں کیوں کر خوشیاں لکھوں
پت جھڑ ہو تو کون ہرا لکھتا ہے

گُن گُن گُن گُن بھنورا سانجھ سویرے
ڈالی ڈالی جانے کیا لکھتا ہے

مل کر ہی اب حال کھلے گا شاید
خط میں تو وہ خود کو خدا لکھتا ہے

بزم سخن سے کیا مطلب مستوں کو
حظ لیتا ہے شوق، رضاؔ لکھتا ہے

کیا پوچھیئے کہ چھوڑ کے ساتھی کدھر گئے
سر پر اندھیری رات تھی، سب اپنے گھر گئے

اب کیا دلیل لائیے رَدِّ ثواب میں
جن وسوسوں پہ ناز تھا وہ تو بکھر گئے

تم ہی قبول کر نہ سکے ورنہ ہم، لہو
لے لے کے چلوؤں میں تمہارے نگر گئے

ہم رہ روانِ شوق کو دیوارِ سنگ کیا
ضربِ نظر سے راہ بنائی، گزر گئے

ساون پلٹ کے آ گیا پر آ سکے نہ تم
بادل برس برس گئے، تالاب بھر گئے

مقصود بھی یہی تھا، لگے خرمنوں میں آگ
اب شعلے جو اٹھے ہیں تو چہرے نکھر گئے

گھر ڈھا کے شاہراہ نکالی تو غم نہیں
اصحاب نام میرا ہی تو اس پہ دھر گئے

تعریف کے پُلوں نے ڈبویا ہمیں، رضاؔ
جو راستی کے پل سے چلے، پار اتر گئے

یہ بستر اک سلگتا سا کنواں کیوں
یہاں ٹھہرا ہی کرتا ہے دھواں کیوں

وہ ٹھنڈی چھاؤں پیڑوں کی، وہ جھونکے
وہاں کیوں آپ ہیں اور ہم یہاں کیوں

کہیں دیتا بھی ہے مہلت، زمانہ
دمادم پوچھتا ہے "کب" "کہاں" "کیوں"

برہنہ سا تنا، بے شاخ، بے چھال
وہی تھامے ہوئے ہے آسماں کیوں

کوئی مالک، کوئی مالی نہیں کیا؟
چمن میں اس طرح پگڈنڈیاں کیوں

اک آنسو ہی تو ٹپکا تھا زمیں پر
وہیں نکلا تمہارا آستاں کیوں

توانا آرزو، ہم بھی توانا
یہ دبلی کانپتی پرچھائیاں کیوں

تصور میں ہے کیا آبِ گلِ تر؟
رکا جاتا ہے بڑھتا کارواں کیوں

جو لمحے انگلیوں سے چھن چکے ہیں
ابھی تک کہہ رہے ہیں داستاں کیوں

خزاں سے بے خبر ہو کر، جیا کون
دیئے جاتا ہے موسم لوریاں کیوں

رضاؔ! دل کی زباں کچھ اور ہی ہے
یہ حرف و صوت اپنے درمیاں کیوں

وقت نے کچھ نہیں کہا ہے ابھی
ٹکٹکی باندھے دیکھتا ہے ابھی

تو کہاں ٹوٹ کر ملا ہے ابھی
چند صدیوں کا فاصلہ ہے ابھی

آنسو اک دن ملے گا مٹی میں
پلکوں پلکوں ٹھہر رہا ہے ابھی

کیا سمجھ کر میں کود جاؤں پھر
ذہن میں کل کا حادثہ ہے ابھی

زرد ٹیلے سے کوئی پھسلا ہے
بے زروں کا خدا ہنسا ہے ابھی

کھوج معنی کی تھی، کہاں سے ملے
لفظ روتا ہوا گیا ہے ابھی

روکیے رقص دو گھڑی کے لیے
لمس کا فرش بچھ رہا ہے ابھی

شوق کہتا ہے ڈھونڈتے رہیے
کوئی انجانا راستا ہے ابھی

وسوسہ ختم کب ہوا دل کا
آتے جاتے سے پوچھتا ہے ابھی

فکر کو کیوں رضاؔ! نہ دو حرکت
زندہ رہنے کا حوصلہ ہے ابھی

فکر و فن چھوٹ چکے، تھوڑا سا مَس باقی ہے
اب کہاں پھول، کہیں ڈال میں رس باقی ہے

ہم نے کس جگ میں سنی صبر و رضا کی تلقین
پیڑھیاں بیت گئیں، حرص و ہوس باقی ہے

بس وہی مانگ میں روشن ہے وفا کا سندور
یعنی اس روپ کے مندر کا کلس، باقی ہے

کوئی تیلی تو نہ ٹوٹی تھی، نہ در ٹوٹا تھا
چند رو پنچھیہ اڑا نہیں ہیں، قفس باقی ہے

کیوں ابھی سے ہو رضا، بیتے دنوں پہ مغموم
اب بھی اُس دور کا ایک آدھ برس باقی ہے

مے کدہ چھٹنے سے سب جھگڑے نبٹ جاتے نہیں
خُم تصور میں مرے آگے سے ہٹ جاتے نہیں

گھونٹ ہو، کش ہو، کہ ساغر ہو، مگر مستی ہو
جھومنے والے، پیالوں میں تو بٹ جاتے نہیں

دوڑنے پھرنے میں رکھتے ہیں شعورِ ہستی
ہم غبارے ہی سہی، جوش سے پھٹ جاتے نہیں

ہم وہ دریا ہیں جو چٹان سے ٹکر لے کر
ڈھونڈھ لیتے ہیں نئی راہ، پلٹ جاتے نہیں

پھیل جاتے ہیں فضا تک، وہ جگر دار ہیں ہم
ایک نقطے کی طرح خود میں سمٹ جاتے نہیں

گزری صدیوں پہ اضافہ ہیں گزرتے لمحے
یا کہ ماضی کی جھلک حال سے کٹ جاتے نہیں

خون دے دے کے ہی کھلتی ہے زمانے کی کتاب
یہ ورق زیست کے، پھونکوں سے الٹ جاتے نہیں

ایک گلزار کھلانا ہے رضا! مقتل میں
باندھ کے سر پہ کفن گھر کو پلٹ جاتے نہیں
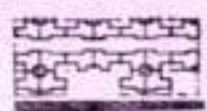
کچھ ایسی کھری جنس کا بیوپار کیا ہے
ہر بیچنے والے کو خریدار کیا ہے

پل پل کی جو دستک ہے درِ دل پہ، اسی نے
لفظوں کو رواں، فکر کو بیدار کیا ہے

اے جانِ غزل! گوشہ نشیں رہ کے بھی ہم نے
گوندھی ہے تری زلف، تجھے پیار کیا ہے

بیڑی ہو تو کاٹوں، کوئی زنداں ہو تو توڑوں
آزاد ہواؤں نے گرفتار کیا ہے

تاریخ شہیدوں کو سجانا نہیں بھولی
ہر مردِ سرِ دار کو سردار کیا ہے

اب دیکھیے کس کنجِ قفس میں ملے بستر
دل نے تو کھلی چھت پہ بھی اصرار کیا ہے

ذہنوں نے اڑا دی ہے تمیزِ ارض و فلک کی
تُلنا پرِ پرواز کا دشوار کیا ہے

صدیوں کی تھکن ڈالے ہوئے ہے وہی شکنیں
سو بار رہِ شوق کو ہموار کیا ہے

بے شک میں ہی مجرم ہوں رضا! ضبط و وفا کا
نیلام جوان کا سرِ بازار کیا ہے

غم نے ہستی کو جو بھی موڑ دیے
ہم نے بے خوف تم سے جوڑ دیے

زیست کا لمس اور ہی کچھ ہے
ہم نے چھو کر مزار چھوڑ دیے

کن چراغوں پہ ناز کرتے ہو
درد کی ایک لو، کروڑ دیے

تو نے توڑا فقط ہمارا دل
آسماں نے اصول توڑ دیے

دیکھیے کیوں تمہیں رضا کے ساتھ
دل نے دو راستے ہی چھوڑ دیے

خود کو شاداں بھی لکھوں، غرقِ فنا بھی لکھوں
مجھ سے ممکن نہیں، ہستی کو قضا بھی لکھوں

ہائے رے جبر! کہ باوصفِ غمِ ذلت کے
تجھ کو منصف بھی کہوں اور خدا بھی لکھوں

کیا خبر، بھیک میں پا جاؤں حسیں مستقبل
کیوں نہ ماضی کو فقیروں کی صدا بھی لکھوں

بد دعاؤں ہی سے خط بھر دیا؟ کیا میں نے کیا
کہیں ممکن ہو تو اک حرفِ دعا بھی لکھوں

کیوں جھکوں اتنا کہ گلشن کی طلب گاری میں
خشک سالی کے بگولے کو صبا بھی لکھوں

یہ بھی تحریر کروں، کیسی ادا، کیسا مزاج
شہر کا ذکر ہے تو آب و ہوا بھی لکھوں

وقت کہتا ہے، کہوں زہر بھی جامِ مے کو
اور تلچھٹ کی عفونت کو نشا بھی لکھوں

لکھ چکا ہوں میں سبھی خواب، روایت، حسرت
اب دمِ نَو ہے، کوئی باب نیا بھی لکھوں

تھک گیا ہوں میں پتا آپ کا لکھتے لکھتے
تازہ دم ہو لوں تو کچھ اپنا پتا بھی لکھوں

چاہتا ہوں کہ تجھے یادِ کہن ہی نہ کہوں
ٹمٹماتا ہوا باطن کا دِیا بھی لکھوں

دکھ امٹ ہے بڑی مشکل سے کیا درجِ کتاب
اب یہ کیوں بھول کروں، دکھ کی دوا بھی لکھوں

شعر کی شکل میں آیا ہی نہیں تو کیوں کر
فکر کو تجربہ بھی، حُسنِ ادا بھی لکھوں

اے سخن فہم کی چپ! تیری اداؤں پہ نثار
تجھ کو قاتل بھی لکھوں، اس سے سوا بھی لکھوں

خوش تھے چکبست تخلص ہی نہ تھا ورنہ میں
کے ڈی گیتا بھی لکھوں اور رضا بھی لکھوں
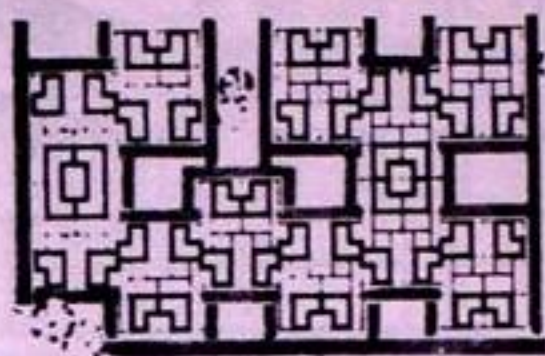
دوست کہا تو بات سے ٹل مت جانا
سن کر میرا حال بدل مت جانا

شاید اُجلے پن کا جال بچھا ہو
دستک دے جو چاند، مچل مت جانا

اس کی پھلواری میں دھواں سا کیسا
آگ لگے پھولوں کو جل مت جانا

دھوپ میں بختا بختی کو نکلے ہو
سر میں موم بھرا ہے ڈھل مت جانا

کوئی جزیرہ بھی تو نہیں آنکھوں میں
پلکوں پر چلتا ہے، پھسل مت جانا

کانچ نہیں، چاندی ہو، سونا ہو تم
پاس چتا جلتی ہے پگھل مت جانا

شام تک آ ہی جانا، صبح کے بھولو!
سرحد کے اس پار نکل مت جانا

خوب پیالا بھرلو، رضاؔ معنی سے
اور کناروں سے بھی اچھل مت جانا

کیا کیا نہ وار کاسۂ سائل پہ آئے ہیں
بے شک یہ سارے زخم مرے دل پہ آئے ہیں

اُٹھیے، بھنور سے بچنے کا منظر تو دیکھئے
کتنے جہاز درد کے ساحل پہ آئے ہیں

تنہائیوں کو کیسے میں ملزم قرار دوں
الزام تو وہی ہیں جو محفل پہ آتے ہیں

خوابوں نے آدھی رات یہ کہہ کر اٹھا دیا
ہم شاہِ وقت ہیں درِ سائل پہ آئے ہیں

اشکوں کی تہہ میں چھن سے ہیں غم کے سلسلے
یہ سو جزیرے پھاند کے منزل پہ آئے ہیں

دنیا میں اب اجالوں کی پہچان کیا رہی
بس وہ پسینے جو رُخِ قاتل پہ آئے ہیں

یہ تنکے، یہ ہوائیں، یہ جھالے، یہ بجلیاں
مہمان سب رضاؔ کے ہیں، ساحل پہ آئے ہیں

کوئی دریا تو ہو رضاؔ کا سا
بہتا بہتا سا، ٹھہرا ٹھہرا سا

یاد آتا ہے ایک سپنا سا
سارے عالم سے ایک رشتا سا

کیا ہُوا وہ زمانہ پیارا سا
من بڑا سا، بدن اکہرا سا

اب تو کہتے ہیں لوگ 'دیوانہ'
میرا کچھ نام بھی تھا اچھا سا

آخرِ شب میں دے گیا کوئی
ایک تڑپن سی، ایک لہجا سا

اب یہی ہے، یہی ہے، فن میرا
بہ چار کندھے سے اِک جنازا سا

سارے منزل سے ہم کنار ہوئے
فاصلہ لگ رہا ہے تنہا سا

رنگِ نامعتبر ہے موج بموج
ہر سمندر ہے اِک جزیرا سا

شاید اندر کا حرفِ ناگفتہ
کچھ تو دیکھا تھا لکھا لکھا سا

اُجلے لفظوں سے کھیلیے کب تک
اے تھکن! اِک خیال میلا سا

ٹھیک ہی مجھ کو راکھ کر ڈالا
مَیں کہ پتّا تھا سوکھا سا سہما سا

ضبط نے گڑھ لیے اصول نئے
درد ورنہ وہی ہے پہلا سا

ہم سفر آج کوئی اور نہیں
محض اک رستہ اونچا نیچا سا

فکرِ نَو کا نزول کیا کہیے
رات ڈھلتی سی، دن نکلتا سا

ہو نہ ہو یہ سخن رضاؔ کا ہے
وہی انداز میٹھا میٹھا سا

◆

گو ہے پینے کی دھوم دھام بہت
پیاس پھر بھی ہے ناتمام بہت

جام کی لَو کو تیز تر کر دو
سانولی سانولی ہے شام بہت

اور بھی تن گیا غمِ دوراں
دل نے جھک کر کیا سلام بہت

جانے کس میکدے میں آپہنچے
مے کا قطرہ نہیں ہے جام بہت

کیوں نہ کہہ دوں کہ میں ہی قاتل ہوں
لوگ لیتے ہیں میرا نام بہت

میں اکیلا ہوں، نکتہ چیں سب ہیں
جرم کم کم ہے انتقام بہت

مل کے خوش ہوں کہ وہ رضاؔ تم ہو
بے ہوس ہو مگر ہے نام بہت

آنا جانا تو اک بہانہ تھا
ہم کو راہوں میں ڈوب جانا تھا

جب ترا دن ترا زمانہ تھا
وقت خنجر تھا، دل نشانہ تھا

رنگ لانے کو دل لہو کرتے
تتلیوں کے نگر نہ جانا تھا

سب مکاں ڈھونڈھے یاد تھے جتنے
زندگی کا کہاں ٹھکانا تھا

بیتے لمحوں میں ڈھل چکا تھا وقت
اور غموں کا وہی زمانہ تھا

اب نہ رکھو نظر اڑانوں پر
تب ہواؤں پہ آشیانہ تھا

سر جھکانے میں دیر کیا لگتی
بھیگی پلکوں پہ آستانہ تھا

تازہ تحریر تھی مگر ہر حرف
کل کا لکھا ہوا فسانہ تھا

روشنی لی نہ لی، رضا جانے
کام اپنا دیا جلانا تھا

◆

مرا زر نہیں مرا دیوتا، مرا دیوتا کوئی اور ہے
اِسے پوجتا کوئی اور ہے، اُسے پوجتا کوئی اور ہے

میں تو ہم سفر ہوں، وجود تک، مرے جی کو اپنا ہی حق کہ
مگر اے سفینۂ جذب دل، ترا ناخدا کوئی اور ہے

مجھے ڈھونڈنا ہے تو ڈھونڈھیے کسی پائے ناز کے نقش میں
وہ یہ چمن چمن، وہ سحر سحر، وہ صبا صبا کوئی اور ہے

میں چلا تو ہوں تری بزم کو مگر اجنبی سی ہیں آہٹیں
کوئی کہہ رہا ہے قدم قدم کہ یہ راستا کوئی اور ہے

تو لباسِ بادِ سحر میں ہے، ترے قدرداں ہیں دمن چمن
تو مری نگاہ پہ شک نہ کر، تجھے دیکھتا کوئی اور ہے

وہ ہے اور کوئی جو سوچ سے مجھے توڑتا ہے ڈگر ڈگر
بھری محفلوں میں یہاں وہاں مجھے بانٹتا کوئی اور ہے

وہ ہے شیام رنگ، بجا کہا، مگر اس کا دل تو ہے مرمریں
یہ دھواں دھواں، وہ رضا نہیں، یہ جگر جلا کوئی اور ہے

بڑھے مزید فاصلے دراز کم نہیں ہوئی ہمیں کو صبر آ گیا، شکستِ غم نہیں ہوئی

ابھی سے آپ کس لیے وصال میں رنگے گئے ابھی تو رات ہجر کی سحر میں ضم نہیں ہوئی

مری پکار کا اثر بشر پہ ہو تو کس طرح فلک پگھل نہیں گیا، زمین نم نہیں ہوئی

یہ وقت وقت پر فقط کہی گئی، سنی گئی یہ داستان پیار کی، کبھی رقم نہیں ہوئی

وہ شاخ آرزو کی تھی، تمام وار سہ گئی سمٹ گئی سکڑ گئی مگر قلم نہیں ہوئی

ترے چراغ سے وہاں چراغ کتنے جل گئے یہاں ترے چراغ کی کرن بھی کم نہیں ہوئی

بس اک تصور ہی تو ہے جو غم میں میرے ساتھ ہے یہ ساری کائنات تو شریکِ غم نہیں ہوئی

رہِ سخن پہ اے رضا چلا ہوں احتیاط سے
مگر وہ کون چوک تھی جو ہم قدم نہیں ہوئی

■

وہ جو ایماں پیمبر پہ لائے نہ تھے اپنے ہی لوگ تھے کچھ پرائے نہ تھے

جانے ہم کون جنگل سے گزرے تھے کل جھنڈ کے جھنڈ پھیلے تھے سائے نہ تھے

وہ تو بس بھول جانے پہ جی آ گیا ورنہ ہم نے سبق سب بھلائے نہ تھے

کی زمانے نے بیعت بھی بے ساختہ حرفِ نامعتبر ہم بھی لائے نہ تھے

کچھ دیئے روشنی دے گئے راہ تک جانے کیوں دوستوں نے بجھائے نہ تھے

بن گئے تھے ہمیں شوق میں چارہ گر میہماں درد کے بن بلائے نہ تھے

اتنے آئینے تھے تو کسی میں نہ تھا اور یہ آئینے میں نے بنائے نہ تھے

اے رضا! غم ہی قندیل بنتا گیا
زندگی نے دیئے تو جلائے نہ تھے
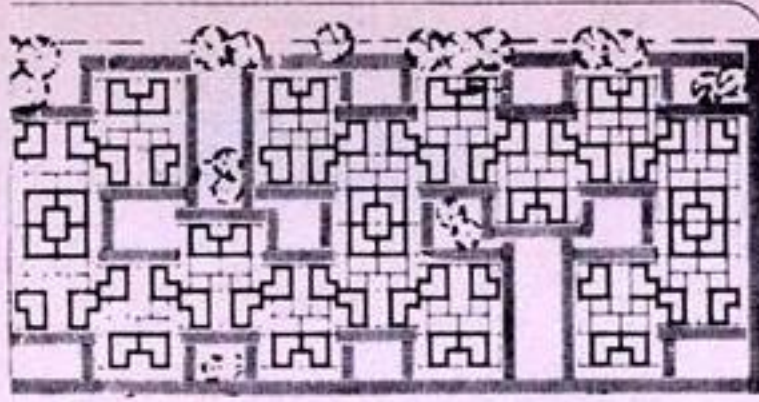
بہار آئی گلوں کو ہنسی نہیں آئی
کہیں سے بو تری گفتار کی نہیں آئی

یہ کچھ اور وجہ ہے؟ کم ہو گئی ہے لذّتِ جام
ہماری پیاس میں کوئی کمی نہیں آئی

یہ کائنات سب آغوشِ نیم شب میں ہے
زمانہ ہو گیا آواز ہی نہیں آئی

چلے تھے لے کے لبِ خشک، لوٹ بھی آئے
پہ راہ کے راہ میں کوئی ندی نہیں آئی

دل اک درخت، زمیں بوس یاد و باراں سے
رتیں گزر گئیں کونپل نئی نہیں آئی

نہ جانے کیسی گھڑی سے گزر رہے تھے ہم
کہ جاگتے نہ رہے، نیند بھی نہیں آئی
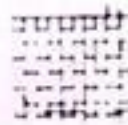
جھما جھم تیری آہٹ آئی جیسے
ہوا دامن میں جل بھر لائی جیسے

ہزاروں بدلیاں کھڑکی کے باہر
ہوں گھر میں قید، میں ہرجائی جیسے

ستارہ صبح کا روشن ہوا یوں
بشر کی ابتدا لوٹ آئی جیسے

زرا دیکھو کہ اب جو میں نہیں ہوں
جمی ہے وادیوں پر کائی جیسے

وہ مدہوشی، وہ آنچل کا سرکنا
زمانہ لے رہا انگڑائی جیسے

نہانے کو کوئی ندی میں اترا
بجھی گرمی، چلی پروائی جیسے

چھپا کر منہ، صبا بھاگی چمن سے
گلوں کو چوم کر پچھتائی جیسے

تمہارا روپ جیسے اونچی دیوار
رضا کا پیار، گہری کھائی جیسے
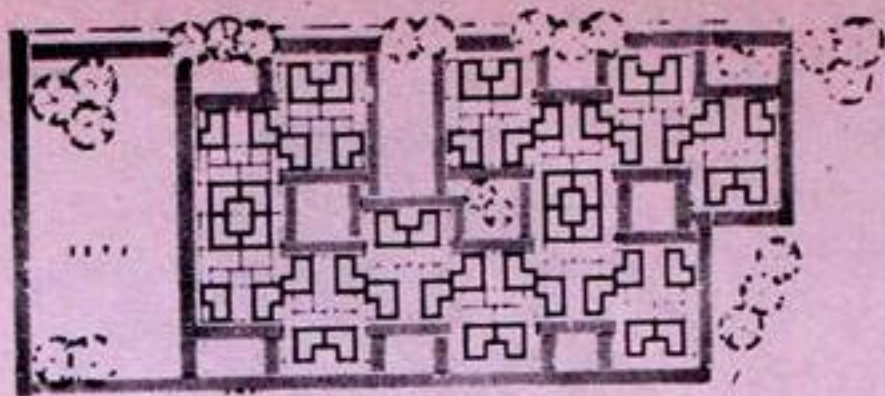
ذہنِ مثبت نے کچھ آرام نہ پایا ہو گا
در کھلا تھا کوئی مہماں تو آیا ہو گا

کوئی چھپر، کوئی کھڑکی، کوئی دیوار نہیں
یہ نگر بادِ مخالف نے بسایا ہو گا

چلتے میں تم نے لیا ہو گا گلوں کا بوسہ
بوئے پابستہ کو یوں آگے بڑھایا ہو گا

اب بھٹکتا ہے غم و درد کے سناٹوں میں
آنسوؤں میں یہ زمانہ نہ سمایا ہو گا

ہر قدم کہتا ہے دل، دشتِ جفا کے اس پار
گلستاں ہو کہ نہ ہو، پیڑ کا سایا ہو گا

آج سب راہ پہ ہیں حسنِ نظر کے راہی
غالباً پیار کے موسم نے بلایا ہو گا

لاکھ جی چاہے گا، دستک پہ یقیں مت کرنا
گھر وہی آئے گا جو خواب میں آیا ہو گا

کسی موسم میں نہ تھا باغ پنپنے والا
بیتے لمحوں ہی نے یہ رنگ جمایا ہو گا

معنویت کا اثر ہے کہ گھٹا جھومے ہے
ایک بارش سی ورق پر ہے، قلم گھومے ہے

ہائے وہ لمس کا احساس، وہ قربت تیری
کوئی پنہاں سا اشارہ ہے جو لب چومے ہے

زہر کا جام، سحر سامنے، حکمِ منصف
درِ زنداں پہ ہے دستک سی، قضا گھومے ہے

مست آنکھوں سے پرے بھی ہے کوئی بزمِ سرور
پسِ میخانہ بھی میخانہ ہے دل جھومے ہے

ٹوٹ جائے ہے فصیلِ شبِ زنداں، یعنی
زندگی عظمتِ مظلوم کا در چومے ہے

کوئی شریان کٹے، کوئی کلیجہ پھٹ جائے
یہ لہو کب سے مرادر دلیے گھومے ہے

دوستو لے لو مرے ہاتھ سے دکھوں کی کتاب
نیند آنکھوں میں ہے، جی ڈولے ہے سر جھومے ہے
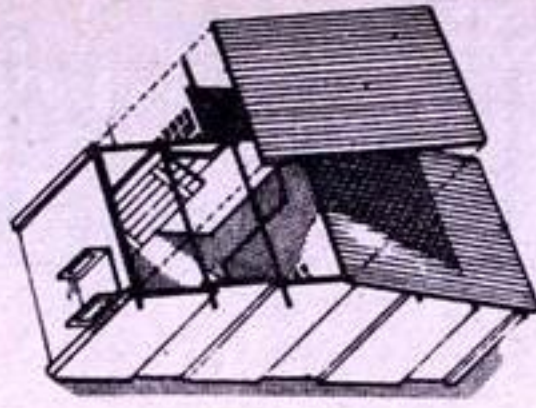
بات اگر نہ کرنی تھی، کیوں چمن میں آئے تھے
رنگ کیوں بکھیرا تھا، پھول کیوں کھلائے تھے

بیکراں خلاؤں کی حد بھی باندھ دینی تھی
جب زمیں بنائی تھی آسماں بنائے تھے

بے ادب نہ تھے ہم کچھ، اپنی بھول اتنی تھی
آپ تک پہنچ کر بھی آپ میں نہ آئے تھے

ہم دھوئیں سے گھبرا کر گھر سے کیا نکل جاتے
کھڑکیوں کے باہر بھی بدلیوں کے سائے تھے

اور دو قدم بڑھتے، ہم کو بھی مٹا دیتے
جب ہمارے آنگن تک نقشِ پا مٹائے تھے

آنسوؤں کی چادر نے ڈھک دیا ہمیں ورنہ
مانگ بھی سجائی تھی، خواب بھی سجائے تھے

آج تیرے چرنوں کا روپ ہی نرالا ہے
آج پھول پوجا کے دھول سے اٹھائے تھے

اے رضا حقیقت تو اب کھلے بڑی ورنہ
بوئی تھیں گھٹائیں بھی، چاند بھی اگائے تھے

سود کیا، کیا زیاں، جو ہوا سو ہوا
غصبِ دل، غصبِ جاں، جو ہوا، سو ہوا

گوشۂ دل کی یہ کچھ ظلمتیں تو مٹیں
سارا عالم دھواں جو ہوا، سو ہوا

شعلے بھی اٹھ چکے، خون بھی جل چکا
اب یہ نذرِ بتاں، جو ہوا، سو ہوا

دل کا افسانہ کب جا سکا آپ تک
منہ سے قصہ بیاں جو ہوا، سو ہوا

دوست کے چاؤ میں منزلیں بجھ گئیں
فرشِ راہ کارواں جو ہوا، سو ہوا

اے رضا اس سے خود ہم امر ہو گئے
حرفِ دل جاوداں جو ہوا، سو ہوا

آسماں سا مجھے گھر دے دینا
خاک ہو جاؤں تو پَر دے دینا

سامنا آج انا سے ہوگا
بات رکھنی ہے تو سر دے دینا

جانے کب سے ہے دھندلکوں کا شکار
نقطے کو شمس و قمر دے دینا

طالبِ وقت نہیں ہوں، لیکن
موت تک چار پہر دے دینا

جو پتا پوچھیں مرا، تم ان کو
مٹّی بھر گردِ سفر دے دینا

کل کا دن بے خبری کا ہوگا
سارے پرچوں میں خبر دے دینا

اپنی دولت سے مجھے کیا دوگے
آس کے شام و سحر دے دینا

دے دیا ہے جو قلم ہاتھوں میں
اب سخن میں بھی اثر دے دینا

پھر رضا جلوہ نما ہوتا ہے
من کے اندھوں کو نظر دے دینا

پاش پاش لاشے سے ، خون خون آرے تک
درد ہی کا قصہ ہے ، غم سے غم کے مارے تک

ہم نے تجھ کو چاہا ہے ، ہم نے تجھ کو ڈھونڈا ہے
اس کشادہ دھرتی کے ، دوسرے کنارے تک

یہ جریدۂ ہستی ، ہر زمانہ نکلے گا
ہر فسانہ پھیلے گا ، آخری شمارے تک

کانٹوں کی اذیت کو کوئی مفت کیوں جھیلے
انگلیوں کو چھلنا ہے پھولوں کے نظارے تک

اے خیال کے سورج تو ہی اب سنبھل ورنہ
پی چلے اندھیرے تو ، روشنی کے دھارے تک

فہم و فکر کی دھرتی ، آسماں نہیں بنتی
میں نے بو کے دیکھے ہیں اس میں چاند تارے تک

کوئی ہم کو توڑے کیا ہم ہیں ایک پُل جیسے
روپ کی کشاکش سے پیار کے سہارے تک

اس اکیلی مسجد کا میں ہی اک محافظ ہوں
اور میں محافظ ہوں ، آپ کے اشارے تک

جینے کا نشان دے رہا ہوں
رہ رہ کے اذان دے رہا ہوں

اشکوں کا یہ مول تول کیسا
لے، ساری دکان دے رہا ہوں

صد شکر کہ جانتا نہیں میں
جس بات کا گیان دے رہا ہوں

پھر عید ہوئی صحافیوں کی
مجمع میں بیان دے رہا ہوں

بوتا ہوں نئی نویلی فصلیں
پرکھوں کو لگان دے رہا ہوں

آئین کے کچھ تو ہوں گے معنی
ہر حرف پہ دھیان دے رہا ہوں

دل ہے کہ ٹھہر نہیں رہا ہے
رہنے کو مکان دے رہا ہوں

اب سچ نہ کہوں تو ڈر نہیں کچھ
پینچوں کو زبان دے رہا ہوں

آنسو ہیں، رضا قبول کرلو
رشوت نہیں دان دے رہا ہوں

اندھیرا

بپا ہے شورِ محشر
بہت بم پھٹ رہے ہیں
مگر اس روشنی سے
اُجالے گھٹ رہے ہیں
یہاں کیا اور وہاں کیا
اِدھر سے اُس طرف سے
مسلسل، بے محابا
اندھیرا بڑھ رہا ہے

دیئے جتنے ہیں روشن
وہ کم پڑنے لگے ہیں
جلاؤ اور شمعیں
لوؤں کو تیز کر کے
لہو کو تیل کر کے
اصولوں کی شعاعیں
اندھیرے کے جگر میں
نذرِ پیوست کردو

کئی چیخیں اٹھیں گی
کئی نالے سنو گے
مگر بہرے رہو تم
کوئی پروا نہ کچھ غم
وہی لَو زندگی کی
(جو لگتا ہے دمادم
جھکولے کھا رہی ہے
کوئی دم میں بجھے گی)
جواں ہو جائے گی ـــ پھر
تمھیں خود کہہ اٹھو گے
کہ ہر سُو روشنی ہے
اندھیرا چھٹ گیا ہے۔

تلاشِ حق

لاکھ ہے تو پابرہنہ
میں نے بھی تو
جستجو کی کھردری راہوں میں گذر
مخملی دریاں بچھادی ہیں
کہ
چلتے وقت تیرے پائے نازک
ٹھوکروں سے زخم خوردہ ہو نہ جائیں

لاکھ تو عریاں رہے
مختصر ملبوس تیرا
گو ہے پیڑوں کی کٹیلی چھال سے کترا ہوا
تو بھی کیا
میں نے بے پوچھے ترے
اس کے اندر
اطلس وکمخواب کے چپکا دیے ہیں نرم استر
تاکہ تو
جس حال میں بھی ہے
رواں ہی رہے
خارزاروں کو کھنگالے

سب چبھن کانٹوں کی ہنس ہنس کر سہے

اور سدا ——————

حق قبولے ——————

حق سنے ——————

حق ہی کہے ——————

لَوحِ قَبر

مَنوں خاک و خَس میں دبا ہوا
میں اگرچہ ایک سپوت ہوں
مگر آ کے نصب جو تو ہوئی
تو مری ڈگر ہی بدل گئی
کوئی آرزو نہ کوئی ہَوس
مجھے یہ بھی ہوش نہیں ہے اب
تنِ مردہ ہوں کہ سکوت ہوں

مری دست بستہ یہ عرض ہے
مرا کام، نام نہ مانیئے
یہی اک وجود مرا ہے اب
مجھے لَوحِ قبر سے جانیئے

رقص

اک قدم
عالمِ بدمستی میں
اور پھر کتنے قدم
دو قدم، تین قدم، چار قدم
تیز، پھر اور بھی تیز، اور بھی تیز
اور عالم وہی بدمستی کا
وہی پیروں کی دھمک
وہی ہاتھوں کی تھپک
وہی گھنگرو کی کھنک
ایک چکّر سا رواں
جیسے زمانہ چھٹ کر
اپنے محور سے
کسی اور طرف جانے لگے
وقت، ذہن، آگ، زمیں
دھوپ، ہوا، سایہ، خلا
کوئی ٹھکانے پہ نہیں
گم وہی ہوش و خرد
لے ہی ذرا اور بڑھی
بے محابا، وہی ڈھب رقص کی بدمستی کا

اب ہوئی ناچنے والے کے لبوں پر جنبش
ایک ہلکی سی صدا
لفظ سے کچھ بننے لگے، بننے لگے، بن ہی گئے
یک بیک ایک گرج
"میں خدا — ہاں میں خدا
اور خدا کوئی نہیں"

دیکھنے والے سبھی۔ جیسے یقین آیا نہ ہو۔
ہکّے بکّے سے ادھر تکنے لگے
اور کچھ سوچ کے پھر بول اٹھے
"اے بشر! اے ازلی مستِ رعونت، رقّاص!
تو خدا ہے تو خدا ہم بھی ہیں"

بس اسی روز سے تفہیمِ بشر ختم ہوئی
اب یہاں اور نہیں کوئی خداؤں کے سوا۔

بڑھے چلو

بڑھے چلو، بڑھے چلو

یہ ہلچلیں نشان ہیں
حصول کے کمال کا
تلاش ہی مقام ہے
فشارِ دل ہی ہے خدا

وہ پھر شہانہ چال سے
چمنستانِ خشک میں
پنپتا پھول بن گیا
امر اصول بن گیا
بڑھے چلو، بڑھے چلو

جو چل پڑا، وہ ست جگی
جو رک گیا، سو کل جگی
وہ شب گئی، سحر اُگی
بڑھے چلو، بڑھے چلو

سفر خود آگہی تو ہے
فنا بقا یہی تو ہے
یہ آفتاب کا سفر
یہی جہاں کا راہبر
نہ وہ رُکا، نہ تم رکو
گھٹاؤں میں، ہواؤں میں
خزاؤں میں، بلاؤں میں
نہ وہ جھکا، نہ تم جھکو

گناہ سے، قصور سے
بشر جو بھول بن گیا
غبارِ راہ بن گیا
نظر کی دھول بن گیا
وہ اک دفعہ جو چل پڑے
تو جان لو سب اس کے غم
فضول کانٹوں کی طرح
چنے گئے، تلف ہوئے

بڑھے چلو، بڑھے چلو
بڑھے چلو، بڑھے چلو

بے کتابی کا ایک لمحہ

ابھی سب کچھ تھا، ابھی کچھ بھی نہیں
ادھ کھلی آنکھوں کی بے رحم جھپک
آدھے لمحے کا بھی وقفہ نہ ملا
لے اڑا کون اِسے، کس کو وہ دھن پیارا تھا

ایسا بیدار، سمجھدار، کہاں اب کوئی
میرے مخطوطوں، کتابوں کی جو چوری کرلے
بیش تر آج تو احمق ہی جیا کرتے ہیں
میرا بوسیدہ ذخیرہ، وہ مرا مال ومتاع
پُرزہ پُرزہ سے ورق
کچھ ادھورے، کئی بے ربط
کئی رنگین، منقش، خوشخط
لکھنے والے کا کہیں نام نہیں، سنہ غائب
قلمی چیز مگر کس کا قلم؟ کس کا دماغ؟
یا پھر ایسے کہ ہے ترقیمہ نہایت کامل
نام، تاریخ، پتا، درج جلی حرفوں میں
یعنی مخطوطہ بھی اور صاحبِ مخطوطہ بھی
اور وہ طبع شدہ دو سو برس کے دوران
اک خزانہ۔ جو مرا ہی حق تھا
جس پہ چغتائی کے دیوانِ مصور قرباں
جس کی نم دیدگی اوراقِ جدیدہ پہ نثار
جس کی دہلیز پہ ذہن آج تلک سر بہ سجود

حاجت اب جس کو مصنف کو نہیں
بلکہ ہے قاریِ خود گم کی تلاش
جو اِسے پڑھ سکے، جتلا سکے اس کی قیمت
لے اڑا کون اُسے، کس کو وہ دھن پیارا تھا
ایسا بیدار، سمجھدار کہاں اب کوئی
بیش تر آج تو جاہل ہی اُگا کرتے ہیں
کون ہوگا وہ خزانے کو چرانے والا
ہو نہ ہو۔ ہوگا کوئی بک سیلر
درس و تدریس کے شعبے سے کوئی کیا ہوگا
ان کو فرصت ہی کہاں انجمنوں، جلسوں سے
سیمناروں سے، اداروں سے ملاقاتوں سے
درس و تدریس تو اک نام ہے۔ اور نام میں کیا؟
اور کچھ کہہ لو اسے، جیسے کہ شہرت طلبی
یا کہو شعبے کو بازار، جہاں تھیسس کی
ادھ پکی، لوٹی ہوئی جنسِ گراں بکتی ہے

نہیں ہرگز نہیں، تعلیم کے شعبے والے
کیوں چُرانے لگے بوسیدہ، پرانے اوراق؟
کون پڑھ پائے گا اِن کو، کسے فرصت ہے یہاں؟
اور ہونگے کوئی
پر کوئی بھی ہوں۔ لوٹنے والے تو ہیں۔
اے لوگو!
نام کے عالمو، اجلاس زدو! زرطلبو!
دست بستہ مری درخواست ہے یہ
میرا سب لے لو، مجھے میری کتابیں دے دو۔
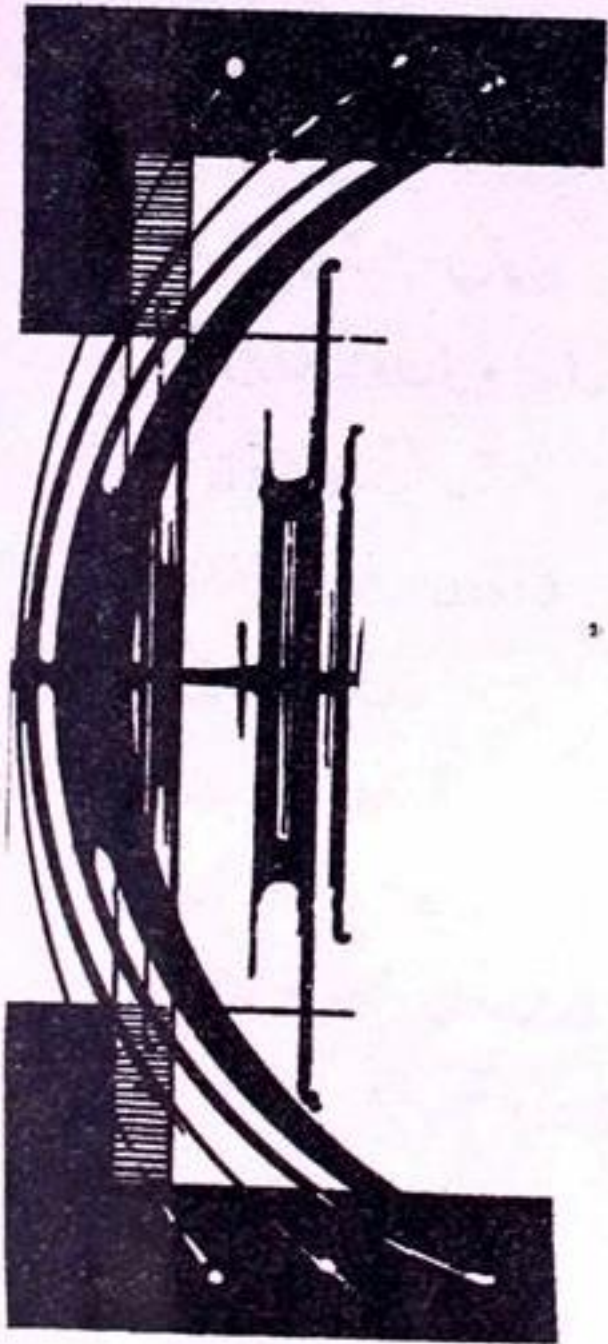
رومانس

ارے رے کیا دیکھتے ہو، جاؤ۔
چلو ہٹو، اپنی راہ ناپو
بچاری چندا کے ہاتھ پر جانے کیسی
انگارا چوٹ آئی
لہو نکلنے لگا تھا دھل دھل۔ دہل گیا دِل
کماری چندا، بچاری چندا
گزرتے دیکھا جو مجھ کو اُس نے
تو ایک دل دوز چیخ ماری
کوئی بھی انسانیت کے ناتے
اس ابتری میں تڑپ ہی جاتا
میں لپکا اور بے سہارا دوشیزہ کو عجب بے دلی سے تھاما۔
—— میں وہ نہیں جو کسی کی گدرائی بانہوں پر
دِل نثار کرتا
ہوس زدوں کی طرح تنِ مرمریں کی پھسلن سے
پیار کرتا

مرا تو جیسے فقیر من ہے
—— کبھی نہ ڈولے کبھی نہ پھسلے
"یقیں کرو میری بات پر تم
چلو، ہٹو، اپنی راہ ناپو ——"
—— عجیب یہ طرزِ گفتگو ہے؟
"نہیں ہے مجھ ایسے پارسا پر بھی
لمحہ بھر اعتبار تم کو؟"
—— یہ کیا غضب کر رہے ہو؟

"یعنی سب اپنی آنکھوں سے تم نے دیکھا ہے؟
اور کہ تم گھنٹے بھر سے، چھپ چھپ،
ہمارا رومانس تاکتے تھے؟
(نکال کر سو کا نوٹ)
"یہ لو۔ بس اب زباں بند، ذکر خارج ______
کسی سے کہتے نہیں یہ باتیں
جبھی زباں، آنکھ نے نہ پائی کہ
دیکھ پائے تو کچھ نہ بولے
سمجھ گئے؟"
کیا کہا کہ تم سارا ماجرا میرے گھر کہو گے؟
"کہو، کہو۔ جاؤ۔ دفع ہو جاؤ۔ کہہ دو جو بھی ہے جھوٹا سچا
مجھے کسی سے خطر نہیں ہے۔"
یہ ہوتا آیا ہے۔ رشیوں، منیوں نے بھی اسے
اپنے گپت خانوں میں جاری رکھا ہے۔
بیاہ، شادی، طلاق یہ سب
سماج کی چیرہ دستیوں کی کھلی اجازت
نہیں تو کیا ہے؟
خطا ہوئی ہے اگر، تو اتنی کہ رابطے کی گھڑی سے پہلے
نہ وید منترا لاپے ہم نے
نہ اگنی کو ساکشی بنایا ______
مگر ہمارا دھرم ہی کوئی نہیں تو ہم یہ
وِواہ کا ڈھونگ کیا رچاتے؟
"سمجھ گئے نا!
یہ نوٹ لو، اپنی راہ ناپو
چلو ہٹو مسخرے کہیں کے....."

شب نشین

اے رضا!
اے شب نشینِ محفلِ شعر و سخن!
لمحہ بھر بھی بھول سکتا ہے تو کیا
اس ادب خانے کے آداب و رموز؟
تو یہ تو بہ ـــ بزمِ رنگ و نور میں
یہ یقیں تجھ کو کہ تو چھا جائے گا؟
سب کا دل بہلائے گا؟
فکر و فن کی مشعلوں سے
روشنی پھیلائے گا؟
ـــ وار یہ تجھ پر ہے پہلا، شہرتِ موہوم کا
چھوڑ یہ نازِ صدارت،
مسندِ فخر و مُباہ
زینتِ قالین و تکیہ۔ لطفِ اوراق و قلم
اِدّعائے لفظ و معنی
فکرِ ترسیل و تراش
شوکتِ تعمیرِ مضموں
ذوقِ تخلیقِ سخن
ـــ یہ ادائیں ہیں ستم گر، ان اداؤں پر نہ جا
غمزہ ہائے شاعرانہ تیری فطرت میں نہیں
افتخارِ علم و دانش سے بری تیرا مزاج
شوقِ گل پوشی سے بے گانہ ترا سادہ خمیر
خامشی، خلوت نشینی تیری طینت کا اصول
ـــ تو ہے ناموزوں! یہ تیری شب نشینی بھی فضول
"کاٹ اپنی رات اب
خار و خس و گلخن جلا"
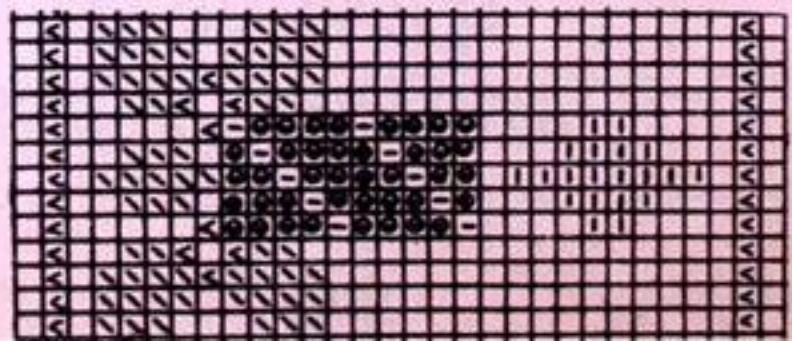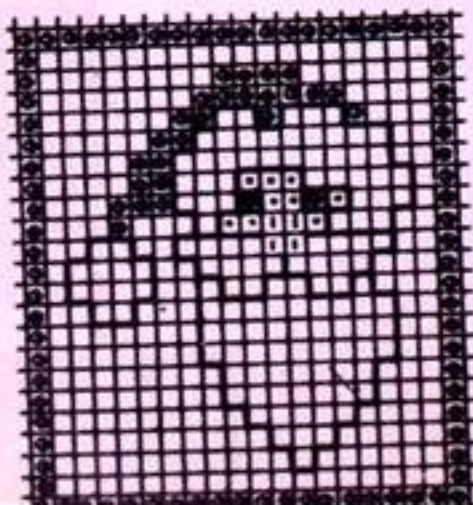
پانچ فیصد

اپنے خول و خرد کی کرنوں کو
نیلے امبر سے دور ہی رکھو
تم کوئی مہر و ماہتاب نہیں
فقط انساں ہو ڈھلتی دنیا کے
زندگی تو اُبلتا چشمہ ہے
اور تم اس کا کیا ہو ؟ بیش از بیش
پانچ فی صد ؛
ذرا خیال کرو ــــــ
قطرۂ خوں کا بیسواں حصّہ ؛
ایک درجہ بھی حرارت کا ؟
جاؤ مرکز کو اپنے کوچ کرو۔

آخری لمحے

جب ان آنکھوں کے دیپ ماند ہوئے
جھانکنے تاکنے کے سب رستے
دید کے سارے نامہ و پیغام
ایک اک کرکے ساتھ چھوڑ گئے
سارا سنسار بن گیا نقطہ
کالا اور دم بدم سمٹتا ہوا
روح جیسے کلانچیں بھرنے لگی
جسم کی بزمِ رقص و موسیقی
سونے لمحوں کو جذب کرنے لگی
آخری سانس گھُل چلی جیسے
ایک شکتی ہیں جس کی شکل نہ نام
اور پھر ــــ میں نے اک معزز کام
یہ کیا۔ اپنے کام یاد کئے
لمحہ بھر کو گنوں پہ ناز کیا
اَوگنوں کی معافیاں چاہیں
اور پھر ــــ شانتی اوم شانتی اوم

سردار جعفری

BOOKS
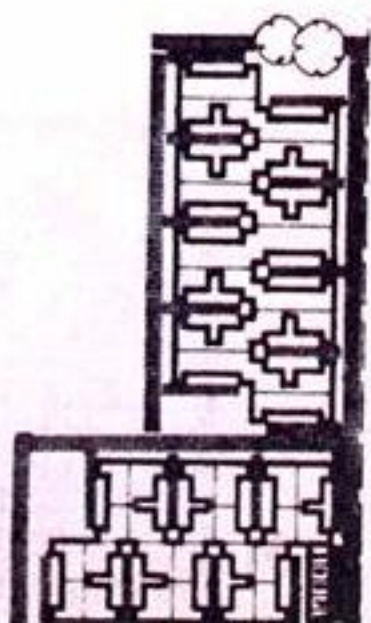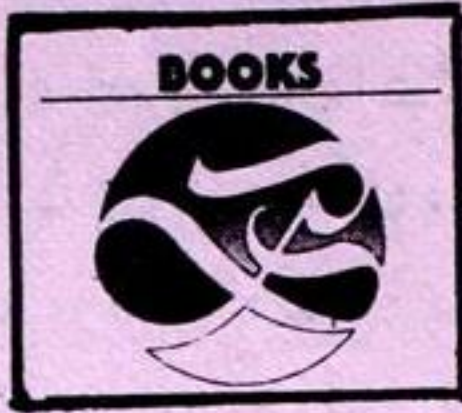
کتابوں کا خزانہ

[یہ گپتا رضا صاحب کے فلیٹ واقع نے پی این سی روڈ، جل درشن
میں مورخہ ۸ اپریل ۱۹۸۱ء کو سردار جعفری صاحب کی ان پر بنائی
گئی ڈاکومنٹری کی ریکارڈڈ رپورٹ " Recorded Report "
ہے جو ۱۵ اپریل ۱۹۸۱ء کو رات کے ۷:۴۲ سے ۸:۱۲ تک آدھ
گھنٹے کے لئے ٹی، وی پر دکھائی گئی تھی۔ عنوان تھا "کتابوں کا خزانہ"]

پہلے آٹھ منٹ گپتا رضا کی عظیم لائبریری کی فلم اور گپتا رضا کے مطالعے کے شاٹس Shots پھر فیملی ممبرز ۱۔ مسز ساوتری گپتا ۲۔ صاحبزادہ دِل گپتا اور ۳۔ صاحبزادی ریتا گپتا کو دکھایا گیا۔ اس کے بعد جناب سردار جعفری نے انٹرویو شروع کیا۔ آخر میں ڈاکومنٹری فلم مسز ساوتری کالی داس گپتا رضا کے انٹرویو پر ختم ہوئی۔

تعارف از سردار جعفری :۔

آج رات، محفلِ یاراں، میں شمعِ محفل، کالی داس گپتا رضا" ہیں۔
آپ ان سے پہلے بھی مل چکے ہیں۔ ان کا نام ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ یہ اپنے پیشے کے اعتبار سے بیوپاری ہیں، لیکن اگر دوسری طرح دیکھا جائے تو یہ کتابیں جمع کرنے والے، شعر کہنے والے، تحقیق کرنے والے مشہور شاعر اور ادیب ہیں تو ہم انھیں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ زندہ رہنے کے لئے بیوپار کرتے ہیں اور زندگی کو حسین بنانے کے لئے ادب کی خدمت کرتے ہیں۔ آپ ابھی کالی داس گپتا رضا سے مل چکے ہیں

ان کو آپ نے دیکھا ہے۔ ان کی بیگم شریمتی گپتا سے آپ ملے ہیں۔ ان کے بیٹے اور صاجزادی سے ملے ہیں اور اب ہم گپتاجی سے ملیں گے۔ پہلے تو یہ نام میرے لئے بہت دلچسپ ہے۔ کالی داس ہمارے بہت پرانے شاعر کا نام ہے۔ بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے وہ۔ اور گپتا شاید ذات بھی ہے اور ذات سے متعلق پیشہ بھی ہے۔ یہ نام ہماری تاریخ میں بڑے زرّیں دور کا نام بھی ہے جسے ہم تاریخ میں گپتا عہد کہتے ہیں۔ اس میں علوم و فنون کی بڑی ترقی ہوئی تھی۔ صرف ان کا تخلص رضاؔ ایک اسلامی نام ہے اور ایک بہت بڑے امام کا نام ہے۔ جن کا روضہ ایران میں مشہد میں ہے تو اس نام سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ اس گنگا جمنی ملی جلی تہذیب کی نشانی ہیں، جس پر ہندوستان کو فخر ہے کہ اس نے ہندو اور مسلم تہذیبوں کے دھاروں کو باہم ملا دیا ہے۔ اسی ملی جلی تہذیب کا ایک سنگم ہمارے گپتا جی ہیں۔ تو آج گپتا جی سے تھوڑی سی بات کریں گے، ان کے اس کتب خانے کے بارے میں کہ جس کی تصویریں بھی اس آج کے پروگرام کا حصہ ہیں۔

سردار جعفری: "تو گپتا جی۔ یہ بتایئے کہ آپ پیشے کے اعتبار سے تو بیوپاری ہیں [یہ میں کوئی بری بات نہیں کہہ رہا ہوں —— رضاؔ صاحب کا قہقہہ] لیکن بیوپاریوں کو شوق ہوتا ہے، 'پیسے جمع کرنے کا' دولت جمع کرنے کا، آپ نے کتابیں جمع کرنے کا شوق کس طرح پیدا کیا۔ اس لئے کہ یہ دھندا جو ہے، کمائی کا دھندا بھی نہیں ہے، خرچ ہی خرچ ہوتا ہے۔ (رضاؔ صاحب: یعنی گھاٹے کا سودا ہے) اور ایک طریقے سے بہت ہی مہنگا شوق ہے۔ بہت ہی کاسٹلی ہابی (Costly Hobby) ہے، ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ تو بتایئے یہ شوق آپ کو کیوں کر پیدا ہوا۔"

رضاؔ: "مجھے ذرا آپ تفصیل میں جانے کی اجازت دیں گے؟"

سردار: "جی ہاں..... جی ہاں....."

رضاؔ: میرے والدِ محترم ایف۔ سی کالج لاہور کے پڑھے ہوئے تھے، گریجویٹ تھے۔ انھوں نے بڑی لمبی عمر پائی۔ وہ اردو فارسی کے بھی بڑے عالم تھے ہو سکتا ہے کہ شعر بھی کہتے ہوں، لیکن شعر بہت سنایا کرتے تھے۔ ان کے پاس

کتابیں بھی بہت عمدہ تھیں۔ میں بچپن ہی سے اُردو میں بہت ہوشیار تھا۔
پہلی ہی جماعت میں جب ہمارے یہاں اردو اِملا اور عبارت نگاری کے مقابلے
ہوا کرتے تھے، دوسرے اسکولوں کے ساتھ، میں ان میں اوّل ہی آیا کرتا تھا
تو اکثر میں والد صاحب کی ان کتابوں کو پڑھا کرتا تھا۔ پہلے زمانے میں ناول
اور افسانے خوب پڑھے۔ جب کبھی میرے والد مجھے ان علمی ادبی کتابوں کو
پڑھتے ہوئے دیکھتے تو بہت خوش ہوتے۔ یونہی زمانہ گذرتا گیا۔ ہمارے
یہاں تعزیہ داری ہر سال ہوتی تھی.....“

سردار: ”محرم میں؟“

رضا: ”جی ہاں محرم میں۔ اس میں میرے والدِ محترم، چوں کہ ہمارے خاندان میں یہ
روایت چلی آتی تھی، سبیلیں لگایا کرتے تھے۔ ہمارا خاندان آریہ سماجی ہے وہ
بہت شوق سے سبیلیں لگاتے اور ہم سب یوں کہیئے کہ تشنگانِ رہِ کربلا
کی پیاس بجھاتے اور میں تعزیہ والوں کو سوز پڑھتے دیکھتا، نوحے وغیرہ۔
ہمارے یہاں مکان کے آگے ایک چھوٹا سا میدان سا ہے۔ وہاں تعزیہ دار
سوز پڑھتے تو بڑا لطف آتا اور تنہائی میں انھیں گنگناتا۔ شاید وہیں سے
مجھے رضاؔ کا نام ملا، اور وہیں میں نے شعر کہنے شروع کر دیئے۔ پھر جب میں افریقہ
چلا گیا......“

سردار: ”تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ کو پہلے کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہوا
اور جب یہ علمی شوق پیدا ہوا تو جی چاہا کہ یہ کتابیں آپ کے پاس رہیں۔ پرانے
بادشاہ حرم رکھتے تھے اور آپ کتابیں رکھنے لگے۔ جی، فرمایئے۔“

رضاؔ: ”جب میں افریقہ چلا گیا اور وہاں بیس سال رہا تو وہاں انگریزی کتابیں میں
نے بہت جمع کیں۔ خوب پڑھتا انھیں۔ انگریزی میں لکھتا بھی تھا۔ ایک انگریزی
کی کتاب (Poetry) کی بھی ہے، جس کا نام "The Silent flame"
ہے، لیکن اردو اتنی زیادہ مجھ میں رچ بس گئی تھی کہ میں اس سے دامن نہ
چھڑا سکا۔ نہ یہ کوشش ہی کی۔ مجھے لطف بھی بہت آتا تھا۔ میرے استاد جوشؔ
ملسیانی مرحوم ہندوستان پاکستان کے مانے ہوئے شاعر اور استاد تھے۔

میں بذریعہ خط وکتابت ان سے اکتسابِ فن کرتا رہا۔ جب جنوری ۱۹۷۰ء میں بچے یونہی گھومنے کے لئے ہندوستان آئے تو یہیں رہ گئے۔ انھوں نے کہا کہ ملک بہت اچھا ہے۔ انھوں نے پہلے تو کبھی دیکھا نہیں تھا۔ اب جو میں یہاں رہ گیا تو پھر وہی کتابوں کی دُھن۔ آدھ دس ہزار کتابیں جو وہاں افریقہ میں تھیں، وہیں رہ گئیں۔ یہاں نہ آسکیں۔ انگریزی کی تھیں۔ تو یہاں آکر میں نے سوچا کہ پھر وہی پرانا شوق پورا کریں۔ چنانچہ میں نے کتابیں اکٹھی کرنی شروع کیں۔ پڑھنے کے لئے۔ پھر تحقیق کے لئے "Reference Books" کا ہونا بہت ضروری ہے۔

سردار: "یہ ذخیرہ تو آپ نے بڑی محنت سے برسوں میں جمع کیا ہے۔ ۱۵۔۲۰ سال میں۔"

رضا: "نہیں۔ ۱۵۔۲۰ سال میں نہیں ۵۔۶ سال میں۔"

سردار: "جو ہندوستان میں جمع کیا ہے۔ اس میں کتنی کتابیں ہوں گی۔"

رضا: "دس ہزار کتابیں تو ضرور ہوں گی۔"

سردار: "اردو فارسی کی یا عربی بھی ہیں۔؟"

رضا: "بیشتر اردو فارسی کی۔ کچھ عربی بھی ہیں۔"

سردار: "آپ عربی جانتے ہیں؟"

رضا: "بہت کم۔ جو لوگ اردو فارسی جانتے ہیں وہ عربی کے ذخیرۂ الفاظ سے تو واقف ہو ہی جاتے ہیں۔"

سردار: "تو آپ عربی جانتے ہیں۔"

رضا: "جی نہیں۔ میں عربی نہیں جانتا۔ الفاظ اور ان کے معانی سے البتہ واقفیت اچھی ہے۔"

سردار: "اچھا تو آپ کے ذخیرے میں آٹھ دس ہزار کتابیں ہیں۔"

رضا: "انگریزی کی بھی دو ہزار کتابیں ہوں گی۔"

سردار: لیکن یہ آپ کے گھر میں جو رکھی ہوئی ہیں، ان سے تو پتا نہیں چلتا کہ یہ دس ہزار کتابیں ہیں۔"

رضا: "میرے گھر میں ۴۔ ۴½ ہزار کتابیں ہیں۔ یہ ساری Catalogued کتابیں

ہیں۔ انھیں Catalogue کر لیا گیا ہے۔ جو کیٹلاگ نہیں ہوئی ہیں، وہ دوسری جگہ رکھی ہوئی ہیں۔"

سردار: "مخطوطے بھی ہیں؟"

رضا: "جی ہاں۔ انھیں علیٰحدہ رکھا گیا ہے۔ باقی ذخیرۂ کتب کے لئے دو آفسوں میں کمرے مخصوص ہیں۔ چوں کہ ان میں مخطوطے یعنی MANUSCRIPTS وغیرہ بھی ہیں۔"

سردار: "میں نے آپ کے کتب خانے کی کچھ کتابیں تو دیکھی ہیں مگر آپ کے مخطوطے یعنی Manuscript دیکھنے کا موقع مجھے نہیں ملا۔ وہ کبھی دیکھیں گے۔ اب آپ یہ بتائیے آپ کا جو یہ ذخیرہ ہے اس کی تقسیم کس طرح سے ہے۔ کس طرح کے مضمون کی کتابیں ہیں۔ کس طرح کے فنون کی کتابیں ہیں۔ شاعری کی کتابیں ہیں اور دوسری کیا کیا کتابیں ہیں۔ کتابیں رکھنا بھی تو ایک فن ہے۔"

رضا: "جی ہاں فن ہے۔ دیکھئے میں نے ایک پورا کارڈیکس سسٹم بنا رکھا ہے ALPHABETICAL آرڈر بھی ہے اور Numerical آرڈر بھی، دونوں ہیں اس کے لئے دو آدمی مقرر ہیں۔ جو میری دیکھ ریکھ میں یہ کام کرتے رہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ خاص شہرت جو میرے کتب خانے نے حاصل کی ہے وہ غالبیات کے بارے میں ہے۔ غالبؔ پر میرے پاس تقریباً تیرہ سو (۱۳۰۰) کتابیں ہیں۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ غالبؔ کے ہاتھ کے ایک دو خط، غالبؔ کے زمانے کی قلمی کتابیں اور ان پر غالبؔ کے ہاتھ کی تصحیح۔ قاطع برہان کے سلسلے میں بھی بہت سی کتابیں لکھی گئی تھیں، وہ سب، اس طرح تقریباً ۳۶ کتابیں غالبؔ کی زندگی میں چھپیں۔ میرا خیال ہے نوّے فی صد ان میں سے میرے یہاں موجود ہیں اور یہ اتنی تعداد میں کہیں اور نہیں ملتیں۔"

سردار: "غالبؔ کے کتنے دیوان غالبؔ کی زندگی میں چھپے یعنی ایک ہی دیوان۔ (اردو) تھا۔"

رضا : "وہ پانچ دفعہ چھپا بلکہ چھ بار کہنا چاہیے۔ کیوں کہ غالب کی زندگی میں ظہیر شاگرد ذوق نے ایک کتاب نگارستانِ سخن تالیف کی تھی۔ جس میں غالب، مومن ذوق تینوں کا کلام دیا گیا تھا۔ انتخاب تھا۔ اس میں غالب کا تقریباً تمام متداول دیوان آگیا ہے۔ اس لئے اسے چھٹا ایڈیشن کہنا چاہئے۔ یہ پانچوں بلکہ چھٹوں ایڈیشن میرے کتب خانہ میں موجود ہیں۔"

سردار: "اب وہ ایک ہی دیوان کئی بار چھپا۔ اس لئے سب کے سب کو ایک ہی دیوان کہنا چاہئے۔"

رضا : "پہلا ایڈیشن تو بہت ہی Rare ہے۔ حتیٰ کہ رام پور میں صولت لائبریری میں ایک نسخہ ہے، خود کتب خانہ رضائیہ رام پور میں نہیں ہے۔ وہاں انھوں نے نقل کروا کے رکھا ہے اور ایک میرے پاس ہے اور ایک دو کہیں اور بھی ہوں گے۔ شاید یہی تین چار نسخے ملتے ہیں۔"

سردار: "اچھا یہ تو کہئے اور اب یہ برسبیلِ تذکرہ بات نکلی ہے۔ غالب کو یہ بڑا شوق تھا کہ ان کی کتابوں کی طباعت بہت اچھی ہو۔ ان کی زندگی میں کوئی کتاب جیسی خوبصورت وہ چاہتے تھے، کوئی کم ہی نظر آتی ہے۔ لیکن غالب کے انتقال کے بعد ایک سے ایک خوب صورت نسخہ چھپا اور اگر وہ دیکھتے تو ان کی روح خوش ہو جاتی۔ آپ کے خیال میں ایسے کتنے ایڈیشن ہیں جو آپ کو پسند ہیں۔"

رضا : "دیکھئے میرے پاس غالب کے دیوانِ اردو کے غالباً ۱۴۰ ایڈیشن ہیں اور بھی بہت سے چھپے ہوں گے۔ یہ ایڈیشن شاید ۱۹۷۵ء تک کے ہوں گے۔ اس کے بعد میں نے جمع کرنے بند کر دیئے تھے۔ اس میں تین ایڈیشن میں سمجھتا ہوں کہ خاص طور پر بہت اچھے ہیں۔ ایک تو عرشی صاحب والا تحقیقی لحاظ سے اور دوسرا عبدالرحمن چغتائی والا مُرقعِ چغتائی، اس کا تو جواب نہیں۔ ...... وغیرہ نہایت عمدہ ہیں۔ اور تیسرا آپ والا ایڈیشن۔ یہ بھی نفاست کے لحاظ سے بہت عمدہ ہے۔"

سردار: "اور میرے والے میں اُردو اور ہندی دونوں ہیں۔"

رضا: "جی ہاں اچھی چیز ہے وہ۔ اور اگر آپ کو معلوم نہ ہو تو بتادوں کہ اب وہ Rare ہے۔"

سردار: "مجھے معلوم ہے کہ وہ Rare ہوگیا ہے اور دوکانداروں نے اُسے دبا کے رکھ لیا ہے۔ وہ چوں کہ Subsidized تھا، نفع کمانا تو مقصد ہی نہ تھا تو بہت ستا ہم بیچ رہے تھے۔ یعنی جو لاگت تھی، اس سے بھی کم۔ اب کچھ کتب فروش اس کے منہ مانگے دام مانگتے ہیں۔ جو کتاب تیس روپے کی تھی اب اس کے آٹھ سو نو سو مانگتے ہیں۔ کوئی شوقین شاید باہر کا آکر خرید بھی لیتا ہوگا۔ وہ انھوں نے Rare بکس میں رکھ چھوڑا ہے۔ ہم جس نظام میں رہ رہے ہیں، اس نظام میں یہی کام ہو رہا ہے۔"

رضا: "اور بھی کئی ایڈیشن مثلاً مطلع آفتاب برلن والا جسے ڈاکٹر ذاکر حسین نے چھاپا تھا۔ ایک ایڈیشن مالک رام صاحب کا بھی اچھا ہے۔"

سردار: "آپ کے خیال میں یہ مختلف ایڈیشن جو غالب کے ہیں ان سے تحقیق کے سلسلے میں کیا کام لیا جا سکتا ہے؟"

رضا: "جو ایڈیشن عرشی صاحب نے شائع کیا وہ تحقیقی لحاظ سے ایک بڑھیا کام ہے مگر اس میں کچھ اغلاط راہ پا گئیں۔ اس کا دوسرا ایڈیشن اب چھپ رہا ہے عرشی صاحب تو اب مرحوم ہو گئے۔ میرا خیال ہے کہ انھوں نے وہ تمام غلطیاں اس میں درست کر دی ہوں گی۔"

سردار: "ایک آدھ الحاقی غزل بھی اس میں آگئی ہے۔"

رضا: "جی ہاں بھوپال والی۔ وہ بھی انھوں نے نکال دی ہوگی۔ انھوں نے شاید پہلے بھی لکھ تو دیا تھا پھر بھی اگر انھوں نے یہ غزل شامل کر لی تو غلطی کی ویسے بھی ایک دو جگہ اگر گہری نظر ڈالی جائے تو کچھ اور بھی غلطیاں تھیں۔ جن کے بتانے کا یہ مقام نہیں ہے۔" میرا خیال ہے کہ پانچوں ایڈیشنوں کے عکس بلکہ چھٹے ایڈیشن کو بھی ایک ہی VOLUME میں چھاپ دیا جائے اور پھر بتایا جائے کہ صحیح متن یہ تھا۔ جو غالب کی زندگی میں چھپا تھا۔ اس کے بعد جتنے بھی تحقیق کرنے والے ہیں، ان کے لئے راستہ صاف ہو جائے گا میرے غالب پراجیکٹ میں یہ کام شامل ہے۔"

سردار: "اچھا غالب کے دیوان کے نسخے تو اس کثرت سے ہیں اور آپ کے پاس کیا کیا ہے۔ میں یہ اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ پروگرام کے دیکھنے والے اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ آپ کے کتب خانے سے۔"

رضا: تقریباً چار سو پانچ سو رسائل ہوں گے میرے پاس۔ جن میں غالب پر مضامین مختلف وقتوں میں نکلتے رہے ہیں۔ اور یہ تحقیق کے لئے بہت ہی ضروری چیزیں ہیں گو رسالے اس سے پہلے کے بھی ہیں۔ گر باقاعدہ آغاز غالباً ۱۹۰۷ء سے ہوتا ہے۔ جب سے آج تک خاصے رسالے میرے پاس ہیں جن میں غالب کے متعلق مضامین ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان سے مدد لینی چاہیئے۔ اگر میری زندگی نے وفا کی تو میں تو کچھ نہ کچھ کروں گا ہی۔"

سردار: "آپ کا اتنا بڑا کتب خانہ ہے جو آئندہ آپ کے کام آئے گا۔ غالبیات کے علاوہ اور کیا ہے آپ کے پاس۔ مخطوطات اور Manuscripts وغیرہ۔

رضا: "500 Manuscripts ہوں گے۔"

سردار: "بہت بڑا ذخیرہ ہے یہ۔ ان میں اردو کے کتنے ہیں اور فارسی کے کتنے؟"

رضا: "اردو کے تو زیادہ نہیں ہیں۔ کیوں کہ اردو کا جس زمانے میں چلن ہوا تو ساتھ ہی پریس کا بھی چلن ہو گیا۔ اس لئے زیادہ تر فارسی کے ہیں اور عربی کے بھی۔"

سردار: "آپ کے پاس اسلامیات کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔"

رضا: "جی ہاں اسلامیات پر بھی بہت کچھ ہے۔ اس میں بہت سی قدیم کتابیں ایسی بھی ہیں جو اب تقریباً ناپید ہو رہی ہیں۔"

سردار: "اسلامیات کے کس پہلو پر؟"

رضا: جیسے تفسیریں، قرآن وغیرہ۔ جی ہاں تفسیریں بہت ہیں فقہ وغیرہ پر بھی۔ میرے پاس ڈکشنریاں بھی بہت سی ہیں۔ بہت عمدہ لغت میرے پاس موجود ہیں۔ ان میں کچھ قلمی بھی ہیں۔ تذکروں کا میرے یہاں بہت اچھا ذخیرہ ہے۔ تذکرے، تحقیق کے لئے بہت ہی ضروری ہیں۔"

سردار: "جی ہاں... جی ہاں..."

رضا ، قدیم اساتذہ کے دیوان، جو اب کمیاب ہیں، بہت سے ہیں۔ 500 کے قریب ہوں گے۔ اس طرح یہ سب چیزیں فائدہ مند ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ سب فائدہ اٹھائیں۔ اگر کوئی میری تحقیقی کتابیں متعلقاتِ غالبؔ وغیرہ دیکھے تو معلوم ہو گا کہ کیا کچھ نیا، غالبؔ پر پروڈیوس کیا جا سکتا ہے۔ متعلقاتِ غالبؔ کے بارے میں قاضی عبدالودود صاحب نے لکھا ہے کہ متعلقاتِ غالبؔ، غالبیات میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ اور اس سے مجھے بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔ جو پہلے میرے علم میں نہ تھیں؛ یہ معلومات میرے کتب خانے ہی کی دین ہیں۔

سردار: "اس سلسلہ میں میں ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں۔ یہ جو سب کچھ آپ نے اپنے گھر پر جمع کر رکھا ہے۔ اور کچھ آپ کے دفتر میں ہے۔ کتابیں لے جانے کے لئے کسی کو دینا تو خطرناک بات ہے۔ کسی نے کہا تھا کہ کتابیں دینی ہی نہیں چاہئیں اور جو لے جائے اسے واپس نہیں کرنی چاہیئے۔ کیا لوگ چوری بھی کر لے جاتے ہیں؟"

رضا : "ہاں چوری کر لے جاتے ہیں۔"

سردار: "جو آدمی کوئی تحقیقی کام کرنا چاہے اور آپ کے کتب خانے سے فائدہ اٹھانا چاہے وہ کیا کرے۔ آپ نے کوئی جگہ تو نہیں بنائی ہے جہاں کوئی بیٹھ کر تحقیق کر سکے۔"

رضا : "میرے پاس کام کرنے والوں اور ریسرچ اسکالرز کے خطوط تو آتے ہی ہی رہتے ہیں۔ میں نے کسی کو ایسا نہیں ہے کہ جواب نہ دیا ہو۔ جواب ضرور دیتا ہوں۔ مگر یہ ضرور دریافت کر لیتا ہوں کہ آپ کو کس کام کے لئے یہ انفرمیشن چاہیئے اگر وہ مجھے بتا دیں تو پھر ان کو اس کام کے اور بھی متعلقات سے آگاہ کر سکتا ہوں۔"

سردار: "یہ تو رہنمائی ہوئی لیکن آپ کی کتابوں کو پڑھنے کا کیا ذریعہ ہے۔ فرض کیجیے کہ کوئی شخص آپ کا مخطوطہ دیکھنا چاہتا ہے ظاہر ہے کہ وہ آپ کے گھر ہی میں بیٹھ کر پڑھے گا۔"

رضا: "کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ اپنی موجودگی میں یہ موقع دوں گا۔"

سردار: "میں نے اس بات کی طرف اس لئے اشارہ کیا ہے کہ جہاں آپ نے اتنا بڑا کام کیا ہے، وہاں ایک کام اور کر دیجیے کہ تحقیق کے لئے ایک چھوٹا سا کمرہ فراہم کر دیجیے، جس میں لوگ آ سکیں۔"

رضا: "میرے ذہن میں یہ بات ہے تو۔"

سردار: "کیونکہ سب سے بڑا کام تو کتب خانے میں بیٹھ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ اچھا ایک سوال اور کر لیں آپ سے۔ کبھی کوئی کتاب چوری بھی ہوئی ہے۔"

رضا: "جی ہاں — ہوئی ہے۔"

سردار: "کیسی کتابیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کتابیں دوبارہ تو آپ کو حاصل نہیں ہونگی۔"

رضا: "جی ہاں — دوبارہ تا حال نہیں ملیں۔ لیکن مجھے حیرت ہوتی ہے کہ وہ کیسے چوری ہو گئیں۔ یہ خاص دیکھ ریکھ میں رہتی ہیں۔ لیکن زیادہ کتابیں چوری نہیں ہوئیں۔ بہت کم۔ لیکن ہوئیں ضرور ...... اب تو میں نے اصول بنا لیا ہے کہ کوئی بھی ہو وہ کتاب میری Presence ہی میں دیکھے۔ اور کوئی طریقہ ہی نہیں، چوری کی روک تھام کا......"

سردار: "اچھا۔ بہت بہت شکریہ۔ گپتا صاحب۔ لیکن ابھی تک تو ہم نے آپ کی تعریف ہی کی ہے۔ اور آپ نے بھی جو کچھ کہا ہے اس سے تعریفی پہلو ہی نکلتا ہے کیوں کہ آپ نے بہت اچھا اور بہت بڑا کام کیا ہے۔ اب کچھ آپ کی برائیاں بھی کی جائیں۔ تو کیوں نہ ہم آپ کی بیگم صاحبہ کو دعوت دیں اور ان سے پوچھیں کہ رازِ درونِ خانہ کیا ہے۔؟"

رضا: "ہونا تو یہ چاہیے کہ اس ملاقات کے دوران میں بھی یہاں حاضر رہوں۔"

سردار: "یہ آپ کے سامنے ہی ہو گا۔"

سردار: "آئیے مسز گپتا۔ اب اگر گپتا صاحب میں اتنی خوبیاں ہیں تو کچھ برائیاں بھی ضرور ہوں گی۔ اب ہم وہ سُننا چاہتے ہیں جو آپ سے بہتر کوئی نہیں بیان کر سکتا۔ اچھا یہ گپتا صاحب تو سارا وقت یا بیوپار میں گزار دیتے ہیں یا کتابوں میں

گزار دیتے ہیں۔ آپ کے لئے کتنا وقت رہتا ہے۔"

ساوتری: "ہمارے لئے تو وقت اتنا رہتا نہیں ہے۔ ویسے میں اب سمجھ گئی ہوں کہ یہ اتنے Busy رہتے ہیں اور مجھے کم ٹائم دے سکتے ہیں۔"

سردار: "گویا معاف کردیتی ہیں۔"

ساوتری: "سارا دن یہاں ان کے پاس لوگ آتے جاتے رہتے ہیں جیسے پروفیسرس ڈاکٹرس، اسٹوڈنٹس، شاعر، ادیب، انڈیا پاکستان سے آتے رہتے ہیں۔"

سردار: "آپ کو تو خاصی تواضع بہت کرنی پڑتی ہوگی۔"

ساوتری: "ہاں کرنی تو پڑتی ہے۔ ان کو بھی اس میں بہت خوشی ہوتی ہے۔ گھر آئے کو چائے پانی کھانا ناشتہ تو دینا ہی چاہئے۔ اس سے یہ خوش رہتے ہیں۔ میں یہ سب کرتی ہوں۔"

سردار: "تو ٹھیک ہے۔ اس سے ان کی برائی کا تو کوئی پہلو نہیں نکلتا۔"

ساوتری: "بس یہی بات ہوتی ہے کہ کسی وقت بات کہنی ہوتی ہے تو ٹائم دیکھتی رہتی ہوں۔"

سردار: "لیکن کبھی کبھی آپ کے دل میں ان کتابوں کے بارے میں رشک تو ہوتا ہوگا۔"

ساوتری: "بالکل نہیں ہے۔"

سردار: "کبھی یہ رشک پیدا نہیں ہوتا کہ ان کتابوں نے آپ کی جگہ لے لی۔"

ساوتری: "یہ بات کچھ ٹھیک ہے۔ مگر میں دیکھتی ہوں کہ ان کا شوق بہت ہے۔ اور یہ دیکھتے ہوئے میں ان کے رستے میں آنا نہیں چاہتی۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ یہ جتنا نام پا رہے ہیں، اور بھی پائیں۔ اگر میں رکاوٹ بنی رہوں گی تو یہ اچھا نہ ہوگا۔"

سردار: "بہرحال ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ آپ بہت خوش قسمت ہیں۔ گپتا صاحب بھی بہت خوش قسمت ہیں۔ ایک دوسرے کو ایسا ساتھی ملا ہے جو ایک دوسرے کو سمجھتا بھی ہے۔ یہ سوال نہیں کروں گا کہ آپ کبھی لڑتے لڑاتے بھی ہیں جہاں دو برتن ہوتے ہیں کھنکتے تو ہیں ہی۔ مجھے تو بہت خوشی ہے۔ تھوڑا

سارشک ہے مجھے کہ ایک سمندر آپ کے گھر کے باہر موجیں مار رہا ہے اور ایک سمندر رہتا ہے آپ کے گھر میں۔ ہمیں بھی بہت شوق ہے کتابیں جمع کرنے کا۔

مگر ہمارے پاس اتنا سادھن نہیں ہے۔ کتابیں جمع نہیں کر سکتے، جمع کر لیں تو انھیں رکھ نہیں سکتے۔ ہمارے پاس کتابیں ہیں وہ کچھ تو الماریوں میں رکھی ہیں، کچھ بنڈل بندھے رکھے ہیں۔"

ساوتری: "ان کتابوں سے تو اور لوگوں کو بھی بہت فائدہ ہوتا ہے۔ اور یہ اچھی بات ہے۔"

سردار: "خوشی کی بات ہے اور میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اور بھی کتابیں جمع ہوں اور گپتا صاحب اور بھی بہت سا علمی، ادبی کام کریں۔"

۹۹

افتخار امام

.....ایک ملاقات

(شاعر، بمبئی- جلد ۵۴، شمارہ ۹- ۱۹۸۳ء)

افتخار- آپ کی شخصیت، شاعری، تحقیقی کام اور ادب و موسیقی پر آپ سے تفصیلی گفتگو کرنے کا خواہش مند تھا- اب شاعر میں آپ پر گوشے کی اشاعت نے یہ موقع فراہم کر دیا- میں چاہوں گا کہ سب سے پہلے آپ اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں وہ باتیں بتائیں جو آپ کی آپ بیتی میں نہیں آسکی ہیں یا پھر جو قارئین اور ادب کی تاریخ لکھنے والوں کے لیے ضروری ہیں۔

رضا- ہمارا خاندانی پیشہ ساہوکاری کا ہے یعنی روپے کا لین دین کبھی زمانے میں بڑے پیمانے پر گڑ اور شکر کی تجارت بھی ہوتی تھی مگر یہ چار پشت پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد میرے بزرگوں نے صرف ساہوکارا پیشے کو اختیار کر لیا اور تب سے آج تک ہم یہی ایک کام کرتے چلے آرہے ہیں اِس بیچ میں کبھی کبھی جنس کی خرید و فروخت کا بھی کاروبار ہوتا رہا لیکن اب جنس کی جگہ مکانوں نے لے لی ہے اور ہمارا روپے پیسے کے لین دین کا کام اب تک چل رہا ہے۔ میں نے اسی ماحول میں پرورش پائی۔ ہماری کھیتی بھی بہت اچھی تھی۔ اس میں بھی مجھے خوب کھیلنے پنپنے کا موقع ملا ہے ویسے ہم یہ کام خود نہیں کرتے تھے۔ تاہم ہمارے پاس کافی زمین تھی۔ میرے دادا اردو سے تقریباً ناواقف تھے اور ان کے کوئی بھائی یعنی میرے دادا کے چھوٹے بڑے بھائی بھی اردو زبان سے ناواقف تھے معمولی شُدبُد انہیں ہو گی البتہ میرے والد اردو فارسی کے عالم تھے۔ وہ پڑھے لکھے بھی خوب تھے۔ گورنمنٹ کرسچین کالج لاہور کے گریجویٹ تھے۔ لمبی عمر پائی انہوں نے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اردو اور فارسی کی لگن مجھے وہیں سے ملی ہے میں نے انہیں شعر کہتے کبھی نہیں سنا لیکن انہیں بہت سے شعر یاد تھے، فارسی کے کیا اردو کے کیا۔ کبھی کبھی ہمیں کوئی چیز لغت میں نہیں ملتی تھی تو ان سے پوچھ لیتے اور وہ بتا دیتے تھے۔

فتخار - اردو اور فارسی کا ذوق اور شوق آپ کو ابتدا ہی سے میسر آیا گویا ایک طرح کا ستھرا ماحول ملا۔

رضا - مجھے بہت اچھا ماحول ملا

فتخار - آپ نے ذکر بھی کیا۔ کئی جگہ کہ آپ کے والد محترم کو غزلیں سننے کا بھی بے حد شوق تھا۔ حسینا نام کا کوئی شخص۔

رضا - جی ہاں حسینا نام کا ایک شخص بہت اچھا گاتا تھا میں نے اس پر مضمون بھی لکھا تھا جو خاصا مقبول ہوا۔

فتخار - کچھ اپنی ابتدائی تعلیم کے بارے میں بتائیے۔

رضا - ہمارے یہاں ایک پرائمری اسکول تھا جو بہت پرانا تھا میں سمجھتا ہوں کہ ۱۸۹۶ء کے قریب کا بنا کردہ تھا وہ۔ پھر مکند پور میں ایک مڈل اسکول قائم ہو گیا وہاں سے پڑھ چکے تو ہائی اسکول میں داخل کئے گئے میں نے اپنی پہلی نظم اسی ہائی اسکول کے جلسوں میں پڑھی تھی اسکول میں اردو فارسی کے اچھے اچھے منشی تھے اس زمانے میں بڑا رواج تھا پنجاب میں اردو، فارسی کا، مجھے یاد ہے کہ جب میں پہلی جماعت میں پڑھتا تھا تو باہر سے ہمارے یہاں انسپکٹرس آف اسکول آیا کرتے تھے جن کو ہم بابوجی کہا کرتے تھے۔ ہم کہا کرتے تھے کہ آج بابوجی آنے والے ہیں انہوں نے ایک بار املا لکھایا، ہمیں اس کی بڑی مشق کرائی جاتی تھی۔ یعنی ایک صاحب بول رہے ہیں اور ہم لکھ رہے ہیں۔ تو جب املا لکھا جا چکا اور سب کی تختیاں دیکھی گئیں تو ایک تختی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ لڑکا کون ہے کھڑا ہو جائے میں اٹھا چھوٹا سا تھا لہذا مجھ سے کہا گیا کہ میز پر کھڑے ہو جاؤ تب انہوں نے پوری کلاس کو اور ٹیچروں کو بتایا کہ یہ لڑکا اتنا ہوشیار ہے کہ "نیچے" کے ہجے بھی جانتا ہے اور اس نے صحیح لکھا ہے۔ گویا پہلی جماعت میں "نیچے کے صحیح ہجے" لکھنا بڑی بات تھی پہلی جماعت کی اردو کی کتاب میں ایک سبق تھا کہ "ماں بچے کو گود میں لئے بیٹھی ہے۔ باپ حقہ پی رہا ہے" حقہ، ہائے حطی کے ساتھ میں نے صحیح لکھا تھا۔ جبکہ کسی اور بچے نے درست نہیں لکھا تھا۔ اس کی بڑی تعریف ہوئی میں ابھی پہلی جماعت ہی میں تھا، ہمارے رشتے دار جب گھر آیا کرتے تھے تو حیرت و استعجاب کے عالم میں میرے

سامنے اخبار رکھ دیا کرتے تھے۔ ملاپ، پرتاپ وغیرہ اور کہتے تھے کہ آج کی خبریں پڑھ کر سناؤ۔ میں اس وقت اخبار بڑی روانی سے پڑھ سکتا تھا جماعت اوّل سے مجھے اس طرح کا ماحول ملا اور اردو زبان میرے ذہن میں رچ بس گئی۔ گاؤں میں تعزیہ بڑی شان سے نکلا کرتا تھا۔ خاندان ہمارا آریہ سماجی تھا اس کے باوجود سو سال سے ہمارے یہاں ایک روایت چلی آرہی تھی کہ تعزیئے کے لئے سبیلیں لگایا کرتے تھے۔ کنوئیں پر جہاں ہم اور ہمارے والد صاحب بھی کھڑے رہتے تھے پانی پلانے کے لئے وہاں جگہ ذرا زیادہ کشادہ تھی لہٰذا وہاں تعزیہ زیادہ دیر تک ٹھہرا کرتا تھا نوحے پڑھے جاتے تھے، نوحے میں نے بہت سنے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ شعر کہنے کی تحریک بھی مجھے یہیں سے ہوئی

افتخار ۔ یہ رضا تخلص آپ نے کیوں کر اختیار کیا؟ کیسے اس تخلص کا انتخاب کیا آپ نے؟

رضا ۔ کسی نے انتخاب نہیں کیا۔ میں نے خود ہی اختیار کیا ہے۔ بس خیال آیا اور میں نے رکھ لیا اس وقت غالباً ۱۳ یا ۱۴ برس کا رہا ہوں گا میں رضا "ر" کی زیر سے لکھتا ہوں نہ کہ "ر" کی زبر سے۔ اگرچہ بہت سوں کا خیال ہے کہ یہ لفظ "ر" کی زبر ہی سے درست ہے۔ لیکن عربی کے لحاظ سے رضا ہی زیادہ صحیح ہے کیوں کہ "رُضا" فعل ہے اور فعل تو تخلص نہیں ہو سکتا لیکن عام طور پر "ر" کی زبر ہی سے لوگ رضا بولتے ہیں۔

افتخار ۔ شعر گوئی کی ابتدا گویا اسکول کے زمانے ہی سے شروع ہو گئی تھی

رضا ۔ جی ہاں! ۱۹۳۵ء یا ۳۶ء میں جارج پنجم کا انتقال ہوا تھا۔ اور میں نے اس پر ایک مرثیہ لکھا تھا اس وقت میں ۱۰ یا ۱۱ سال کا تھا غالباً۔

افتخار ۔ ۱۹۲۵ء آپ کی پیدائش کا سن ہوا اس حساب سے۔

رضا اس کے بارے میں ذرا وضاحت کردوں۔ مجھے اپنے سنہ پیدائش کا صحیح علم نہیں تھا۔ نہ یوم کا نہ سنہ کا۔ جب میں ۱۹۷۴ء میں پنجاب گیا تھا اس وقت میرے والد بقید حیات تھے میں نے ان سے پوچھا تو کہنے لگے کہ "کچھ کہہ نہیں سکتے پرانے کاغذات کی ورق گردانی کرو"، ہمارے یہاں ایک بہت پرانا اور بڑا بہی کھاتہ ہے جو کئی پشتوں سے چلا آتا ہے اس میں دیکھا تو بالکل صحیح تاریخ پیدائش نکل

آئی یعنی ۲۵ اگست ۱۹۲۵ء شام کے ساڑھے پانچ بجے۔ اب جہاں کہیں بھی میری تاریخ پیدائش اس کے علاوہ شائع ہوئی ہے وہ غلط ہے۔

افتخار۔ آپ کی بعد کی تصانیف میں تو صحیح یوم اور سنہ ہی شائع ہوا ہے۔ خود گیان چند نے بھی اپنے دیباچے میں اس کا ذکر کیا ہے اور ظفر ادیب نے جو آپ پر کتاب لکھی ہے اس میں بھی ۲۵ اگست ۱۹۲۵ء ہی لکھا ہے۔

رضا: جی ہاں! میں نے ہی ان لوگوں کو صحیح تاریخ پیدائش دی تھی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد میری تصانیف میں یہی سنہ آیا ہے پہلے میں نے کئی جگہ صحیح تاریخ پیدائش سے لاعلمی کا اظہار کیا ہے

افتخار: اسکول سے کالج تک کے تعلیمی سفر کے بارے میں بتایئے

رضا: مجھ سے کہا جا رہا تھا کہ میں افریقہ چلا جاؤں۔ افریقہ جانے کے لئے ویزا اور پاسپورٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں خاصی تاخیر و تگ و دو کی وجہ سے میں کالج جانے سے رہ گیا۔ غالباً فرسٹ ایر میں گیا تھا۔ چند ایک مہینے، اور پھر چھوڑ دیا۔ اسی اثنا میں میں نے منشی فاضل اور ادیب فاضل کے امتحان دیئے یعنی آنرز ان اردو، آنرز ان پرشین۔ اس سے ایک بڑا فائدہ مجھے یہ ہوا کہ پرانی فارسی سے واقفیت ہوگئی۔ اردو لٹریچر سے واقفیت ہوگئی۔ پرانی کتابیں پڑھ ڈالیں میرے والد صاحب کی چھوٹی سی لائبریری تھی وہ کتابوں کے بڑے شوقین تھے۔ میں چھپ کر کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ وہ بھی خوش رہتے تھے اس بات سے کبھی برا نہیں مانا وہ کہا کرتے تھے کہ بس رزق چھوڑ کر یہ کام نہیں کرنا چاہیے۔

افتخار: اس دور میں کس طرح کی کتابیں آپ کے مطالعہ میں آئیں۔

رضا: والد صاحب کی لائبریری میں بعض کتابیں بہت پرانی تھیں کچھ مذہبی بحث و مباحثے کی کتابیں بھی تھیں جن کا بڑا رواج تھا پنجاب میں اس میں سوامی دیانند کا جیون چتر۔ اردو میں لکھی ہوئی تھی، یہ کافی ضخیم کتاب ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ فارسی کی مشہور کتابیں۔ انوارِ سہیلی۔ گلستان۔ بوستاں۔ مجھے میرے والد صاحب نے پڑھ کر سنائیں اور سمجھائیں۔ انوار سہیلی ایک مشکل کتاب ہے۔ اس سے مجھے جو فائدہ پہنچا وہ میں اسکول میں نہ اٹھا سکتا تھا

افتخار : آپ کی ذہنی نشوونما میں ان کتابوں نے خاصہ اہم کردار ادا کیا۔

رضا : نہ صرف ذہن بنا بلکہ فارسی زبان کا مزاج۔ اردو کی گنگا جمنی تہذیب ذہن میں آئی۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ آریہ سماجی بن جایئے وہابی بن جائے مگر اردو کا اپنا کلچر ہے جو بالکل الگ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر شخص کے لئے بالخصوص شمالی ہندستان کے رہنے والوں کے لئے اردو کا سیکھنا بہت ہی زیادہ ضروری ہے میں ہمیشہ اپنے دوستوں، رشتے داروں سے کہا کرتا ہوں کہ کسی اور وجہ سے نہ سہی کم از کم شمالی ہندستان کے مزاج کو سمجھنے کے لئے اردو ضرور سیکھئے اس سے زبان بنتی ہے۔ مزاج بنتا ہے۔ ایک تاریخ ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ جس سے ہم نابلد ہوتے جارہے ہیں۔ جس طرح کی زبان اس وقت بولی جارہی ہے وہ تو کچھ عجیب سی لگتی ہے۔

افتخار۔ جی ہاں! آج زبان بے حد مختلف ہوگئی ہے اور انتشار کا سبب بنتی جارہی ہے آپ نے باقاعدہ شاعری کی ابتدا چودہ پندرہ سال کی عمر میں کی۔ شروع میں تو غالباً کسی سے مشورہ نہیں کیا لیکن بعد میں پنجاب کے ایک شاعر کمال کرتار پوری سے اصلاح لینی شروع کی لیکن جوش ملسیانی صاحب سے شرف تلمّذ کس طرح حاصل ہوا

رضا : میں نے کمال کرتار پوری مرحوم سے مشورہ سخن کیا ہے۔ بہت اچھے استاد شاعر تھے ان کا انتقال ہوگیا۔ قبلہ جوش ملسیانی صاحب کے صفِ اول کے شاگردوں میں تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے استاد محترم جوش صاحب کے سپرد کردیا

افتخار : جوش صاحب سے آپ کے تعلق یعنی استادی و شاگردی کے سلسلہ میں بعد میں گفتگو کریں گے لیکن یہ بتایئے کہ اس وقت پنجاب میں جو مشاعرے ہوتے تھے اُن میں آپ شرکت کرتے تھے تو کون کون سے شعرا نمایاں تھے۔

رضا : مجھے مشاعروں سے دلچسپی کم رہی اس لئے بہت ہی کم ان میں شرکت کرتا تھا۔ ہاں مطالعے کا بے حد شوق تھا لہٰذا پڑھنے کی طرف زیادہ مائل رہا۔ ایک بات بتاتا چلوں کہ پھر کہیں ذہن سے نہ نکل جائے۔ یہ اس لئے نہیں کہ آپ کو خوش کرنا چاہتا ہوں۔ محض اس لئے کہ وہ بھی ایک دور تھا۔ ہمارے گاؤں میں ایک لڑکا سادھو رام تھا۔ یہ شخص حلوائی تھا۔ سادھو رام کی پھوپھی جوش صاحب کو بیاہی

ہوئی تھیں ۔عرش ملسیانی صاحب کی ننھیال ہمارے ہی گاؤں میں تھی سادھو
رام کے یہاں شاعر آیا کرتا تھا ۔میں اس وقت یہی چودہ پندرہ سال کا ہوں گا میں
نے دیکھا تو مجھے شاعر اچھا لگا ۔میں نے سادھو رام سے پوچھا کہ کیا شاعر باقاعدہ نکلتے
ہو؟ بولے ہاں ۔میں نے کہا کہ رسالہ آیا کرے تو مجھے بھی دیا کرنا ہیں گا ہے گا ہے رسالہ
پڑھتا رہا ۔اس وقت شاعر میں سیماب صاحب کی اصلاحیں آیا کرتی تھیں یہ بہت زمانہ
پہلے کی بات ہے مگر میرے ذہن میں محفوظ رہ گئی شاید کہ میری یادداشت اچھی ہے ۔
اس میں ایک مصرع تھا "ماہ و مہر لگتے ہو" سیماب صاحب نے وہاں اصلاح دی تھی
کہ چونکہ مہر کا مقام ماہ سے اونچا ہے اس لئے اس کو پہلے ہونا چاہے یعنی مہر و ماہ ہونا
چاہئے اس سے ایک نئی بات میرے ذہن میں آئی کہ شاعری میں اس طرح کا خیال بھی رکھنا
چاہئے اور آج تک میرے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے شاعری پر اصلاحوں کے ذریعہ
سے آپ کے دادا سے غائبانہ تعارف ہوا

افتخار :شعری شخصیت کی تشکیل میں اور کون کون لوگ اور کتابیں معاون ہوئیں ؟

رضا : اس سلسلے کی سب سے پہلی کتاب جو میں نے پڑھی وہ تھی "شعرالہند" عبدالسلام
ندوی کی جو دو حصّوں میں ہے اس کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوا کہ داغ کے خاندان
کے لوگ اس وقت پورے شعری ماحول پر غالب تھے میں نے ان سب کو پڑھا
دیکھا پھر مختلف رسائل اور کتابوں میں بھی ان کو پڑھا ۔اس طرح زبان و بیان کی
تشکیل میں مجھے کافی مدد ملی ۔

افتخار : ایک سوال آپ کی گفتگو سے ابھر آیا جسے ذرا وضاحت کے ساتھ بیان کر رہا ہوں
داغ دہلوی اور ان کے بے شمار شاگرد جو پورے ہندستان میں پھیلے ہوئے تھے
ان سے اردو شاعری کو بہت زیادہ فروغ حاصل ہوا ۔زبان و ادب پر اس کے
وسیع اثرات مرتب ہوئے پھر داغ کے شاگردوں کے سینکڑوں شاگرد ہوئے
اس طرح شمع سے شمع کا یہ سلسلہ آج تک جاری ہے اور جاری رہے گا ۔لیکن عجیب
بات ہے کہ ہمارے نقادوں نے داغ دہلوی کو کبھی قابل اعتنا نہیں سمجھا اور داغ
کی پوری شاعری تنقیدی فقرے بازی سے آگے کوئی تفہیمی شکل اختیار نہیں کر سکی
ایک اہم اور بڑے شاعر کا ذکر تو ہونا تھا ۔لہٰذا جس نے جیسا چاہا کہا اور نوازا ۔

یہاں تک کہ داغ کے شاگردوں کے شاگردوں نے بھی کبھی داغ پر ایسا کام نہیں کیا۔ تحقیقی و تنقیدی کتابیں نہیں لکھیں جو اس اہم شاعر کے لئے ضروری تھیں جس کا اردو شاعری میں بہت بڑا حصہ ہے۔

رضا: میں نے اپنی کتاب سہو و سراغ میں ایک مضمون لکھا تھا جو ایسے اشعار کے متعلق تھا جو دوسروں کے نام سے مشہور ہو گئے اس میں ایک شعر دیا ہے۔ غالباً سراج لکھنوی کا ہے ؎

آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے ؛ اک ذرا آپ کو زحمت ہو گی

لوگ اس پر بازاری پن گھٹیا پن وغیرہ کی پھبتی بہت کستے ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ ہمارے بیشتر نقادوں میں جو ہر شاعری تو ہوتا نہیں ہے اس سے وہ لطف نہیں لے سکتے۔ لفظی معنی نکالنے کی کوشش کرتے ہیں معنی اس کے صرف اتنے ہی ہیں کہ آپ کے اختیار میں میری زندگی ہے۔ آپ کی ذرا سی مدد پر میرا مستقبل سنور سکتا ہے

افتخار: یہاں دل زندگی کی علامت ہے۔

رضا: اب داغ کا یہ شعر لیجیے

چوٹ کھانا دلِ حزیں نہ کہیں ؛ درد رہ جائے گا کہیں نہ کہیں

مجھے بتایئے آپ کیا کہیں گے، پرانا شعر روایتی شعر؟ یا کیا اس کا کوئی جدید اسلوب بھی ہو سکتا ہے؟ آپ کہہ کر دیکھ لیجیے۔ آپ سے نہیں بن پڑے گا جتنی نثری اور آزاد نظمیں لکھنے والے لوگ ہیں وہ ایسے شعر کہہ کر دکھائیں لیکن ہم سے آپ نثری نظمیں لکھوایئے ہم دو منٹ میں کہہ سکتے ہیں۔ آپ ہم سے غیر مقفا نظم کہلوایئے دیر نہیں لگے گی یعنی مشقِ سخن کے اپنے فوائد ہیں اسے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ کچھ نہیں۔ کوئی شخص فن کو نہ جانے بغیر نثری نظم کہنے لگے گا تو شاعر کیونکر کہا جائے گا۔ فن سے واقف ہونے کے بعد اجتہاد زیب دیتا ہے۔

افتخار: نثری نظم، آزاد غزل یا پھر آزاد نظم پر ہم بعد میں گفتگو کریں گے۔ یہاں بات داغ کی چل رہی ہے

رضا: میں اسی طرف آ رہا ہوں۔ دراصل آپ کے سوال کا جواب میرے اس جواب ہی سے آگے بڑھتا ہے کیونکہ بنیادی طور پر جو کچھ آج اردو تنقید میں ہو رہا ہے یا شاعری

میں ہو رہا ہے وہی ہماری روایت ہماری شاعری اور ادب کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ بہر حال بلا شبہ داغ ایک وہبی شاعر تھا جس کے یہاں فکر کم سہی۔ لیکن یہ کہنا کہ وہ بازاری شاعر تھا بالکل غلط ہے۔ لوگوں نے داغ کا صحیح مطالعہ نہیں کیا۔ داغ کی شاعری کا ایک انتخاب میر کے انتخاب ہی کی طرح کیا جا سکتا ہے۔ جب ہم انتخاب کرتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ اس کے سب پہلو نظر میں رکھئے اور جب سب پہلو نظر میں رکھنے ہیں تو پھر مکمل کلام ہی پڑھئے۔ یا پھر یک رخا انتخاب کیجئے، جیسے داغ کے صرف اس کلام کا انتخاب جس میں فکر پائی جاتی ہو۔ نوح ناروی کے لئے کہا جاتا ہے کہ ان کی شاعری داغ کی طرح کی شاعری تھی نوح کا ایک شعر سنئے ؎

اے دستِ شوق دامنِ محبوب تھام لے — لوٹے گا سلسلہ نہ سوال و جواب کا

اب آپ مجھے یہ بتایئے کہ اس شعر میں کیا ہے جو غالب کی طرح معنی خیز نہیں اور صرف لفظوں کا کھیل ہے؟ یہ تو نہیں ہے کہ ان لوگوں میں کچھ تھا ہی نہیں یہ وقت کی رو کے ساتھ چلے جیسے کہ آج کے شاعر چل رہے ہیں، آج کے شاعر کیا کر رہے ہیں؟ کیا انہیں یقین ہے کہ وہ باقی رہ جائیں گے؟ آج سے دس سال پہلے کے شاعر کیا زندہ ہیں؟ اب سے دس سال بعد دیکھیے گا کہ آج کے ہم، مردہ قرار دیئے جائیں گے۔

افتخار: آپ نے بجا فرمایا! ادب میں اسی طرح کے رویوں نے مصلحتوں نے اور مفاد پرستی نے بہت سی دھاندلیاں کی ہیں اور یہ ایک طویل موضوع بحث ہے داغ کا جہاں تک تعلق ہے اس کی شاعری کا مطالعہ غالب اور میر کی طرح نہیں کیا گیا غالب نے اردو غزل کو بہت سی نئی جہتوں سے آشنا کیا لیکن اس کی شاعری میں ایک مخصوص مزاج کے رکھ رکھاؤ نے اسے بڑا اغنائی شاعر تو بنا دیا لیکن داغ کی سی سرمستی، چلبلاپن، زبان و بیان کی سجاوٹ اور شعروں میں مکالماتی انداز لہجے کی بے پناہ شوخی اور کھلی فضا کم ہی ملتی ہے۔ غالب نے اردو غزل کو ایک نئی زندگی دی تو داغ نے اسے بولنا اور قہقہے لگانا سکھایا۔ اگر داغ کی شاعری میں کچھ بھی نہیں ہے تب بھی محاورے اور زبان کا تحفظ اس کے یہاں زیادہ ہے جو اسکے ہزاروں شاگردوں سے آج ہم تک پہنچا۔

رضا : داغ کی شاعری میں بے ساختہ پن زیادہ ہے ۔ لوگوں کو زبان آگئی تھی کہ پنجاب کی پنجابی تک اردو میں ڈھل گئی۔ میں جب افریقہ سے واپس ہوا اور پنجاب پہنچا تو معلوم ہوا کہ زبان بالکل ہی بدل گئی ہے۔ "توں تا زندگی نہیں بھلیں گا"، "اِہ تیرے واسطے حرفِ آخر اے"، جیسے جملے ہم پنجابی میں بولا کرتے تھے اور یہ دین تھی داغ کے زبان زدِ عام اشعار کی اور اب تو یہ عالم ہے کہ لفظ بنائے جارہے ہیں جبکہ بنائے جانے سے زبان نہیں بنتی۔ زبان تو از خود بنتی جاتی ہے کسی کی کوشش سے نہیں بنتی ایسے لفظ جیسے بکھڑا بکھڑیاں وغیرہ کو ناسخ نے متروک قرار دیا اور فارسی و عربی کے الفاظ کو شاعری میں رواج دیا جس سے زبان تبدیل ہوگئی اور ان میٹھے الفاظ کا استعمال لوگ بھول گئے لیکن یہ نئے ثقیل الفاظ زیادہ نہیں چلے اور آہستہ آہستہ ختم ہوگئے اگرچہ پچاس ساٹھ سال بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصے تک لوگوں نے انہیں برتا "ملک" "سدا" وغیرہ الفاظ متروک تھے مگر اب پھر استعمال ہونے لگے ہیں

افتخار : زبان میں تغیر و تبدّل تو ناگزیر عمل ہے۔

رضا : یہ تو ہونا ہی چاہیے

افتخار : اس لئے بھی کہ مقامی اور معیاری زبانیں ایک دوسرے میں خلط ملط ہوتی رہتی ہیں۔ پھر تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر مختلف النوع بولیاں بھی ہیں۔ ان سب سے آپسی میل جول سے ذخیرۂ الفاظ بڑھتے ہیں۔ آواز کے خانوں میں جو لفظ از خود سما جائے اور دور تک پہنچ جائے وہ معیاری زبان کا حصہ بن جاتا ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ادبی زبان کیا ہو۔؟ داغ کے بہت سے شاگردوں نے اپنے گزشتہ کی زبان کے بہت سے الفاظ کو متروک کیا۔ شاعری کی زبان ہی معیاری زبان تسلیم کی گئی ہے چنانچہ زبان و بیان کے ذیل میں حوالے بھی اساتذہ کی شاعری ہی سے دیئے جاتے ہیں۔ تو یہ ناگزیر عمل جاری رہتا ہے۔

رضا : داغ کا کمال یہی ہے کہ اپنی شاعری اور کچھ تلامذہ کی شاعری کے ذریعہ زبان کی فصاحت و بلاغت کو عوام سے زیادہ قریب کیا اور زبان کا تحفظ کیا۔

افتخار : آپ افریقہ گئے تھے اور طویل عرصے تک وہاں رہے بھی اس طرح آپ کی سوچ اور طرزِ فکر بھی متاثر ہوئی ہوگی۔ وہاں کے ماحول اور حالات کے سبب ....

رضا: مجھے معلوم نہیں کہ آپ نے کہاں سے اندازہ لگایا۔ آپ بتائیں کہ یہ تبدیلی کہاں سے شروع ہوئی؟

افتخار: "شعلۂ خاموش" اور "شورشِ پنہاں" کے بعد کی شاعری میں یہ تبدیلی محسوس کی جاسکتی ہے۔ یہاں تبدیلی سے دو باتیں ابھرتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ شاعر کے یہاں بڑھتی ہوئی عمر اور مشقِ سخن سے شاعری میں نکھار اور استحکام آتا ہی ہے۔ تجربوں، مشاہدوں اور تجزیوں سے فکری سطح پر زبان، لہجہ، میلان وغیرہ بہت کچھ تبدیل ہوتا ہے، اسی کے ساتھ ہر شاعر کی اپنی شاعری اس کے مزاج اور ماحول کی عکاس بھی ہوتی ہے اور آپ کے یہاں بھی ابتدائی دو شعری مجموعوں کی اشاعت کے بعد کی شاعری سے یہ تبدیلی نمایاں ہے۔

رضا: دیکھیے! میں نے زبان کو تو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ میں نے چند متروکات یا وہ تمام الفاظ جو قبلہ جوش ملسیانی نے ترک کر دیے تھے ان کی زندگی تک متروک رکھے۔ ان کے انتقال کے بعد پھر میں نے اپنے طور پر کچھ متروکات کے استعمال کو جائز قرار دے لیا۔ یہ تو میں بھی مانتا ہوں کہ بعض الفاظ استعمال نہیں کرنے چاہئیں لیکن اگر استعمال کرنے کا ہنر آتا ہے تو ضرور انھیں برتنا چاہیے۔

افتخار: اگر آپ اس بات کو مثال دے کر سمجھائیں تو مزید وضاحت ہو جائے گی۔

رضا: سوقیانہ الفاظ جیسے "چھاتیاں" وغیرہ۔ لیکن اگر موضوعات ہی ایسے ہیں کہ ان الفاظ کے بغیر چارہ نہیں تو پھر استعمال کرنا چاہیے۔ لیکن ایسے متروکات جیسے تلک، سدا، انکھڑیاں، مکھڑا، دکھڑا وغیرہ کا استعمال ضرور ہونا چاہیے۔ میں نے جوش صاحب کی زندگی کے آخری دنوں میں فکر کی لے تیز تر کر دی تھی کیونکہ یہ میرا فطری رجحان تھا، لیکن زبان کو ان ہی حدود میں رکھا جو مجھے سکھایا گیا تھا۔ اب جیسے میرا یہ مطلع

جانے کس الجھن میں پڑا ہوں
ڈوبا سا ساحل پہ کھڑا ہوں

زبان تو بالکل صاف رکھی میں نے لیکن ذرا سی آزادی دے دی۔ جوش صاحب "جانے" کو بہ معنی "خدا جانے"، "نہ جانے" استعمال نہیں کرنے دیتے تھے لیکن جب ہر سطح پر لوگ استعمال کرنے لگے تو میں نے بھی برتنا شروع کر دیا۔ ورنہ مجھے بھی "نہ جانے" "خدا جانے" استعمال کرنا پڑتا۔ اب میری غزلیں اسی نہج پر تخلیق ہونے لگی ہیں۔ میں جب ہندوستان آیا تو دیکھا کہ میں ہند و پاک کے ادب سے بالکل کٹ گیا ہوں اور اگر اپنی یہ نظمیں اور غزلیں لے کر نکلوں گا تو کوئی

گھاس نہیں ڈالے گا۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ کچھ عرصے تک خاموش رہا جائے، عصری شاعری کے رجحانات کو دیکھا جائے اور یہ کہ اسے کہاں تک اپنے آپ میں سمو سکوں گا۔

افتخار: آپ کی یہ خاموشی بھی آپ کے کام ہی آئی اور شاعری سے تحقیق تک سفر طے ہوا۔

رضا: جی ہاں! میں تحقیق کی طرف راغب ہو گیا، مگر ایسا ہونا بھی عین میرے مزاج کے مطابق تھا اس لیے کہ تحقیق کی عادت میری بچپن سے ہے۔ لہٰذا اس طرف آنے میں مجھے دیر نہیں لگی۔ مطالعہ بجد کیا، اردو، فارسی اور انگریزی ادب کے مطالعے سے مجھے بے اندازہ فائدہ ہوا۔ تاریخ ہمیشہ ہی سے میرا دل پسند موضوع رہا ہے۔ یادداشت اچھی ہے۔ جو کچھ پڑھتا ہوں وہ یاد رہ جاتا ہے اس سے بھی بڑی مدد ملی۔ مجھے تحقیقی کاموں میں اس قدر کامیابی ملی کہ میری شاعری اس کے نیچے دب گئی۔

افتخار: تحقیق کے موضوع پر ہم بعد میں بات کریں گے۔ یہاں گفتگو چل رہی ہے تبدیلی سے متعلق کہ آپ نے زبان و بیان کی تبدیلیوں کی طرف اشارہ کیا جب کہ میں فکری سطح پر تبدیلیوں کی بات کر رہا تھا۔

رضا: میرے خیالات میں بہت زیادہ تبدیلی تو آئی مطالعے و مشاہدے سے۔ لوگوں کے میل جول سے چوں کہ میں پنجاب سے نکلا تھا اور نکل کر ایسے لوگوں میں چلا گیا جہاں مختلف دھارے ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ افریقہ میں مطالعے کا موقع بھی بہت ملا لہٰذا پڑھا بھی بہت۔ اچھے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ میں سخت و شدید مذہبی آدمی نہ رہا مجھے یہ سوچنے اور سمجھنے کا گر ہاتھ آ گیا کہ کوئی بھی چیز حرفِ آخر نہیں ہے۔ مذہب کے معاملے میں بھی۔ اس میں ہمیں کچھ ڈھیل ضرور دینی چاہیئے۔ ادب میں اگر کسی نے یہ لکھا کہ "یوں کرنا چاہیئے" تو کرنا چاہیئے تک فائدہ اٹھانا چاہیئے یعنی ضروری نہیں کہ کیا ہی جائے۔ جتنا کرنا چاہیئے اس سے کم بھی آپ کر سکتے ہیں۔ زیادہ بھی کر سکتے ہیں۔ گویا سوچ سمجھ کر ایڈجسٹمنٹ کرنے کی طبیعت بن گئی جس سے ذہن میں وسعت آ گئی اور یہ وسعت "شعلۂ خاموش" کے بعد بڑھتی ہی چلی گئی۔ یعنی اپنی آنکھوں سے پوری انسانیت کا سلسلہ، روشنی، اندھیرا، بہت جھڑ، خزاں وغیرہ وغیرہ علامتیں اور استعارے دیکھ لیے۔ میں نے مذہبی کتابیں بھی بہت پڑھیں۔ اسلامی لٹریچر کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے۔ یہ کتابیں اور لٹریچر بے کار کی ہُو و ہا نہیں۔

افتخار : اس کا اندازہ اسلامی موضوعات پر آپ کی شاعری سے ہوتا ہے۔

رضا : یہ تو خیر بہت مختصر سی ہے۔ پھر بھی مطالعہ بہت کیا۔ اس سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ اب مجھے غیر آریہ سماجی، غیر ہندو، کٹر مسلمان اور دہری جن سے ملنے میں کوئی عار نہیں۔ یہ احساس کبھی مجھ میں باقی نہیں رہا کہ یہ مجھ سے کمتر ہیں یا مجھ سے بڑھ کر ہیں مجھے محسوس ہوا کہ سب لوگ برابر ہیں اور بیشتر باتوں اور مسائل میں ہم میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ یہ سمجھ کر آپس میں ملنا آسان ہو جاتا ہے اس لیے آپ نے دیکھا ہوگا کہ میں بہت کم کسی سے ملتا ہوں لیکن جب کوئی مجھ سے ملتا ہے تو یہی محسوس کرتا ہے کہ اسے کمتر یا برتر نہیں مانا گیا، یا اسے ہندو نہیں مانا گیا، سکھ نہیں مانا گیا، مسلمان نہیں مانا گیا، اور نہ ہی ان کے ساتھ مجھے کھانے پینے میں کوئی پرہیز ہوتا ہے حالانکہ میں خود کھانے پینے میں زیادہ پرہیز کرتا ہوں۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی شراب نہیں پی۔ میں اپنے گھر پر بھی کسی کو شراب نہیں پلاتا۔ نہ میں رشوت لیتا ہوں اور نہ ہی دیتا ہوں۔ ان تمام باتوں نے مجموعی طور پر میری شاعری اور میرے ادب کو متاثر کیا۔

افتخار : ایک بہت ہی غیر اہم اور ضمنی سا سوال آپ سے کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ آپ نہایت ہی متمول شخص ہیں تو اس سے آپ کی شاعری اور آپ کے تحقیقی ادب پر کیا اثر پڑا کیوں کہ عموماً ہمارے یہاں اس طرح کی افواہیں گونجتی رہتی ہیں کہ فلاں شخص اپنی دولت کے بل پر ادب میں اپنی جگہ بنا رہا ہے اور اس کی مثالیں موجود ہیں۔ حقیقت کیا ہے ؟

رضا : بات یہ ہے افتخار کہ میں نے اپنے آپ کو پیسے سے کبھی نہیں منوایا اور جب کوئی میرے کام کو، میرے ادب کو روپئے پیسے سے تولتا ہے تو مجھے بے حد دکھ ہوتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ لوگ یہ بات ہضم نہیں کر سکتے ہیں کہ کوئی پیسے والا اچھا اور سلجھا ہوا ادیب ہو سکتا ہے۔

افتخار : اپنی شاعری کی اب سے عہد جوانی تک کوئی ایسا خاص واقعہ یا سانحہ جو آپ کی شاعری پر اثر انداز ہوا ہو۔

رضا : نہیں میں نے عشق نہیں کیا۔

افتخار : میری مراد عشق محض سے ہرگز نہیں ہے بلکہ ۔۔۔۔۔۔

رضا : میرے یہاں ایک خاندانی روایتی سنجیدگی ہے جسٹس چانن سنگھ نے ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ "نوجوان رضا کے کاندھوں پر ایک بوڑھے بزرگ کا سر رکھ دیا گیا ہے"۔ اس لیے میری سوچ سمجھ اپنی عمر سے کچھ اونچی ہی رہی۔ یوں سمجھ لیجیے کہ دس سال کے بعد میں پختہ

رہا ہی نہیں۔ میرے بچپن اور جوانی کی عمر کا عہد بہت کم ہے۔ مجھے فکری شاعری پسند تھی۔ غالب مجھے پسند تو آتے تھے لیکن سمجھ میں کم آتے تھے۔ یہ ضرور معلوم ہوتا تھا کہ یہ کچھ کہتا دوسروں سے الگ ہے۔ صحیح مقام بعد میں معلوم ہوا۔ کوئی ایسا محرک تو نہ تھا جس نے میری شاعری کو تازیانہ دیا ہو۔ میرا اپنا مطالعہ و مشاہدہ اور میری سوجھ بوجھ ہی میری شاعری ہے۔

افتخار: کہتے ہیں کہ غزل میں عشق کا رچاؤ ضروری ہے یا یہ کہ اردو شاعری میں عشق کو غالب حیثیت حاصل رہی ہے لیکن آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ کے بچپن اور جوانی میں کوئی خاص فاصلہ نہیں رہا اسی طرح شعور بھی جلد بالغ ہو چکا تھا یعنی جوانی ہی میں آپ کی فکر کسی بڑی عمر کے شخص کی طرح ہو گئی تھی تو اس میں چاہنے اور چاہے جانے کا کوئی لمحہ آیا ہی نہیں۔

رضا: دیکھئے، اس میں یہ فرق ہے جیسے بیوی کی طرح چاہنا۔ اس غرض سے چاہنا کہ اس کے ساتھ کوئی جنسی فعل کیا جائے۔ یہ تو بہت ہی گھٹیا قسم کا عشق ہے۔ عشق کی نہایت ہی پست صورت ہے۔ اردو شاعری میں ہمارے غزل گو یوں نے منوا دیا کہ عشق یہی ہے مجھے کتابوں سے والہانہ عشق ہے۔ عشق محض عورت ذات ہی سے تو نہیں ہوتا۔ مجھے ہر خوبصورت چیز بہت پسند ہے۔ لڑکی ہو، لڑکا ہو، کوئی ہو میں اسے دیکھتا ضرور ہوں، خوش ہوتا ہوں، لیکن اس کی انگیا کے اندر جھانکنے کی کوشش نہیں کرتا۔ مجھے فرض کیجئے ایک لڑکی پسند ہے لیکن وہ اگر اچھا نہیں بولتی تو مجھے ناپسند ہو جاتی ہے مجھے اچھی آواز پسند ہے کیوں کہ میں گانے کا شوقین ہوں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ عشق کس سے؟ عشق تو بہت سی چیزوں سے ہو سکتا ہے۔

افتخار: عشق کی تو جتنی بھی تعریفیں بیان کی گئی ہیں وہ اس لامحدود جذبے کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔ عشق لامحدود ہے۔

رضا: مجھے اردو سے عشق ہے۔

افتخار: اردو سے ہے، کتابوں سے ہے، مطالعے سے ہے، عشق اپنے کام سے ہے۔

رضا: اصولوں سے عشق ہے۔

افتخار: موسیقی سے بھی آپ کا لگاؤ رہا ہے اور افریقہ میں موسیقی کی خوب خوب محفلیں سجائیں۔ موسیقی کے متعلق آپ نے لکھا بھی ہے غالباً آپ نے ستار کی تعلیم حاصل کی تھی۔

رضا: پہلے تو میں گاتا تھا۔ بعد میں جب ستار سیکھنے کی منزل میں آیا تو گانا ترک کر دیا۔ یہ بتادوں

کہ چاہے گانے والا ہو، چاہے ساز بجانے والا ہو، دونوں ہی کے لیے موسیقی کا علم ضروری ہے یعنی بنیادی اصول تو سب کے لیے یکساں ہیں۔ تال یعنی ردم کے لیے طبلہ سیکھنا بھی ضروری ہے اگر کوئی شخص یہ نہیں سیکھتا تو محفلوں میں اکثر ناکامیاب رہتا ہے اور اس کا حوصلہ نہیں بڑھتا۔ میں فن عروض میں اچھا تھا اور ہوں۔ عروض میں بھی ماترائیں، طبلہ میں بھی ماترائیں ہی ہیں۔ اس طرح عام بحر وزن خاص طور پر متقارب اور متدارک اوزان کہروے اور تین تال پر بڑی آسانی سے آتے ہیں۔ یہ تالیں چار چار ماتراؤں میں تقسیم ہوتی ہیں۔ اسی طرح فعلن، فعلن، فعلن، فعلن ہر ایک میں چار چار ماترائیں ہیں ف، ع، ل، ن۔ اور سبب کے حساب سے فع لن، فع لن۔ دو، دو، دو، دو۔ میرا ذہن بیوپاری خاندان کا تربیت یافتہ تھا اس لیے حساب میں میں اچھا رہا۔ مجھے بچپن ہی سے دونوں چیزیں پسند ہیں، شاعری اور موسیقی۔ موسیقی کا ریاض میں نے برسوں کیا ہے۔ میں پہلے گایا کرتا تھا۔ یہ جو انسٹرومینٹل میوزک ہے یعنی ستار وغیرہ اس کی محویت بھی کچھ ایسی ہوتی ہے کہ آپ گا نہیں سکتے۔ اس میں کچھ ایسی غنائیت ہوتی ہے کہ آدمی بہہ جاتا ہے چنانچہ وہ گانے سے پرہیز کرتا ہے۔ اس طرح سے میرا گانا ختم ہو گیا لیکن یہ تو نہیں ہوا کہ ستار سیکھنے اور ریاض کرنے سے گانے کی ودیا بھی مجھ میں سے نکل گئی۔

افتخار: ستار کی تعلیم آپ نے کس سے حاصل کی؟

رضا: وہی جن سے میں نے گانا سیکھا تھا، یعنی پنڈت جگن ناتھ پروہت سے۔ وہ ستار بھی بہت اچھا بجاتے تھے۔ جگن ناتھ پروہت وشنو ڈگمبر کے شاگرد تھے۔ ماہنامہ آج کل (دہلی) نے جو موسیقی نمبر شائع کیا تھا اس میں استاد اللہ دیا خاں پر غالباً تاجدار احتشام صدیقی کا مضمون ہے۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کہ انھوں نے اس طرح کا مضمون کیسے لکھا۔ آپ کے گھر میں کیا موسیقی ہے؟

افتخار: ذکر آ گیا ہے تو بتا دوں کہ تاجدار بھائی مرحوم کو مضامین لکھنے کا شوق تھا ہی، بابو جی نے بھی اس نمبر میں ایک مضمون لکھا ہے جو اس وقت ذہن میں نہیں ہے۔ استاد اللہ دیئے خاں صاحب پر محترم عظمت حسین خاں میکش مرحوم نے مواد فراہم کیا تھا جو تحقیقی امور میں معاون ثابت ہوا۔ موسیقی سے شغف ہمارے یہاں چار نسلوں سے ہے۔ میرے پردادا مرحوم مولوی محمد حسین، جو کئی کتابوں کے مصنف تھے اور شاعر بھی تھے، بہت مشہور میلاد خواں گزرے ہیں۔

اور دور دور تک جن کا شہرہ تھا۔ دادا جان سیماب اکبر آبادی جس طرح عروض پر بے پناہ قدرت رکھتے تھے اسی طرح ترنم کے سلسلے میں بھی ان کے شاگرد ساغر نظامی کا کوئی جواب نہیں۔ نظموں اور غزلوں میں ارکان کی کمی بیشی سے اسقدر تجربے کئے ہیں کہ بہت کم شعراء نے کئے ہوں گے۔ عروض اور موسیقی کی ہم آہنگی نے دادا جان کے کلام میں بے پناہ موسیقیت اور تنوع پیدا کر دیا تھا۔ بابو جی کے یہاں بھی شاعری میں تجربے اور اپنی زمینوں کی تلاش نمایاں رہی مختصر یہ کہ ہم لوگ کن سُرے نہیں ہیں اور موسیقی کے بہت اچھے سامع تصور کئے جاتے ہیں۔ بہر حال بات ذرا طویل ہو گئی۔ کیا اب بھی گانے اور ستار کا ریاض جاری ہے۔

رضا:۔ جی نہیں، دو چیزیں میں نے چھوڑ دی ہیں۔ موسیقی اور شطرنج میں شطرنج کا کافی اچھا کھلاڑی تھا۔

افتخار:۔ شطرنج کا ذکر بھی جگہ جگہ آیا ہے۔ آپ کے استاد محترم بھی اس کے بہت اچھے کھلاڑی تھے۔

رضا:۔ جی ہاں وہ شطرنج کے کھلاڑی کے طور پر بھی ہمارے علاقے میں بے حد مشہور تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ کھیلا ہوں۔

افتخار:۔ شاعری اور تحقیق میں آپ کی شخصیت کا نمایاں پہلو ایک محقق کا ہے نہ کہ شاعر کا۔ آپ کی شہرت تحقیق کے حوالے سے زیادہ ابھری۔

رضا:۔ جی ہاں! ہندوستان میں آنے کے بعد چونکہ میں نے زیادہ تیزی سے تحقیقی کام کیا اور متعدد اہم اور بھرپور کتابیں دیں لہٰذا میرا ذکر اسی حوالے سے زیادہ ہوا لیکن اب پھر شاعر کی حیثیت سے ابھر رہا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تحقیق بہت زیادہ دقت پسندی کا نام ہے۔ کبھی کبھی جی اوب جاتا ہے۔ اب بڑھاپا بہت نزدیک آ رہا ہے اور گو میں تحقیقی کاموں کی طرف بھی متوجہ رہتا ہوں لیکن اب اتنا کام نہیں کر پاتا اور میری تسلی ہوتی نہیں جب تک اسے ڈھنگ سے نہ کروں۔ ایسی صورت میں شاعری کی طرف رجحان زیادہ ہونا فطری بات ہے۔ ادھر میں گذشتہ دو تین سال سے جو شاعری کر رہا ہوں وہ پہلے سے بہت الگ ہے اور اس کا مقام بھی دوسرا ہو گیا ہے۔ میں جدید شاعر تو نہیں ہوں۔ ویسے کوئی بھی جدید شاعر نہیں ہے۔ سب فضول باتیں ہیں۔ شاعری تو شاعری ہوتی ہے۔ جدید و قدیم کیا ہوتا ہے اس لئے میں ؟

افتخار:- آپ نے یہ تو سنایا کہ مشرقی افریقہ سے واپسی کے بعد ہند و پاک کی شاعری سے خود کو ہم آہنگ کرنے کے لئے نہایت ہی خاموشی سے مطالعہ کیا اور تحقیق کی طرف مائل ہوئے کہ بچپن سے آپ کے مزاج میں تلاش و تحقیق کا عنصر بھی شامل تھا پھر بھی یہ ایک سوال بنتا ہے کہ آپ تحقیق ہی کی طرف کیوں آئے، تنقید، افسانہ، انشائیہ وغیرہ کی طرف کیوں متوجہ نہیں ہوئے جبکہ اردو والوں کا یہ خاصہ ہے کہ وہ شاعری، افسانہ اور تنقید میں زیادہ طبع آزمائی کرتے ہیں کہ کسی طرح ادبائیں شمار ہونے لگے۔ کسی بھی صنف کے ذیل میں نام تو آہی جائے گا۔۔۔۔ "سہو دسراغ" کے آخر میں جو مضامین ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ افسانہ اور انشائیہ بھی لکھ سکتے ہیں۔

رضا:- یہ سوال میرے مزاج سے متعلق ہے ہوا یوں کہ میں طبعاً بہت حقیقت پسند طبیعت رکھتا ہوں جیسے صحیح بات کہنا، جو کام ہو سکتا ہے، وہی کہنا۔ جسے جو وقت دے سکتا ہوں وہی دینا بات پر قائم رہنا وغیرہ۔ مجھے مفروضے پسند نہیں ہماری اُردو تنقید محض مفروضہ بن کے رہ گئی ہے۔ اس میں چار تنقید کرنے والے ایک ہی شخص پر یکساں بات نہیں کہہ پاتے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا ہے کہ کسی شاعر کی ہزار جہتیں ہو سکتی ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ دس نقاد مل کر بھی کسی شاعر کی ایک جہت قائم نہیں کر سکتے، ایک نقاد ایک شاعر کو بہت زیادہ اچھا کہتا ہے، دوسرا اسی کو بہت برا کہتا ہے۔ آپ جتنے بھی تنقیدی مضامین کے مجموعے دیکھیں گے سب میں تضادات جگہ جگہ بکھرے ہوں گے۔ لیکن تحقیق میں یہ ممکن نہیں ہے۔ تحقیق میں آپ کو حق کی تلاش ہے اور آپ کو حق ہی پر پہنچنا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آپ حق سے ذرا کم رہ گئے ہوں۔ حرف آخر کہنا مشکل ہوتا ہے لیکن ایک جہت تو ہے، ایک منزل تو ہے ہمارے سامنے۔ محقق کو کبھی مفروضوں پر انحصار نہیں کرنا چاہئے۔ جو اس کے علم میں آتا ہے اور اس کی صداقت کا اسے یقین ہو گیا ہے وہی اسے کہنا چاہئے۔ اپنے پاس سے کچھ اضافہ نہیں کرنا چاہئے۔

افتخار:- گویا تحقیق نامعلوم سے معلوم تک کا سفر ہے۔

رضا:- سفر ہے، باقاعدہ سفر ہے۔ پہلے معلومات تک پہنچنا ہے اور اس کے بعد حق پالینا ہے۔

افتخار:- تو وہ عرصہ جو خاموشی کی نذر ہوا شاعری کے لئے اور تحقیق کام آپ نے کیا تو کیا شاعری

بالکل نہیں کی۔

رضا:۔ جی نہیں! ایسا نہیں ہے، اس دوران میں نے رباعیاں لکھیں، سیکڑوں رباعیاں، ان میں بیشتر شعاعِ جاوید میں شامل ہیں اس سے مجھے رباعی گو کہنے لگے۔ مجھے یقین تو تھا ہی کہ میں نے اچھی رباعیاں کہی ہیں لیکن لوگوں نے بھی مانا یہ خوشی کی بات ہے، رباعی ایک مشکل فن ہے اس لئے کوئی اس سے کھلواڑ نہیں کرتا۔

افتخار:۔ آپ کا ابتدائی تحقیقی کام کس نوعیت کا تھا اور کہاں سے یہ اندازہ ہوا کہ آپ ایک اچھے اور معتبر محقق بھی بن سکتے ہیں۔

رضا:۔ آپ نے ڈاکٹر صفدر آہ کا نام سنا ہوگا مرحوم بے حد ذہین آدمی تھے لیکن قلم کی وجہ سے وہ موجودہ تحقیق کی معیاری سطح سے بہت پیچھے رہ گئے تھے ان کو غرہ یہ تھا کہ وہ اب بھی زبردست محقق ہیں اور ان کی تحقیق پر کوئی حرف گیری نہیں کرسکتا۔ انھوں نے ایک کتاب لکھی تھی "میر اور میریات" اس کا مسودہ علوی بک ڈپو کے یہاں پڑا تھا۔ ایک دن میں کسی کام سے وہاں گیا ڈاکٹر صفدر آہ بھی وہاں آگئے۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے دوسرے شعری مجموعے "شورش پنہاں" کا دیباچہ لکھا تھا ہم ایک دوسرے سے کبھی ملے نہیں تھے۔ کتابت شدہ صفحات انھوں نے میری طرف بڑھا دیے، میں نے سرسری طور پر دیکھتے ہوئے بھی کئی مقام انھیں بتا دیئے۔ ڈاکٹر صفدر آہ تو بھونچکے رہ گئے، کہنے لگے آپ کو قطعی معلوم ہے کہ یہ یوں نہیں ہے۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے اپنی یادداشت پر بھروسہ ہے اور وہ صحیح نکلے۔ انھوں نے کہا آپ تمام مسودہ دیکھ ڈالئے۔ میں "میر اور میریات" کے کتابت شدہ صفحات گھر لے آیا۔ اسے پورا دیکھ ڈالا اس کے آخر میں ترجمہ تھا۔ صفدر آہ صاحب نے میر کے کئی فارسی کلام ترجمہ کر کے کتاب کے آخر میں لگا دیے تھے۔ لیکن مترجم کی حیثیت سے وہ اپنا نام نہیں دینا چاہتے تھے کیونکہ انھیں نہ جانے کیوں اپنے فارسی ترجمے پر اعتماد نہیں تھا مسودے پر لکھا تھا کہ یہ ترجمہ ناشر کی طرف سے دیا جائے۔ اس ترجمے میں کہیں کہیں میرے خیال سے جو فرق تھا وہ میں نے ترمیم کر دیا۔ جب ڈاکٹر آہ میرے پاس آئے تو میں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب یہ ترجمہ اچھا ہے میرے خیال میں اسے آپ اپنے ہی نام سے شائع کرلیجئے۔ ناشر کا نام کیوں دیں، کہنے لگے "بہت اچھی بات ہے۔ ترجمہ تو میں نے ہی کیا ہے" چنانچہ وہ انہی کے نام سے شائع۔ اس پر انھوں نے کہا "تم تو تحقیق کے آدمی بھی ہو۔ تحقیقی کام کیوں نہیں کرتے۔ ایک موضوع زمانے سے

میرے ذہن میں چلا آرہا ہے "دلگیر" کا "دلگیر" پر کیوں نہیں لکھتے ؟" انھوں نے مجھے کچھ اشارے دیئے وہ یہ کہ وہ ہندو تھا اور ہندوؤں میں اس سے بڑا مرثیہ گو کوئی ہوا ہی نہیں اور یہ کہ مشہور ہے اس نے تبدیلِ مذہب کیا تھا، حالانکہ اس نے ایسا قطعی نہیں کیا تھا۔ اس مضمون سے مجھے تحقیق کا چسکا پڑا۔ اسی مضمون کے سلسلے میں ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ادیب سے چل گئی۔ چھ سات مضامین لکھے گئے۔ انھوں نے لکھے، میں نے لکھے، اکبر حیدری نے لکھے۔ اس طرح پورے طور پر میں تحقیق کے میدان میں کود پڑا۔

افتخار:۔ بحث اور الجھاوے کس بات پر تھے ؟

رضا:۔ یہی کہ "دلگیر" نے تبدیلِ مذہب کیا تھا کہ نہیں۔

افتخار:۔ محض اسی بات پر ؟

رضا:۔ جی ہاں! لیکن کس کو اندازہ تھا کہ میں اس زمانے کی سیکڑوں کتابیں پڑھ ڈالوں گا۔ لائبریری رکھنے کا شوق مجھے افریقہ ہی سے تھا وہاں انگریزی کتابیں زیادہ تھیں "دلگیر" کے موضوع پر میں نے جہاں جہاں سے بھی ممکن ہو سکا کتابیں منگوائیں لہٰذا حوالے کبھی نرم ثابت نہیں ہوئے۔ اس طرح سے تحقیق کے تہ خانے تک جا پہنچا۔ قاضی عبدالودود پہلے شخص ہیں جنھوں نے مجھے داد دی۔ ان کا کارڈ میرے پاس آیا کہ تمہیں یہ تحقیق کا چسکا کیسے لگ گیا ؟

افتخار:۔ کیا قاضی صاحب پہلے سے واقف تھے آپ سے ؟

رضا:۔ نہیں، انھوں نے میرے مضامین پڑھے تھے اور خط و کتابت میں پہل میں نے کی تھی۔

افتخار:۔ "چکبست" پر اتنا اہم اور مستند تحقیقی کام کرنے کا خیال آپ کو کیسے آیا ؟

رضا:۔ "چکبست" کو جب میں نے پڑھنا چاہا تو کوئی کتاب میرے پاس نہیں تھی، ڈھونڈی تو مجھے ملی نہیں۔ میں نے ڈاکٹر صفدر آہ سے دریافت کیا کہ آپ کے پاس چکبست کی کوئی کتاب ہے ؟ کہنے لگے نہیں۔ مگر چکبست پر کام کرنا چاہئے۔ اپنے بچپن میں مجھے یاد ہے میرے والد بہت سے اشعار گنگنایا کرتے تھے ان میں چکبست کے شعر بھی شامل رہا کرتے تھے۔ جیسے رامائن کے اشعار۔ میری عادت ہے کہ جب میں کسی کام کی ابتدا کرتا ہوں تو اسے درمیان میں نہیں چھوڑتا چنانچہ "چکبست" پر اتنا ضخیم کام کر ڈالا مگر دس سال لگے اور اس کا صلہ بھی مجھے خوب ملا۔ وہ یہ کہ مہاراشٹرا اردو اکاڈمی نے جب "چکبست" پر سیمینار کیا تو باہر سے لوگ بلائے مگر مجھے مدعو نہیں کیا۔ لیکن اس کا ایک فائدہ بھی ہوا میں کسی مشاعرے، کانفرنس

میٹنگ وغیرہ میں آتا جاتا نہیں۔ وہاں جاتا تو مجھے بولنا تو آتا نہیں پھنس کر رہ جاتا اور
جو بھرم بنا ہوا ہے وہ بھی کھو بیٹھتا۔

افتخار:۔ تحقیق سے متعلق مزید سوالات کرنے سے پہلے شاعری پر ایک اور سوال میں آپ سے
کر رہا ہوں جو بہت دیر سے میرے ذہن میں گونج رہا ہے وہ یہ کہ غزل کی موجودگی میں شاعری
کی دیگر اصناف کی طرف آپ کیوں کر متوجہ ہوئے یعنی تخلیقی سطح پر اظہار کی صورت غزل
کے علاوہ نظم بھی کیوں بنی جبکہ آپ ایک کامیاب غزل گو بھی ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ
زود گو بھی واقع ہوئے ہیں۔

رضا:۔ غزل آسان صنفِ سخن ہے۔ اسے سمجھنا بھی آسان ہے اور کہنا بھی آسان ہے۔ لیکن اس
کے لیے مشقِ سخن بے حد ضروری ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی اس کا اختصار ہے یعنی
تھوڑے سے لفظوں میں بہت کچھ کہہ جانا۔ میں مختصر بات کہنا پسند کرتا ہوں جبکہ نظم میں
طوالت سے کام لینا پڑتا ہے۔ نظمیں میں نے کہی ہیں اور بہت کہی ہیں۔ حتےٰ کہ کچھ لوگ
مجھے نظم کا شاعر کہتے ہیں۔ غزل کی طرف میرا میلان اب اس لیے زیادہ ہے کہ جب میرے
پاس تحقیقی کاموں سے کچھ وقت بچتا ہے اور میں کچھ کہنا چاہتا ہوں تو غزل میں ایک ہی
شعر کہنے کے بعد میں دوسری طرف مائل ہو سکتا ہوں لیکن نظم کے لیے زیادہ وقت چاہیے
اسے پورا کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہاں یہ ہے کہ صرف ایک شعر کہہ کر مطمئن ہو گئے کہ کل پھر کہہ
لیں گے۔ میں زود گو ہوں یہ صحیح ہے، میں شعر بہت جلد کہہ لیتا ہوں۔

افتخار:۔ آپ کے شعری مجموعے اس بات کی گواہی دیتے ہیں۔

رضا:۔ لیکن میں اپنی زود گوئی کا غلط استعمال نہیں کرتا۔ میں زیادہ شعر کہتا نہیں۔

افتخار:۔ خیال کی اگر ترسیل ہو رہی ہے۔ جو آپ کہنا چاہتے ہیں وہ بھرپور انداز میں غزل کے اسلوب
میں بیان کیا جا رہا ہے لیکن اگر ایسا نہیں ہو پا رہا ہے چاہے آپ کتنے ہی زود گو کیوں
نہ ہوں۔ آپ کے اندر کی گھٹن کم نہیں ہو رہی ہے۔ شدت کم نہیں ہو رہی ہے تو پھر اس
کا وسیلۂ اظہار اسالیبِ نظم ہی میں ممکن ہو سکے گا۔ آپ نے کبھی ایسی کیفیت کو محسوس
کیا؟

رضا:۔ دیکھئے میں نے اس پر کبھی غور نہیں کیا تھا ـــــ لیکن چونکہ آپ نے بات میرے منہ میں
ڈالی ہے تو اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ بات ہو سکتی ہے۔ کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ ایک

خیال آجاتا ہے تو اس کے اوپر کافی کچھ (BUILD) کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بغیر وضاحت نہیں ہو پاتی۔ وہ ایک شعر میں نہیں سماتا۔ ایسی صورت میں نظم کہنا ضروری ہو جاتا ہے۔ لیکن میں بہت زیادہ طویل نظمیں کہنا پسند نہیں کرتا میں سمجھتا ہوں کہ کہنے والا بھی اور قاری دونوں طویل نظم سے اوب جاتے ہیں۔

افتخار:۔ آپ کے یہاں شاعری میں جو ہیئتی تجربے ملتے ہیں وہ آپ کی عروض پر دسترس کے سبب ہیں یا پھر یہ کہ آپ مزاجاً تجربہ پسند ہیں ؟

رضا:۔ میرے مزاج میں شروع میں تو داغ کی شاعری تھی جو جوش صاحب قبلہ کی وجہ سے مجھ میں آئی۔ زمانے کا رجحان بھی ۳۶-۱۹۳۵ء تک یہی تھا۔ پھر میں مشرقی افریقہ چلا گیا اس لئے کچھ زیادہ تجربات میں نے اس سے پہلے نہیں کئے لیکن افریقہ میں رہ کر تجربات کئے۔ ایک چیز میری پسندیدہ یہ ہے کہ میں ارکان سے باہر ہو کر کچھ کہنا نہیں چاہتا یعنی نثر مجھے پسند نہیں پھر بھی شاعری میں میں نے ارکان کی کمی بیشی تو کی ہے مثلاً ایک مصرع میں پانچ رکن ہیں تو دوسرے میں دو یا تین رکن کر دیئے لیکن میں اسے غزل میں جائز نہیں سمجھتا اور یہ پسندیدہ بھی نہیں ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ زیادہ عرصہ رہنے والی بھی نہیں ہے۔

افتخار:۔ آپ کا اشارہ آزاد غزل کی طرف ہے۔

رضا:۔ جی ہاں! لیکن میرے لیے آزاد غزل کہنے میں اور عام غزل کا جو اسلوب ہے اس میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مجھے کوئی دقت تو نہیں ہو سکتی لیکن میں نے آزاد غزل صرف اسی لئے نہیں کہی کہ میرے نزدیک اس سے کوئی فائدہ نہیں ہے اس کی عمر بھی کم ہی ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ رجحانات کتنی جلد جلد بدل رہے ہیں۔ ہمارے ہندوستان میں چونکہ شاعر کوئی بڑا کام نہیں کر پاتے اس لئے بہت جلد محقق اور نقاد بن جاتے ہیں، کوئی ذرا سی بات کہتے ہیں تو اس کا سہرا اپنے سر باندھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ تحقیق میں بھی یہی دیکھ رہا ہوں۔" یہ میری دریافت ہے" "یہ سب سے پہلے میں نے کہا ہے" اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ہم مطالعہ نہیں کرتے ہمارے پاس علم نہیں رہا میں غالب کے مشہور شاگرد اسمٰعیل میرٹھی کا مطالعہ کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ غیر مقفا نظمیں ان کے یہاں ملتی ہیں اور غالب کے زمانے میں کوئی اس کا تصور بھی نہیں

کرسکتا تھا۔ لوگوں نے بہت پہلے ہی کئی طریقے سے سوچا ہوا ہے۔ اس لئے بہت جلد دعویٰ نہیں کردینا چاہئے کہ میں نے کیا ہے یہ میں نے کیا ہے۔ ہم سے پہلے بھی لوگ بہت کچھ کر گئے ہیں۔ سخت چھان پھٹک کی ضرورت ہے۔ آپ نے دیکھا کہ میں نے جو تحقیقی کام کئے ہیں انھیں کوئی چھو نہیں سکا پھر بھی میں نے دعویٰ نہیں کیا کہ کوئی نہیں کرسکتا جو میں نے کیا ہے۔ میں نے جہاں جو کچھ لکھا ہے وہ اس طرح لکھا ہے کہ یہ چیز شاید اردو میں پہلے نہیں تھی۔ میں نے لفظ شاید ضرور کہا ہے۔

افتخار: ایک عام خیال یہ ہے کہ تحقیق نہایت ہی خشک موضوع ہے اور صرف پڑھے لکھے لوگوں ہی کے لئے ہے۔ یہ عام قاری کے بس کا روگ نہیں۔

رضا: یہ قطعی خشک چیز نہیں ہے۔ جسے دلچسپی نہیں اس کے لئے خشک ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب کی تحقیق نے دراصل یہ ہوا دی ہے۔ قاضی صاحب چند ہی لفظوں میں بہت کچھ کہہ دینا چاہتے ہیں۔ اس لئے انھوں نے علامتیں وغیرہ بنالیں اس طریقے سے یہ فن خشک تصوّر کیا جانے لگا۔ لیکن آپ نے دیکھا ہوگا کہ میری تحقیق میں یہ خشکی نہیں ہے۔ ہے بھی تو بہت کم۔ اگرچہ مفروضے اور انشا پردازی تحقیق کے لئے قاتل ہیں پھر بھی میری کوشش رہتی ہے کہ اسے اچھے اسلوب میں بیان کردیا جائے اسے گورکھ دھندا نہ بنایا جائے۔ معمہ نہ بنایا جائے۔

افتخار: غالب پر سب سے بڑا ذخیرہ آپ کے پاس ہے گویا آپ کو اس کا اندازہ ہے کہ پوری دنیا میں غالب پر کہاں اور کس نوعیت کا اچھا یا برا کام ہوا ہے یا ہو رہا ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ ان سب کی روشنی میں اب غالب پر کس طرح کے تحقیقی و تنقیدی کام کی ضرورت ہے جس پر ہند و پاک میں غور کیا جانا چاہئے۔

رضا: مجھے تو افتخار! اس بات کی داد دینا پڑتی ہے کہ تم اس سوال پر آئے۔ تمہارا سوال میرا سوچا سمجھا ہوا موضوع ہے جس پر میں اپنی باقی تمام عمر صرف کرنا چاہتا ہوں۔ ایک پروجیکٹ جس کا میں خاکہ بنا چکا ہوں میرے سامنے ہے میں اسے بیس جلدوں میں شائع کروں گا اور اس کا تعلق غالب سے ہے۔ اب لوگ کہیں گے کہ نہ جانے یہ کیا کرے گا لیکن گیتا رضا نے تو بہت کچھ کر دکھایا ہے اور یہ پروجیکٹ بھی کر گذروں گا۔ ڈھنڈورچی لوگ پھر شرمندہ ہو جائیں گے کہ رضا نے یہ بھی کر ڈالا۔ ہو سکتا ہے یہ بھی کہہ دیں کہ رضا کو کسی نے کر کے دیا ہے۔

افتخار:۔ بیس جلدوں میں آپ جو کچھ دینا چاہتے ہیں اگر اس کی اجمالی تفصیل دیں تو اس سے موضوع کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے گا۔

رضا:۔ میں تفصیل یوں نہیں دینا چاہتا کہ لوگ اگر اس بات کو جان لیں گے تو ایک آدھ کتاب اس موضوع پر لکھ ڈالیں گے اور اتنے بڑے موضوع کا بیڑا غرق کر دیں گے اور دعوے کریں گے کہ سب سے پہلے ہم نے یہ موضوع لیا تھا، اس پر ہمارا کام پہلے سے موجود ہے۔ کہاں ایک موضوع پر میں پندرہ سال لگانا چاہتا ہوں اور کہاں کوئی پندرہ دن میں ایک گھٹیا سی کتاب پیش کر دے گا۔

افتخار:۔ عموماً ایسا ہوتا ہی ہے۔ لوگوں کے پاس سوچنے سمجھنے کے لئے دماغ تو ہوتا نہیں، یا تو مکھی پر مکھی مارنا یا پھر ادھر ادھر سے آنڈ بنڈ اڑا کر اسے نہایت ہی بھونڈے انداز میں پیش کرنا۔ اس سے آگے تو سوچ بھی نہیں سکتے۔ بہر حال! میں قدرے وضاحت چاہتا ہوں کہ اب غالب پر کس نہج سے کام ہونا چاہئے۔

رضا:۔ غالب کی تفہیم ابھی تک کم ہے۔ غالب پر ایک بہت بڑا کام جو ابھی تک نہیں ہوا ہے غالباً یہ ہے، اب پھر وہی بات کہ مجھے بتانا پڑے گا — آپ مصر ہیں تو ایک جزو بتا ہی دیتا ہوں اور وہ یہ کہ غالب کے معاصرین میں دوسری زبانوں کے شعرا کیا گزرے ہیں۔ ان کا تقابلی مطالعہ غالب کے ساتھ۔ غالب اگر بہت بڑا شاعر ہے اردو کا تو ہم ایسا دکھائیں گے یا دیکھیں گے کہ دوسرے شعراء کے سامنے کیا قدر و قیمت تھی غالب کی۔

افتخار:۔ یعنی غالب کے عہد میں ملکی اور غیر ملکی زبانوں کے شعرا کس طرح کی شاعری کر رہے تھے۔

رضا:۔ بالکل یہی اس میں بے حد محنت ہو گی یہ کام معمولی نہیں۔ مگر یہ تو محض ایک حصہ ہے اور بہت کچھ بھی ہو گا۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ میرے بتانے کے بعد کوئی نہ کوئی اسے کر دے گا حالانکہ ہو گا کچھ بھی نہیں۔ محنت کون کرے گا۔

افتخار:۔ کیا ایک محقق کا کام اتنا ہی ہے کہ وہ صرف خام مواد پیش کر دے اور نتیجہ قاری پر چھوڑ دے؟

رضا:۔ نہیں! غلط۔ محقق کو نتیجہ بھی اخذ کرنا چاہئے۔ دیکھئے محقق اور مورخ میں بہت کم فرق ہے۔ دونوں کم و بیش ایک ہی طرح کا کام کرتے ہیں۔ مورخ وہی مستند سمجھا جاتا ہے جو نتیجہ خود اخذ کرے۔ میں نے کلیات چکبست ایڈٹ کی۔ ایڈیٹنگ تو اپنی جگہ پر رہی اس پر

۸۵ صفحات کا مقدمہ لکھا۔ شاعر کا کلام تو اپنی جگہ رہ گیا کلام کی ترتیب و تدوین کے ساتھ ساتھ میں کیا کہتا ہوں میں کیا سمجھتا ہوں اس کا بیان بھی ہونا چاہئے۔ چکبست کا ایک پرانا شعر ہے۔

غم نہیں مجھ کو یہاں دین کی بربادی کا
بت سلامت رہے انسان کی آزادی کا

یہ شعر چکبست نے ۱۹۱۷ء میں کہا تھا جبکہ ترقی پسند کانفرنس بہت بعد میں ہوئی تھی۔ یعنی بیس سال قبل چکبست یہ شعر کہہ چکے تھے۔ آپ دیکھئے کہ "آزادی کا بت" "انسان کا بت" یہ ترکیب کس قدر چلی لیکن کسی نے اس کی دریافت چکبست کی جھولی میں نہیں ڈالی۔ اردو میں سب سے پہلے یہ ترکیب وہی لائے اس طریقے سے کوئی بھی شاعر کا مطالعہ نہیں کرتا لوگوں نے کہا کہ چکبست تو آتش و غالب کے مقلد تھے۔ میں نے پورا باب اس پر لکھا ہے کہ وہ کہیں بھی مقلد نہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کچھ اپنے طور پر بھی تو کہنا چاہئے۔

افتخار:۔ ہماری دانش گاہوں میں جس طرح کا تحقیقی کام ہو رہا ہے اور جس طرح کے موضوعات پر ہو رہا ہے۔ اس کے بارے میں آپ کی رائے قدرے تفصیل کے ساتھ جاننا چاہوں گا کیوں کہ آپ خود ایک بڑے محقق ہیں اور آپ کی ذاتی لائبریری بھی ہے۔

رضا:۔ جب راہی قریشی صاحب نے مجھے موضوع بنایا پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے تو وہ میرے پاس تشریف لائے۔ میں تو انھیں جانتا بھی نہیں تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ نے مجھے کیوں منتخب کیا؟ انھوں نے کہا کہ میں نے آپ کی کتابیں پڑھی ہیں اور اسی سے میں نے آپ پر تحقیقی کام کرنے کا ارادہ کیا اور کہ یہ بات میں نے آدھی رات کے وقت طے کی تھی گویا مجھے کشف ہوا تھا۔ میں نے کہا کہ اچھی بات ہے، لیکن آپ زندہ شخصیتوں پر لکھیں گے تو اس میں تحقیق کا کام کیا رہ گیا۔ انھوں نے کہا کہ جو آپ کی زندگی میں لکھ دیا جائے گا اس سے مستند اور کیا ہوگا یہ بھی اپنی جگہ ایک بات ہے اور میں مانتا ہوں اس بات کو۔ لیکن راہی صاحب نے کام بھی اچھا کیا ہے۔ میں نے دیکھا ہے۔ مجھے چاہے لاکھ اختلاف ہو لیکن کام کرنے کا ڈھنگ اور طریقہ اچھا ہے۔ وہ مجھ پر نہ لکھتے کسی اور پر لکھتے تب بھی تعریف ہی کرتا۔ اس طرح سے دانش گاہوں میں بعض کام اچھے بھی ہو رہے ہیں۔ دانش گاہوں کے گائڈس اچھے ہیں تو اچھا کام کرا سکتے ہیں۔ عام طور سے گائڈس خود موضوع سے کماحقہ واقف نہیں ہوتے۔ زرینہ ثانی نے سیماب اکبرآبادی

پر کام کیا تھا۔ زرینہ مجھ سے اصلاح لیتی تھی مجھے معلوم ہے کہ وہ بہت بھٹکی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ "زرینہ تم کام تو کر لوگی مگر تم سے موضوع سنبھالے نہیں سنبھلے گا۔" میں نے مرحومہ کو بتایا کہ ـــــ سیماب ایک بڑا موضوع ہے اس کے لئے حرف بہ حرف مطالعہ ضروری ہے۔ برسوں مجھے سیماب سے ایک قسم کا تعصب سا رہا کیونکہ داغ سے تلمذ کے سلسلے میں بہت گڑبڑ ہوئی تھی۔ لیکن اسی ہنگامے کی ایک بات ہمیشہ میرے ذہن میں رہی۔ جوش ملسیانی صاحب سے اس مسئلے پر جب رائے مانگی گئی تھی تو انھوں نے لکھا تھا کہ "ہم نے کبھی سنا تو نہیں کہ سیماب داغ کے شاگرد ہیں لیکن اگر وہ کہتے ہیں کہ ہم داغ کے شاگرد ہیں اور اگر ایک اچھا شاعر ہمارے استاد کا شاگرد ہونا چاہتا ہے تو ہمیں اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" اب "اچھا شاعر"۔ جوش صاحب نے کہا تو یہ بات ہمیشہ میرے ذہن میں رہی کیوں کہ جوش صاحب کسی کو داد وا د نہیں دیتے تھے۔ بہت کم دیتے تھے لیکن جب انھوں نے اپنے ہم عصر کو اچھا شاعر کہہ دیا تو اس میں ضرور کوئی بات ہوگی۔ حالانکہ ہم عصر سے عام طور پر حسد ہوتا ہے۔ دو سال قبل . . . اب پھر یہ بات وہی آجائے گی کہ تم سیماب کے پوتے ہو اور میں تمھیں خوش کرنے کے لئے کہہ رہا ہوں۔

افتخار:۔ جی! آپ اپنی بات مکمل کر لیں۔ ویسے سیماب کو جس طرح نظر انداز کیا گیا ہے وہ اردو شعر و ادب کا بہت بڑا المیہ ہے۔ بہر حال مجھے اس سے کوئی بحث نہیں ہے۔

رضا:۔ میں کوئی ایسی ویسی بات کہنے والا نہیں میں محقق ہوں اور دیانتداری سے بات کہتا ہوں میں نے جب سیماب کا آخری شعری مجموعہ "لوح محفوظ" پڑھا۔ ایک تو لوح محفوظ بذات خود بہت اہم لفظ ہے۔ اسلامیات میں اس کا بڑا ذکر ہے۔ میں نے جب کتاب کا مطالعہ کیا تو اعجاز سیمابی سے کہا کہ بھائی یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ تم سیماب کو کتنا سمجھتے ہو لیکن یہ سیماب کچھ تھے آدمی الگ۔ یہ جو آخری مجموعہ ان کا آیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے اساتذہ سے الگ تھے۔ زرینہ جن دنوں تحقیقی کام کر رہی تھیں، لوحِ محفوظ شائع نہیں ہوئی تھی ورنہ میں ان سے کہتا کہ اپنا پہلا کام ردی کی ٹوکری میں ڈالو اور از سر نو سے کرو۔ زرینہ بہت اچھی خاتون تھی۔

افتخار:۔ غالب کے سلسلے میں ایک سوال اور میرے ذہن میں رینگ آیا ہے۔ جس کا تعلق تو دریافت بیاضوں سے ہے۔ مولانا عبد الباری آسی سے لے کر رامپور نسخہ، بھوپال نسخہ اور اس طرح

نہ جانے کتنے نسخے بن گئے اور غالب کا کلام الجھتا چلا گیا۔ سوال یہ ہے کہ غالب کا پہلا دیوان جوان کی زندگی ہی میں شائع ہو گیا تھا لیکن پھر بعد میں اب تک کلام غالب میں طرح طرح کے تصرفات ہوئے ہیں۔ شعر کی شکلیں بدلی ہیں اور نہ جانے کیا کیا کچھ ہو گیا ہے اس سلسلے میں آپ کے خیالات جاننا چاہتا ہوں۔

رضا:۔ جو تصرف ہے وہ تو تصرف ہی ہے۔ لیکن غالب کے عہد کے دیوان ہمیں ضرور مدنظر رکھنا چاہئیں۔ دیوان تو ایک ہی تھا لیکن اس کے پانچ ایڈیشن نکلے جس میں وہ اضافہ کرتے چلے گئے۔ اور چھٹا ایڈیشن وہ جو ذوق کے شاگرد ظہیر کا مرتبہ ہے" نگارستان سخن " جس میں انھوں نے غالب، مومن، ذوق تینوں کا انتخاب دیا تھا۔ غالب کے کلام کا جو انتخاب اس میں ہے گویا تمام متداول دیوان اس میں آگیا ہے لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ اسے چھٹا ایڈیشن کہہ لینا چاہئے۔ ۱۸۶۲ء میں یہ شائع ہوا تھا اور کمیاب ہے لیکن میرے پاس ہے۔ اس کی اشاعت کے سات سال بعد تک غالب زندہ رہے۔ یہ ۶ ایڈیشن مستند مانے جائیں گے کیوں کہ یہ غالب کی حیات میں شائع ہوئے تھے۔ اب رہا سوال مخطوطات کا تو یہ الجھایا ہی کرتے ہیں۔ ان میں وہ کلام جو سابقہ مستند ایڈیشنوں کے مطابق ہے وہ تو ہے ہی۔ اس کے علاوہ وہ کلام جو غالب کے نام سے ان کے عہد میں مختلف تذکروں میں آچکا ہے وہ بھی صحیح ہے مگر باقی اشعار کی جانچ پڑتال ضروری ہے۔ اب رہا سوال اس مخطوطے کا جو غالب کے ہاتھ تحریر کردہ کہا جاتا ہے تو ان کے بارے میں فی الحال میں کچھ نہیں کہہ سکتا میں نے اس کا غائر مطالعہ نہیں کیا۔ کیوں کہ میں دوسرے کاموں میں الجھا رہا ہوں جن لوگوں کا ان مخطوطات میں بہت زیادہ عمل دخل ہے وہ تو لکھ ہی رہے ہیں۔ اس کا ایک اچھا جواب ڈاکٹر گیان چند نے بھی دیا ہے وہ پڑھنا چاہئے اس میں انھوں نے یہ مانا ہے کہ یہ غالب کا لکھا ہوا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب غالب نے اپنا سارا کلام چھانٹ ہی لیا تھا اور اپنی زندگی میں کہہ دیا تھا کہ باقی جو کچھ ہے وہ اب میرا نہیں ہے تو پھر اسے غالب کے نام سے کیوں منسوب کرنا لیکن غالب کے ذہن کو سمجھنے کے لئے اس کلام کو پڑھنا اور سمجھنا ضرور چاہئے۔

افتخار:۔ آپ کے اپنے تحقیق اصول و ضابطے ہوں گے یعنی آپ کس طرح سے کام کرتے ہیں یا ایک محقق کو کس طرح کام کرنا چاہئے۔

رضا:۔ اب پتہ نہیں، ویسے میں کسی کی تقلید تو نہیں کر رہا ہوں . . .

افتخار:۔ یہاں تقلید کا سوال نہیں ہے ۔ ہوتا یہ ہے کہ شروع شروع میں بہت ممکن ہے کہ بنے بنائے ضابطوں اور اصولوں پر کام کرنا پڑتا ہو لیکن پھر رفتہ رفتہ راستے خود بنتے چلے جاتے ہیں

رضا:۔ دیکھئے! میں ایک ساتھ کئی کام شروع رکھتا ہوں اور ان کی فائلیں بنا لیتا ہوں۔ جیسا کہ میں نے کہا تھا میرا حافظہ اچھا ہے لہٰذا مطالعے کے دوران مجھے اندازہ ہوتا رہتا ہے کہ کس کا تعلق کس موضوع سے ہے۔ میں یہ سب نوٹ کرتا جاتا ہوں اور متعلقہ فائل میں ڈال لیتا ہوں۔ اس طرح سے میرے پاس بہت سی فائلیں تیار ہیں اور بنتی رہتی ہیں ابھی چند ہی روز پہلے میں نے ایک کام ختم کیا تو سوچا کہ اب عمر ہو گئی ہے اور یہ سب یادداشتیں میرے کام نہیں آسکیں گی لہٰذا انھیں شائع کر دینا چاہئے اس پر ایک نوٹ لکھ کر میں نے اس کا نام رکھ دیا ہے "غالبیات ۔ چند شخصی اور غیر شخصی حوالے" اس میں میں نے اپنی طرف سے ایک لفظ بھی نہیں لکھا ہے۔ صرف یادداشتیں ہیں جیسی جہاں دیکھیں انھیں حوالوں کے ساتھ درج کر دیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب شائع کر دوں گا۔ میری ایک چھوٹی سی کتاب اور شائع ہو رہی ہے۔ رسالہ "شمعِ عرفاں" جو تصوف کا لغت ہے اس میں میں نے اردو کے مترادفات اور حاشئے اضافہ کر دیئے ہیں۔ ایڈٹ کر کے شائع کر رہا ہوں۔ شاید مفید ثابت ہو۔ غالبیات میں میں نے جو یادداشتیں درج کی ہیں وہ ۱۳۶ فل اسکیپ کاغذ پر جمع ہوئی ہیں۔ مثلاً امام بخش صہبائی کے بارے میں یادداشتیں ہیں جہاں سے جو متعلقہ مواد ملا نوٹ کرتا چلا گیا۔ غالب کے خطوط سے مرتب شدہ یادداشتیں یہ شاید میرے کام نہ آسکیں تو غالبیات کے شائقین کے لئے ہی سہی۔ اس طرح سے میں نے بہت سا کام کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے پاس کئی ہزار صفحات یادداشتوں ہی پر مشتمل ہوں گے۔

افتخار:۔ اس تفصیل سے جہاں یہ اندازہ ہوا کہ آپ کس طرح کام کرتے ہیں وہیں یہ بھی اندازہ ہوا کہ آپ نے کیا کچھ کیا ہے اور کر رہے ہیں اس طرح طلباء اور نئے محققین کے لئے یہ سود مند ہوگا۔ یہ تو آپ نے کام کی نوعیت کے بارے میں بتایا ہے لیکن میں اس ضمن میں مزید وضاحت چاہوں گا کہ موضوع اور اس کے مطالعے کے لئے اور کیا کچھ ہونا چاہئے۔

رضا:۔ دیکھئے میں شام گئے تک مطالعہ کرتا ہوں اس میں رات بھی ہو جاتی ہے اس دوران میں

لکھنے کا کام نہیں کرتا۔ اب میرا مطالعہ کم ہوگیا ہے کیوں کہ آنکھیں کمزور ہو گئی ہیں دن میں صبح ساڑھے نو بجے سے ایک بجے تک لکھتا ہوں اور دوپہر بعد یعنی پانچ بجے تک میں آفس میں بزنس کرتا ہوں لیکن جب کوئی موضوع زیر تحقیق ہو تو پھر یہ ہوتا ہے کہ پوری پوری رات گذر جاتی ہے اور کام ہوتا رہتا ہے۔ اس بڑھاپے میں بھی میں رات رات بھر کتابوں کی الماریاں کھنگالتا رہتا ہوں کام تو بغیر محنت کے ہوتا نہیں مجھے بے پناہ مسرت ملا ہوتی ہے جب میں لکھتا ہوں کہ یہ میں نے کہاں سے لیا ہے۔ میں کبھی کسی کا کام اپنے نام بغیر حوالے کے شائع نہیں کرتا اور اگر کہیں میری کسی کتاب میں بغیر حوالے کے ایسا مواد آگیا ہے تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ میں نے اپنے طور پر دریافت کیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے مجھ سے پہلے کسی اور نے کیا ہو اور میرے علم میں نہ آیا ہو۔ میری پوری پوری کوشش یہی رہتی ہے کہ اصل ماخذ کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس کی اصل شکل دیکھی جائے۔ لوگ مجھے جو نقل بھیجتے ہیں اس میں غلطیوں کا احتمال رہتا ہے۔ غرض یہ کہ میں اپنے موضوع پر بہت محنت کرتا ہوں ہندوستان یا پاکستان میں کہیں کوئی چیز نظر آجائے تو اس کی پوری چھان پھٹک کرتا ہوں۔ اب آپ 'شاعر' والے تو ہمیں کچھ دیتے ہی نہیں کوئی معاوضہ وغیرہ (قہقہہ)

افتخار:۔ آپ نے بات تو صحیح کہی کہ معاوضہ نہیں دیتے۔ لیکن ہمیں خود معاوضہ نہیں ملتا جو دوسروں کو دیں۔ تیسری نسل تک آتے آتے کیا معاوضہ ہمیں ملا ہے۔ یہاں ایک سوال اس گفتگو سے یہ ابھرتا ہے کہ عصری اردو ادب کی تخلیق کا سارا کام ہندوستان بھر میں پھیلی ہوئی اردو اکاڈمیوں نے سنبھال لیا ہے۔ چنانچہ غیر معیاری ادب بلا مقصد اور زیادہ تخلیق ہو رہا ہے تحقیقی کاموں کے لئے بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔

رضا:۔ کچھ اچھا کام بھی ہو رہا ہے اور بے کار سا بھی ہو رہا ہے۔ دونوں طرح کے کام ہو رہے ہیں دیکھئے میرا تاثر اس کے بارے میں یہ ہے کہ میں پچھلے بارہ تیرہ سال میں ہندوستان کے جتنے بھی اردو کے دانشوروں سے ملا ہوں ان میں بہت ہی کم ایسے ہیں جنھیں میں نے اردو کے ساتھ روٹی کے لئے وابستہ نہیں دیکھا مجموعی طور پر سب ہی اردو سے فائدہ اٹھا رہے ہیں کوشش یہی کی جا رہی ہے کہ اردو سے کسی نہ کسی طرح کا مالی فائدہ حاصل کیا جائے۔ میں نے کوئی ایسا نہیں دیکھا جسے اردو سے واقعی پیار ہو، محبت ہو۔ ہوں گے ایسے لوگ مگر خال خال اور اپنے کام کی وجہ سے گوشہ نشیں۔ ایک بار جوش میں آکر قاضی عبدالودود صاحب

نے کہہ دیا تھا کہ ہندوستان میں دو ہی لوگ ہیں جو اردو سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ ایک میں اور دوسرے گپتا رضا۔

افتخار:۔ یہ بات تو ہم اپنے لئے بھی کہہ سکتے ہیں۔

رضا:۔ لیکن آپ کا تعلق رسالے سے ہے۔ آپ کی روزی اسی میں ہے۔

افتخار:۔ تو کیا ہوا، ہم کام تو دوسروں سے بہتر کر رہے ہیں۔ اکادمیوں اور اداروں سے زیادہ ٹھوس اور افادی کام کر رہے ہیں۔

رضا:۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ پھل کافی نہیں مل رہا ہے۔ جو مل رہا ہے ناکافی ہے۔

افتخار:۔ کچھ بھی نہیں مل رہا ہے تو کافی اور ناکافی کیا ہے۔ ایک ادبی رسالہ جو مسلسل ۵۵ برسوں سے شائع ہو رہا ہے اور جس نے اردو زبان و ادب کی ایک مستند ادبی تاریخ بنائی ہے جس کی کوئی دوسری مثال نہیں۔ اس کے لئے ہونا کیا چاہئے یہ آج تک کسی نے بھی نہیں سوچا۔

رضا:۔ صحیح معنوں میں کوئی اردو سے دلچسپی ہی نہیں لے رہا ہے۔ ایسا ہوتا تو شاید آپ کو شکایت بھی نہ ہوتی۔ کوئی سکریٹری ہو، جنرل سکریٹری ہو، صدر ہو یا کوئی ہو۔ اب مجھے انجمن ترقی اردو مہاراشٹر کا صدر بنایا ہے تو اب تک میری یہ سمجھ میں نہیں آسکا ہے کہ میرا اس میں کیا کام ہوگا۔ میں کیا کروں گا؟ وہ کام جو مجھ سے لینا چاہتے ہیں اس سے کہیں زیادہ کام تو میں کر ہی رہا ہوں۔ مجھے اس طرح کے عہدوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے میں پروپیگنڈہ کا آدمی بھی نہیں ہوں۔ صرف کام کرنے کا عادی ہوں اور کام آپ کے سامنے ہے۔ اوپر والے نے عمر دی تو انشاءاللہ اور بہتر کام کروں گا۔

افتخار:۔ نقاد اور محقق کا ذہن ہر طرح کے تعصبات سے پاک ہونا چاہئے میرے خیال میں تو صرف یہ ایک مفروضہ ہی ہے؟

رضا:۔ مجھے تمہاری رائے سے سو فی صدی اتفاق ہے کہ محقق اور نقاد کو ہر طرح کے تعصبات سے پاک ہونا چاہئے لیکن مفاد اور حسد ایسا ہونے نہیں دیتے۔ میں نے دیکھا ہے کہ بڑے سے بڑے محقق کی جب کسی غلطی کی نشاندہی کی جاتی ہے تو وہ اسے خوشی سے قبول نہیں کرتا جبکہ ایسا ہونا چاہئے۔ مجھ پر کوئی ایسا حملہ تو نہیں ہوا، اگر ہوا بھی تو اپنی غلطی کو میں فوراً قبول کر لوں گا۔ تحقیق کسی کے گھر کی نہیں ہے۔ جو جتنا اچھا کرلے، یا جس کو جتنا اچھا مواد

مل جائے۔ اپنے نام سے چیزیں چھپوا لینا اور حوالے نہ دینا، اعتراف نہ کرنا۔ دوسروں کے تحقیقی کاموں کو نہ سراہنا یہی تو تعصبات ہیں۔ میں اگر فروگزاشتیں پیش بھی کرتا ہوں تو نہایت ہی ادب کے ساتھ۔ ایک محقق صاحب نے میرے ایک مضمون "بیاض رفعت" پر، جو شاعر ہی میں شائع ہوا تھا، اعتراض کیا۔ اس میں ایک جگہ لکھا تھا "نماز گذاری" انھوں نے کہا نماز گذارنا غلط ہے، نماز پڑھنا یا نماز ادا کرنا صحیح ہے میں نے کہا کہ میرا ایک مصرع ہے کہ

نمازِ عشق تو ہم ہر جگہ گذار چکے

میں نے یہ غزل قبلہ جوش صاحب کو دکھائی تھی اور انھوں نے اس میں کوئی خامی نہیں نکالی تھی اور جوش صاحب کے یہاں سے کلام اصلاح ہو کر آجائے تو ہم اسے مستند مانتے ہیں۔ ان محقق صاحب نے کہا "ہم جوش صاحب ہی کو نہیں مانتے۔" میں نے کہا "اچھی بات ہے نہ مانیے۔" لغت میں ہر چیز تو نہیں آجاتی، لغت میں جب نماز کرنا شامل ہے تو گذارنا کیوں غلط ہے۔ ہم 'نماز گذار' 'عبادت گذار' لکھتے ہی ہیں انھوں نے اسے فارسی کا لفظ بتایا میں نے کہا کہ پھر آپ "فرہنگ آصفیہ" میں "گذارنا" دیکھئے۔ گذارنا کے لئے لکھا ہے جیسے "نماز گذارنا" اب وہ کیا رہ گئے؟ مجھے ان کی یہ نکتہ چینی اچھی نہیں لگی۔ کیونکہ یہ علاقائی تعصب ہے اب پتہ نہیں اہل زبان کون لوگ ہیں۔؟

افتخار:۔ گویا یہاں علم یا تحقیق نہیں بلکہ ذہنی تعصب کام کر رہا تھا۔

رضا:۔ تعصب ہی نہیں بلکہ الزام دینے کی خواہش بھی۔ مجھ سے اگر کوئی ایسی ویسی بات کہہ دے تو میں جواب صفائی سے دیتا ہوں لیکن دل میں عداوت نہیں رکھتا۔ چکبست پر میں نے اتنا کام کیا لیکن مجھے کوئی انعام نہیں ملا۔ میں نے واویلا بھی نہیں کیا کیوں کہ میں نے اپنا کام انعام و صلے سے بلند ہو کر کیا تھا۔ ایک صاحب جو بہت بڑے محقق اور مصنف کہلاتے ہیں پاکستان گئے تو وہاں میرے بارے میں کہہ آئے کہ مجھے کوئی اور لکھ کر دیتا ہے اور میں اپنے نام سے شائع کروا دیتا ہوں۔ ان کے اس بات کے کئی گواہ تھے۔ جب میں نے ان سے پوچھا تو وہ مکر گئے۔ میں نے ایک خط شائع کرا دیا۔ میں نے کہا کہ اس کا جواب دے دیجئے آپ۔ پھر معافی اور صفائی کا خط آیا۔ میں نے تو کچھ نہیں کہا۔ کرتے رہتے ہیں لوگ اس طرح۔ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ سوال یہ ہے کہ ہم اردو کے اور گوشوں کی طرف توجہ کیوں نہیں کرتے۔ ہمارے پاس کیا وہی کچھ ہے جو پہلے ہو چکا ہے۔ میر کی طرف ہم اب متوجہ ہوئے

ہیں۔

افتخار:۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ذہنی تعصبات کا سلسلہ بہت دور تک پھیلا ہوا ہے جس سے زبان و ادب کو کافی نقصان پہنچ رہا ہے۔

رضا:۔ جی ہاں! یہ دیکھئے ناکہ نصف صدی پہلے کے جو اچھے شعرا اور اساتذہ تھے ان پر کیا ہو رہا ہے؟ متروکات کے لئے معمولی معمولی باتیں لے لیں اور رد کرتے چلے گئے۔ یہ نہیں دیکھا اور مطالعہ نہیں کیا کہ ان لوگوں نے مثنویاں لکھیں۔ تراجم کئے، تجربے کئے۔ کیا کچھ نہیں کیا۔ تاریخ نویسی پر تو کوئی کیا کام کرتا، فن تاریخ گوئی کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی اور اب یہ علوم مرتے جا رہے ہیں۔ ان کو تحقیقی موضوع بنانا چاہئے۔

افتخار:۔ آپ کو عروض پر کافی دسترس حاصل ہے۔ کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ عربی، فارسی عروضی نظام میں کوئی تشکیل جدید ہو سکتی ہے جبکہ آپ نے بھی ہیئتی تجربے کئے ہیں۔

رضا:۔ جوش صاحب قبلہ اپنے وقت کے بہت بڑے عروضی تھے، اسے لوگوں نے مانا ہے۔ ان سے جب میں نے پوچھا کہ یہ عروضی رعایتیں ہیں ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟ انھوں نے کہا کہ میں نے کبھی ان سے فائدہ نہیں اٹھایا کیوں کہ اس طرح مغائرت پیدا ہوتی ہے۔ آپ کہتے تھے کہ اگر کسی قسم کا عروض (جو کانوں پر گراں گزرے) ہم استعمال کرتے رہیں گے تو فصاحت سر پیٹتی رہ جائے گی۔ میں نے ان کے خطوط کا جو مجموعہ شائع کیا ہے "جوش بنام رضا" اس میں یہ خط شامل ہے۔ اپنے یہاں کئے جانے والے ہیئتی تجربوں میں بھی میں نے یہ بات دھیان میں رکھی ہے کہ کوئی مغائرت نہ ہو کسی قسم کی یعنی ایک سیدھا سیدھا عروض ہمارے سامنے رہے۔ اسی طرح قوافی بھی غنائی اور رکھنکتے ہوئے ہوں، مترنم بحریں ہوں غنائی اوزان ہوں کیوں کہ شاعری کا تعلق موسیقی سے بھی بہت ہے اسی لئے میں کہتا ہوں کہ نثری نظموں کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ زندہ نہیں رہ سکتیں، انھیں آپ حوالے کے طور پر بھی استعمال نہیں کر سکتے آپ مشاعرے میں کسی نثری نظم کا کوئی ٹکڑا یاد کر کے سنانا چاہیں تب بھی نہیں کر سکتے۔

افتخار:۔ یہی بات آزاد نظم کے لئے بھی کہی جا سکتی ہے جبکہ آزاد نظم بہ حیثیت ایک صنف کے بے حد مقبول رہی ہے۔

رضا:۔ نہیں یہ صنف مقبول نہیں ہوئی۔ البتہ وہ نظم مقبول ہے جن میں رکن برقرار رہوں۔

افتخار:۔ آپ نے اپنے کسی شعری مجموعے کے دیباچے میں یہ لکھا ہے کہ آپ جدید اردو شاعری کے مخالف نہیں تاہم سپاٹ نثری نظموں کے قائل نہیں۔ اس طرح آپ نثری نظموں کے تو قائل ہیں لیکن اس کے سپاٹ پن سے آپ کو اختلاف ہے۔

رضا:۔ زیادہ تر سپاٹ ہی ہوتی ہیں۔

افتخار:۔ زیادہ تر سپاٹ ہونے کے باوجود بھی اس ہیئتی تجربے سے انکار ممکن نہیں۔

رضا:۔ کبھی کبھی نثر بھی تو اپنی جگہ شاعری کر لیتی ہے۔

افتخار:۔ لیکن آپ نے لاشعوری طور پر نثری نظموں کا اعتراف کیا ہے۔

رضا:۔ دیکھئے (CREATIVE ART) میں فہم و ادراک کو جو چیز ثقیل لگے اس کی عمر زیادہ نہیں ہوتی۔ اس لئے افسانہ اور غزل نہیں مریں گے باقی صنفوں کے مقبول رہنے کی امید نہیں۔

افتخار:۔ ہند و پاک میں نثری نظمیں بہت زیادہ کہی جا رہی ہیں اور نئی نسل اس طرف متوجہ ہوئی ہے کہ اظہار کی شدت کو غزل یا دیگر اسالیب کے بجائے نثری نظم میں پوری طرح سمویا جا سکتا ہے۔

رضا:۔ جی ہاں! کہی جا رہی ہیں۔ آپ نے میرے جس دیباچے کا حوالہ دیا ہے اس میں میں نے یہ بھی لکھا ہے کہ آزاد نظموں میں ارکان کی سالمیت تک کو گوارا کرتا ہوں یعنی رکن اگر ہیں تو اس میں ایک ردھم رہتا ہے، پڑھنے میں دقت نہیں ہوتی۔ یہ ضرور ہے کہ آزاد نظموں میں تکرار نہیں آپاتی اس لئے تاثر بڑھ جاتا ہے لیکن آزاد غزل لکھنے میں کیا فائدہ ہے یہ مجھے بتائیں؟

افتخار:۔ گویا آپ آزاد غزل کو کوئی صنف یا ہیئتی تجربہ نہیں مانتے۔

رضا:۔ جی نہیں! اگر آپ کہیں کہ میں آزاد غزل نہیں کہہ سکتا تو یہ میرے لئے معمولی بات ہے۔ ایک آدھ رکن آگے پیچھے کر دینے میں کیا ہے۔ یہ مجھے بتائیے کہ عروض میں زحافات کیوں رکھے گئے ہیں؟ ان کی اجازت کیوں ہے؟ جہاں ہم نے دیکھا کہ عروض ہمارے آڑے آ رہا ہے ہم نے زحاف ایجاد کر لیا، اس سے آسانی ہو گئی۔ عروض تو ہمیں رعایتیں دیتا رہا ہے۔ آپ چاہیں تو اور رعایتیں بھی لے سکتے ہیں۔

افتخار:۔ میرے خیال میں آزاد غزل اسی عروضی رعایت ہی کا ایک نام ہے ویسے عروض کو آسان

کرنے کی ضرورت ہے۔

رضا:۔ ہو سکتا ہے۔

افتخار:۔ ترقی پسند تحریک اور جدیدیت ان دونوں نے اردو ادب پر جو اثر مرتب کئے ہیں اس کے تناظر میں آپ کا کیا خیال ہے؟

رضا:۔ ترقی پسند تحریک نے اردو ادب پر جو اثر ڈالے ہیں وہ تاریخ میں محفوظ رہیں گے، انھیں نکالا نہیں جا سکتا مجھے احتجاج ان کے ایک رویّے پر ہے کہ انھوں نے اساتذہ کو مار ڈالا کسی استاد کو اپنے مرتبے پر فائز نہیں رہنے دیا اور ان کی جگہ خود کو نمایاں کیا، ان کے دیوان اور دوسرے کام سب طاقچے پر رکھ دئے گئے۔ ان کی اہمیت نہیں مانی گئی بس اپنے آپ ہی کو منوانے کی کوشش کی۔ ان میں ذہانت تھی۔ پروپگنڈے کا بھی بڑا عنصر تھا ان سب کے باوجود ان کا کام باقی رہے گا۔ جدید شاعری کا کیا رجحان ہے؟ یہ کہاں جا رہے ہیں؟ کیا کر رہے ہیں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اس کی کوئی جہت مقرر نہیں ہوتی ہے۔ گذشتہ بیس برسوں میں کتنا کچھ ہوا ہے اور کتنا ختم بھی ہوا ہے، اب تو جدیدیت تھکی تھکی لگ رہی ہے اور روایت کی طرف پلٹ رہی ہے۔ جہاں تک غزل کا تعلق ہے اس میں زبان کے نئے رجحانات ہیں کئی نئے اسلوب ہیں، وہ تو آنے ہی چاہئیں اور آتے رہیں گے یہ اچھے بھی لگتے ہیں۔ باقی غزل اسی نہج پر چلے گی جو ہے۔

افتخار:۔ ہمارے بیشتر محقق شاعر بھی ہیں ان میں سے کچھ نے یا تو ابتدا میں شاعری کی یا پھر بعد میں کرنے لگے۔ نقاد حضرات کے لئے بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ مجموعی طور پر ان لوگوں کی شاعری پھیکے پن کا شکار رہی ہے۔ آپ کے یہاں بھی غزلوں میں کہیں کہیں اس طرح کے بوجھل پن کا احساس ہوتا ہے۔

رضا:۔ اس کا قصور تحقیق میں نہ ڈھونڈئے۔ میں حقیقت میں تو شاعر تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ میں ایک اچھا شاعر ہوں، معمولی شاعر نہیں ہوں۔ یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ جب میں اپنے مدمقابل شعراء کو دیکھتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں بھی کچھ شاعری نہیں بلکہ یہ کہ زبان اور شعری مزاج بھی اکثر کا مجھ سے کمزور ہے۔ تحقیق میرے یہاں بعد میں آئی لیکن شاعری کا رجحان مجھ میں مرا نہیں وہ اور بڑھ گیا۔ عشقیہ شاعری مجھے پسند نہیں ویسے میں جب چاہوں اس طرح کی شاعری کر سکتا ہوں۔ یہ صناعی ہے، لیکن طبعاً

میں اسے پسند نہیں کرتا۔ ایک غلط مفروضہ ہر ایک پر منطبق نہیں ہو سکتا۔ اگر دوسرے محقق یا نقاد اچھے شاعر نہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔

افتخار:۔ کہتے ہیں کہ شاعری الہام کا دوسرا نام ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

رضا:۔ پہلے تو آپ یہ سمجھئے کہ شاعر کے لئے زبردست مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ مطالعے کے بغیر شاعر کچھ نہیں کر سکتا۔ ایک بات بنالی گئی کہ شاعر الہامی ہوتا ہے یعنی جزو پیغمبری۔ مجھے اس سے زیادہ اتفاق نہیں۔ بے حد مشق و مزاولت شاعر کے لئے ضروری ہے۔ الہام تو اس کا وہاں تک ہے جہاں تک اس کا طبعی رجحان ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ شاعر کو الہام ہوتا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ غالب نے یا اقبال نے کوئی بھی کلام بغیر محنت کے کہا ہو۔ آپ کے دادا جان نے بھی نہیں کہا۔ یونہی تمام چیزیں کاغذ پر نہیں آگئیں۔ زبردست مطالعہ اور مربوط ذہن اس کے پیچھے کارفرما تھا۔ فوراً لکھنے کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ الہام ہو گیا۔

افتخار:۔ ہماری تنقید، تحقیق۔ ہمارا ادب، مفروضے، کلیے اور معیارات سب کے سب غالب اور اقبال سے شروع ہو کر انہی دونوں پر ختم ہو رہے ہیں اور ادب کا یہ سارا کاروبار پورے زور و شور کے ساتھ جاری ہے۔ تو کیا غالب اور اقبال کے آگے پیچھے اردو ادب و شاعری کچھ بھی نہیں ہے۔

رضا:۔ پچھلے دنوں میں نے کلیم الدین احمد کا ایک انٹرویو پڑھا تھا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ دقت کی بات یہ ہے اور افسوس ناک بھی کہ ہم کچھ بھی اقبال کے خلاف کہنا چاہیں تو لوگ واویلا کرتے ہیں اس لئے اقبال پر کھل کر بات نہیں ہو سکتی۔ اگر مداحی کریں تو ہمیں بڑا مانا جاتا ہے اور یہ حقیقت ہے۔ اب جو میں کوئی بات کہوں گا تو یہی حال میرا بھی ہو گا میرے بہت سے مخالفین پیدا ہو جائیں گے لیکن جو آدمی تحقیق کے میدان میں آجائے وہ مخالفت مول لے ہی بیٹھے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اب اقبال کی نظمیں، غزلیں آپ کو وہ لذت نہیں دیتیں جو آج سے پچیس تیس سال پہلے دیتی تھیں۔ اب اقبال ادب پر اتنا حاوی نہیں مگر ذہنوں پر حاوی ہے۔ اقبال کی تقلید اب نہ کوئی پاکستان میں کرتا ہے نہ ہندوستان میں۔ غالب اپنی جگہ پر اٹل ہے کیوں کہ اس نے اتنے بڑے ذہن کے باوجود اردو میں اتنا کم کہا کہ وہ ذہنوں میں گھس گیا ہے۔

افتخار:۔ غالب پر ہند و پاک میں اس قدر کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے کہ معمولی سے معمولی ذہن نے

بھی ان وسائل سے اسے قبول کرلیا ہے اور ایسا ہونا ضروری تھا۔ مجھے تو اب ایسا لگ رہا ہے کہ اقبالؔ اور غالبؔ کی شاعری تو پیچھے رہ گئی لیکن ان پر انشا پردازی کی دوڑ تیز تر ہے۔

رضا:۔ انشا پردازی تو ہو ہی رہی ہے۔ اب تلاش غالبؔ یا اقبالؔ کی نہیں ان کی اپنی ہو رہی ہے۔ اب تو سب خالق ہیں۔

افتخار:۔ آپ کو ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ آئندہ پچیس تیس سال بعد کا ردِ عمل یہ ظاہر کرے کہ غالبؔ و اقبالؔ کی شاعری اتنی بڑی نہیں جتنا بڑا کام ہوا ہے۔

رضا:۔ ہاں یہ صحیح ہے اتنا زیادہ کام کر دیا لوگوں نے کہ اس میں تکرار و تواتر کی بھرمار ہے اور بار بار دہرایا ہوا کام موثر نہیں ہوتا۔ اب جو کتابیں غالبؔ پر شائع ہو رہی ہیں ان میں سے بیشتر میں غالبؔ کے علاوہ سب کچھ ہوتا ہے۔ ایک رجحان اور عام ہے۔ تین غزلیں لے لیں غالبؔ کی، ۹، ۱۰ نظمیں لے لیں اقبالؔ کی اور اس پر کام ہو رہا ہے۔ یہ بیشتر تضیعِ اوقات ہے۔ میں نے ڈاکٹر گیان چند سے (جنھیں میں سمجھ بوجھ کا آدمی مانتا ہوں) پوچھا تھا کہ آخر تنقید سے مراد کیا ہے؟ کیوں کہ انھوں نے اپنے ایک مضمون میں میرے متعلق لکھا ہے کہ "میں تنقید سے نالاں ہوں"۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تنقید کی کوئی جہت نہیں، بہت زیادہ ابہام ہے اور اپنے اپنے کرتب سب دکھا رہے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ "تفہیم ادب"۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے، میرے استاد کا ایک شعر ہے۔

بحث میں دونوں کو لطف آتا رہا
مجھ کو دل میں دل کو سمجھاتا رہا

اس کی تفہیم کرائیے۔ کہنے لگے کہ یہ آپ کے لئے نہیں ہے۔ اس پر میں نے جواب دیا کہ جب آپ تنقید لکھا کریں تو یہ بھی لکھ دیا کیجئے کہ یہ بچوں کے لئے ہے کیوں کہ ہم لوگ تو جانتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ تنقیدی کتابیں کاہے کے لئے ہیں، کیوں لکھی جا رہی ہیں یہ کتابیں؟ یہی بات میں نے وارث علوی سے احمد آباد میں پوچھی تھی کہ تنقید سے مراد کیا ہے؟ ایک ہی جملے میں بتا دیجئے۔ کہنے لگے کہ ٹی ایس ایلیٹ نے کہا ہے۔ میں نے کہا کہ ایلیٹ کو جانے دیجئے مجھے تو صاف صاف آسان سی اردو میں بتا دیجئے۔ مگر وہ پڑھے لکھے نقاد ہیں سو صفحے لکھ ڈالیں گے، میرے دوست ہیں، میں نے کہا کہ کم لکھا کیجئے۔

افتخار:۔ کیا تنقید و تحقیق میں کوئی باہمی ربط ہونا چاہئے یعنی تنقید کی بنیاد تحقیق پر رکھی جائے۔

رضا:- دونوں میں ربط ضروری ہے۔ جہاں تحقیق، تنقید کے ساتھ نہیں ہوگی وہاں تنقید مار کھا جائے گی محقق جو تنقید کرے گا وہ بالکل سیدھی اور صاف ہوگی۔ اس میں الجھاوے نہیں ہوں گے۔

افتخار:- اُردو کے رسم الخط کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا اسے تبدیل ہو جانا چاہئے۔؟

رضا:- اُردو کا رسم الخط ہرگز تبدیل نہیں ہونا چاہئے۔ رسم خط کی تبدیلی کا نعرہ لگانے والے اسے جس رسم خط میں ڈھالنا چاہیں ڈھال لیں لیکن اُردو کا انحصار اس کے رائج رسم خط ہی پر رہے گا۔

افتخار:- اُردو کے مستقبل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

رضا:- اُردو کا مستقبل تاریک ہے۔ اس کے دو وجوہ ہیں۔ اوّل یہ کہ میں نے اُردو کے دانشوروں کو اس سے دلچسپی رکھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ زیادہ تر خود غرضانہ باتیں ہیں ایسے حالات میں اُردو کی ترقی کیسے ہو سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اب ہمیں اپنے آپ کو یہ کہلوانے میں شرم آتی ہے کہ ہم اُردو والے ہیں۔ جب حالت یہاں تک پہنچ جائے تو سوائے تاریکی کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اردو اکاڈمیاں سرکاری نہیں ہونی چاہئیں۔ اگر ان پر سرکار کا غلبہ ہے تو اکاڈمیاں کام نہیں کر سکتیں اکاڈمیوں والے بھی سرکاری آدمی نہیں ہونا چاہئیں۔ ہم چند لوگوں پر انحصار کر کے پورے ہندوستان میں اُردو کی ترقی کی توقعات لئے بیٹھے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مشکل سے ساٹھ ستر لوگ ہوں گے جو ہندوستان بھر کی اردو اکاڈمیوں، انجمن ترقی اُردو اور اس طرح کے دوسرے اداروں کے ساتھ چپکے ہوئے ہیں۔ انھیں میں سے کوئی یہاں ممبر ہے تو کوئی وہاں، اس کے لئے اس قدر تگ و دو جاری ہے کہ خدا کی پناہ بن کے ہی رہیں گے ممبر، یہاں یا وہاں۔

افتخار:- آپ کے پاس مخطوطات، نایاب و کمیاب کتابیں اور رسائل کا بہت بڑا اور قیمتی ذخیرہ موجود ہے۔ آپ نے اس کے تحفظ کے لئے کیا کیا ہے؟

رضا:- ان کے کارڈس تو تقریباً پورے تیار ہو گئے ہیں۔ ان کا ایک ماسٹر رجسٹر بھی ہے جس سے کتاب فوری طور پر نکالی جا سکتی ہے اور نشاندہی کی جا سکتی ہے کہ کتاب کہاں ہے اور جب تک یہ سارا سرمایہ میرے پاس ہے تو محفوظ ہی ہے یعنی اس کا تحفظ میری زندگی تک تو ہے ہی اس کے بعد کیا ہوگا یہ خدا کو معلوم۔

افتخار:۔ آپ اپنی زندگی ہی میں اس کو محفوظ کرنے کا طریقہ بھی بتا دیجئے۔

رضا:۔ کس کے پاس محفوظ کروں؟ میں نے جہاں بھی نظر دوڑائی ہے یہی محسوس کیا ہے کہ لوگ علم سے دوستی نہیں رکھتے۔

افتخار:۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ اپنے وسائل سے ایک ریسرچ سنٹر قائم کردیں، کوئی ٹرسٹ بنا دیں جہاں تشنگانِ ادب ریسرچ اسکالر وغیرہ آیا کریں اور استفادہ حاصل کریں۔

رضا:۔ میں کبھی کسی کو انکار نہیں کرتا اور خطوط بھی میرے پاس بڑی تعداد میں آتے ہیں۔ ان سب کا جواب دیتا ہوں۔ زیادہ تر ہوتا یہ ہے کہ لوگ چاہتے ہیں کہ سارا کام ہی انھیں کر کے دے دوں۔

افتخار:۔ رضا صاحب آپ سے اتنی زیادہ باتیں ہوئی ہیں کہ وقت کی طوالت کا احساس ہی نہیں رہا اور اب بھی ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے بہت کچھ پوچھنا باقی ہے۔ میں اس قدر طویل انٹرویو کے لئے آپ کا شکر گذار ہوں۔

نئی نئی منزلوں کا انتھک مسافر

پی۔ کے
نجھاون

رِضا

ستاون برس کے کالی داس گپتا رِضا گندمی رنگ کے، تنومند جسم کے کامیاب بینکر، اردو اور فارسی کی کتب جمع کرنے والے ایک ایسے شخص ہیں جو اپنی شریک حیات بچوں اور گیارہ ہزار کتب پر مشتمل لائبریری کے ساتھ بمبئی میں شانتی اور تنہائی کی زندگی بسر کرنا پسند کرتے ہیں۔ پھر بھی آج وہ خود اردو ادب کے ایک عظیم محقق ہی نہیں، ہندو پاک دونوں میں ماہر غالبیات کے طور پر ابھر رہے ہیں۔ ان میں ایسا کیا ہے کہ ایک بینکر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ کتب اور ادب کو اتنا وقت دیتے ہیں۔؟ کون ان کے اس کام میں معاون ہیں؟ یہ سب کر لینے کا وقت وہ کہاں سے مہیا کر لیتے ہیں۔؟ کس طرح بھارت میں اردو اور فارسی کی کتب کی ذاتی لائبریریوں میں شاید سب سے عظیم لائبریری بنا سکے ہیں؟ اردو ادب میں ان کی کیا گرانقدر خدمات ہیں؟ تشہیر و پروپیگنڈے سے وہ کیوں دور بھاگتے ہیں؟ اپنی کتب کے بارے میں وہ کیوں زبان نہیں کھولتے؟ ان تمام سوالوں کے جواب آپ کو اس ملاقات میں مل جائیں گے۔

اگر کوئی شخص ۳۰ برس کے عرصہ میں بیس ہزار سے زائد کتب کا ذخیرہ جمع کر لے تو آپ اسے کیا نام دیں گے۔؟ سوچنے پر بھی شاید کوئی متبادل اصطلاحی لفظ نہ مل سکے۔ جس عظیم شخصیت سے میں آج آپ کو متعارف کرا رہا ہوں۔ انھوں نے گذشتہ ۱۱ برسوں میں ہی ۱۱ ہزار سے زائد کتابیں اور تقریباً پانچ سو مخطوطے جمع کر لیے ہیں۔ ان میں بیشتر کتب تو اب نایاب ہیں۔ اوسطاً ایک سال میں ایک ہزار سے زائد کتابیں جمع کرنا، کیا یہ کام غیر معمولی نہیں؟ لیکن یہی نہیں وہ پیسے کا لین دین بھی اسی گھٹے ہوئے انداز سے کرتے ہیں اور اس طرح بھگوان وشنو کی دونوں بیویوں یعنی لکشمی اور سرسوتی کو خوش رکھتے ہیں۔ مختصر تعارف یہ ہوا کہ وہ نہ صرف بے حساب کتب جمع کرتے ہیں

اور بہت کچھ تصنیف و تالیف کرتے ہیں بلکہ ساتھ ہی بینکنگ کا دھندا بھی اعلیٰ پیمانے پر کرتے ہیں۔ اگر اس عظیم المرتبت ہستی کے بارے میں آپ کو کُرید ہو تو لیجئے سنئیے۔

کالی داس گپتا رِضا ستاون برس کے قد آور طویل و تنومند شخص ہیں، جن کے خدوخال شمالی ہندوستان کے ہیں۔ ساوتری، موصوف کی اہلیہ محترمہ سبھی خوش وخرم ہندوستانی خواتین کی طرح اب ادھیڑ عمر میں قدرے بھرے بھرے جسم کی نظر آنے لگی ہیں۔ لیکن ایام شباب میں یقیناً حسین رہی ہوں گی۔ اولاد نرینہ ایک ہی ہے۔ وِمل۔ جو بی کام (آنرز) ایل ایل بی ہے۔ ۲۶ سالہ اس اٹھتے نوجوان کا قد لمبا، رنگ گندمی، ناک نقشہ والدہ جیسا ہے۔ لیکن آنکھوں میں ایک خاص چمک مستقبل کے نئے خواب لیے ہوئے دکھائی دیتی ہیں۔ ایسی ہی ۲۳ سالہ صاحبزادی رتیا گپتا بھی ہے جو بی کام ہے اور جس نے ابھی تازہ تازہ بی ایڈ کیا ہے۔ کتابی چہرے کی یہ لڑکی اکہرے جسم اور تھوڑا لمبا قد لئے ہوئے ہے اور سادگی و دل کشی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

ان کے گھر میں جانا نہایت فرحت بخش ہوتا ہے۔ اردو تہذیب کی قدیم وضع کے ساتھ ساتھ ان لوگوں میں ایک پنجابی قسم کی استقبال آمیز مروّت اور کھلاپن ہے جدید طرز پر گھر آراستہ ہے۔ لیکن ایک خاص نپے تلے انداز پر ــــ کوئی چیز غیر ضروری محسوس نہیں ہوتی۔ مختصر خاندان کے چاروں افراد ایک دوسرے کے حد درجہ قریب ہیں۔ مہمان نوازی اس گھر کا طرۂ امتیاز اور وصف خاص ہے۔ مہمان کو چائے، پانی یا کوئی بھی مشروب گھر کے بچے خود خندہ پیشانی سے پیش کرتے ہیں۔ نہ کہ ملازم۔

کچھ ماہ قبل بمبئی ٹی وی پر رِضا صاحب کو بھارت کے عظیم شاعر علی سردار جعفری نے اردو فارسی کی کتب کے جمع کرنیوالے کے روپ میں پیش کیا تھا اس سے میرے دل میں ایک خواہش نے جنم لیا کہ ایسی ہستی کو قریب سے دیکھا جائے۔ بعدۂ میرے ایک دوست نے ان سے متعارف بھی کرایا۔ لیکن وہ کس طرح اور کیوں کتابیں ذخیرہ کرتے ہیں اس سلسلے میں میں کچھ جان ہی نہ سکا۔ اگرچہ مختلف موضوعات پر تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔ ہنسی مذاق کی فضا ہی رہی۔ لیکن جب میں ان کے

اس زبردست شوق کے بارے میں کچھ دریافت کرتا، وہ نہایت سلیقہ مندی سے ٹال مٹول کر جاتے تھے۔ شاید ان کا پیشہ ہی یہی ہے کہ وہ بات کا رخ نہایت آسانی سے اور بخوبی بدل جاتے ہیں۔ آخر میں نے انھیں اس بات پر رضامند کر ہی لیا کہ میں انھیں ایک سوال نامہ بھیجوں، جس کا جواب وہ دیں گے۔ آخر میں وہ یہ بات بھی مان گئے کہ اگر اور کوئی سوال ذہن میں ابھرے تو اس کا جواب بھی وہ بخوشی دیں گے۔

تو لیجیے۔

یہ رہا ان سے تعارف کا قصہ۔ اور اس سے جو کچھ بھی حاصل ہُوا وہ ایک عجیب انسان کی عظیم جانکاری سے بھرپُور ہے۔ اور میں اس پر زیادہ سے زیادہ کہنے کی حرص میں مبتلا ہوتا جارہا ہوں، جو کبھی پھر پوری کروں گا۔

ایک چلتا پھرتا عظیم کتب خانہ

معدودے چند احباب کو چھوڑ کر کم لوگوں کو علم ہے کہ آپ (کالی داس گپتا رِضا) اٹھارہ کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ جن میں سات ان کے مجموعۂ کلام ہیں۔ کیا آپ ان کی اہمیت دریافت کیجیے گا۔؟ اس کا جواب سماعت کیجیے۔ کہ انھوں نے عظیم القدر لکھنوی شاعر اور نقاد "چکبست" پر جو تصنیف کی ہے وہ ایک یونیورسٹی کے ایم اے (اردو) میں شریک نصاب ہے۔ دراصل "چکبست" کو قعرِ گمنامی سے نکالنے اور اردو کی صف اوّل میں کھڑا کرنے کا سہرا، ان ہی کے سر ہے اور خود وہ اس براعظم میں عظیم شاعر غالبؔ پر ایک ماہر اور محقق بن چکے ہیں۔

ان کا رجحان غالبؔ کی طرف کیسے ہُوا؟ اس کی ایک دل چسپ کہانی ہے۔ ان کے ایک ادیب دوست نے ایک بار ان سے کہا تھا۔ "غالب پر اتنا لکھا جاچکا ہے کہ کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں رہی۔؟" رِضا نے اس بیان کو ایک چیلنج تصور کیا اور غالب پر دس تصانیف کا ایک منصوبہ بنا ڈالا۔ یہ پروجیکٹ ابھی نصف بھی تکمیل کو نہیں پہونچا ہے، لیکن انھیں جو کامرانی نصیب ہوئی ہے، اسے عظیم کہا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر بھارت اور پاکستان دونوں ملکوں میں اردو تحقیق کے زبردست عالم قاضی عبدالودود صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ رِضا صاحب کی کتاب

متعلقات غالب" پیش نظر ہے۔ یہ غالبیات میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ اور اس سے مجھے بہت سی باتیں معلوم ہوئیں، جو پہلے میرے علم میں نہ تھیں۔

ایک اور نامور ماہر غالبیات جناب مالک رام لکھتے ہیں "غالب کی سوانح حیات اس حد تک مکمل کرلی گئی ہے کہ اب کسی اہم اور قابل ذکر بات کا اضافہ اس پر بہت مشکل ہے۔ لیکن داد دینی پڑتی ہے جناب کالی داس گپتا رِضا کی کہ انھوں نے اس موضوع پر دو کتابیں پیش کردی ہیں۔ ان دونوں کتابوں میں انھوں نے کیا کیا داد سخن دی ہے، وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔"

اب ان کے ایک اور پہلو کو لیجیے۔ جب میں ان سے اس بار ملا تو ان کے سامنے تیرہ، چودہ خطوط جمع تھے۔ انھوں نے مجھے وہ خطوط دکھلائے۔ ان میں سے ایک پوسٹ کارڈ قاضی عبدالودود کا بھی تھا۔ رِضا بتاتے گئے "قاضی صاحب اب کافی ضعیف ہوگئے ہیں۔ ملنے کی بڑی خواہش ہے۔ میں کچھ دنوں کے لئے ان کے پاس پٹنہ جاؤں گا۔ ایک اور خط تھا۔ ڈاکٹر گیان چند جین کا۔ ڈاکٹر جین حیدرآباد یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہیں۔ اور اردو ادب کے ایک زبردست محقق و نقاد ہیں۔ دوسرے خطوط لکھنے والوں میں کچھ لوگ یہ تھے۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو، جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر و صدر شعبہ ہیں۔ پروفیسر لطیف الزماں خان جو پاکستان میں گورنمنٹ کالج ملتان کے انگریزی شعبہ میں استاد ہیں، ڈاکٹر ایس حنیف نقوی جو بنارس ہندو یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں' اور رضیہ حامد جنھوں نے بھوپال میں عربی میں ریسرچ کی اور آجکل نئی دلّی میں ہیں۔ تقریباً سبھی خطوط ادبی اور تحقیقی نوعیت کے تھے۔ بعض دوسرے خطوں میں ان سے دریافت کیا گیا تھا کہ فلاں مواد کہاں سے دستیاب ہوسکتا ہے۔

ایک صاحب نے انھیں بھی بتایا تھا کہ اس مخصوص موضوع پر مواد کہاں کہاں سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ انھیں صرف ایسے ہی خطوط موصول نہیں ہوتے۔ بہت سے مقالے بھی آجاتے ہیں۔ جن کو ان کے مصنفین رِضا صاحب کو دکھانا چاہتے ہیں تاکہ وہ ان کے خیالات سے مستفیض ہوسکیں۔ رائے جاننے کے لئے مصنفین اپنی کتابیں بھی بھیجتے رہتے ہیں۔ دیباچے لکھنے کے لیے بھی اصرار رہتا ہے۔

اس طرح کے تقریباً چالیس خطوط ان کو ہر ماہ وصول ہوتے ہیں۔ اور رضا صاحب ان پر جیسا واجب ہو توجہ دیتے ہیں۔ مقصد یہ ہوا کہ انھیں نہ صرف جواب ہی عنایت کرنے ہوتے ہیں بلکہ کتابیں اور مقالے بھی پڑھنے ہوتے ہیں اور ان میں ضروری اضافے و ترمیمات بھی روانہ کرنے پڑتے ہیں۔ بعض کو رائے دینی پڑتی ہے کہ ابھی اور زیادہ مقالے پر غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اور مواد کہاں کہاں سے دستیاب ہو سکتا ہے۔ بعض خطوط کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کے لئے طویل وقت بھی درکار ہوتا ہے۔ اس لئے میرے دل میں یہ سوال اٹھا کہ آخر اس سارے کام کے لئے انھیں اتنا وقت کہاں سے فراہم ہو جاتا ہے۔ کیا وہ تن تنہا صحت مند ادب کی گراں قدر انجمن کا کام کر سکتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو واقعی وہ ایک بے مثال ہستی ہیں۔ آخر اردو ادب کوئی چھوٹا موٹا ادب تو ہے نہیں۔

ہماری ملاقات اسی سوال سے شروع ہوئی۔ رضا صاحب نے مجھے بتلایا "چونکہ میری صحت اور یادداشت اچھی ہے اس لئے میں اتنا سارا کام کرنے کے اہل ہوں۔ پھر اپنی کتب کا تو بہت کچھ مجھے ویسے ہی بالکل یاد ہے"

دراصل اردو کتابوں اور ادب سے ان کی لگن کا کوئی اور چھور نہیں۔ آخر یہ لگن لگی کیسے۔ میرے سوال کے جواب میں انھوں نے فرمایا "بچپن میں مجھے کتابوں کا بہت شوق رہا ہے۔ جب میں چھوٹا تھا تب بھی گھر کی تمام کتابیں پڑھ ڈالتا تھا۔ میرے والد محترم ساہوکار تھے۔ لیکن ساتھ ہی انھوں نے کئی موضوعات پر کتابیں بھی اکٹھا کر رکھی تھیں میں ایک کتاب لے لیتا اور گھر کے کسی کونے میں بیٹھ کر پڑھتا رہتا۔" رضا صاحب گھر میں سب سے چھوٹے تھے۔ اس وقت کے بڑے گھروں میں کب کسی کو پتہ چلتا تھا کہ کون کہاں ہے "لیکن میرے والد جانتے ضرور تھے اور ایک طرح سے انھوں نے کتابوں کے لئے میری رغبت والفت کو حوصلہ بھی بخشا تھا۔"

"وہ کیسے؟" میں نے دریافت کیا

"اس کا آخر کیا جواب دوں۔ شاید وہ چاہتے بھی تھے کہ میں زندگی میں بہت سی کتابیں پڑھوں۔ شاید ان کی بھی کبھی ایسی رغبت رہی ہو گی، جسے وہ اپنے لڑکے کے روپ میں تکمیل تک پہنچتے دیکھنا چاہتے تھے۔ میں ایسا اس لئے کہہ رہا ہوں کہ انھوں نے کئی بار میری پیٹھ تھپتھپائی تھی۔"

"کیا انھوں نے آپ کا نام بھی کچھ ایسے ہی وجوہ سے منتخب کر رکھا تھا۔"

"کیا کہوں؟ ہو بھی سکتا ہے، اور نہیں بھی ویسے ہمارے ویشن خاندانوں میں یہ نام کچھ اجنبی سا ضرور ہے۔ شاید پروہت نے میری جنم کنڈلی بناتے ہوئے اس نام کا ہی سجھاؤ دیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا کوئی سبب ہی نہ ہو۔"

بات کرتے کرتے وہ یادوں میں کھو سے گئے۔ پھر گویا ہوئے۔

"پتاجی نے میری کئی جگہ حوصلہ افزائی کی۔ ساہوکاری یعنی روپے کا لین دین ہمارا آبائی پیشہ ہے۔ ان دنوں کی زندگی میں "شاہ" گاؤں کی زندگی کا خاص جزو سمجھا جاتا تھا۔ لوگ کہا کرتے تھے " شاہ بن پت نہیں " یعنی کوئی چاہے کتنا ہی امیر و کبیر کیوں نہ ہو۔ مشکل کے وقت شاہ کے بغیر عزت قائم نہیں رہتی۔ اس لیے میٹرک میں کامیابی کے بعد (یہ تعلیم ان دنوں کافی اہمیت رکھتی تھی) میں بھی پتاجی کے ساتھ ہی دھندا کرنے لگا۔ میں نے اس کام کاج میں جلد ہی مہارت حاصل کرلی۔ شاید یہ سب میری گھٹی ہی میں تھا۔ لیکن کچھ اور شوق بھی میرے اندر سر ابھار رہے تھے۔ اردو اور فارسی دونوں کے ادب مجھے لبھا رہے تھے۔ پھر میں نے "ادیب فاضل" اور "منشی فاضل" کے امتحانات دیے جو اردو اور فارسی کے اعلیٰ ترین امتحانات تھے۔

لیکن میرا سب سے زیادہ رجحان سنگیت کی طرف تھا۔ ہاں شاستریہ سنگیت کی طرف۔ میں باؤلوں کی طرح گھنٹوں سُر کا ریاض کیا کرتا تھا۔ تب ہماری بیٹھک میں بڑے بڑے نامور گویّے شریک ہوا کرتے تھے۔ اور ہمارا علاقہ سنگیت میں کوئی معمولی علاقہ نہیں ہے۔ سنگیت میں جالندھر کا نام تو ہندستان گیر شہرت رکھتا ہے۔ وہاں دسمبر کی راتوں کے کٹکٹراتے جاڑوں میں ہری ولبھ کا میلہ لگتا ہے۔ اس میں دیش بھر سے اونچے سے اونچے موسیقار شامل ہونا اپنی خوش بختی سمجھتے ہیں۔ ہری ولبھ کا یہ میلہ سنگیت کی ایک یونیورسٹی ہے۔ جو بھی وہاں ایک بار گا کر ناموری پا گیا، وہی بڑا راگی سمجھا گیا۔ میری بھی یہ عظیم خواہش اور کامنا تھی کہ ایک دن اس میلہ میں اپنا ہنر پیش کرسکوں۔ لیکن یہ ارمان پورا نہ ہوسکا۔ جلد ہی مجھ پر شاعری کا بھوت سوار ہوگیا۔"

شاعری کی طرف

یہاں میں نے ان کو ٹوکا اور دریافت کیا کہ وہ شاعری کی طرف کس طرح راغب

ہوئے۔

وہ متبسم ہوئے اور فرمانے لگے۔

"جو اکثر شعراء کہتے ہیں، ایسا دراصل کچھ نہیں ہے۔ کسی بھی دوشیزہ نے مجھے نہیں پھنسایا اور نہ ہی آوارہ گردی و اوباشی میرے مزاج میں تھی۔ الفاظ اپنے آپ آجاتے تھے لے۔ سُر میں پھندوں سے لبریز الفاظ جن سے کئی طرح کی لفظی تصویریں ابھر ابھر آتی تھیں یوں تو میں متعدد برسوں سے شاعری کر رہا تھا لیکن اس کا علم لوگوں کو بہت بعد میں ہوا شاید میں نے اپنی پہلی شعری کوشش ۱۴ برس کی عمر میں کی تھی۔ ایک دن حسینے خاں نے (جو ہمارے دیہات کا ایک میراثی نوجوان تھا) مجھے شاعر بنا ہی دیا۔ اس کی آواز میں بلا کا جادو تھا۔ اور وہ میری سنگیت کی محفلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ لیکن جانے کیسے اسے اس بات کی بھنک پڑ گئی کہ میں شاعری بھی کرتا ہوں۔ ایک دفعہ تو اس نے حد درجہ ضد کی اور میں نے اسے ایک نظم سنائی جس کا نام "دیش بھگت کی دعا" تھا اسے یہ نظم اس قدر پسند آئی کہ اس نے اسے لکھ لیا۔

"یہاں تک تو ٹھیک تھا لیکن جس مقام پر مجھے حسینے خاں لے آیا وہاں میں شاعر ہو ہی گیا۔ پیچھے نہ مڑ سکا۔ ہمارے گاؤں مکندپور سے پانچ میل کے فاصلے پر کھٹکر کلاں نام کا ایک گاؤں ہے جہاں شہید اعظم بھگت سنگھ کی پیدائش ہوئی تھی۔ شاید ۱۹۴۲ء کے بیساکھی کے میلے پر جب کہ ہزارہا فرد کھٹکر کلاں میں بھگت سنگھ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے جمع تھے حسینے خاں نے کچھ اس طرح سے بھری سبھا میں میری نظم گائی کہ لوگوں پر ایک وجد سا طاری ہو گیا۔

"کچھ ہی عرصہ بعد شاعر اعظم داغ دہلوی کے شاگرد رشید جوش ملسیانی کا شاگرد بننے کا خوش قسمت موقع ہاتھ لگا۔ میں اپنی تحریریں انھیں دکھانے لگا۔ میرا استاد ایک کامل شاعر اور فن کار تھا۔ اور واقعی ان کے شاگردوں میں شمار کیا جانا فخر کی بات ہے۔ کچھ سال بعد انھوں نے مجھے لکھا کہ اب مجھے اپنی نظمیات دکھانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ ہاں کبھی کوئی شک یا گمان گذرے تو میں ان سے رجوع کر سکتا ہوں۔ ایسے استاد سے ایسے الفاظ سننا ہر شاگرد کی آخری خواہش ہو سکتی ہے

"لیکن آخر یہ کیا کہ شاعر کی حیثیت سے پنجاب کے بہت سے لوگ آپ سے کم

متعارف ہیں۔" میں نے پوچھنے کی جسارت کی۔
انھوں نے سوالیہ انداز سے میری طرف دیکھا، جیسے وہ مجھ سے پوچھ رہے ہوں کہ آخر کس حق کی بنا پر میں نے ان سے یہ سوال کیا ہے۔ اس پر مجھے بھی بتانا پڑا کہ میں نے بھی کبھی تھوڑی بہت شاعری کی تھی اور پنجاب کے بہت سے شاعروں کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ بس پھر کیا تھا۔ ہمارے درمیان جھجک اور اجنبیت کی جملہ حدیں ختم ہو گئیں انھوں نے جواباً فرمایا۔
"میں مزاجاً گمنامی پسند واقع ہوا ہوں۔ میں اسی میں رہ کر کام کرنا چاہتا ہوں۔ آج کل بھی لوگوں کی نظر سے چھپا سا جاتا ہوں۔ میری گمنامی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ میں کافی عرصہ تک دیش سے باہر رہا۔ دراصل میں نے ۱۹۴۹ء میں دیش چھوڑا اور کینیا چلا گیا۔ اور پھر ۱۹۷۰ء میں ہی دیش لوٹنا نصیب ہوا۔ تب سے میں بمبئی ہی میں مقیم ہوں۔

غربت کا اصل مفہوم

"کوئی خاص سبب"؟
"پنجاب کے لوگ دوآبہ (ضلع جالندھر) کے لوگوں سے غیر ملک جانے کا سبب دریافت نہیں کرتے۔ ہے نا؟" انھوں نے چٹکی لیتے ہوئے کہا۔
اب مجھے معلوم ہوا کہ میں اپنی ہی بات میں پھنس گیا ہوں۔
پنجاب میں تو یہ مثل مشہور ہے کہ دوآبہ کی مائیں بچے کو جنم ہی اس لیے دیتی ہیں کہ وہ مغربی ممالک کو جائیں۔ بات کچھ بھونڈی ضرور ہے لیکن ہے سچ۔ جو لوگ دوآبہ سے باہر گئے ہیں ان کی تعداد بے حساب ہے۔
"پھر بھی ......" میں نے پوچھ ہی لیا۔
"میں یہ نہیں کہوں گا کہ میں وہاں پیسے کمانے نہیں گیا تھا۔ میں نے وہاں اچھی دولت کمائی۔ ۱۹۵۶ء میں ساوتری دیوی سے شادی کی۔ میرے دونوں بچے وہیں پیدا ہوئے ایک طرح سے یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ میرے پاس آج جو کچھ بھی میرا اپنا ہے وہ سب مشرقی افریقہ ہی سے مجھے حاصل ہوا ہے۔" انھوں نے پھر چٹکی لی۔
"پھر آپ واپس کیوں آئے۔" میں نے فوراً ہی سوال کیا۔
"مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ مجھے بھارت لوٹنا ہی ہے۔ جس مٹی سے میں بنا ہوں

اس کی کشش بری طرح مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ لیکن صرف دیش بھگتی کی بات نہیں میرے پاس برطانوی پاسپورٹ تھا۔ اور ہمارے لیئے کئی راستے کھلے تھے، لیکن بہت سوچ وچار کے بعد مجھے دو باتوں نے بھارت کے حق میں فیصلہ کرنے پر مجبور کیا۔ ایک تو میری اپنی ادبی رغبت دوسرے میرے بچوں کا مستقبل۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ان کے ماتھے غیر ملکی نقوش سے داغدار رہیں۔ اردو زبان میں "غربت" کا مفہوم غریبی ہے ضرور لیکن اس کا صحیح مطلب ہے دیش سے دور رہنا۔ بمبئی مجھے کئی اعتبار سے بہتر لگا۔ اور ۱۹۷۰ء میں میں یہاں آیا اور یہیں کا ہو کر رہ گیا۔

ادبی فرض اور گمنامی

"آپ نے بمبئی ہی کو کیوں پسند فرمایا۔؟"

"یہاں میرے لیئے گمنامی میں اپنے ادبی کاموں کے پورا کرنے کا موقع میسر ہے، دوسرے یہاں ساہوکارہ بھی خاصا مضبوط رہتا ہے"

مجھے پہلی بار سن کر کافی تعجب ہوا۔ زیادہ تر ادبی کام تشہیر سے ہوتا ہے ایک نیا شاعر بھی اپنا کلام کسی نہ کسی کو سنانا چاہتا ہے۔ اور پھر شاعر تو کسی کو چھوڑتا نہیں۔ سب سے پہلے کلام سناتا ہے۔ دراصل شاعر ایک ماں کی مانند ہوتا ہے جس کی یہ چاہت ہوتی ہے کہ سب اس کے بچے کو دیکھیں اور تعریف کریں۔ اس لیئے میں نے ان سے وضاحت کے لیئے کہا۔

کچھ لمحے سوچ کر انھوں نے کہا۔

"یہ بات نہیں کہ میں اپنی شاعری کو سنانا نہیں چاہتا۔ اپنی تعریف کسے پسند نہیں۔ لیکن مجھے مزاجاً گوشۂ تنہائی پسند ہے۔ پھر میرے تمام علمی پروجیکٹ ہیں اور ان کے لیئے بہت محنت درکار ہوتی ہے۔ تقریباً دس گھنٹے روزانہ اسی لیئے میں اپنے کام پر خود ہی آفریں کہہ لیتا ہوں۔

آپ کہیں گے کہ میں نے اپنے اردگرد ایک دیوار سی کھڑی کرلی ہے۔ لیکن باہری دنیا سے میں جس طرح تعلق بنائے ہوئے ہوں وہ آپ کو بتا ہی چکا ہوں۔ جو خطوط میں نے آپ کو دکھائے وہ مجھے ایک ہفتہ میں موصول ہوئے ہیں۔ یہ وہ معزز لوگ ہیں جو میرے گوشۂ تنہائی کے ساتھی ہیں۔ ان میں سے کئی کو میں ذاتی طور پر جانتا بھی نہیں ہوں لیکن ایک عجیب جذبہ ہمیں ایک دوسرے سے منسلک رکھتا ہے۔"

رضا صاحب کی حالت اس وقت نہایت مؤثر محسوس ہو رہی تھی، اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ جس شخص نے ٹیلی فون کیا تھا وہ کوئی اردو عالم ہی لگتا تھا کیوں کہ بات چیت اردو لہجے میں مخصوص لکھنوی انداز میں ہو رہی تھی۔ رضا صاحب نے انھیں اگلے دن گھر پر آنے کی دعوت دی۔

پھر مجھے رضا صاحب نے یوں دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں کہ یہ ہے آپ کے سوال کا جواب جناب مظفر لاری لکھنؤ سے آئے تھے اور انھیں کا ٹیلی فون تھا۔ اسی ٹیلی فون پر اردو کے مشہور نقاد باقر مہدی اور کہانی نویس راجندر سنگھ بیدی نے بھی ان سے باتیں کیں۔ بھلا کس لئے؟ لکھنؤ کی میر اکاڈمی نے انھیں میر ایوارڈ سے نوازا تھا۔ لیکن وہ ایوارڈ لینے لکھنؤ نہیں گئے تھے۔

"میں وہاں جاتا تو مجھے وہاں بیسوں انجمنوں میں جانا پڑتا اور میں ایسا کر نہیں پاتا پھر بھی اس ایوارڈ کے لیئے میں ان کا ممنون ہوں۔ کل وہ میرے یہاں مجھے اعزاز دینے آئیں گے۔ تب نہ تو کوئی نامہ نگار یہاں ہوگا۔ اور نہ ہی کوئی فوٹو گرافر۔ کتنا تعجب خیز ہوگا یہ اعزاز۔ ہے نا۔"

بات قطعی درست تھی۔ ان کے ادبی نام کے بارے میں مجھے اب کچھ مزید دریافت نہیں کرنا تھا۔ جس طرح وہ کام کرتے ہیں یہ تو ایک طرح کی تپسیا ہے۔ گذشتہ دس برسوں میں انھوں نے یومیہ دس گھنٹے کام کیا ہے اور آگے بھی وہ یہی سب کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ رابرٹ براؤننگ کا "گرامرین" بھی تو ایسا ہی تھا۔

میں نے ان کے عظیم ذخیرۂ کتب کے بارے میں کچھ خاص بات دریافت نہیں کی تھی اس لیئے میں نے اس بات پر سوالات شروع کیے۔ سب سے پہلا سوال یہ تھا کہ آپ کتابیں کیوں جمع کرتے ہیں۔ کیا یہ صرف مشغلہ ہی ہے یا اس کے پیچھے کوئی سنجیدہ مقصد و مصلحت پوشیدہ ہے۔

کینیا میں ذخیرۂ کتب

رضا صاحب فرمانے لگے۔

"میرے کتب جمع کرنے کا کام دُو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے

پہلے دور میں میں نے کتب بغیر کسی ترتیب یا منصوبہ کے جمع کیں۔ مجھے انگریزی میں

شُد بُد کم تھی اس لیۓ میں نے انگریزی میں سینئر کیمبرج امتحان پاس کیا۔ ایک پُر لطف اتفاق بتاؤں۔ کینیا سے جن سو کے قریب پرائیویٹ امیدواروں نے امتحان میں شرکت کی تھی ان میں سے اکیلا میں ہی کامیاب ہوا تھا۔ اس کے لیۓ مجھے بہت پڑھنا پڑا۔ میرے مضمون پرنسپل سطح کے تھے۔ سبھی قسم کی کتابیں پڑھیں۔ اور پھر یوروپی تہذیب، وہاں کا سیاسی فلسفہ، آرٹ، اور ادب۔ سبھی مضامین مجھے عزیز ہو گئے۔ میں کینیا میں بیس سال مقیم رہا۔ اور اس دوران میں نے تقریباً ۹۰۰۰ کتابیں جمع کیں۔ چمڑے کی جلد پوش شاہکار جن میں ۹۰ فی صد کتابیں انگریزی ہی میں تھیں۔ لیکن وہ سارا ذخیرہ کینیا میں ہی رہ گیا۔ جنھیں کتابوں سے لگاؤ ہو وہ اس غم کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ یہ غم زندگی بھر قائم رہے گا۔ کبھی کبھی لگتا ہے کہ میں ان کتابوں کے حضور مجرم ہوں۔"

"کیا کتابیں ذخیرہ کرنے کا یہی سبب تھا؟"

وہ یادوں میں گم ہو گئے۔ گویا وہ اب بھی کینیا میں ہی ہوں۔ پھر کہنے لگے۔

"اگر آپ جاننا ہی چاہتے ہیں تو سنیۓ۔ مجھے کتابوں کے جمع کرنے کا شوق ایک بہت بڑے عالم کی سنگت سے ہُوا۔ وہ عالم ہے۔ جسٹس چانن سنگھ۔ کینیا سپریم کورٹ کے ایک فاضل جج۔ ہم دونوں کو شاعری کا چسکا تھا۔ وہ کوئی خاص شاعر تو نہ تھے لیکن سرسوتی کے ایک عالم فرزند تھے۔ کتابیں ہی ان کی زندگی تھیں۔ ہم بہت اچھے دوست بن گئے۔ حالانکہ وہ ہر لحاظ سے مجھ سے بڑے تھے۔ انھیں کی صحبت میں مجھے کتابوں میں کچھ ایسا لگنے لگا کہ گویا وہ ہماری ہی طرح ذی روح ہوں اور مجھ سے کہہ رہی ہوں۔ اس حالت میں میں نے بیشمار کتابیں پڑھیں، لیکن بھوک نہیں مٹی۔ مجھے کوئی شۓ تھی جو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ یہی سمجھیۓ کہ میری آتما کی تکمیل ہوتی جا رہی تھی۔

بھارت میں

"تب"

"بھارت آنے کے بعد میں نے خصوصاً اردو کی ہی کتابیں جمع کی ہیں۔ اس زبان میں مجھے تھوڑی بہت شُد بُد حاصل ہے۔ فارسی اور عربی کی کتابیں بھی اسی لیۓ جمع کی ہیں کہ اردو ادب سے ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ جملہ کتابیں میرے کام میں معاون ہیں۔

"کیسے؟"

"مجھے خالق نے عجیب طرح تخلیق کیا ہے۔ جب تک میرے پیش نظر سبھی کتابیں نہ ہوں، کام کر ہی نہیں پاتا۔ میں اپنے مضامین میں کوئی ایسی بات تحریر نہیں کرتا جس کی سند میرے پاس نہ ہو۔ تحقیق میں صرف لفاظی سے کام نہیں چلتا۔ یہ ایک سخت تنظیم ہے جس میں ہر لحظہ کوئی قدیم بت توڑنا پڑتا ہے۔"

"آپ نے کتنی کتابیں اکٹھا کر رکھی ہیں؟"

"میرے ذخیرہ میں فی الوقت گیارہ ہزار سے کچھ زائد کتابیں اور ۵۰۰ مخطوطے ہیں۔ کچھ تو نایاب ہو چکی ہیں اور بہت بڑی تعداد کمیاب کتابوں کی ہے۔"

"ان میں سے کتنی کتابیں آپ نے مطالعہ کی ہیں؟"

"اس کا جواب شاید میں پہلے دے چکا ہوں۔ پھر بھی جواب یہ ہے کہ میری کتابیں چار حصوں میں منقسم ہیں۔ پہلے حصہ میں ۳۳۳۱ کتابیں شامل ہیں جو میرے گھر پر ہیں میری روز کی ضرورت کے لیئے۔ یہ تمام کتب تو میں نے پڑھی ہی ہیں۔ مجھے ان کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔ دوسرے حصہ میں ۳۸۱۹ کتابیں ہیں جو میرے دفتر میں ہیں اور میں نے ان کی چھان بین کر لی ہے۔ تیسرے درجہ میں میرے مخطوطات ہیں ان میں سے کچھ کو ضرور شائع ہونا چاہیئے۔ اور اس کے لیئے مجھے الگ پروجیکٹ بنانا پڑے گا تقریباً ۴۰۰۰ کتابیں ایسی ہیں جو ابھی بے ترتیب پڑی ہیں۔ ان کی فہرست بنانے کا کام جاری ہے۔"

"اس کام میں آپ کا معاون کون ہے؟"

"میرے اہل خانہ کے اپنے افراد۔ میرا ایک ملازم بھی ہے جسے میں نے جلد سازی کی تربیت دلوائی ہے۔ جو خستہ کتابوں کے ٹھیک کرنے کا بھی کام سنبھال لیتا ہے۔"

"اگر کسی کتاب پر زیادہ محنت درکار ہو تو؟" میں نے جاننا چاہا۔

"جملہ نایاب کتابوں پر میری شریکِ حیات اور بچے کام کر لیتے ہیں۔ اگر بہت مہین کام کرنا ہو تو میری اہلیہ اور میں خود بھی جلد باندھنے کا کام کر لیتے ہیں۔ اس میں ہرج ہی کیا ہے۔"

اس وقت رضا صاحب کی آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی۔

یقیناً میں ایسے جواب کے لیئے تیار نہیں تھا

گیارہ ہزار کتابوں کی لائبریری کو سنبھالنے کا کام کوئی معمولی کام نہیں۔ آج کل جبکہ خاندان سُست رفتار سے ہوتے جارہے ہیں، رضا صاحب ضرور ان گنے چنے افراد میں ہوں گے جن کے بچّے بیجان کرم خوردہ قدیم چھپے کاغذوں کو وقت دینے سے ادبتے نہیں۔

لیکن کچھ سوال ابھی باقی تھے۔

"آپ اس ذخیرے کا استعمال کیسے کرنا چاہتے ہیں۔؟ میں یہ سوال اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ آپ کا ذخیرہ نایاب ہے۔ اور جو بھی لوگ ان پر کام کرنا چاہتے ہیں، انھیں ایسا کرنے کا موقع ملنا چاہیئے۔ مثال کے طور پر بھارت اور پاکستان میں غالبؔ کا سب سے بڑا ذخیرہ آپ کی تحویل میں ہے۔ غالبؔ پر اتنی کتابیں تو پٹنہ کی خدابخش لائبریری میں بھی نہیں۔ پھر آپ ان کا استعمال کیسے کریں گے؟ کیا آپ ان کو کسی خاص لائبریری میں دے دیں گے۔ یا اپنی الگ ایک لائبریری بنائیں گے۔

رضا صاحب نے یہ سوال کافی غور سے سنا۔ کچھ دیر تک وہ سوچتے رہے۔

پھر بولے۔

"میں نے ابھی ان سوالات پر غور نہیں کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مستقبل اپنا راستہ خود بنالے گا۔ ابھی تو میرے پروجیکٹوں پر ہی تیزی سے کام جاری ہے۔ پھر بھی میں اپنی سماجی ذمہ داری کا جوابدہ ہوں۔ اس لیئے سوچ رہا ہوں کہ اپنے ذخیرۂ کتب کے سلسلہ میں ایک ماہانہ جریدہ نکالوں جو میرے کتب خانہ کو متعارف کرائے۔ اسے یونیورسٹیوں کو، اردو اور فارسی کے علماء کو اور دوسرے کتابوں کے شائقین کو بھیجا کروں گا۔

"لیکن کیا آپ دوسرے محققین کو ان پر کام نہیں کرنے دیں گے؟۔"

کیوں نہیں؟ میرے دروازے سبھی سنجیدہ شائقین کے لیئے کھلے ہیں۔"

"لیکن وہ لوگ آپ کے گھر پر کیسے کام کریں گے؟" میں نے پوچھا۔

" ایسا نہیں ہے۔ آج تک کوئی ۲۴ عدد محققین میرے مخطوطات سے مستفید ہوچکے ہیں۔ کئی بار ان محققین کے پروفیسرس اور گائیڈس مجھ سے تعلق پیدا کرتے ہیں اور میں ان سے تعاون کرتا ہوں۔"

ادبی روایت شکنی

"آپ اپنی کتابوں کا تحقیق میں کیسے استعمال کرتے ہیں؟"

"آج تک میں کئی ایک غلط مروجہ باتوں کو اپنی کتب کی بنیاد پر غلط ثابت کرنے میں کامیاب رہا ہوں ۔ ان کتب کے بغیر یہ کام نہیں کیا جا سکتا ۔"

"کیا آپ ان کی کوئی مثال پیش کیجئے گا؟"

"مثال کے طور پر ایک کتاب ہے حدیث قدسی ۔ اس میں پیغمبر اسلام کی شان میں کہی گئی نعتیں شامل ہیں ۔ ایسا کہا گیا تھا کہ یہ نعتیں مغل سلطنت کے آخری مشاعرے کی بنیاد پر جمع کی گئی تھیں جو کہ ۱۸۵۶ء میں ہوا تھا ۔ اس مجموعہ میں غالب کی ایک نعت بھی شامل ہے جو ایک نہایت اہم بات ہے ۔ میں نے اپنی تحقیقات سے اب یہ طے کر دیا ہے کہ یہ مجموعہ ۱۸۵۴ء میں شائع کیا گیا تھا لیکن خاص اہمیت کی بات یہ ہے کہ اس کی بنیاد کوئی خاص مشاعرہ نہیں تھا ۔ یہ نعتیں شعراء سے ذاتی طور پر کہلوائی گئی تھیں ۔

غالب کے ملازم کلّو کے بارے میں کچھ غلط بیان راہ پا گئے تھے ۔ میں نے تحقیق کی ۔ مرحوم فخرالدین علی احمد جو بھارت کے صدر جمہوریہ تھے ، کی بڑی بہن حمیدہ بیگم سے بھی ملاقات کی ۔ ان کی نانی بیاہ کر غالب کے گھر میں بہو کے روپ میں آئی تھیں ، ان کو اس ملازم کے بارے میں کافی معلومات تھی ۔ محقق کسی بھی گوشہ کو تشنہ چھوڑ نہیں سکتا ۔ تذکرہ غوثیہ کے مصنف کے بارے میں صحیح سراغ لگایا ۔ مولانا فضل حق خیر آبادی کا ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے ربط ظاہر کیا وغیرہ وغیرہ ۔ مگر یہ سب محنت کا پھل ہے ۔ اس پر بے وجہ ناز کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے ۔

"آپ نے اتنے بڑے ذخیرۂ کتب کو کیسے جمع کیا؟"

"ویسے ہی جیسے اور چیزیں اکٹھا کی جاتی ہیں ۔ اس میں بھی کئی بار بہت سی مایوسیاں ساتھ چلتی ہیں ، اور کئی ایک طرح سے کام کرنا پڑتا ہے ۔ تب جا کر نتیجہ برآمد ہوتا ہے ۔ کئی بار تو بات پہلی کوشش میں بن جاتی ہے ۔ لیکن کئی بار ۔ بار بار مایوس ہونا پڑتا ہے ۔ میں نے اپنی زیادہ تر کتب شمالی ہندستان کے قدیم ہندو اور مسلم خاندانوں سے اور جنوب کے مسلمان خاندانوں سے حاصل کی ہیں ۔ کبھی کبھی تو کام سیدھا بن گیا اور کبھی سلسلے ایسے منقطع ہوئے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آیا ۔ کہ سرا کہاں ہے ۔"

"کوئی خاص مثال؟" میں نے دریافت کیا ۔

"مجھے ایک نایاب نسخۂ کتاب کا پتہ چلا ہے ۔ وہ کتاب لکھنؤ میں ہے ۔ جس کے پاس

یہ کتاب ہے وہ تین سو روپے لینا چاہتا ہے۔ مجھے یہ قیمت منظور ہے۔ کافی مہینوں سے بات چیت چل رہی ہے۔ پھر بھی ابھی تک کامیابی نہیں ملی ہے۔"

"کیا آپ کچھ نایاب کتب کی مثال دیں گے؟"

"ویسے تو نایاب کتب کا کوئی شمار نہیں۔ لیکن میرے پاس ایک بہت ہی قیمتی قرآن ہے یہ قرآن کا اولین اردو ترجمہ ہے۔ اس نسخہ کی کتابت تقریباً دو سو برس پہلے شاہ عبدالقادر صاحب کی زندگی میں ہوئی تھی، جو خود اس کے مترجم ہیں۔

"ایک اور مثال ــ میرے پاس اقبال کی کتاب بانگ درا کی ایک کاپی محفوظ ہے جو انھوں نے بڑی عقیدت سے اپنے پروفیسر سر ٹامس آرنلڈ کی نذر کی تھی اب چونکہ اقبال پاکستان کا قومی شاعر ہے اس لیئے کم از کم پاکستان کے لیئے تو اس کتاب کی بہت اہمیت ہے۔"

"اسی طرح غالب کی حیات میں ان کے دیوان کے ۵ ایڈیشن نکلے ہیں۔ بھارت کے کسی بھی ذخیرہ میں یہ پانچوں ایڈیشن موجود نہیں ہیں۔ غالب اکیڈمی اور غالب انسٹی ٹیوٹ میں بھی نہیں ہیں۔ لیکن میرے ذخیرۂ کتب میں ہیں۔ غالب کی دوسری حیاتی کتابوں کے بیشتر ایڈیشن بھی میرے یہاں ہیں۔"

آپ کو اتنے سارے کام کے لیئے وقت کہاں سے ملتا ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ لکشمی اور سرسوتی میں کیا کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔" میں نے پوچھا۔

لکشمی اور سرسوتی۔

"ہاں یہ جھگڑا تو یقینی ہے۔ لیکن میں نے اپنے تجارتی اصولوں کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ ان پر ہر روز تین گھنٹے کام کرنا کافی ہو جاتا ہے۔ اس سے میں اپنی ضرورت کے لیئے پیسے (لکشمی) کما لیتا ہوں اور باقی وقت ادب یعنی سرسوتی کے نذر کر دیتا ہوں۔ گویا دونوں خوش رہتی ہیں۔

"آپ ساہوکار ہیں لیکن آپ کی زندگی کی ڈھرے میں ساہوکاروں جیسی شان و شوکت نہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟" میں نے پوچھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ سوال ان کو اچھا نہیں لگا۔ شاید میں بہت بے تکلف ہو گیا تھا۔ اس کے لیئے میں نے ان سے معافی چاہی۔

لیکن انھوں نے کہا کوئی بات نہیں۔ میں جواب دوں گا۔

بنیادی طور پر ویش دھرم یہ ہے کہ خوب دولت پیدا کرو۔ لیکن ضرورتوں کو زیادہ مت بڑھاؤ

یہ ٹیلی فون، یہ کار، میری تجارت کے لیئے اشد ضروری ہیں۔ لیکن بے معنی اشیاء خریدتے رہنا میرے دھرم کے خلاف ہے۔ میں اپنے گھر کی ہر ضرورت پوری کرتا ہوں لیکن ہمیں شان و شوکت سے نفرت ہے۔ کیا یہ جواب کافی نہیں ہے۔"

پھر وہ کچھ وقت کے لیئے رُکے اور کہنے لگے۔

"میں نہیں چاہتا کوئی مجھے غلط سمجھے یا بخیل کہے۔ اگر کوئی فرد زیادہ پیسے کماتا ہے تو اسے وہ دولت انسانی برادری پر خرچ کرنی چاہیئے۔ مجھے بھی اپنے فرض کا احساس ہے۔ شاید میں قدیم وضع کا آدمی ہوں۔"

اور یہاں آکر ہماری ملاقات ختم ہو گئی۔

ہاں وہ ضرور ہی قدیم وضع کے آدمی ہیں۔ اس دن جب میں ان کے گھر گیا تو ان کی اہلیہ اور فرزند تھالی میں پھول پتے سجائے مندر میں حاضری کے لیئے جا رہے تھے۔ آج سے چالیس سال قبل لاہور میں میری والدہ بھی تو یہی کرتی تھیں۔ جہاں تک ان کے نظریہ کا تعلق ہے میں ان کی درج ذیل رباعی یہاں پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں کیوں کہ اُن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کیسے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیئے وقف کر رہے ہیں۔

ہے عُمر اخیر۔ اور نہ دیکھو بھالو
آنکھوں میں ہیں جو خواب انھیں کو پالو
جی کھولو، قلم ہاتھ میں لو۔ الٹو ورق
محفوظ ہے جو ذہن میں سب لکھ ڈالو

●●

●●

قاضی عبدالودود

حرفے چند

جناب کالی داس گپتا، تخلص بہ رضا سے میرے تعلقات کا آغاز اس خط سے ہوا، جس میں انھوں نے دلگیر، مرثیہ گو کے تبدیلِ مذہب کے بارے میں میری رائے دریافت کی تھی۔ اس کے بعد ان کی دو تین کتابیں ملیں، جن میں سے ایک غالب کی فارسی مثنوی تھی، جسے انھوں نے مرتب کیا تھا۔ میرے ملاقاتیوں میں سے دو صاحب بمبئی میں ان سے ملے۔ وہ ان کے حُسنِ اخلاق کے مداح ہیں۔ انھیں سے ان کے کتب خانے کا حال معلوم ہوا، اور یہ کہ ان کا زیادہ وقت لکھنے پڑھنے میں صرف ہوتا ہے۔ ان کے ادبی ذوق اور غالب سے ان کی دلچسپی دیکھ کر، میں نے تحریک کی کہ وہ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کے رکن دوامی بن جائیں، انھوں نے پانچ سو روپے فوراً انسٹی ٹیوٹ کو بھیج دیے۔ وہ میرے قائم کردہ "ادارۂ تحقیقات اردو" کے رکن دوامی بھی بن گئے۔ اور میں نے ان کو اس کی کونسل کا رکن نامزد کر دیا۔ ان کی آخری کتاب جو میرے پاس آئی ہے "متعلقاتِ غالب" ہے، اس میں ان کی تصویر بھی ہے۔ میں نے اسے دیکھ کر انھیں لکھا کہ اگر آپ طبیب ہوتے، تو مریض کی آدھی بیماری آپ کو دیکھ کر دور ہو جاتی۔ چند ہفتے قبل وہ پٹنہ آئے اور میں نے انھیں دیکھا اور گفت گو کی تو بڑی مسرت ہوئی، اور دوسرے لوگ بھی جو ان سے یہاں ملے، اور جن سے بعد کو ان سے، ان کے متعلق مبادلۂ خیالات ہوا۔ تو وہ بھی اس میں شریک نظر آئے۔

اس وقت ان کی صرف ایک کتاب "متعلقات غالب" پیشِ نظر ہے۔ یہ غالبیات میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ اور اس سے مجھے بہت سی باتیں معلوم ہوئیں، جو پہلے میرے علم میں نہ تھیں۔ میری آرزو ہے کہ وہ عمر دراز پائیں۔ اور عمر کے ساتھ، ان کی معلومات اور دقّتِ نظر میں اضافہ ہوتا رہے۔

مالک رام

کالی داس گپتا رضاؔ

کوئی دس برس ہوئے جب ہندستان کے مختلف پرچوں میں کالی داس گپتا رضاؔ کے تحقیقی مضامین شائع ہونے لگے، تو لوگوں کو تعجب ہوا کہ یہ کون صاحب ہیں! مضمون مطالعے کی وسعت پر دال تھے۔ مواد اور استدلال کے پہلو سے اتنے مکمل کہ سب چونک پڑے کہ یہ صاحب آج تک کہاں چھپے رہے۔

جو لوگ ان کو شاعر کی حیثیت سے جانتے تھے، وہ ان کے مزاج کے تحقیقی پہلو سے بے خبر تھے۔ لہٰذا انھیں بھی کچھ کم حیرت نہیں ہوئی۔

رضاؔ صاحب شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنے کلام پر جوشؔ ملسیانی مرحوم سے اصلاح لی۔ جوشؔ مرحوم جس پایہ کے ماہر زبان اور صاحب فن تھے، وہ اہل فن سے مخفی نہیں ایسے استاد کے آغوشِ تربیت میں پروان چڑھنے کے بعد رضاؔ صاحب سے جو توقعات وابستہ کی جاسکتی تھیں، بحمدہٖ تعالیٰ وہ پوری ہوئیں۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ عروض اور فنِ شعری پر ان کی جیسی گرفت ہے، اس میں کم ہی لوگ ان کے برابر ہیں۔

خدا نے بھی رضاؔ صاحب کو اپنی نعمتوں سے نوازا ہے۔ ان کے پاس بہت اچھا کتاب خانہ ہے، اور وہ اس سے استفادہ کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر غالب ہی کو لیجیے۔ غالب کی زندگی کے کس پہلو پر اب گفت گو ممکن ہے! مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تقریباً تمام ماٰخذ منظر عام پر آچکے ہیں، اور ان سے استفادہ کرنے کے بعد ان کی سوانح عمری اس حد تک مکمل کرلی گئی ہے کہ اب کسی اہم اور قابل ذکر بات کا اس پر اضافہ بہت مشکل ہے۔ لیکن داد دینی پڑتی ہے جناب کالی داس گپتا رضاؔ کی کہ انھوں نے اس موضوع پر دو کتابیں پیش کردی ہیں: متعلقات غالب اور غالبیات: چند عنوانات ان دونوں کتابوں میں انھوں نے کیا کیا داد سخن دی ہے، وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی

ہے۔

لیکن رضا صاحب کا دائرۂ عمل غالبؔ ہی تک محدود نہیں رہا۔ انھوں نے اپنی محنت اور لگن سے چکبست کو دوبارہ زندہ کر دیا ہے۔ چکبست نے اپنی تھوڑی سی عمر میں اردو کی جو خدمت کی، وہ بھولنے کی چیز نہیں تھی۔ انھوں نے نظم و نثر میں اتنا سرمایہ چھوڑا تھا کہ ہم اس پر فخر کر سکتے تھے، اور اس چراغ سے چراغ جلا کر کام آگے بڑھا سکتے تھے۔ لیکن ہماری بد توفیقی کی حد ہے کہ کام آگے بڑھانا تو درکنار ہم نے خود چکبست ہی کو بالائے طاق رکھ دیا۔

رضا اس صورتِ حال کو برداشت نہ کر سکے، انھوں نے بیڑہ اٹھالیا کہ وہ چکبست کو اس کا جائز مقام دلائیں گے۔ انھوں نے پرانے رسائل کھنگالے اور ان کے نظم و نثر کے وہ شاہ پارے ڈھونڈ نکالے، جو آج تک کتابی شکل میں شائع نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت تک وہ چکبست اور باقیاتِ چکبست (نظم و نثر)، انتخابِ آتش و غالب از چکبست، کلیاتِ چکبست (نظم)، مقالاتِ چکبست (نثر) شائع کر چکے ہیں۔ اور ابھی مزید نظم و نثر اشاعت کے قابل ان کی تحویل میں ہے۔

غرض رضا صاحب کے کام کے کس کس پہلو پر گفتگو کی جائے۔ دل سے دعا نکلتی ہے کہ خدائے بزرگ و برتر انھیں اپنی حفظ و امان میں رکھے اور وہ اسی طرح تا دیر علم و ادب کی خدمت کرتے رہیں

ڈاکٹر گیان چند

نگارشاتِ رضا

کالی داس گپتا کے لیئے اردو ذریعۂ معاش نہیں اس کے باوجود اردو ان کا اوڑھنا بچھونا ہے ۱۹۶۸ء اور ۱۹۸۴ء کے درمیان وہ ۱۹ تصنیفات و تالیفات منظرِ عام لا چکے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کتابیں انھوں نے خود ہی شائع کی ہیں اور ان کی عطا کردہ (ع ۱۹ کے سوا) یہ سب کتب میرے پاس ہیں۔ تاریخی ترتیب سے ان کے نام یہ ہیں۔

۱۔ شعلۂ خاموش، شعری مجموعہ، ۶۸ء۔ ۲۔ شورشِ پنہاں، شعری مجموعہ، ۷۰ء۔ ۳۔ شاخِ گل، شعری مجموعہ، ۷۴ء۔ ۴۔ اجالے، اسلامی نظمیں، ۷۵ء۔ ۵۔

انگریزی نظمیں ۷۵ء۔ ۶۔ مکتوباتِ جوش ملسیانی بنام رضا، اگست ۷۶ء۔

۷۔ منشورات جوش ملسیانی، ۷۷ء۔ ۸۔ دعائے صباح، دسمبر ۷۷ء۔ ۹۔ ہندوستانی مشرق افریقہ میں، دسمبر ۷۷ء۔ ۱۰۔ متعلقاتِ غالب، اگست ۷۸ء۔ ۱۱۔ چکبست اور باقیاتِ چکبست مارچ ۷۹ء۔ ۱۲۔ شعورِ غم، رثائی نظمیں، نومبر ۷۹ء۔ ۱۳۔ سہو و سراغ، جنوری ۸۰ء۔ ۱۴۔ انتخاب آتش و غالب از چکبست مارچ ۸۰ء۔ ۱۵۔ شعاعِ جاوید، رباعیوں کا مجموعہ آخر ۱۹۸۰ء۔ ۱۶۔ کلیات چکبست، جنوری ۱۹۸۱ء۔ ۱۷۔ غالبیات، چند عنوانات، جنوری ۱۹۸۲ء۔ ۱۸۔ مقالاتِ چکبست، جنوری ۱۹۸۳ء۔ ۱۹۔ شب نشیں (زیرِ طبع ۱۹۸۴ء) شعری مجموعہ۔

موضوع کے اعتبار سے ان کی گروہ بندی یوں کی جائے گی۔

(ا) ترتیب متن۔

۱۔ مکتوباتِ جوش ملسیانی بنام رضا۔ اگست ۷۶ء۔ ۲۔ منشورات جوش ملسیانی، ۷۷ء۔

۳۔ دعائے صباح، دسمبر ۷۷ء۔ ۴۔ چکبست اور باقیاتِ چکبست، مارچ ۷۹ء۔ ۵۔ انتخاب آتش و غالب از چکبست، مارچ ۸۰ء۔ ۶۔ کلیاتِ چکبست جنوری ۱۹۸۱ء۔ مقالاتِ چکبست جنوری ۱۹۸۳ء

ب۔ تحقیقی مضامین کے مجموعے۔

۸۔ متعلقاتِ غالب، اگست ۷۸ء۔ ۹۔ سہو وسراغ جنوری ۸۰ء۔ ۱۰۔ غالبیات، چند عنوانات ۲۶ جنوری ۸۲ء

ج۔ تاریخ وجغرافیہ

۱۱۔ ہندوستانی مشرقی افریقہ میں (جلد اول) دسمبر ۷۷ء

د۔ شاعری۔

۱۲۔ شعلۂ خاموش، ۶۸ء۔ ۱۳۔ شورش پنہاں ۷۰ء۔ ۱۴۔ شاخِ گل ۷۴ء۔ ۱۵۔ اجالے ۷۵ء۔ ۱۶۔ شعورِ غم نومبر ۷۹ء۔ ۱۷۔ شعاع جاوید (رباعیوں کا مجموعہ) ۱۹۸۰ء ۱۸۔ شب نشیں (زیر طبع ہے)

ہ۔ انگریزی نظمیں۔

۱۹۔ The Silent Flame ۱۹۷۵ء

ذیل میں ان تمام کتابوں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

ا۔ ترتیب متن

ا۔ مکتوبات جوش ملسیانی بنام رضا۔ رضا صاحب جوش ملسیانی کے شاگرد ہیں۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۷۴ء تک جوش صاحب نے رضا صاحب کو تقریباً سو خطوط لکھے ہوں گے جن میں سے ۵۵ محفوظ رہ گئے۔ ان خطوں کو رضا صاحب نے اگست ۷۶ء میں شائع کر دیا۔ مجموعے کے شروع میں عرش ملسیانی کا دو صفحوں کا تعارف ہے، پھر رضا صاحب کا مضمون "استاذی قبلہ جوش ملسیانی مرحوم (چند یادیں)" جو ۱۳ صفحات کو محیط ہے۔ اور اس کے بعد عرش ملسیانی کا مضمون "میرے والد محترم"۔ اس کے بعد خطوط ہیں۔ جوش داغ کے شاگرد تھے اس لیئے زبان کے رموز اور سخن کے نکات پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ ان خطوط کا موضوع بیشتر اصلاح سخن اور نکات زبان ہی ہے۔ یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ داغ اسکول کے زیر اثر وہ زبان کو لغت کا پیرو سمجھتے تھے۔ خاص وعام کی زبانوں پر چڑھ کر تلفظ میں جو تصرفات ہو گئے ہیں وہ انھیں جائز نہیں قرار دیتے۔ مثلاً یہ اصرار کہ رِضا میں رائے مفتوح ہی درست ہے (ص ۴۵)، رمضان میں میم متحرک ہی صحیح ہے (ص ۶۱) چاہت متروک ہے (ص ۵)، فضا ف کے زبر سے ہے (ص ۶)، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اردو میں رضا کو مفتوح، رمضان کو میم ساکن سے اور فضا کو ف کے زبر اور زیر دونوں سے، بلکہ زیر سے زیادہ بولا جاتا ہے۔ رمت اور چاہت جیسے الفاظ کو

یہ گویا مضامین چکبست حصہ دوم ہے۔ ان نثری تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ مضامین چکبست چکبست کے جملہ نثری مضامین کو محیط نہیں تھا بلکہ ان کا انتخاب تھا۔ معرکۂ چکبست و شرر کے دوران اودھ پنچ میں جنت کی ڈاک کا جو طویل سلسلہ تھا اگر یہ طے کر لیا جائے کہ وہ چکبست کا کارنامہ تھا، تو باقیاتِ نثر میں بڑا اضافہ ہو جائے۔ کتاب کے ص ۹۲ پر اسے انہوں نے چکبست کی تصانیف کی فہرست میں شامل کیا ہے لیکن معلوم نہیں کیوں اسے اور بعض دوسری چیزوں کو، جن کی نشان دہی خود ان ہی کی ہے، انھوں نے اپنے مجموعے باقیات چکبست میں شامل نہیں کیا۔

باقیات کے نثری حصے کے بعد پندرہ صفحات پر ایسی نظمیں ہیں جو صبح وطن میں شامل نہیں۔ یہ ان کی مرتبہ کلیات چکبست میں لے لی گئی ہیں۔ کتاب کے آخر میں کتابیات کے بعد ایک جامع اشاریۂ اشخاص ہے۔

۵۔ انتخاب آتش و غالب از چکبست مارچ ۱۹۸۰ء

چکبست اپنے رسالہ صبح امید میں ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۱ء تک یادۂ کہن کے طور پر اپنے محبوب شعرا، آتش و غالب کا انتخاب شائع کیا کیے۔ رضا صاحب کو چار یا پنچ شماروں کے سوا، بقیہ سب مل گئے۔ انھوں نے اس انتخاب کو کتابی صورت میں چھاپ دیا ہے ص ۱۲ سے ۹۵ تک متن ہے۔ پوری جلد میں ہر مصرع کو ایک سطر میں یعنی ہر شعر کو دو سطروں میں لکھا ہے۔ کاغذ کی اس گرانی کے زمانے میں یہ اسراف ہے۔ انتخاب کلام بالکل ذاتی اور موضوعی معلوم ہوتا ہے۔ گو اس انتخاب میں دونوں شعرا کے بہت کچھ اچھے اشعار آ گئے ہیں لیکن متعدد اشعار ایسے بھی ہیں جنھیں ان کے بہترین کلام میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً۔

قاتل سمجھ کے تیغ لگا، جائے شرم ہے
تسمہ لگا جو گردن بسمل میں رہ گیا

شہر کو نالوں نے مجھ مجنوں کے صحرا کر دیا
جوشِ سیلِ اشک نے چشموں کو دریا کر دیا

حالت نزع ہے صورت کوئی بچنے کی نہیں
اٹھ گیا رو کے، جو آیا ترے بیمار کے پاس

ہاتھ قاتل کا ترے خنجر تک آ کر رہ گیا
کہنیوں تک آستینوں کو چڑھا کر رہ گیا

اے ترک مست! بہر خدا، عید گاہ چل
آہو کباب ہوتے ہیں شوقِ شکار میں

غالب

دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد　　کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب　　گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں　　مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

ان اشعار کے شمول سے چکبست کے مذاقِ سخن کے بارے میں اچھی رائے قائم نہیں ہوتی۔ دوسری طرف دونوں شعرا کے کئی اچھے اشعار انتخاب میں دکھائی نہیں دیتے۔ مثلاً غالب کی ذیل کے اشعار والی غزلیں بالکل غائب ہیں۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی　　ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا　　یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا　　آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

ایک امکان ہے کہ رضا صاحب کو صبحِ امید کے جو چند شمارے نہیں ملے یہ غزلیں ان میں ہی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ چکبست نے انتخاب کا یہ سلسلہ رسالے کا پیٹ بھرنے کے لیے کیا ہوگا۔ رضا صاحب نے اسے غیر ضروری اہمیت دی اور شائع کر دیا۔ اردو والوں کے وسائل محدود ہوتے ہیں۔ اس انتخاب سے کہیں زیادہ بیش بہا کتنے مخطوطات منتظرِ اشاعت ہیں لیکن کوئی ان پر چشمِ کرم نہیں کرتا۔ مثلاً رام پور اور انڈیا آفس میں رنگین کی غیر مطبوعہ مثنوی دل پذیر، بر بہ قلم مصنف ہے، ندوۃ العلما لکھنؤ میں ہوس کی بہت اچھی مثنوی گل و صنوبر شاہ ہے اور مصحفی کا پورا کلام اب تک شائع نہیں ہوا۔ غالب کا دیوان عام طور پر ملتا ہے اور ڈاکٹر اعجاز حسین کا انتخاب کلامِ آتش موجود ہے۔ رضا صاحب اپنے وسائل کو کسی بہتر مصرف میں لاتے تو اردو کی زیادہ خدمت ہوتی۔

۶۔ کلیاتِ چکبست (نظم) جنوری ۱۹۸۱ء

چکبستیات کے سلسلے کی یہ تیسری کڑی ہے۔ وہ مقالاتِ چکبست شائع کر کے اس سلسلے کو مکمل کریں گے۔ میرے نزدیک کلیاتِ چکبست رضا صاحب کا اہم ترین کارنامہ ہے۔ اس میں ترتیبِ متن کے جملہ تقاضے پورے کیے گئے ہیں۔ اس کی ابتدا میں ۸۶ صفحات کا مقدمہ ہے اس کے بعد متن، آخر میں اشاریہ۔ مقدمہ کا عنوان "حصۂ نثر" دیا ہے اور متن کا "حصۂ شعر"۔ چونکہ نثر مرتب کے قلم سے ہے اور شعر چکبست کے ہیں اس لیے دونوں کے عنوانات

کو ایک سطح پر نہ رکھ کر حصۂ نثر کو مقدمہ کہا جاتا تو موزوں تر ہوتا۔

مقدمے میں اور توقیتِ چکبست ہے۔ پھر تصانیفِ چکبست کی فہرست ہے۔ اس کے بعد نظم، غزل اور رباعی پر تفصیل سے لکھا ہے۔ یعنی اہم نظموں اور غزلوں کی تخلیق کا تاریخی اعتبار سے تعارف کرایا ہے شاعری کا ارتقا واضح کیا ہے۔ اس کے آگے عنوان ہے تقلیدِ غالب و آتش۔ اس میں انھوں نے اس غلط فہمی کی تردید کی ہے کہ غزل میں چکبست غالب اور آتش کے مقلد تھے رضا صاحب نے ہر طرح غزلوں کے اشعار دے کر ثابت کر دیا ہے کہ چکبست کا رنگ اور ہے آتش و غالب کا اور۔ آتش دبستانِ لکھنؤ کے شاعر تھے، چکبست کے یہاں اخلاقی پہلو غالب رہتا ہے۔ اس سلسلے میں رضا صاحب نے یہ بات بڑے مزے کی کہی ہے۔

"جو نقاد تحقیقی شعور سے بے بہرہ ہوتے ہیں ان کے یہاں تو کھوکھلے حرفوں کے جوڑ توڑ کے سوائے کچھ ملتا ہی نہیں۔ انشا پردازی سنگھاسن پر براجمان رہتی ہے اور تنقید ہاتھ پھیلائے بھیک مانگ رہی ہوتی ہے" ص ۵۲

اگلا مفید عنوان ہے "زبان و بیان کے معترضین"، چکبست کے کلام پر بعض لکھنے والوں، بالخصوص محمد یحییٰ تنہا نے جو اعتراض کیے تھے اس کا رضا صاحب نے ایسا عالمانہ جواب دیا ہے جیسا چکبست نے نسیم کے معترضین کو دیا تھا۔ مختلف الفاظ، محاورات اور روزمرہ کی صحت کی تائید میں وہ لکھنوی اساتذہ کے کلام سے جو اسناد ڈھونڈھ کر لائے ہیں اس کی داد دینی پڑتی ہے۔ اسناد میں وہ رند، بحر، جلیل، صفی، لطافت، تعشق، رشک، شرف لکھنوی اور سراج لکھنوی کے اشعار بھی نقل کرتے ہیں۔ کلاسکی ادب کا ماہر ہی ان کے کلام پر ایسی نگاہ رکھ سکتا ہے۔

مقدمے کے حرف آخر میں اس مجموعے کی ترتیب کی تفصیل دی ہے۔ متن میں انھوں نے صبح وطن کے علاوہ چکبست کا بقیہ سب کلام لے لیا ہے۔

متن کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، نظم، غزل اور رباعی۔ ترتیب تاریخی ہے اور یہ صبح وطن پر اضافہ ہے۔ بعض نظموں کی تاریخ یقینی نہیں معلوم ہو سکی۔ انھیں قیاساً ان کے مناسب مقام پر رکھا گیا ہے۔ صبح وطن میں بعض اشعار کی تکرار، اغلاط طباعت، نظموں کی تاریخ کا غلط اندراج راہ پا گیا تھا۔ اس مجموعے میں اصلاح کر دی گئی ہے۔ کلام چکبست میں اختلاف نسخ کی گنجائش تقریباً نہیں ہے۔ جہاں کہیں تھی اسے مرتب نے فٹ نوٹ

میں درج کیا ہے۔ مختلف اشعار اور نظموں پر حواشی بھی کافی ہیں۔ انھیں بھی متعلقہ صفحہ کے فٹ نوٹ میں دیا ہے۔ مقدمہ میں مرتب نے صراحت کر دی ہے کہ قاری عموماً متن کے آخر میں دیے ہوئے حواشی کو نہیں پڑھتا اس لیے انھیں فٹ نوٹ میں لکھنے ہی پر ترجیح دی گئی۔

مرتب نے کئی نظموں اور اشعار کے حوالے کے طور پر اپنی کتاب "چکبست اور باقیاتِ چکبست" کا صفحہ دینا کافی سمجھا ہے مثلاً انتسابی نظم کے بعد پہلی نظم حبِ قومی (ص ۹۵) غزلیات کے اشعار میں ص ۳۰۴ پر اسی کتاب کا حوالہ ملتا ہے جس سے ہمیں کوئی روشنی نہیں ملتی۔ حوالے کو خود مکتفی ہونا چاہیے یعنی ماخذ اصلی کا برملا اظہار ہو۔ مرتب کو اس میں سہولت ہوئی کہ مستقل نوٹ نہیں لکھنا پڑا لیکن قاری کے لیے دقت ہو گئی۔ یہ ایک کمی ہے کہ بار بار باقیات چکبست نکال کر دیکھنا پڑتا ہے

کتاب کے آخر میں افراد، مقامات اور کتب و رسائل وغیرہ کا اشاریہ ہے۔ غرض یہ کہ یہ ایک معتبر محقق کا معتبر کارنامہ ہے۔

۷۔ مقالات چکبست ۔ ۱۹ جنوری ۱۹۸۳ء

رضا صاحب کی کئی کتابیں جنوری کے مہینہ میں شائع ہوئی ہیں مثلاً سہو دسراغ جنوری ۸۰ء میں، کلیاتِ چکبست ۱۹ر جنوری ۸۱ء کو، غالبیات چند عنوانات جنوری ۸۲ء کو اور مقالاتِ چکبست ۱۹ر جنوری ۸۳ء کو۔

میں ۱۹ جنوری کی تاریخ دیکھ کر حیران تھا کیوں کہ کسی کتاب کی اشاعت کی اتنی قطعی تاریخ طباعت سے قبل کیونکر جانی جا سکتی ہے۔ ہاں اس دن کوئی رسم اجرا کرنی ہو تو دوسری بات ہے مجھے گمان تھا کہ ۱۹ر جنوری رضا صاحب کے اہل خاندان میں سے کسی کی سالگرہ تو نہیں مقالات چکبست میں چکبست کی توقیت دیکھی تو معلوم ہوا کہ یہ ان کے محبوب شاعر برج نرائن چکبست کی ولادت کا دن ہے۔

چکبست کے سلسلے میں رضا صاحب کا یہ چوتھا کام ہے جس پر یہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے کلیات چکبست کے بعد تدوین چکبست میں یہ ان کا ایک اور زریں کارنامہ ہے۔ اس کے شروع میں مرتب کا کوئی دیباچہ نہیں لیکن ص ۵۳ پر حرف آخر کے عنوان سے جو ایک صفحے کی تحریر ہے وہ دراصل ایک مختصر دیباچہ ہی ہے جسے مجموعے میں سب سے پہلے دینا چاہیے تھا

کتاب کے تین حصے ہیں۔

پہلا حصہ دراصل ایک تفصیلی اور تجزیاتی مقدمہ ہے جسے مرتب نے مختلف عنوانات کے تحت لکھا ہے۔ دوسرے حصے میں چکبست کی متفرق نثری تحریریں ہیں۔ تیسرا حصہ اشاریہ ہے اسے علاحدہ حصہ قرار دینے کی ضرورت نہ تھی۔

پہلا حصہ بیشتر تحقیقی ہے اس میں سب سے پہلے ایک معتبر توقیت چکبست ہے جس کے بعد تصانیف چکبست کی وضاحتی فہرست ہے، اس میں پہلی کتاب صبح وطن ہے جس کے بارے میں فاضل مرتب کا قول ہے کہ یہ مجموعہ پہلے پہل ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا۔ یہ بات انھوں نے راس مسعود کے انتخاب زریں اور عطیہ نشاط کے مرتبہ ڈرامہ کملا کے مقدمہ کے حوالے سے کی ہے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر سیّد محمد عقیل مُصر ہیں کہ ۱۹۱۸ء میں اس کا کوئی ایڈیشن نہیں نکلا۔ ۱۹۲۶ء کا ایڈیشن ہی پہلا ایڈیشن ہے۔ رضا صاحب نے میرے نام ایک خط میں تسلیم کیا ہے کہ انھوں نے ۱۹۱۸ء کا ایڈیشن خود نہیں دیکھا اب انھیں دوسروں کے بیانات سے قطع نظر خود دریافت کرنا چاہیئے کہ کیا ۱۹۲۶ء سے پہلے صبحِ وطن واقعی چھپی تھی۔

تصانیف کے بعد ایک اور اہم تر توقیت ہے جس کا عنوان ہے۔ رسالہ صبح امید کے علاوہ چکبست کی نگارشات کی توقیت۔ اس میں سال بہ سال رسالوں میں شائع ہونے والے چکبست کے مضامین کی تفصیل ہے یعنی رسالے کے شمارے کی نشان دہی، مضمون کا عنوان اور اس مجموعے کا نام جس میں بعد میں یہ مضمون شامل کیا گیا۔ اتنی صحت اور جامعیت کے ساتھ ہر مضمون کی نشان دہی نہایت مشکل کام تھا۔ ایک اور جزو میں "سوانحی، تنقیدی مضامین، متفرق دیباچے، رپورٹ تاثر وغیرہ کی گروہ بندی کی گئی ہے اور ان کا تعارف پیش کیا ہے۔ اگلے جزو میں رسالہ صبحِ امید کے مشمولات کی گروہ بندی کی ہے۔

دوسرا حصہ نفسِ کتاب ہے جس میں چکبست کی وہ نثری تحریریں شامل ہیں جو مضامین چکبست اور باقیات چکبست میں شامل نہ تھیں۔ ان تحریروں کے دو اہم زمرے مباحثہ، گلزارنسیم کے سلسلے کے مضامین اور صبح امید میں رفتار قوم کے سلسلے کے مضامین ہیں۔

گلزارنسیم سے متعلق مضامین میں تین مصرعوں میں کچھ فرق دکھائی دیا۔

ص ۶۳ اٹھ گئے نسیم جس دن سے۔ (صحیح) اٹھ گئے ہیں نسیم جس دن سے

ص ۸۸۔ ے اندازِ قدرت می شناسم (صحیح) من اندازِ قدرت رامی شناسم
〃 ۱۱۵۔ کچھ سوچ میں ہو نسیم بولو 〃 کس سوچ میں ہو نسیم بولو

پہلے مصرعہ میں "ہیں" کا حذف سہو کتابت ہو سکتا ہے۔ بعد کے دو مصرعوں کا صحیح متن میں نے رضا صاحب کو لکھ بھیجا۔ انھوں نے جواب دیا کہ وہ صحیح متن سے واقف تھے لیکن خود چکبست نے جو متن لکھا تھا اسی کو چھاپنے پر مجبور تھے۔ ان کا یہ طریق صحیح ہے لیکن انھیں چاہیئے تھا کہ ان مصرعوں کے آگے قوسین میں (کذا) لکھ کر فٹ نوٹ میں صحیح متن لکھ دیتے۔

چکبست کے جو مضامین مجموعے میں شامل ہیں ان میں سے مباحثہ، گلزار نسیم کے سلسلے سے تو اکثر قارئین واقف ہوں گے لیکن صبح امید کے مشمولات سے نہیں۔ ان میں دو مفید عنوانات ہیں۔ ایک تو معاصر کتابوں پر تبصرے، دوم رسالوں کے معاصر شماروں کے قابل ذکر مضامین کا جائزہ۔ ان جائزوں میں مبصر چکبست کی ایک جھلک ملتی ہے۔

رضا صاحب نے چکبست کے سلسلے میں جو وقیع کام کیا ہے وہ ڈاکٹریٹ کی اعلا ڈگری سے بھی زیادہ ہے۔ جو محقق ڈگری سے بے نیاز ہو کر اپنے طور پر تحقیق کرتے ہیں وہی تحقیق کے بہتر اور پائیدار کارنامے پیش کرتے ہیں۔ جہاں تک چکبست کا سوال ہے ان کے سب سے بڑے محقق، محب اور محسن کالی داس گپتا ہی ہیں۔

(ب) تحقیقی مضامین کے مجموعے

رضا صاحب کے مضامین کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں سے کچھ کو دو مجموعوں میں لے لیا گیا ہے لیکن ابھی کئی مجموعے تیار ہو سکتے ہیں۔ شائع شدہ مجموعے حسب ذیل ہیں۔

۸ متعلقات غالب۔ اگست ۸۷ء

غالب پر کوئی کتاب لکھی جائے تو نام کی تلاش بھی ایک مسئلہ ہو جاتا ہے۔ رضا صاحب کو اپنے مجموعے کے لیے یہی نام سوجھ سکا۔ اس کا پیش لفظ راقم الحروف نے لکھا ہے مجموعے میں صرف چھ مضمون ہیں جن کے بعد اشاریہ اور کتابیات ہیں۔ مضامین کے عنوانات یہ ہیں۔ ۱۔ غزل قدسی اور تضمین غالب۔ ۲ دعائے صباح۔ ۳ مرزا عباس بیگ مرحوم (خواہرزادۂ غالب)۔ ۴ مرزا افضل بیگ مرحوم۔ ۵ غالب بنام سیاح و میر غلام بابا خاں۔ ۶ ذکا شاگرد غالب اور اس کا غیر مطبوعہ اردو دیوان۔

ان مضامین میں صرف مضمون نمبر ۲. براہ راست غالب پر ہے بقیہ سب مضامین غالب کے اقارب و تلامذہ کے بارے میں ہیں۔ چونکہ کالی داس صاحب کسی تدریسی ادارے سے متعلق نہیں رہے اس لیے بعض اوقات ان کی تحقیقی تحریریں سکہ بند تحقیقی مضامین سے قدرے مختلف رنگ کی ہوتی ہیں۔ اس مجموعے کے مضامین کی قدرِ مشترک یہ ہے کہ سب کا موضوع غیر دلچسپ ہے۔ یہ مالک رام، امتیاز علی، عرشی اور قاضی عبدالودود ہی کی دلچسپی کے ہوسکتے ہیں۔ دوسرے قارئین یہ تسلیم کرلیں گے کہ ان کی تحقیق پُر مغز ہے لیکن وہ شاید انھیں چاؤ اور لگن کے ساتھ پڑھنا نہ چاہیں۔

غزلِ قدسی کی تضمین سے متعلق رضا نے ایک ادبی سرقے کا بھانڈا پھوڑا ہے۔ غالب بنام سیاح و میر غلام بابا خاں میں آپ نے غالب کے دو غیر مطبوعہ فارسی قطعات پیش کئے ہیں۔ یہ قطعات آپ کے پاس بخط غالب محفوظ ہیں۔ دعائے صباح پر جو مضمون اس مجموعے میں شامل ہے اُسی کو بڑھا کر اس نام کی کتاب میں مقدمے کے طور پر شامل کردیا گیا

کتاب کے آخر میں حسبِ معمول اشاریہ اور فہرستِ کتابیات ہے۔ اشاریہ بہت مفید شے ہوتا ہے لیکن چونکہ اس کا تیار کرنا محنت طلب ہوتا ہے اس لیے کم لکھنے والے ہی اس ضروری کھکھیڑ میں پڑتے ہیں۔

۹۔ سہو و سراغ۔ جنوری ۱۹۸۰ء

یہ ان کے متفرق تحقیقی اور چند تخلیقی مضامین کا مجموعہ ہے جس کی ترکیب صابر دت نے کی۔ میرے نزدیک مضامین کا مجموعہ مستقل کتاب سے کم تر درجے کی چیز ہوتا ہے۔ اگر مجموعے کے تمام مضامین ایک فرد یا ایک صنف سے متعلق ہوں تو انھیں بھی کسی حد تک مستقل کتاب کے لگ بھگ ٹھہرا سکتے ہیں مثلاً کالی داس صاحب کی متعلقاتِ غالب، میری رموز غالب اور لسانی مطالعے، ڈاکٹر نورالحسن نقوی کی سرسید اور ہندوستانی مسلمان۔ اگر مضامین کی شیرازہ بندی کرنے والی کوئی ایسی کڑی نہ ہو تو کم از کم یہ تو ہو کہ تمام مضامین ایک ہی رنگ و نوعیت کے ہوں یعنی ان میں اتحاد کیر کٹر ہو مثلاً سرور و احتشام کے مضامین کے مجموعے (تمام تنقیدی)، یا مسعود حسن رضوی کی نگارشاتِ ادب، یا ڈاکٹر سید حسن کی "چند تحقیقی مقالے" (دونوں تحقیقی) ایک دفعہ کی تحقیق و تنقید کے مقالات کی ہم نشینی کو برداشت کیا جاسکتا ہے، لیکن اس سے آگے ہو تو چوں بچوں کا مربہ ہو جاتا ہے اور اس بدعت کا بڑا مرتکب میں ہوں

میرے مجموعے "تحریریں" میں تحقیقی، تنقیدی اور ایک آدھ تخلیقی مضمون یکجا ہیں۔ تجزیے اور ذکر و فکر میں تحقیقی، تنقیدی اور تاثراتی مضامین ہیں۔ حقائق میں تحقیق، تنقید اور لسانیات کو ایک کھونٹے سے باندھ دیا گیا ہے۔

شاید میری ہوس بازی سے گمراہ ہو کر صابر دت نے بھی سہو و سراغ میں تحقیقی کے ساتھ تخلیقی یعنی انشائی مضامین بھی شامل کر دیے۔ میں نے کالی داس صاحب کو لکھا کہ اس میں تحقیقی کے ساتھ انشائی مضامین بھی یکجا کر دیے گئے ہیں، نیز انشائی مضامین کے ساتھ تنقیدی بلکہ تحقیقی مضامین کو بھی گڈمڈ کر دیا گیا ہے۔ ایسا کیوں؟ انھوں نے جواب دیا کہ اس کی ذمہ داری صابر دت پر ہے جنھوں نے اپنے حسب خواہش مضامین کو مجتمع کر دیا۔

مجموعے کا پہلا عنوان ہے۔ "سن رکھو تم فسانہ ہیں ہم لوگ" یہ ایک چھوٹا سا تذکرہ، بلکہ یوں کہیے کہ تذکرے کا جزو معلوم ہوتا ہے جس میں لکھنؤ کے ۱۲ اور فیض آباد کے ایک شاعر کا تذکرہ حروف تہجی کے اعتبار سے ہے ان میں جہاں آتش، ناسخ، سرب سکھ دیوانہ، امانت، اشک، وزیر، جیسے مشاہیر ہیں وہاں گوز بخش ادیب لکھنوی اور جرار فیض آبادی جیسے مجہول الاسم نام بھی ہیں۔ معلوم نہیں آتش اور ناسخ جیسے شعرا کے بارے میں ایک ڈیڑھ صفحے کے حالات لکھنے کی کیا افادیت ہے۔ اس کے باوجود ماننا ہوگا کہ ان حالات میں تحقیق کے سراغ دکھائی دیتے ہیں مثلاً دیوان وزیر کے سنہ ترتیب و طباعت کے بارے میں ڈاکٹر رام بابو سکسینہ اور ابو اللیث صدیقی کے بیانات میں جو اختلافات تھے انھوں نے بات کو الجھا دیا تھا۔ یہ رضا ہی جان سکتے تھے کہ ۱۲۶۳ھ ہجری نہیں فصلی ہے اور اس طرح صحیح ہے۔

اس طویل مضمون یا وفاق مضامین کے بعد ۱۵ تحقیقی مضامین ہیں جو اس مجموعے کی جان ہیں۔ ان میں دو مضامین "چند قدیم ہندو مرثیہ گو" اور "قدیم ہندو شعرا کی چند نعتیں" بھی کسی قدر تذکروی انداز میں ہیں لیکن اپنے موضوع کے پیش نظر افادیت سے خالی نہیں۔ ان تمام مضامین کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ غیر دل چسپ، خشک، تحقیقی اسلوب میں نہیں لکھے گئے ان میں ایک مضمون "چند مشہور شعرا، اور ان کے خالق" بہت دل چسپ اور معلومات افزا ہے۔ معاصر حصہ اول و دوم میں قاضی عبدالودود نے آوارہ گرد اشعار کے عنوان سے اسی قسم کا مضمون لکھا تھا اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ڈاکٹر حنیف احمد نقوی نے بھی کسی مضمون میں لا اعلم و لا ادری قسم کے اشعار کے مصنفوں کی نشان دہی کی تھی۔ رضا صاحب کے مضمون میں

ان کی کھوج پر داد دینی پڑتی ہے۔

اس کے آگے کا مضمون "غالبیات" ہے جس میں بعض کتابوں کے غالب سے متعلق اقتباسات یا بیانات کو لے کر ان کی تصحیح کی گئی ہے۔

مجموعے کا آخری جزو رفتار قلم کے عنوان سے ہے جو دس مضامین پر مشتمل ہے۔ اس میں بعض مضامین مزاحیہ ہیں مثلاً ہمارا تخلص، ہم اڈیٹر تھے چھپ چکے ہیں مثلاً حسینا درگادیوی، عبدل بابا، حکیم راؤ امین خاں۔ دلی سے دلی تک انشائیہ ہے لیکن مزاحیہ نہیں "میرے استاد محترم" اور مولانا ماہر القادری، دو مشہور ادیبوں کے بارے میں ہیں۔ یہ دونوں مضامین اور آبِ حیات میں ہندو شعراء کا تذکرہ، سب سے پہلے جزو میں رکھے جانے چاہئیں نہ کہ، رفتارِ قلم کے انشائی حصے میں۔

اچھا یہ ہوتا کہ انشائی مضامین اس مجموعے میں شامل نہ کیئے جاتے کیوں کہ ان میں کسی سہو کا سراغ نہیں لگایا گیا۔ اس خلفشار کی ذمہ داری مرتب کی ہے مصنف کی نہیں۔

القصہ سہو و سراغ کا مجموعہ تحقیق و معلومات افزائی کے لحاظ سے کالی داس صاحب کی طرح متمول ہے۔ انھوں نے تحقیق کر کے جو کچھ لکھ دیا ہے اس کی صحت پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔

غالبیات، چند عنوانات۔ تاریخ اشاعت ۲۶ر جنوری ۱۹۸۲ء۔ تاریخ اشاعت کی قطعیت توجہ طلب ہے۔ رضا صاحب کے مضامین کا بھی یہ تیسرا مجموعہ ہے اور غالبیات پر بھی ان کی تیسری کتاب۔ پہلی دو متعلقات غالب اور دعائے صباح ہیں۔ سہو و سراغ میں بھی ایک طویل باب غالبیات کا ہے۔ ان تمام تحریروں کی بنا پر رضا صاحب ماہر غالبیات کی بزم میں اپنا مقام بنا چکے ہیں۔ زیر نظر کتاب آٹھ مضامین پر مشتمل ہے

۱۔ غالب کا ملازم خاص کلو داروغہ۔ ۲۔ غوث علی شاہ قلندر پانی پتی اور مرزا غالب۔ ۳۔ مکتوبات شوکت شاگرد غالب۔ ۴۔ سید جمیل الدین بغدادی مرحوم۔ ۵۔ بیاض جمیل۔ ۶۔ بیاض رفعت۔ ۷۔ مولانا فضل حق خیر آبادی کا ایک تاریخی قصیدہ۔ ۸۔ مطالعات و مشاہدات۔

غالب سے جو بھی متعلق ہوا، جس نے بھی ان سے کچھ معاملہ کیا تاریخ ادب میں اس نے امر رس پی لیا۔

رضا صاحب کی کتاب متعلقات غالب میں ایسے کئی افراد کا ذکر ہے۔ مالک رام نے غالب کے تلامذہ کو اجاگر کیا۔ حمیدہ سلطان نے غالب کی بیوی امراؤ بیگم پر لکھا۔ رضا صاحب نے غالب کے داروغہ کلو کا انتخاب کیا۔ دیکھیئے اب غالب کے میاں مٹھو کو کون غالب پرست نوازتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ رضا صاحب نے کن کن ماخذ کو کھنگال کر کلو کے حالات بالخصوص اس کی تاریخ ولادت و وفات کو دریافت کیا ہے۔

دوسرا مضمون غوث علی شاہ قلندر اور مرزا غالب ہے۔ حیات اسماعیل کے مصنف ڈاکٹر سیفی پریمی نیز مالک رام کا انکشاف تھا کہ تذکرہ غوثیہ اس کے مبینہ مصنف گل حسن شاہ کی تالیف نہیں بلکہ اسماعیل میرٹھی کا کارنامہ ہے۔ رضا صاحب نے تردید کر کے دعویٰ کیا ہے کہ یہ دراصل گل حسن شاہ کی ہی تالیف ہے

جمیل الدین بغدادی پر مضمون میں ایک ایسے ماہر غالبیات کا تعارف ہے جس سے ماہر غالبیات کے علاوہ دوسرا واقف نہیں۔ بیاض جمیل انھیں کی دل چسپ بیاض ہے جس میں مختلف حضرات نے غالب سے متعلق کچھ لکھا ہے خواہ وہ غالب کا کوئی شعر ہی کیوں نہ ہو۔ اب یہ بیاض رضا صاحب کی ملک ہے۔ بیاض رفعت کا مضمون گاڑھی تحقیق میں شرابور ہے بیت الغزل آٹھواں مضمون مطالعات و مشاہدات ہے جو ۸۹ صفحوں پر مشتمل ہے۔ مضمون کیا ہے بچاس مشاہدات کا مجموعہ ہے اور ان میں سے ہر مشاہدہ ایک مختصر مضمون ہے جس میں کوئی نہ کوئی نئی بات پیش کی گئی ہے ان میں کسی آزمودہ کار مصنف کی غلطی افشا کی ہے یا غیر معروف یا کم معروف کتابوں میں غالب کے متعلق اندراجات کو پیش کیا ہے۔ مالک رام نے ذکر غالب میں لکھ دیا تھا کہ ۱۸۳۵ء میں بقول غالب ان پر چالیس پچاس ہزار ادیبوں کا قرضہ تھا۔ رضا صاحب نے توجہ دلائی ہے کہ یہ صریحاً مبالغہ ہے۔ غالب نے تفتہ کے نام ایک خط میں لکھا تھا۔

یہ الو کا پٹھا قتیل صفوتکدہ و شفقت کدہ و نشتر کدہ کو.... غلط کہتا ہے۔ ص ۱۳۸

غالب نے یہ بات قتیل کی کتاب نہر الفصاحت کے حوالے سے لکھی تھی۔ کوئی بھی غالب کے اعتراض کو بجا مان لیتا، نہر الفصاحت دیکھنے کی زحمت نہ کرتا۔ رضا صاحب نے اس کتاب کو دیکھا اور معلوم کیا قتیل نے حاشیہ میں ان سب الفاظ کے جواز کا اصول پیش کیا ہے۔ غالب نے دانستہ قتیل کی آدھی عبارت نقل کی۔ مشاہدات کے مضمون میں اسی طرح کے علمی

شرارے بکھرے ہوئے ہیں۔ مجموعے کے آخر میں افراد، مقامات اور کتب و رسائل کے تین اشاریے ہیں۔

ج۔ تاریخ و جغرافیہ۔

۱۱۔ ہندوستانی مشرقی افریقہ میں (جلد اول) دسمبر ۷۷ء

اس دبلی سی کتاب میں ۱۲۸ صفحات ہیں جن میں متنِ کتاب محض سو صفحات پر ہے میں نحیف کتابوں کا قائل نہیں۔ مشرقی افریقہ والی کتاب رضا صاحب نے میری تجویز پر لکھی۔ میں نے انھیں رائے دی کہ آپ اتنے عرصے تک افریقہ میں رہے ہیں (جوانی وہیں لٹادی) افریقہ کے حالات پر مشتمل ایک کتاب لکھ دیجئے۔ انھوں نے جھٹ سے ایک کتابچہ لکھ ڈالا لیکن اسے دیکھ کر میں نے ماتھا ٹھوک لیا۔ میں نے سوچا تھا کہ وہاں کے حبشیوں کی معاشرت اور افریقہ کے ریگ زاروں، پھل پھولوں اور جانوروں کے بارے میں ایک پڑھنے لائق، ذہن کو پکڑنے والی کتاب وجود میں آجائے گی جس کی سیر کرنے میں سند باد جہاز میں یا مارکوپولو کی مہموں کا مزا آجائیگا لیکن محقق کے ساتھ بڑی مصیبت ہے۔ انھوں نے افریقہ میں ہندوستانیوں کی تاریخ گھسیٹ دی اور جے رام شوجی، علی دیناو سرام اور معلوم نہیں کن کن پر ایک ایک فصل گھسیٹ دی۔ ان میں جسٹس چانن سنگھ کے بعض مقدموں کے فیصلے دلچسپ ہیں۔ افریقہ میں جو ہندوستانی سفارت کار بھیجے جاتے ہیں، ہوسکتا ہے یہ کتاب ان کے ڈھب کی ہو لیکن عام قاری کے سفر کی ساتھی نہیں ہوسکتی۔

اس کتاب کے شروع میں مالک رام نے تعارف لکھا ہے اس کے بعد مصنف کا دیباچہ ہے، پھر کتابیات جو دیباچے کا جزو ہوسکتی تھی کیوں کہ اس میں مصنف نے اپنے ماخذوں کی شرح کی ہے یعنی اس میں کتابوں کے محض نام نہیں بلکہ ان کے بارے میں تعارف و تبصرہ بھی ہے متن کتاب میں ایک ایک باب افریقہ اور مشرقی افریقہ کے جغرافیے پر ہے۔ اس کے بعد مشرقی افریقہ میں ہندوستانیوں کے بسنے کی روداد ہے۔ اسی اجمال کی شرح میں چار اہم ہندوستانیوں کو ایک ایک باب دیا گیا ہے۔ آخر میں ایک ضمیمہ ہے "بحر ہند کے گرداگرد سمندری سفر" جس میں ایک قدیم انگریزی کتاب کے اقتباس دیئے ہیں۔ سب سے آخر میں حسب معمول ایک اشاریہ ہے۔

دوسری جلد کینیا میں اردو کی ترویج سے متعلق ہوگی۔ دیکھیئے یہ کب تک آتی ہے یا آتی

بھی ہے کہ نہیں؟

نثری کتابوں کا تعارف ختم ہوا۔ رضا صاحب شاعر بھی ہیں۔ ان کی بیشتر شاعری افریقہ کی پیداوار ہے۔ ہندوستان آکر وہ نظم کے بجائے نثر بالخصوص تحقیق کے ہو کر رہ گئے۔ ذیل میں ان کے شعری مجموعوں کے بارے میں چند الفاظ کہے جاتے ہیں۔

۱۲۔ شعلۂ خاموش

یہ رضا صاحب کی پہلی کتاب ہے جو ۱۸۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس وقت تک یہ افریقہ ہی میں مقیم تھے۔ اس کے شروع میں انتساب ہے جو لالہ کشمیری لال گپتا، کینیا اور "ان شعراء اور ادبا کے نام" جو میری طرح اپنی پہلی کتاب کو منظر عام پر لاتے ہوئے جھجکتے ہیں،" ہے۔ اس کے آگے دو صفحے مصنف کے التماس کے ہیں جس کا یہ پہلا جملہ ہے۔

"مشق نہ ہونے کی وجہ سے مجھے اردو نثر لکھتے ہوئے سخت الجھن ہوتی ہے"

اس کے بعد کینیا ہائی کورٹ کے جسٹس چانن سنگھ کا 'پیش نامہ' ہے جو ۲۶ صفحات کو محیط ہے اس میں بڑی قدرت کے ساتھ رضا صاحب کے کلام کا جائزہ لیا گیا ہے اگر چانن سنگھ نے اس تحریر میں کسی دوسرے سے مدد نہیں لی تو انھیں اردو کا اچھا خاصا نقاد ماننا ہوگا۔ اس مقدمے کے بعد "حضرت شکیل بدایونی بی اے (علیگ)" کا ڈھائی صفحات کا مقدمہ 'حرفے چند' کے عنوان سے ہے اور پھر متن کتاب یعنی رضا صاحب کی شاعری ہے۔

یہ ان کا پہلا مجموعہ ہے جس میں ۴۲ء سے ۶۷ء تک کا کلام ہے لیکن پورا کلام نہیں منظومات کا ایک بڑا حصہ جو ہنگامی موضوعات پر لکھا گیا تھا حذف کر دیا گیا ہے۔ ابتدائی دو نظموں کے بعد مجموعے کے مشمولات یہ ہیں۔

خواب و حقیقت (نظمیں)، ماخوذات (منظوم ترجمے)، چنگ و رباب (گیت) زیب و زینت (رباعیات)، فراق و وصال غزلیں۔ ادھورے خاکے (متفرقات جن میں غزلیں، قطعے اور مفردات شامل ہیں)

ان کی ابتدائی نظموں میں کئی قوم پرستانہ اور بدیسی حکومت کے خلاف جہاد کے نعرے ہیں ساتھ ہی اس دور کے ترقی پسندوں کی طرح وہ 'محنت کشوں سے خطاب'، 'اے رکشا کھینچنے والے' وغیرہ کے عنوان سے بھی لکھتے ہیں اور 'ہند کا سپاہی' 'رفیقو اٹھو' وغیرہ بھی۔ ہیمو بقال اور لکشمی

پائی پر قومی نظمیں بھی ہیں۔ اور کینیا پہونچ کر کینیا ٹا اور افریقہ کی جھیل اور پہاڑوں پر بھی نظموں کے موضوعات میں بہت تنوع ہے۔ نظموں کی پختگی میں کہیں کہیں اقبال اور جوش کا رنگ دکھائی دیتا ہے مثلاً نظم 'اے ہم وطن' کے اشعار دیکھئے۔

ظلمتِ یاس کو انوارِ مسرت سے بدل　　شامِ افلاس میں دولت کی سحر پیدا کر
قلعۂ ظلم و ستم فتح جو کرنا ہے تجھے　　دستِ خالی ہی سے دیوار میں در پیدا کر
زور پیدا کر اگر جور مٹانا ہے تجھے　　دل جو لوہے کا، تو پتھر کا جگر پیدا کر

کینیا جب انگریزوں کے زیرِ نگیں تھا اور کینیا ٹا کو قید کیا گیا تو "داخلِ زنداں ہونا" کے عنوان سے انھوں نے ایسی ہی قوم پرستانہ نظم لکھی جو ہندوستان کے کسی لیڈر مثلاً مہاتما گاندھی کی گرفتاری پر لکھی جاتی۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ رضا صاحب بہت بڑے زردار ہیں لیکن چانن سنگھ نے اپنے مقدمے میں رضا صاحب کے ایسے اشعار کا ذکر کیا ہے جن میں آں جناب نے زرداروں کی مٹی پلید کی ہے۔

نادار کی رگ رگ سے لہو چوس ہی لیں گے　　انسان کے جامے میں یہ شیطان کے بچے

زردار کو ہاتھ زر سے دھونا ہوگا　　خود ساختہ اعتبار کھونا ہوگا
بکرے کی ماں منائے گی کب تک خیر　　اک دن تو اسے حلال ہونا ہوگا

مجموعے میں مذہبی یک جہتی کی نظمیں بھی کثرت سے ہیں۔ نعت، مولود یا معرکہ کربلا وغیرہ سے متعلق اسلامی نظموں کو بھی انھیں ہی میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

ایک دل چسپ نظم "بیوی سے شکوہ (جو دیر سے میکے میں ہے)" ہے۔ مجھے بے اختیار امیر مینائی اور داغ کا ایک مکالمہ یاد آتا ہے جو میں نے ڈاکٹر نثار احمد فاروقی اور دوسرے کئی حضرات سے سنا ہے اور جو سچ ہو سکتا ہے۔ ایک بار امیر مینائی نے داغ سے کہا کہ نواب صاحب کیا بات ہے کہ میری غزل میں آپ والی بات نہیں آتی۔ داغ نے پے بہ پے تین سوال کیے کہ آپ نے کبھی اغلام، زنا اور مے گساری کی ہے۔ مینائی صاحب نے لاحول و استغفار پڑھ کر برائت کا اظہار کیا۔ اس پر داغ نے کہا کہ پھر جورو کو نظر میں رکھ کر غزل کہی جائے گی تو ایسی ہی ہوگی۔

اردو شاعری میں محبوبہ بیوی سے علاحدہ کوئی نازنین نہیں ہوتی ہے۔ شاید رضا صاحب کی نئی شادی ہوئی ہوگی جو بیوی کو بلانے کے لیے اتنا تلخ طنز کرتے ہیں۔

آنا تم ارتھی پر آنا
نفرت کے پھول چڑھا جانا

یہاں کتاب پر تنقید لکھنا مقصود نہیں ورنہ اس مجموعے میں شعریت سے مملو اشعار کی کمی نہیں۔ کئی نظموں میں خالص شاعری ہے، گیتوں کا تو ذکر ہی کیا۔ میں غزل کے چند اشعار پر اکتفا کرتا ہوں۔

خرد کو لطف ملے کیا مرے فسانے میں
زمانہ ہوش میں کب تھا ترے زمانے میں

کیا ہوا جو تو ہے دنیا سے الگ
سن تو لے فریاد دنیا دار کی

کوئی قطرہ بھی مئے ناب کا ساغر میں نہیں
ہائے کس وقت مری جان لبوں پر آئی

یہ غلط ہے، حسن ہے آتش فشاں
عشق خود ہی شعلۂ خاموش ہے

غرضیکہ اس شعری مجموعے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ رضا کا بحیثیت شاعر اور زیادہ اعتراف ہونا چاہیئے تھا لیکن اردو کے دیار سے دور افریقہ کی وادیِ غیر ذی زرع میں فروکش ہونے کی وجہ سے شعری گم نامی کا شکار رہے۔

۱۳۔ شورشِ پنہاں ۱۹۷۰ء

اس مجموعے میں بھی قیامِ افریقہ کے دوران کا کلام ہے۔ اس پر ڈاکٹر صفدر آہ کا سات صفحوں کا دیباچہ ہے اور پھر مصنف کا عرض حال۔ مشمولات کی ترتیب یہ ہے

غزلیں، نظمیں، رباعیات، قطعات۔

آخر میں پہلے مجموعۂ کلام شعلۂ خاموش پر چند رائیں ہیں جو ۲۴ صفحات کو محیط ہیں۔ ان میں عفت موہانی، رسالہ دوام ٹانڈہ فیض آباد اور ہمدرد صحت ڈائجسٹ کراچی کی رائیں بھی شامل ہیں۔ جو چنداں معتبر نہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ رضا نے اس مجموعے کی نظموں میں پہلے مجموعے سے آگے ترقی کا قدم رکھا ہے اب کی بار انھوں نے ہیئت میں بھی کسی قدر تجربے کیئے ہیں۔ کشمکش نام کی نظم ملاحظہ ہو

وہی میں ہوں وہی ساحل، وہی موجیں وہی طوفاں

وہی اس پار میری زندگی
مجھ سے جدا ہو کر

دوبارہ مجھ میں آملنے کی سوزش میں تڑپتی ہے۔
وہی رستے میں حائل ہے سمندر دین و دنیا کا
وہی الفت کی کشتی
ڈگمگاتی ڈوبتی بہتی
کہیں ساحل پہ جا لگنے کی خواہش میں تڑپتی ہے
وہی کالی گھٹائیں آسماں پر یاس و حسرت کی
وہی بجلی خیال خودکشی کی
مجھ کو رہ رہ کر
جلا کر خاک کر دینے کی کوشش میں تڑپتی ہے ص ۱۰۵،۱۰۴

یہ خودکشی کا خیال کیوں۔ صفحہ ۹۸ پر ایک اور نظم خودکشی ہے
وقت چندے اور ٹل جاتا اگر تہہ میں دریا کی مرا ہوتا قیام
معلوم نہیں کیوں رتوسا کو بھی بعض اوقات اس آخری سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔
نظم سوال کے دو بند اور ان میں حقیقت کی کرید ملاحظہ ہو

اے زندگی بتا دے
ہے خواہش نمو کیا۔
کھلنے کی آرزو کیا
گلزار رنگ و بو کیا
ہم کیا ہیں اور تو کیا
اے زندگی بتا دے

سامان دلبری کے
انداز عاشقی کے
سب طور دل لگی کے
دشمن ہیں کیوں ہنسی کے
اے زندگی بتا دے

مجموعے کے آخر میں شعلۂ خاموش کے بارے میں جو رائیں درج ہیں ان میں شب خون

الہ آباد نے کہا ہے۔

"غزلیات میں زبان وبیان اور خیال کے اعتبار سے رضا آنند نراین ملاؔ کے قبیل کے شاعر ہیں،، ص ۱۷۹

سچ یہ ہے کہ شورش پنہاں کی غزلیں اپنے دور کی غزل سے پیچھے ہیں ۔۱۹۷۰ء کے قریب کی غزل پر جب تک جدیدیت کا اثر نہ ہو وہ سیٹھی سی رہتی ہے۔ اس مجموعے میں غزلوں میں کہیں کہیں کامیاب اشعار دکھائی دیتے ہیں گو کمی کے ساتھ۔ کاش شاعر پر اخلاق اور نیک چلنی کا تاریک سایہ اس قدر حاوی نہ ہوتا۔

۱۴۔ شاخ گل۔ ۱۹۷۴ء

رضا صاحب کے ورود ہند کے بعد یہ ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جو ۱۳۶ صفحات کو محیط ہے۔ اس کے شروع میں مُصنف کا دیباچہ عرض حال کے نام سے ہے اور اس کے بعد نظمیں، غزلیں اور رباعیاں ہیں۔ ابتدائی حصے کی نظموں کا تعلق عہد عتیق سے ہے۔ پہلی نظم فتح و شکست رِگ وید کے کسی حصے کا ترجمہ ہے جس میں اِندر اور اجگر کے معرکے کو نظم کیا ہے۔ اس میں بے لطف واقعہ نگاری کے سوا کچھ نہیں۔ شاعر نے اس کے لیے ۳۲ ماتراؤں کا وزن منتخب کیا ہے۔ دو نظمیں سنت گیانیشور اور گوتم بدھ کے دنیا کے ترک سے متعلق ہیں۔ جیسا کہ مصنف نے خود صراحت کردی ہے۔ یہ دونوں نظمیں ان کے دوسرے مجموعے شورش پنہاں میں شامل ہیں۔ قدیم ہندو دور کی یاد تازہ کرنے کے سلسلے میں اگلی نظم امرت منتھن ہے اور پھر "یاد کربلا"۔ اس کے آگے "قدیم مصریوں کا ادب،، کے بڑے عنوان کے تحت چار نظمیں ہیں جو قدیم مصری ادب کے ترجمے ہیں۔ یہ ترجمے اس قدر فطری ہیں کہ طبع زاد معلوم ہوتے ہیں۔ اور اردو ادب کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ یہ شاعری کے تقاضوں کو یوں پورا کرتے ہیں کہ رضا صاحب مصری ترجموں کی پوری کتاب تیار کر دیتے تو اردو میں اضافہ ہوتا۔

چھ نظمیں فرقہ وارانہ فسادات سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں۔ عام طور سے اس مجموعے کی نظمیں زمانۂ حال کے شعری تقاضے کو پورا کرتی ہیں۔ چند متفرق اقتباسات ملاحظہ ہوں

گھٹ رہا ہے دم مرا

سب دریچے کھول دو

آنے دو ٹھنڈی ہوا (گھٹن ص ۵۶)

اے اندھیرو ہٹو
چھوڑ دو چھیننا
چھوڑ دو پھیلنا
غم کا اظہار
دو پل
بہت ہو گیا (ہمیں روشنی دو۔ ص ۲۷)

دیکھنا رات اماوس کی نہ ڈھلنے پائے
دو پہر کو بھی اندھیرے میں بدلتے دیکھا
صبح دم چاند کو بھی ہاتھ ہی ملتے دیکھا
کتنے سورج ہیں جو بادل سے نکلنے پائے
دیکھنا رات اماوس کی نہ ڈھلنے پائے (دیپک ۵۔ ص ۸۰)

آج پھر اکیلا ہی
زندگی کے صحرا میں
پھول چن رہا ہوں میں
دست بے نوائی سے
خام آرزوؤں کا
جال بن رہا ہوں میں (زندگی کے صحرا میں۔ ص ۸۱)

اس مجموعے کی غزلوں میں بھی کہیں کہیں نئے رنگ کے اشعار نظر آجاتے ہیں۔

ساحل نہ سفینے کا پتہ ہے ہر موج کو انتظار سا ہے

جب فکروں پر بادل سے منڈلاتے ہونگے انسان گھٹ کر سائے سے رہ جاتے ہونگے

۱۵۔ اجالے۔ اکتوبر ۷۵ء

رضا صاحب کی شاعری کی ابتدا ۱۹۴۲ء سے ہوئی ہے۔ ان کی وسیع المشربی کا یہ حال

ہے کہ شاعری کے پہلے ہی سال میں آپ نے ایک نعتیہ نظم عید میلاد النبی لکھی جو اجالے میں شامل ہے۔ قیام افریقہ میں آپ نے کثرت سے اسلامی مذہبی تقریبات میں شرکت کی اور ان کے لیے بطورِ خاص نظمیں لکھیں۔ جب وہ ۷۰ء میں ہندوستان میں منتقل ہوئے تو بدقسمتی سے ان اسلامی نظموں کا تین چوتھائی حصہ ضائع ہو گیا اور صرف ایک چوتھائی باقی بچا۔ ہندوستان آکر بھی انھوں نے اس موضوع و مشرب سے قطع تعلق نہیں کیا۔ چنانچہ "اے امام زندگی" ۷۱ء۔ شہادت سے متعلق دو رباعیاں ۷۳ء کی اور نعت رسولؐ ۷۴ء کی نظمیں ہیں۔ ان سب اسلامی نظموں کا مجموعہ اجالے کے نام سے ۷۵ء میں مرتب کیا گیا۔ اس کے شروع میں رضا صاحب کا پیش لفظ ہے اور اس کے بعد نظمیں جو ص ۸۷ پر ختم ہوتی ہیں۔ مجموعے کے دو حصے ہیں "باب رسالت اور باب شہادت"

اس مجموعے کی بعض نظمیں ان کے پہلے مجموعے میں آچکی ہیں۔

۱۶۔ شعورِ غم مرتبہ اعجاز سیمابی۔ نومبر ۷۹ء

میں اعجاز سیمابی صاحب سے واقف نہیں لیکن یہ یقینی ہے کہ وہ فرقہ اثنا عشری سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے مندرجہ سابق مجموعے 'اجالے' کے بابِ شہادت کی نظموں کو لیا اور اس نوع کے باقی ماندہ کلام کو حاصل کر کے 'شعورِ غم' کے نام سے ترتیب دیا۔ عرض مرتب' میں وہ لکھتے ہیں۔

"بیشتر کلام پر یہ دھوکا ہوتا ہے کہ وہ کسی شیعہ شاعر کا کہا ہوا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے"

یہ مجموعہ محض ۳۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ منقبت کے تین اشعار ملاحظہ ہوں۔

جب علی کے دیوانے راہ سے گزرتے ہیں
کانٹے پاؤں پڑتے ہیں، پھول ناز کرتے ہیں

ہم کہاں سناتے ہیں داستان حیدر کی
زندگی کے خاکے میں رنگ صدق بھرتے ہیں

ہم سے کون چھینے گا مستیِ مئے حیدر کی
ہم جو بہہ نکلتے ہیں پھر کہاں ٹھہرتے ہیں

اگر اس نظم کو سلام کہہ دیا جائے تو کتنا تغزل آمیز و شعریت بیز نمونہ ہو گا

۱۷۔ شعاعِ جاوید۔ ۱۹۸۰ء

۱۶۳ رباعیوں پر مشتمل یہ مجموعہ بلراج ورما کی ترتیب سے ۱۹۸۰ء کے آخر میں شائع ہوا اس میں ۱۹۴۳ء سے ۱۹۷۹ء تک کی رباعیاں ہیں۔ کتاب کو جگہ جگہ جدید آرٹ کی

تصویروں سے مزین کیا گیا ہے۔ ابتدا میں ایک تصویر ہے جس پر کالی داس گپتا رضا کے ہونے کا اتہام ہے لیکن میری رائے میں ان کی تصویر نہیں ہے انجمن روح ادب الہ آباد کے صدر ڈی۔این۔آریہ انکم ٹیکس افسر کی معلوم ہوتی ہے۔ مجموعے پر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا مقدمہ ہے جس میں انھوں نے اپنے نقد و نظر کی تمام گہرائیوں سے کام لے کر رباعیوں کے تمام تفلسف اور شعر کو وا کیا ہے۔

رباعیوں کو چار ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (۱) ۱۹۷۵ء تا ۱۹۷۹ء۔(۲) ۱۹۷۱ء تا ۱۹۷۴ء۔ (۳) ۶۸ تا ۷۰ء۔(۴) ۴۳ تا ۶۷

اکثر رباعیوں کا موضوع حیات و کائنات اور ذات انسان ہے۔ انسان سے متعلق رباعیات میں اخلاق اور نفسیات پر خصوصی توجہ کی ہے۔ کئی رباعیوں میں اپنے تجربات و احساسات بیان کیے ہیں۔ ہستی اور انسان کی عظمت سے متعلق دو رجائیہ رباعیاں ملاحظہ ہوں۔

صناع ازل نے کیا بنائی بستی	پندار، خمار، ہوش مندی، مستی
اک ٹھاٹھیں مارتا، بپھرتا دریا	ہستی ہستی، چہار جانب ہستی

تا آخرِ دم دل سے جواں رہتا ہے	بے زارِ جہاں، مستِ جہاں رہتا ہے
مذہب بھی ٹھہر جاتا ہے اک نقطے پر	انسان سدا رواں دواں رہتا ہے

رباعیوں میں یہ رنگ کم ہے، بیشتر ان کا نقطۂ نظر درد و یاس، بے اطمینانی، عبرت اور پشیمانی کا ہے۔ طنز کی تلخی اور درد کی انتہا ہی ملاحظہ ہو۔

ہاں کود پڑو ریا سے دامن بھر لو	بے راہ روی کی موج پہ رنگ دھر لو
وہ سامنے ہے حسد کا سوکھا دریا	ارمان شناوری کا پورا کر لو

وسعت میں اپار ہے بیابانِ درد	پاتال سے بھی نیچے ہے پایانِ درد
صدیاں کٹ جائیں غم گساری کرتے	جب جا کے کہیں ہوتا ہے عرفانِ درد

محمد حسین آزاد کے مجموعے نظم آزاد کے سرورق پر لکھا ہوتا ہے

نظمِ آزاد، جو حسن و عشق کی قید سے آزاد ہے

رضا صاحب کے محبوب شاعر چکبست کی طرح رضا صاحب کا زیرِ نظر مجموعہ بھی حسن و عشق کی قید سے آزاد ہے۔ بمشکل ایک آدھ رباعی پر ان جذبات کا اتہام رکھا جا سکتا ہے۔ عشقیہ جذبات کا نعم البدل اس قسم کی منظری رباعیاں ہیں۔

ہر سو ہے رواں دواں رو پہلا دریا　　پرُ نور، ضیا بار، مصفّا دریا
دل کیسا بہا جاتا ہے خنداں خنداں　　یہ رات ہے پونم کی کہ ہنستا دریا

لہروں کو مدھر گیت سناتی کشتی　　طوفان سے زور آزماتی کشتی
کس گھاٹ اترتی ہے بالآخر دیکھیں　　ہچکولے کھاتی، ڈگمگاتی کشتی

مثنوی گلزارِ نسیم کے مکالموں پر مشتمل اشعار مشہور ہیں۔ رضا کی کئی رباعیاں بھی اس طرح مکالموں پر مشتمل ہیں جن کے ہر مصرعے میں کوئی کچھ کہتا ہے۔ طوالت کے خوف سے قطع کرتا ہوں۔

جوش ملیح آبادی نے اپنی نظم 'نقاد' میں اہل نقد کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

منطقی کانٹے پہ رکھتا ہے کلام دل پذیر
مر کے بھی تو شاعری کا بھید پا سکتا نہیں

رضا صاحب بھی تنقید سے نالاں ہیں۔ شاید وہ جدید تنقید کے شاکی ہیں

اک سمت مہک پھولوں کی غنچوں کی چٹک　　اک سمت اناڑیوں کی بے سود کھٹک
الجھاؤ ہے، تنقید جسے کہتے ہو　　لے جاؤ مرے آگے سے یہ چھان پھٹک

دوسرے مصرعے میں 'اناڑیوں' کا لفظ کھٹکتا ہے۔ یوں بھی ہمارے نقادوں کو جو ماہر شعریات ہوتے ہیں اناڑی نہیں کہا جا سکتا۔ رضا صاحب جدید تنقید اور جدید شاعری سے یکساں طور پر نالاں ہیں۔ شاعری پر شعری تنقید ملاحظہ ہو

ابہام کے انبار کہاں سے لائیں　　الجھے ہوئے افکار کہاں سے لائیں
اشعار کی نثر تو کیا کرتے تھے　　اب نثر کے اشعار کہاں سے لائیں

کاش ردیف میں 'لائیں' کی جگہ 'لاؤں' ہوتا۔ کتاب کے آخری فلیپ پر جدید شاعر اور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کی ستائشی رائے ہے۔

۱۸ - شب نشیں

رضا صاحب تجارت پیشہ ہیں، اس لئے انھیں مالی سال سے دن رات سروکار رہتا ہے۔ یہ مجموعۂ کلام (زیر طبع) گزشتہ مالی سال کے آخری دن یعنی ۳۱ مارچ ۱۹۸۴ء تک کے کلام کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلا "شب نشیں" نظموں کا مجموعہ ہے، اور دوسرا حصہ "شاہدِ صبح" غزلوں کا۔ معلوم نہیں کیوں نظموں کا تعلق شب سے اور غزلوں کا صبح سے ہے۔ دونوں کا تعارف الگ الگ پیش کیا جاتا ہے۔

"شب نشیں" میں محض ۱۲ نظمیں ہیں۔ پہلی نظم شب نشیں میں وہ رات کو کسی مشاعرے میں صدارت کر رہے ہیں۔ شبینہ بزم آرائی اور ان کے مقطّع علمی مزاج میں جو مغائرت ہے اسی نے اس نظم کو جنم دیا۔

وار یہ تجھ پر ہے پہلا شہرتِ موہوم کا

چھوڑ یہ نازِ صدارت

مسندِ فخر و مباہ

خامشی، خلوت نشینی تیری طینت کا اصول

تو ہے ناموزوں، یہ تیری شب نشینی بھی فضول

"بے کتابی کا ایک لمحہ" میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواب یا خیال میں کسی نے ان کے مخطوطے اور کتابیں چرالیں اور یہ بے کتاب رہ گئے۔ اس میں اہل تدریس پر یوں طنز کرتے ہیں۔

کون ہوگا وہ خزانے کو چرانے والا

ہو نہ ہو، ہوگا کوئی بک سیلر

درس و تدریس کے شعبے سے کوئی کیا ہوگا

ان کو فرصت ہی کہاں انجمنوں، جلسوں سے

سیمیناروں سے، اداروں سے، ملاقاتوں سے

درس و تدریس تو اک نام ہے اور نام میں کیا

اور یہ کچھ کہہ لو سے جیسے کہ شہرت طلبی

یا کہو شعبے کو بازار، جہاں تھیسس کی

ادھر کی لوٹی ہوئی جنسِ گراں بکتی ہے

غالباً رضا صاحب یونیورسٹیوں کا ذکر کر رہے ہیں۔ پی ایچ ڈی کے مقالوں کے بارے میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ کبھی کبھی ایسے مقالے بھی سامنے آتے ہیں جن پر نہ صرف مصنف بلکہ شعبہ بھی فخر کر سکتا ہے۔ اکیڈیمیوں، انجمن ترقی اردو اور ترقی اردو بورڈ وغیرہ پر قبضہ کرنے کے لیے غیر معلم بھی اتنے ہی حریص ہیں جتنے کہ معلم۔ چونکہ تحقیق و تنقید کا کاروبار بیشتر درسگاہوں سے متعلق ہے اس لیے اکیڈیمیوں اور انجمنوں میں اہل تدریس کی کثرت فطری ہے

نظموں کے حصے میں "رقص" اور "تلاشِ حق" قابل قدر نظمیں ہیں، کہ یہ رمزیہ اور علامتی ہیں اور قاری کو فکر کا سامان مہیا کرتی ہیں۔

"شاہدِ صبح" "شب نشیں" کے مقابلے میں ضخیم حصہ ہے۔ اس میں شامل غزلوں میں خاص بات یہ ہے کہ یہ نہ ترقی پسندی سے وابستہ ہیں نہ جدیدیت سے۔ اب جبکہ ترقی پسند شاعر بھی جدیدیوں کی لفظیات و اظہار و علائم میں لکھنے پر مائل ہوتے ہیں۔ رضا صاحب ان اثرات سے دور دور ہیں۔ ان کے موضوعات وہ نہیں جو جدید شاعروں میں مشترک ہیں۔ مثلاً احساسِ تنہائی، احساسِ غیر محفوظیت، احساسِ بیگانگی وغیرہ۔ اور یہ اچھا ہی ہے، جو ان کا شکار ہو وہ انھیں نظم کرے، جو ان احساسات سے دوچار نہ ہو وہ کیوں روایتاً اس خیمے میں پناہ لے۔

جس طرح ان کی نظموں میں بعض سوانحی اشارے تھے ان سے کچھ زیادہ، غزلوں میں اپنے تجربات و احساسات کی عکاسی کرتے ہیں۔ مقطعوں میں خاص طور پر ان کی شخصیت کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ چند مثالیں

نمود و نام کا سب اشتہار، نازیبا
زمانہ ہو گیا، ہم یہ نشہ اتار چکے

بھلا برا پکارنا، نئے خدا بھی ہوں تو کیا
بلندیاں نصیب کی "خطاب" میں نہ ڈھونڈنا

ساری دنیا کا یہ کہنا ہے کہ خوددار ہے تو
اب بگڑ جائے نہ یہ بات، بنائے رکھنا

تعریف کے پلوں نے ڈبویا جمیں رضا
جو راستی کے پل سے چلے پار اتر گئے

بہوں، پر کہیں کالی داس اب نہیں — بڑے نام گیتا رضا لے گئے

ایک خالص مہاجنی شعر ملاحظہ ہو

جب بھی لوٹا دیں، جو بھی سود بھریں — میرے سکھ، قرض آپ پر جیسے

اور کم اہلوں کی گرمیِ بازار پر ان کا طنز ملاحظہ ہو

مجھ سے فکر تھی کہ تھا جہل کا اپنے اقرار — ہم نشینوں کا وہ شورِ ہمہ دانی کیا تھا

سنا تھا لایا ہے کوئی نیا سخن، لیکن — وہی گھسے پٹے نغمے، لٹی پٹی تانیں

نتیجہ اس کا ہو کیا، وقت ہی بتائے گا — یہ چھوٹے چھوٹے مقرر، بڑی بڑی بحثیں

دکان کیسے چلے گی اگر یہی ہے جنس — اُدھار اُدھار قصیدے ملاوٹی غزلیں

جو سرو قد ہیں انھیں رینگ رینگ چلنا ہے — ملی ہیں پست قدوں کو بلند محرابیں

اور اسی غزل کا ایک شعر ملاحظہ ہو جو کسی خالص جدیدیے کا معلوم ہوتا ہے

یہیں ہیں، اسی دل میں، ایک اک کر کے — لہولہو وہ امنگیں، وہ کٹی لاشیں

ان کی بعض نظموں اور غزلوں کی زبان پر ہندی زبان اور ہندی ادبی روایات کا خاصا اثر ہے

مثلاً ذیل کے مطلعوں والی غزلیں

جب یہ کہا، سب پیار کا ناٹک جان لیا — روپ نے جیسے ہم پر نیزہ تان لیا

ٹکڑے چن کر بکھرے من کے — کھول لے رستے نوجیون کے

بعد مرے جب مجھ کو اپنے گیت سنانے آؤ گے — کیسی نراشا ہوگی تم کو کس منھ واپس جاؤ گے

ایک غزل میں ہندی لفظیات نہیں، پھر بھی اس میں گیت کا ترنم اور لَے ہے

اے بے ہمت! ڈھیلے ڈھیلے — جینا برحق، جی لے جی لے

اس غزل کے ہر شعر کے مصرعۂ ثانی میں مقفیٰ لفظ کی تکرار ہے

انھوں نے تین غزلیں ہندی اوزان میں لکھی ہیں جن کی ماترائیں گنی جا سکتی ہیں۔

مثلاً ۲۰ ماترا کا وزن۔

دوست کہا تو بات سے ٹل مت جانا — سن کر میرا حال بدل مت جانا

میرا قلم ساجن کا پتا لکھتا ہے — بول اے دل! تو خط میں کیا لکھتا ہے

ہندی میں ۲۰ ماترا کے کئی اوزان ہیں لیکن وہ اس کے متوازی نہیں۔

(ب) ۲۲ ماترا کا وزن۔ ہندی کا ماترائی وزن۔ راس اسی قسم کا ہے

جب یہ کہا سب پیار کا ناٹک جان لیا — روپ نے جیسے ہم پر نیزہ تان لیا

اوزان کا ذکر چھڑا تو چند عروضی مشاہدات کرتا چلوں

ایک غزل اردو کے کم مستعمل وزن "ہزج مسدس مقبوض" میں کہی ہے۔ اس کا مثمن وزن نسبتاً کثیر الاستعمال ہے۔

زمانہ تنگ ظرف ہوگیا تو کیا — مفاعلن مفاعلن مفاعلن

نظم "بڑھے چلو" اسی کے مربع وزن میں ہے۔ جیسے یہ مصرعے

فضول کانٹوں کی طرح

چنے گئے تلف ہوئے

اس نظم میں ایک مصرع ہے "وہ اک دفعہ جو چل پڑے" یہاں "دفعہ" بروزن فعَل باندھا گیا ہے اور میں اس سے خوش ہوں۔ لغت کے اعتبار سے یہ بروزن فعْلن ہے لیکن میں اردو میں عربی فارسی، انگریزی کے دخیل الفاظ کے اردو تلفظ کو اصل زبان کے تلفظ پر ترجیح دیتا ہوں، اردو میں دف + عہ کوئی نہیں بولتا، سب دَفَع بولتے ہیں اس لیے یہی تلفظ صحیح ہے۔

رضا صاحب محقق ہیں اور قدیم علوم پر عبور رکھتے ہیں۔ اپنے زورِ استادی میں وہ ایک جگہ ایسا کتابی لفظ استعمال کر گئے ہیں جس کی صحت کی سند ان کے پاس ہے لیکن جو موجودہ روزمرے میں نہیں

نظم "دکھی نہ ہو" میں

ابھی سب کھولے دیتا ہوں کواڑے

ان کے پاس سند ہے کہ ناسخ نے کواڑا استعمال کیا ہے۔ کیا ہوگا لیکن اب نہ لکھنؤ میں نہ دلی میں اور نہ میرے علم کی حد تک کسی اور جگہ کواڑا بولا جاتا ہے۔ اگر داغ یا نواب مرزا شوق تک نے کواڑا باندھا ہوتا تو بھی میں اسے قبول نہ کرتا، کیوں کہ یہ زندہ روزمرہ کا جزو نہیں۔

زبان کے استعمال کو قدما کی تحریروں، لغات اور قواعد سے طے نہیں کرنا چاہیے، بلکہ

اس کے موجودہ استعمال سے یعنی وسیع معنی میں اہل زبان (یعنی وہ سب جو اس زبان کو سہولت اور قدامت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں جن میں رضا صاحب بھی شامل ہیں) کی واقعی بول چال سے۔

میر کے احیا کے سلسلے میں ان کے بول چال کے انداز کی تقلید کا فیشن ہو گیا ہے اور ان کے متروک اظہارات کو استعمال کیا جا رہا ہے۔ فراق نے بطور خاص ایسا کیا ہے

ہم سے فراق اکثر چھپ چھپ کر پہروں پہروں روؤ ہو
وہ بھی کوئی ہمیں جیسا ہے کیا تم اس میں دیکھو ہو

رضا صاحب نے اس کی شیریں بے تکلفی کی وجہ سے ذیل کی غزل میں اس کو روا رکھا۔

مانگ بھرو ہو سنگھار کرو ہو　　　کون سی منزل پار کرو ہو

رضا صاحب کی غزلوں کے اشعار زبان کے اعتبار سے چست اور مفہوم کے اعتبار سے خوش گوار ہیں۔ ہندی کی چندی بند کر کے میں ایسے چند شعر درج کرتا ہوں

کہاں کا ہاتھ، کہاں کا نجوم کیسا نصیب　　　لکیریں کھینچ کے بے بس بنا گیا کوئی
نہ راستے سے پکارا نہ دی کہیں دستک　　　خیال و خواب کے در وا تھے آ گیا کوئی
میں اک چراغ سرِ راہ میری ہستی کیا　　　جلا گیا مجھے کوئی، بجھا گیا کوئی

یہ کیسے جھکولے تھے بندار کے　　　مجھے پنکھ دے کر اڑا لے گئے
گھر آنگن میں سونے کا سورج کہاں　　　کرن تک پڑوسی چرا لے گئے

موجِ لب، مصرعِ تر، سیلِ خیال　　　تیرتا پھرتا ہوں ڈل پر جیسے

۱۹۔ انگریزی ترجمہ　　　۱۹۷۵ء

انھوں نے اپنی بعض اردو نظموں کو انگریزی نثر میں ترجمہ کیا اور اسے کے نام سے شائع کیا۔ یہ نام ترجمہ ہے "شعلۂ خاموش" کا اور اس مجموعے میں بیشتر نظمیں شعلۂ خاموش ہی پر مبنی ہیں۔ مجموعہ ۲۷ صفحات کا ہے۔ گو اسے نثری ترجمہ کہا گیا ہے لیکن اس میں سطروں کی نشست و شکست اور جملوں کی نحوی ترتیب شعری انداز ہی کی ہے۔ اس لیے انھیں نثری نظم کہہ سکتے ہیں۔ آخر میں جو متفرق اشعار و رباعیات کے ترجمے ہیں ان میں باقاعدہ قافیہ ہے، وزن کا مجھے عرفان

نہیں۔ ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

What fun is this, the dew has
Entrusted its pearls one by one
To flowers, relying on
Protection by the Sun

کالی داس صاحب کی یہ تمام تصانیف ۱۹۶۸ تا اوائل ۸۴ یعنی ۱۶ سال کے اندر سامنے آئی ہیں۔

اردو میں اتنے فعّال اہلِ قلم شاذ ہیں۔ انھوں نے شاعری سے تحقیق کی طرف ارتقا کیا ہے۔ ان کی بنیادی حیثیت محقق کی ہے۔ اگر وہ ہمہ تن شاعری کی طرف متوجہ ہوتے تو اس میں بھی مقام پیدا کر سکتے تھے ان کی نظموں میں شعریت ہے لیکن تحقیق کی آشفتہ منزلوں کے بعد شاعری کے لیے وقت اور دماغ نہیں بچتا۔ لگتا ہے، وہ محقق نہ ہوتے تو زمانہ ان کی شاعری کی طرف زیادہ توجہ کرتا۔ ان کے کلام کا ایک انتخاب کیا جائے تو وہ عطرِ مجموعہ مشامِ جان کو تازگی بخشے گا۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی
(پاکستان)

اردو تحقیق کا ایک منفرد اور معتبر نام

("کلیاتِ چکبست" اور "سہو و سراغ" کی روشنی میں)

تحقیق بڑا صبر آزما اور دقت طلب کام ہے اور اس میں عمریں صرف ہو جاتی ہیں تب کہیں جاکر گوہرِ مقصود ہاتھ میں آتا ہے اس وجہ سے اردو تحقیق میں ایسے نام انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں جن کے تحقیقی کام کی نادر و قیمت ہے اور جنھوں نے اپنی تحقیقات کے حوالے سے اردو تحقیق کو اعتبار بخشا ہے۔ ایسے ناموں میں مولوی عبدالحق حافظ محمود شیرانی، سید مسعود حسن رضوی ادیب، قاضی عبدالودود مالک رام، امتیاز علی عرشی، ڈاکٹر وحید قریشی، مشفق خواجہ اور ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا تحقیق کی آبرو ہیں۔ ان میں اب کالی داس گپتا رضا کا نام بھی شامل ہے جنھوں نے اپنے تحقیقی کارناموں سے نہ صرف چونکایا ہے بلکہ تحقیق میں توازن و اعتدال بھی پیدا کیا ہے اس کے ساتھ ساتھ اپنے تنقیدی جوہر بھی آشکار کیے ہیں۔ غالب اور چکبست ان کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ غالب کے سلسلے میں متعلقات غالب "دعائے صباح"، "غالب کی ایک مثنوی"، "غالبیات چند عنوانات" اور "سہو و سراغ (غالبیات سے متعلق حصہ)" تحقیق و تنقیدِ غالب میں نہ صرف اہمیت و افادیت کی حامل ہیں بلکہ غالبیات میں مباحث کے نئے در کھولتی ہیں اس سلسلے میں کالی داس گپتا رضا نے دوسرے محققین کے سہو کا جو سراغ لگایا ہے۔ وہ اپنی جگہ اہم ہے۔ چکبست کے سلسلے میں انھوں نے نہ صرف اس کے کلام کو جمع کیا ہے بلکہ اس کے تنقیدی مقالات کو بھی یک جا کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں کلیاتِ چکبست، چکبست اور باقیات چکبست، انتخاب آتش و غالب از چکبست اور مقالاتِ چکبست اب تک سامنے آچکے ہیں۔ لمحۂ موجود میں میرے سامنے کلیاتِ چکبست کا ۱۹ر جنوری ۱۹۸۱ء کا شائع شدہ نسخہ ہے جو ۰۰۰... صفحات پر مشتمل ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اس کا انتساب چکبست کی صد سالہ عمر کے نام کیا گیا ہے جو کالی داس گپتا رضا کی چکبست سے عقیدت کا مظہر ہے۔ اس کتاب میں ۸۰ صفحات پر محیط طویل مبسوط مقدمہ ہے جو کالی داس گپتا رضا کی تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں کا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔

مقدمے کے کئی حصے ہیں سب سے پہلے تو قیت چکبست میں چکبست کے خاندان کی ہندوستان

میں منتقل آباد (۱۵۰۰ تا ۱۸۰۰) چکبست کی ولادت (۱۹ جنوری ۱۸۸۲ء) اور وفات (۱۲ فروری ۱۹۲۶ء) تک مکمل اور مفصل سوانحی خاکہ دیا گیا ہے جو چکبست کی پوری زندگی کا آئینہ ہے۔ تصانیف چکبست میں صبحِ وطن، قومی مسدس، فریادِ قوم وطن کا راگ) کے سنہ اشاعت دیئے گئے ہیں اسی طرح انتخابِ چکبست مرتبہ روپ نرائن شیوپوری، انتخاب چکبست مرتبہ ڈاکٹر عبدالستار دلوی اور انتخاب چکبست مرتبہ ڈاکٹر عطیہ نشاط کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ نثری تصانیف میں مضامین چکبست منتخباتِ چکبست، جنت کی ڈاک، کملا کا تذکرہ کر دیا گیا ہے۔ خود کالی داس گپتا رضا نے جو کام کیا ہے اس کی نشاندہی پہلے ہی کر دی گئی ہے تاہم اس میں انتخابِ آتش و غالب بھی شامل ہے جسے انھوں نے رسالہ صبحِ اُمید سے ترتیب دیا ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ چکبست کالیداس گپتا رضا کا خاص موضوع ہے تو کلیاتِ چکبست کے مقدمے میں حرفِ اول کے عنوان سے جو کتاب کے ص۱۱ سے ص۲۸ تک پھیلا ہوا ہے کالی داس گپتا رضا نے چکبست کی نظم، غزل اور رباعی پر تحقیقی و تنقیدی نظر ڈالی ہے اسی طرح تقلیدِ آتش و غالب میں ان اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو آتش و غالب کی پیروی کے سلسلے میں چکبست پر کیے گئے زبان و بیان کے معترضین میں بھی چکبست پر کیے گئے اعتراضات کے جواب مہیا کیے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ چکبست کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کا بھی تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔

اس سے پہلے کہ مقدمے کے مندرجات کے بارے میں گفتگو کی جائے ضروری ہے کہ حرف آخر کے بارے میں پہلے بات کر لی جائے جس میں "کچھ اس مجموعے کی ترتیب کے بارے میں" اور گفتنی کے عنوانات سے کالی داس گپتا رضا نے اس کلیات کی ترتیب و تنظیم کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جو میری رائے میں پہلے ہونا چاہیئے تھا تاکہ اس کی ترتیب کے بارے میں جو مشکلات فاضل محقق کو پیش آئی ہیں ان کا اندازہ ہو جاتا۔ تاہم تحقیق کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں نے اسے پہلے پڑھا ہے اس لیے اس کا ذکر بھی پہلے ــــ یہ بات واقعی درست ہے کہ چکبست بڑے شاعر نہ سہی مگر اپنے عہد کے تناظر میں اہم ضرور تھے اس لیے اردو شاعری کی تاریخ انہیں بھلا نہیں سکتی اور پھر جس بد نصیبی کا وہ شکار رہے اور جن حالات میں انھوں نے زندگی گذاری اس کے پیش نظر ان کے کلام کا محفوظ رہ جانا بڑی بات ہے۔ کالی داس گپتا رضا نے تلاش و جستجو سے ان کا سارا کلام ڈھونڈ ڈھانڈ کر کلیاتِ چکبست میں محفوظ کر دیا ہے یہی نہیں بلکہ ان مواخذ کی نشاندہی بھی کر دی ہے اور ساتھ ہی ساتھ متن کے اختلاف کو حواشی میں درج کر دیا ہے۔ وراس طرح چکبست کے صحیح اشعار

کی صورت سامنے آئی ہے اور یہ حواشی چونکہ متن کے ساتھ دیئے گئے ہیں اس لیے ان کی افادیت اور بھی مسلّم ہو جاتی ہے۔ یوں اس کتاب کی صورت میں چکبست اپنی نئی اور مکمل صورت میں سامنے آئے ہیں گویا کالی داس گپتا رضا کے اپنے الفاظ میں" اب یہ کتاب چکبست کی نظم کا کلیات ہی نہیں بلکہ کلامِ چکبست کی تشکیلِ جدید بھی ہے"۔ (۴۸)

"گفتنی،، میں کالی داس گپتا رضا نے اس کی غرض وغایت اور چکبست سے دل چسپی کے سلسلے میں چند اعتراضات کا بھی جواب دیا ہے گویا چکبست پر کام کرنا کسی تعصب کے پیشِ نظر ہے۔ اس میں انھوں نے چکبست کا شعری مرتبہ متعین کرنے، چکبست کی انفرادیت کو ظاہر کرنے اور اپنے اوپر اعتراضات کرنے والوں کا جواب بھی دیا ہے اگرچہ یہ تحریر کم وبیش تین صفحات پر مشتمل ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس میں بڑا زور ہے اور اس طرح یہ بڑی جاندار تحریر ہے جس کے بین السطور میں کرب اور غصہ ہے مگر اس کی آنچ بہت دھیمی ہے اور یہ اس محقق کا کمال ہے جس کے بارے میں میں نے اوپر توازن واعتدال کے لفظ استعمال کیے ہیں یعنی کالی داس گپتا رضا کی تحقیقی ریاضت اور تنقیدی بصیرت کا ثبوت ہے کہ انھوں نے ایسے انداز میں باتیں کہی ہیں جو دل کو بھی لگتی ہیں اور اسلوبِ منفرد کی بنا پر تاثریت میں بھی اضافہ کرتی ہیں چند سطور دیکھئے۔

" بڑے اور چھوٹے شاعروں میں امتیاز کرنے کا آلہ میرے پاس موجود نہیں کیونکہ بڑے شاعروں کے یہاں معمولی شاعری کے انبار موجود ہیں اور چھوٹے شاعروں کی خاکستر میں عظیم شاعری کی چنگاریاں بھی مل جاتی ہیں اسی طرح بڑے اور چھوٹے بہت سے اردو شاعر میرے محبوب ہیں جن میں ایک چکبست بھی ہیں،، (۴۹)

یہ تو تھی چکبست کی شاعری کی بات اور اب اس کی زبان کے بارے میں رائے دیکھئے۔

" زبان کی شگفتگی میں وہ انیس سے کم ہیں مگر آتش وغالب سے کبھی کبھی آگے بھی نکل گئے ہیں اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ آتش وغالب کا زمانہ کچھ دور کا زمانہ ہے اور چکبست کا عہد ہمارے بچپن کا عہد ہے اس لیے چکبست کی زبان ہمیں اپنے بچپن کی طرح شیریں معلوم ہوتی ہے"۔ (۵۰)

چکبست کے مقام ومرتبہ کا تعین کرتے ہوئے کالی داس گپتا رضا لکھتے ہیں۔

" چکبست عظمتِ شعر میں آتش، غالب اور انیس کو نہیں پہنچتے مگر ان کا اپنا ایک رنگ ہے جو ان کے پیش روؤں کا ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ رنگ چکبست کو اس کے اپنے اندازِ فکر اور عہد نے عطا کیا تھا اور ان کے ہم عصروں نے صلاحیت کے باوجود اپنایا نہیں"۔

کالی داس گپتا رضا نے جہاں چکبست کی خوبیاں بیان کی ہیں وہاں ان کی خامیوں کی طرف بھی اشارہ کیے ہیں دیکھئے "ان کی بیشتر نظمیں بیانیہ ہیں اس لیے بعض مقامات پر سپاٹ ہو جاتی ہیں مگر طرزِ کلام کی رنگینی اس عیب کو ڈھانپے رکھتی ہے مگر غزلوں کے حسن میں تطبیہ مضامین کے باوجود فرق نہیں آتا،، ص ۸۵

کالی داس گپتا رضا نے اس الزام کو کہ چکبست پر کام کرنے کے پیچھے ایک مذہبی جذبہ کارفرما ہے بڑے اچھے انداز میں رد کیا ہے میں اس بحث میں نہیں پڑتا البتہ ایک بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ چکبست جو بھی مذہب رکھتے تھے اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ چکبست اردو کے شاعر تھے اور اس حوالے سے ان کا شعری و نثری سرمایہ اردو کا سرمایہ ہے یوں چکبست اور اس پر کام کرنے والے ہمارے لیے باعث افتخار ہیں اور اس میں کسی تعصب کا کوئی جواز نہیں۔ کالیداس گپتا رضا نے درست لکھا ہے "آیئے کھلے ذہن سے کلام چکبست کا مطالعہ کریں" یہ ان کے روشن دلیل اور منور مزاج کا آئینہ دار ہے۔

۱۸۸۲ء سے ۱۹۲۶ء تک کے زمانے کو ہندوستان میں آزادی کی تحریکوں کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے اثرات کافی عرصہ تک رہے جو ۱۹۴۷ء کی آزادی کا پیش خیمہ ثابت ہوتے۔ اس تناظر میں چکبست کی نظموں کو جو وطن کی آزادی کے لیے ہوئے ہیں قومی شاعری کے خانے میں رکھا جاسکتا ہے۔ کالی داس گپتا رضا نے نظم کا ذکر کرتے ہوئے آغاز ہی میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ سیاسی بیداری کے شاعر تھے لکھتے ہیں "چکبست کے یہاں شاعری اور زندگی میں ایک اٹوٹ رشتہ ہے جو بیسویں صدی کے آغاز سے شروع ہو کر پہلی جنگ عظیم تک کے ان کے اشعار (خصوصی نظموں میں) برابر دیکھا جاسکتا ہے۔ جہاں وہ توہم پرستی کی مخالفت اور ازدواج بیوہ ایسے نازک مسئلے کی موافقت میں پیش پیش تھے وہاں وہ پرانی قدروں کے بھی عاشق تھے اور نئی قدروں کو آسانی سے قبول نہیں کر سکتے تھے۔۔۔۔ اگر چکبست نہ ہوئے تو اردو شاعری بیسویں صدی کے آغاز کی سیاسی بیداری کے تذکرے سے محروم رہ جاتی،، ص ۱۸

اسی طرح کالی داس گپتا رضا نے ۲۶ صفحات میں چکبست کی نظموں کے پس منظر کے حوالے سے ان کی نظم گوئی کے موضوعات کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے اور سنہ وار ان کی نظموں کی اہمیت و افادیت کا تعین کیا ہے ان کے بقول "سیاسی گفتگو عوام میں زاہد خشک کے پند و نصائح کی طرح تھی مگر چکبست کی شگفتہ اور پُر تاثیر شاعری نے اسے دل پسند بنا دیا اور ایک بڑا طبقہ ان کی نظموں سے متاثر ہوا۔ اردو شاعری کا یہ نیا موڑ چکبست کو اپنے ہم عصروں میں امتیاز بخشتا ہے،، (ص ۴۴-۳۹)

چکبست کی نظم کی طرح غزل بھی ان کے منفرد رنگ کی آئینہ دار ہے۔ ان کی غزل کے مطالعے سے ان کے قدیم وجدید دونوں رنگ کی جھلکیاں دکھائی دے جاتی ہیں تاہم زیادہ تر ان کی روایتی شاعری ہی ہے جن میں ان کا اپنا الگ رنگ صاف طور پر شناخت کیا جاسکتا ہے۔ کالی داس گپتا رضا نے صحیح لکھا ہے "انھوں نے غزل کے روایتی عشقیہ انداز کو ترک نہیں کیا اور اس کے تمام مسلمہ لوازم کو برقرار رکھا۔ فرق صرف یہ کیا کہ ان لوازم کو نئے معنی پہنائے اور نئی جہتیں مقرر کیں۔ نتیجے کے طور پر ان کی غزل سے پرانے رنگ کے شیدائی اور نئے رنگ کے متلاشی دونوں یکساں محفوظ ہوئے۔"

"تقلیدِ آتش وغالب" میں کالیداس گپتا رضا نے اس مفروضے کو کہ چکبست غالب وآتش کے مقلد تھے ہم زمین اشعار کے تقابل سے واضح کیا ہے کہ چکبست کا اپنا رنگ تھا۔ اس سلسلے میں اہم بات یہ ہے کہ چکبست نے ہر عہد کی شاعری کا مطالعہ کیا تھا اس لیے اسلوب میں اگر کوئی جھلک نظر آجائے تو اسے اتفاق قرار دیا جاسکتا ہے۔ تقلید اور پیروی نہیں اس لیے کہ چکبست کسی مخصوص اسکول سے تعلق نہیں رکھتے تھے اور ان کا اپنا الگ رنگ تھا جو بقول کالیداس گپتا "انہیں اپنے پیش رووں سے جداگانہ مقام دیتا ہے اور اپنے ہمعصروں میں ممتاز کرتا ہے" (ص ۴۴)

اس طرح زبان وبیان کے معترضین کے عنوان سے ان اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جن کی کوئی وقعت نہ تھی۔ "طنز ومزاح" میں چکبست کے طنزیہ ومزاحیہ کلام کا جائزہ لیا گیا ہے۔ چکبست کا شمار اودھ پنچ کے شعراء میں ہوتا ہے اس میں ان نظم "لارڈ کرزن کی جھپٹ" کے حوالے سے ان کے اس پہلو پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

اس تناظر میں کالی داس گپتا رضا نے چکبست کو زندہ کر دیا ہے۔ مقالے میں ان کا تحقیقی انداز زیادہ ہے البتہ کہیں کہیں تنقیدی آراء بھی دی گئی ہیں مگر چونکہ کالی داس گپتا رضا بنیادی طور پر ایک محقق ہیں اس لیے انھوں نے چکبست کی شاعری کے حوالے سے ان کی نظموں اور غزلوں کے سنہ اشاعت کا تعین کیا ہے۔ ان میلانات کی نشاندہی کی ہے جن کی وجہ سے یہ نظمیں لکھی گئیں۔ اسی طرح چکبست پر ہونے والے اعتراضات کا تحقیقی طور پر جواب فراہم کیا۔ خاص بات یہ ہے کہ پسندیدگی اور عقیدت کے باوجود کالی داس گپتا رضا نے اس جذبے کو اپنی تحریر میں کہیں بھی اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیا اور کہیں بھی ——————— کا صیغہ استعمال نہیں کیا یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر میں نہ تو اندھی عقیدت ہے اور نہ ہی سطحی جذباتیت بلکہ اپنی بات کو دلائل اور شواہد سے منوانے کا بھرپور رویہ موجود ہے یوں کلیاتِ چکبست ایک ایسی تحقیقی دستاویز ہے جو چکبست پر کام کرنے والوں کے لیے تحقیق وتنقید کی نئی راہیں کھولتی ہے اور اسی میں اس کتاب کی اشاعت کا جواز مضمر ہے مگر شرط یہ ہے کہ کھلے دل اور ذہنی کشادگی سے چکبست کا مطالعہ کیا جائے۔ اس اعتبار سے کالی داس گپتا رضا

کی کاوش منفرد بھی ہے اور لائقِ تحسین بھی کہ انھوں نے چکبست کو اردو میں ان کا اصل مقام دلانے کی غیر جانبدارانہ کوشش کی ہے۔

کالی داس گپتا رضا بنیادی طور پر شاعر اور محقق ہیں۔ مگر تنقید کے خارزار میں بھی قدم رکھتے ہیں۔ کالی داس کا نام آتے ہی سنسکرت کے لازوال شاہکار "شکنتلا" کا خیال ابھرتا ہے۔ مگر گپتا رضا سے پہلے کالی داس کی شمولیت کم از کم میرے لیے حوصلہ افزا صورتِ حال کو سامنے لاتی ہے اس لیے کہ میں ذاتی طور پر ان سے واقف نہ ہوتے ہوئے بھی ان کے علمی اور ادبی کارناموں اور تحقیقی فتوحات سے شناسائی رکھتا ہوں۔ کالی داس رضا سے میری واقفیت مسعود حسن رضوی ادیب کے حوالے سے ہوئی اور خاص طور پر چھنولال دلگیر لکھنوی کے مذہب کے بارے میں مسعود صاحب اور ان میں جو بحث جاری رہی وہ میری نظر سے گذری تو مجھے ان کی صلاحیتوں کا بھی معترف ہونا پڑا۔ صابر دت (فن و شخصیت) نے کالی داس گپتا رضا کے تحقیقی، تنقیدی اور بعض ہلکے پھلکے مضامین پر مشتمل ایک کتاب مرتب کی ہے جس کا نام سہو و سراغ ہے۔ اس کتاب کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے "سن رکھو تم فسانہ ہیں ہم لوگ" میں لکھنوی شعراء پر مختصر تعارفی تحقیقی مضامین ہیں اور بعض دیگر شعراء کے بارے میں تحقیقی و تنقیدی معلومات فراہم کی گئی ہیں جو تحقیق کے طالب علم کے لیے خاص طور پر اور ان شاعروں پر کام کرنے والوں کے لیے عام طور پر بھرپور افادیت کی حامل ہیں۔ دوسرے حصے سہو و سراغ میں غالب کے بارے میں لکھی جانے والی بعض کتابوں کی غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے جو غالبیات میں ایک اہم اضافہ ہے۔ تیسرا حصہ رفتارِ قلم میں ہلکے پھلکے مگر علمی و ادبی مضامین شامل کیے گئے ہیں جو کالی داس گپتا رضا کے تحقیقی و تنقیدی مزاج سے الگ تھلگ ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے ذائقہ بدلنے کے لیے یہ مضامین قلم بند کیے ہیں۔ ان مضامین کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے کالی داس گپتا رضا کی غیر معمولی قوتِ مشاہدہ، زبان و بیان پر گرفت اور اسلوب کی چاشنی اور شیرینی کا احساس ہوا یہی وجہ ہے کہ اس مضمون میں مَیں نے اس حصے کے بارے میں اظہارِ خیال کرنا پسند کیا ہے اور وہ اس لیے کہ ان کے تناظر میں مجھے ایک اور کالی داس گپتا رضا دکھائی دیئے۔ میں جو خشک تحقیق و تنقید سے ہٹ کر ایک شگفتہ ادیب کی شکل میں سامنے آئے ہیں۔ اس حصے میں دس مضامین شامل ہیں۔ دلی سے دلی تک، میرے استادِ محترم، حینا، درگا دیوی، عبدل بابا، مولانا ماہر القادری ہمارا تخلص، ہم ایڈیٹر تھے، حکیم راؤ امین خاں، "آبِ حیات" میں ہندو شعراء کا تذکرہ۔ موخر الذکر مضمون کو اس حصے میں شامل نہیں ہونا چاہیئے تھا اور اسے پہلے حصے میں ہونا چاہیئے تھا کیوں کہ

مزاح کے اعتبار سے یہ یہاں مناسبت نہیں رکھتا اس لیے اس کا ذکر نہیں کروں گا۔ باقی کو مضامین کو تین الگ اصناف میں تقسیم کیا جاسکتا ہے یعنی دلی سے دلی تک کو میں انشائیہ قرار دینے میں کوئی تامل محسوس نہیں کرتا۔ میرے استادِ محترم، حُسنیا، درگا دیوی، عبدل بابا، مولانا ماہر القادری اور حکیم راؤ امین خاں خاکہ نگاری کی ذیل میں آتے ہیں۔ اسی طرح ہمارا تخلص اور ہم ایڈیٹر تھے طنز و مزاح کے زمرے میں آتے ہیں۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو کالی داس گپتا رضا کی حیثیت انشائیہ نگار، خاکہ نگار اور طنز و مزاح نگار کی ہو جاتی ہے اگرچہ ان مضامین کے مطالعے سے ان تینوں حیثیتوں میں ان کی ذات بھرپور طریقے سے نہیں اُبھری تاہم ان کی ذات میں چھپے ہوئے ان تینوں اصناف کے تخلیق کار کو تلاش ضرور کیا جاسکتا ہے اور بجا طور پر یہ شگون ان کی ذات کی ایک الگ اور منفرد اکائی ہے جو ان کی تنقیدی صلاحیتوں، تحقیقی مشاہدات اور تبحر علمی کے زاویوں کے گرد گھومتی ہے۔

"دلی سے دلی تک" شہر دلی کی ایک تاریخ ہے جو اس کے عروج و زوال کی داستان ہے جو انشائی اسلوب میں بیان کی گئی ہے اس میں نہ تو تاریخ کی خشکی ہے اور نہ ہی واقعات کی بھرمار بلکہ ہلکے پھلکے انداز میں دلی کی کہانی آپ بیتی کے تناظر میں بیان کی گئی ہے اس تحریر کے پس منظر میں جہاں دلی کو ہندوستان کہا گیا ہے وہاں کالی داس گپتا رضا کا جذبۂ حب الوطنی بھی سامنے آیا ہے اور انھوں نے یہ کہہ کر دلی کو خود اپنی زبان دے دی ہے۔ لکھتے ہیں "میرا نام امر بھارتی ہے یعنی زندۂ جاوید ہندوستانی۔ وہ ہندوستانی جو کبھی نہیں مرتا۔ میں نے اور تاریخ نے ایک ساتھ جنم لیا تھا۔ تاریخ تو تمام عالم میں پھیل گئی مگر میں نے خود کو ہندوستان ہی تک محدود رکھا۔ تاریخ کا کوئی مسلک کوئی وطن نہیں ہے وہ ہر رنگ میں ہر جگہ ہے مگر میں ایسا ہرجائی نہیں۔ میرا مسلک بھی ہے اور وطن بھی۔ یہ ضرور ہے کہ میں نے ان دونوں کو ہندوستانیت میں ضم کر دیا ہے۔"
(سہو و سراغ ص ۱۰۱)

اس انشائیے کا کردار امر بھارتی ایک بے نام سا نام ہے اس لیے کہ اس کے پس منظر میں خود کالی داس گپتا موجود ہیں۔ اس کا اسلوب جس طرح شگفتگی کا مظہر ہے وہ اگرچہ اپنے باطن میں بے پناہ کرب رکھتا ہے مگر الفاظ سے ظاہر نہیں ہوتا صرف محسوس کیا جاسکتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کی تحریر کا کمال ہے۔

"میرے استادِ محترم" تنقید، عقیدت اور خاکہ نگاری کا ملا جلا رویہ لیے ہوئے ہیں اس

میں کالی داس گپتا رضا نے اپنے استاد جوش ملسیانی کا تذکرہ بڑی عقیدت و احترام کے ساتھ کیا ہے اور اپنے استاد کی عظمت کا لوہا دلائل سے منوایا ہے اور یوں اس میں اندھی عقیدت کہیں بھی نظر نہیں آئی۔ بلاشبہ دبستانِ داغ کے حوالے سے جوش ملسیانی کی اردو ادب اور خاص طور پر اردو شاعری کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

شیخ کیوں ایسی بات کہہ جائے	محترم ہی سہی خدا تو نہیں
جام لے کر کہا یہ زاہد نے	دیکھنا کوئی دیکھتا تو نہیں

ان اشعار میں زبان و بیان کا جو لطف ملتا ہے وہ ان ہی کا حصّہ ہے۔ حُسینا درگا دیوی اور عبدل بابا تینوں اپنے اندر کہانی کا سا انداز لیے ہوئے ہیں۔ مگر انہیں کہانی کہنے کی بجائے کہانی نما خاکہ کہنا زیادہ مناسب ہے اس لیے ان میں کالی داس گپتا رضا نے ان تینوں کرداروں کو بڑی خوبصورتی سے پینٹ کیا ہے ایک اور خاص بات یہ ہے کہ ان تینوں کرداروں میں بین السطور نہیں بلکہ واضح طور پر خاکہ نگار کی اپنی ذات بھی بولتی دکھائی دیتی ہے اور یوں ان کی اپنی جذباتی اور احساساتی بھی شامل ہے۔ حسینا اور عبدل بابا کے خاکوں میں مجھے مولوی عبدالحق کے نام دیو مالی کی مماثلت نظر آتی ہے کہانی کے اعتبار سے نہیں کردار کے حوالے سے بڑے پن اور عمل اور لگن کے اعتبار سے۔ خاص طور پہ اسلوب جو ان کو دلچسپ، شگفتہ، پر لطف اور پر از معلومات بنا دیتا ہے یوں کالی داس گپتا رضا نے اپنے باطن اور خارج کے تناظر میں ان کرداروں میں جھانکنے کی کوشش کی ہے۔ کالی داس گپتا رضا نے حُسینا۔ درگا دیوی اور عبدل کا جو ناک نقشہ بیان کیا ہے اس سے ان کے مشاہدے کی داد دینا پڑتی ہے اور اس بات کی بھی کہ وہ باقاعدہ خاکہ نگار نہ ہوتے ہوئے بھی ایک خاکہ نگار کی جملہ خصوصیات اپنے اندر رکھتے ہیں۔ حُسینا میں انھوں نے دیہات کی فضا کی جو منظر نگاری کی ہے اس کے پس منظر میں ان کا تخلیقی اور شاعرانہ ذہن کارفرما ہے۔ دیکھیے۔

"میں اپنے فارم پر گیا ہوا تھا وہاں فصل کی سنچائی ہو رہی تھی۔ رہٹ چل رہا تھا دونوں بیل اپنے ختم نہ ہونے والے سفر پہ رواں تھے۔ غوں غوں بولتا ہوا رہٹ گویا موسم کی خوشگواری کے نغمے الاپ رہا تھا۔ شہتوت کے درخت کے نیچے ٹھنڈی ریت میں مَیں بھی مطمئن بیٹھا تھا۔ . . . . . تھوڑی دیر کے لیے چلتا ہوا رہٹ رک گیا اس کے ساتھ جیسے زمین، آسمان، ہوا دماغ سب رک گئے" [۲۴]

اسی طرح درگا دیوی میں دیہات کے سچّے کھرے اور پاکیزہ ماحول کا ذکر کرتے ہوئے گپتا رضا نے

گاؤں کے لوگوں کی فطری شرافت کا اعتراف کیا ہے۔ دیکھئے

"درگا بارہ برس کی ہوگئی تھی لیکن ابھی تک اسے زنانے مردانے کی تمیز نہ تھی۔ یوں بھی گاؤں والے بیحد سادہ اور شریف تھے۔ یہ ضرورت کہاں تھی کہ بچے بچیوں کو بُری نظروں سے بچایا جائے۔" صت ۲۴۶

عبدل بابا کا تعارف کراتے ہوئے کالی داس گپتا رضا نے کم سے کم الفاظ میں بہت کچھ کہا اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایجاز واختصار کا کمال ہے اور اس میں بھی ایک شاعر کی صناعی اور فن کاری شامل ہے۔ دیکھئے۔

"عبدل بابا کا گاؤں جس میں وہ رہتے تھے جنگل کے درختوں کی چار دیواری میں گھرا ہوا تھا اور ان کا چھوٹا سا مکان غریبوں کے کچے گھروں کی چار دیواری میں، اسی گھر کے سادہ سے برآمدہ میں عبدل بابا سے میری پہلی بھینٹ ہوئی تھی اور مجھے ایسے لگا تھا جیسے میں ان کو جگ جگ سے پہچانتا تھا اور وہ مجھے صدیوں سے جانتے تھے ورنہ اس پہلی بھینٹ سے پہلے میں انہیں صرف ایک شاعر کی حیثیت سے جانتا تھا اس شاعر کی حیثیت سے جو پت جھڑ کے موسم میں بھی بسنت کے پھولوں کی طرح کھلا رہتا ہے۔" صت ۲۵۰

ان خاکوں کے اسلوب کی بات تو میں کر چکا ہوں کہ نثرِ لطیف میں گپتا رضا نے زبان و بیان کی شیرینی اور مٹھاس سمودی ہے ایک اہم بات یہ ہے کہ اپنی تحریر میں کالی داس گپتا رضا نے ہندی کے نرم اور کومل الفاظ استعمال کیے ہیں جن کی وجہ سے ان کے لب و لہجے میں تازگی اور شادابی آگئی ہے اور ان سے تحریر کا لطف دو بالا ہو گیا ہے۔

"ہمارا تخلص" اور "ہم ایڈیٹر تھے" طنزیہ اور مزاحیہ مضمون ہیں۔ "ہمارا تخلص" میں عاقل کے حوالے سے طنز کی گئی ہے اور ایک طرح جدید رنگ شعر کا بھی مذاق اڑایا گیا ہے خاص طور پہ ان شاعروں کا جو جدت کی ترنگ میں نہ تو الفاظ کی صحت کا خیال رکھتے ہیں اور نہ ہی شعر کی معنویت کا۔ نکٹے کے عنوان سے ایک نظم بطور نمونہ درج ہے دیکھیے۔

ناک پر واعظوں کی ہے
جنت کا پیڑ
اور اسی پیڑ کی
چھاؤں میں
سینکڑوں نکٹے
آرام میں محو ہیں

کالی داس گپتا رضا نے جس فنکارانہ مہارت سے طنز کی ہے اس کی بنا پر میں یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ ان کے اندر ایک ایسا فنکار چھپا بیٹھا ہے جو ہر طرح کے مضامین کہنے اور ہر طرح کی تحریر لکھنے پر قادر ہے مگر یوں لگتا ہے کہ کالی داس گپتا رضا تحقیقی کاموں میں اُلجھ کر رہ جاتے ہیں اور یہ ہے بھی صحیح کہ جو تحقیق کا ہو رہا پھر کہیں کا نہ رہا۔ اس کے باوجود دیگر اصناف کے حوالے سے جو کچھ اب تک سامنے آیا ہے اس کی داد نہ دینا بے انصافی ہوگی۔ اسی طرح "ہم ایڈیٹر تھے" میں بھی طنزیہ پیرایہ اختیار کیا گیا ہے اور رسالوں کے ایڈیٹروں پر چوٹ کی گئی ہے اور اس میں ایسا اندازِ بیان ہے کہ طنز کو بین السطور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مجلس مشاورت میں جو صاحبان شامل ہیں ان کے نام بھی خاصے مضحکہ خیز لگتے ہیں مثلاً رغبت کابلی، دولت مفلس آبادی، عظمت ذیلی وغیرہ۔ درحقیقت اس مضمون کے پس منظر میں کالی داس گپتا رضا نے ان لوگوں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے جو چھوٹے موٹے چیتھڑے نکال کر بزعمِ خود اُردو کی خدمت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں اپنے اعزاز میں استقبالیے دلواتے ہیں اور یوں اصل کا حق مارتے ہیں۔ کالی داس گپتا رضا کا رنگ دیکھئے۔

"اردو قاری کی آنکھیں تو کھلنا ہی تھیں مگر ہماری آنکھیں بھی کھل گئیں اور ہم نے عہد کر لیا کہ جب تک رسالے کی باگ ڈور ہمارے ہاتھ میں رہے گی ہم پرچمِ اردو بلند کرتے رہیں گے اور پہاڑی صحت افزا مقام پر موسم گرما گذارنے کے لطف سے محروم نہ رہیں گے چنانچہ جب تک ہم رسالے کے ایڈیٹر رہے اُردو ہمارے سایۂ عاطفت میں پل کر جوان ہوتی رہی اور ہم اردو کے سایۂ عاطفت میں ...." ص ۲۶۵

اسلوب کا کمال دیکھئے کہ لکھنے والا طنز کے کاری نشتر چلا رہا ہے اور دل میں ہیں کہ اترتے چلے جاتے ہیں۔ الفاظ کی یہ کاٹ دراصل ان کے فنی کمال کی آئینہ دار ہے۔

اس تناظر میں اگر رفتارِ قلم کے مضامین کا تجزیاتی مطالعہ کریں تو یہ بات روشن منور ہو جاتی ہے کہ کالی داس گپتا رضا نے محض منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے یہ مضامین نہیں لکھے بلکہ ان میں ان کی ذہنی اُپج بھی موجود ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کے تخلیقی و تحقیقی مزاج کا ایک حصہ ہے اور اس میں بھی ان کی شخصیت کے جوہر کھلتے ہیں اور اس طرح انھوں نے اردو ادب کی اب تک جو خدمت کی ہے اس کی بنا پر صابر دت کی اس بات سے مجھے کیا اُردو کے ہر بہی خواہ کو اتفاق ہوگا کہ کالی داس گپتا رضا اپنے آپ میں نہ صرف ایک دانش کدہ ہے بلکہ اردو زبان کا دست و بازو بھی ہے اگرچہ اس

زبان کی دی ہوئی روٹی نہیں کھاتا۔ چنانچہ اردو کی ترویج و ترقی میں ہندوؤں نے جو قابلِ قدر خدمات سرانجام دی ہیں اردو ادب کی تاریخ ان کے ذکر کے بغیر ادھوری ہے۔ کرشن چندر، رام لعل، جوگندر پال، فکر تونسوی، فراق گورکھپوری کے ساتھ ساتھ کالی داس گپتا رضا کی علمی و ادبی فتوحات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو میری نظر میں تحقیق کے جنگل میں لطافتوں کا ایسا پھول ہے جس کی خوشبو اردو شعر و ادب کو نئے ذائقوں سے روشناس کراتی ہے۔
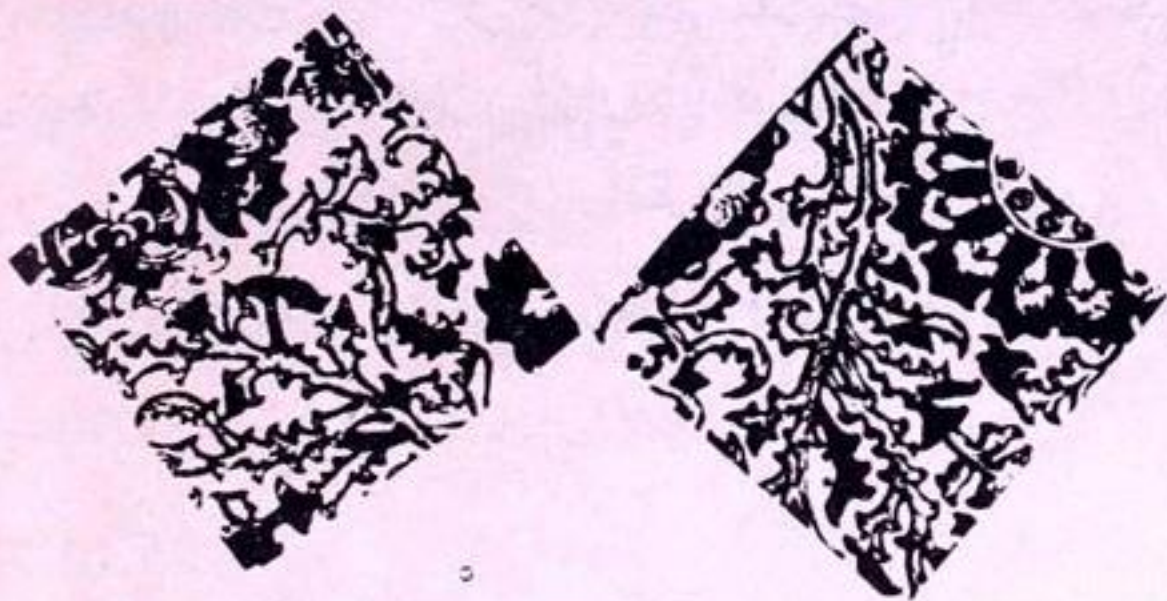
ہمارے آئین میں جس سیکولرازم کا تذکرہ کیا گیا ہے، وہ محض کتابی عبارت آرائی بن کر جمود کا شکار ہو گیا ہے، اور ہماری قومی یک جہتی اور قومی اتحاد ایک تکلیف دہ فریب نظر کی صورت میں ہمارا تمسخر اڑا رہا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ دیوی دیوتاؤں سے متعلق اور ان پر مبنی سیاسیات ہم جنسوں کی انسان دوستی، سماجی اور اقتصادی انصاف اور روحانی و مادی امتزاج کا قیمہ بنا رہی ہے۔ آج قرآن اور بائبل نیز گرو گرنتھ صاحب اور وید شاستر اور خونی پالیسیوں کی تشہیر و ترویج کے لیے کام میں لائے جاتے ہیں۔ ان کے ذریعے ان اشخاص اور عقائد کے لیے سزائے موت کا حکم سنایا جاتا ہے جو ہماری جمہوریہ کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور جو اس کی اساس ہیں۔ اس طریقِ عمل کو بدلنا ہے اور دیوی دیوتاؤں کے ڈھونگ کو بے نقاب کرنا ہے ورنہ بصورتِ دیگر ہماری بقا ممکن نہیں۔ سیکولرازم کے پر جوش حامیوں اور انسان دوستی نیز سماجواد میں یقین رکھنے والوں کو اب آئینی فتح کے لیے لڑائی لڑنی ہے تاکہ سماجی و سیکولر معاملات نیز مقولات اور پجاریوں اور پنڈتوں سے متعلق معاملات کے درمیان حدِ فاصل قائم کی جا سکے۔

جسٹس وی۔ آر کرشنا آئر

ڈاکٹر عابد پیشاوری

قابلِ رشکِ محقق

رشک بھی عجیب و غریب جذبہ بلکہ "سرجذبہ" ہے۔ (یہ لفظ سرخوشی، سرمستی وغیرہ کی طرز پر تراشا گیا ہے جس سے اصل کی وقعت یا قدر و قیمت میں اک ذرا اضافہ ہو جاتا ہے) اس کے بغیر ترقی ممکن ہے نہ تنوع۔ وہ جو کہتے ہیں خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے اس کے پیچھے یہی سرجذبہ کارفرما ہے ورنہ "دیکھ کر" کی معنویت مشکوک ہو جائے گی۔ ترقی کا راز بھی یہی ہے۔ جیسے مرنا نہ ہو تو جینے کا مزہ نہیں اسی طرح اگر رشک نہ ہو تو ترقی نہیں ظاہر ہوا کہ رشک بہت بنیادی بلکہ ضروری جذبہ ہے اور اس سے کوئی بشر خالی نہیں، تناسب میں کمی بیشی کی بات دوسری ہے۔ لیکن جس طرح ہر چیز کے دو پہلو، دو رُخ ہوتے ہیں اسی طرح ہر قاعدے میں ایک مستثنیٰ ہوتا ہے، اور عموماً غیر مستثنیٰ سے نمایاں ہوتا ہے۔ گویا غیر مستثنیٰ عام اور مستثنیٰ خاص اور خاص کے بہتر ہونے میں کون شک کر سکتا ہے۔ بلکہ عموماً عوام کو خواص کے رشک میں مبتلا پایا گیا ہے لیکن ع کچھ ایسے بد نصیب جنھیں ہر خوشی ہے غم۔

ہم نے اپنا شمار ہمیشہ مستثنیات میں کیا ہے۔ شمار کیا کیا ہے واقعی ایسا ہی ہے۔ لیکن مستثنیٰ کا دوسرا رخ بھی ہمیں اپنی ذات میں نظر آتا ہے۔ یعنی ہم مستثنیٰ ہو کر بھی خاص نہیں، عام ہیں بلکہ "عام عوام" ہیں۔ اس لیے نہ قابل رشک ہیں نہ قابل تقلید۔ ہماری سب سے بڑی کمی، کوتاہی یا کم نصیبی قابل رشک بلکہ قابل صد حد تک رشک کا فقدان ہے۔ باوجود خواہش و کاوش کے یہ جذبہ ہم میں پیدا ہی نہیں ہو سکا۔ اسی لیے تو کہتے ہیں ع پہنچے نہ کسی مقام پر ہم۔ اردو ادب کی دنیا میں وہ شخصیت جس کو یہ جذبہ کافی وافی ودیعت ہوا، غالب کی شخصیت ہے۔ جو رشک کی وجہ سے محبوب کے گھر کا نام بھی نہیں لے پاتا۔ اس کا دیوان مضامینِ رشک کا چمن زار ہے۔ رشک کا شاید ہی کوئی

پہلو ایسا ہے جو مرزا کے قلم کی زد سے بچ گیا ہو اور اس ہجوم رشک میں ایک مصرع ایسا بھی ہے جو مرحوم کے کم لیکن اس ہیچمدان کے حق میں زیادہ ہے یعنی ع ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے۔

آپ سوچ تو یقیناً رہیں ہوں گے کہ یہ کیا بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔ بات ایک قابل رشک محقق کی تھی اور یہ اپنی ہی رام کہانی لے بیٹھا۔ لیکن اس میں ہمارا بھی کیا قصور۔ یہ بھی ایک نفسیاتی نکتہ ہے۔ جب آپ کسی ایسی شخصیت کے متعلق کچھ کہنا چاہیں جو ہر لحاظ سے آپ سے بہتر و برتر ہو تو آپ اپنی ہی کمتری کا اظہار کرنے پر مجبور ہیں۔ یعنی جو کچھ کہا جائے گا وہ اس کی برتری کا اظہار کم اور آپ کی اپنی کمتری کا اعلان زیادہ ہو گا۔ لہذا کالی داس گپتا رضاؔ اور ہمارا کچھ ایسا ہی معاملہ ہے، اور ایک بار پھر ہم غالب کا سہارا لینے پر مجبور ہیں۔ ع کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے۔ خیر جب قلم اٹھا ہی لیا ہے تو ہر چہ بادا باد۔

ہم نے کالی داس گپتا رضاؔ کو قابل رشک محقق کہا ہے۔ قابل رشک آپ کے لیے دیکھو کہ یہاں تو رشک کا مادہ سرے سے ہے ہی نہیں) اور محقق اپنے لیے۔ اور ہمیں اس میں قطعی کوئی اعتراض نہ ہو گا اگر آپ ہمارا حصہ بھی مار لیں اور رضا صاحب کو قابل رشک اور محقق دونوں سمجھنے لگیں کہ عافیت اسی میں ہے ورنہ جب ہم ان کے کارنامے گنوائیں گے تو آپ کو مرعوبیت کا شکار ہونا پڑے گا۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس سے ہمارے حق میں دست بردار ہو جائیں۔ اس سے پہلے کہ مرعوبیت کی بات ہو، ایک فقرہ تحقیق یا محقق کے باب میں۔ ہم نے اپنی بات کا آغاز سر جذبۂ رشک سے کیا تھا۔ جب رشک کا سر قلم ہو جائے تو شک پیدا ہوتا ہے اور یہیں سے تحقیق اور محقق کا جنم ہوتا ہے۔ (اتفاق سے یہ سر بریدہ رشک کچھ ہمارے حصہ میں بھی آ گیا ہے) رشک سے بے بہرہ ہونے کے باوجود، ہم میں تفاخر کا جذبہ کسی حد تک پایا جاتا ہے (اور اپنے عام ہونے پر فخر کرنا معمولی بات نہیں)، نتیجہ میں اعترافِ عظمت کے باوجود ہم بڑے بڑوں کو خاطر میں نہیں لاتے خواہ وہ شعر کا میدان ہو، تنقید کا یا تحقیق کا۔ فی الوقت چوں کہ بات ایک محقق کی ہے اس لیے ہم اپنے آپ کو تحقیق کی حدوں تک محدود رکھیں گے۔ گذشتہ بیس پچیس سال سے ہمارے یہاں تحقیق کا خاصا چرچا ہے اور اسی نسبت سے ارزانی بھی۔ خصوصاً جب سے تحقیق

داخل مدرسہ ہوئی ہے، ایک طرح سے داخلِ دفتر ہو گئی ہے۔ سند یافتہ محققوں کی بھیڑ میں اصل محقق اندھیری رات میں اِکّا دُکّا جگنو کی طرح چمک جاتے ہیں اور بس۔ ان میں مرعوب و مبہوت کرنے والی شخصیتیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ مدرسے سے باہر بھی معاملہ کچھ امید افزا نہیں۔ جن کے کارنامے آپ کو مبہوت یا مرعوب کر سکیں انھیں محاورتاً نہیں حقیقتاً ایک ہاتھ کی انگلیوں پر شمار کیا جا سکتا ہے۔ کم از کم میرے لیے ایسا ہی ہے لیکن میں آپ کو ان کے نام نہیں بتاؤں گا کہ اس سے خلاف منشا نتیجہ نکلنے کا امکان ہے۔ یعنی میں تو یہ چاہوں گا کہ آپ بے وجہ دوسروں سے مرعوب نہ ہوں اور ہو یہ کہ آپ ان کی عظمت سے بھی انکار کر بیٹھیں جو عظیم ہوتے ہوئے بھی مرعوب کن نہیں ہیں۔ تاہم مجھے اپنی طرف سے یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں کہ میں کالی داس گپتا رضا سے مرعوب ہونے کی حد تک متاثر ہوں بسبب ان کا کام، کیا باعتبارِ کمیت کیا بہ لحاظ کیفیت۔

سُنا ہے محبت کی بنیاد نفرت ہے۔ خدا جانے یہ کہاں تک درست ہے۔ ممکن ہے ایسا ہو یا ممکن ہے ایسا نہ ہو۔ لیکن رشک کی طرح نفرت کا جذبہ بھی ہم کو نہیں بخشا گیا۔ مخالفت یا اختلاف کی بات دوسری ہے۔ عموماً اختلاف کی بنیاد فکری ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔ یعنی آپ خالص جذباتی سطح پر بھی اختلافات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ (یہ یاد رہے کہ جذبات اور تحقیق میں بُعد المشرقین ہے) لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ آدمی جذبات کی پوٹ ہے۔ اگر اس کے برعکس ہو تو اس کے آدمی ہونے میں شک ہے۔ بہ قول ایک محقق کے ع جو بشر شدت سے جذباتی نہ ہو حیوان ہے۔ جس محقق کا یہ مصرع ہے اس کا نام ہے ڈاکٹر گیان چند جین۔ کالی داس گپتا رضا کی طرح ہم جین صاحب سے بھی شدید طور پر متاثر و مرعوب ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ جین صاحب سے ہم ہی نہیں ہر کوئی جسے تحقیق سے ذرا سا بھی مس ہے) متاثر ہو گا خواہ ان سے مل کر اسے کسی مرعوبیت کا احساس نہ ہو۔

جین صاحب بلاشبہ ہمارے دور کے بڑے محققوں میں شمار ہونے کے قابل ہیں۔ اور اپنی شہرت کی طفولیت کے باوجود کالی داس گپتا رضا بھی۔ ان دونوں سے ہمارا تعارف بلکہ ہماری محبت اختلاف سے شروع ہوئی۔ کئی سال ادھر انشا پر اپنی تحقیق کے سلسلے میں جب ہم عارضی طور پر حیدر آباد میں مقیم تھے (اور آج کل جین صاحب بسلسلۂ ملازمت حیدر آباد میں مقیم ہیں) تو کسی رسالے میں جین صاحب کا ایک مضمون نظر سے گذرا تھا جس میں بحرِ

متقارب کے سلسلے میں انشا کی ایک غلطی کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے ہمیں برا لگنا ہی تھا۔ ہم نے وہ مضمون نقل کر کے رکھ لیا تھا کہ موقع لگے گا توان صاحب کو دیکھ لیں گے بلکہ سمجھ لیں گے۔ آخر یہ اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں۔ عروض کی غلطی اور انشا کے کلام میں؟ جو دریائے لطافت کا مصنف ہے جس کا ایک حصہ عروض و بیان پر مشتمل ہے (جا ہے قتیل ہی کا لکھا ہوا ہے)۔ اور پھر وقت گزرتا گیا، ہمارے کاغذوں کا انبار بڑھتا گیا بعد میں وہ مضمون اس انبار تلے دب کر غالباً پس گیا کہ اب اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اور پھر یوں ہوا کہ جموں یونی ورسٹی میں جین صاحب کو نہ صرف دیکھ ہی لیا بلکہ سمجھ بھی لیا (اگرچہ یہ دیکھنا اور سمجھنا اس طرح نہیں تھا جس طرح ہم نے ان کا مضمون دیکھ کر سوچا تھا) کم و بیش بارہ برس ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ خود انھیں کی نگرانی میں ہم نے اپنا پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کا مقالہ لکھا اور پیش کیا۔ ظاہر ہے کہ ہمیں اس طویل مدت میں یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ جین صاحب کا اعتراض برحق تھا۔ انشا سے واقعی لغزش ہوئی تھی۔ کالی داس گپتا رضا سے بھی ہماری محبت کی بنیاد مخالفت سے پڑی۔ اب یہ تو یاد نہیں کہ رضا صاحب نے کس مضمون میں جین صاحب کے متعلق کیا لکھا تھا لیکن کچھ نہ کچھ لکھا ضرور تھا (اور یہ رضا صاحب کو یاد ہو گا) لیکن ان کا اعتراض پڑھ کر ہم نے رضا صاحب کو دیکھ لینے کا ویسا کوئی ارادہ نہیں کیا تھا جیسا جین صاحب کا انشا کے خلاف مضمون پڑھ کر کیا تھا (غالباً اسی لیے اب تک انھیں دیکھنا نصیب نہیں ہوا)، بہر حال ان کا اعتراض ہمارے ذہن سے محو ہو گیا اور پھر اچانک مراسلت اور محبت کا آغاز ہو گیا جو تب سے اب تک نہ صرف قائم ہے بلکہ اس میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ رضا صاحب اپنی تصانیف تحفتہً بھیجتے رہتے ہیں (پتہ نہیں انھوں نے ہمیں اس مہربانی کا اہل کیوں سمجھا۔ کیا انھیں معلوم ہو گیا ہے ہمیں کتابیں خرید کر پڑھنے کی توفیق زرا کم ہی ملی ہے؟) ہم چاہے کوئی اور کتاب پڑھیں نہ پڑھیں۔ تحفے میں ملی ہوئی کتاب پڑھنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتے ہیں۔ اس طرح ہم خرما و ہم ثواب کی تصدیق ہوتی رہتی ہے۔

کتابوں سے پہلے کبھی کبھی رضا صاحب کے مضامین رسالوں میں نظر سے گزرتے رہتے تھے اور ہم نہ صرف ان کی تحقیقی بصیرت کے قائل ہوتے جاتے تھے بلکہ مرعوب بھی ہوتے جاتے تھے۔ ان کے تحقیقی مضامین پڑھ کر ہمیں ہمیشہ یہ محسوس ہوتا تھا جیسے وہ قاضی

عبدالودود سے متاثر ہی نہیں بلکہ ان کا انداز بھی تقریباً ویسا ہی ہے جیسا قاضی عبدالودود کا البتہ دونوں کی تحریر میں ایک واضح فرق یہ ہے، جہاں قاضی صاحب کی تحریریں فارمولوں سے گرانبار ہوتی ہیں وہاں رضا صاحب کے یہاں بالعموم سادگی ہوتی ہے۔ علمیت کا مرعوب کن احساس جو قاضی صاحب کی تحریروں سے ہوتا ہے اس کی جھلک رضا صاحب کے یہاں بھی موجود ہے۔ ان کی کتابیں دیکھنے کے بعد یہ خیال اور بھی پختہ ہو گیا بلکہ ہم نے اپنے دعوے کی تائید میں دو ایسے مضامین بھی ڈھونڈ نکالے ہیں جن میں قاضی صاحب کے فارمولائی انداز کی بھی کچھ شان پائی جاتی ہے۔ جو حضرات تصدیق چاہیں وہ سہو و سراغ میں ان کا مضمون '' آفتاب رائے رسوا دہلوی '' اور راجا رتن سنگھ زخمی پر ان کا مضمون ملاحظہ فرمالیں۔ اول الذکر کے شروع میں بیس اور موخر الذکر کی ابتدا میں پندرہ محققات کی فہرست دی گئی ہے۔ ضمیمہ و استدراک تو کئی مضامین میں مل جائے گا۔

محقق کی کچھ بنیادی خصوصیتیں ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کچھ ایسی باتیں ہیں جن کے بغیر کوئی شخص محقق ہو ہی نہیں سکتا۔ مثلاً یہ کہ ان میں محنت کرنے کی انتھک صلاحیت اور کام کی لگن ہو۔ اس کا مطالعہ وسیع ہو اور اس کا ہاضمہ درست ہو۔ یعنی وہ جو کچھ پڑھے، سمجھ کر پڑھے اور حافظے میں محفوظ بھی رکھے۔ مزاج میں عجلت پسندی نہ ہو جسے آج کل کاتا اور لے دوڑی کے محاورے سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ بے باکی و حق گوئی، یعنی محقق کسی مرتبے یا مفاد سے مرعوب و متاثر ہوئے بغیر اپنی بات کہنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ اگر تحقیق میں لالچ کی لاگ، کسی خوف یا دباؤ کی ٹیٹ ہو تو تحقیق و محقق دونوں کا پایۂ اعتبار مشکوک ہو گا۔ محقق کے مزاج میں باقاعدگی کا ہونا بھی ضروری ہے وغیرہ وغیرہ۔ اب یہ فیصلہ تو آپ رضا صاحب کی تصانیف پڑھ کر ہی لگا سکتے ہیں کہ ان میں محقق کی خصوصیات کہاں تک موجود ہیں۔ میں البتہ جین صاحب کے چند جملے نقل کرنا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے اس سے آپ کو رائے قائم کرنے میں کچھ آسانی ہو۔

آپ نے اپنی خداداد ذہن کا دوسرا استعمال اپنے نادر کتب خانے کی نشو و نما پر کیا ہے پرائیویٹ ذخیروں میں جناب مسعود حسن رضوی کی لائبریری سر فہرست تھی۔ میرا خیال ہے کہ اب ملک میں جناب کالی داس گپتا رضا کو یہ امتیاز ہے۔ غالب پر جتنا کلکشن آپ کے پاس ہے اتنا کہیں اور ہو ہی نہیں سکتا۔ ابھی تک آپ کے پاس غالبیات اہم ۸ کتابیں

تھیں۔ اب ان میں اضافہ ہونے والا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ دنیا میں آپ ہی کا کتب خانہ ایسا ہے جس میں غالب کی زندگی میں شائع شدہ دیوان کے پانچوں اڈیشن موجود ہیں۔ تذکروں، لغات، دواوین اور قدیم رسالوں کا بھی آپ کے پاس بہت نادر و وافر ذخیرہ ہے۔ نادر مخطوطات کی تعداد دو سو کے قریب ہے۔

تحقیق میں آپ کچھ لکھنے سے قبل جملہ مواد کا مطالعہ کرتے ہیں اور نہایت حزم و احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ آپ نے تحقیقی یادداشتوں کی تقریبًا ڈیڑھ سو فائلیں تیار کر رکھی ہیں۔ امید ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے تحقیقی کام سامنے آتے جائیں گے۔ یہ یاد رہے کہ اردو ان کا ضمنی شغل ہے لیکن وہ اپنے کاروباری دفتر میں صرف تین گھنٹے بیٹھتے ہیں اور اردو کے مطالعے کو روزانہ کم و بیش دس گھنٹے دیتے ہیں۔ درسگاہوں والے دھیان دیں" (متعلقات غالب تعارف از گیان چند جین ص ۹)

اردو کے عظیم محققین کو کسی نہ کسی طرح بڑے کتب خانوں سے قرب حاصل رہا ہے، وہ ان کے نجی ہوں یا کسی دوسرے سرکاری، نیم سرکاری یا غیر سرکاری ادارے کے۔ رضا صاحب نے اس روایت کو قائم رکھنے کے لیے اپنے نجی کتب خانے کی نشو و نما کی۔ مزاج کی باقاعدگی اور کام کی لگن روزانہ دس گھنٹے کام کرنے اور تحقیقی یادداشتوں کی ڈیڑھ سو فائلیں تیار کر کے رکھنے سے ظاہر ہے۔ اوپر کے اقتباس میں جین صاحب نے گویا سب کچھ کہہ دیا ہے اب ہمارے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں۔ اگر ہے بھی تو بہت کم۔ جین صاحب نے رضا صاحب کی تصانیف کا گوشوارہ بھی پیش کر دیا ہے۔

طبع زاد کتابیں!

شعلۂ خاموش (مجموعۂ کلام ۱۹۶۸ء) شورشِ پنہاں (مجموعۂ کلام ۱۹۷۰ء) شاخِ گل (مجموعۂ کلام ۱۹۷۴ء) اجالے (اسلامی نظمیں ۱۹۷۵ء)

دانگریزی نظمیں ۱۹۷۵ء)

یہ رضا صاحب کی غیر تحقیقی کاوشیں ہیں۔ گویا ۱۹۷۵ تک ان کی کوئی تحقیقی کتاب طبع نہیں ہوئی تھی۔ ۱۹۷۶ سے اس سلسلہ کا آغاز ہوتا ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے اپنے استاد کی دو کتابیں مرتب کر کے ان پر مقدمہ لکھا اور ۱۹۷۶ میں شائع کیا۔ (مکتوبات جوش ملسیانی بنام رضا اور منشورات جوش ملسیانی) انھیں ان کے میدان تحقیق

میں وارد ہونے کا پیش خیمہ کہیئے - ان کے بعد پے در پے ان کی تحقیقی تصانیف کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا جن کا ذکر ڈاکٹر جین نے اپنے تعارف میں اس طرح کیا ہے:

فی الحال آپ کی چار کتابیں معرض اشاعت میں ہیں - ان کی تفصیل یہ ہے:

۱- ہندستانی مشرقی افریقہ میں-

۲- غالب نے دعا الصباح (کذا) کا فارسی منظوم ترجمہ کیا تھا - آپ اسے ایک مبسوط دیباچہ کے ساتھ شائع کر رہے ہیں - (یہ دونوں کتابیں بقول مصنف دسمبر ۱۹۷۷ء میں شائع ہو گئی ہیں)

۳- "چکبست اور باقیات چکبست" میں ایک طرف توحیات چکبست کے ان گوشوں پر نظر ڈالی گئی ہے جو ابھی تک محققوں کی نظر سے اوجھل ہیں دوسری طرف چکبست کا مزید کلام (نظم و نثر) پیش کیا گیا ہے-

(یہ کتاب مطبوعہ صورت میں ہمارے سامنے ہے اور اس پر تاریخ اشاعت ۱۹۷۹ء درج ہے)

۴- آخری کتاب "متعلقات غالب" ہے جو غالب سے متعلق تحقیقی مضامین پر مشتمل ہے .... یہ مضامین عام دلچسپی کے نہیں - یہ کلام غالب کے رسیاؤں کے ڈھب کے بھی نہیں - یہ صرف محققینِ غالب کے درخورِ التفات ہو سکتے ہیں - ان مضامین میں رضا صاحب نے بہت سی غلط فہمیوں کا پردہ چاک کیا ہے - بہت سے حقائق کو پہلی بار افشا کیا ہے - مشتے نمونہ از خروارے - :

تخمسات قدسی کے مرتبین قاضی محمد عمر اور حاجی شمشیر علی نے مرتب اول کا جو ادبی سرقہ کیا ہے - رضا صاحب نے اس کا بھانڈا پھوڑ دیا ہے - انھوں نے ...... اس بیان کو بھی بے بنیاد قرار دیا ہے کہ تضمینات قدسی کا یہ مجموعہ کسی مشاعرے کا گلدستہ ہے .... اس قسم کا کوئی مشاعرہ منعقد ہی نہیں ہوا تھا-

غالب کے بھانجے مرزا عباس بیگ مرحوم اور مؤخر الذکر کے عم مرزا افضل بیگ کے سوانح غیر معروف ماخذ سے جمع کر کے مفصل لکھے - غالب بنام سیاح و میر غلام بابا خاں میں غالب کے دو غیر مطبوعہ فارسی قطعات بخط غالب دریافت کر کے پہلی بار پیش کیے ہیں جو غالبیات میں ایک اہم اضافہ ہے

غالب کے شاگرد ذکا کے سلسلے میں ایک کتاب "غالب اور ذکا" شائع ہو چکی ہے رضا صاحب نے ان کے بارے میں مزید تفصیلات کا انبار لگا دیا ہے..... ذکا کے مضمون کے سلسلے میں آپ نے بہت سے تاریخی قطعات کا تجزیہ کیا ہے اور ان کے تاریخی پیچ کو حل کیا ہے۔ اس سے آپ کی تاریخ دانی کا علم ہوتا ہے۔ اس مضمون کے آخر میں آپ نے ذکا کے غیر مطبوعہ دیوان کا انتخاب بھی پیش کیا ہے۔

یہ تو ایک محقق کے قلم سے رضا صاحب کی تصانیف کا تعارف تھا۔ اپنے تعارف کے آخر میں جین صاحب نے چند مزید جملے رضا صاحب کے متعلق بھی لکھے ہیں جو خاصے اہم ہیں۔

"افریقہ میں رضا صاحب محض شاعر تھے۔ ہندستان آنے کے بعد آپ کا ادبی محقق کا روپ سامنے آیا۔ غالب کے علاوہ بھی آپ کے تحقیقی مضامین کی تعداد اتنی ہے کہ ایک اوسط حجم کا مجموعہ تیار ہو سکتا ہے۔ انیسویں صدی کی ادبی تاریخ میں آپ گہری نظر رکھتے ہیں۔ رضا صاحب کسی درس گاہ یا ادارے سے متعلق نہیں۔ آپ اردو کی روٹی نہیں کھاتے۔ محض شوق کی خاطر آپ کو اردو سے لگاؤ ہے اور اسے آپ نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا ہوا ہے۔ تجارت کی شوریدگیوں اور خاطر آشوبیوں کے باوجود آپ اتنا تخلیقی اور تحقیقی کام کر لیتے ہیں۔ اس سے ہم طفلیان اردو کو شرمسار ہونا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ شعر اور تحقیق کے باب میں آپ اردو کو بہت کچھ دیں گے۔" (متعلقات غالب تعارف ص ۱۰-۱۳)

یہ طویل اقتباسات اس لیے پیش کئے گئے تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ رضا صاحب کے باب میں ایک بڑے محقق نے کتنا کچھ پہلے ہی کہہ دیا ہے۔ پھر ہمارے لیے قلم اٹھانے کی گنجائش یا جواز کیا ہے؟ لیکن آپ ہم کو محض طفیلی نہ سمجھیں، اپنا بھرم تو قائم رکھنا ہی پڑے گا۔ لہذا چند دن پہلے لکھے ہوئے اپنے ایک فرمائشی مضمون "اردو کے غیر مسلم محققین" کے چند جملے پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔:

وکیل (ڈاکٹر پرکاش مونس) کے بعد ساہوکار یعنی کالی داس گپتا رضا کا بھی تذکرہ ہو جائے۔ یہ ساہوکار بڑی خوبیوں کا مالک بلکہ ہمہ صفت موصوف ہے۔ یہ ساہوکار ہی نہیں صاحب خیر بھی ہے۔ عالم بھی ہے اور شاعر بھی۔ اس میں افسانہ نگاری کے جراثیم بھی پائے جاتے ہیں اور مزاح نگاری کے بھی۔ عمر کے لحاظ سے تو اسے بزرگوں میں شامل

کرنا پڑتا ہے لیکن ادبی نام آوری میں یہ ابھی عالمِ طفولیت میں ہے۔ تاہم اگر طفلی یہی ہے تو شباب کیا ہوگا؟ ادھر دس بارہ سال میں ان کا نام سننے میں آنے لگا ہے۔ انگریزی کا ایک محاورہ ہے to arrive with a bang جس کا اردو مترادف دندناتے ہوئے داخل ہونا ہو سکتا ہے۔ کالی داس گپتا رضا میدان تحقیق میں واقعی دندناتے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔ پچھلے تقریباً ۵ سال میں ان کی پانچ کتابیں سامنے آچکی ہیں۔ یوں تو ان کا موضوع عموماً ادبی تحقیق ہے لیکن ان کی غالباً پہلی کتاب "ہندستانی مشرقی افریقہ میں" ہے اور اسے تاریخی تحقیق کہنا چاہیئے۔ غالب سے ان کی دلچسپی جنون کی حدوں کو چھوتی معلوم ہوتی ہے۔ جس کے ثبوت میں ان کی دو کتابیں دعائے صباح از غالب اور متعلقات غالب پیش کی جاسکتی ہیں۔ پہلی کو ترتیب متن کے ذیل میں رکھ لیجئے۔ متعلقات غالب میں غالب پر کم اور متعلقات و متعلقینِ غالب پر بہت کچھ ہے۔ اور یہ بہت کچھ ایسا ہے کہ اس پر ماہرین غالبیات کو بھی رشک آئے۔ رضا کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ان موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں جن پر معلومات نہ صرف عام نہیں بلکہ بہ آسانی دستیاب بھی نہیں۔ غالباً چکبست کے انتخاب میں ان کے مزاج کی اسی افتاد کو دخل ہے۔ چکبست پر ایک کتاب "چکبست اور باقیاتِ چکبست" تو وہ پہلے ہی لکھ چکے تھے۔ ابھی چند روز پہلے انھوں نے کلیاتِ چکبست بھی مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔ حال ہی میں ان کی ایک اور کتاب سہو و سراغ چھپ کر آئی ہے (تاریخ اشاعت جنوری ۱۹۸۰ء) لیکن ہم نے سہو و سراغ کو عمداً موخر رکھا ہے) جس میں سہو کم اور سراغ زیادہ ہے۔ اور یہ ان کی ہر تصنیف کی خوبی ہے۔ مسلّمات کو بدل دینا، معروف بلکہ مقبول غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا ہر کسی کا منصب نہیں۔ یہ منصب گنتی کے چند لوگوں کے حصے میں آیا ہے۔ ان میں کالی داس گپتا رضا بھی شامل ہیں اور وہ بوجوہِ احسن بلکہ قابلِ رشک حد تک کامیابی سے اس کا حق ادا کر رہے ہیں۔ غالب کا یہ مصرع ان پر صادق آتا ہے۔

ع توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے۔

قاعدے سے اس مضمون کو یہیں ختم ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن مذکورہ آخری کتاب سہو و سراغ کے باب میں دو ایک جملے لکھنا ضروری ہیں۔ اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود، ہمارے خیال میں اس کتاب کو ابھی شائع نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ اس میں مصنف کی

مرضی کو کم اور مرتب کی خواہش کو زیادہ دخل معلوم ہوتا ہے۔ اس کے مشتملات میں بیشتر کی نوعیت یادداشتوں کی ہے جن پر شاید رضا صاحب کا ارادہ باقاعدہ مضامین لکھنے کا تھا۔ ایسا لگتا ہے مرتب کو اس سند کی اشاعت و تشہیر مقصود تھی: "آپ ہر فن مولا ہیں۔ اسی لیئے (کذا) تحقیق کے خواص بھی بن گئے۔ خدا ہی خیر کرے" (باقر مہدی) اللہ اللہ اب تحقیق ایسی ہی معمولی چیز تو ہے کہ "ہر فن مولا" کو محقق کا درجہ بخش دیا جائے۔ یہ سرٹی فکیٹ ایک غیر محقق نے دوسرے غیر محقق کو بخشا ہے۔ اس لیے اس کی وقعت معلوم لیکن مرتب نے اسے کور پر اس طرح شائع کیا ہے جس کے لیے غالب نے کہا تھا ؎ غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر — کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے۔

کتاب کی ترتیب میں بے سلیقگی کی داد بھی دی گئی ہے۔ بھلا تحقیق کے دقیق مسائل کہاں اور کہاں ہلکی پھلکی تحریریں۔ اسے آفتاب کی کرن میں پاپوش کا پیوند لگانا کہیئے اس اشاعت سے مرتب کا مقصد مصنف کو متعارف کرانا تھا جو اس لیے غلط ہے کہ مصنف اب اردو تحقیق میں کسی تعارف کا محتاج نہیں رہ گیا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ مصنف نے کس مصلحت کے پیشِ نظر اشاعت کی اجازت دے دی۔ خیر ان کی مصلحتیں وہ جانیں لیکن ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس اشاعت سے ان پر عجلت زدگی یا کاتا اور لے دوڑی اور تعددِ تصانیف اور ہوسِ تشہیر کا الزام وارد ہو سکتا ہے۔ ہوس کو خواہ کتنی ہی نشاط کار ہو، رضا صاحب جیسے محتاط محقق کو ایسی مصلحتوں کے دام میں نہیں آنا چاہیئے کہ قطرے کو گہر ہونے تک حلقۂ صد کامِ نہنگ حائل ہیں۔

جو نقش تھے پامال بنائے میں نے
بکھرے ہوئے بال بنائے میں نے
تخلیق کے کرب کی جو کھینچی تصویر
تو اپنے خد و خال بنائے میں نے

کالی داس گپتا رضاؔ

(آپ بیتی)

(سالِ تحریر ۱۹۷۸ء)

"...بہرحال ریختہ کی خاک ہمیشہ سے اڑتی آئی ہے اور ہمیشہ اڑتی رہے گی۔ ہم میں اجتماعی کام کرنے کی صلاحیت بہت کم ہے۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ آنے والے پچاس برسوں تک بھی اردو کی عظمت انفرادی طور پر کیے ہوئے کام ہی کے سہارے باقی رہے گی۔ اجتماعی کام کے سہارے نہیں......"

مصرعِ طرح تھا ؏

پاس آ آ کے دور جاتے ہیں

مئی (۱۹۳۹) کا مہینہ تھا، شدت کی گرمی تھی۔ شام کو غروبِ آفتاب کے بعد ہوسٹل (ایل۔ آر۔ دوآبہ ہائی اسکول۔ جالندھر شہر) کی چھت پر نیاز احمد، مدن لال، گورچین سنگھ، محمد اسمٰعیل، رمیش وغیرہ کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا کہ مجھے گرہ سوجھ گئی۔ میں نے ذرا اونچی آواز سے کہا ؎

وہ مرا ظرف آزماتے ہیں
پاس آ آ کے دور جاتے ہیں

میرے ان دوستوں میں سے کسی کو شعر و شاعری سے شغف نہ تھا۔ وہ اپنی ناکامی اور میری کامیابی پر دل مسوس کر رہ گئے۔ ماش کی دال اور بینگن کے بھرتے کی رکابیاں دھری رہ گئیں۔ دیوار کی اوٹ سے ماسٹر رتن[1] نے سنا اور وہ ہمارے پاس آ گئے۔ رمیش نے ماش کی دال کی رکابی اور پراٹھا ان کی طرف بڑھا دیا۔ دیکھتے ہی فرمایا ؎

ماش کی دال تو نہیں مرغوب بھرتہ بینگن کا خوب کھاتے ہیں

---

[1] پنڈت ہری کرشن رتن ایم۔ اے۔ ایم۔ او۔ ایل۔ ہمیں اردو فارسی کا درس دیا کرتے تھے۔ اچھے شاعر تھے، نہایت شریف اور قابل استاد تھے۔

چند ماہ پہلے رسالہ "مستانہ جوگی" لاہور میں ایک غزل پڑھی تھی، بیدار خدا حافظ، رفتار خدا حافظ۔ ردیف بہت پسند آئی اور بے اختیار سات آٹھ شعر کہہ ڈالے۔ یہ میری پہلی مکمل غزل تھی۔ صرف مطلع یاد ہے ؎

کہتا ہے تجھے دل سے بیمار خدا حافظ

اے پیار خدا حافظ، اے یار خدا حافظ

میرے گاؤں[1] (مکند پور ضلع جالندھر) میں محرم میں عاشورے کے روز تعزیہ بڑی دھوم دھام سے اٹھایا جاتا تھا۔ جس میں ہندو برابر کے شریک ہوتے تھے۔ ہماری بیٹھک کے سامنے جگہ، نسبتاً کشادہ ہے وہاں تعزیہ ذرا زیادہ وقت کے لیے رُکتا تھا۔ بیٹھک کے متصل اُپادھیائے براہمنوں کا کنواں (پادھیاں دا کھو) تھا اس پر میرے والدِ محترم دو سبیلیں لگاتے تھے۔ ایک لال شکر کی اور دوسری سفید شکر کی۔ میرے والد کٹر آریہ سماجی تھے اور ہمارا سب کا مسلک یہی تھا، مگر بزرگوں کی اس روایت کو جو کئی پشتوں سے جاری تھی پورے اہتمام سے انجام دیتے تھے۔ میں نے خود ان سبیلوں پر گھنٹوں کھڑے رہ کر سیکڑوں تشنگانِ رہِ کربلا کی پیاس بجھائی ہے۔ میری دادی پورے رمضان بھر حاجتمند مسلمانوں کے لیے افطار کا سامان فراہم کرتی تھیں۔ گاؤں کے مسلمان نسبتاً غریب تھے اس لیے ان کی ثقافتی دیکھ ریکھ خوش حال ہندوؤں کا قومی فریضہ بن گیا تھا اور سب لوگ بلا لحاظ مذہب و مسلک اسے مستحسن نظروں سے دیکھتے تھے۔ یہ سلسلہ تقسیم ہندوستان (۱۹۴۷ء) تک جاری رہا۔ عاشورے میں ایک سوز خواں خاص طور پر شرکت کرتے تھے۔ میرا یہ مصرع ان کی مکمل خارجی تصویر پیش کرتا ہے۔ ؏

سیاہ رنگت، متین چہرہ، بلند قامت، دراز گیسو

جب وہ ہماری بیٹھک کے سامنے رُک کر سوز خوانی کرتے تو میرا دل بھر آتا۔ اشعار کی معنویت اور موزونیت میرے اندر چھپے ہوئے شاعر کو بیدار کر کے جیسے کسی بھری پُری محفل میں لا کھڑا کرتیں۔ اکیلے میں یہی ازلی درد، یہی ازلی سوز و گداز مجھے جھنجھوڑتا رہا۔ میری فرشتہ سیرت والدہ بھی ہمیشہ زیر دستوں سے وفا کی نصیحت کرتیں جو دل میں گڑ جاتی۔ میری غزلوں کے ایسے شعر شاید اسی تاثر کی دین ہیں۔ یہ تاثر بچپن سے لے کر آج چوّن سال کی عمر تک برابر کار فرما ہے ؎

سائے سکھ کی باتیں، اب ہونٹوں پر لانا کیا

رات گئی سو بات گئی، اب دن میں دہرانا کیا

---

[1] اہلِ مکند پور، مکند پور کو گاؤں کہا کرتے تھے اور آس پاس کے گاؤں والے شہر حقیقت میں اسے قصبہ کہنا چاہیے۔

دِل کے اندھیرے گوشوں کو چاندنی رات آجائے کیوں
یادوں سے پُرنور کرو، چاند کی شمع جلانا کیا

جب بگولے نقشِ پا بھی لے اُڑے
خارِ خوخوردہ نشاں دینے لگا
کوئی کہہ بیٹھا حدیثِ زندگی
اِک دیا بجھ کر دھواں دینے لگا

وقتِ آخر ہے نہ اُڑ جائے کہیں غم کی مہک
دو گھڑی اور اسے زُلفوں میں بسائے رکھنا
سرے پا تک یہ ترے زخمِ وفا کیا کہنا
اپنے آنگن میں کبھی پھول سجائے رکھنا

اضافہ ہو گیا ہے دیکھ کتنا
مرے اشکوں سے تیری دلکشی میں
وہی قاتل، وہی وحشی، وہی نر
نہ آئی آدمیت آدمی میں

آلام ہمہ جہت اب آلام
دُکھ جزوِ حیات بن گیا ہے
آتے جاتے رُلا رہا ہوں
نالہ خیرات بن گیا ہے

ہنستے چہروں میں پنہاں الم، الاماں
کون ہنستا ہے دِل سے کلی کی طرح
یاس کس دستِ غیبی کی ہے منتظر
راستے میں لٹی پالکی کی طرح

اُڑتا پھرتا غبار ہر سُو
یہ دشتِ رواں کبھی چمن تھا
دنیا مقتل بنی تھی اور دلِ
اپنے ہی خیال میں مگن تھا

چل پڑی موت اپنے مسکن سے
زندگی کیسی بے خبر ہو گی
وقت آنے دو روپ نکھریگا
سائے پلٹیں گے دوپہر ہو گی

مراد جو دہے مبہم گر وجود تو ہے — افق کے پار سہی اور میں کہیں نہ سہی
ازل سے گردہوں میں خاکِ پا اٹھا ہوں — کوئی بگولہ مجھے ڈھونڈتا نہیں نہ سہی

تجھ بن میرے ارماں، جیسے — گُل بوٹے اُجڑے آنگن کے
باجے گاجے کا کیا سُننا — بول سنو دل کی دھڑکن کے
نیلے ہونٹ اور پیلا چہرہ — رنگ ہی کتنے ہیں تر دھن کے

میں پہلے ہی سے اپنے شعر سنانے میں بہت شرم محسوس کرتا ہوں اور میری یہ روش آج تک قائم ہے۔ اس لئے میرے اِرد گرد کے (۱۹۴۲ء) بہت کم لوگ جانتے تھے کہ مجھے شعر کہنے کا شوق ہے۔ حالانکہ اس وقت مَیں استاد سے اصلاح لینی شروع کرچکا تھا اور زکرِ شعر باقاعدہ کرتا تھا۔ میں نے موسیقی کی تعلیم بطورِ خاص حاصل کی تھی۔ خوش حالی کا زمانہ تھا۔ میرے یہاں خوب خوب محفلیں ہوتیں۔ روزانہ کے حاضر باشوں میں ایک گویّا حسینے خاں تھا۔ راگ کی واقفیت کے علاوہ وہ ایسا خوش آواز تھا کہ اس کی آواز سن کر چہچہاتے ہوئے پرندے بھی شرما جاتے۔ اُسے ایک دن معلوم ہوا کہ میں شعر بھی کہتا ہوں۔ اصرار سے ایک نظم سنی "محبِ وطن کی دعا" جسے اس نے پسند کیا اور اپنی بیاض میں لکھ لیا۔

ہمارے گاؤں سے موضع کھٹکڑ کلاں صرف تین کوس کے فاصلے پر ہے۔ یہ وہی کھٹکڑ کلاں ہے جس نے شہیدِ اعظم بھگت سنگھ[1] کو جنم دیا۔ جب کی بات بیان کر رہا ہوں اس وقت بھگت سنگھ کی شہادت کو تیرہ چودہ برس ہو چکے تھے۔ اس سال بیساکھی کے پوتر دن پر دیش بھگتوں نے "بھگت سنگھ شہیدی میلہ" کی بنیاد ڈال دی۔ ہزاروں لوگ جمع ہوئے۔ کھٹکڑ کلاں میں ریلوے لائن کے اس پار آم کے درختوں کے جھنڈ سے لگا ہوا سادہ گر دیع اسٹیج تیار ہو گیا۔ اس وقت کے نامی لیڈروں میں ڈاکٹر ستیہ پال نے جلیاں والا باغ امرتسر کی المناک داستان دہرائی جو بیس پچیس سال پہلے اسی روز انگریز کے خونخوار قلم سے لکھی گئی تھی۔ ماسٹر کابل سنگھ نے بھگت سنگھ کی دل بڑھا دینے والی باتیں سُنائیں۔ لاہوری رام پردیسی نے اپنا مشہور و مقبول "انگریزی حکومت کا سیاپا (نوحہ)" سُنایا۔ لوگ دیوانے ہو ہو گئے۔ حسینے خاں بھی اسی جوش

---

[1] بھگت سنگھ کے والد سردار کشن سنگھ میرے پتا جی کے بڑے شناسا تھے۔ میں نے انھیں کئی بار اپنے یہاں پتا جی کے ساتھ محوِ گفتگو دیکھا ہے۔ بھگت سنگھ کے گھر بھی ایک سے زیادہ دفعہ گیا ہوں اور ان کی ماتا جی سورگ باشی "پنجاب ماتا" کے ہاتھ کا کھانا بھی کھا چکا ہوں۔

دخروش میں اسٹیج پر وارد ہو گیا۔ وارد کیا ہو گیا بس چھا گیا۔ نظم تھی وہی محبِ وطن کی دعا۔ حب الوطنی اور اردو دونوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ جب حسینے خاں ان مصرعوں پر پہنچا۔

اے تری رحمت کے صدقے مجھ کو یہ انعام دے

جان تک قربان کر دوں میں وطن کے واسطے

تو اس کی بے حد سُریلی اور پاٹ دار آواز چند لمحوں کے لئے "انقلاب زندہ باد" کے فلک شگاف نعروں میں گم ہو کے رہ گئی۔ نظم کے ۹ بند ہیں۔ پہلا اور آخری بند سن لیجیے ؎

وقف میں کیوں ہوں نگار سحر فن کے واسطے

عشرتِ جاں کے لئے آرامِ تن کے واسطے

مہ وشانِ رقص و لطفِ انجمن کے واسطے

جان تک قربان کر دوں میں وطن کے واسطے

کر رہا ہوں میں گناہِ عشقِ ملکی بر ملا

کوئی دن ایسا بھی میرے دیس پر لا اے خدا

جس دن اٹھ جائے جنازہ ہند سے افلاس کا

اور سازِ دل کی جھنکاروں سے اُٹھے یہ صدا

جان تک قربان کر دوں میں وطن کے واسطے

ملک تقسیم ہو کر آزاد ہو گیا۔ میں جون ۱۹۴۹ء میں مشرقی افریقہ چلا گیا وہاں سے ۱۹۷۰ء میں واپس لوٹا اور بمبئی میں سکونت اختیار کر لی اور جب سے اب تک بمبئی ہی میں رہ رہا ہوں۔

۱۹۷۰ء سے اردو تحقیق کا شوق ہوا۔ تاریخ سے شروع ہی سے دلچسپی رہی ہے۔ اس لئے اس میدان میں اترنے کے لئے مجھے مشقت تو بہت اٹھانی پڑی مگر ایک نومشق کی سی محنت نہیں کرنی پڑی۔ افریقہ کا کتب خانہ وہیں چھوڑ آیا تھا۔ جو بچانوے فیصد انگریزی کتابوں پر مشتمل تھا۔ یہاں آکر از سرِ نو ذاتی کتب خانے کی بنیاد ڈالی۔ کتابوں کے جمع کرنے کے لئے طرح طرح کے پاپڑ بیلے۔ میں خود اپنے ذخیرۂ کتب کے متعلق کیا کہہ سکتا ہوں مگر ڈاکٹر گیان چند جین صاحب کے خیال میں اب یہ کتب خانہ ہندوستان بھر کے ذاتی کتب خانوں میں پہلے نمبر پر ہے۔ اس میں ابھی تمام کتابوں کا کیٹ لاگ نہیں بن سکا۔ ایک اندازے کے مطابق دس ہزار سے زائد کتابیں، رسالے اور دو سو سے زاید مخطوطے ہوں گے۔ میرا غالبیات کا ذخیرہ شاید دنیا

بھر کا سب سے بڑا غالب کلکشن ہے۔ امید ہے کہ جلد ہی تمام کتب کی تفصیلی فہرست شائع ہو گی کام شروع ہو چکا ہے۔

میری تعلیم کچھ زیادہ نہیں۔ میں نے اردو فارسی پنجاب یونیورسٹی کے ادیب فاضل اور منشی فاضل تک انگریزی کیمبرج یونیورسٹی کے سینیئر سرٹیفیکیٹ تک پڑھی مگر اس نصابی تعلیم کی کمی کو میں نے ایک حد تک اکتسابی تعلیم سے پورا کیا۔ میرا اندازہ ہے کہ میں نے کم و بیش تین ہزار کتابیں اردو فارسی، انگریزی کی حرف بحرف پڑھی ہوں گی اور تقریباً اتنی ہی کتابوں کا جزوی طور پر مطالعہ کیا ہوگا۔ مختلف رسائل بھی ہزاروں کی تعداد میں نظر سے گذرے ہوں گے۔ حوالے کی کتابوں کی ورق گردانی تو ہوتی ہی رہتی ہے۔ کاروبار کے علاوہ ہر روز تقریباً دس گھنٹے پڑھنے لکھنے کی نذر ہوتے ہیں۔

مشاعروں اور اجتماعوں سے گھبراتا ہوں۔ اگر محفل چند ہی افراد پر مشتمل ہو تو لطف اندوز ہوتا ہوں اور اس میں کچھ کہہ سن بھی لیتا ہوں۔ نام و نمود سے کوئی غرض نہیں۔ گوشہ نشینی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ کام بہت ہوتا ہے اور ڈھنگ کا ہوتا ہے۔ پروپگنڈہ کبھی میرا شعار نہیں رہا۔ پرماتما کی مہربانی سے مالی حالت اطمینان بخش ہے مگر میں نے مال و متاع کو کبھی اپنا نام اچھالنے کے لئے استعمال نہیں کیا۔ دس تصانیف اب تک منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں اکثر پر انعام بھی مل چکا ہے مگر مجھ پر آج تک نہیں کھل سکا کہ کتابوں پر انعام دینے کا طریقہ کیا ہے اور انعام دینے والوں کو یہ کیوں کر معلوم ہوا کہ میری یہ کتاب اوّل نمبر کی ہے اور وہ کتاب دوسرے درجے کے انعام کے لائق ہے اور یا واقعی میری کوئی کتاب اس لائق بھی تھی کہ اس پر انعام دیا جاتا۔

بہر حال یہ خاک ہمیشہ سے اڑتی آئی ہے اور ہمیشہ اڑتی رہے گی۔ ہم میں اجتماعی کام کرنے کی صلاحیت بہت کم ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ آنے والے پچاس برسوں تک بھی اردو کی عظمت انفرادی طور پر کئے ہوئے کام ہی کے سہارے باقی رہے گی۔ اجتماعی کام کے سہارے نہیں۔ میری تصانیف کے نام یہ ہیں:۔

۱۔ شعلۂ خاموش	(مجموعۂ کلام)	۱۹۶۸ء
۲۔ شورشِ پنہاں	(مجموعۂ کلام)	۱۹۷۰ء
۳۔ شاخِ گل	(")	۱۹۷۴ء
۴۔ اُجالے	(")	۱۹۷۵ء
۵۔ The Sielent Flame	(انگریزی)	۱۹۷۵ء
۶۔ مکتوباتِ جوش ملسیانی بنام رضا	(نثر)	۱۹۷۶ء
۷۔ منشوراتِ جوش ملسیانی	(نثر)	۱۹۷۷ء
۸۔ ہندوستانی مشرقی افریقہ میں	(")	۱۹۷۷ء
۹۔ دعائے صباح (فارسی منظوم ترجمۂ غالب) نثر	"	
۱۰۔ متعلقاتِ غالب	(")	۱۹۷۸ء

"چکبست اور باقیاتِ چکبست" اس وقت زیر طبع ہے۔ جنوری ۱۹۷۹ء تک شائع ہو سکے گی اور بہت سا کام تیار ہے مگر فائنل ایڈیٹ کا منتظر ہے۔ تقریباً اسّی مضامین (بیشتر تحقیقی) لکھے ہوں گے بیشتر مختلف رسائل میں چھپ چکے ہیں۔ اگر صحت نے اجازت دی تو اگلے آٹھ دس برسوں میں میرا بھلا بُرا بہت سا تحقیقی کام منظرِ عام پر آ جائے گا۔

میرا تعلق نکندپور (ضلع جالندھر پنجاب) کے مشہور اگروال خاندان سے ہے۔ میرے بزرگ (میری ساتویں پشت ہے) ضلع حصار (ہریانہ) کے ایک گاؤں کھرک پونیاں سے ہجرت کر کے نکندپور آ بسے تھے۔ یہاں آ کر بہت عزت اور شہرت پائی۔ امارت میں بھی اور شرافت میں بھی۔ خاندانی پیشہ ساہوکاری تھا۔ مجھے ابھی دو برس پہلے تک اپنی صحیح تاریخ ولادت کا علم نہ تھا مگر پرانے کاغذات سے اصل یاد داشت نکل آئی تو معلوم ہوا کہ میرا جنم ۲۵ اگست ۱۹۲۵ء کو پانچ بجے بعد دوپہر ہوا تھا۔

میری شادی نیروبی (مشرقی افریقہ) ہی میں ۴ اگست ۱۹۵۶ء کو ساوتری دیوی سے ہوئی[1]۔ میرے خسر سورگیہ لاجپت رائے گپتا ایک مدت سے تنزانیہ کے شہر اروشا میں مقیم تھے۔ میرے دو بچے ہیں لڑکا ونل اور لڑکی ریتا، اس وقت دونوں ہی کالج میں زیرِ تعلیم ہیں۔

خاندانی پیشہ ساہوکارا تھا۔ اب بھی وہی ہے، اب اسے ساہوکارا نہیں بنکنگ کہا جانے لگا ہے چلو یوں ہی سہی۔

ذہن میں بہت کچھ محفوظ ہے۔ چند برسوں میں سب لکھ ڈالوں گا، شاید اب یہی مناسب ہوگا دل بھی یہی کہتا ہے ؎

ہے عمر اخیر اور نہ دیکھو بھالو
آنکھوں میں ہیں جو خواب انھیں کو پالو
جی کھولو، قلم ہاتھ میں لو، الٹو ورق
محفوظ ہے جو ذہن میں سب لکھ ڈالو

---

[1] استاذی قبلہ جوش ملسیانی مرحوم نے میری شادی پر یہ قطعہ لکھ کر بھیجا تھا ؎

ڈاک نے آج سنایا مژدہ ہونے والی ہے رضا کی شادی
کالے کوسوں کا سفر ہے اے جوش بھیج دو خط میں مبارک بادی

رفتارِ قلم
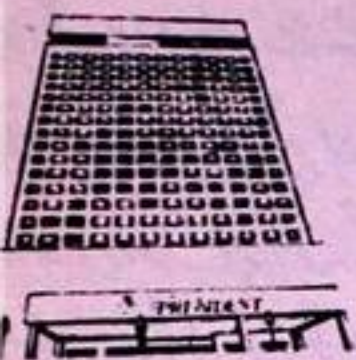
دِلّی سے دِلّی تک

میرا نام امر بھارتی ہے یعنی زندہ جاوید ہندوستانی۔ وہ ہندوستانی جو کبھی نہیں مرتا۔ میں نے اور تاریخ نے ایک ساتھ جنم لیا تھا۔ تاریخ تو تمام عالم میں پھیل گئی۔ مگر میں نے خود کو ہندوستان ہی تک محدود رکھا۔ تاریخ کا کوئی مسلک کوئی وطن نہیں ہے وہ ہر رنگ میں ہر جگہ ہے مگر میں ایسا ہرجائی نہیں۔ میرا مسلک بھی ہے اور وطن بھی۔ یہ ضرور ہے کہ میں نے ان دونوں کو ہندوستانیت میں ضم کر دیا ہے۔

میں اس وقت ہمایوں کے مقبرے کی بغل میں یعنی نظام الدین (مشرقی) کی نئی آبادی میں رہ رہا ہوں۔ ہندوستانی ہوں کہیں بھی رہوں۔ مجھے روکنے والا کون؟ اور مجھے دِلّی سے پیار ہے۔ کل کی دِلّی سے بھی اور آج کی دلّی سے بھی۔ اس لئے میں صدیوں سے یہیں رہ رہا ہوں۔

١٨٠٣ء سے اکتوبر ١٨٥٧ء تک دلّی میں میری سکونت اُس علاقے میں تھی جہاں اب کوئی عمارت نہیں ہے یعنی جامع مسجد اور قلعہ کے درمیان کی کھلی جگہ۔ ان دنوں یہ میدان متوسط طبقے کے گھروں سے اٹا پڑا ہے۔ مغل دربار کے بعض امرا بھی یہاں رہتے تھے۔ اسی طرح جس علاقے میں آج ریلوے نظام اور ریلوے لائنس میں وہ ان دنوں پرانی دلّی کا آباد ترین علاقہ تھا۔ ١٨٥٧ء سے پہلے کے چند برسوں میں انگریزی عملداری نے پرامن فضا پیدا کر دی تھی۔ لہذا خوشحالی بھی پلٹ آئی تھی اگرچہ یہی عارضی خوشحالی بعد میں ہماری غلامی کی زنجیر کی مضبوط ترین کڑی ثابت ہوئی۔

اورنگ زیب (متوفی ١٧٠٧ء) کا عہد حکومت مغلیہ سلطنت اور دِلّی دونوں کا نقطۂ عروج تھا مگر اس کے آخری پچیس سال تباہ کن ثابت ہوئے۔ اورنگ زیب دکن کی یلغار پر کیا نکلا کہ مغلیہ سلطنت اور دلی دونوں دھندلا کے رہ گئے۔ دِلّی کی آبادی بیس لاکھ نفوس پر مشتمل تھی اور تیس پینتیس سال (١٧٣٩ء) میں

نادر شاہ کے حملے کے بعد گھٹ کر صرف پانچ لاکھ رہ گئی۔ مگر دلی کا زوال تو ایک مسلسل زوال تھا۔ کمزور مغل بادشاہ جو دلی ہی کے بوجھ کو سنبھال نہ سکتے تھے اس حکومت کا بوجھ کیونکر سنبھالتے جو ان کے محتشم بزرگ ان پر لاد گئے تھے۔ دلی کے باشندے پُرامن علاقوں کی کھوج میں رہنے لگے۔ گو شہر کی محبت ان کے پاؤں کی زنجیر بن رہی تھی مگر روز کی افراتفری اس زنجیر کو ہر لحظہ کاٹے ڈالتی تھی۔ آہستہ آہستہ یہ چہکتے ہوئے پرندے پر تول گئے اور ۱۸۰۰ء کے لگ بھگ شہر کی آبادی سمٹ کر ایک لاکھ کے دائرے میں محبوس ہو گئی۔ پھر انگریزوں کا نظام مسلط ہونے لگا۔ تلاطم چندے ٹھہر گیا۔ کچھ باہر والے بھی آبسے۔ چنانچہ ۱۸۴۵ء تا ۱۸۴۷ء کی مردم شماری میں شہر، اس کے مضافات اور محلات کی آبادی ایک لاکھ چھپن ہزار کو پہنچ گئی۔ سائمن فریزر نے ۱۸۵۶ء میں صرف شہر ہی کی آبادی ایک لاکھ باون ہزار بتائی ہے۔ مجھے اعداد و شمار سے کیا غرض۔ مگر ہاں میں یہ ضرور دیکھتا تھا کہ محلے والے خوش ہیں اور دلی کے عام شہری کے چہرے پر اطمینان کی جھلک ہے۔ یہ اٹھارویں صدی کا باون بازاروں اور چھتیس منڈیوں والا شہر نہ سہی مگر اب اس میں ترقی پذیر شہر والی تمام علامتیں موجود تھیں۔

میں پھر پہلے کی طرح منہ اندھیرے فصیل سے باہر جانے لگا۔ اب کسی قسم کا کوئی خطرہ نہ تھا جب دلی دروازے پر پہنچتا تو اُسے بند پاتا۔ سنتری اسے میرے لئے کھول دیتے۔ بعد ازاں جب سورج سنہری رتھ میں سوار ہو کر اپنے سفر پر نکلتا تو دروازہ ہر آنے جانے والے کے لئے کھول دیا جاتا اور رات گئے تک کھُلا رہتا۔ آج جو فصیل کے نشان اور کھنڈر آپ کہیں کہیں دیکھ رہے ہیں اس وقت وہ پورے طور پر محفوظ تھی اور شہر اسی کے اندر تک محدود تھا۔ لوگوں کی ضرورتیں اندر ہی پوری ہو جاتی تھیں شاذ ہی باہر جانا پڑتا تھا۔ سوائے اس کے کہ فصیل کے باہر جانے کا شوق چرایا ہو۔ کسی زیارت گاہ پر پہنچنا ہو یا کوئی لمبا سفر درپیش ہو۔ کشمیری دروازے کے باہر تو چند مکان تعمیر ہو گئے تھے اور ان میں کچھ لوگ رہنے بھی لگ گئے تھے۔ مگر دلی دروازے کے باہر کوئی آبادی نہ تھی۔

اس افراتفری کے دور میں بھی دلی میں وہ گرانی نہیں ہوئی، جو ایسے حالات میں اکثر ہو جایا کرتی ہے۔ یہ شہر وسیع و عریض نیز زرخیز زراعتی علاقوں سے گھرا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں کھانے پینے کی چیزیں نسبتاً سستی رہیں۔ آج کی قیمتوں سے مقابلہ کر کے ہمت ہار نہ بیٹھئے۔ تو کہوں کہ گیہوں ایک روپے کا ایک من (چالیس کلو سے کچھ کم) اور خالص گھی ایک روپے کا چار سیر (چار کلو سے کچھ کم) فروخت ہوتا تھا۔

لوگ زیادہ تر گھر ہی میں کتے ہوئے سوت کے کپڑے پہنتے تھے۔ سردیوں میں بھی روئی ہی کے دگلے پہنے جاتے تھے بہر حال بدن اور کپڑے کی صفائی کا معیار تو اپنا اپنا ہوتا ہے۔

۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۰ء تک انگریزی حکومت واقعی امن کی علمبردار نظر آتی تھی۔ شہر کے اندر خوش حالی عام ہو گئی تھی۔ کوئی مکان اب خالی نہ ملتا تھا ہمارے پڑوس میں ہر خالی جگہ پر دوبارہ جھونپڑے اور چھوٹے چھوٹے مکان حسب توفیق تعمیر ہو کر آباد ہو گئے تھے۔ اکثریت آرام اور سکون کی زندگی گزارنے لگی تھی۔ تیوہار مشترک تھے اور شاندار پیمانے پر منائے جاتے تھے۔ شادی بیاہ کے موسم میں روزانہ جلوس نکلتے تھے۔ دعوت اور سجاوٹ پر بے دریغ دولت لٹائی جاتی تھی۔ گلی کوچوں میں ہر موڑ پر ایک نہ ایک محفل سجی نظر آتی تھی۔ امیر لوگ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ بازاروں میں بدیسی چیزیں بہت کم نظر آتی تھیں۔ دیسی چیزیں نہ صرف اچھی ہوتی تھیں بلکہ ان پر خرچ بھی کم آتا تھا۔ ان کی بناوٹ اور رنگ میں بھی ایک خاص نفاست تھی۔

شہر سے باہر ایک ہموار شاہراہ تھی جس کی باقاعدہ مرمت ہوا کرتی تھی مگر شہر کی اندر کی سڑکوں کی حالت اچھی نہ تھی۔ ہمارے علاقے میں تو یہ حال تھا کر سے گڑھوں سے پٹے پڑے تھے جو برسات کے موسم میں کیچڑ سے بھر جایا کرتے تھے۔ میں خود اس کیچڑ میں کئی بار پھنسا ہوں پھسلا ہوں گرا ہوں اور چھوٹے چھوٹے بچوں کے قہقہوں کا نشانہ بنا ہوں مگر ہم دلی والوں کو ایسی باتوں کی عادت تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ خشک اور گرم موسم میں آندھی چلنے سے جو دھول اڑا کرتی تھی وہ برسات کی کیچڑ اور بند نالیوں سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوا کرتی تھی۔ امیر لوگ اپنی شاندار بگھیوں میں آیا جایا کرتے تھے۔ جب کبھی اوبڑ کھابڑ سڑک کی وجہ سے کسی بگھی کا پہیہ نکل جاتا تو ٹریفک خوب درہم برہم ہوتا۔

آج کا چاندنی چوک اپنی تمام بھیڑ بھاڑ کے باوجود اُس وقت کے چاندنی چوک سے قطعی مختلف ہے۔ وہ وسطی نہر اور اس کے دونوں طرف کے سایہ دار درخت بھلائے نہیں بھولتے۔

میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور تیز رفتار کاریں اور اس سے ذرا پرے ریل گاڑیاں بار بار میرے دماغ کو پامال کئے جا رہی ہیں۔ کہاں آج کے مشینی دیو اور کہاں وہ شاہی ہاتھی۔ سنہری جھول اور نفیس ترین عماریوں سے مزین۔ جب یہ جلوس چاندنی چوک سے گزرتا تھا تو تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جایا کرتے تھے۔ کئی بار دل کرتا کہ میں بھی عمدہ عماری میں بادشاہ کی جگہ پر ہوتا تو کیا ہوتا مگر نہیں فوراً خیال آتا کہ مجھ میں

اور بادشاہ میں فرق ہی کیا ہے۔ میں بھی ہندوستانی وہ بھی ہندوستانی۔ تیموری خاندان نے اپنے آپ کو ہندوستان میں ایسا جذب کیا کہ اب ہر ہندوستانی اس پر ناز کرتا ہے۔ جامع مسجد سے تھوڑے فاصلے پر ایک بڑا کنواں تھا، جو "ہاتھیوں کا کنواں" ہی مشہور ہو گیا تھا۔ کیونکہ شاہی ہاتھی صبح شام اس کنویں پر لائے جاتے تھے یہاں انہیں نہلایا جاتا اور پانی پلایا جاتا تھا۔ آہ میں اس منظر کو کتنے چاؤ سے دیکھا کرتا تھا۔

مگر جلسے جلوس دعوتیں رنگ برنگ کے جلوس سات ہی تو دلّی کی زندگی نہ تھے ایک ادبی اور ذہنی تحریک بھی یہاں شانہ بشانہ سرگرم عمل تھی۔ انگریزی زبان گھٹنوں کے بل چلنے لگی تھی۔ اردو شباب پر تھی مگر فارسی کے چہرے پر جھرّیاں نظر آنے لگی تھیں۔ اردو کو مومن کا بانکپن، غالب کا بے پایاں تخیئل اور ذوق کا ملکۂ شاعری مستقبل کے لئے پر پرواز عطا کر رہے تھے۔ دلّی کالج قائم ہو چکا تھا۔ نئی فکریں وسعتوں کو ناپنے لگی تھیں۔ کہیں کہیں پرانے علوم کا مذاق بھی اڑایا جانے لگا تھا۔ رام چندر، مکند لال، نذیر احمد، ضیاءالدین محمد حسین آزاد، حالی، ذکاءاللہ اور دوسرے لوگ جو بعد میں سرسید احمد خاں کی تحریک سے وابستہ ہوئے میدانِ عمل میں آچکے تھے۔

جہاں مہرولی (قطب) میں تفریح گاہ کے لحاظ سے زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی تھی، وہاں انگریز افسروں مثلاً کول بروک اور مٹکاف نے شہر کی دوسری طرف مگر فصیل کے کافی باہر اپنی کوٹھیاں بنوائی تھیں۔ مغل درباری، ہندو اور مسلمان تاجر، انگریز افسر سب ایک پر امن فضا میں مل جل کر رہ رہے تھے۔ ہندو عموماً تجارتی اور کاروباری زندگی پر چھائے ہوئے تھے۔ انتظامیہ بیشتر انگریزوں کے ہاتھ میں تھا۔ مٹکاف کی کوٹھی (مٹکاف ہاؤس) کے سبزہ سے ڈھکے باہری صحنوں پر جب کبھی کوئی سرکاری تقریب ہوتی تو مغل شہزادے اور ہندو ساہوکار انگریز افسروں اور ان کے بال بچوں کے ساتھ برابر شریک ہوتے تھے۔ بادشاہ کی جانب سے دیوالی، ہولی اور عیدیں منائی جاتی تھیں۔ ہندو محرم کی مجلسوں اور جلوس میں اس طرح شریک ہوتے تھے گویا یہ انھیں کے مذہبی تہوار ہوں۔ میں ان تمام تقریبوں میں موجود رہتا تھا اور ہر شہری کی طرح مطمئن تھا۔ (یہ میل جول اب کم دیکھنے میں آتا ہے) موسم برسات میں مہرولی میں جب "پنکھا" ہوتا تو ہندو مسلمان عجیب جوش و خروش سے شامل ہوتے۔ مشترکہ جلوس نکلتا اور جوگ مایا جی کے مندر اور حضرت قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ پر جاتا۔ مذہبی تناؤ شاید ہی کبھی دیکھنے میں آتا تھا۔ اگر کہیں ہوتا بھی تو گائے کی قربانی پر۔ مگر بادشاہ اور اس کے مشیر اس تناؤ کو کبھی بڑھاوا نہیں دیتے تھے۔ ایک دفعہ

ایک مسلمان کی ایسی ہی شکایت پر حکیم احسن اللہ خاں نے بادشاہ کے ایما پر بہت برہمی دکھائی تھی۔ اور یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ان کے عقیدے میں گائے کی قربانی شامل نہیں۔ خود بادشاہ (بہادر شاہ) نے عید کے دن دیوان خاص میں اونٹ قربان کیا تھا۔ اور جب اعتراض ہوا تو انہوں نے کہا کہ شاہ عالم (متوفی ۱۸۰۶ء) کے وقت میں یہی قربانی دی جاتی تھی۔

میں نے اس دلی کو بھی دل سے چاہا تھا بالکل اسی دلی کی طرح جو اس سے سیکڑوں برس پہلے ڈھے ڈھے کر آباد ہوتی چلی آرہی تھی۔ مگر یہ انیسویں صدی کے وسط کی دلی ایک نرالی ہی دلی تھی نئے اور پرانے کا عارضی مگر حسین امتزاج — نئی تباہی نئی غلامی کی منتظر۔ ایک نئے جگ کے ہولناک جبڑوں میں پسنے کو تیار۔

۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کا دن آپہنچا۔ پو پھٹتے ہی میرٹھ کے سپاہی بغیر کسی اطلاع کے توپ کے دہانے کی طرح پھٹ پڑے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ آنکھوں نے دیکھا ہے۔ مگر ان کی زبان نہیں، وہ بیان نہیں کر سکتیں۔ زبان جس کی آنکھیں نہیں وہ مستعار لے کر کہاں تک اور کیا کچھ بیان کرے گی۔ انگریز دلی سے نکال پھینکے گئے۔ بہادر شاہ ظفر کو پھر سے شہنشاہ بنا دیا گیا۔ مگر کسی تنظیم کے بغیر بادشاہی کب تک۔ انگریزوں نے دوبارہ فتح پائی۔ ہندو مسلمان سب کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کے رکھ دیا۔ لکھنے والے بہت کچھ لکھ گئے ہیں۔ میں جو کچھ دیکھ رہا تھا اسے بیان کرنے کا یارا ہی کہاں رہ گیا تھا۔ بس یہ تھا کہ شہر میں کسی آدمی کی زندگی محفوظ نہ تھی۔ جو بھی تندرست و توانا نظر آتا اسے انگریزی فوج باغی کہہ کر گولی مار دیتی۔ جب بربریت کا دور ختم ہوا تو دہشت کا باقاعدہ دور شروع ہوا۔ دلی کی پوری آبادی نکال باہر کر دی گئی۔ شہر کے ہر گھر کی طرح میرا محلہ بھی ویران ہو گیا۔ بوڑھے اور سسکتے بلکتے زخمیوں کے سوا جیسے شہر کا کوئی اور نام ہی نہ تھا۔ پھر کورٹ مارشلوں اور پھانسیوں کا دور چلا۔ میری آنکھوں کے سامنے کتنے بھائی بند انتہائی مظلومیت میں شہید ہوئے۔ نام کو تحقیقاتی کمیٹیاں اور عدالتیں بھی مقرر کر دی گئی تھیں مگر کارروائی بالکل اسی شعر کے مصداق ہوئی ؎

عدل قاتل منصفی خنجر بکف

ملزم ہستی بیاں دینے لگا

اور یہی حال بادشاہ کا ہوا۔ اسے رنگون میں قید رہنے کا حکم صادر ہوا۔

میں حیران و سراسیمہ نہ جانے کہاں کہاں مارا مارا پھرا۔ نہ کوئی جاننے والا نہ پہچاننے والا۔ دن میں شہر کے تباہ گلی کوچوں کی سیر سے پیٹ بھرتا، شام کو گھر کی یاد آتی اور واپس آتا تو رات کے اندھیرے میں جلتے ہوئے مکانوں کی روشنی میری رہنمائی کرتی۔ گھر کاٹ کھانے کو آتا۔

ٹھیک سے یاد نہیں شاید ۱۸۵۸ء کے اکتوبر کی ساتویں تاریخ تھی۔ وہی دلی کے راستے اور وہی میری سراسیمگی۔ ناگاہ میں نے ایک انگریز لیفٹننٹ اور اس کے سپاہیوں سے گھرا ہوا ایک خاموش نیم مُردہ قافلہ دلی سے نکلتے دیکھا۔ معلوم ہوا کہ شاہی خاندان کو ملک بدر کیا جا رہا ہے۔ یہ قافلہ بہادر شاہ ظفر، زینت محل بیگم اور ان کے بیٹے اور بہو، اس کی والدہ اور بہن، سابق بادشاہ کی ایک اور زوجہ تاج محل بیگم، ایک اور شہزادے مرزا شاہ عباس اور اس کی والدہ مبارک النساء، پانچ خواتینِ حرم، پانچ مردوں اور گیارہ خواتین خواصوں پر مشتمل تھا۔

میں نے اچانک پیچھے مڑ کر دیکھا تو لال قلعہ پر ایک سیاہ بادل منڈلا رہا تھا۔ شاید یہ ہندوستان کی آزاد سلطنت کی بجھی ہوئی شمع کا دھواں تھا۔ جو پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ میں اس غلام لال قلعہ پر اس وقت تک منڈلاتا رہوں گا جب تک کہ ہندوستان پھر سے آزاد نہیں ہو جاتا۔

یہ دھوئیں کا پہاڑ جسے میں نے برابر دیکھا ہے پورے نوّے سال یعنی ۱۹۴۷ء تک لال قلعہ کی سیاہ پوشی کا ماتم کرتا رہا۔ اسے اب بھی دیکھا جا سکتا ہے مگر اب یہ منڈلاتا نہیں بلکہ ایک جگہ مضبوطی سے قائم ہو کر لہراتا ہے۔ پہلے یہ سیاہ لبادہ اوڑھے تھا، اب تین اُجلے رنگوں میں ملبوس ہے اور اس سے رات کو بھی سورج کا سا اُجالا پھوٹتا ہے۔ میں اپنے گھر سے اِس آزاد روشنی کا نظارہ کیا کرتا ہوں۔ *

میرے استادِ محترم

(زبان، بیان اور فن)

۱۹۶۰ء میں یا اس سے کچھ عرصہ پہلے جب استاذی قبلہ نے پانی ردیف والی غزل آجکل میں برائے اشاعت بھیجی تو اس وقت کے ایڈیٹر شاعرِ انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی نے غزل کی داد ان لفظوں میں دی۔[1]

"آپ کی غزل چشمۂ کوثر کی طرح موجیں مارتی پہنچی اور ذوقِ شعری کو سیراب کر گئی۔"

برادرِ معظم جناب عرشؔ ملسیانی کے مجموعۂ کلام "چنگ و آہنگ" مطبوعہ ۱۹۵۳ء میں عرشؔ صاحب کا تعارف کراتے ہوئے جوشؔ ملیح آبادی نے پھر لکھا۔

"جوشؔ ملسیانی صاحب کو نئی پود نہیں جانتی اور جان بھی نہیں سکتی۔ کیونکہ جوشؔ صاحب کی ذات جن ادبی محاسن کا مجموعہ ہے اُن کی چھاؤں بھی اس پر نہیں پڑی ہے۔"

جناب کمالؔ کرتارپوری مرحوم استاذی قبلہ کے صفِ اوّل کے شاگردوں میں تھے۔ انہیں نے ۱۹۲۶ء میں مجھے استاذی قبلہ کے سپرد کیا تھا مگر اس سے پہلے میں کئی برس کمالؔ صاحب سے فن شعر گوئی کی تعلیم حاصل کرتا رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ کمالؔ صاحب بھی مجھے وہی کچھ سکھا رہے تھے جو انہوں نے استاذی قبلہ جوشؔ صاحب سے سیکھا تھا۔ ان کے خطوط کے چند اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

"۔۔۔۔ صحتِ زبان کے لئے نوحؔ ناروی، قبلہ جوشؔ ملسیانی، دلؔ شاہجہانپوری، جلیلؔ مانک پوری کا کلام دیکھیے" (خط ۱۹۴۳ء)

---

[1] مکتوباتِ جوشؔ ملسیانی بنام رضا مکتوب ۱۲۴ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۵۱ء۔

"قبلہ جوش صاحب اب اصلاح نہیں فرماتے۔ مسودات اسی طرح واپس کر دیتے ہیں اور داد طلب شعر پر صاد فرما دیتے ہیں۔ ..... ابھی ابھی قبلہ موصوف کو بحرِ متدارک اور بحرِ متقارب سولہ رکنی پر چند ایک سوالات لکھ کر بھیجے ہیں۔ ان کا جواب آنے پر انہی دو بحروں پر ایک مستقل مضمون لکھوں گا اور وہ آپ کو بھیج دوں گا۔ ....."

(خط ۳ مارچ ۱۹۴۴ء)

"..... اِن (جوش ملسیانی) کو سبیلِ روزگار نے دیہات کے کونے میں گوشہ نشین کر دیا اور حالاتِ مابعد نے دنیا سے دل برداشتہ کر دیا۔ اس لئے ۱۹۲۳ء سے پہلے آپ سے بہت کم لوگ آشنا تھے۔ اس کے بعد میری تحریک پر انہوں نے مشاعروں میں شرکت شروع کی اور اب دنیائے سخن میں جس درجہ کے مستحق تھے پا چکے ہیں۔ مگر ابھی اُن کے کمال کی پوری قدر نہیں ہوئی۔ اگر وہ کسی شہر مثلاً لاہور میں ہوتے تو آج تک ناخدائے سخن تو کیا خدائے سخن ہوتے۔ انھیں دیہاتی حالات نے اور اسکول گرد و نواح نے ان کو شاگرد بھی وہ دیے ..... جو حالات سے مجبور ہیں یا شعر گوئی کو محض تفریح سمجھتے ہیں اور ان کو نام و نمود کی پروا نہیں ہے۔ ۱۹۲۳ء تک میں اپنے آپ کو بڑا شاعر سمجھتا تھا۔ لاہور کے سب اخباروں میں میرا کلام چھپتا تھا اور کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا مگر جب حضرت جوش کی قدم بوسی نصیب ہوئی تو مجھے اپنی خامیوں کا کما حقہ علم ہوا ؎

مجھ کو جنابِ جوش نے شاعر بنا دیا
پایہ مرے سخن کا فلک سے ملا دیا

(خط ۹ مارچ ۱۹۴۴ء)

۱۹۴۸ء میں جب استاذی قبلہ سے میں پہلی بار ملا تو انہوں نے میری بیاض پر تبرکاً ایک غزل تحریر فرما دی، جس کا مطلع ہے ؎

"نظر نظر سے ملا کر حجاب کیا معنی
نیازِ عشق سے یہ اجتناب کیا معنی

مَیں نے اس خیال سے کہ شاید کمالؔ صاحب نے نہ دیکھی ہو یہ غزل بہت سی تعریف کے ساتھ ان کی خدمت میں بھیج دی۔ کمالؔ صاحب نے اسی کاغذ پر جواب لکھ دیا اور غزل کے تین اشعار میں چند لفظوں

پر سُرخ روشنائی سے حلقے بنا دیئے۔ وہ اشعار یہ تھے ؎

وقارِ مہر و وفا کو (تو) سرنگوں نہ کرو	ہر اک سوال کا الٹا جواب کیا معنی
غرض ہی کیا تھی تماشائے دہر سے تم کو	(اب) آئے ہو تو یہ رخ پر نقاب کیا معنی
چنیں گے ایک مجھی کو وہ ہر ستم کے لئے	خطا کرے (نظر) انتخاب کیا معنی

اور لکھا کہ "○ ان الفاظ کے استعمال پر غور فرمائیں یہ استادانہ نکات ہیں۔ نظر کی جگہ نگہ بھی درست، مگر نظر میں جو وسعت ہے اس میں نہیں ..... قبلہ جوش کے متعلق جو آپ نے لکھا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہیں ......"

(خط ۵ ر ستمبر ۱۹۴۸ء)

۱۹۶۰ء میں خود کمالؔ صاحب بھی ایک نغز گو سخنور ہونے کے ساتھ ایک بزرگ اور مسلم استادِ فن کی حیثیت سے تسلیم کئے گئے۔ تاہم عمر کے ان آخری ایام میں مشاعرے میں ایک غزل کا مقطع یوں فرماتے ہیں ؎

کمال اربابِ فن سے قدر دانی کی توقع پر
ریاضِ جوشؔ سے لایا ہوں ان پھولوں کا نذرانہ

(خط ۱۹۶۰ء)

۲۴ مارچ ۱۹۷۶ء کو جناب پرتوؔ لکھنوی جانشین حضرت آرزوؔ لکھنوی مرحوم میرے غریب خانہ (بمبئی) پر تشریف لائے۔ میں نے انہیں استاذی قبلہ کے انتقالِ پُر ملال کی خبر سنائی۔ بہت افسوس کیا اور چند لمحے فکر کر کے ایک قطعہ تاریخ اپنے قلم سے لکھ کر مجھے عنایت فرمایا۔ وہ قطعہ انہیں کی تحریر میں میرے پاس محفوظ ہے ؎

قطعہ تاریخ وفاتِ حسرت آیات
حضرت جوشؔ ملسیانی یادگارِ داغؔ

جوش صاحب لے گئے جوشِ سخن	شعر کا ذکر اب تو جیسے ختم ہے
سالِ غم پرتوؔ بہ یک آہِ مزید	ہائے جوشِ شاعری جو ختم ہے

۶ + ۱۹۷۰ = ۱۹۷۶ء

باتوں باتوں میں پرتو صاحب نے بتایا کہ ان کی جانشینی کے محضر پر جناب جوشؔ ملسیانی کی مہر بھی ثبت ہے اور کہ ان کے اٹھ جانے سے گویا مستند اساتذہ کا سلسلہ ختم ہوگیا۔

آخر حضرت جوشؔ ملیح آبادی جیسے عظیم اہلِ زبان، زباندان اور قادر الکلام شاعر کو یہ کہنے پر کیوں مجبور ہونا پڑا کہ نئی پود استاذی قبلہ جوشؔ ملسیانی کے ادبی محاسن کی ورثہ دار بننے کی خو کیا داد دینے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتی؟ جناب پرتوؔ صاحب جانشین حضرت آرزو لکھنوی مرحوم کے منہ سے بے ساختہ کیوں نکل گیا کہ جوشؔ ملسیانی کے اٹھ جانے سے گویا مستند اساتذہ کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ کمالؔ صاحب ایسے باکمال کے منہ سے پچاس سال تک لگاتار کیوں ایک ہی بات پھولوں کی طرح جھڑتی رہی کہ ان کا کمالِ شاعری جناب جوشؔ ملسیانی کے فیضان کے سوا کچھ نہیں؟ آخری عمر میں جبکہ وہ خود استاد مانے گئے انہوں نے شاعرانہ تعلّی کے زیرِ اثر اپنا ڈھنڈورا پیٹنے کے بجائے کیوں بھرے مشاعرے میں سراپا انکسار بن کر کہا کہ میرے گلہائے فکر محض ریاضِ جوشؔ کی عنایت ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ استاذی ابوالفصاحت حضرت جوشؔ ملسیانی انیسویں اور بیسویں دونوں صدیوں کے اساتذہ کی آبرو اور ان کی اعلیٰ اقدار کے محافظ تھے اور آپ کا کلام آپ کی صاف، سادہ، نیک، مطمئن، وضع دار اور ٹکسالی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ آپ کی سوچ کا ڈھنگ ہمیشہ واضح اور ہموار رہا۔ داغؔ کی نہایت پختہ اور ہردلعزیز شاعری کے وہ پہلو جن پر ایک طبقہ ہمیشہ جائز ناجائز اعتراض وارد کرتا رہا ہے آپ کے ہاں ناپید ہیں۔ اور آپ کے ہاں یہ رکھ رکھاؤ بہت پہلے سے ہے۔ کمالؔ صاحب کے کلام پر آپ کی دی ہوئی اصلاحوں[1] سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ پینتیس چالیس سال کی عمر ہی میں یہ واضح راستہ اختیار کر لیا گیا تھا جس کی منزل تو ایک تھی مگر جہتیں تین تھیں۔ یہ جہتیں تھیں زبان، بیان اور فن۔ اور منزل تھی صالح ادب۔ اس سلسلے میں یہاں کمالؔ صاحب کے کلام پر چند اصلاحیں بطور مثال پیش کی جاتی ہیں۔

---

[1] کمالؔ صاحب نے مارچ ۱۹۴۳ء میں اپنے کلام پر جوشؔ صاحب کی بہت سی اصلاحیں میری رہنمائی کے لئے مجھے بھیجی تھیں جو اب تک میرے پاس محفوظ ہیں۔

پے تعظیم درد اٹھا نہ کرے   میری مجبوریاں سوا نہ کرے

(اصلاح)   درد تعظیم کو " " " " " "

یہ اصلاح ۱۹۲۵ء کی ہے۔ پے تعظیم فارسیت ہے۔ جوش صاحب فارسی کے نہ صرف ایک خوش گو شاعر تھے بلکہ اس زبان کے عالم بھی تھے۔ اس کے باوجود وہ اردو کو فارسی بنانے کے سخت مخالف تھے۔ "پے تعظیم درد اٹھا نہ کرے" کو "درد تعظیم کو اٹھا نہ کرے" بنا کر آپ نے ثابت کر دیا کہ فضول فارسیت کی بھرمار سے ذرا سی احتیاط سے بآسانی گریز کیا جا سکتا ہے۔

جذب دل کھینچ تو لے گا مگر اے جوشِ جنوں
راستہ بھول نہ جائیں وہ بیابانوں میں

(اصلاح مصرع ثانی)   راہ وہ بھول نہ جائیں گے " " ؟

یہ اصلاح ۱۹۲۶ء کی ہے۔ ایک تو دلی کی زبان کی پیروی میں آپ کو راستہ کا لفظ کھٹکا ہو گا۔ دوسرے اگر بیان میں کہیں کمزوری محسوس ہو تو آپ اسے پوری قوت عطا کیے بغیر نہ رہتے تھے۔ چنانچہ مصرع ثانی میں "راہ وہ بھول نہ جائیں گے بیابانوں میں" کہہ کر استفہام سے جو مطلب واضح کیا گیا ہے اس سے لطف دوچند نہیں بلکہ دہ چند ہو گیا ہے۔

اُسی زمانے کی ایک اور اصلاح دیکھیے ؎

ایک عجیب خلا کا دل میں پھر احساس سا ہوتا ہے
ہمیشہ حسرت سی رہتی ہے اجڑے گھر کو بسانے کی

(اصلاح)   ہر دم حسرت سی " " " "

یہاں دو بحریں خلط ملط ہو گئی تھیں۔ اس کے علاوہ مصرع ثانی لفظ ہمیشہ سے شروع ہوا تھا جس نے روانی کا خون کر دیا تھا۔ متقارب اور متدارک بحروں میں امتیاز بعض اوقات اس قدر مشکل ہو جاتا ہے کہ اچھے اچھے پختہ کار بھی ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ مگر آپ ایسے امامِ فن کی باریک بیں نظریں ایسے عیوب بڑی آسانی سے چن لیتی تھیں۔ چنانچہ "ہر دم حسرت سی ......" کی ترمیم سے یہ عیب دور کر دیا گیا۔

مندرجہ بالا سے یہ ظاہر ہے کہ چالیس سال کو پہنچتے پہنچتے جوش صاحب ایک ایسے پختہ کار استاد بن چکے تھے اور مذاق اس قدر صاف ستھرا اور بلند ہو چکا تھا کہ آپ کو اپنے کلام کو مزید سنوارنے نکھارنے کی ضرورت نہ تھی مگر جب ستمبر ۱۹۴۰ء میں آپ کا پہلا مجموعۂ کلام "بادۂ سرجوش" شائع ہوا تو اردو دنیا نے آغازِ کتاب میں پیش لفظ کے بعد ایک نیا ہی باب دیکھا۔ یہ تھا بابِ متروکات۔ اُسے بیالیس مختلف خانوں میں بانٹ دیا گیا تھا! اور ان میں سب سے اہم پہلا نمبر تھا جو اس طرح ہے۔

"رقیب۔ بوسہ۔ وصل۔ زلف۔ کمر۔ ابرو۔ انگیا۔ دوپٹہ۔ چوڑیاں۔ گھنگرو۔ جوبن۔ جوڑا کھولنا۔ بال کھولنا۔ رونا پیٹنا۔ میت اور جنازہ کے مضامین ترک کئے گئے ہیں......"

یہ اعلان اس بات کا مظہر تھا کہ جوش صاحب کا کلام زبان، بیان اور فن کی پختگی کے علاوہ ان تمام باتوں سے بھی پاک ہوگا جس کو سامنے رکھ کر مدتوں کلامِ داغ کو داغدار ثابت کیا جاتا رہا تھا۔ چنانچہ اس اصول کو جوش صاحب نے عمر بھر (جو خوش قسمتی سے بہت لمبی تھی) جزوِ روح بنائے رکھا۔ ایسا ایک لفظ بھی آپ کے دل نے محسوس نہ کیا اور دماغ نے نہ سوچا جو آپ کے قلم سے نکل کر ابتذال کی حد کو جا چھوتا۔ اس طرح آپ نے روایتی شاعری کی شان بھی برقرار رکھی اور نئے تقاضوں کو بھی جلا بخشی۔ مگر کسی رنگ میں بھی زبان، بیان اور فن کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ آپ نے اس فطری لگاؤ کا اظہار اکثر اوقات کیا ہے۔

مجھے حسنِ سخن کی بحث میں خاموش رہنے دو　　　کہوں گا کچھ اگر لطف زباں تک بات آ پہنچی

زباں درست بیاں چست جب نہیں اے جوش　　　وہ شعر کیا وہ غزل کیا وہ شاعری کیا ہے

بات کہنی ہے تو کہنے کا سلیقہ بھی ہے شرط　　　بر محل سی کوئی تمہید اٹھالوں تو کہوں

مسترس جانتے ہو جوش تم اک حسنِ معنی کو　　　مگر ہم دیکھتے ہیں شعر میں حسنِ بیاں پہلے

کیوں کیا کہا ہی پر نظر اٹھتی ہے کیوں دیکھنا یہ بھی تو ہے کیسا کہا

جوش صاحب کا ایک مقطع ہے ؎

لے جوش کہہ رہا ہے کلام جنابِ داغ

وہ شاعری نہیں جو حیات آفریں نہ ہو

آج حیات آفریں شاعری سے مراد بلند آہنگی، دور از کار تشبیہیں، پُرشکوہ الفاظ، خطابت اور نعرہ بازی ہے مگر جوش صاحب کے ہاں اس کا مطلب صرف شگفتگی ہے۔ کیونکہ شگفتگی ہی سے زندگی عبارت ہے۔ کیا زندگی کے اور جھمیلے کم ہیں کہ شاعری کو بھی معمہ بنا کر اس کے حل کے لیے صلائے عام دیدی جائے۔ چنانچہ جوش صاحب نے ایسی شاعری سے قطعاً پرہیز کیا ہے۔ تاہم اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ کے ہاں فکر و نظر ہے ہی نہیں یا آپ کا کلام زندگی کے مسائل سے بیگانہ ہے۔ آپ کے یہاں سب کچھ ہے۔ مگر وہ مخصوص طبقہ جو صرف شکوہِ الفاظ ہی پر جان دیتا ہے آپ سے مستفیض نہیں ہو سکتا۔ اور وہ لوگ بھی حظ نہیں اٹھا سکتے جو زندگی کی الجھنوں کو بیان کرتے ہوئے اشعار کو مرثیہ بنا دیتے ہیں کیونکہ قاری کے دل پر ایسی زار نالی کا اثر خاک نہیں ہوتا۔ وہ فقط ورق الٹ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ جوش صاحب نے کیا برمحل کہا ہے ؎

گریۂ پیہم کا جن میں ذکر تھا ہنس رہے ہیں وہ انہیں اشعار پر

اب لگے ہاتھوں چند وہ اشعار بھی سن لیجئے جن پر آج کا نقاد جان دیتا ہے۔ مگر آپ کے یہاں وہ کڑوے گھونٹ نہیں معلوم ہوتے بلکہ جرعاتِ صہبا معلوم ہوتے ہیں اور جرعہ کش پورا ساغر پیے بغیر سیر نہیں ہوتا ؎

جس قطرۂ ناچیز میں جوہر ہوں نمو کے زندانِ صدف میں بھی گہر ہو کے رہے گا

حق نے بخشی ہم کو وہ دیوانگی پھول سمجھے جس قدر پتھر چلے

اپنی پرواز پہ غرّہ تھا فرشتوں کو بہت ایک دن بھی نہ مقاماتِ بشر تک پہنچے

زندگی کٹ ہے سفر یا کوئی چکر اے جوش اپنے گھر سے جو چلے اپنے ہی گھر تک پہنچے

کیوں کیا دیر سے حرم کا سفر تو یہاں بھی نہ تھا وہاں بھی نہیں

غرض مندوں نے کس مشکل میں ڈالا ابرِ رحمت کو یہی اصرار ہے سب کا یہاں پہلے یہاں پہلے

کچھ نہ پایا نشانِ منزل کا | رہ گیا تھک کے توسنِ ادراک

کونین کی شاہی کا طلب گار اگر ہے | دنیا میں پتا پوچھ کسی خاک نشیں کا

پکارا تھا مجھے نزدیک ہی سے | بھٹکتا رہ گیا ذوقِ نظر کیوں

ہمتِ دل پوچھتی ہے دل سے بامِ عرش پر | اب یہاں ٹھہرے گا یا کچھ اور اونچا جائیگا

اگرچہ بحرِ محبت میں خود تو ڈوب گیا | مگر سفینۂ عالم بچا لیا میں نے

پھل اُس سے آئے نہ آئے یہ مقدر کی ہے بات | چھاؤں تو نخلِ تمنا کی گھنی ہوتی ہے

اے اجل بہرِ خدا تھوڑی سی مہلت دیدے | اک تمنا کے بر آنے کی تمنا ہے ابھی

دیر سے کعبہ کو جاتا ہوں یہ مقصد لے کر | دیکھ آؤں کہیں میرا بھی خدا ہے کہ نہیں

جوشؔ صاحب بہت بڑے عروضی تھے اور اپنے اشعار میں فنِ شعر کے لوازمات سے ایک قدم اِدھر اُدھر نہ ہوتے تھے مگر اس کے باوجود جب کوئی معقول بات دلیل کے ساتھ پیش کی جاتی تھی تو اسے ماننے میں تامّل نہ کرتے تھے۔ مثلاً ارکانِ رباعی کی ترکیب کے لئے اساتذہ یہ مشہور مقولہ یاد رکھنے کی ناقدین کرتے چلے آئے ہیں ؎

سبب پئے سبب است و وتد پئے وتد است

یعنی رباعی کے رکنوں کی نشست اس انداز سے ہو کہ جس رکن کے آخر میں سبب ہے اس کے بعد والے رکن کی ابتدا میں بھی سبب آنا چاہیئے اور اگر کسی رکن کے آخر میں وتد واقع ہوا ہے تو اس کے بعد والے رکن کی ابتدا میں بھی وتد آنا ہی چاہیئے۔

ایک روز میں اِس مقولے پر غور کر رہا تھا تو معلوم ہوا کہ رباعی کے اوزان پر اس مقولے کا اطلاق تمام تر درست نہیں چنانچہ میں نے استاذی قبلہ سے تصدیق چاہی۔ آپ نے بلا تامّل میری دلیل کو قبول فرما لیا اور لکھا:

"ٹھیک کہتے ہو۔ رباعی میں سبب پئے سبب اور وتد پئے وتد کا اصول دوسرے اور تیسرے رکن ہی تک محدود ہوتا ہے۔ پہلا رکن ہے مفعولُ اس میں ایک سبب اور ایک وتد آیا ہے۔ آخری رکن فع ہوتا ہے۔ جب اس کے ساتھ نہ سبب ہوتا ہے نہ وتد تو وہاں یہ اصول کس طرح چل سکتا ہے۔"[1]

---

[1] مکتوباتِ جوشؔ ملسیانی بنام رضا خط ۴۷ ورخہ ۲۸ اگست ۱۹۶۱ء

باوجود فنی سخت گیری کے آپ جا و بے جا عروضی رعایتوں سے فائدہ اٹھانے کے سخت خلاف تھے۔ ان کے نزدیک جو بھی چیز کلام کی روانی میں حارج ہوتی ہو گردن زدنی تھی۔ اپنے اس اصول کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

"اساتذۂ قدیم نے وہی زحافات قابلِ استعمال رکھے ہیں جو روانئ کلام کے منافی نہ ہوں۔ ان کی پرواہ نہ کرنا اور من مانیوں سے کام لینا روانی اور موسیقیت کا خون کرنا ہے۔

ہوئی ہے آج تو شاداب سرزمینِ چمن
ہوئی ہے آج تو شاداب سرزمینِ گلستاں

یہ تبدیلی عروض کے لحاظ سے درست سہی مگر موسیقیت سر پیٹتی نظر آتی ہے۔"[1]

یہی وجہ ہے کہ آپ کا کلام روانی، برجستگی اور صفائی کی انتہا ہے اور بقول یگانہ اس کی پاکیزگی کا یہ عالم ہے کہ ایک شعر بھی عامیانہ رنگ کا نہیں۔ کوئی لفظ ٹکسال باہر نہیں، کسی ٹکڑے میں سوقیانہ پن نہیں۔ اندازِ بیان کی تازگی اور شگفتگی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ شعر پر شعر پڑھتے چلے جایئے۔ روایتی رنگ کو بھی زبان، بیان کا ایسا رنگین لبادہ اوڑھا دیا ہے کہ خزاں میں گل بوٹے اگ آئے ہیں۔ مثال کے طور پر معشوق کے رخ کو لیجئے۔ اس کو چاند سورج سے تشبیہ دینا اتنی گھسی پٹی بات ہے کہ اردو تو اردو لگ بھگ ہر زبان میں یہ خیال موجود ہے۔ جوش صاحب پرانے تو تھے ہی مگر پرانے ہونے کے ساتھ پرانے ادب پر حاوی بھی تھے۔ اس لئے یہ تشبیہ بارہا آپ کے مطالعہ میں آچکی ہوگی۔ پھر بھی آپ نے اسے اپنے کلام میں شامل کیا۔ مگر اس انداز سے کہ ہر شعر میں رخ کی خوبصورتی میں اضافہ کر دیا ہے۔ یہ تدریجی ارتقاء ملاحظہ فرمایئے۔ پہلے شعر میں یہ کہتے ہیں کہ چاند سورج کی روشنی جلوۂ رخ ہی کی عنایت ہے۔

چاند سورج میں یہ تنویر کہاں سے آتی
تیرے ہی جلوۂ رخ سے ہیں منور دونوں

---

[1] مکتوبات جوش ملسیانی بنام رضا خط نمبر ۴۲ مورخہ ۲۸ مئی ۱۹۷۳ء

پھر کہا ہے کہ اس رُخ کی چمک دمک چاند سورج سے زیادہ ہے اور یہ ہماری فکر کا عجز ہے
کہ ہم چاند سورج سے آگے سوچ ہی نہ سکے ۔

نہ ملی اس رُخِ روشن کی مکمل تشبیہ
ڈھونڈنے والے فقط شمس و قمر تک پہنچے

آخر میں فیصلہ کن انداز میں فرماتے ہیں کہ رخ کو چاند سے تشبیہ دینا ہی نادرست ہے کیونکہ
دونوں کی چمک دمک میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک کا مسکن زمین ہے اور دوسرے
کا آسمان۔ اس لئے تشبیہ ممکن ہی نہیں ہے۔

تشبیہ دوں میں چاند سے اُس رُخ کو کس طرح
دونوں میں جب ہے فرق زمین آسمان کا

یہ اشعار لاکھ روایتی سہی۔ عشق بھی مجازی ہی سہی مگر روپ رنگ کو کس زمانے میں سراہا نہیں گیا۔
گہنے کا ڈھنگ بدلتا رہا ہے۔ اور بدلتا رہے گا۔ مگر حُسن پرستی کبھی موت نہیں مر سکتی۔ اور آج کی
شاعری میں حسن پرستی کے نام پر جو گُل کھلائے جا رہے ہیں وہ تو ہر زمانے میں ابتذال ہی کے زمرے
میں شامل رہے ہیں۔

مختلف شاعروں کے جزوی یا کلی طور پر ایک ہی مضمون کو نظم کرنے کی مثالیں بہت ہیں
اسے سرقہ کہیئے یا توارد کا نام دے لیجئے۔ جو کچھ بھی گردانیے مگر اس سے کوئی شاعر خالی نہیں۔ میر
سودا۔ غالب۔ ناسخ۔ آتش سے لے کر بیسویں صدی کے اساتذہ تک کے ہاں یہ بات موجود ہے۔
جوش صاحب کے ہاں بھی ایک دو اشعار کا ڈانڈا کسی پیشرو سے مل ہی جاتا ہے۔ مگر دیکھنا یہ
ہے کہ بعد کے شاعر نے پیشرو کے کہے ہوئے میں اضافہ کیا ہے کہ نہیں۔ ورنہ سرقہ تو ہر حال میں سرقہ
ہے اور اس کی مذمت ہر دور کے شاعر کرتے چلے آئے ہیں۔ حتیٰ کہ سرقے کی مذمت کے اشعار
کو بھی شاعروں نے اپنا اپنا لب و لہجہ عطا کیا ہے۔ نریش کمار شاد مرحوم نے ایک مثال سے اسے خوب
واضح کیا ہے مگر اس میں بھی، جوش صاحب نے جو کہا ہے وہ اپنے رنگ میں منفرد ہے۔ اس میں وہی
سلاست اور پاکیزگی موجود ہے۔ جو آپ کا خاصہ ہے۔

مت باندھیو لے مصحفی مضمون کسی کا
ہے ننگِ خلائق وہ جو شاعر ہو سخن چور
(مصحفی)

مضمون کا چور ہوتا ہے رسوا جہان میں
چغلی خراب کرتی ہے مالِ حرام کی — آتش

دزدِ سخن سے معنیٔ رنگیں کو کیا خطر
مہندی لگائے گا کوئی کیونکر لگی ہوئی — امیر مینائی

سرقہ نہاں رہے گا نہ اہلِ نظر سے جوشؔ
چوری کا مال گھر میں چھپایا نہ جائے گا — جوشؔ ملسیانی

اب ایک اور شعر دیکھئے کہ تین مختلف ادوار کی پیداوار ہے مگر ہر دور میں اسلوبِ بیان بدل گیا ہے اور مفہوم وہی رہا ہے۔ تاہم جوشؔ صاحب کا اپنا خاص فصیح و بلیغ لب و لہجہ برقرار ہے ؎

میر سوز — کھولی گرہ جو غنچے کی تو نے تو کیا عجب
یہ دل کھلے جو تجھ سے تو ہوائے صبا عجب

داغؔ — دل کی کلی نہ تجھ سے کبھی اے صبا کھلی
چمپا کھلی، گلاب کھلا، موتیا کھلی

جوشؔ ملسیانی — میرے ہی دل کی ہے گرہ میرے ہی دل کی ہے کلی
جو نہ کھلی بہار میں، جو نہ کھلی بہار میں

ایک مثال اور۔ غالب کہتے ہیں ؎

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

جوشؔ صاحب کہتے ہیں ؎ — سب تمنائیں ہماری مر چکیں
ایک مرنے کی تمنا رہ گئی

دونوں اشعار ایک ہی مضمون کے حامل اور اپنی جگہ فصیح و بلیغ مگر جوشؔ صاحب کے شعر میں تمنائیں مر چکیں۔ اور مرنے کی تمنا کے ٹکڑوں نے لب و لہجہ کے اعتبار سے نمایاں فرق پیدا کر دیا ہے۔

دسمبر ۱۹۷۶ء کو میں نے آخری بار آپ کے نیاز حاصل کئے۔ اور دورانِ گفتگو جب آپ نے مجھے تھوڑی دیر کے لئے خاموش دیکھا تو ہنس کے فرمایا۔ اگر میرے لئے درازیٔ عمر کی دعا مانگنے کا ارادہ باندھ

رہے ہو تو یہ ظلم نہ کرنا" فوراً آپ کا ایک شعر ذہن میں آگیا ؎

دشمن ہی نہیں میں انہیں قاتل بھی کہوں گا
ہیں جن کی زبان پر مرے جینے کی دعائیں

دوسرے شعراء نے بھی اس مضمون کو ادا کیا ہے مگر آپ کا اسلوب سب سے نرالا ہے۔ مضطر خیرآبادی نے اسے یوں ادا کیا ہے ؎

مصیبت اور لمبی زندگانی
بزرگوں کی دعا نے مار ڈالا

گوپال متل کا شعر بھی خوب ہے ؎

مجھے زندگی کی دعا دینے والے
ہنسی آرہی ہے تری سادگی پر

اوپر حیات آفریں شاعری سے متعلق جوش صاحب کا نظریہ بیان کیا جاچکا ہے۔ آپ کے نزدیک شگفتگی شعر اچھے شعر کے لیے شرطِ اول ہے جو حسنِ طبیعت، حسنِ بیان، حسنِ ادا کے بغیر ممکن نہیں اور یہ صفات مبدء فیاض نے جوش صاحب کی جھولی میں جی کھول کر ڈال دی تھیں۔ آپ شعر میں حسنِ ادا ہی کے نبض شناس نہ تھے بلکہ حسن ادا کی خصوصی اداؤں کے بھی شناسا تھے۔ ایک ہی مقطع سے اندازہ کر لیجیے ؎

ادائیں حسن ہی کی جوش ہیں یوں تو غزل میں بھی
مگر حسنِ ادا میں کچھ ادائیں اور ہوتی ہیں

بھلا ایسا کامل استاد، ماہرِ فن اور وضعدار شاعر جس کی متواتر چھہتر سال کی فعال ریاضت نے بے شمار پھول کھلائے جو ریاضِ جوش کی شکل میں آج بھی ہندوستان کے کونے کونے میں خوشبو پھیلا رہے ہیں، آج کی بے راہ روی پر کیوں ماتم نہ کرتا۔ آپ کی ایک غزل آپ کی آخری عمر کی مایوسی کی مکمل ترجمانی کرتی ہے۔ موجودہ زمانے کی ادبی، سیاسی، سماجی زندگی کی صحیح تصویر دیکھنا ہو تو اسے پڑھیے ایک ضعیف العمر حساس شاعر کا کرب لاوا بن کر ابل پڑا ہے:

گردِ غم دل پہ نمایاں کبھی ایسی تو نہ تھی — زندگی خاک بداماں کبھی ایسی تو نہ تھی
بیٹھنا بزمِ سخن میں بھی ہوا ہے مشکل — بدمزہ صحبتِ یاراں کبھی ایسی تو نہ تھی

ڈگمگاتے ہیں قدم قول و قسم کے ہر دم — اب جو ہے لغزشِ ایماں کبھی ایسی تو نہ تھی

بارہا ہم نے سیاست کو برہنہ دیکھا — لیکن اب جتنی ہے عریاں کبھی ایسی تو نہ تھی

منہ سے جو کچھ بھی نکل جائے بجا ہے لے جوشؔ
شاعری فن سے گریزاں کبھی ایسی تو نہ تھی

چند سال پہلے (۱۹۷۰ء) تقریباً ربع صدی مشرقی افریقہ میں گذار کر میں واپس ہندوستان پلٹا اور بمبئی میں آباد ہو گیا۔ گو میں اپنی عادت کے مطابق مشاعروں اور محفلوں میں شامل نہیں ہوتا تاہم ابتدا ہی میں ایک محفلِ یاراں میں شمولیت کا اتفاق ہوا۔ کسی نے میرا تعارف ایک جانے مانے جدید شاعر سے کرایا اور کہا کہ رضا صاحب جناب جوشؔ ملسیانی کے شاگرد ہیں انہوں نے فوراً جوشؔ صاحب کا یہ مطلع پڑھا ؎

کیوں تغزل کا نگہبان نہ رہے فن میرا
یہی پونجی ہے مری اور یہی دھن میرا

اور طنزاً کہا "ایسی قدیم اور روایتی شاعری کی اب کہاں گنجائش ہے" اور پھر میرا دل رکھنے کیلئے کہا کہ جوشؔ صاحب کو مدت سے جانتا ہوں اور کہ وہ بڑے استاد ہیں۔ میں نے کہا آپ نے شاید اسی غزل کا ایک اور شعر نہیں سنا جو استاذی قبلہ نے آپ ہی کے لئے فرمایا ہے ؎

دوستوں کی بھی کہیں قدر نہ مٹ کر رہ جائے
دشمنی ترک کئے جاتا ہے دشمن میرا

تو خوب قہقہہ پڑا۔ اس قسم کی پھبتیاں اور لوگ بھی اڑاتے رہے ہوں گے۔ جوشؔ صاحب اس سے ناواقف نہیں تھے۔ آپ کا یہ شعر اسی طرف اشارہ کرتا ہے ؎

قدامت پسندوں پہ کیوں ہنس رہے ہو خدا کی قدامت پسندی تو دیکھو
ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں برس سے وہی کہکشاں ہے وہی چاند تارے

اب اسی غزل کے چند شعر اور پڑھ جائیے اور خدا لگتی کہیئے کہ کیا یہ قدیم شاعری کے زمرے میں آئیں گے؟ کیا ان میں صرف روایت ہے؟ کیا ان میں جوشؔ صاحب صرف لفظوں سے کھیلتے ہیں؟ کیا یہ شعر صرف کہنے کے لئے کہہ گئے ہیں؟ کیا انہیں محض قافیہ پیمائی سمجھا جائے؟ مجھے یقین ہے ان سب سوالوں کا جواب نفی میں ہوگا۔

کتابوں نے گو استعاروں میں ہم کو بتائے بہت سے ٹھکانے تمہارے
مگر کچھ وضاحت سے اپنا پتہ دو سمجھتے نہیں ہم یہ مبہم اشارے
نہ غم مجھ کو گرداب رنج و بلا کا نہ محتاج ہوں میں کسی ناخدا کا
سفینے کو موجوں کی زد سے بچا کر چلا جا رہا ہوں کنارے کنارے
تری خشمگیں آنکھ کی گردشوں نے زمانے کو زیر و زبر کر دیا ہے
سہاروں پہ کوئی بھروسا کرے کیا سہارے تو خود ڈھونڈتے ہیں سہارے

آخر میں چند اور اشعار پیش کیے جاتے ہیں جو روائتی ہی سہی مگر بے مقصد نہیں، شوخی، فصاحت سلاست و روانی سے بڑھ کر اور کہاں پائیے گا ؎

شیخ کیوں ایسی بات کہہ جائے — محترم ہی سہی خدا تو نہیں
جام لے کر کہا یہ زاہد نے — دیکھتا کوئی دیکھتا تو نہیں
اس دور میں اے شرم گنہ خوف ہی کیا ہے — چرچا بھی جو ہوگا تو وہ ہوگا کوئی دن کا
کیوں نہ ہم پیر مغاں کی بھی زیارت کر چلیں — راہ میخانے سے بھی جاتی ہے منزل کی طرف
میں یہ سمجھا اک سفینہ آ گیا میرے لئے — بھولی بھٹکی موج آ نکلی تھی ساحل کی طرف
اک مشت خاک بن کر رخصت ہوا جہاں سے — مٹی کے مول یارب انسان بک گیا ہے
کیوں انھیں باد مخالف بن کے چھیڑا آپ نے — چار موجیں آپ کی شوخی سے طوفاں ہو گئیں
تعلق تھا انہیں تو زندگی تک — میرے اعمال ہیں اب ہم سفر کیوں
ان کو خوش رکھنے کے نکتے کون سوچے رات دن — اس طرح تو دل لگانا ایک فن ہو جائے گا
پھول کیوں خاموش ہیں یہ راز میں کیوں کر کہوں — مجھ کو ڈر ہے میرے سر سارا چمن ہو جائے گا
قضا کے تیر نے ایسے دیئے پر پرواز — کہ عمر رفتہ کو رستے میں جا لیا میں نے
میں بھی پیتا ہوں مجھے اس سے کچھ انکار نہیں — وہ مگر دامن تقوے میں چھپی ہوتی ہے

ایک غزل اور کہ زبان، بیان اور فن تینوں یکجا ہو گئے ہیں ؎

داغ دل چمکا تو غم پیدا ہوا — یہ اندھیرا صبح دم پیدا ہوا
میں ہوں وہ گم گشتۂ راہ طلب — میری ہستی سے عدم پیدا ہوا

جب خیالِ بیش و کم پیدا ہوا ۔۔۔ ہو گئی ہر ایک بیشی میں کمی

اُس کے یُں کہنے سے ہم پیدا ہوا ۔۔۔ حسن میں تخلیق کا جوہر بھی ہے

ہر قدم پر ہم قدم پیدا ہوا ۔۔۔ یاد ان کی یوں رفیقِ راہ تھی

استاذی قبلہ آج اس دنیا میں نہیں۔ آپ کا رنگ آپ ہی کے ساتھ ختم ہو گیا بلکہ یوں کہیئے کہ داغ اسکول ختم ہو گیا۔ آپ کے سینکڑوں شاگرد ہیں اور ان میں سے کئی نامور ہیں مگر ان میں شاید کسی میں کوئی ایسی بات موجود نہیں جس سے بغیر دریافت کئے معلوم ہو سکے کہ یہ شاعر "ریاضِ جوش" سے متعلق ہے۔ مگر جوش صاحب کو پہچاننے کے لئے کسی خارجی سہارے کی ضرورت ہی کہاں ہے۔ جنہوں نے آپ کو بچشم خود نہیں دیکھا وہ آپ کے کلام سے آپ کو پہچانیں گے۔ استاذی قبلہ خود فرما گئے ہیں ؎

اگر صورتِ جوش دیکھی نہیں ہے
انہیں ان کی اردو سے پہچانئے گا

○

حُسینا

شطرنج کھیلتے وقت میرے پتاجی کا انہماک دیدنی ہوتا تھا۔ ایک دن ایسے ہی عالم میں ڈاکیہ آیا۔ "لالہ جی! سلام" کہہ کے کھڑا رہ گیا۔ لالہ جی (پتاجی) اپنے آپ میں ہوں تو سلام کا جواب دیں۔ ان کے تو برق رفتار پیادے دشمن کے قلعے پر حملے پر حملہ کر رہے تھے۔ خدا خدا کر کے بازی ختم ہوئی اور پتاجی ڈاکیے کی طرف متوجہ ہوئے۔ معلوم ہوا کہ سنگاپور سے منی آرڈر آیا ہے۔ آج (۱۹۷۸ء) سے لگ بھگ چالیس سال پہلے کا زمانہ اور پچپن روپے کی گرانقدر رقم بھیجنے والے کا پتا قطعی مبہم۔ کوئی ایسا آدمی خیال میں نہ تھا جو ہمارا خاص شناسا ہو اور سنگاپور میں رہتا ہو۔ مگر ہمارا پتا بالکل درست تھا۔ پتاجی نے روپے لے لیے اور امانت کے طور پر جمع کر لیے۔ اس بات کو ایک مدت گذر گئی اور بات آئی گئی ہو گئی کہ ایک روز فقیریا[1] کلانوت سلام کرنے کو آیا اس کے ساتھ ایک چالیس سال کا

---

[1] باہر والوں کے نزدیک یہ مشہور گویا فقیرے خاں تھا مگر ہمارے گاؤں والے اسے فقیریا کلانوت (کلاونت) یا فقیریا میراثی ہی کے نام سے پکارتے تھے۔ یہ گذشتہ پیڑھی کا آدمی تھا۔ عمر میں گویا میرے دادا سے پندرہ سال چھوٹا اور میرے والد سے ۱۵ سال بڑا۔ جب میں نے اسے دیکھا ہے اس وقت اس کی کمر جھکی ہوئی تھی، چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں اور ہاتھوں میں زبردست رعشہ پیدا ہو چکا تھا۔ پھر بھی دسویں پندرہویں وہ پتاجی کے پاس حاضری ضرور دیتا اور راگ بھی سناتا۔ لرزے کی وجہ سے اس کا کلام بھی اتنا ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا کہ خواہ مخواہ ٹپے راگ کی کیفیت پیدا ہو جاتی۔

دبلا پتلا شخص بھی تھا۔ دونوں دہلیز کے قریب بچھی ہوئی چٹائی پر بیٹھ گئے اور فقیریا بولا کہ یہ میرا بیٹا حسینا[1] ہے اور اپنے پچیس روپے لینے کے لئے آیا ہے۔ حسینا دس بارہ برس پہلے گھر سے بھاگ گیا تھا اور آج تک اس کا پتا نہ تھا۔ اب ظاہر ہوا کہ یہ کسی نہ کسی طرح سنگاپور پہنچ گیا تھا۔

کئی برس بعد میں تعلیم ختم کر کے واپس اپنے گاؤں آ گیا۔ خاندانی ساہوکارہ تو تھا ہی اس پر زمین کی پیداوار اور افریقہ سے ماہانہ آمدنی مستزاد۔ پتاجی، ماتاجی، چھوٹی بہن اور میرے سوا کوئی کھانے والا نہیں۔ گوشت، شراب، تمباکو، افیون سے ازلی پرہیز۔ حتیٰ کہ لہسن تک کے کھانے سے ممانعت۔ اس وقت میں نے تین رستے اختیار کئے۔ ایک زمین کی دیکھ بھال، دوسرا اسپورٹس، (فٹ بال، ہاکی وغیرہ) اور تیسرا شاستریہ سنگیت۔ ایک بڑا کمرہ سنگیت کے لئے وقف ہو گیا۔ بعد دوپہر دو ڈھائی بجے سے شام کے پانچ چھ بجے تک وہ سنگیت فضاؤں میں بکھرتا کہ تان سین کی روح بیدار ہو جاتی۔ رفتہ رفتہ علاقے کے اچھے اچھے کلاکار اس محفل میں شریک ہونے لگے۔ بعض محفلوں کے چرچے تو دنوں بلکہ مہینوں زبان پر رہتے۔ طبلہ نوازوں میں ملنگ، عنایت خان خیراتی، محمد خاں[2]، ہرنام سنگھ۔ گویوں میں پنڈت گوردھن داس، جگن ناتھ، پردیت ستیہ پال، اقبال حسین، سنتا سنگھ۔ ستار نوازوں اور سارنگی والوں میں حسین بخش۔ جگن ناتھ، دھنا رام اور علاقے کے بہت سے دوسرے کلاکار جن کے نام اب لوحِ دل پہ باقی نہیں۔ میری بیٹھک کو نغمہ زار بنانے لگے۔

بہت سے مفروضوں میں ایک مفروضہ یہ بھی ہے کہ ہر آواز جو پیدا ہوتی ہے وہ بظاہر چند لمحوں کے ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی ہے مگر حقیقت میں وہ ختم نہیں ہو جاتی بلکہ کہیں نہ کہیں فضا میں

---

[1] اصل نام حسینے خاں مگر بگڑ کر صرف حسینا بلکہ سینارہ گیا تھا۔ بڑے بھائی کا نام فیضے خاں تھا جو پہلے فیجا (فیضا) اور بعد میں فجا ہو گیا تھا۔ یہ گاؤں ہی میں رہتا تھا۔ جب کسی بڑے بوڑھے ہندو کی ارتھی اٹھتی تو فجا اور اس کے ساتھی اس کے آگے بھجن گاتے شمشان تک جایا کرتے تھے۔ یہی اس کا پیشہ تھا۔

[2] میں نے طبلہ محمد خاں سے سیکھا تھا اور ستار جگن ناتھ پردیت سے۔

موجود رہتی ہے۔ صرف ہمارے کانوں کی دسترس میں سے باہر ہو جاتی ہے۔ اس لئے توقع کی جاسکتی ہے کہ ایک نہ ایک دن کسی خاص آلے کی مدد سے ہزاروں سال پرانی آوازوں کو بھی پھر سے سنا جا سکے گا۔ یہ سچ ہو کہ نہ ہو مگر یہ قطعی سچ ہے کہ میں ان کلاکاروں کے چالیس سال پرانے نغموں کو اپنے دل کے آلے کی مدد سے جب جی چاہے سن سکتا ہوں۔ اس لئے تنہائی میں راحتِ دل و جان کے لئے میرے پاس کبھی نہ ختم ہونے والا سامان ہمیشہ موجود رہتا ہے۔

اس دوران میں فقیرے کلاونت کا انتقال ہو گیا اور حُسینا بھی دماغ سے محو ہو گیا ایک روز گرمی کے موسم میں، یہی کوئی چار پانچ بجے ہوں گے، محفل قریب قریب ختم ہو رہی تھی۔ ٹیا نوکر پنکھا کھینچتے کھینچتے لگ بھگ سو ہی چکا تھا۔ پنکھے کی ڈور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ہلتے ہوئے پنکھے کے متوازی جھول رہی تھی۔ محمد خاں طبلے پر اپنے لمبے لمبے ہاتھوں سے آخری تھاپ دے رہے تھے کہ حُسینا کمرے میں داخل ہوا۔ سیاہ رنگت، کمر کسی قدر جھکی ہوئی، کتروان مونچھیں مگر سرے کچھ کچھ اوپر اٹھے ہوئے، سفید قمیض اور پاجامہ زیب تن۔ ننگا سر، ترچھی مانگ، دبلا پتلا، بانکا، مگر سراپا انکسار۔ حُسینا سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گیا۔ میں نے ہارمونیم کا منہ اس کی طرف پھیر دیا۔ محمد خاں پھر سے تیار ہو گئے۔ طبلہ ملایا۔ پتاجی بھی باہر کے کمرے سے آکر محفل میں شامل ہو گئے۔ حُسینے نے پوچھا۔ "لالہ جی آج تو میرے بھاگ جاگ اُٹھے۔ کیا سناؤں" پتاجی نے کہا "جو جی میں آئے"۔ حُسینے نے ایک چیز چھیڑی:

دھنیہ دھنیہ بھاگ جاگے

پٹ دیپ ایسا مدھر راگ، محمد خاں ایسا طبلچی اور موقعہ محل کی چیز۔ ایسا سماں بندھا کہ جلسہ رات کے آٹھ بجے ختم ہوا۔ خدا لگتی یہ ہے کہ میں نے بڑے بڑے ہنرمندوں کو سُنا تھا مگر ایسا سُریلا گلا حُسینے کے سوائے کسی نے نہ پایا تھا۔ افسوس کہ یہ لوگ وسائل کی کمی اور بخت کی نارسائی کے ہاتھوں اپنے گھر سے چل کر اپنے ہی گھر تک پہنچ پاتے ہیں اور بس۔

ہوتے ہوتے حُسینا ہر دوسرے تیسرے روز آنے لگا۔ گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھتا، میٹھے سروں کی بارش کرتا، خود بھی بہہ جاتا اور اپنے ساتھ ہمیں بھی بہالے جاتا۔ میرے پتاجی ان محفلوں میں بہت

کم شامل ہوتے۔ ایک تو اُن کا بزرگ مقام، دوسرے ان کے اپنے ہم چشموں کا ازدحام۔ مگر حسینا جب کبھی شام کو تن تنہا آنکلتا تو ان سے ایک آدھ غزل کی فرمایش کرتے۔ زیادہ تر دو ہی غزلوں کی فرمایش ہوتی۔ ایک پنجاب کے سب سے بڑے استادِ فن اور زبان داں ابوالفصاحت جوشؔ ملسیانی کی اور دوسری اردو زبان کے عظیم مفکر شاعر علامہ اقبالؔ کی۔ ان غزلوں سے یہی نہیں کہ دونوں سخنوروں کے رنگِ سخن کی انفرادیت کھل کر سامنے آتی ہے بلکہ اِن سے پتاجی کے اعلیٰ اور ارفع مذاقِ سخن کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ دونوں غزلوں سے چند اشعار جو یاد آرہے ہیں درج کیے جاتے ہیں:

غزل جناب جوشؔ ملسیانی

کس بلا کا حُسن ہے اے روحِ گلشن پھول میں ۔۔۔ خود تری تصویر کا ہے رنگ و روغن پھول میں

پھول کے دو چار ساغر اور اے ساقی لنڈھا ۔۔۔ خوب تر کر دے مری تو بہ کا دامن پھول میں

اس جہانِ رنگ و بو میں دیوتا آباد ہیں ۔۔۔ اپنا مندر تو بنا لے اے برہمن پھول میں

موت نے آکر مٹا دیں سب کے دل کی رنجشیں ۔۔۔ دوست بن کر آگیا ہر ایک دشمن پھول[1] میں

غزل علامہ اقبالؔ

دریا میں موتی اے موجِ بیباک ۔۔۔ ساحل کی سوغات خار و خس و خاک

تیرا زمانہ، تاثیر تیری ۔۔۔ نادان! نہیں یہ تاثیرِ افلاک

ایسا جنون بھی دیکھا ہے میں نے ۔۔۔ جس نے سیئے ہیں تقدیر کے چاک

رکھتا ہے اب تک مے خانۂ شرق ۔۔۔ وہ مے کہ جس سے روشن ہو ادراک

میں نے پہلی مرتبہ یہ غزلیں اپنے مکان کی کھلی چھت پر سنی تھیں۔ پتاجی، پونم کا چاند اور مہینے کی چاندنی سے بھی زیادہ اجلی اور کلیجہ ٹھنڈا کرنے والی آواز۔ ادب اور آواز کا جادو جس پر چلے وہی اس کا مزا جانے۔

---

[1] موت کے تین دن بعد کی ایک رسم۔

حسینے پر بہت دیر میں کھلا کہ مجھے شعر کہنے کا شوق بھی ہے۔ میں پہلے ہی سے اپنے شعر سنانے میں بہت شرم محسوس کرتا ہوں اور میری یہ روش آج بھی اسی طرح بنی ہوئی ہے۔ حالانکہ میں اس وقت استاد سے اصلاح لینی شروع کر چکا تھا اور فکرِ شعر بھی باقاعدہ کرتا تھا۔ اس نے ایک دن اصرار کر کے میری ایک نظم سنی "محب وطن کی دعا"۔ ان دنوں شاعر وقت کے تقاضے سے اپنے کلام میں، نظم ہو یا غزل، وطن کی محبت کا اظہار ضرور کرتے تھے۔ میں بھی گھڑی گھڑی پل پل وطن پر جان نثار کر دینے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ البتہ یہ دعوےٰ نہیں کر سکتا کہ اگر واقعی ایسا موقع آ جاتا تو میں اُن خوابوں کو پورا بھی کر دکھاتا۔

حسینے کو یہ نظم بہت پسند آئی۔ ہمارے گاؤں سے موضع کھٹکڑ کلاں صرف تین کوس کے فاصلے پر ہے۔ یہ وہی کھٹکڑ کلاں ہے جس نے شہیدِ اعظم بھگت سنگھ[1] کو جنم دیا۔ جس زمانے کا یہ ذکر ہے اس وقت بھگت سنگھ کی شہادت کو تیرہ چودہ برس گزر چکے تھے۔ خدا جانے کیا سمائی کہ بیساکھی (اپریل) کے پوتر دن پر دیش بھگتوں نے "بھگت سنگھ شہیدی میلہ" کی بنیاد ڈال دی۔ ہزاروں لوگ جمع ہوئے۔ ریلوے لائن کے اس پار آم کے درختوں کے جھنڈ سے لگا ہوا سادہ مگر وسیع اسٹیج تیار ہو گیا۔ اس وقت کے نامی لیڈروں میں ڈاکٹر ستیہ پال نے جلیان والا باغ امرتسر کی المناک داستان دہرائی جو بیس پچیس سال پہلے اسی روز انگریز کے خونخوار قلم سے لکھی گئی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ لوگ زار زار رو پڑے تھے۔ ماسٹر کابل سنگھ نے بھگت سنگھ کی دل بڑھا دینے والی باتیں سنائیں۔ کامریڈ لاہوری رام پردیسی[2] نے اپنا مشہور و مقبول انگریزی حکومت کا سیاپا سنایا۔ لوگ ہنسی

---

[1] شہیدِ اعظم بھگت سنگھ کے والد سردار کشن سنگھ میرے پتاجی کے بڑے شناسا تھے۔ میں نے انھیں کئی بار اپنے یہاں پتاجی کے ساتھ محوِ گفتگو دیکھا ہے۔ بھگت سنگھ کے گھر میں بھی میں ایک سے زیادہ بار گیا ہوں اور ان کی ماتاجی کے ہاتھ کا کھانا بھی کھا چکا ہوں۔

[2] کامریڈ لاہوری رام پردیسی عموماً جیل ہی میں رہتے تھے۔ جب بھی رہا ہوئے تو کسی نہ کسی جلسے میں یہ مشہور "سیاپا" سنا بیٹھتے اور واپس جیل بھیج دئے جاتے (سیاپا پنجاب میں ایسی نظم کو کہتے ہیں جو کسی مرنے والے کے ماتم میں میراثنیں گایا کرتی ہیں۔ میراثن پورا بند خاص انداز میں پڑھتی ہے اور باقی عورتیں ٹیپ

(باقی ص ۲۹۲ پر)

اور جوش میں دیوانے ہو ہو گئے۔ حسینا بھی اسی جوش میں اسٹیج پر وارد ہو گیا۔ وارد کیا ہو گیا بس چھا گیا نظم تھی وہی یعنی "محب وطن کی دعا" حب الوطنی اور اردو دونوں کے عروج کا زمانہ تھا جب حسینا ان مصرعوں پر پہنچا ؎

اے تری رحمت کے صدقے مجھ کو یہ انعام دے
جان تک قربان کر دوں میں وطن کے واسطے

تو اس کی سریلی اور باٹ دار آواز چند لمحوں کے لئے "انقلاب زندہ باد" کے فلک شگاف نعروں میں گم ہو کے رہ گئی۔ نظم کے ۹ بند ہیں۔ پہلا اور آخری بند آپ بھی سن لیجئے ؎

وقف میں کیوں ہوں نگارِ سحر فن کے واسطے
عشرتِ جان کے لئے آرامِ تن کے واسطے
مہ وشاں رقص و لطف انجمن کے واسطے
جان تک قربان کر دوں میں وطن کے واسطے

کر رہا ہوں میں گناہِ عشقِ ملکی بر ملا
کوئی دن ایسا بھی میرے دیس پر لا دے خدا
جس دن اٹھ جائے جنازہ ہند سے افلاس کا
اور سازِ دل کی جھنکاروں سے اٹھے یہ صدا
جان تک قربان کر دوں میں وطن کے واسطے

(بقیہ صفحہ ۲۲ا سے آگے) کا مصرع اٹھاتی ہیں اور سر اور زانو کو دونوں ہاتھوں سے پیٹتی ہیں) پردیسی والی نظم کا ایک ہی شعر یاد رہ گیا ہے۔ پردیسی اسٹیج پر بالکل میراثن کی طرح کھڑے ہو جاتے اور سر اور زانو کو پیٹتے ہوئے مصرع اٹھاتے ؎ ہائے نی نکمیئے حکومتے

پھر انترہ پڑھتے راون ورگے چل گئے
بھبیکن ور گے مل گئے۔ نکمیئے حکومتے۔ ہائے ہائے نی . . . .

(ترجمہ) اے ناکارہ حکومت ہم تیرا ماتم کرتے ہیں۔ اس دنیا سے راون جیسا جری راجا اُٹھ گیا۔ اس کا بھائی بھبیکن بھی کوچ کر گیا۔ تو کہاں رہنے والی ہے۔ اے ناکارہ حکومت ہم تیرا ماتم کرتے ہیں۔

اپریل ۱۹۴۷ء سے اکتوبر ۱۹۴۷ء کے وسط تک میں رانچی میں اپنے بھائی کے پاس رہا۔ اس اثناء میں ملک تقسیم ہو گیا، آزاد ہو گیا مگر کچھ ناسمجھی کے سبب اور کچھ فاصلے کی وجہ سے یہ تو اندازہ ہی نہ ہوا کہ پنجاب پر کیا بیت گئی۔ وہاں رانچی میں تو آزادی کے شاندار پروگرام سامنے تھے۔ پنجاب سے صحیح خبریں آ نہیں رہی تھیں مگر جب میں واپس آیا تو اور ہی سماں دیکھا، سب قدریں بکھر گئیں صرف تباہی ہی ایک قدر مشترک تھی جو باقی رہ گئی تھی۔

ہمارے گاؤں میں البتہ خیریت تھی۔ سب مسلمان جوں کے توں موجود تھے۔ ہندوؤں اور سکھوں نے یہاں مل کر ان کی ایسی حفاظت کی کہ قتل وخون کا ایک واقعہ نہ ہوا۔ تاہم کل کے جگری دوست اور جانے پہچانے مسلمانوں کی سہمی ہوئی نظریں بتا رہی تھیں کہ اب انہیں ہم پر اعتبار نہیں رہا۔ وہ کسی وقت بھی پاکستان ہجرت کرنے کو تیار تھے۔

ایک روز یہی کوئی سہ پہر کا وقت تھا، میں اپنے فارم پر گیا ہوا تھا وہاں فصل کی سینچائی ہو رہی تھی۔ رہٹ چل رہا تھا۔ دونوں بیل اپنے ختم نہ ہونے والے سفر پر رواں تھے۔ غوں غوں ہوتا ہوا رہٹ گویا موسم کی خوشگواری کے نغمے الاپ رہا تھا۔ شہتوت کے درخت کے نیچے ٹھنڈی ریت میں میں بھی مطمئن بیٹھا تھا کہ کسی کے قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ یہ حسینا تھا "لالہ جی۔ سلام۔ لو ہم چلے" میں نے پوچھا "کہاں؟"۔ کہا۔ "یہ تو ہمیں بھی نہیں معلوم" میں نے مڑ کر دیکھا اس کی آنکھیں جیسے میلوں اندر دھنس گئی ہوں۔ شاید وہ اب کچھ بھی دیکھنا نہیں چاہتی تھیں۔ راستہ جہاں بھی اسے لے جائے گا وہ چلا جائے گا۔

تھوڑی دیر کے لیے چلتا ہوا رہٹ رک گیا، اس کے ساتھ جیسے زمین، آسمان، ہوا، دماغ سب رک گئے۔ پھر میں نے کہا "بیٹھ جاؤ" وہ بیٹھ گیا۔ خاموش ساکت اور جامد۔ پھر کہنے لگا "کوئی غزل سناؤں" میں نے کہا سناؤ۔ جو بھی اچھی لگے۔ اس نے جناب جوش ملسیانی[1] کی یہ غزل سنائی ؎

مجھ کو لینے کے لیے بے تاب ہر ویرانہ تھا
پاؤں کا چکر بھی گویا گردشِ پیمانہ تھا

---

[1] میرے ساتھ میل جول کی وجہ سے اُسے جوش صاحب کا بہت سا کلام یاد ہو گیا تھا اور کچھ غزلیں اس نے کمال صاحب کی بھی از بر کر لی تھیں۔

داستانِ عاشقی کچھ اور باقی ہے ابھی

خوابِ ہستی تو فقط افسانہ در افسانہ تھا

چھین لی کیوں آپ نے مجھ سے متاعِ صبر و ہوش

کیا سزائے قیدِ غم کے ساتھ کچھ جرمانہ تھا

جب وہ اس شعر پر آیا ؎

چار دن چلنے نہ پایا بادۂ عشرت کا دور

ہائے کتنا تنگ میری عمر کا پیمانہ تھا

تو اس کا گلا بھر آیا اور وہ آگے نہ پڑھ سکا۔ آج اس کی آواز میں بھی وہ کشش نہ تھی۔ بولا "اچھا اب اجازت قافلہ کوچ بولنے والا ہے۔ فوجی آچکے ہیں۔" میں نے ہمیشہ کی طرح جیب میں ہاتھ ڈالا تو صرف بارہ آنے کی ریزگاری ملی۔ وہی اس کے ہاتھ میں تھمادی۔ اور حسینا بغیر کچھ کہے سنے ایک انجان منزل کی طرف بل کھاتے کچے راستے پر چلنے لگا۔ مدتوں بعد میں نے ایک شعر میں شاید اسی منظر کی عکاسی کی تھی ؎

جدھر خود ہو گیا تھا لگا لے گیا

نہ جانے کدھر راستا لے گیا

○

دُرگا دیوی

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ برسات کے خوشگوار موسم میں ایک دن جب کہ رستوں میں پانی بانسوں اُچھل رہا تھا اور میں محلے کے دوسرے بچوں کے ساتھ برستے پانی میں نہ جانے کیا کیا کھیل رہا تھا کہ یکا یک بازار میں کھڑ کھڑ کرتے ہوئے تانگے کی آواز آئی تھی۔ کیا جانے اس تانگے والے نے چار میل کی کچی سڑک کو کس طرح پار کیا ہوگا۔ یہ گھوڑے بھی غضب کا دم خم رکھتے ہیں۔ جہاں موٹر کاریں، بسیں، ٹرک فیل ہو جاتے ہیں وہاں یہ کام آتے ہیں۔ ہم تماشے کے طور پر اُڑ مچاتے پانی کو پھر سے بادل میں تبدیل کرتے تانگے کے پیچھے ہو لئے تھے اور میری حیرت کی کوئی حد نہ رہی تھی جب تانگہ بالکل ہماری بیٹھک کے پاس آکر رک گیا تھا اور تانگے والے نے پکار کر پوچھا تھا

"کیا لالہ شنکر داس کی بیٹھک یہی ہے؟"

اور بیٹھک کے اندرونی دروازے کی چلمن کے پیچھے سے پتا جی اپنی بھاری رعب دار آواز میں بولے تھے۔

"کون ہے؟"

"میں ہوں دُرگی آپ کی بہن" ایک نحیف سی آواز سنائی دی تھی۔ ہم نے چونک کر تانگے کے اندر گٹھڑی بنی ہوئی ایک نہایت کمزور اور بیمار عورت کو دیکھا تھا جو ایک میلے کچیلے دوپٹے میں لپٹی ہوئی بالکل آم کی گٹھلی معلوم ہوتی تھی جس کا گودا اچار ڈالنے کے لئے تراش لیا گیا تھا۔

درگی شریف اور امیر ماں باپ کی اکلوتی نہ سہی مگر بہت لاڈلی بیٹی تھی۔ من بھاتا کھاتی تھی اور جگ بھاتا پہنتی تھی۔ محلے کی سکھی سہیلیاں اس پر رشک کرتی تھیں۔ گھر کے آنگن میں اور محلے میں دھما چوکڑی مچی رہتی تھی اور درگی سب میں پیش پیش ہوتی تھی۔ وہ گھنگرو کی طرح چنچل اور نغمے کی طرح سریلی جب بدکر دوڑتی تھی تو تصور کی طرح پلٹ کر وہیں پہنچ جاتی تھی جہاں سے چلی ہوتی تھی اور بازی جیت جاتی تھی۔

ہر سال گاؤں میں رام لیلا ہوتی تھی اور دسہرہ دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ اسی طرح دیوالی کے دن گاؤں بھر میں ہزاروں دیے جلا کر دھرتی پر تارے چمکائے جاتے تھے۔ مشعلیں روشن ہوتی تھیں اور رات کو کھانا کھانے کے بعد ہمارے ہاں بڑے دالان میں کئی من مٹھائی بنوا کر سجائی جاتی تھی جو گاؤں اور آس پاس کے گاؤں کے غریب غربا میں تقسیم کی جاتی تھی۔ یہ منظر بہت سہانا ہوتا تھا۔ درگی اس روز سگھڑ بیٹی بنی، ہاتھ میں چاندی کی طشتری لئے کمال پھرتی اور لگن سے مٹھائی تقسیم کرتی نظر آیا کرتی تھی۔ سگھڑ کی جھاڑو پھوہڑ کا لیپا۔ سبھی اس کے سلیقے کی تعریف کیا کرتے تھے۔

درگی بارہ برس کی ہو گئی تھی۔ لیکن ابھی تک اسے زنانے مردانے کی تمیز نہ تھی۔ یوں بھی گاؤں والے بےحد سادہ اور شریف تھے۔ یہ ضرورت ہی کہاں تھی کہ بچے بچیوں کو بری نظروں سے بچایا جائے۔ مگر رواج کے مطابق درگی کو بڑے چھوٹے کی تمیز اور کھرے کھوٹے کی پہچان کروائی جانے لگی اور پھر وہ روز بروز، ماہ بہ ماہ، سال بہ سال، اٹھکھیلیوں کے ساتھ ساتھ سنجیدگی اختیار کرتی ہوئی بدستور ماں باپ کی لاڈلی اور بھائی بہنوں کی پیاری بنتی ہوئی شباب کا دروازہ کھٹکھٹانے لگی۔

مہندی لگنے لگی، شادیانے بجنے لگے۔ رنگ ہی رنگ، شور ہی شور، اہل خاندان، محلے والے، گاؤں والے جلنے اور پر مے آنند اتنے ہی من سے پرسن۔ دھوم دھام سے برات پہنچی۔ گرم جوشی سے سواگت کیا گیا۔ خوشی رام بانکا سجیلا دولہا سفید اور بلند قامت گھوڑی پر ایسے لگتا تھا جیسے برف سے ڈھکی چوٹی پر فتح کا پھریرا۔ بیاہ کی رسم ادا ہوئی۔ بیس برس کی نازوں کی پالی بیٹی کو ماں نے باہوں میں بھینچ لیا اور باپ نے آخری بار درگی کو کنیا کے روپ میں پیار کر کے ڈولی میں بٹھا دیا۔

سمبندھیوں نے دور تک ساتھ چل کر برات کو الوداع کہی۔

جس طرح چاند کبھی کبھی سورج نکل آنے کے بعد بھی دیر تک دکھائی دیتا رہتا ہے۔ اسی طرح گھر سے چلے جانے کے بعد بھی دیر تک گھر اور محلّے والوں میں درگی کی رسیلی معصوم اور شرارت آمیز یاد آنکھوں میں چکاچوند پیدا کرتی رہی۔ درگی شادی کے بعد پہلی بار پھری تو اور بھی جادو جگانے لگی۔ وقت اور کسی قدر احساسِ ذمہ داری نے اس میں سنجیدگی اور گمبھیرتا کا اضافہ کر دیا تھا۔ وہ بہت خوش تھی اس لئے ماں باپ بھائی بہن بھی نہایت خوش تھے۔

چھ ماہ بعد ساون آیا۔ باغ میں آم کے درختوں پر جھولے پڑنے لگے۔ درگی کو سسرال سے بلوایا گیا تاکہ وہ بھی اپنی میکے کی پرانی یادوں کو تازہ کر لے۔ درگی آئی مگر اس میں پہلے کی درگی کی کوئی جھلک باقی نہ تھی۔ ماں باپ نے معلوم کر لیا مگر اس طرح کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ خوشی رام بہت لالچی انسان ہے اور وہ زیادہ سے زیادہ روپیہ پیسہ لانے کے لئے درگی کو مجبور کرتا ہے۔ جب درگی واپس سسرال لوٹی تو بہت خوش تھی۔ کیونکہ اس کی ماں نے اسے روپے اور زیور سے لاد دیا تھا۔ اب کی اسے سسرال میں بے حد عزت ملے گی۔ مگر اتنے مال کو دیکھ کر خوشی رام کا لوبھ دونا ہو گیا۔ اس کے دماغ میں سکھ شانتی کی برکھا کی جھما جھم کی جگہ سونے چاندی کے سکے جھنکنے لگے۔ وہ ہوس سے مجبور ہو گیا کہ درگی پر جبر کر کے اور بھی دھن دولت اکٹھا کرے۔ وہ مجبور کرتا۔ وہ مجبور ہوتی، میکے جاتی اور وہاں سے جو کچھ ملتا سمیٹ لاتی اور اپنے پتی کے چرنوں میں ارپن کر دیتی۔ اس طرح شادی کے بعد درگی کی جوانی کی بہار اس کے سسرال کی روپے پیسے کی بھوک نے دو ہی لقموں میں ہڑپ کر لی اور پھر جوں ہی ماں باپ پرماتما کو پیارے ہوئے درگی کی رہی سہی امید بھی (جو کبھی اس کا مستقل سہارا بن سکتی تھی) پرلوک گئی۔ اس کا پتی اسے اکیلا چھوڑ کر الگ رہنے لگا۔ اور وہ نہایت افلاس اور تنگدستی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دی گئی۔ وہ تن تنہا کتنے دن اپنی زندگی کا بوجھ اٹھاتی۔ آخرکار تپ دق کی ماری نے اپنے میکے میں اپنے بھائی شنکر داس کے پاس اپنی زندگی کے آخری سانس لینے کی ٹھان لی۔

پتاجی اور چند دوسروں نے نہایت پیار اور شفقت سے درگی کو تانگے سے ہاتھوں ہاتھ اتارا اور اسے ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق فیملی سے الگ اپنے گھر سے کچھ ہی دور ایک کھلے صحن والے کچے مکان میں رکھا۔ ایک کمرے کے علاوہ گرمی اور برسات سے بچنے کے لئے صحن کے ایک طرف گھاس پھوس

کا چھپر بھی ڈال دیا گیا۔ ایک بوڑھا نوکر خدمت کے لیے رکھ دیا گیا۔ یہ سب کچھ پتا جی نے نہایت ڈھارس اور صبر سے کیا۔ اگرچہ ان کا حال بہن کی دم بہ دم گھٹتی ہوئی سانسوں سے بے حال ہو رہا تھا۔

میرے پتا جی اور ماتا جی گھر کو آتے جاتے درگی کے پاس ٹھہرتے، مزاج پرسی کرتے اور اِدھر اُدھر کی نئی اور پرانی باتوں سے اس کا دل بہلاتے لیکن درگی پر تو پت جھڑ کے موسم کی کیفیت تھی جس میں اس کے جسم و جان کا پودا گھڑی گھڑی پل پل بسنت رِتو کے رہے سہے نشان کھوتا چلا جا رہا تھا۔ دھوئیں کو پانی کا بادل کب تک سمجھا جا سکتا ہے۔ فریاد سے گیت کا سا آنند لینا بھول ہے۔ یہ بات بھائی، بھاوج اور بہن تینوں جانتے تھے۔ مگر خاموشی کے سوا چارہ نہ تھا۔ کیونکہ یہ ایسا غم تھا جو رونے سے ہلکا ہونے کے بجائے بڑھتا تھا۔

گلی محلے والے ہمیشہ حال پوچھنے کے بہانے آنے اور درگی کا دل بہلاتے۔ پر وہ ان کا دھنیہ واد کرتی۔ درگی عام طور پر دوپہر کے کھانے کے بعد اکیلی ہوتی۔ چارپائی کے سفید بستر پر سفید ساڑھی میں ملبوس نحیف و نزار درگی ہرے بھرے درخت کی ایک سوکھی خاردار ٹہنی کی طرح بے رنگ و رونق پڑی ہوتی۔ میں یوں تو ہر روز ایک دفعہ بعد دوپہر بوا درگی کو پرنام کرنے آتا مگر کبھی کبھی اس کے پاس کچھ دیر کے لیے رک بھی جاتا۔ ویسے تپ دق کی مریضہ ہونے کی وجہ سے گلی کوچے کے بچوں کو اس کے پاس آنے کی اجازت نہ تھی اور وہ بھی اسی وجہ سے بچوں کی موجودگی پسند نہ کرتی تھی۔ میں جب اس کے پاس ہوتا وہ مجھے اپنے ماں باپ (میرے دادا دادی) کی باتیں سناتی اور لاڈ چاؤ سے اس کا من گدگد ہو اٹھتا یا پھر وہ اپنی سکھی سہیلیوں کی باتیں سناتی۔ کسی ایک کو لمحہ بھر یاد کرتی اور جیسے گھنٹوں سوچ میں کھو جاتی۔ حتیٰ کہ میں اس کے چہرے کی طرف دیکھتا اور محسوس کرتا کہ اس کی آنکھوں کی چمک واپس آ گئی ہے۔ اور اس کے پچکے ہوئے گال ابھر کر آنکھوں اور نچلے جبڑے کے برابر آ گئے ہیں۔ لیکن مزاج پرسی کے لیے اس کی سکھی سہیلیوں میں سے کوئی نہ آئی تھی۔ وہ سب مدت ہوئی یکے بعد دیگرے اپنی قسمت کے کھیل کھیلنے کسی اور گھر کی زینت بن کر یہاں سے رخصت ہو چکی تھیں۔

لڑکیوں کے اسکول کی استانی اور کچھ اور بڑی بوڑھیاں سیر کرتے نکلیں تو میری والدہ نے پوچھا۔

"کہاں کی تیاری ہے"

استانی نے جواب دیا "پانچ بج رہے ہیں ذرا گرمی کم ہونے لگی تھی ہم نے سوچا باغ کی سیر کو چلا جائے۔ "آپ بھی آئیے"۔

محلّے والے میری والدہ کی بڑی عزّت کرتے تھے۔ میری والدہ جھٹ تیار ہو گئیں اور کہنے لگیں۔

"کیوں نہ دو گھڑی دُرگی کا بھی دل بہلاتے چلیں"۔

یہ صلاح سب کو پسند آئی۔ اور سب خراماں خراماں دُرگی کے رین بسیرے کی طرف بڑھنے لگیں اور ساتھ ہی ساتھ دنیا بھر کی خبریں دینے لگیں۔ استانی نے کہا۔ "آج چمپا کی بیٹی پُشپا اسکول نہیں آئی۔ سنا ہے اس کا باپ بہت بیمار ہے"۔

خوشحالی نے کہا "کل تو بھلا چنگا تھا۔ منّی کے پتاجی کہتے تھے امیر چند اب بالکل ٹھیک ہو گیا ہے"۔

الشری جھوٹ کر بولی "کبھی لوتڑوں کے بگڑے بھی ٹھیک ہوئے ہیں، نہ موئی شراب چھٹے نہ امیر چند ٹھیک ہو"۔

جانکی نے گہری فکر کا اظہار کرتے ہوئے کہا "بے چاری چمپا نے تو ایک دن پیٹ بھر کھانا بھی نہ کھایا۔ تیس ہی سال کی عمر میں بے چاری کا گورا چٹّا چہرہ ہلدی ہو گیا ہے"۔

رام رکھی ٹیڑا منہ کر کے بولی "دُرگی کو دیکھو وہ حال ہوا ہے کہ پرماتما دشمن کا نہ کرے بے چاری مہینوں سے پھانسی پر لٹک رہی ہے۔ اب تو کلیجہ کڑا کر کے یہی منہ سے نکلتا ہے کہ ابھاگن اس سنسار کے جنجال سے چھوٹ جائے۔

آخری بات کے ختم ہونے تک وہ سب درگی کی کوٹھری تک پہونچ چکی تھیں۔ میری والدہ نے ہر روز کی طرح کمرے میں داخل ہونے سے پہلے پیار سے آواز دی۔ "بی بی دُرگی" مگر ایک بے پناہ خاموشی کے سوا اندر سے اور کوئی آواز نہ آئی۔

دُرگی سر سے پاؤں تک چپ کی تصویر بنی پڑی تھی۔ گھر گرہستی سے بے خبر اور سنسار کے جنجال سے آزاد۔

عبدُل بابا

"وہ جو سامنے ہری پربت ہے ہمارا مزار وہیں بنے گا۔" عبدل بابا نے اپنے دائیں ہاتھ کی اُنگلی سے ہری پربت کی سہری بھری چوٹی کی طرف مضبوطی سے اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

عبدل بابا کا کوئی مذہب نہ تھا مگر ہر مذہب عبدل بابا کا مذہب تھا وہ ہندو کے ساتھ ہندو نظر آتے تھے، مسلمان کے ساتھ مسلمان اور عیسائی کے ساتھ عیسائی۔ لیکن ان کے صحیح مذہب کا پتا اس وقت چلتا تھا جب وہ ایک ہی وقت میں ہندو مسلمان عیسائی تینوں سے بات کر رہے ہوتے تھے۔ اُس وقت اُن کا مذہب سب مذہبوں پر بھاری معلوم ہوتا تھا۔

عبدل بابا کا گاؤں جس میں وہ اب رہتے تھے جنگل کے درختوں کی چار دیواری میں گھرا ہوا تھا اور ان کا چھوٹا سا مکان غریبوں کے کچے گھروں کی چار دیواری میں۔ اسی گھر کے سادہ سے برآمدہ میں عبدل بابا سے میری پہلی بھینٹ ہوئی تھی۔ اور مجھے ایسا لگا تھا جیسے میں اُن کو جُگ جُگ سے پہچانتا تھا! ور وہ مجھے صدیوں سے جانتے تھے ورنہ اس پہلی بھینٹ سے پہلے میں انہیں صرف ایک شاعر کی حیثیت سے جانتا تھا۔ اس شاعر کی حیثیت سے جو پت جھڑ کے موسم میں بھی بسنت کے پھول کی طرح کھِلا رہتا ہے۔

بابا چشمہ لگائے لمبا کرتا زیب تن کئے اور دھوتی پہنے آرام کرسی پر ٹیک لگائے برآمدے میں بیٹھے تھے۔ اور میں سوٹ بوٹ پہنے فیشن کے کندھوں پر سوار ہو کر ان کی سیوا میں پہونچا تھا۔ فیشن سادگی سے ٹکرا گیا تھا۔ ہار فیشن ہی کو ہونی تھی کیونکہ فیشن ہر لحظہ اپنا رنگ بدلتا ہے اور سادگی کا روپ سدا بہار ہوتا ہے۔ میں نے بے اختیار اُن کے پاؤں چھوئے تھے اور انہوں

نے ضبط اور سنجیدگی سے پاس پڑی ایک کرسی پر مجھ سے بیٹھنے کو کہا تھا۔ وہ مجھ سے عقل و ہوش کی باتیں کرنے اور کھانا پکوانے کے منصوبے باندھنے لگے تھے اور میں اُن کی دانشمندی سے مرعوب ہو کر اپنے ہوش و حواس کا مسالا کوٹنے لگا تھا

راتیں کٹتی رہیں اور دن بیتتے گئے۔ میں اُن کے درشن کو جاتا اور ان کے پاؤں چھوتا وہ تپاک سے ملتے اور گلے سے لگا لیتے۔ میں بہت سے کٹھن سوال اپنے دماغ میں لے کر جاتا مگر اُن کے آگے کہنے کی ہمت نہ ہوتی اور اسی طرح ناکام ہو کے رہ جاتا جیسے برسات کے موسم میں کوئی مانگے کا رین کوٹ لے کر دن بھر گھومتا پھرے مگر بارش نہ ہو۔

بابا دس برس سے اِس گاؤں میں آکر رہ رہے تھے مگر وہ اپنے آبائی شہر کو کبھی نہ بھولے تھے۔ وہ اپنے گھر کے در و دیوار، شہر کے بازار، گلی کوچے، آموں کے باغ، پانی سے لبالب تالاب کا ذکر اس محبت سے کیا کرتے تھے جیسے انھیں کسی زنجیر نے اس گاؤں میں باندھ رکھا ہو اور جس کے ٹوٹتے ہی وہ گاؤں چھوڑ کر اپنے شہر کی فصیل کی شکستگی سے جا لپٹیں گے۔

بابا آنے والے زمانے سے بہت پُر امید تھے۔ ان کی چند باتوں ہی سے دکھ درد سے پاگل لوگوں کی ڈھارس بندھ جاتی تھی۔ پل بھر میں اماوس کی رات کی سحر ہو جاتی اور آشا کا سورج نکل آتا تھا۔ بابا کو چٹانوں میں جھرنے کی جھر جھر سنائی دیتی تھی۔ وہ سوکھے تنکوں میں باغوں کے حُسن کا نظارا کیا کرتے تھے۔ ان کے لئے ہر سانس ہمیشگی کا پیغام تھی۔ وہ ناامیدی کو امید میں بدلتے دیکھنا چاہتے تھے۔ اُن کی شاعری انہیں احساسات سے لبریز تھی جیسے

اے اندھیرو۔ ہٹو
چھوڑ دو چیخنا
چھوڑ دو گھورنا
غم کا اظہار دل
بہت ہو گیا
تم تو صدیوں سے غم کے
علمدار ہو

اب رُکو۔ اپنے غم
کا مداوا کرو
رات ماں ہی تو ہے
تم جو مانگو گے ماں سے
وہ مل جائے گا
ہاں بڑھاؤ قدم
پھر سے بچّے بنو
اور بڑے چاؤ سے
لاڈ سے پیار سے
مانگ لو روشنی
رات ماں ہی تو ہے
جو بھی مانگو گے ماں سے
وہ مل جائے گا
مانگ لو روشنی
مانگ لو زندگی
مانگ لو ہر خوشی

نظم سناتے سناتے ان کا چہرہ دوپہر کی دھوپ کی طرح کھل اُٹھتا تھا جیسے انہیں بن مانگے ہی روشنی، خوشی، زندگی سب کچھ مل گیا ہو اور ان کا مشن پورا ہو گیا ہو۔

یکایک فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔ خون کی چھینٹوں سے بیلے کی سفید منھ بند کلیوں کا رنگ لال ہو گیا۔ قاتلوں کی گرم روی سے راستے رات کی ٹھنڈک میں بھی تپنے لگے۔ عبدل بابا کے گھر کے عین سامنے چنڈی کا ناچ ہونے لگا۔ بابا کو اللہ پر ایمان ہو نہ ہو انسان پر ایمان تھا وہ بھی آن کی آن میں چکنا چور ہو گیا۔ امیدیں ہچکیاں لینے لگیں۔ ارمان اپنا وجود کھو بیٹھے۔

جیسے ہی فسادات کی آگ ٹھنڈی ہوئی میں بابا کے درشن کو پہنچا اور انہیں زندہ وسلامت دیکھ کر پرماتما کا شکر بجالایا۔ بابا ہمیشہ کی طرح آرام کرسی پر ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور کچھ گنگنا رہے تھے۔ میں نے حاضر ہوتے ہی ان کے پاؤں چھوئے مگر انہوں نے نہ مجھے اُٹھ کر گلے لگایا اور نہ ہی مجھ سے پاس پڑی کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں اور میں شاید فسادات کے دوران میں اتنا بدل گیا ہوں کہ ان کی پہچان سے باہر ہوگیا ہوں اور وہ دھیمے دھیمے سُروں میں انتہائی درد وکرب کے ساتھ کچھ اس قسم کا گیت گنگنائے جا رہے تھے۔

آج پھر اکیلا ہی
زندگی کے صحرا میں
پھول چن رہا ہوں میں

کون ہے مرا ساتھی
کون ہے مری منزل
محض ایک رستا ہے

گھر نہ کوئی بستی ہے
صرف آرزوؤں کا
ایک شہر بستا ہے

یکایک ان کا سر کرسی کی بائیں طرف کو لڑھک گیا۔ آرزوؤں کا شہر ویران ہوگیا۔ رستا کٹ گیا۔ میں نے گاؤں کے لوگوں سے مل کر اُن کی لاش کو نہلایا دھلایا اور دھوم دھام سے ان کا جنازہ نکالا اور ان کی خواہش کے مطابق ان کو سامنے ہری پربت کی ہری بھری چوٹی کے دامن میں احترام سے دفن کر دیا۔

آج ان کی قبر پر ایک مندر بنا دیا گیا ہے جسے عبدل بابا کی سمادھ کہتے ہیں مگر صرف میں جانتا ہوں کہ یہ مندر یا سمادھ نہیں بلکہ ایک پھول ہے جو عبدل بابا نے زندگی کے صحرا سے چُنا تھا اور جسے گاؤں کے سادہ مگر جذباتی لوگوں نے بابا کے مہاتما کی موت مرنے کے بعد اُن کے مزار پر چڑھا دیا تھا۔

جناب اسماعیل داؤد "اودھ پنچ" کا ۱۹۷۸ کا
مکمل سیٹ پیش کرتے ہوئے

سامعین

ریڈیو کلب بمبئی میں تقریر کرتے ہوئے۔
دائیں سے بائیں: دھرم ویر بھارتی ایڈیٹر دھرم یگ، کرشن چندر
سردار جعفری وغیرہ۔